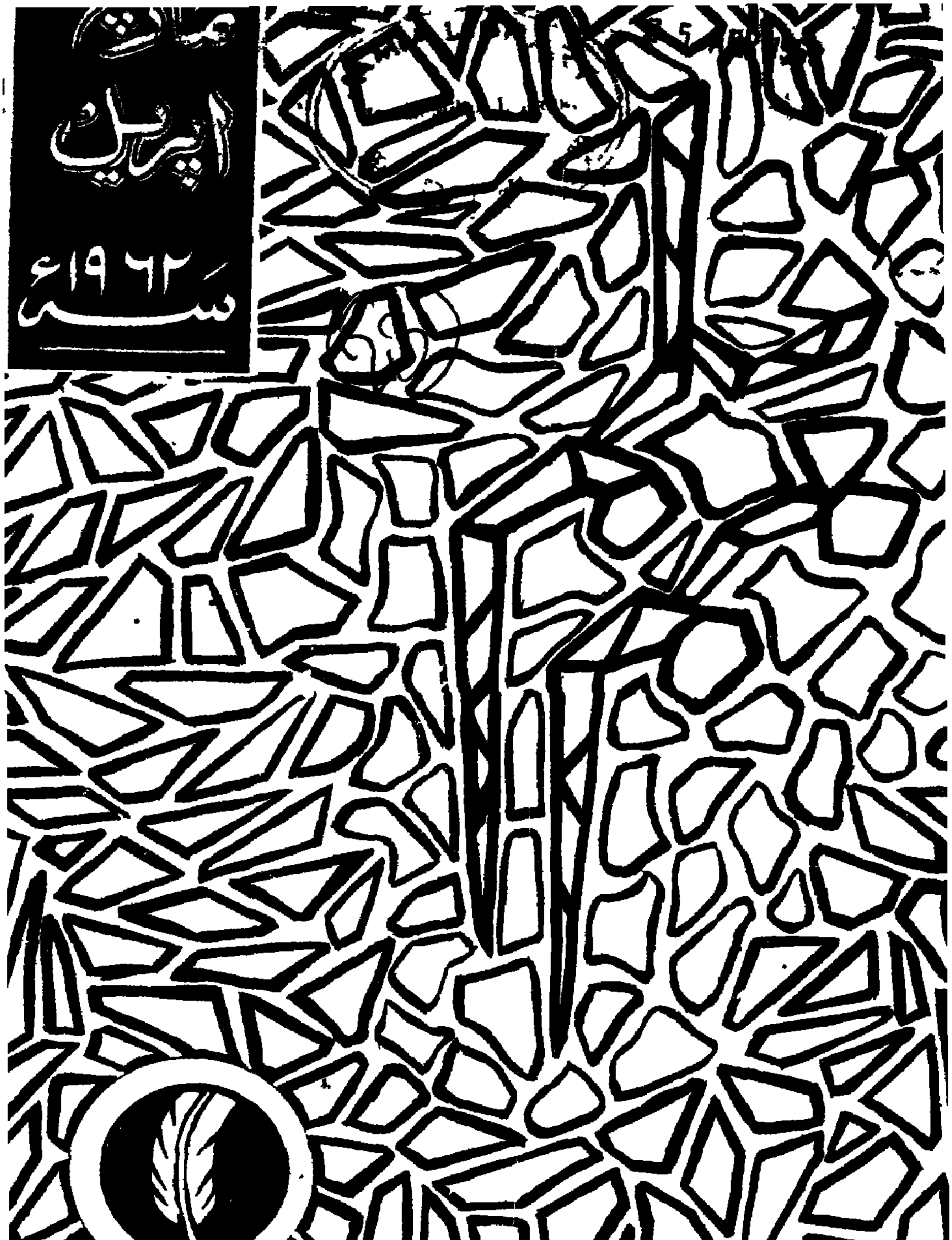

ابريل
سنة ١٩٦٢م

ترقی کی راہ پر

دی بنک آف بہاولپور لمیٹڈ

سنٹرل آفس :— پی آئی ڈی سی ہاؤس ۔ کچہری روڈ ۔ کراچی ۔ نمبر ۴
۵۰ فیصد سے زیادہ حصص حکومت مغربی پاکستان کی ملکیت ہیں
رجسٹرڈ ہیڈ آفس — بہاولپور (مغربی پاکستان)

سرمایہ

منظور شدہ و جاری شدہ — — — — —	۲۵ لاکھ
ادا شدہ — — — — —	۲۵ لاکھ

ہم مسرت سے اعلان کرتے ہیں کہ ہماری مندرجہ ذیل شاخوں میں غیر ملکی زرمبادلہ کا کاروبار بالواسطہ کیا جاتا ہے :

شاخیں

* کراچی ایکسچینج برانچ	* ہارون آباد	* حاصل پور
* کراچی لیاقت بازار	* حیدرآباد	* جیکب آباد
* کراچی جوڑیا بازار	* احمد پور شرقیہ	* بہاولپور (ہیڈ آفس)
* کراچی پی آئی ڈی سی برانچ	* بہاولنگر	* چشتیاں
* کراچی لالو کھیت	* گجرانوالہ	* گجرات
* کامونکی	* قصور	* خانپور
* لاہور	* لیاقت پور	* لائلپور
* ملتان	* رحیم یار خان	* صادق آباد
* سرگودھا	* سکھر	* وزیر آباد

۱— دنیا کے منظور شدہ مراکز میں لیٹر آف کریڈٹ کھولے جاتے ہیں
۲— برآمدی تجارت کے لئے دنیا بھر میں ہماری ایجنسیاں قائم ہیں
۳— بیرونی ممالک میں ترسیل زر کے سلسلے میں ڈرافٹ اور تاریں جاری کی جاتی ہیں
۴— سفری چیک جاری اور کیش کئے جاتے ہیں

مزید تفصیلات کے لئے مقامی برانچ مینیجر سے رابطہ قائم کیجئے

ماہنامہ

ہم قلم

ادارہ مصنفین پاکستان (پاکستان رائٹرز گلڈ)

(کا ترجمان)

جلد ۲ ——————— شمارہ ۷-۸

مارچ - اپریل ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ	دس آنے	(۶۲ نئے پیسے)
سالانہ	———	چھ روپے

اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ
جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں

پتہ
ادارہ مصنفین پاکستان
اسٹریچن روڈ - کراچی ۴

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کا اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں۔ جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں پورا فخر ہے، ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی حبِ وطن کی قدروں کی نشوونما بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔ ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کے لئے آزادانہ مساوی مواقع فراہم ہوں اور جہاں دولت و اقتدار انسانی قدروں اور روحانی تصور کے تابع ہوں اسی لئے ہم سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں
بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

ترتیب

باہتمام سنٹرل ایگزیکٹو، ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر طفیل احمد جمالی۔ سنٹرل پرنٹنگ پریس کراچی۔

اداریہ

یکم مارچ کو پاکستان کا دوسرا دستور نافذ ہوگیا۔ اس سے قوم کی زندگی میں جمہوریت کا ایک نیا باب وا ہوتا ہے۔ اہلِ پاکستان نے اس کا پُرجوش خیر مقدم کیا ہے۔

پاکستان کا نیا آئین ایک رسمی دستاویز یا ذہنی عشرت نہیں بلکہ ایک نیا تجربہ ہے جس کے بعض پہلو ندرت اور انفرادیت لئے ہوئے ہیں۔

یہ آئین آخری صحیفہ نہیں، تجربے کی روشنی میں ترمیم و تنسیخ کی ہمیشہ گنجائش رہتی ہے اور عوام کے نمائندے اس پر نظرِ ثانی کا اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن مثبت نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو جمہوریت کا یہ تحفہ قوم کے مزاج اور آرزوؤں سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آئے گا۔

دیکھا جائے تو پاکستان میں ساڑھے تین برس کے اندر اندر ایک فرد کا اپنے اختیارات ایک منتخبہ جماعت کو سپرد کر دینا ایک عجیب و غریب واقعہ ہے۔ کئی ممالک میں جہاں فوجی افسروں نے حکومتیں سنبھالیں ابھی تک دستوری زندگی پر سوچ بچار بھی شروع نہیں ہوا۔ انسانی نفسیات کی پیچ در پیچ تہوں میں طاقت عجیب عجیب گل کھلاتی ہے اور عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ ایک بار طاقت ہاتھ میں آجانے کے بعد کوئی فرد اسے کسی دوسرے فرد یا کسی ادارے کو نہیں بخشتا۔

اس پس منظر میں دستور کے ساتھ صدر ایوب کی شخصیت کس طرح ابھرتی ہے اس کا فیصلہ خود اہلِ نظر کر سکتے ہیں۔

ہماری ریاست ایک نصب العینی مملکت ہے اور اپنے گوناگوں عناصر کی وجہ سے مختلف تجربات سے گزر رہی ہے۔ ہم نے گیارہ برس برطانوی طرز کی جمہوریت کا تجربہ کیا جو ناکام ثابت ہوا۔ اب ہمارے یہاں تجربے کا رُخ بدلا ہے اور بنیادی جمہوریتوں کی اساس پر اپنی نوعیت کا ایک نیا نظام اختیار کر رہے ہیں جو ہمارے حالات سے زیادہ ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ کسی بھی نظام کی کامیابی میں دوسرے عوامل کے ساتھ ساتھ ان افراد کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جو اسے چلائیں۔ اب یہ ہمارے شہریوں پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کے افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کرتے ہیں۔

شاید یہ کہنا ضروری نہیں کہ ہر نظام ہر طرزِ حکومت ہر نصب العین کا مطمحِ نظر عوام کی خوش حالی اور فکر و نظر کی بلندی ہوتا ہے۔ ادیب چاہے کسی بھی نقطۂ نظر سے وابستہ ہو اپنے ملک اور اپنے عوام کی بھلائی سے کسی طور بے تعلق نہیں رہ سکتا۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے اب تک ہر مکتبِ خیال کے ادیبوں کا خیر مقدم کیا ہے اور شاید یہ ادیبوں کی اتنی بڑی واحد جماعت ہے جس نے صف بندی کو فروغ دینے کی بجائے اس کا تدارک کرنے کی کوشش کی ہے۔ آئین کے متعلق ہر دانشور کی اپنی رائے ہوگی۔ ہم اس سے زیادہ گزارش کرنا مناسب نہیں سمجھتے کہ مثبت نقطۂ نظر منفی سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

(مرکز) ۔

نصر من اللہ

الجزائر میں جنگ بندی کا اعلان پاکستانی ادیبوں اور دانشوروں کے اطمینان کا باعث ہے۔
الجزائری سورماؤں نے فرانسیسی استعمار پسندوں پر پہلی عظیم فتح حاصل کرلی ہے۔ اب انہیں او۔ اے۔
ایس اور دوسرے تخریبی عناصر کا سامنا کرنا ہے اور یقین ہے کہ وہ بہت جلد ان پر بھی قابو پالیں گے۔
ہم ایک آزاد مضبوط اور خوشحال الجزائر کے لئے دعاگو ہیں۔ الجزائر ملتِ اسلامیہ کا ایک مضبوط قلعہ ہے۔
افریشیائی برادری کا ایک طاقتور رکن ہے۔ اور وہ ہمیشہ عالمی تاریخ کا ایک درخشاں باب بن کر
چمکے گا۔

الجزائری حریت پسندوں نے اپنی انتھک اور صبر آزما جدوجہد اور بے مثال قربانیوں سے دنیا بھر کے استعمار پسندوں پر ثابت کر دیا ہے کہ ایٹم بم رکھنے کے باوجود کسی قوم کے حق خود اختیاری کو ہمیشہ کے لئے غصب نہیں کیا جا سکتا۔

ہم الجزائری شہیدوں اور سورماؤں کو خلوص اور عقیدت سے سلام پیش کرتے ہیں۔
اس موقع پر مناسب ہوگا کہ ہم اپنے کشمیری بھائیوں کی آزادی کے لئے بھی دعا کریں جو مدتوں پہلے سے برطانوی اور اب ہندوستانی سامراج کے شکار ہیں۔ آج کشمیر کا محل وقوع اور سیاسی حد بندی الجزائر جیسی خونیں جنگ کے لئے سازگار نہیں ہیں لیکن اس سے ان کے حق خود اختیاری کو ہمیشہ کے لئے غصب نہیں کیا جا سکتا۔ جیسے فرانس کو اپنی بے پناہ ایٹمی طاقت اور بے شمار وسائل کے باوجود اپنے ایک سو تیس برس کے غاصبانہ قبضے سے ہاتھ دھونے پڑے۔ اسی طرح ہندوستان کو کشمیر کی سرحدیں چھوڑنی پڑیں گی۔

آزادی سب کا بنیادی حق ہے

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

مژدۂ دستور

عزیز ہم وطنو! السلام علیکم

۱۔ آج جو باتیں میں آپ سے عرض کرنے والا ہوں ان کو آپ پوری توجہ سے سنیں، کیونکہ وہ آپ پر اور وطن کے مستقبل پر گہرا اثر رکھتی ہیں۔ میری گفتگو کا موضوع پاکستان کا نیا آئین ہے۔

۲۔ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو جب میں نے آپ سے ریڈیو پر خطاب کیا تھا تو میں نے آپ سے چند وعدے کئے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ان میں سے بہت سے وعدے پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ باقی وعدوں میں سب سے اہم وعدہ آئین سے متعلق ہے۔ اس سلسلے میں ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو میں نے یہ عرض کیا تھا۔

"میں صاف صاف اور غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ بالآخر ہمارا مقصد یہ ہے کہ جمہوریت کو بحال کیا جائے لیکن وہ جمہوریت اس طرز کی ہو۔ جسے ہمارے عوام سمجھ سکیں اور چلا سکیں۔ وقت آنے پر آپ کی بے لاگ رائے دریافت کی جائے گی۔ لیکن وہ وقت کب آئے گا۔ اس کا فیصلہ واقعات اور حالات پر منحصر ہے۔ اس دوران میں ہمیں ابتری کو دُور کرنا ہے اور ملک کے حالات کو استوار کرنا ہے۔"

۳۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں یہ اعلان کرنے کے قابل ہوں کہ ہمارا آئین تیار ہے۔ اور اب میں اسے نافذ کر رہا ہوں۔

۴۔ جن تجاویز کی بنیاد پر یہ آئین مرتب ہوا ہے ان کا مواد جمع کرنے اور اسے جانچنے پرکھنے میں بڑے غور و خوض اور محنت سے کام لیا گیا ہے۔

۱۷ فروری ۱۹۶۰ء کو پاکستان کا آئین کمیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہ کمیشن مختلف شعبوں سے چنے ہوئے نامور ماہرین پر مشتمل تھا اور اس کا کام مجھے یہ مشورہ دینا تھا کہ پاکستان میں کن کن طریقوں سے ایسی جمہوریت قائم کی جا سکتی ہے جو ——

(۱) انصاف، مساوات اور رواداری کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔

(۲) جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دے سکے۔

(۳) جو قومی اتحاد کو مستحکم کرے اور

(۴) ایک مضبوط اور پائیدار نظام حکومت قائم کرے۔

سوالنامے کے ۶۲۶۹ جوابات کو جانچنے اور ملک کے دونوں حصوں میں ۵۶۵ اشخاص سے مفصل گفت و شنید کرنے کے بعد کمیشن نے ۶ مئی ۱۹۶۱ کو اپنی رپورٹ مکمل کر کے پیش کر دی۔ اس کے بعد خود کابینہ نے اور کابینہ کی مقرر کی ہوئی چند کمیٹیوں نے اس رپورٹ کی ہر شق اور جزو پر مزید غور و خوض کیا۔ اپنی موجودہ شکل میں یہ آئینی فیصلے مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہیں۔ اور ماضی کی خامیوں، گزشتہ ساڑھے تین برس کے تجربات اور مستقبل کی ضروریات کی روشنی میں حتی الامکان بے لاگ مخلصانہ اور بالغ نظر جائزے کا نچوڑ ہیں۔

۵۔ میں ان سب اصحاب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس کی تکمیل میں میری مدد کی۔ اس سلسلے میں سابق چیف جسٹس مسٹر شہاب الدین جو آئین کمیشن کے صدر تھے، پیش پیش ہیں۔ انہوں نے نہایت اعلیٰ رپورٹ مرتب کی جو آئین کے لئے ایک اچھی بنیاد ثابت ہوئی۔ اس رپورٹ کو عنقریب شائع کیا جائے گا۔ میں مسٹر منظور قادر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے میرا ہاتھ بٹانے میں بڑی محنت اور کاوش سے کام لیا۔ مجھے بہت کم ایسے لوگ ملے ہیں جن میں ان دو اصحاب کی سی دیانتداری، خلوص اور حب الوطنی پائی جاتی ہے۔

۶۔ دستور کو ہم عام فہم انگریزی، بنگالی اور اردو میں کثیر تعداد میں چھاپ رہے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں اور سمجھیں۔ عوام سے اس کی حمایت کی توقع اسی صورت میں کی جاسکتی ہے جب کہ وہ اس کے مفہوم اور اسکی روح کو پوری طرح سمجھ لیں۔ مجھے امید ہے کہ رفتہ رفتہ آپ آئین کی چھپی ہوئی کاپیاں حاصل کر کے اس کا تفصیلی مطالعہ کریں گے اس وقت میں آپ کے سامنے آئین کے چیدہ چیدہ پہلو اور اس کا مختصر سا خاکہ پیش کروں گا ——

۱۔ ہمارا مقصد ایسے نمائندہ ادارے قائم کرنا ہے جو عوام کی رضا کے تابع ہوں۔ ان پر کون کون حکومت کرے۔ اور کس طریق سے حکومت کرے۔ اس کا آخری فیصلہ عوام کے ہاتھ میں ہوگا۔ دوسرے لفظوں میں عوام کو حق حاصل ہوگا کہ وہ اپنے حکمرانوں کا آزادانہ انتخاب کریں اور انہیں کرسی پر بٹھا بھی سکیں اور اٹھا بھی سکیں۔ یہ آئین کی بنیاد ہے۔

۲۔ حکومت کا سربراہ صدر ہوگا۔ مرکز میں ایک مرکزی مجلس قانون ساز ہوگی۔ دونوں صوبوں میں بھی نامزد گورنروں کی سربراہی میں ایک ایک صوبائی مجلس قانون ساز ہوگی۔ ان سب کی میعاد پانچ پانچ سال ہوگی۔

۳۔ صدر اور مندرجہ بالا اداروں کا انتخاب بنیادی جمہوریتوں کے منتخب ممبر کریں گے۔ بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کا انتخاب ملک کی اس تمام بالغ آبادی کے ذریعے ہوگا۔ جسے رائے دینے کا حق حاصل ہے۔

۴۔ عدلیہ اختیارات مرکز میں سپریم کورٹ اور دونوں صوبوں میں ایک ایک ہائی کورٹ کو حاصل ہوں گے۔

۵۔ جو امور قومی حیثیت رکھتے ہیں، ان کو ایک الگ فہرست میں درج کیا جائے گا اور ان کی ذمہ داری کلیتہً مرکز کے سپرد ہوگی، باقی سب امور صوبائی تحویل میں ہوں گے تاہم مرکز کو ایسے صوبائی امور کے متعلق بھی قانون بنانے کا اختیار ہوگا، ایسی ضرورت شاذ و نادر ہی پیش آئے گی۔ لیکن جب کبھی یہ ضرورت پیدا ہوئی تو قانون تو قومی اسمبلی بنائے گی لیکن ان پر عمل درآمد صوبوں ہی کے سپرد ہوگا۔ یہ فیصلہ اس اصول پر مبنی ہے کہ جو امور صوبائی سطح پر انجام پاسکتے ہیں وہ صوبوں ہی کے اختیار میں رہنے چاہئیں۔

۶۔ پالیسی کے اصول دستور میں شامل کئے گئے ہیں اور ان پر عمل درآمد کی ذمہ داری مملکت کے ہر ادارے اور فرد پر عائد ہوگی جو مملکت کی جانب سے کسی فرض یا کام پر مامور ہو یہ ذمہ داری فرائض کے تناسب سے عائد ہوگی۔ پالیسی

کے بعض اصول یہ ہیں۔

(i) مسلمانوں کو ایسے مواقع فراہم کرنا کہ وہ اسلام کی تعلیم کے مطابق اپنی زندگی بسر کرسکیں۔

(ii) اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

(iii) پس ماندہ علاقوں کی خوش حالی۔

(iv) پاکستان کے مختلف علاقوں کی متوازن ترقی۔

(v) دونوں صوبوں میں مساوات وتوازن۔

پالیسی کے یہ اصول کم وبیش وہی ہیں جو سابق دستور میں رہنما اصولوں کی حیثیت سے شامل تھے

۷۔ اصول قانون سازی کی اساس بنیادی شخصی حقوق پر ہوگی۔ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے کہ قانون ساز اس اصول کے پابند رہیں۔

۸۔ ملک کے مفاد میں یہ ضروری ہے کہ صدارت اور قانون ساز اداروں کے لئے صحیح قسم کے لوگ منتخب ہوں۔ اس لئے مملکت ہر امیدوار کو ووٹروں سے پورے طور پر متعارف کرانے اور ووٹروں کو امیدوار کی صلاحیت پرکھنے کی ہر ممکن سہولت بہم پہنچائے گی۔

۹۔ کسی سیاسی جماعت کے قیام کی اجازت نہ ہوگی۔ جب تک کہ قومی اسمبلی اپنے ایکٹ کے ذریعے اس کی اجازت نہ دے۔

۱۰۔ آئین کے تحت اسلامی نصب العین کے متعلق ایک مشاورتی کونسل قائم کی جائے گی۔ یہ کونسل ایسے اشخاص پر مشتمل ہوگی جو دینیات، تقاضوں، اقتصادیات، نظم ونسق وغیرہ میں ماہر ہوں۔ اسلامک ریسرچ سنٹر اس ادارے کی مدد کرے گا۔ اگر کسی مجوزہ قانون کے متعلق صدر یا اسمبلیوں کو کسی قسم کا شبہ ہو تو وہ اس کونسل سے مشورہ کریں گے تاکہ سب قوانین اسلام کے تقاضوں اور اصول قانون سازی کے مطابق ہوں۔ کونسل کے مشورے مخفی نہیں رکھے جائیں گے بلکہ ان کی عام اشاعت کی جائے گی۔

۱۱۔ دستور میں ترمیم اس صورت میں ہوسکتی ہے کہ قومی اسمبلی کے دو تہائی اراکین اور صدر متفق ہوں۔ ایوان کی تین چوتھائی اکثریت صدر کے ویٹو کو مسترد کرسکتی ہے بجز ان صورتوں کے کہ صدر معاملہ کو استصواب رائے عامہ کے لئے پیش کرے یا اسمبلی کو توڑ دے اور خود دوبارہ انتخاب لڑے۔

۱۲۔ یہ تو ہوا دستور کا مختصر خاکہ۔ اب میں مختلف اداروں پر علیحدہ علیحدہ تفصیل سے بات کروں گا۔

صدر

۱۳۔ صدر مسلمان ہوگا اور انتظامیہ کا سربراہ ہوگا۔ وہ اپنے فرائض منصبی میں مدد کے لئے وزیروں کا تقرر بھی کرے گا۔ اگر کوئی نامزد وزیر قانون ساز اسمبلی کا رکن بھی ہوا تو اسے ایوان کی رکنیت سے دستبردار ہونا پڑے گا۔ وزیروں کو ایوان کے اجلاس میں شرکت کا حق ہوگا لیکن انہیں ووٹ دینے کا حق نہ ہوگا۔ وزیروں کی معاونت کے لئے قومی اسمبلی کے اراکین میں سے پارلیمانی سکریٹریوں کا تقرر کیا جائے گا جو اس تقرر کے بعد بھی ایوان کے رکن رہیں گے۔

۱۴۔ اسمبلی کے پاس شدہ بلوں پر صدر کی منظوری لازمی ہوگی۔ اسمبلی کی دو تہائی اکثریت صدر کے ویٹو کو مسترد

کر سکے گی۔

۱۵۔ جب اسمبلی اجلاس میں نہ ہو تو صدر کو آرڈیننس جاری کرنے کا اختیار ہوگا۔ ایسے آرڈیننس کی میعاد چھ مہینے سے زیادہ نہ ہوگی اور چھ مہینے گزرنے پر ہر آرڈیننس کالعدم ہو جائے گا تاوقتیکہ اسمبلی اسے قانون کی حیثیت نہ دے دے۔

۱۶۔ صدر بعض صورتوں میں اسمبلی کو توڑ سکے گا۔ ایسی صورت میں اسے اپنے عہدے پر برقرار رہنے کے لئے اپنا انتخاب بھی دوبارہ کرانا پڑے گا۔

۱۷۔ اسمبلی کی تین چوتھائی اکثریت صدر پر بد اعمالی کے الزام میں مواخذہ کر سکتی ہے جسمانی یا دماغی معذوری کی صورت میں بھی اسے اسی طریقے سے عہدے سے ہٹایا جا سکتا ہے تاہم اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ تحریک کی روک تھام کے لئے یہ شرط رکھی گئی ہے کہ اگر تحریک کے محرک اپنی تائید میں ایوان کے نصف اراکین کی حمایت بھی حاصل نہ کر سکیں تو وہ ایوان کی رکنیت سے محروم ہو جائیں گے۔

۱۸۔ صدر کی ملک سے غیر حاضری یا عہدے سے برطرفی یا اچانک موت کی صورت میں قومی اسمبلی کا اسپیکر صدر کے فرائض سنبھالے گا۔ یہ روایت قائم کی جائے گی کہ اگر صدر مغربی پاکستان سے ہو تو اسپیکر مشرقی پاکستان سے ہو یا اس کے برعکس۔

۱۹۔ صدر۔ یکے بعد دیگرے صرف دو میعادوں کے لئے منتخب کیا جا سکے گا جب تک کہ اسے قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے اراکین اپنے مشترکہ اجلاس میں خاص طور پر تیسری دفعہ انتخاب لڑنے کی اجازت نہ دیں۔ ان ہی اداروں کو یہ بھی اختیار ہوگا کہ وہ صدارت کے سب امیدواروں کی جانچ پڑتال کریں اور معدودے چند امیدواروں کو انتخاب لڑنے کی اجازت دیں تاکہ صحیح قسم کا امیدوار ہی کامیاب ہو سکے۔

قومی اسمبلی

۲۰۔ قومی اسمبلی ۱۵۰ عام اراکین پر مشتمل ہوگی۔ ہر صوبے سے ۷۵۔۷۵ اراکین ہوں گے۔ ان کا انتخاب بنیادی جمہوریتوں کے اراکین کریں گے۔ اس کے علاوہ اسمبلی میں چھ نشستیں خاص طور پر عورتوں کے لئے ریزرو ہوں گی۔ یعنی ہر صوبے سے تین۔ ان خواتین کا انتخاب صوبائی اسمبلیاں کریں گی۔ یہ طریقہ اس لئے رکھا گیا ہے تاکہ خواتین کو وسیع انتخابی حلقوں کے دوروں کی زحمت سے بچایا جائے۔ اس کے علاوہ اگر خواتین چاہیں تو وہ عام نشستوں کے انتخابات بھی لڑ سکتی ہیں

۲۱۔ قومی اسمبلی قانون کا سرچشمہ ہوگی

۲۲۔ سابقہ منظور شدہ بجٹ میں کوئی تبدیلی صدر کی اجازت کے بغیر نہ ہو سکے گی اور کوئی نیا ٹیکس قومی اسمبلی کی رضامندی کے بغیر نہ لگایا جا سکے گا۔ دستور میں یہ انتظامات اس لئے رکھے گئے ہیں کہ صدر اور اسمبلی کے درمیان تصادم کے امکانات کم ہو جائیں۔ انتظامیہ میں تعطل نہ پیدا ہو۔ اور زیر عمل منصوبوں پر کام جاری رہے۔ اس فیصلہ کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نظم و نسق کی تمام ذمہ داری صدر پر ہے۔ اور اس سلسلے میں انجام کار وہی ملک کے سامنے جواب دہ ہے۔ چنانچہ بجٹ کا جو حصہ نظم و نسق سے متعلق ہے وہ صدر کے اختیار میں ہونا لازمی ہے۔ دوسری طرف نئے ٹیکس عوام کو ادا کرنے پڑیں گے۔ اس لئے نئے ٹیکسوں کا اختیار عوام کے نمائندوں یعنی قومی اسمبلی کو ملنا چاہیئے۔

۲۳۔ اسمبلی کے اراکین کی بد اعمالی کو روکنے کے لئے اسپیکر کو اختیار ہوگا کہ وہ ایسے معاملات کو تادیبی کارروائی کے لئے سپریم کورٹ کے سپرد کر دے۔

۲۴۔ ماضی میں ہمیں سیاسی جماعتوں کا تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ اگر آج انہیں پھر سے اُبھرنے کی اجازت دی جائے تو گمان غالب ہے کہ ان کا رویہ جوں کا توں رہے گا دوسرے یہ بھی ہے کہ قومی اسمبلی کے اختیارات سنبھالنے تک مارشل لا کا قیام ناگزیر ہے ان وجوہات کی بنا پر آئندہ انتخابات شخصی خوبی اور لیاقت پر لڑے جائیں گے شخصی خوبی کی کسوٹی یہ ہوگی کہ امیدوار پاکستان اور اس کے نصب العین پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں۔ اس کا ذاتی عمل و کردار اچھا ہے یا بُرا۔ کیا وہ پاکستان کی ترقی، اتحاد اور استحکام کی تنظیم و تعمیر میں پوری پوری مدد دے گا یا نہیں؛ کسی شخص کی قدر و قیمت پہچاننے کے لئے اس سے بہتر اور کیا معیار ہو سکتا ہے۔ کسی سیاسی جماعت کا منشور بھی اس سے زیادہ اور کیا معیار مقرر کر سکتا ہے؟

۲۵۔ ہمارے یہاں سیاسی جماعتوں کی سرگرمیاں عوام میں انتشار پھیلاتی، اور تفریق بڑھاتی ہیں۔ یہ انتشار ہمارے عوام کو خود غرض اور شورش انگیز لیڈروں کا آلہ کار بنا ڈالتا ہے اور وہ سیدھے سادے عوام کو بیدریغ لوٹتے کھسوٹتے ہیں۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم ملک کی سیاست کو پارٹیوں کے بغیر چلا سکیں، تو یہ چیز ہمارے لئے باعث رحمت ہوگی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ اسمبلیوں میں ہم خیال لوگ ضرور آپس میں متحد ہوں گے۔ لیکن اگر ان گروہوں کا جال اسمبلیوں سے نکل کر سارے ملک میں پھیل جائے تو یہ بات ضرور خطرناک ہوگی۔

بہر کیف اگر یہ تجربہ کسی وجہ سے ناکام ثابت ہوا، جس کی مجھے توقع نہیں، تو اس صورت میں جماعتی نظام کو قومی اسمبلی کی منظوری سے از سرِ نو قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ جماعتیں تعداد میں کم ہوں گی اور دوسرے یہ کہ اسمبلی کی نگرانی کی وجہ سے ان کے پروگرام قومی سطح پر معقول اور مفید ہوں گے۔

۲۶۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جماعتی نظام کے بغیر امیدواروں اور خاص طور پر صدارت کے امیدواروں کو عوام سے متعارف ہونے میں بڑی دقت پیش آئے گی۔ یہ واقعی ایک قابل غور مسئلہ ہے۔

کافی سوچ بچار کے بعد دستور میں یہ اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر امیدوار کو اپنے انتخابی ادارے (الیکٹورل کالج) کے سامنے پیش ہونے کی ہر سہولت مملکت کی طرف سے مہیا کی جائے۔

صوبائی گورنر

۲۷۔ گورنروں کا تقرر صدر کرے گا اور گورنر دستور کے مطابق صوبوں کے صحیح انتظام کے لئے صدر کے سامنے جواب دِہ ہوں گے۔ گورنر بھی صدر کی منظوری کے ساتھ اپنے وزیروں کا تقرر کریں گے۔ گورنر اور ان کے وزیروں کا صوبائی اسمبلیوں کے ساتھ وہی رشتہ ہوگا جو صدر اور اس کے وزیروں کا قومی اسمبلی کے ساتھ ہے۔ مرکز کی طرح صوبوں میں بھی پارلیمانی سکریٹریوں کا تقرر ہوا کرے گا۔ پارلیمانی سکریٹریوں کی تعداد کسی صورت میں مرکزی اور صوبائی محکموں کی تعداد سے زائد نہ ہوگی تاکہ اس اختیار سے بے جا فائدہ نہ اُٹھایا جا سکے۔

صوبائی اسمبلیاں

۲۸۔ ہر اسمبلی ۱۵۰ عام اراکین پر مشتمل ہوگی۔ مغربی پاکستان کی اسمبلی میں ۴۰ فی صد اراکین سابق پنجاب اور بہاولپور سے منتخب کئے جائیں گے، اور باقی ماندہ ۶۰ فی صد دوسرے علاقوں سے۔ یہ طریقہ دس سال یا دو پوری انتخابی مدتوں تک قائم رہے گا۔ اس کے علاوہ ہر اسمبلی میں پانچ خواتین رُکن ہوں گی۔ ان خواتین کا انتخاب ان کی اپنی اپنی صوبائی

اسمبلی کرائے گی۔

عدلیہ

۲۹۔ یہ ذمہ داری کہ کوئی قانون ایسا نہ وضع کیا جائے جو بنیادی شخصی حقوق کے منافی ہو قانون سازوں پر عائد کر دی گئی ہے۔ قانون سازوں کے لئے بچے تلے اُصول متعین کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان اصولوں کی پابندی ان پر لازمی قرار دے دی گئی ہے سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کوئی قانون اسلام کے منافی نہیں بنایا جا سکتا۔

دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر شہری کے ساتھ ہر معاملے میں یکساں برتاؤ کیا جائے گا۔ دستور میں قانون سازی کے لئے ایسے پندرہ اصول وضع کر دیئے گئے ہیں۔ اگر مرکز یا صوبائی اسمبلی کو یہ شک ہو کہ آیا کسی مجوزہ قانون کی کوئی شق اسلام کے یا کسی دوسرے اصول کے منافی ہے تو اس کے لئے یہ گنجائش رکھ دی گئی ہے کہ وہ اس معاملے میں اسلامی نصب العین کی مشاورتی کونسل سے مشورہ حاصل کر لے۔ یہ کونسل دستور کے تحت قائم کی جائے گی۔ ان تمام اقدامات سے یہ صورت پیدا کر دی گئی ہے کہ عدالتوں کا یہ کام ہوگا کہ وہ ہر قسم کی قانون شکنی کا نوٹس لیں اور اس کا انسداد کریں ہر اس شخص کو جس کے ساتھ قانون کے مطابق برتاؤ نہیں کیا گیا یا جس کے ساتھ قانون کے خلاف برتاؤ کیا گیا ہے قانونی چارہ جوئی کا حق حاصل ہوگا خواہ اس کی یہ شکایت کسی پرائیویٹ شخص کے خلاف ہو یا کسی سرکاری ملازم، ایجنسی یا محکمہ کے خلاف۔ کسی عدالت کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ کسی قانون کو اصول قانون سازی کے خلاف سمجھ کر اس پر عمل درآمد کرنے سے انکار کر دے کوئی قانون اصول قانون سازی کے خلاف ہے یا نہیں اس کا فیصلہ قانون سازوں کی رائے پر ہے کسی اور کی رائے پر نہیں۔

ان طریقوں سے بنیادی شخصی حقوق کی جس طرح حفاظت کی گئی ہے وہ پرانی روش کی پیچیدگیوں سے پاک ہے پہلے یہ ہوتا تھا کہ ہر قانون کے خلاف عدالت کی طرف رجوع ہو سکتا تھا چنانچہ اکثر قوانین ہمیشہ کشمکش و پیچ کی حالت میں معلق رہتے تھے اور کبھی عملی صورت اختیار نہ کر پاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ قانون کو چیلنج کرنے سے شہری حقوق کا تحفظ ہوتا ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو نتیجہ اس کے برعکس ہی نکلتا ہے۔ عام طور پر کسی قانون کو وہی لوگ چیلنج کرتے ہیں جنہیں ذاتی طور پر اس قانون سے کوئی تکلیف پہنچ رہی ہو اور وہ اچھے سے اچھے قانون دانوں کو بڑی بڑی فیسیں دے کر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکیں اس طریقہ میں یہ قباحت تھی کہ خواہ کوئی قانون ملک و معاشرے کے لئے کتنا ہی سود مند کیوں نہ ہو لیکن محض ذاتی مفاد کی خاطر اسے عدالت میں چیلنج کر کے معرض التوا میں ڈالا جا سکتا تھا۔ نئے آئین نے اس صورت حال سے نجات حاصل کر لی ہے۔ جو طریقہ کار اب اختیار کیا گیا ہے وہ وہی ہے جو انگلستان میں رائج ہے

۳۰۔ عدلیہ کے اندرونی نظم و ضبط کے لئے اس کے خود اپنے قواعد ہوں گے۔

سرکاری ملازمین کے حقوق

۳۱۔ سرکاری ملازمین کے حقوق کا باضابطہ تحفظ کیا گیا ہے۔ موقوفی، برطرفی، عہدے میں تخفیف، تنخواہ، پنشن اور ریٹائرمنٹ کی عمر کے معاملات ہائی کورٹ میں جا سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہائی کورٹ کا وہی اختیار ہوگا جو پہلے رٹ کا اختیار سماعت کہلاتا تھا۔ دوسرے معاملات مثلاً چھٹی، تبادلہ، ترقی وغیرہ میں فیصلے کا اختیار سرکاری

محکمہ کو ہوگا۔ سرکاری ملازم کو کم از کم ایک محکمانہ اپیل دائر کرنے کی اجازت ہوگی۔

۳۲۔ اداروں کی تفصیل ختم ہوئی۔ اب میں دستور کے چند خاص پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتا ہوں تاکہ یہ واضح کر سکوں کہ ہم نے ان کو کس کس وجہ سے اختیار کیا۔

۳۳۔ ہم نے صدارتی نظام اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس پر عمل کرنا آسان ہے۔ یہ ہماری تاریخ اور صلاحیتوں کے عین مطابق ہے اور اس سے ملک میں استحکام پیدا ہوگا۔ ہمارے ملک کے لئے استحکام ضروری اور انتشار زہر ہے دوسرا نظام پارلیمانی ہوسکتا تھا۔ اس کا تجربہ ہم کر چکے ہیں اور اس میں ناکام بھی ہو چکے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ پارلیمانی نظام بذاتِ خود کوئی بری چیز ہے۔ وقت یہ کہ ہم میں بعض ایسی تدلیسی باریکیاں موجود نہیں ہیں جو اس نظام کو کامیاب بناتی ہیں اسے کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کے کونے کونے میں دیہات تک جمہوری ادارے ہوں۔ ٹریڈ یونین ہوں، امداد باہمی کی جماعتیں ہوں۔ اور وہ بھی بڑے پیمانے پر تاکہ عوام میں رواداری کا جذبہ پیدا ہو اور مسائل پر بے لاگ غور کرنے کی صلاحیت اُبھرے۔ ساتھ ہی اعلیٰ تعلیم، خوش حالی، خدمت خلق کا جذبہ اور دیانت داری کی بھی اشد ضرورت ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ لوگوں میں تحمل مزاجی اور برداشت کا مادہ ہو جو بلادِ سرد ممالک کے لوگوں میں عام طور پر زیادہ پایا جاتا ہے۔ ایسے نظام کی تربیت کے لئے بھی کافی مدت درکار ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ کو اس منزل پر پہنچنے کے لئے چھ سو سال لگے۔ جس دوران میں انھوں نے کیا کیا غلطیاں نہ کیں اور کیا کیا مصیبتیں نہ جھیلیں۔ دنیا کے دیگر ممالک کی طرف نگاہ دوڑائیں تو معلوم ہوگا کہ صرف برطانیہ اور سکنڈے نیویا ہی میں پارلیمانی نظام کامیاب رہا ہے۔ باقی ممالک میں صحیح معنوں میں اس کا قیام نہ ہوسکا حتیٰ کہ فرانس بھی اسے چلانے میں ناکام رہا حالانکہ وہ حریت پسندی کا قدیمی علمبردار ہے گزشتہ ناکامیوں کے پیش نظر ہمیں فرسودہ باتوں میں نہ اُلجھنا چاہیئے اور نہ ہی اس خوش فہمی میں مبتلا رہنا چاہیئے کہ ہم اس منجھے ہوئے نظام کو چلانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جب تک ہمارے حالات غیر معمولی طور پر نہ بدلیں۔ اس وقت تک ایسا خیال حماقت کے مترادف ہے۔ پارلیمانی نظام میں وزیر اعظم کو ہمیشہ ایوان کی اکثریت کی حمایت حاصل ہونا ضروری ہے۔ اگر کسی ملک میں پارلیمانی روایات جڑ پکڑ لیں تو اگر ایوان کا کوئی رُکن اپنی حمایت کا حلف اُٹھانے کے بعد مکر جائے تو اُسے رائے عامہ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑتا ہے۔ ہمارے یہاں ایسا کوئی طریقہ نہیں جو اراکین کو اپنی حمایت بدلنے یا اپنی حمایت کی قیمت طلب کرنے سے باز رکھ سکے۔ اس طرح تمام نظام حکومت ہی تہ و بالا ہو جاتا ہے اور سارا زور اس بات پر صرف ہونے لگتا ہے کہ غیر وفادار یا باغی ممبروں کو ہر قیمت پر خوش رکھا جائے تاکہ ان کی حمایت کے بغیر حکومت کا تختہ اُلٹنے نہ پائے۔ اس سے بچنے کا صرف یہی طریقہ ہے کہ مملکت کے انتظامی سربراہ کو اس مسلسل کشمکش سے نجات دلائی جائے تاکہ وہ بلا خوف و خطر عوام کی بھلائی کے کاموں میں منہمک رہ سکے۔

۳۴۔ ہمارا بنیادی جمہوریتوں کا نظام غالباً اپنی مثال آپ ہے۔ اس کے قیام کی وجہ سے لوگوں میں خودداری، اُمید، امداد باہمی اور ذمہ داری کا جذبہ پیدا ہو رہا ہے۔ جمہوری معاشرے کی حقیقی بنیادیں دراصل اسی جذبے سے مضبوط ہوتی ہیں۔ ہمیں اس سسٹم کی ترتیب اور پرورش میں پوری پوری کوشش صرف کرنی چاہیئے، اس کے علاوہ بنیادی جمہوریتوں کے ممبر صدارت اور اسمبلیوں کے لئے انتخابی ادارے کے فرائض سرانجام دیں گے جس کا

ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ۔ دوسرے الفاظ میں عوام انتخابی ادارے کو منتخب کرتے ہیں اور انتخابی ادارہ قومی اور صوبائی اداروں کا انتخاب کرتا ہے ۔ اس کی وجہ بالکل سیدھی سادھی ہے ۔ یعنی ہم اس واضح حقیقت کو تسلیم کر رہے ہیں کہ انتخاب اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے ۔ بنیادی جمہوریتوں کے انتخابات نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ انشا اللہ عام انتخابات میں اس کا مزید ثبوت بھی مل جائے گا اس بات سے میرا یہ دعویٰ ہرگز نہیں کہ بعض ووٹر غلط کاری کا شکار نہیں ہوں گے ۔ لیکن انسانی معاملات میں سو فی صد صحیح نتائج کی توقع رکھنا حقائق کے منافی ہے ۔ خاص کر ایسے معاشرے میں جو ابھی پوری طرح بالغ نظری کی منزلیں طے نہیں کر چکا ۔ بہر حال بالراست انتخابات کی نسبت اس طریقے میں لوگوں کو بہکانے پھسلانے کے امکانات بہت کم ہوں گے ۔ بالراست انتخابات میں تو یہ حال تھا کہ لوگ بھیڑوں کی طرح ووٹ ڈالنے کے لئے ہانکے جاتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ بالراست انتخابات بالراست تو ہرگز نہ تھے باقی جو ہوں سو ہوں ۔ ان میں ہوتا یہ تھا کہ دو چار موٹی موٹی اسامیوں کو پھانس لیا جاتا تھا اور وہ دوسروں کو بھیڑ چال کی طرح اپنے پیچھے لگا لیتے تھے ۔

جو طریقہ میں نے تجویز کیا ہے اس میں نہ تو ایسا ہو سکتا ہے اور نہ ہی ایسا ہونے دیا جائے گا کیونکہ ان ووٹروں میں سے ہر ووٹر اپنے حلقے میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے ۔ بالواسطہ طریقۂ انتخاب اختیار کرنے کی دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اگر ہم ہر بالغ کو براہ راست ووٹ ڈالنے کا حق دے دیتے تو انتخابات کو ایک دو سال تک ملتوی کرنا پڑتا کیونکہ موجودہ انتخابی فہرستیں کئی سال پرانی ہیں اور نئی فہرستیں تیار کرنے میں وقت لگتا ۔ اسکے علاوہ بالراست طریقہ انتخاب پر بہت خرچ اُٹھتا ہے ۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں عام انتخاب پر تقریباً چھ کروڑ روپے خرچ ہونے والے تھے ۔ کیا ہمارا ملک اس قدر فضول خرچی کا متحمل ہو سکتا ہے ؟

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ کچھ اہل دانش اور چند مخصوص مفادات کے طبقے اس طریقہ انتخاب میں شکایت کے بعض پہلو نکال لیں گے لیکن کوئی وجہ نہیں کہ ضرورت پڑنے پر آئندہ ایک ایسا فارمولا نہ بن سکے جس کی رُو سے انہیں بھی پورا پورا احساس شمولیت ہو سکے ۔

بہر حال آج کی سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ آئین جلد از جلد نافذ کر دیا جائے ۔ اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ موجودہ بنیادی جمہوریتوں کو ہی حلقۂ انتخاب رکھا جائے ۔ فی الحال اگر طریقۂ انتخاب میں کسی قسم کی تبدیلی کی گئی تو وہ آئین کے نفاذ میں غیر ضروری تاخیر کا باعث ہوگی ۔ اور آئین کے نفاذ میں تاخیر کسی طرح مناسب نہیں ۔

اس موقع پر میں یہ بھی عرض کر دوں کہ آئندہ بنیادی جمہوریتوں —— - - - - ——— میں کوئی نامزدگی نہیں ہوگی ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی تعداد اسی ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ بیس ہزار ہو جائے گی ۔ بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اس تعداد میں مزید اضافہ کرنے کا فیصلہ بھی ہو جائے ۔

۳۵ ۔ انتظامیہ اور قانون ساز اسمبلی کے درمیان جس بات پر اکثر اختلاف اور جھگڑا ہوا کرتا ہے وہ بجٹ کا مسئلہ ہے یہ کشمکش نظم و نسق اور ترقیاتی منصوبوں پر بہت بُرا اثر ڈالتی ہے ۔ اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے آئین میں بجٹ کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا ہے ۔ سابقہ منظور شدہ بجٹ پر صدر کا کلی اختیار ہے ۔ کیونکہ اس کے بغیر نظم و نسق کا برقرار رہنا محال ہے نئے ٹیکسوں پر قومی اسمبلی کا مکمل اختیار ہے ۔ یہ ایک نیا فارمولا ہے اور کچھ عجب نہیں کہ پارلیمانی زندگی میں یہ

طریقہ شاید پہلی بار آزمایا جا رہا ہو۔

۳۶۔ یوں تو یہ سب کی خواہش ہوتی ہے کہ الیکشنوں میں اچھے لوگ کامیاب ہوں لیکن سچ تو یہ ہے کہ اچھے لوگوں کو اُبھارنے اور ان کی مدد کرنے کے لئے معاشرہ کبھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھاتا۔ نئے آئین میں امیدواروں کو رائے دہندوں سے متعارف کرانے کی ذمہ داری مملکت کو سونپی گئی ہے۔ اس سے آگے ووٹروں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ جس کو چاہیں اپنا ووٹ دیں۔

۳۷۔ صدارتی نظام میں سب سے زیادہ دارومدار اس بات پر ہے کہ صدر کے عہدے کے لئے صحیح آدمی چُنا جائے۔ چنانچہ قوم کو لازمی طور پر یہ احتیاط برتنی چاہیئے کہ صرف مناسب قسم کے امیدواروں کو صدارتی انتخاب لڑنے کی اجازت دی جائے۔ ہمارے ہاں قومی اور صوبائی اسمبلیوں کا ایک مشترکہ اجلاس امیدواروں کی جانچ پڑتال کرے گا۔ عام طور پر تین امیدواروں کو صدارتی انتخاب لڑنے کی اجازت دی جائے گی۔ البتہ اگر برسر اقتدار صدر بھی دوبارہ انتخاب لڑنے کا قانونی طور پر مجاز ہو اور خواہش مند بھی ہو تو اس صورت میں صدارتی امیدواروں کی تعداد چار ہوگی۔

۳۸۔ پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ جس نصب العین پر ہماری قومیت کا انحصار ہے وہ اسلام ہے۔ چنانچہ ہماری قدرتی کوشش اور خواہش بھی ہونی چاہیئے کہ ہم اپنی مادی ترقی کو اسلام کی اخلاقی اور روحانی قدروں کے زیر سایہ پروان چڑھائیں۔ یہ ایک یا دو روز کا کام نہیں بلکہ ایک مسلسل ارتقائی عمل ہے جس کا زندگی کے ہر گوشے سے تعلق ہے چنانچہ آئین کے تحت اسلامی نظریات اور نصب العین کے متعلق ایک مجلس مشاورت قائم کی جائے گی۔ یہ مجلس مختلف شعبہ ہائے زندگی کے ذی علم مشاہیر پر مشتمل ہوگی اور اس کی مدد کے لئے علمی و مذہبی ریسرچ کے نامور ماہر مقرر کئے جائیں گے۔ صدر اور اسمبلیوں پر یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ قانون سازی کے وقت وہ اس مجلس کا مشورہ حاصل کریں کہ زیر تجویز قوانین کو کس طرح اسلامی رنگ اور رجحان دیا جا سکتا ہے۔ ہمارے نئے نظام تعلیم میں دینیات کو آٹھویں جماعت تک لازمی قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی تعلیمی اداروں میں عموماً اور اوقاف کے اداروں میں خصوصاً مروجہ سلسلۂ تعلیم کو متوازن کرنے کے لئے اس پر مناسب نظر ثانی کی جا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان سب اقدامات کی بدولت ہم رفتہ رفتہ خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی دینی شاہراہ پر گامزن ہو کر منزل مقصود تک جا پہنچیں گے۔

۳۹۔ دستور میں ترمیم کے طریقوں پر ذرا غور کیجئے۔

اس اسکیم میں آئین کے مختلف حصوں کی اہمیت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر صدر اور قومی اسمبلی دو تہائی اکثریت کے ساتھ متفق نہ ہوں تو ترمیم دشوار تر ہو جاتی ہے۔ یہ اس لئے کیا گیا ہے کہ بغیر سوچے سمجھے جلد بازی کیساتھ آئین میں رد و بدل نہ کیا جائے۔ آئین کی ہیئت ترکیبی میں بڑی بڑی تبدیلیوں کی صورت میں تو استصواب رائے عامہ تک ضروری ہو جائے گا۔

دستور کے متعلق میری اپنی رائے یہ ہے کہ نہ تو اس کا بدلنا زیادہ آسان ہو اور نہ ناممکن حد تک مشکل۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے استحکام اور بتدریج ترقی ممکن۔ اور جس سے آئے دن کے انقلابی خدشات کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

ہمارا معاشرہ بڑی محنت سے تعلیم کی توسیع کر رہا ہے۔ صنعتیں قائم کر رہا ہے، جدید طریقوں کو اپنا رہا ہے اور روز افزوں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میری رائے میں ایسے معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دستور پر ہر بیس سال بعد نظر ثانی کرے تاکہ وہ معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں سے ہم آہنگ رہے۔ آنے والی نسلوں کے

لئے میرا یہی مشورہ ہے فی الحال یہ دستور پورے کا پورا ہی نافذ ہو سکتا ہے اگر اس کی بنیادی باتوں میں اساسی تبدیلیاں کرنے کی کوشش کی گئی تو ساری عمارت زمین پر آ رہے گی۔ یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے۔

۴۰۔ یہ آئین اپنے اداروں سے تعمیری نتائج کی توقع رکھتا ہے۔ ان اداروں کو وجود میں لانے کے بعد آئین کا حق ہے کہ وہ ان سے توقع رکھے کہ وہ قانونی حدود میں آزادانہ کام کریں گے اور ملک و قوم کے لئے اچھے نتائج پیدا کریں گے۔ آئین کے اندر ایسی تنظیمی صلاحیتیں بھی رکھی گئی ہیں۔ جو قانون کے ناجائز استعمال، دھاندلیوں، چیرہ دستیوں اور تعطل کو روک سکیں۔ مقصد یہ ہے کہ آئین نیکی کی حمایت میں آزاد اور بدی کی رکاوٹ میں بے باک ہو۔ اس آئین میں جمہوریت اور نظم و ضبط کا ایسا امتزاج ہے۔ جو حکومتی استحکام اور اعلیٰ نظم و نسق کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔

۴۱۔ مختصر طور پر یہ ہے وہ فلسفہ جو آئین کے بنیادی پہلوؤں کی رُوح رواں ہے۔ مجھے عرصہ دراز تک ملک کے نظم و نسق کی بلند ترین سطحوں کے ساتھ گہرا واسطہ رہا ہے۔ مجھے اپنے وطن کے چپے چپے اور عوام کے ہر طبقے سے واقف ہونے کے بہت سے تفصیلی مواقع میسر آئے ہیں۔ میں نے اپنے ملک اور بیرونی دنیا کے واقعات اور مسائل کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ اور ان پر گہرا غور و خوض کیا ہے۔ میرے سینے میں یہ آرزو تڑپتی رہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح قوم کو ایسی شاہراہ پر گامزن کیا جائے جس سے وطن کا سر بلند ہو اور پاکستان ایک سلجھا ہوا، مضبوط اور ترقی پسند ملک بن جائے۔ یہ آئین اسی سوچ بچار، اسی اضطراب، اسی تڑپ کا نتیجہ ہے اور میں اسے بڑی انکساری کے ساتھ قوم کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ مجھے اس آئین کے ایک ایک لفظ پر مکمل یقین اور اعتماد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس آئین کو صحیح طور پر چلا کر ہمارا ملک اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ میں انتہائی خلوص سے یہ آئین آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

میری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کاملہ سے ہمیں اس آئین کو سچائی اور وفاداری سے چلانے کی بصیرت، فراست، ہمت اور توفیق عطا فرمائے تاکہ ہمارے حالات بہتر ہوں۔ ہماری آئندہ نسلوں کے حالات بہتر ہوں۔ اور خاص طور پر دنیا کی نظر میں ان لوگوں کا ایمان اور عقیدہ سرخرُو ہو۔ جنہوں نے پاکستان کے نصب العین کو اپنایا۔ اور قائداعظم محمد علی جناح کی رہنمائی میں سرتوڑ جدّ و جہد اور بے انتہا مصائب کے بعد اپنا پیارا وطن حاصل کیا۔ آمین

پاکستان پائندہ باد

پروفیسر احمد عبد اللہ المسدوسی
استاد قانون۔ اُردو کالج — کراچی

نئے آئین کی چند اہم خصوصیات

پاکستان کے نئے دستور کا خاکہ جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں صاحب صدر مملکت پاکستان کی نشری تقریر کے ذریعہ معلوم کر کے ہر پاکستانی جو دستور کے لئے چشم براہ تھا اطمینان اور مسرت کے ملے جلے جذبات اپنے اندر موجزن پاتا ہے اور یہ محسوس کرتا ہے کہ ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے انقلاب کے موقع پر جمہوریت کی بحالی کا جو وعدہ انھوں نے فرمایا تھا اس کو پورا کیا گیا۔

ان کی تاریخی تقریر میں دستور کا جو خلاصہ پیش کیا گیا اس کو پڑھنے سے دو نمایاں حقائق سامنے آتے ہیں۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ نئے دستور میں پچھلے دستور کی وہ تمام خصوصیات اور خوبیاں موجود ہیں جو کسی جمہوری دستور کی نمایاں علامات سمجھی جاتی ہیں اور دوسری یہ کہ اچھے اور کامیاب دستور کی تمام پسندیدہ خصوصیات کو باقی رکھتے ہوئے اس میں ایسے چند اضافے بھی موجود ہیں جو کسی اچھے اور کامیاب دستور کے مخالف نہیں بلکہ دستور کو زیادہ مفید و مستحکم اور ملت پاکستان کے حالات کے لئے زیادہ سازگار بناتے ہیں۔

آئیے ان دونوں خصوصیات کا کسی قدر وضاحت سے جائزہ لیں۔

جہاں تک پچھلے دستور کی خوبیوں کی بحالی کا تعلق ہے وہ موجودہ دستور کے حسب ذیل پہلوؤں سے ظاہر و ثابت ہے۔

(۱) دستور میں جو نمائندہ ادارے بنائے گئے ہیں وہ عوام کی مرضی پر مبنی ہیں چنانچہ مرکزی و قومی اسمبلی اور دونوں بازوؤں کی صوبائی اسمبلیاں کافی منتخب ہوں گی۔

(۲) مرکزی حکومت کا صدر بھی منتخب ہوگا جس کی مدت عہدہ پانچ سال ہوگی۔

(۳) ان قومی اور صوبائی اسمبلیوں اور صدر کو منتخب ارکان چنیں گے جو براہ راست عوام کے منتخب شدہ ہوں گے۔

(۴) عوام کے بنیادی حقوق کا بھی سابق کی طرح اس دستور میں تحفظ کیا گیا ہے جن کے منجملہ پہلا یہ اصول ہے کہ کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو دوسرا یہ کہ تمام معاملات میں تمام شہریوں سے مساوات برتی جائے گی۔

(۵) مملکت کے ہدایتی اصولوں کا بھی اصول پالیسی کے تحت دستور میں تحفظ کیا گیا ہے جنہیں مسلمانوں کے لئے اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے اور اقلیتوں کے حقوق کی مدات سرفہرست ہیں۔

(۶) صدارت اور مقننہ کی رکنیت کے سلسلے میں رائے دہندوں کے سامنے امیدواروں کے پیش ہونے کے بارے میں سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔

(۷) عوام کے منتخب نمائندوں کو قانون بنانے کا حق اس حد تک بحال ہے کہ صدر مملکت بھی اس کے احترام کا پابند ہے نیز عوام کے منتخب نمائندوں کو یہ حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے محصول عائد کریں۔

(۹) اسمبلیوں کے برخواست کے زمانے میں ناگہانی ضروریات

صدر صرف چھ ماہ کے لئے آرڈیننس جاری کرے گا جس کے لئے اسمبلی کی منظوری ضروری ہوگی ورنہ یہ منسوخ ہو جائے گا۔

(۱۰) عوام کے منتخب نمائندوں کے قطعی اختیارات کی اس حد تک نگہداشت کی گئی ہے کہ وہ دو تہائی تعداد سے دستور کے احکام میں بھی ترمیم کر سکتے ہیں بشرطیکہ صدر بھی متفق ہو ورنہ تین چوتھائی تعداد ضروری ہوگی ایسی صورت میں صدر پابند ہوگا الا اس کے کہ صدر اپنی دانست میں اس معاملہ کو عوام کے مفاد میں اتنا اہم سمجھے کہ عوام سے استصواب کروائے یا پھر اسمبلی کو توڑ کر اسی مسئلہ پر دوبارہ منتخب ہو یہ درحقیقت عوام کے اصلی اور بنیادی حق کا واضح طور پر تسلیمی اعتراف ہے کیونکہ اگر دوبارہ اسی اختلافی مسئلہ کی نتیجے پر وہ منتخب ہو جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اصلی حاکم (رائے دہندگان) صدر کی رائے کو پسند کرتے ہیں اور یہ فیصلہ دونوں میں قطعی ہے اور اگر صدر دوبارہ منتخب نہ ہو سکے تو پھر رائے دہندگان کے فیصلے کے مدنظر ان کی رائے غالب ہوگی الغرض اس تجویز کے ذریعہ عوام کے اصلی اقتدار اعلیٰ کا صاف اور واضح اعلان و اقرار ہے۔ اسکی ضمنی مصلحت یہ بھی ہے کہ دستور میں ترمیم کو آسان اور روزمرہ کا مشغلہ بھی نہ بنایا جائے کیونکہ کسی جمہوری اور تحریری دستور میں آئے دن کی تبدیلیاں دستور کے احترام، ملک کے استحکام، مملکت کی ترقی اور اندرون و بیرون ملک وقار کے منافی ہوتی ہے اس لئے اس کو کسی قدر دشوار بنایا گیا لیکن بالکل جامد اور ناقابل تغیر و تبدیل بھی نہیں بنایا گیا درمیانی راہ اختیار کی گئی ہے تاکہ دستور کے لچکدار اور مستحکم پہلوؤں میں ایک قسم کا مفید اور خوشگوار امتزاج ہو۔

(۱۱) کسی شخص کے حق میں کوئی شخص یا حکومت کا کوئی چھوٹا بڑا کارندہ یا عہدہ دار قانون شکنی نہ کرے اس غرض کے لئے دستور میں اس کا بندوبست ہے کہ عدالتیں اس کا تدارک کریں گی اسی طرح خلاف قانون سلوک کی صورت میں عوام کو عدالت سے مدد لینے کا حق حاصل ہوگا۔

(۱۲) قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی سابقہ دستور کی طرح خواتین کے لئے نشستیں مخصوص ہوں گی ان کے علاوہ وہ عام نشستوں میں بھی قسمت آزمائی کر سکیں گی۔

(۱۳) چونکہ پاکستان ایک طویل اور تاریخی جدوجہد اور عظیم الشان قربانیوں کے بعد برصغیر ہند و پاک کے مسلمانوں نے اس غرض سے حاصل کیا تھا کہ وہ اس میں اسلام کے اعلیٰ اصولوں کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل کا اہتمام کر سکیں اس لئے اس مملکت کے دستور کی اساس سیکولر نہیں بلکہ آئیڈیالوجیکل ہونی چاہئے اس مقصد کو دستور میں منتقل کرنے کے لئے سابقہ دستور میں جن اصولوں کی پابندی کی گئی تھی وہ اس دستور میں بھی موجود ہیں مثلاً صدر مملکت مسلمان ہوگا۔ مسلمانوں کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے کوئی ایسا قانون نہ بنایا جائے گا جو اسلام کے خلاف ہو اور اگر مرکزی یا صوبائی مقننہ کو اس بارے میں کوئی شبہ ہو کہ کسی مجوزہ قانون کا کوئی اصول اسلام کے خلاف ہے تو وہ "اسلامی آئیڈیالوجی کی مشاورتی کونسل" کا مشورہ طلب کرے گی اور اس مشورے کو مؤثر اور نتیجہ خیز بنانے کے لیے یہ بھی پابندی رکھی گئی ہے کہ اس کو مخفی نہ رکھا جائے گا بلکہ عام کیا جائے گا۔

(۱۴) مملکت کا دستور سابق کی طرح وفاقی ہوگا اور سابق کی طرح اس کے اجزائے وفاق صرف دو یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان ہونگے۔

(۱۵) دونوں وفاقی اجزا کی سابق کی طرح نمائندگی برابر ہوگی اس طرح نمائندگی کے اس خاردار اور نازک مسئلہ کے حل کیلئے سابق میں طویل عرصہ کی بحث و تمحیص کے بعد جو متفقہ فارمولا بنایا گیا تھا اس کو برقرار رکھا گیا ہے۔

(۱۶) مرکز اور صوبجات میں سابق کی طرح یک ایوانی مقننہ رکھی گئیں اور ان کے اعلیٰ ترین حاکم حسب سابق گورنر مقرر کئے گئے۔

(۱۷) اسی طرح مغربی پاکستان میں سابقہ دستور کی طرح دس سال کے لئے سابقہ صوبجات (سندھ، سرحد وغیرہ) میں صوبائی اسمبلی کے ارکان کی تقسیم کی گئی چنانچہ سابق پنجاب و بہاولپور کو ۴۰ فیصد اور بقیہ کو ۶۰ فی صد یہ اصول بھی مغربی پاکستان کو ایک بنانے کے سلسلے میں چونکہ بڑے غور و خوض اور باہمی مفاہمت سے طے پایا

تھا اور مشرقی و مغربی پاکستان کی مساوات کی بنا تھا اس لئے اس کو بھی علی حالہٖ برقرار رکھا گیا۔

مذکورۂ بالا وہ چند دستوری احکام ہیں جو سابقہ دستور کی طرح موجودہ دستور میں بھی پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ عدلیہ اور انتظامیہ سے متعلق تفصیلی احکام بھی ہیں جن میں کوئی بنیادی اور اہم تبدیلی نہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ دستور میں کشادہ دلی اور وسیع النظری سے کام لیا گیا ہے اور حتی الامکان پچھلے تجربات اور پیشروں کی محنت اور بصیرت و تدبر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا گیا ہے اس طرح نئے دستور کا بڑا حصہ پرانے دستور کے آزمودہ اصولوں پر مبنی ہے لیکن چند چیزیں ایسی بھی ہیں جو اس دستور میں جدید اضافے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ دستور محض سابقہ دستور کی نقالی نہیں بلکہ اصولوں کی خوبی اور افادیت پر مبنی ہے۔

اب آگے ہم جدید اضافوں اور تبدیلیوں کا اجمالی تذکرہ کرینگے

مفید اضافے

پہلی نمایاں تبدیلی وزارتی کابینہ کو ترک کرکے اس کے بجائے وہ طریقہ حکومت اختیار کرنا ہے جس کو دستوری زبان میں صدارتی حکومت کہا جاتا ہے جس میں صدر اپنے وزراء خود منتخب کرتا ہے جو اس کے روبرو جوابدہ ہوں اور جس کا رکن اسمبلی ہونا ضروری نہیں اور اگر رکن اسمبلی ہو تو اس سے دست برداری ضروری ہے جس کے بعد وہ اسمبلی میں بغیر رائے کے شریک ہو سکتے ہیں۔ اگر اس اصطلاحی تعریف کو نظر انداز کیا جائے تو جہاں تک سابقہ دستور کا تعلق ہے اس میں بھی اعلیٰ ترین عہدہ صدارتی تھا البتہ صدر مملکت کابینی اصول کے تحت اسمبلی کی غالب پارٹی کے قائد یا اکثریت کے اعتماد کے حامل رکن کو حکومت کی باگ ڈور حوالے کرتا اور اس سے اپنے رفیق وزراء کو منتخب کرنے کو کہتا صدارتی طرز حکومت میں یہ دونوں طریقے رائج ہیں امریکہ میں پہلا طریقہ اور فرانس میں دوسرا ان میں سے کوئی طریقہ بھی فی نفسہ جمہوریت کا لازمی معیار نہیں لیکن نتائج کے لحاظ سے پہلا جمہوری روح سے زیادہ قریب ہے کیونکہ دستوری اور سیاسی تاریخ کا طالب علم بھی اس کو جانتا ہے کہ فرانس اور امریکہ میں سے جو مغربی جمہوریت کے دو بڑے

گھوارے ہیں امریکہ کو مغربی جمہوریت کے تصور کے تحت پائیدار اور کامیاب سمجھا جاتا ہے ہماری زبان کے ایک خوش مذاق ادیب کے مشہور الفاظ میں فرانسیسی صدر کی کابینہ "گول خانے میں چوکھٹی چیز" کے مصداق ہے واقعہ تو یہ ہے کہ کابینی نظام عوام اور موروثی بادشاہ کے باہمی متصادم حقوق میں سمجھوتے کی ایک صورت تھی تاکہ بادشاہ کے مقابلے میں عوام کے حقوق کا تحفظ ہو جن کی پاسبانی منتخبہ ارکان پارلیمان کی غالب پارٹی کا لیڈر کیا کرتا تھا لیکن جہاں بادشاہت نہ ہو۔ جمہوریہ غیر ضروری اور بے موقع ہے اس لئے ناکام ہوا مثلاً فرانس کی جمہوریت کی قبائے زریں میں جب کابینہ کی ٹاٹ کا پیوند لگا تو پھر اس جمہوریہ کو عیب لگا اور وہ ناکام ہوا جو فرانس کے مسلسل بحران، فرانس کی وزارتوں کی آئے دن کی تبدیلی اور اس کے بین الاقوامی وقار کی مجروحی سے ظاہر و ثابت ہے دراصل صدارتی طرز میں کابینی اصول کا یہ اَنمل اور بے جوڑ پیوند تھا لیکن ہمارے پرانے سیاستدانوں کی مشکل یہ تھی کہ وہ انگریز کی غلامی کے طویل دور کے اثرات سے اپنے ذہن اور فکر کو آزاد نہ کر سکے اور برطانوی کابینی اصول کی کامیابی کو ایک ایسی مملکت (پاکستان) پر تھوپنے کی سعی ناکام کرتے رہے جو بادشاہت نہیں بلکہ جمہوریہ ہے اور اسی جمہوریہ کے اطراف پورا دستور گھومتا ہے اور جس میں کابینی طرز حکومت کو چلانے کی کوشش پہلے درجہ کی بے بصری ہے انقلابی حکومت سے پہلے کے دور کی افراتفری میں اس کابینی نظام کا سب سے بڑا حصہ رہا ہے جس کے ماتحت پیشہ ور سیاستداں روز پارٹی تبدیل کرتے اور نئی وزارتوں کے انعامات اور غنائم میں اپنا حصہ لگا تے تھے یہ صرف پاکستان کی مصیبت ہی نہیں کہ دستور ناکام ہوا بلکہ سارے مشرقی اور اسلامی ممالک کا یہی حال ہے چاہے مصر ہو کہ عراق، ترکی ہو کہ انڈونیشیا الغرض ہم مانگے تانگے یا کرائے کے ذہن سے غور نہ کریں، برطانوی دستور سے اپنی طویل وابستگی کا شکار نہ ہوں اصولوں کی افادیت کو پرکھیں اور سب سے زیادہ اہم رہنما اصول کی روشنی میں دیکھیں جو ہماری اپنی تاریخ ہماری روایات، ہمارے دستوری تصورات اور ہماری ملت کا اجتماعی مزاج ہے تو ہمیں صاف

[illegible] سے چھٹکارا حاصل کرنا ہر نوع ضروری [illegible] کی تعریف اور ہمارے قومی انا کے فروغ [illegible] ہے۔

کیا یہ واقعہ نہیں کہ مسلمانوں کا اولین طرز حکومت (خلافت راشدہ) جمہوری اور صدارتی تھا (خلافت) صدر مملکت اسلامیہ کی [illegible] اور مقامی نوعیت ہی تھی کیا اس طریقہ حکومت میں کابینی سسٹم کا کہیں وجود نہ تھا۔ اس نظام اور وزارت عظمیٰ کی بدعت عہد عباسیہ میں شروع ہوئی جو خالص عجمی اور آریائی طرز حکومت کی پیداوار تھی اور خلافت عباسیہ بغداد اور مسلمانوں کی تباہی میں اس وزارت عظمیٰ کے کارنامے مخفی نہیں سابقہ اموی دور نے جو اور طرح خلافت راشدہ کی اعلیٰ روایات کا نمونہ نہ تھی اس وزارت عظمیٰ اور کابینی نظام کو کبھی انگیز نہیں کیا اس لئے وہ مسلم اقتدار کے لحاظ سے فی الجملہ بعد کے ادوار سے فائق ہے یہ وہ کھلی حقیقت ہے جس کی طرف ہمارے دور کے سب سے زیادہ جہاندیدہ اور واقف دستور (سر آغا خاں مرحوم) نے کراچی ہی میں برملا اشارہ کیا تھا اور پاکستان کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بنی امیہ کو اپنا نمونہ بنائیں کیا اس ذہین اور زیرک فرزند اسلام کا منشا امویوں کے نظام حکمرانی کی اسی خصوصیت کی طرف متوجہ کرنا نہیں تھا کہ وزارت عظمیٰ اور کابینی نظام کا وہ شرمندۂ احسان نہ تھا اس بات پر ہم جتنا غور کریں اچھا ہے الغرض یہ بات صاف ہے کہ یورپی اور مغربی [illegible] انگریزی بولنے والی اقوام میں جو تاج برطانیہ کے مقبوضات میں رہتی ہیں یہ مفید ہو سکتا ہے لیکن اس خاص ماحول سے باہر ہرگز نہیں۔ مشرق میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جہاں اس کی کامیابی پر آج تک [illegible] اس کو قطعی ثبوت نہ جا سکے خود ہندوستان میں اگر یہ کابینی سسٹم کامیاب ہوگا جو مشتبہ ہے تو اس کی وجوہ اور ہوں گی [illegible] برطانوی اور ہندوستانی قوم کا آریائی ہونا، ایک ہی قسم کی روایات اور قومی مزاج کا خوگر ہونا، برہمنوں کے اقتدار کا اس کے ذریعہ تحفظ اس لئے کابینی نظام کو دستور میں حرف آخر سمجھنا تدبر کا دیوالیہ پن ہے اچھا ہوا کہ جلد ہم کو اس سے نجات ملی لیکن پھر بھی اگر کوئی شخص اس کو ناگزیر اور مفید سمجھتا ہے تو یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر اس کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے اور اس اصول کو آزمانا چاہئے تاکہ تجربہ کے بعد اس کے متعلق وہ اعتماد سے کوئی بات کہے اور وہ موثر ہو تاکہ مقننہ کے ارکان اس کو اختیار کرنے میں اپنے اس دستوری اختیار کو استعمال کر سکیں جو اس دستور میں انہیں دیا گیا ہے۔

اس دستور کا دوسرا مفید اقدام اجزائے وفاق اور مرکز کے اختیارات کا مسئلہ ہے سابقہ دستور کے مقابلے میں اس میں وفاقی اجزاء کے اختیارات وسیع تر ہیں چنانچہ ان معین اختیارات کے علاوہ جو مرکز کو دیئے گئے ہیں مشترک اختیارات اور باقی اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں گے اس سے دونوں بازوؤں کے رہنے والوں میں زیادہ خوشدلی کی فضا پیدا ہوگی جو ہر وفاق کی کامیابی کی اولین اور ضروری شرط ہے اور جس کو ہمارے سابقہ دستور سازوں کا جوش اور خیال پرستی نظر انداز کرنے کی غلطی کر گئی تھی حالانکہ ہماری دستور سازی کی تاریخ کی اولین منزل ہی پر واضح ہو چکا تھا کہ دونوں بازوؤں کے اندر وفاق میں متحد اور منسلک ہونے کی فطری اور زبردست خواہش کے باوجود دونوں اپنی جداگانہ انفرادیت کی برقراری کی خاطر وہ اختیارات اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے جو نئے دستور نے دانشمندی سے ان کے حوالے کئے ہیں چنانچہ ۲۲ر دسمبر ۱۹۵۲ء کو بنیادی اصول کی کمیٹی کی پیش شدہ رپورٹ سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے اندریں حالات ہم اس فیصلے کو عملی تدبر کی ایک نمایاں کامیابی سمجھتے ہیں کہ دونوں اجزاء کے رجحانات کے پیش نظر کامل خوشدلی اور تعاون پر وفاق کی بنیاد رکھی گئی کیونکہ اصلی شئی وفاق کی اسپرٹ ہے نہ کہ اختیارات کی کمی بیشی جب خوشدلی حاصل ہو جاتی ہے تو تعاون فطری ہوتا ہے۔ بدگمانیاں دور ہو جاتی ہیں ترقی پذیر اجتماعی زندگی کے تقاضے اور مشترکہ فلاح و بہبود کی اہم تر ضروریات ایک دوسرے سے قریب تر رہنے پر مجبور کرتی ہیں چنانچہ دنیا کے مختلف ممالک کے دستوری ارتقائی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ خوشدلی کی فضا میں عہد نے (Confederation) وفاق

(federation) یعنی وفاقی و وحدانی حکومت (unitary form) میں تبدیل ہو گئے الغرض دستوری ارتقاء فطری اور رضاکارانہ کامیاب ہوتا ہے نہ کہ جبری اس دستور کا یہ نمایاں پہلو بے حد خوش آئند ہے کہ اس میں خوش دلی اور رضاکارانہ تعاون کی داغ بیل ڈالی گئی ہے۔ نئے دستور کا ایک اور اہم اصول قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں راست انتخاب کے بجائے بالواسطہ انتخاب کا ہے جو بنیادی جمہوریتوں کے ذریعہ ہوگا اس اصول بالواسطہ کو نیا تو کہا جا سکتا ہے لیکن جمہوری اصول کے خلاف نہیں اس کے بارے میں جو ممکنہ اعتراضات ہو سکتے ہیں اور ان کے جوابات یہ اب سب کو معلوم ہیں اس لئے ان کو دہرانا غیر ضروری ہے البتہ اس معاملہ میں ہم اگر ٹھنڈے دل سے سوچیں تو غیر جانبدار اشخاص کی رایوں سے استفادہ کر سکتے ہیں جن میں جے پرکاش نارائن جیسے سوشلسٹ بھی ہیں جو ہندوستان میں اپنی ذہانت، خلوص اور جمہوریت پرستی کے لئے پنڈت جواہر لعل نہرو کی ٹکر کے آدمی سمجھے جاتے ہیں وہ اس کو نہ صرف بہتر سمجھتے ہیں بلکہ ہندوستان کے لئے بھی اس کی سفارش کرتے ہیں ان میں رشبروک ولیمس جیسے مشہور یورپی عالم ہیں جو اس کی خوبیوں کے معترف ہیں۔ اس لئے اس طرز انتخاب کو بطور تجربہ اتنی مدت ملنے میں کیا قباحت ہے کہ اس کا مفید یا مضر ہونا عملی طور پر ظاہر ہو جائے بلاواسطہ طریقہ کو ہم نصف صدی سے زیادہ برت چکے ہیں اس لئے ہم کم از کم نصف مدت تو دیں اس کے بعد بھی اگر ہماری قوت تمیز کا فیصلہ یہی ہو کہ یہ طریقہ نامناسب ہے تو پھر یہ نہ سمجھا جا سکے گا کہ عادت کے دباؤ (force of habit) کے ماتحت ہمارا یہ فیصلہ ہے لیکن اگر اسلام کی تاریخ اور اس کے احکام ہمارے فیصلے کی کسوٹی ہوں تو ہم یاد دلائیں گے کہ اسلامی دستور کے سب سے بڑے مستند عالم (الماوردی) کے نزدیک تو صدر مملکت (خلیفہ) کا انتخاب عوامی نہیں بلکہ محدود اور منتخب افراد کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ایک اور ترمیم یہ ہے کہ اسمبلی کے اندر سیاسی پارٹیوں کے بنانے کی اجازت ہو سکتی ہے لیکن فوری طور پر اسمبلی سے باہر اس کی اجازت نہیں اس کی وجہ اور مصلحت ظاہر ہے کہ بدنام اور پیشہ ور سیاست دانوں کی معاندانہ مفادات حاصلہ سے ان کے گٹھ جوڑ کو روکنا اور عوام کی نئی اور صحت مند قیادت کو ابھارنا ہے اگر ملک کے مجموعی مفاد کے لئے تجربہ کے بعد بالآخر یہ غیر ضروری ثابت ہو تو دوبارہ اسمبلی سے باہر سیاسی جماعتوں کے قیام کا دستوری راستہ کھلا ہوا ہے چنانچہ نئے دستور میں قومی اسمبلی کی منظوری سے اس کو زندہ کرنے کا حکم موجود ہے اس لئے اس قید کی نوعیت عارضی ہے اگرچہ یقین نہیں کہ عوام کے بڑھتے ہوئے سیاسی شعور کے تحت اسمبلی ایسا کرنا مفید اور مناسب تصور کرے گی۔

اس دستور کی ایک انوکھی اور نہایت مفید تجویز یہ ہے کہ زیر تکمیل اسکیموں کو جاری رکھنے کے لئے سابقہ منظور شدہ بجٹ میں صدر مملکت کی منظوری کے بغیر کوئی تبدیلی نہ ہوگی اس اصول کے وضع اور اضافہ کے لئے جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ یہ سابقہ دستور کی ایک اہم فروگذاشت کی ناگزیر اصلاح ہے۔ حیرت ہے کہ سابق میں دستور سازوں کا ذہن کیوں اس طرف منتقل نہ ہوا کہ دیگر مشرقی ممالک کی طرح پاکستان بھی ترقیاتی دور سے گزر رہا ہے جس کے لئے مملکت کے فرائض میں منصوبہ بندی اور اس کی تکمیل مقدم ترین ہو گئی ہے اور بغیر اس کے نہ تو عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کا انتظام ممکن ہے اور نہ ملک کی ہمہ جہتی ترقی اور دفاع کا مؤثر بندوبست ممکن اس کے لئے کثیر مادی و مالی وسائل مہیا کرنے ضروری ہیں جو اندرونی اور بیرونی ذرائع کے محتاج ہیں اگر دستور میں یہ قید نہ ہو تو نہ صرف اندرونی و بیرونی ذرائع امدادوں اور قرضوں کی فراہمی مشکل ہے بلکہ مآل کار ان کی مدد ملک کی بربادی کا جاندار خطرہ پیدا ہوگا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ سابقہ دستور کی تیاری کے وقت ترقیاتی اسکیموں اور منصوبہ بندی کی یہ سنگین صورت حال پوری طور پر ابھر کر سامنے نہیں آئی تھی ورنہ یقین ہے کہ یہ قید سابقہ دستور میں بھی ضرور موجود ہوتی بہرحال یہ اضافہ ضروری اور پسندیدہ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ دستور سازی کا ذہن بیدار اور نئے پیدا شدہ مسائل سے پوری طور پر باخبر ہے صرف مکھی پر مکھی مارنے کا قائل نہیں۔

نئے دستور کے اہم اجزا پر اجمالاً جو کچھ اوپر بیان ہوا اس سے ابھر کر چند نمایاں خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

نئے دستور کی نمایاں خصوصیات

(۱) دستوری قانون اور دستور سازی کے مروجہ اصولوں کے بجائے ہماری مملکت کے لئے موزوں اصولوں کا انتخاب کیا گیا ہے۔

(۲) چونکہ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل مملکت ہے اسلئے اسلامی تعلیمات کے بنیادی اصولوں کی دستوری مسائل کے مرکزی تصورات پر عملی چھاپ (انطباق و اطلاق) ہے۔

(۳) اسلامی اُصولوں اور جمہوری اُصول دستور سازی میں ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے۔

(۴) دستوری قوانین اور اسلامی تعلیمات کے مشترکہ اصولوں کے ذریعہ دستور کو حیات اجتماعی کے صحت مندانہ ترقی پذیر اور جمہوری تقاضوں کا ضامن بنایا گیا ہے۔

ان خصوصیات سے یہ امر نمایاں ہے کہ موجودہ قیادت کے ذریعہ ہمیں قائداعظم اور قائد ملت کے بعد وہ دولت حاصل ہو گئی ہے جو کسی بھی دستور اور خصوصاً وفاقی دستور کے قیام اور کامیاب عمل آوری کی شرط مقدم سمجھی جاتی ہے اور جس کو (K.C. Wheare) اپنی کتاب (Federal Govt.) وفاقی حکومت میں (صفحات ۳۹، ۴۰) صحیح وقت پر قیادت اور معاملہ فہمی سے تعبیر کرتا ہے چنانچہ اسی قیادت کے تحت گزشتہ تین سال کی مختصر سی مدت میں متعدد مفید اصلاحی اقدامات کئے گئے زرعی اصلاحات، تعلیمی اصلاحات، نظام محصول اندازی میں دروبست، ترقیاتی میدان میں ایک حوصلہ مندانہ پنج سالہ منصوبہ جو پہلے کے مقابلہ میں ڈھائی گنا اور ۲۳ ارب کا ہے اس کو کامیابی سے پورا کرنے کیلئے اندرونی اور بیرونی سرمایہ سے پہلے تین سالوں کا پورا بندوبست کیا گیا ملک کے ندی، آبی اور برقابی مسائل کو نبٹانے کے تمام ضروری انتظامات بشمول کثیر سرمایہ کے (جو کئی ارب روپوں پر مشتمل تھا) مکمل کئے گئے اور اب اس کے کارناموں میں یہ دستور خوب سے خوب تر کے مصداق ہے

سچی بات یہ ہے کہ اس دستور کو دیکھنے کے بعد مستقبل کے مورخ کو یہ لکھنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ وہ ایک ایسے بے مثال مدبر کا کارنامہ ہے جو ایک سچا محب وطن، بیدار مغز حقیقت پسند سیاست داں وسیع النظر انسان ہونے کے ساتھ قومی اور جمہوری قائد کی ضروری صفات کا بھی نمونہ تھا بے شک ہم سب پاکستانی مورخ کے اس فیصلے کی پیش قیاسی کر سکتے ہیں۔

بل نقوی

نیا نظام ہے پُرنور

فروغِ جذبۂ تعمیر ہے فضا کی نمود
زمیں چھوڑ چکا، کارواں تباہی کا
اُبھر رہے ہیں تصور میں روشنی کے خطوط
دل و دماغ پہ پہرا نہیں سیاہی کا

ہُنروروں پہ کھلا بابِ اوّلینِ حیات
عروسِ فکر کو آزادیٔ خیال ملی
وُہ اک خلیج کہ حائل تھی درمیانِ طلب
اُس اک خلیج کو سرمستیٔ وصال ملی

کھلیں گے زیست پہ اسرار ہائے سینۂ دہر
چمک اُٹھے گی علوم و فنون کی تقدیر
نکل چکا ہے شعورِ وطن کی راہوں سے
غبارِ جہل کہ تغافلِ مست و بے زنجیر

ہر ایک موڑ پہ کلیاں، ہر ایک راہ میں پھول
بجھی بجھی سی فضاؤں پہ رنگ برسائیں
بہار ڈھونڈ رہی ہے نئی فضاؤں کو
ہمارا کام ہے ایک ایک گنج مہکائیں

سوادِ جبر کی راتیں گزار دیں ہم نے
نیا نظام ہے پرنور، مل گیا ہم کو
پئے وطن نئی جمہوریت کے قالب میں
ہمارے عہد کا دستور مل گیا ہم کو

ضمیرِ عظمتِ جمہور ہے ثباتِ وطن
ہمارے عہد کا دستور ہے شبابِ وطن

پروفیسر سجاد حارث

جدید اُردو شاعری میں بغاوت کی روایت

کہتے ہیں، مقدمہ شعر و شاعری روایت کے تابوت میں بغاوت کی پہلی پیچ ٹھونکنے کی سعی تھی، بس اس دن سے ہی اُردو زبان و ادب میں میخیں ٹھونکنے کی ایک رسم سی چل نکلی ہے۔ یوں تو ہر دور میں قدامت پسند حضرات روایت سے بغاوت کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتے رہے ہیں۔ لیکن آجکل صورتِ حال کچھ زیادہ ہی دلچسپ نظر آتی ہے۔ جدید ترین خیالات و نظریات کا حامل ایک فنکار اور دانشور رات میں خالص جدید انسان کی حیثیت سے سوتا ہے لیکن اگلی صبح جب ناشتہ کی میز پر اخبار میں کسی نئی پود کا سینی فسٹو پڑھتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اب وہ نئے دور کا نمائندہ نہیں رہا، وہ قدامت پسندوں کی صف میں آچکا ہے، اس الزام کی وہ جس قدر مزاحمت کرتا ہے۔ اسی قدر قدامت پسند کہہ کر اسے مطعون کیا جاتا ہے، مولانا حالی کی بغاوت کا بھی یہی حشر ہوا۔ مولینا کو ایک زمانہ تک اُردو کی جدید شاعری و ادب میں مجتہد کا درجہ حاصل رہا ہے۔ لیکن نئی دریافت اب یہ کی گئی ہے کہ مولینا سرے سے ہی نہ شاعر تھے، نہ ادیب، زیادہ سے زیادہ انھیں سماجی مصلح اور ریفارمر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ مولانا کے ساتھ ہی ساتھ ان کے اکثر ہم عصروں اور ہم سفروں کو بھی اس صف میں اکھڑا کیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولینا کی نظر لنِن، بائرن، الفرڈ وسٹڈ زورتھ تک ہی محدود تھی۔ ان کا ذہن بادلیر، ریمبو اور ورلین کی شاعری کا احاطہ کر سکتا تھا نہ ہی مستقبل میں کسی فیضؔ، میراجیؔ اور راشدؔ کی پیدائش کی پیشینگوئی کر سکتا تھا کیونکہ مولانا حالی رمل اور نجوم کا کاروبار نہیں کرتے تھے، اپنے زمانہ کے فکر انگیز اور توجہ طلب تہذیبی اور معاشرتی مسائل کو ایک باشعور اور حساس فنکار کی طرح سوچتے تھے اور پھر اپنے افکار و احساسات کو نظم و نثر کے سانچوں میں ڈھال کر پیش کر دینا ہی ان کا کام تھا۔ وہ اپنے عہد کے مخصوص سماجی شعور کی ترجمانی کر رہے تھے، ہمارا عہد، ہمارے عہد کا انسان اور اس کی متنوع ذہنی اور جذباتی الجھنیں اور وقتیں فطری طور پر ان کے احاطۂ فکر و نظر سے ماہر تھیں۔ مولانا کا ایک یہ احسان ہی ہم پر کم نہیں ہے کہ انھوں نے ہم کو خود اپنے یعنی (مولینا کی اپنی ادبی روایات و نظریات) کے خلاف بغاوت کرنا سکھا دیا ہے۔

تخصیص کے ساتھ یہاں مولانا حالی کے تذکرہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مولینا ان ادیبوں اور شاعروں کی نمائندگی کرتے ہیں جن کے یہاں محض "انسان" کا ایک مسخ تصور پایا جاتا ہے۔ بقول نئے فن کاروں کے تہذیب و تمدن کی آلائشوں اور جھوٹی اقدار سے منزّا ہوا انسان یا فطری انسان یعنی آدمی کا ان بزرگوں کی تحریروں میں کوسوں تک پتہ نہیں چلتا، یہی وجہ ہے کہ نئے فنکار "انسان" کے جنم کے شاعروں اور ادیبوں کو

دنیا فضا نہیں سمجھتے، اور انھیں وہ سب کچھ ماننے کے لئے تیار ہیں لیکن حقیقی فن کار تسلیم کرنے کے لئے مطلق تیار نہیں ہیں۔ یہ نئے فن کار حقیقت کے ادراک کا ذریعہ اعصاب کو قرار دیتے ہیں۔ شعور ان کی ادبی مملکت میں ایک خطرناک شے تصور کی جاتی ہے۔ عقلیت پسندی چونکہ فن کار کو مقصدیت کی طرف لے جاتی ہے اور فن پر انسان کی بالادستی قائم کر دیتی ہے اس لئے اعصابی حقیقت نگاری میں تعقل کے تمام رشتے زیر زبر ہو جاتے ہیں۔ ایمجزم، سوریلزم، فیوچرازم اور سمبلزم کسی نہ کسی شکل میں یورپ میں اس نوع کی تحریکیں تھیں۔

یورپ میں ناول نگاری کے میدان میں بھی یہی کچھ ہوا۔ پہلے ناول خارجیت لئے ہوئے ہوتا تھا۔ حقیقت اور مقصدیت کی بنیادوں پر ان ناولوں کی عمارت تعمیر کی جاتی تھی۔ ان میں تمام تر سماجی رشتے اور روابط صاف طور پر نظر آجاتے تھے لیکن شعر وادب میں سائنٹفک اسپرٹ اور حقیقت پسندی کے رجحانات کے خلاف بالآخر بغاوت شروع ہوئی اور ڈورتھی رچرڈسن، جیمس جوائس اور پراؤست جیسے فن کاروں نے ناولوں میں ایک نئی دنیا آباد کرنی شروع کر دی۔ اب خارجیت شجر ممنوعہ قرار پائی گئی۔ شاعری کے علاوہ ناولوں میں بھی "آدمی" کی تاجپوشی کی گئی، انسان کو اس مملکت سے نکال دیا گیا اور گہرے داخلی تجربات اور باطنیت پر ناولوں کی بنیادیں استوار کی گئیں۔

چند دنوں سے اردو کے چند تازہ بہ تازہ نو بہ نو قسم کے شاعر ابتدائی فنتسی کے ذریعہ اپنے اور کائنات کے رشتے قائم کرنے کی مہم چلا رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سمبلزم خواب کی ایمجری، فوک لور اور مذہبی اشاروں سے آرکے ٹائپل اظہار کے پیرائے استعمال کر رہے ہیں کیونکہ ضرورت آج اس بات کی ہے کہ فطرت سے مکمل طور پر یکانگت اور ہم آہنگی محسوس کی جائے، سائنسی حقیقت اور عقلیت نے تین چیزوں آدمی۔ فطرت، اور انسانی تخیل کے پرخچے اڑا دیئے ہیں یعنی

سائنس اور عقلیت کے اس دور میں انسان، آدمی کے سینہ پر زیادہ سنگ دلی اور بے رحمی سے دندناتا پھر رہا ہے۔ بودلیر سے لے کر ڈی۔ایچ لارنس تک یورپ کے لگ بھگ تمام نئے فنکار بنیادی طور پر یہی بات کہتے ہیں۔ ان کا لب ولہجہ اگرچہ مختلف ہے لیکن کسی نہ کسی شکل میں مدعا ایک ہی ہے۔ اردو ادب میں اس ذہنی کرب اور جذباتی خلفشار کی پہلی پرچھائیں میراجی کے یہاں ملتی ہیں۔ اردو زبان کے وہ نوجوان شاعر جو نئی پود سے موسوم کئے جاتے ہیں، ان کے فکر وفن میں بھی زیر نفسی اس نوع کی الجھنیں پائی جاتی ہیں۔ ان میں کچھ نوجوان ایسے ہیں جو لکھتے اردو میں ہیں لیکن سوچتے انگریزی میں ہیں اور جن کا فکر وفن یورپ کی نئی ادبی تحریکات اور تخلیقات سے براہ راست اثر پذیر ہوا ہے۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی شامل ہیں جن کا فن اور نظریۂ فن دوستوں کی محفلوں اور ادبی نشستوں کی محض سنی سنائی باتوں پر استوار ہوتا ہے۔ جو اپنے خیالات اور محسوسات کچھ غیر ملکی شاعروں سے اور کچھ اپنی زبان کے فنکاروں سے مستعار لیتے ہیں۔ ان پر قدرے اپنا خون لگاتے ہیں اور شہیدوں میں داخل ہو جاتے ہیں۔

فن وادب میں پیروئ مغرب بری بات نہیں لیکن جذبات ومحسوسات تک یورپ سے درآمد کرنا نہ ہی فنکارانہ عظمت کا ثبوت ہے اور نہ ہی فنی خلوص۔ اگر فنی تخلیق قدیم سماجی ہیئت اور نئے انفرادی تجزیہ کے مابین ایک مخصوص [illegible] سے معرض وجود میں آتی ہے اور نئی شاعری فرد اور ماحول کی عدم مطابقت کا بلا واسطہ اظہار ہے تو اس صورت میں نئے فنکاروں کے لئے اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص ماحول میں ہی اپنے آرٹ کی، اس آرٹ کے مخصوص ذریعۂ اظہار یا ہیئت کی اور اپنی شخصیت کی تلاش کریں۔ صرف اسی صورت میں وہ لوگوں کے لئے آگہی اور مسرت کی دنیائیں تخلیق کر کے اپنی ذات کی معنویت قائم کر سکیں گے۔ ورنہ دوسری صورت میں ان کے تخلیقی ہیولے

ہمعصر زندگی اور ماحول سے کٹ کر مجذوب کی بڑ بن جائیں گے۔ اور فن و ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ جن مجذوبوں نے تاریخ ماحول اور اپنے دور کے منطقی تسلسل کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ہمعصر افراد اور آنے والی نسلیں آج تک نہ ہی ان کی ذات کو سمجھ سکی ہیں اور نہ ہی ان کی ذات کی معنویت کو۔ ایذرا پاؤنڈ کا حشر بھی اسی لئے اچھا نہیں ہوا کہ وہ اپنے دور کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ اور وہ مرتے دم تک اپنے افکار و احساسات کو ہمعصر زندگی سے ہم آہنگ نہیں کر سکا۔ یہی حشر مسلارمے اور اس کے نظریۂ فن کا ہوا۔ انگریزی زبان کے جمالیات پرستوں کا المیہ بھی یہی ہے۔ فرانس کے زوال پسند شاعروں کے فن اور نظریۂ فن کی موت کا راز بھی اس حقیقت میں مضمر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زوال پسندوں کی روایت پر چلنے والے وہ شاعر جنھوں نے سن ۱۹۳۰ء کے بعد لکھنا شروع کیا تھا۔ انھیں بالآخر اپنے (Ivory Tower) سے باہر نکل کر خارجی دنیا کی وسیع و عریض فضا میں آنا پڑا اور اپنے فن اور نظریۂ فن میں بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں۔ ان کے ذہنی اور فنی پیشروؤں نے اب تک فن کو انسانی شعور سے بالاتر کوئی ماورائی شے سمجھانے پر اپنی زندگانیاں صرف کر دی تھیں۔ لیکن ان کے مقلدین نے فن کو بالآخر سماجی عمل مان کر ان کے نظریات کی خود ہی تکذیب کر دی۔ اردو کے نوجوان شاعر فن اور فنکار ان تاریخی المیوں سے کافی کچھ سیکھ اور سمجھ سکتے ہیں۔

ہمعصر زندگی اور ماحول سے اپنے فن کو ہم آہنگ کرنے کا یہ مفہوم ہرگز نہیں ہے کہ فکر و فن میں روایات کے بت مطلق نہ توڑے جائیں، یقیناً آج ہمارا ماحول بدل رہا ہے اور زندگی نئے سانچوں میں ڈھل رہی ہے۔ اور اس روبہ تغیر زندگی اور ماحول میں نئے اسالیب و موضوعات اپنانے ہوں گے لیکن قدیم سے جدید کی جانب جانے کے لئے ہمیں اپنی روایات کے منطقی تسلسل کی متعدد اور پُرپیچ سیڑھیاں لازمی طور پر عبور کرنی پڑیں گی ورنہ ہمارا حشر بھی پاؤنڈ، مسلارمے اور فرانس کے دیگر زوال پسند شاعروں سے مختلف نہیں ہوگا۔ اپنی شاعری، ادب اور ماحول اور معاشرہ کی مخصوص روایات کا جدلی شعور رکھنا نہ صرف ابلاغ کے خیال سے بلکہ فنکار کی خود اپنی شخصیت کی صحت اور فن کی معنویت کے نقطۂ نظر سے ازبس ضروری ہے۔ اب جو لوگ فن و ادب کو محض فنکار کی داخلیت اور مجہول باطنیت تک محدود رکھنے پر زور دیتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں جو لوگ فنی تخلیق کو سماجی عمل تسلیم نہیں کرتے اور اگر تسلیم بھی کرتے ہیں تو محض نثر کی زبان میں لیکن اپنی شاعری اور فنی طریقۂ کار میں اپنی مخصوص نظریاتی الجھنوں کی بنا پر اپنی نثر کی خود تکذیب کرتے رہتے ہیں۔ ایسے فنکاروں کو بالخصوص اپنے سماجی معتقدات فنی نظریات اور اظہارِ فن کے مابین مکمل ذہنی ہم آہنگی اور مطابقت کا گہرا جدلی شعور رکھنا ناگزیر بن جاتا ہے۔

جب زندگی قدیم ہیولوں سے گزر کر نئی منزلوں کی جانب بڑھنے لگتی ہے اس وقت فطری طور پر معاشرہ کے حساس اور ذہین افراد کے دل و دماغ میں خیالات و جذبات کی نئی متلاطم تحریکات جنم لینے لگتی ہیں۔ زندگی کے قدیم سانچے اپنا آب و رنگ اور اپنی دلکشی کھو دیتے ہیں کیونکہ اب یہ نئے ذہن کے لئے سامانِ تسکین بہم نہیں پہنچا سکتے۔ نئے انسان کی ذہنی اور جذباتی ضرورتوں کے کفیل نہیں بن سکتے۔ لہٰذا اب نئے سانچے اور ہیولے تعمیر کئے جاتے ہیں۔ ان جانی اور ان دیکھی حقیقتوں کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ اب نیا طرزِ احساس اور اندازِ فکر معاشرہ پر اپنا تسلط جمانے لگتا ہے۔ لیکن اس افراط و تفریط اور شکست و ریخت کے دور میں ہر جگہ ہمیشہ ایسی روحیں بھی نظر آتی ہیں جو حیران و پریشان ادھر ادھر سر ٹکراتی پھرتی ہیں۔ جو ان نئی تبدیلیوں کو قبول تو کر لیتی ہیں لیکن ان کا منضبط ادراک ان کے بس کا روگ نہیں ہوتا، نراجیت اور کنفیوژن ان کے شعور و احساس کا معتد بہ حصہ بن جاتا ہے۔ اس شکست و ریخت سے ان کے

ہمہ وقت ایک حشر سا برپا رہتا ہے۔ داخلیت کا ہیجان ختم کرنے کے لئے داخلیت کی سُرنگ میں وہ جتنی دور جاتے ہیں۔ انکا رُوحانی انتشار اور احساس تنہائی بھی انتہائی شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ذہنی و احساس کی متلاطم تحریکات کو تاریخ کی مادی تعبیرات کی روشنی میں نئے سائنسی شعور کے نئے امکانات اور زود بہ تغیر انسانی معاشرہ کی مادی تبدیلیوں کی بنیادوں پر دیکھنے سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ حقیقت و احساس کے مابین کی عدم مطابقت کا نتیجہ جزوی یا مکمل نراجیت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس صورت میں ان بھٹکتی ہوئی بے چین رُوحوں کے شعروادبی کارنامے ہذیان سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اس نوع کے تمام فنکار ایلیا اہرن برگ کے الفاظ میں" خوابوں کے کارخانے بن جاتے ہیں۔ جو زندگی اور زندگی کی متنوع اور عملی حقیقتوں سے بھاگ کر خود کو چھوٹے چھوٹے گھونگھوں میں مقید کر لیتے ہیں اور پھر وسیع و عریض سمندروں کی تہ میں پڑے ہوئے بزعم خویش "انا البحر" کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ اور ان میں کافکا ([illegible]) جیسے فنکار بھی ہوتے ہیں جو آپن واحد میں انسان کو کاک رُوچ (   ) کی ہیئت میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ اور کیڑوں کوڑوں کے ذہن میں بیٹھ کر "حشرات الارض کے خواب" دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ ظاہر ہے اس نوع کا فن و ادب نیز چڑیوں، چمگادڑوں اور کاک روچوں کے خواب لوگوں کے لئے آگہی، شعور، عمل اور مسرت کی دنیائیں تخلیق کر سکتے ہیں۔ اور نہ ہی فنکار کے فن اور اس کی ذات کی معنویت کو قائم کر سکتے ہیں۔ نہ ہی داخلیت کی اذیت ناک حشر سامانی کو ختم کرنے کے موجب بن سکتے ہیں البتہ یہ ذہنی نراجیت نظریاتی عدم وضاحت اور جذباتی ژولیدگی فنکار کو عام طور پر گھونگھوں اور کاک روچوں میں بسنے والی تمام حساس ترین روحوں کو ایزرا پاؤنڈ کی اس سیڑھی پر ضرور پہنچا دیتی ہے۔ جہاں انسانی ذہن موت میں زندگی کی تعبیر کرنے لگتا ہے اور تاریکی سے روشنی کا حظ اٹھانے لگتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر فنکار فنکار نہیں رہتا۔ اپنی ذات کی مخصوص معنویت میں ایک مہلک مرض بن جاتا ہے۔

آج ایک فنکار کے لئے اس سے بڑا المیہ اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنی باطنیت اور داخلیت کو مختلف النوع خارجی عوامل سے جزوی یا کلی طور پر ماوراء یا بے تعلق سمجھنے پر اکتفا کرلے۔ فن کا ایک مجرد مفہوم اختراع کرنا اور پھر اس مجرد مفہوم میں زندگی کے مختلف النوع خواب دیکھنا ہمارے عہد کا سب سے بڑا فریب اور عظیم ترین جھوٹ ہے۔ اپنے عہد کی اقدار اور ذہنی و مادی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے (اپنی بہترین مزاحمتی کوششوں کے باوجود) آج کوئی فن کار متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک فنکار محض فنکار بن کر آج نہ زندہ رہ سکتا ہے۔ نہ انسان کی مسیحائی کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی قابل ذکر تخلیقی فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ معمولی سے معمولی فن کار کے لئے آج یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ خود کو ایک اچھا خاصا انسائیکلوپیڈیا بنائے۔ اور بیک وقت فلسفہ، سائنس، معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات وغیرہ میں دلچسپی اور درک رکھے۔ اور زندگی و سماجی حقیقت کو مجموعی طور پر پرکھنے، سمجھنے اور بدلنے کی کوشش کرے کیونکہ فن و ادب کے رشتے خارجی عوامل و حقائق سے جس صراحت و گہرائی سے آج قائم نظر آتے ہیں۔ اس شکل میں انسانی تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتے۔

اب جو فنکار زندگی کو شش جہت پہلوؤں سے دیکھنے اور سمجھنے کی سعی نہیں کریں گے۔ زندگی ادب اور فنی ہیئت کے مسائل کو ایک محدود اور مخصوص وسیلہ اور علم کی وساطت سے پرکھنے کی کوشش کریں گے۔ پھر اس محدود پرکھ کی بنیاد پر ہی فکری اور جذباتی نتائج اخذ کرنے کی تگ ودو کرینگے۔ ان افراد کا فکر و فن بھی زندگی کی وسیع ترین بنیادوں سے کٹ کر سطحی اور لایعنی بن جائے گا۔

اس حقیقت کی واضح مثالیں اگر ایک طرف ترقی پسند تحریک کے نعرہ زن اور پمفلٹ نگار فنکاروں کی تخلیقات سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ تو دوسری جانب ترقی پسند تحریک کے ان مخالفین کی نگارشات میں بھی ڈھونڈی جا سکتی ہیں۔ جو ادب میں سیاسی، عمرانی، اور معاشی نظریات کی کارفرمائی گناہ عظیم سمجھتے رہے ہیں۔ ان افراد کے علاوہ فن و ادب میں ایک اور طبقہ نظر آتا ہے۔ جو زندگی اور انسانی معاشرہ کو شش جہت پہلوؤں سے دیکھنے کی سعی تو کرتا ہے۔ لیکن اپنی کمزور فکری بنیادوں اور نظریاتی عدم وضاحت کی بنا پر ادراک حقیقت کی صحیح اور سچی منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان فنکاروں کی تحریروں میں بالعموم حقیقت مسخ ہو کر ابھرتی ہے۔ ان کی تخلیقی کاوشوں میں احتجاج' بین' بغاوت، گہرا غم اور انسانی دردمندی، انسان دوستی، قدیم حقیقت سے بیزاری اور نفرت نئی حقیقت کی تلاش و جستجو۔ غرضیکہ زندگی کو نئی منزلوں سے روشناس کرانے والے تمام ضروری عوامل کی کارفرمائی تو نظر آتی ہے لیکن ان منزلوں کی جانب جو راستے جاتے ہیں ان پر تاریکیوں کے گہرے دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قاری گم کردہ راہ مسافر کی طرح ٹامک ٹوئیاں مارتا رہ جاتا ہے۔

اقبال کے پیغام سے لے کر ڈی۔ ایچ لارنس کے احتجاج تک زندگی حرکت و عمل سے دُور ایک مجہول سی شے نظر آتی ہے، منزلیں، راستے اور راہرو تاریکیوں میں گم، محض ایک وزن ایک واہمہ، ناقابل عمل زندگی کا ایک لفظی تصور ہی نظر آتا ہے بعینہ میراجی اپنے تمام تر جذباتی خلوص و عبودیت کے باوجود خلاء میں پھنسے چیختے ہوئے سنائی دیتے ہیں لیکن کو بالٹ بم اور اپٹنٹنک کے اس سائنسی دَور میں صرف فن کاروں کی ذہنی ساخت اور فنی شعور ہی نہیں بدل رہا ہے بلکہ آج کا نیا قاری بھی فکر و فن کے معاملہ میں دس سال قبل کے قاری سے کافی حد تک مختلف نظر آتا ہے۔ جس طرح آج نئے فنکاروں کے سامنے فن اور زندگی کے نئے مسائل درپیش ہیں۔ اسی طرح قارئین کی نئی پود کے سامنے فکر و فن کے نئے تقاضے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نئی پود کی لغت میں حالی اقبال غزل ردیف و قوافی وغیرہ الفاظ متروکات میں شامل ہو گئے ہیں، پرانی نسل کے بزرگوں اور ساتھ ہی پرانی نسل کے نوجوانوں کو ان نئی تبدیلیوں پر چراغ پا ہونے کی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی مایوس ہونے کی۔ بھلا ہٹ دھرمی، مخالفت اور مطعون کرنے سے بھی نئی زندگی اور فن کے تقاضوں کی بیخ کنی نہیں ہو سکے گی۔ کیونکہ اس تاریخی حقیقت کو تسلیم کئے بنا اب چارہ نہیں کہ وہ دَور اب ختم ہو چکا ہے۔ جب اقبال اور حالی پیدا ہوا کرتے تھے۔ نئی زندگی اور انسان کا نیا سماجی شعور آج اقبال اور حالی سے بہت آگے جا چکا ہے۔ نوجوان نسل کے شاعر اپنی تمام تر نظری اور فنی خامکاریوں کے باوجود زندگی کے نئے اُفق کی جانب بڑھنے کی سعی کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے دور کی تخلیق کے خواب دیکھ رہے ہیں جو حالی اور اقبال کے تصورات سے زیادہ تابناک اور خوش آئند ثابت ہوگا۔ لیکن نوجوان نسل کے شاعروں کو اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ دور اقبال اور حالی کی محض نفی کرنے سے معرض وجود میں نہیں آئے گا بلکہ پچھلی روایات اور تہذیبی سرمایہ کو منزل بہ منزل آگے بڑھا کر اس خواب کو حقیقت میں تبدیل کیا جا سکے گا۔ پرانی نسل کے دانشوروں کو یہ بات بخوبی سمجھ لینی چاہیئے کہ آج کا نیا فنکار اس انسان کے تصور کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ جس کے فکر و فلسفہ میں آلات احساسات مروّت کو کچل دیتے ہیں۔ بلکہ یہ فن کار اس نئے انسان کو جنم دینے کی جد و جہد کر رہا ہے۔ جس کے نظریۂ حیات میں آلات احساسات مروّت کو کچلتے نہیں بلکہ انسانی رشتوں کو اور انسانی جذبات و محسوسات کو زیادہ مستحکم اور خوشگوار بنیادوں پر استوار کرتے ہیں۔ یہ نئے فن کار اس انسان کی پیدائش کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ جو ہائیڈروجن بم اور کوبالٹ بم کی ایجادات سے کیسے نئے ہیروشیما اور ناگاساکی کو انسانی تہذیب اور انسان کی تخلیقی کاوشوں اور ثقافتی کارناموں کو تباہ نہیں

کرے گا۔ بلکہ صحیح معنوں میں انسان کے ایسے جہانِ آرزو کی تخلیق کرے گا۔ جہاں انسان کی داخلیت خارجی ماحول سے برسرِ پیکار نہیں ہوگی۔ جہاں 'انسان' 'آدمی' کی نفی نہیں کرے گا۔۔ بلکہ آدمی کو تہذیب و تمدن کی جھوٹی اقدار سے نجات دلائے گا۔ اور جہاں حیاتِ انسانی پہلی بار مکمل طور پر اپنی تکمیل تک پہنچے گی۔ اگرچہ اُردو زبان کے ان فنکاروں میں سے بیشتر کے یہاں ابھی تاریکیاں اور مختلف النوع خامکاریاں موجود ہیں۔۔ روایات کے منطقی تسلسل کا فقدان ہے۔ زندگی کو شش جہت پہلوؤں سے دیکھنے کی سعی ناکام ہے، ادراکِ حقیقت کا تصور بھی ابھی خام ہے، الجھنیں ہیں، پیچیدگیاں ہیں، عدم وضاحت ہے مزاجی رجحانات ہیں، ذہنی اور جذباتی انتشار ہے۔ اور ان میں سے آج ہر فرد رابنسن کروسو بنا اُردو شاعری کی گردن پر سوار ہے۔ لیکن اُردو کی نئی شاعری کے تیور بتا رہے ہیں کہ نئے دور اور نئی زندگی کے عظیم ترین فنکار نئی نسل کی اس صف ہی میں سے اُبھریں گے۔ اگرچہ یہ حقیقت بھی کم اذیت ناک نہیں ہے کہ ان فنکاروں میں سے اکثریت ان ٹوٹتے ہوئے تاروں کی مانند ثابت ہوں گی۔ جو چند لمحوں تک اپنی چمک دمک دکھا کر آسمانِ ادب کی پہنائیوں میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جاتے ہیں۔

یونسکو کی اشاعتی سرگرمیاں

۱۔ یونسکو سورس بک فار سائنس ٹیچنگ

دنیا کے بہت سے ملکوں میں سائنس کی تعلیم کے انتظامات آج بھی بہت ناقص ہیں خاص طور پر ابتدائی اور ثانوی درجوں میں سائنس کی تعلیم کا اچھا انتظام نہیں ہوتا۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے یونسکو نے یہ کتاب ترتیب دی ہے اس میں آپ کو سائنس کے بہت سے آلے بنانے کے آسان طریقے ملیں گے۔ کتاب میں ۳۰۰ سے زیادہ نقشے اور تصویریں ہیں۔ — قیمت ۱۵ر اسٹرلنگ

۲۔ کرنٹ ٹرینڈز ان سائنٹفک ریسرچ

فزکس کے ممتاز فرانسیسی عالم پروفیسر پیرے اوگر نے اقوامِ متحدہ کے ایما پر سائنسی تحقیقات کے بارے میں یہ رپورٹ تیار کی ہے یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے اور مختلف شعبوں میں سائنسی تحقیقات کے مختلف رجحانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

کٹالاگ آف کلر ری پروڈکشنز آف پینٹنگ

قیمت ۳۳ر اسٹرلنگ

کٹالاگ آف کلر پروڈکشنز (۱۸۶۰ سے پہلے) قیمت :- ۶/۲۲ اسٹرلنگ

(۱۸۶۰ - ۱۹۶۱) قیمت :- ۶/۲۸ اسٹرلنگ

پروسیڈنگز آف دی انٹرنیشنل کانفرنس آف انفارمیشن پروسیسنگ

انگریزی اور فرانسیسی زبان میں (ان کے علاوہ جرمن روسی اور اسپینی زبانوں میں بھی خلاصہ موجود ہے)۔ قیمت ۷/۷ اسٹرلنگ

ملنے کا پتہ :- ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ یونسکو پبلشنگ ہاؤس

پی۔ او بکس نمبر ۳۷۴، ۵۶ ، این گلبرگ ، انڈسٹریل کالونی ، لاہور

فصیح الدین احمد

شعری آہنگ

تخلیقی جذبہ گو ایک اُبال ہے، ایک سوز ہے، ایک ساز لیکن تاہم جب یہی ساز، یہی سوز، یہی اُبال ایک خاص لمحۂ سکون میں ایک خاص شعوری کیفیت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے تو انشائے دل پذیر کی تخلیق کا موجب بنتی ہے، بشرطیکہ زبان کا جادُو بھی جاگ گیا ہو۔

زبان کی یہی ساحری اساس شاعری ـ جذبات اور تجربات ـ کو پُراسرار طور پر ایک وحدت میں منسلک کر دیتی ہے ـ یہی وحدت، یہی ہم آہنگی، یہی عضویاتی ربط جو مختلف متنوع اشیاء کے قوام، ترکیب و ترتیب کے مناسب امتزاج سے تخلیقی ذہن کے اُفق شعور پر جلوہ گر ہو کر نظمِ عالم سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، الفاظ کی ساحری پر موقوف ہے۔

الفاظ کی یہی بازیگری نت نئے تجربے کی خالق ہے جو اپنے عجب و حیرت خیزی کے باعث عام تجربوں سے الگ ایک نئی دنیا کے تجربے بن جاتے ہیں بشرطیکہ ذہنی و جذباتی ردِ عمل کی صلاحیت ہو ـ اور تجربے کی ذہنی و جذباتی ردِ عمل کا اساس آہنگِ فکر و آہنگ تخیل پر مبنی ہے جس کے ادراک کے لئے قلب زندہ و مذاق ادبی و شعری ناگزیر ہے کہ قاری نظم و شعر کے سُر تال کے مخصوص سانچے سے لطف اندوز ہو سکے اور اس تجربے کو اپنا سکے۔

نظم و شعر کا یہ آہنگ محض صوتی اثرات کا مرہون منت نہیں، جیسا کہ شروع شروع آزاد نظم کے علمبرداروں کا دعویٰ تھا، اس لئے کہ اگر شاعری کے آہنگ کا انحصار یکسر صوتی اثرات پر قائم ہوتا تو کسی غیر ملک کی زبان کی شاعری سے جس سے ہم واقف نہ ہوتے ہم پر وہی تاثرات طاری کرتی جو ہماری اپنی جانی پہچانی شاعری قائم کرتی ہے۔ کیونکہ آواز و مفہوم، لفظ و معنی، ساؤنڈ و سنس (Sound and sense) باہم دگر اس طرح خلط ملط ہیں کہ ایک کو دوسرے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا اور لفظی سانچے کا مجموعی تاثر آواز و مفہوم کے اس قوام و امتزاج سے حاصل ہوتا ہے۔

پس شعری آہنگ صوتی آہنگ کا نام نہیں بلکہ صوتی آہنگ کے ساتھ ساتھ داخلی آہنگ کے مجموعے کا نام ہے ـ یا بالصراحت یوں کہا جا سکتا ہے کہ شعری آہنگ سے مراد وہ تمام حرکات ہیں جن کی ترسیل نظم نے الفاظ کے واسطے قاری تک کی گئی ہو ـ گویا نظم کے حقیقی آہنگ کا انحصار نہ صرف صوتی سُر و تال، الفاظ کی حرکات و سکنات ـ ان کی تنظیم و ترتیب، ان کے اشباع و امالہ ہی پر ہی موقوف نہیں ہوتی بلکہ اس کا تعلق زبان کے تمام سانچے سے قائم ہو جاتا ہے جو خیالات و جذبات کے ابلاغ و اظہار پر نہ صرف قادر ہی ہوتے ہیں بلکہ ان پر قابو بھی رکھتے ہیں ـ المختصر آہنگ نام ہے نظم کے مکمل ذہنی و جذباتی بہاؤ کا یا شاعری کے اپنے مخصوص لب و لہجے کا۔

لیکن عجیب بات یہ ہے کہ آہنگ کو عام طور پر بحر و وزن کا مترادف سمجھ لیا گیا ـ یہ نادرست تصور ہے ـ عروض ایک بے جان

چیز ہے جبکہ آہنگ تمام قسم کی شاعری کی رُوح رواں ہے۔ شاعری کی اس روح رواں کی ایک بڑی اچھی پہچان یہ ہے کہ بعض نظمیں ایسی آہنگ کی حامل ہوتی ہیں کہ ان کو مختلف طریقوں پر ادا کیا جاسکتا ہے تاہم اس تبدیلیٔ ادا کے باوجود بھی ان کے مطالب پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا (آہنگ کی یہ تبدیلی بالکل دراصل آہنگ کے عمل کی کمزوری کا لازمی نتیجہ ہے) جبکہ کچھ نظمیں ایسی پائیدار آہنگ کی مالک ہوتی ہیں کہ وہ آہنگ کے خفیف تغیر کی بھی متحمل نہیں ہوسکتیں اس لئے کہ طرز ادا کے ساتھ ساتھ جذباتی زیر و بم کی جو زیریں لہریں بہتی رہتی ہیں ان کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے اور اس طرح نظم کے اصل مطالب، مقاصد اور موقات کو شدید ٹھیس پہنچتی ہے۔

پائدار آہنگ کی ایک خوبصورت مثال اقبال کی نظم "رُوحِ ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" ہے۔ —— اس نظم میں کی سی شان پائی جاتی ہے جو مقتضی ہے کہ نظم کو ایک سے مختلف انداز پر نہ پڑھا جائے ورنہ نظم کا سارا حسن داغ دار ہوجائے گا اور ساری کی ساری نظم بیکار ہوکر رہ جائے گی۔ اسی طرح ایک اور نظم "فرشتے آدم کو جنت سے رخصت کرتے ہیں" ہے۔ اس نظم میں چونکہ وداعی کیفیت کے تاثرات کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس لئے اس کا آہنگ دبا دبا، رُکا رُکا، اور گھٹا گھٹا سا ہے جو غیر ضروری روانی کی متحمل نہیں ہوسکتی ورنہ نظم جسد بے رُوح ہوکر رہ جائے گی۔

دراصل آہنگ کے جس کا انحصار الفاظ یا حروف پر زور دینا، توقف اور حرکت یا رفتار کے تناسب اور اشتراک عمل پر ہے۔ "ساقی نامہ" کا تیسرا اور چوتھا بند جس کی ایک اچھی مثال ہیں۔ اس نظم کے تیسرے بند میں شاعر نے بڑے البیلے انداز میں خیر کی دعا مانگی ہے جب ہی تو اس کا آہنگ "شراب کہن پھر پلا ساقیا" تیروں کی صداؤں کی طرح رک رک کر نہایت دھیمے انداز میں بجو کی لپک اور آواز کی خشکی لئے ہوئے بڑھتا ہے کہ یہی انداز مناسب حال ہے لیکن اس نظم کے چوتھے بند کا آہنگ "دمادم رواں ہے یم زندگی"، دونوں بندوں کے آہنگ کو واضح اور نمایاں کردیتا ہے۔ یہاں اس بند میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اچانک اُبل پڑا ہے اور اس کو اپنی خودی کا احساس ہوگیا اسی لئے اس کے لہجے میں زور اور بلند آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ درویشانہ انداز فلسفیانہ اور سنجیدہ ہوگیا ہے۔ اسی طرح بعد کے بندوں میں آہنگ کا تغیر خطابت کے پیش نظر گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ جس میں الفاظ کی تکرار سے بلند آہنگی پیدا کی جاتی ہے

پس شاعری میں موضوع کی تبدیلی کے پیش نظر آہنگ کی مناسب تبدیلی ناگزیر ہے ورنہ وہ اعلیٰ شاعری کے زمرے سے خارج شمار ہوگی۔ اس لئے کہ وہ دوسری صورت میں میکانکی ہوکر رہ جائے گی اور شاعری سے جو کچھ اخذ کیا جاسکتا ہے وہ اخذ نہیں کیا جاسکے گا اس نکتہ کو Verna Black نے اس طرح کہا ہے۔ "A regular limited sing song rythm in poetry is hostile to a great suggestion".

بلیک (Black) کی اس بات کا اطلاق ہماری روزمرہ کی زندگی پر بھی ہوتا ہے جس کی مزید وضاحت یوں ہے کہ اگر ہماری روزمرہ کی گفتگو کا ایک سانچہ بن جائے تو ہم جلد ہی محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ہماری گفتگو ہمارے جذبات کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتی مگر ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ لفظ مجسمے کے مانند بے جان، بے حس اور بے نیاز و بے جذبہ نہیں ہوتے ان کی تہہ میں جذب و حرکت کی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ اسی لئے ہماری روزمرہ کی بات چیت میں لب و لہجے کے فرق کی حد بندی ممکن نہیں۔ ہمارے لہجے کے فرق ہی سے ہمارے الفاظ کے زور، ان کی رفتار یا ان کے آہنگ میں فرق پیدا ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو تو ہمارے جذبات گھٹ گھٹ کر مرجائیں۔ اسی لئے اعلیٰ شاعری میں جو زندگی کی مُنہ بولتی تصویر بھی ہوتی ہے اور بہتر

زندگی کی تخلیق بھی۔ آہنگ نمایاں اور واضح ہوتا ہے کیونکہ فنکار کو اپنے جذبے کی گہرائی اور اپنے تجربے پر کامل اعتماد ہوتا ہے لیکن خارجی آہنگ صوتی اور اوپری چیز ہے۔ حقیقی آہنگ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ لکھنو اسکول کی بیشتر شاعری اس کی مثال ہے۔

چونکہ آہنگ کے خارجی پہلو کو موسیقی کے ساتھ بھی گہرا تعلق ہے اس لئے اکثر کم درجہ شعرا نے آہنگ کے صرف اسی پہلو کو کافی سمجھا اور اپنا خسارہ یوں کر لیا کہ ان کی بنائی ہوئی تصویریں یک رخی ہو کر رہ گئیں۔ ذوق کے بیشتر قصائد اور مرزا دبیر کے اکثر مرثیے نوحہ خواں ہیں کہ ان کے خالق کی تمام تر توجہ الفاظ کی آواز اور ان کی پیدا کردہ ظاہری موسیقی اور اصول شاعری پر مرتکز ہو کر رہ گئی۔

موسیقی اور اصول شاعری کا آہنگ کے محض خارجی پہلوؤں سے تعلق ہے۔ جبکہ داخلی آہنگ ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ وہ صرف شاعر کے بطون میں پیدا ہوتا ہے جہاں سے زبان کی ماہر و چابک دست دایہ اس کیفیت کی ترسیل کے فرائض دیانتداری و خلوص کے ساتھ انجام دیتی ہے۔ اس طرح ہم سب تخلیقی جذبات و موثرات شاعری کے ان تمام رازہائے نشیب و فراز کے رازداں بن جاتے ہیں جن کے ابلاغ و اظہار پر فنکار قادر تھا لیکن اگر خود شاعر کو آہنگ کی باطنی موجودگی کا احساس نہیں یا وہ اس کیفیت کی مناسب و موزوں گرفت سے معذور ہے تو قاری اپنے بطون میں کوئی نشیب و فراز محسوس نہیں کر سکتا۔

جذبات یا آہنگ کی یہی ناہم آہنگی شاعری کو پست مرتبہ اور اس کے خالق کو کم رتبہ بنا دیتی ہے۔ میر اسی لئے ہمیشہ زندہ رہیں گے اور ناسخ کی شاعری ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گئی کیونکہ ایک قاری کا رازدار بن جاتا ہے اور دوسرا خود کا بھی شریک راز نہیں ہو پاتا۔ اسی طرح میر انیس کو مرزا دبیر پر جو فائقانہ عظمت حاصل ہے اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مرزا صاحب اور قاری میں وہ یگانگت و موافقت، وہ خلوص اور وہ توافق کلی نہیں پیدا ہو پاتا ہے جس کا پیدا ہو جانا شعر [illegible] ہے جبکہ میر انیس اور قاری دونوں ساتھ ساتھ اور برابر ان کے جذبے سے سرشار دنیائے تخلیق کے سفر پر رواں ہوتے ہیں۔ اسی لئے میر انیس کے مقابلہ میں مرزا دبیر کے مرثیوں کو پڑھ کر ہرگز اس بات کا احساس نہیں پیدا ہوتا کہ ہم کوئی درد انگیز نظم پڑھ رہے ہیں۔ ممکن ہے شاعر کے بطون میں غم و اندوہ کے جذبات ہوں لیکن الفاظ سے جو کچھ ظاہر ہوتا ہے وہ اس سے زیادہ نہیں کہ شاعر نے فن کی خارجی باریکیوں کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک شاندار مرثیہ کہہ دیا ہے جس میں الفاظ و تراکیب اور بندشیں ٹھوس میکانکیت لئے ہوئے ہیں۔ جبکہ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے حقیقی جذبات نہ تو اتنی باقاعدگی سے ابھرتے ہیں اور نہ ہی اس کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ پس اس قسم کے اشعار زندگی سے خود بخود خارج ہو جاتے ہیں۔

شاعری چونکہ باطنی تجربہ کا اظہار ہے اسی لئے آہنگ شاعری کا لازمی و ناگزیر عنصر ہے تاہم یہ ضروری ہے جو غیر ڈرامائی اور نیم ڈرامائی شاعری کے مقابلہ میں ڈرامائی شاعری میں زیادہ صاف، واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس نوع کی شاعری میں باتیں کرنے والے کردار کی تخلیق کرنی ہوتی ہے۔ اقبال کی نظم 'محبت' اس قسم کی شاعری کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس نظم کی ایک واضح ابتدا ہے۔ ایک نقطۂ عروج اور ایک واضح انجام ہے جس کا تال و سر بھی حسب حال گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح علامہ کی ایک دوسری نظم 'جبریل و ابلیس' ہے جو ڈرامائیت سے مملو اور داخلی و خارجی آہنگ کی اعلیٰ مثال ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اس بات کا خاص خیال رکھا ہے کہ جبرئیل و ابلیس کی فطری مناسبت کے لحاظ سے الفاظ لائے ہیں تاکہ قاری پر دو مختلف مگر صحیح قسم کے تاثراتی نقوش مرتسم ہوتے جائیں اور پھر یہ کہ نظم کی رفتار نہ اتنی تیز ہے کہ ہمارے جذبات اس کا ساتھ نہ دے سکیں اور نہ اتنی سست کہ جذبات کو آگے بڑھنے کا انتظار کرنا پڑے، یہ خوبی نظم میں اس لئے پیدا ہوئی ہے کہ الفاظ اور جذبات میں مکمل ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

لیکن آخرکار شاعری اس القا کا نام ہے جو شاعر کے قلب پر ہوتا ہے اور اس الہام کا پہنچانا نظم کی عضویاتی آہنگ کا کام ہے۔ لیکن چونکہ وقت یہ ہے کہ وہ کیفیت جس میں شاعر پر کوئی خیال القا ہوتا ہے وہ نتیجہ ہے اس کی اعصابی قوت کے غیر معمولی تناؤ کا۔ اس لئے ایسی صورت میں اس کے شعور کی سطح عام سطح سے کہیں زیادہ بلند ہو جاتی ہے۔ ظاہر ہے یہ کیفیت پائدار نہیں ہو سکتی اور نہ اسے ہونا چاہیئے۔ کولرج نے اسی بناء پر کہا تھا کہ ایک طویل نظم ساری کی ساری شاعری نہیں ہو سکتی کیونکہ کولرج کو معلوم تھا کہ شاعر اور قاری دونوں کیلئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنے شعری احساس کو زیادہ سے زیادہ طویل عرصے کے لئے قائم رکھ سکے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ عضویاتی یا شعری آہنگ وزن کی طرح کوئی باقاعدہ چیز نہیں جبکہ وزن شعر باقاعدہ صوتی سانچے کا دوسرا نام ہے۔ پس شعری آہنگ کا انحصار شاعر کی الہامی کیفیت کی نوعیت اور اس کی مدت پر ہے یعنے وجدانی نظم میں پورے تصور کا آہنگ ہوتا ہے یا اس جذبے کی یا مزاج کی اس کیفیت کی جس میں اس تصور کی تخلیق اور اس کے اجزا کی تشکیل ہوتی ہے۔ اس شعری آہنگ میں سُر و تال کس طرح پیدا ہوتا ہے کہ مجموعی بڑے خاکے کے اندر شاعر کے جذباتی لب و لہجہ میں کس طرح نشیب و فراز آئے۔ غرضکہ جذباتی لب و لہجہ کا زیر و بم طویل نظموں میں آہنگ کا احساس پیدا کرتا ہے اور مختصر نظموں میں یہ شعری آہنگ واحد اکائی کی شکل میں نظر آتا ہے۔ غزل کے اشعار اسی لئے نشتر بن کر دل میں اُتر جاتے ہیں کیونکہ ان اشعار میں شاعرانہ کیفیت کا ارتکاز زیادہ ہوتا ہے۔ اور چونکہ شاعرانہ القا کا استقلال بلکہ جذباتی استقلال عموماً ہمارے قومی مزاج میں کمتر پایا جاتا ہے اس لئے طویل نظموں اور مثنویوں کی جگہ غزلیں زیادہ مقبول ہوئیں اور نثر میں طویل ناولوں کی جگہ مختصر افسانے زیادہ لکھے گئے اور زیادہ کامیابی سے لکھے گئے۔

فرمان فتحپوری

علاقائی زبانیں اور اُردو

پاکستان میں جو زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں ان میں اُردو، بنگالی، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی اور گجراتی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ چونکہ اُردو کے ساتھ بنگالی کو بھی قومی زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے اس لئے اب علاقائی زبانوں میں صرف پنجابی سندھی پشتو، بلوچی اور گجراتی کو شمار کرنا چاہیئے۔ یہ پانچوں علاقائی زبانیں مغربی پاکستان سے تعلق رکھتی ہیں۔ مغربی پاکستان کا علاقہ دریائے سندھ کی وادی کے توسط سے دُنیا کی تہذیبی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کا مالک ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اس علاقے نے اسلامی تہذیب و تمدن کو برصغیر میں سب سے پہلے اپنایا ہے بلکہ تاریخ کے قدیم ترین دور میں اس نے دنیا کی رہنمائی بھی کی ہے۔ تاریخ کے محققین اور آثارِ قدیمہ کے ماہرین کی کوششوں سے جو نتائج اب تک ہمارے سامنے آئے ہیں ان سے یہی پتہ چلتا ہے کہ وادی دجلہ و فرات، وادی نیل اور وادی سندھ کی تہذیبیں قدیم ترین ہیں۔ تہذیب و تمدن کی اوّلین کرنیں انھیں علاقوں میں پھوٹی ہیں اور اوّل اوّل انھیں کرنوں نے انسانی ذہن کے لئے مختلف علوم و فنون کے وسیع میدان روشن کئے ہیں۔ کچھ دنوں پہلے تک مصر کی تہذیب قدیم ترین خیال کی جاتی تھی لیکن علمائے تاریخ و ثقافت کے جدید انکشافات و تحقیقات نے اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ اب ماہرین تاریخ و آثارِ قدیمہ عام طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ وادی دجلہ و فرات یعنی سمیریہ اور بابلیوں کی تہذیب مصریوں سے بھی قدیم تر ہے۔ موہنجوڈارو کی حالیہ کھدائی سے جو نقوش تازہ سامنے آرہے ہیں ان سے کوئی عجب نہیں کہ وادیٔ سندھ کی تہذیب بابل و مصر سے بھی قدیم تر ٹھہرے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہمارا ملک مغربی پاکستان کی بدولت انسانی تہذیب کا اوّلین گہوارہ قرار پائے گا۔ برصغیر میں آریوں کی تہذیب کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن موہنجوڈارو اور ہڑپا کے متعلق محققین کی عام رائے یہ ہے کہ ۳۰۰۰ ق۔م سے لوگ یہاں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے۔ یہ قدیم باشندے صنعت و حرفت اور فنِ تحریر سے واقف تھے۔ اور ان کے شہروں کے کھنڈرات بتاتے ہیں کہ وہ ایک ترقی یافتہ تمدن رکھتے تھے۔ افسوس ہے کہ اس زمانے کی تحریریں اب تک پڑھی نہیں جا سکیں لیکن جس قسم کے آلات، ظروف اور تحریری نشانات اب تک ملے ہیں ان سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ وادیٔ سندھ میں آریوں کے داخل ہونے سے بہت پہلے اس علاقے میں ایک متمدن قوم بود و باش رکھتی تھی۔ اس لحاظ سے دریائے سندھ سے سیراب ہونے والا علاقہ تاریخ بھی انسانی تہذیب و تمدن کے قدیم ترین گہواروں میں سے ہے اور ہم پاکستانی دُنیا کے اوّلین تہذیبی گہواروں کے وارث ہونے کی حیثیت سے اس علاقے پر جس قدر فخر کریں کم ہے۔

یہ تو خیر قبل از اسلام کی باتیں ہیں ممکن ہے بعض حضرات میرے نقطۂ نظر سے اختلاف کریں اور مذہب کا سہارا لے کر اس تہذیبی ورثے کو زیادہ اہمیت نہ دیں لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اسلامی تہذیب و تمدن کی پہلی کرنیں بھی برصغیر کے اسی علاقے پر پڑی ہیں برصغیر کے مسلمانوں نے جس مسلم قومیت کا نعرہ لگایا تھا اور جس مسلم ثقافت و تمدن کے تحفظ کے نتیجے پر پاکستان وجود میں آیا ہے اس کی پہلی اینٹ اسی علاقے میں رکھی گئی تھی۔ اس سے انکار نہیں کہ حضرت عمر کے زمانے ہی سے ساحل سندھ پر عربوں کے حملے شروع ہو گئے تھے لیکن سیاسی اور تہذیبی حیثیت سے تاریخ کا سب سے اہم کارنامہ سن ۷۱۲ء میں محمد بن قاسم کا سندھ پر حملہ ہے جس نے دیبل اور ملتان تک کے علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے برصغیر میں ایک نئے مذہب اور نئی تہذیب کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس نئی تہذیب کے پہلو ایک دو نہیں کئی ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ قدیم، سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ کارآمد پہلو وہ ہے جس نے اردو زبان کو جنم دیا۔ ہر چند کہ میرے اس نقطے میں ادب و زبان کے محققین کے لئے موشگافی کی گنجائش باقی رہتی ہے لیکن اگر یہ سچ ہے کہ اردو برصغیر کی قدیم علاقائی بولیوں اور عربی و فارسی کے باہم میل جول سے وجود میں آئی ہے تو پھر یہ کہتے ہوئے جھجکنا نہ چاہیئے کہ یہ میل جول سب سے پہلے اسی علاقے میں شروع ہوا ہوگا۔ اس لحاظ سے مغربی پاکستان سے اردو کا تعلق نیا نہیں بہت پرانا ہے۔ اور اس میں پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان بھی شامل ہیں

اب جبکہ اردو کو پاکستان کی قومی زبان قرار دیا گیا ہے اور جس کی تعلیم و تدریس کا انتظام پورے مغربی پاکستان میں کیا جا رہا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو اور علاقائی زبانوں کے تعلق کو زیادہ سے زیادہ مضبوط بنایا جائے۔ یہ اس طرح ممکن ہے کہ جو لوگ علاقائی زبانیں نہیں جانتے وہ ان کی طرف متوجہ ہوں۔ وہ لوگ اردو کے سوا پنجابی، سندھی یا پشتو وغیرہ بھی جانتے ہیں وہ اخذ و ترجمہ کے ذریعے اردو کو علاقائی زبانوں سے متعارف کرائیں۔ اس سے دونوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اردو کا دامن وسیع ہوگا۔ وہ مقامی رنگ روپ اختیار کرے گی اور قومی زبان کی حیثیت سے بہت جلد ملک کے ہر علاقے کے باشندوں کے لئے باہم تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن جائے گی۔ مختلف علاقوں کے لوگ جب اپنی علاقائی بولی کے اثرات و نقوش اردو میں پائیں گے تو طبعاً وہ اس کی طرف لپکیں گے۔ علاقائی زبانیں بھی گھاٹے میں نہ رہیں گی۔ پنجابی، سندھی اور پشتو ابھی تک اپنے اپنے علاقوں تک محدود ہیں۔ ان زبانوں کے ادیبوں اور شاعروں کی شہرت کا دائرہ بہت محدود ہے لیکن اگر علاقائی ادب کے کارآمد پہلوؤں کو اردو میں منتقل کر لیا جائے تو پنجابی، سندھی، پشتو یا بلوچی ادب اور ادیبوں کے اثرات کا حلقہ بھی وسیع تر ہوتا جائے گا۔ یہ صحیح ہے کہ اردو میں علاقائی زبانوں کے بکثرت الفاظ شامل ہیں اور علاقائی زبانوں کی طرح اس کا حلقۂ اثر کسی خاص خطۂ زمین تک محدود نہیں ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسے علاقائی زبان و ادب کی اہم روایات و اقدار سے شعوری طور پر روشناس کیوں نہ کرایا جائے؟۔ اردو کو قومی زبان کی حیثیت سے مقبول اور اس کے ادب کو پاکستانی قومیت کا متحمل بنانے کے لئے اس میں علاقائی ادب کی معروف و مقبول روایات کیوں نہ داخل کی جائیں۔ ان علاقوں کے تاریخی مقامات، دریا، پہاڑ، پھل پھول، باغ و راغ، قصے کہانی، رسم و رواج، سورما، شجاع، شاعر، صوفی سب کو اردو میں کیوں جگہ نہ دی جائے۔ جب فارسی و عربی کے گل و بلبل، یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، رستم سہراب، وامق عذرا، محمود و ایاز، سکندر و دارا، دجلہ و فرات، جیحون سیحون، اصفہان و شیراز وغیرہ اردو میں جگہ پا سکتے ہیں اور سنسکرت و ہندی سے چاند چکور، سیتا رام، راون و رام، لچھمن و بھرت، بھیم و ارجن، گنگا جمنا، کرشن جی، مرلی، گوکل، گوپی، پریت، پیتم، پاتال، کامروپ، گوبر گنیش، کالکا وغیرہ کے الفاظ و تراکیب اپنائی

جاسکتی ہیں تو پھر سسی پنوں ۔ ہیر رانجھا ۔ لیلا چنیسر ۔ عمر ماروی ۔
مرزا صاحبان ۔ خانیار ۔ راوی ۔ چناب ۔ سندھ ۔ شاہی مسجد
اور گاما وغیرہ کو اصطلاحات و تلمیحات کے طور پر اُردو میں
کیوں رواج نہ دیا جائے ۔ جب تک ایسا نہ کیا جائے گا اُردو
پاکستان کی تہذیب یا قومیت کی ترجمانی کا حق ادا نہ کرسکے گی۔

پنجاب چونکہ قدیم زمانے سے اُردو کا مرکز رہا ہے اور
یہاں کے لوگ بیک وقت پنجابی و اُردو دونوں زبانوں کو فروغ
دیتے رہے ہیں اس لئے پنجابی کے الفاظ ۔ محاورات اور بعض
ادبی روایات آسانی سے داخل ہوگئی ہیں ۔ لیکن دوسری
علاقائی زبانوں سے اُردو ابھی کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئی ۔ اس
سلسلے میں سب سے مناسب اور مفید کام یہ ہو سکتا ہے کہ علاقائی
زبانوں کے منظوم اور نثری افسانے اُردو نثر و نظم میں منتقل
کئے جائیں اور کم از کم ان کے کرداروں کو تلمیح و مثال کے طور
پر اُردو ادب کے رموز و علائم میں داخل کیا جائے ۔ پنجابی اور
سندھی دونوں میں افسانوی ادب کا اچھا ذخیرہ ہے اور ان
کی بعض کہانیاں مصحفی و انشا کے زمانے ہی میں غیر معمولی شہرت
پاچکی تھیں ۔ چنانچہ ایک جگہ پنجابی منظوم عشقیہ افسانہ ہیر رانجھا کی
داد انشاء اللہ خاں نے اس طور پر دی ہے ۔

سُنا یارات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

اس قسم کی داستانوں میں ہیر رانجھا سسی پنوں اور
سوہنی مہینوال کی کہانیاں خاص طور پر قابل توجہ ہیں ۔ سسی
پنوں کا قصہ تو پورے مغربی پاکستان میں شہرت رکھتا ہے اور
پنجابی ۔ سندھی ۔ پشتو تینوں زبانوں میں ایک بار نہیں کئی بار
نظم کیا جاچکا ہے ۔ پنجابی میں ہاشم شاہ نے اس قصے کو نظم کرکے
بڑی شہرت حاصل کرلی ہے ۔ لیکن اس قصے کا بنیادی تعلق پنجاب
سرحد سے نہیں بلکہ سندھ سے ہے ۔ ہوا یہ کہ شاہ عبداللطیف
بھٹائی کے بعد اس داستان کو احمد شاہ درانی کے عہد میں ہاشم شاہ
نے پنجابی میں نظم کیا اور اس میں فنی دلکشی کے ایسے آثار پیدا
کردئیے کہ وہ سندھ کی طرح پنجاب کی بھی مقبول ترین داستان
خیال کی جانے لگی ۔ غالباً ہاشم شاہ کے ذریعہ اس نظم کی شہرت
سرحد تک پہنچی اور اس کا ترجمہ پشتو میں کیا گیا ۔ اس قصے کی دلکشی
و مقبولیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے
متعدد فارسی شعراء کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا ہے ۔ منشی جوت
پرکاش اثر نے ۱۷۲۴ء/۱۱۳۶ھ میں اسے دستور عشق کے نام سے
فارسی مثنوی کی صورت میں منتقل کیا ۔ اندرجیت نے ۱۷۲۷ء/۱۱۴۰ھ
میں "نامۂ عشق" کے نام سے نظم کیا ۔

۱۸۳۵ء/۱۲۵۱ھ میں محمد حسین شہباز نے فارسی میں نظم کیا اور
"وقائع پنوں" نام رکھا ۔ ۱۸۴۰ء/۱۲۵۶ھ میں ایک اور فارسی شاعر
فرخ بخش فرحت نے اسے فارسی میں منظوم کیا ۔ غرض اس
داستان کی شہرت پاکستان سے باہر افغانستان و ایران تک
پہنچ چکی ہے ۔ اگر اُردو والے بھی اس طرف توجہ کریں تو نقصان
میں نہ رہیں گے ۔ سسی پنوں کی داستان بڑی دلکش ہے ۔

علاقائی زبانوں کے اس قسم کے قصوں سے قدیم اُردو
شعرا بھی یکسر ناآشنا نہیں تھے بعض نے انھیں اُردو نظم کا جامہ
پہنانے کی کوشش کی ہے ۔ ابھی فارسی منظوم ترجموں کا ذکر ہو
چکا ہے ۔ ۱۱۹۷ھ میں نواب محبت خاں شاگرد جرأت نے سسی
پنوں کو اُردو مثنوی کی صورت میں نظم کیا ۔ اور اسرار محبت نام
رکھا ۔ اس مثنوی کا ایک قلمی نسخہ انجمن ترقی اُردو کے کتب خانۂ
خاص میں موجود ہے جو ۱۲۴۳ھ کا لکھا ہوا ہے آغاز داستان
سے پہلے حمد کے اشعار ہیں بعد ازاں میر تقی میر کے انداز میں
عشق و محبت کی تعریف یوں کی گئی ہے ۔ ؎

محبت نام اور ہر دل مکیں ہے
محبت سے کوئی خالی نہیں ہے
محبت ہی سے بھڑکی گلخن دل
محبت ہی سے برقِ خرمن دل
کہوں میں کیا کہاں تک ہے محبت
زمیں سے آسماں تک ہے محبت

اس کے بعد کے منتخب اشعار میں بھی عشق کے جذبۂ اثر پر روشنی ڈالی گئی ہے پھر دو صفحوں میں "اسرار عشق" کے رموز و نکات کا بیان ہے۔ بعد ازاں اصل قصہ شروع ہوتا ہے اس طرح پوری مثنوی کوئی ساڑھے چھ سو اشعار پر مشتمل ہے۔ آخری شعر یہ ہے۔

کہی تاریخ اس کی یہ بہ صنعت
عجب قصہ ہے اسرار محبت

اس کے دوسرے مصرعے سے تصنیف کا سال ۱۱۹۵ھ نکلتا ہے۔ مثنوی بلحاظ زبان و بیان کافی شگفتہ ہے نواب محبت خاں میں مثنوی نگاری کا اچھا سلیقہ نظر آتا ہے اس لئے کہ انھوں نے ہر واقعہ اور ہر موقع کے موثر تصویر کھینچنے کی کوشش کی ہے۔ جذبات نگاری کے بعض نہایت کامیاب نمونے اس میں ملتے ہیں۔ مثلاً سستی کے غم فراق کا حال یوں نظم ہوا ہے۔

ہوا خون جگر آنکھوں سے جاری
لگا دل بر میں کرنے بے قراری
پہ سینے میں پھڑکتا تھا دلِ زار
قفس میں جوں ہو مرغ نو گرفتار
نظر کو پیش و پس اودھر ادھر کو
لگی رونے وہ دھر زانو پہ سر کو
ہوا یہ یک بیک حال تن زار
کہ ہو جیسے کوئی مدت کا بیمار
جنونِ عشق جب ہوتا تھا تازہ
نکل جانے کا کرتی تھی ارادہ
کبھی دو دو پہر آوارہ پھرنا
کبھی اٹھنا کبھی غش کھا کے گرنا
کبھی حیران ہو اک سمت تکنا
کبھی بیٹھے کچھ آپ ہی آپ بکنا
اسے جب کوئی سمجھانے کو آتا
تو یہ روتی کہ بس جی ڈوب جاتا
کبھی چپ اور کبھی رو رو بلکتی
بسانِ موج سر دے دے پٹکتی

اس قسم کے اشعار اور داستان کے خلاصے سے سستی پنوں کے قصے کی اہمیت و دلکشی کا اندازہ کم و بیش کیا جا سکتا ہے۔ یہی نوعیت دوسرے علاقائی افسانوں کی ہے جیسا کہ میں نے شروع میں عرض کیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ اس قسم کی علاقائی داستانوں سے اُردو کو روشناس کرایا جائے۔ اُردو میں ان کے ترجمے کرائے جائیں اور پرانے ترجمے مدون کر کے مقدمہ و حواشی کے ساتھ شائع کئے جائیں۔ مثلاً ابھی جس اُردو سستی پنوں منظوم کا ذکر کیا گیا ہے وہ ہر لحاظ سے اہم ہے اور پنجابی۔ پشتو یا سندھی ادیبوں کو چاہیئے کہ وہ اس نظم پر تحقیقی مقدمہ تیار کریں اور اسے منظر عام پر لائیں۔ اس قسم کی دوسری داستانوں کو بھی اُردو میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس طرح اُردو زبان کا دامن وسیع ہوگا۔ اس پر مقامی رنگ چڑھنے لگے گا اور رفتہ رفتہ وہ پاکستانی قومیت اور ملکی تمدن سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جائے گی۔

ظہور نظر

ڈھارس

اے دلِ مایوس اتنا غم نہ کر!
وہ ستمگر وہ وفا نا آشنا
جس کی چاہت میں ہوا تیرا یہ حال
مڑ کے دیکھے گی، تو روئے گی بہت
دُور جا کر آئے گا اس کو خیال
تیرا، میرا، اس محبت کا، جسے
کر دیا اُس کی اَنا نے پائمال
پیار کی تو اک گھڑی رہتی ہے:
تُو نے تو پُوجا ہے اس کو ماہ سا

اے دلِ مایوس اتنا غم نہ کر!
آ، کوئی تسکیں کی صورت کریں :
آ، ذرا چھان آئیں پھر وہ رہگزار
گھوم کر کل شام جس پر دیر تک
میں نے بھی، تو نے بھی پایا تھا قرار
جس کے پہلو میں ہیں لاکھوں نقش ذہن
تجھ سے بھی بدتر ہے جس کا حالِ زار
سو رہا ہے جس کے اک اک موڑ پر
اَن گنت مُردہ بہاروں کا غبار
بچھ رہی ہے خاک ہونے کے لئے
جس کے سینے پر ردائے برگ و بار
اِس قدر ویرانیوں کے بعد بھی
جس کے دامن میں درختوں کی قطار
زرد پتوں سے دیئے روشن کئے
کر رہی ہے فصلِ گل کا انتظار
اَے دلِ مایوس اتنا غم نہ کر!
آئے گی، تجھ پر بھی آئے گی بہار!!

نبیل نقوی

نکتہ چیں ہے غمِ دل

عشق نے جب بھی کیا ہے غمِ دوراں سے خطاب
دشتِ احساس سے اک شورِ فغاں اُٹھا ہے
جب بھی دل شورشِ جذبات سے مغلوب ہوا
دل سے سہمی ہوئی آہوں کا دُھواں اُٹھا ہے

لذتِ حسرتِ دیدار کا افسونِ جمیل
دل کو اک کشمکشِ غم میں پھنسا دیتا ہے
یا کبھی ترکِ ملاقات کی لوری دے کر
دل کو بے کیف سی اک نیند سُلا دیتا ہے

کون ہے جس سے غمِ عشق کا شکوہ کیجیے
کون سُنتا ہے بہاروں میں خزاں کے قصّے
کس کو فرصت ہے کہ اربابِ جنوں کی خاطر
پھر سے دہرائے غمِ عشقِ بُتاں کے قصّے

کون بتلائے کہ دولت کے نہاں خانوں میں
جب بھی بھڑکا ہے کہیں شعلۂ عشرت طلبی
جب بھی سمٹی ہے تنک آبی دریائے نشاط
کام آئی نہ کبھی حُسن کی عالی نسبی

گرم ہے کب سے زلیخائیٔ ہوس کا بازار
پارہ پارہ ہوئے تقدیس کے دامن کتنے
کتنی سیتاؤں کی عفت کو ملوّث کرنے
عرصۂ دہر میں پیدا ہوئے راون کتنے

وہی قصّے جنھیں تہذیب کے آئینے میں
آج بھی دیکھنا چاہیں تو نظر آتے ہیں
جن کی تفصیل میں مضمر ہیں جنوں کی اقدار
آج بھی خلوتِ احساس میں در آتے ہیں

اگلے وقتوں کے تھے وہ لوگ چلو مان لیا
جن کو ہم "اہلِ نظر قبلہ نما" کہتے ہیں
لیکن ان طرفہ نژادوں کے لئے ہے کیا حکم
جن کی ہر بات پہ ہم نامِ خدا کہتے ہیں

احسن احمد اشک

ڈراما

دوش پر ہابیل کی لاش اُٹھائے ہوئے سوچ میں قابیل ہے خون چھپائے کہاں
سخت بہت ہے زمیں دور بہت آسماں!

راہ نما، پیشوا، رشی، منی، اولیا، مصلحین و انبیا، عاقبت و آخرت:
فطرتِ گمراہ پر کتنی ہی پابندیاں

نیند میں سقراط ہے زہر کا پیالہ پئے، جرم ہے اعلانِ حق اس کی سزا مختلف:
خواریاں، رسوائیاں، دار و رسن، بیڑیاں

شیش محل کی فضا سنوری ہوئی کہکشاں، تخت پہ بیٹھے ہوئے نادر و چنگیز خاں
ساز و دف و چنگ پر رقص کناں مہوشاں، صندل و کافور کی ترشی ہوئی پنڈلیاں
راجکماروں کی بھیڑ ــ سیناپتی، رانیاں، باادب و باخبر خواجہ سرا، لونڈیاں،
شاعروں بھانڈوں کی بھی مدح سرا ٹولیاں

پالکیاں، ڈولیاں، پردہ نشیں بیبیاں ـــــ گلشنیاں شہزادیاں
چھپ کے نظر بازیاں

جاگے ہوئے میکدے سوئی ہوئی بستیاں رات کے سناٹے میں سازشیں سرگوشیاں
ڈاکہ زنی، چوریاں

حُسن کے بازار میں نائکائیں نوچیاں

موٹریں، اسکوٹریں، بینڈ، نائٹ کلب، ناچ گھر
گوری جواں ناریاں، مدھ کی بھری گگریاں، مستیاں، انگڑائیاں، مسکی ہوئی چولیاں
ٹوٹی ہوئی چوڑیاں

کوروں کی پانڈوں کی جنگ بیر جیالے جواں
خون کا تحفہ لئے آگ کے رتھ پر سوار، آگ کی اور خون کی بہتی ہوئی ندیاں
نینوا، الجیریا، کانگو اور کوریا —— جلتے ہوئے شہر اور جلتی ہوئی بستیاں

علم ارسطو تمام سیل سکندر میں گم
آئن سٹائن، بو علی بے وطن و در بدر، لارڈ رسل، سارتر فکر غلط بے اثر
رابعہ و طاہرہ بن کو بسائے ہوئے، گوتم و عیسیٰ کے بت خوں میں نہائے ہوئے
رُوحِ محمد تجلی تو بھی حیراں

کانفرنس، مشورے، چیخ، شملہ، یالٹا ——
شانتی کے نام پر اور بھی خونریزیاں، دامنِ تہذیب پر اور بھی گلکاریاں،
اور بھی بربادیاں

پھر نئی آبادیاں
بند بھی کر لو اگر آنکھ کی یہ کھڑکیاں، وقت کے اسٹیج پہ صبحِ ازل سے رواں
ایک سی پرچھائیاں

ایک سی پرچھائیاں

ظہیر کاشمیری

○

اک شخص رات بندِ قبا کھولتا رہا
شب کی سیاہیوں میں شفق گھولتا رہا

تنہائیوں میں آتی رہی جب بھی اس کی یاد
سایہ سا اک قریب مرے ڈولتا رہا

حسنِ بہار خوب مگر دیدۂ بہار
صحنِ چمن کی خاک پہ کیوں رولتا رہا

اُس نے سکوت کو بھی تکلم سمجھ لیا
کچھ اس ادائے خاص سے دل بولتا رہا

ہجراں کی رات مشغلۂ دل نہ پوچھیے
اُس زلفِ خم بہ خم کی گرہ کھولتا رہا

ہم کشتگانِ خواب، گراں گوش ہی رہے
سورج۔ سروں پہ وقتِ سحر بولتا رہا

عرضِ نیازِ شوق پہ وہ جانِ اعتبار
گردن جھکائے دل کو مرے تولتا رہا

اس راہِ جذب سے بھی گزرنا پڑا ظہیر
جس راہ میں خرد کا قدم ڈولتا رہا

سلیمان اریب

○

کانٹوں کی نہ پھولوں کی زباں مانگ رہا ہوں
لے دردِ نہاں حسنِ بیاں مانگ رہا ہوں

کیا سود و زیاں عشق و ہوس سب سے گزر کر
دُنیا کو یقیں دے کے گماں مانگ رہا ہوں

دُکھ درد تو مجھ کو مری قسمت سے ملے ہیں
کچھ تم سے نہ اے چارہ گراں مانگ رہا ہوں

ہر گام پہ جلنا ہی جو ٹھہرا ہے مقدر!
ہر گام پہ اک برقِ تپاں مانگ رہا ہوں

اُس گرد سے جو خود مرے قدموں سے اُٹھی ہے
کھوئی ہوئی منزل کا نشاں مانگ رہا ہوں

انسان کا غم ہی مجھے مل جائے بہت ہے!
میں عشرتِ کونین — کہاں مانگ رہا ہوں

ہر قلب کو شائستۂ رفعت جو بنا دے
میں دہر میں وہ طرزِ فغاں مانگ رہا ہوں

شاعرؔ لکھنوی

○

کیا کہیے مفہومِ جنوں سے ہیں کتنے بیگانے لوگ
دیوانوں کو ہوش کی باتیں آتے ہیں سمجھانے لوگ
ترکِ وفا کے یونہی کیا کم کہتے ہیں افسانے لوگ
اور قیامت بن جاتے ہیں یہ جانے پہچانے لوگ

دار و رسن کا قصہ چھیڑو خونِ جگر کی بات کرو
رسمِ محبت ہم کیا جانیں، ہم تو ہیں دیوانے لوگ
جلتی آنکھیں، تپتے چہرے، ساکت ہونٹ، سلگتے دل
اُس محفل میں چُپ رہ کر بھی کہتے ہیں افسانے لوگ
جام اُٹھائیں لب تک لائیں اتنا کسی کو ہوش کہاں
دیکھ کے ان آنکھوں کی گردش بھول گئے پیمانے لوگ
کتنے سادہ، کتنے رنگیں، کتنے پیارے لگتے ہیں
روٹھے روٹھے، برہم برہم، بیگانے بیگانے لوگ
کیسے کیسے گل مرجھائے، کیسے کیسے باغ جلے
صدیوں میں بھی کہہ نہ سکیں گے لمحوں کے افسانے لوگ
ماہرِ فن جو نکلے ان کو عظمتِ فن کا تاج ملا
ہم تو اک فنکار رہے تھے شاعرؔ ہم کو کب پہچانے لوگ

مجروحؔ سلطانپوری

○

اہلِ طوفاں آؤ دل والوں کا افسانہ کہیں
موج کو گیسو بھنور کو چشمِ جانانہ کہیں
وہ شہِ خوباں کہ مہر ہے پھر چلیں اس کے حضور
زندگی کو دل کہیں اور دل کو نذرانہ کہیں
سُرخیِ مے کم تھی میں نے چھو لیے ساقی کے ہونٹ
سر جھکا ہے جو بھی اب اربابِ مے خانہ کہیں
اے رُخِ زیبا بتا دے اور ابھی ہم کب تلک
تیرگی کو شمعِ تنہائی کو پروانہ کہیں
تشنگی ہی تشنگی ہے کس کو کہیے مے کدہ
لب ہی لب ہم نے تو دیکھے کس کو پیمانہ کہیں
پارۂ دل ہے وطن کی سرزمیں مشکل یہ ہے
شہر کو ویراں کہیں یا دل کو ویرانہ کہیں
آرزو ہی رہ گئی مجروحؔ ہم کہتے کبھی
اک غزل ایسی جسے تصویرِ جانانہ کہیں

رفیق خاور جسکانی

○

وردِ دو غم زمانے کے، اور ایک جی، تنہا
آندھیوں میں جلتی ہے، شمعِ زندگی، تنہا
اپنی اپنی راہیں ہیں، اپنی اپنی منزل ہے
کارگاہِ ہستی میں، رہتے ہیں سبھی تنہا
شب کے داغِ ہجراں کا واسطہ عجب شے ہے
تیری دلکشی تنہا، میری بے کلی تنہا
جیسے اس زمانے میں اہلِ فن کی بے قدری
موسمِ زمستاں میں جیسے چاندنی تنہا
جانے دل کی دھڑکن میں کیا فریب ہوتا ہے
تجھ سے بات کرتے ہیں ہم کبھی کبھی تنہا
رہ گزر پہ سجتی ہے اپنی بزمِ تنہائی
تیرے نقشِ پا تنہا، میری بے خودی تنہا
حسن و عشق کی تقدیر اک تضاد باہم ہے
اُن کی شام بھی محفل، اپنی صبح بھی تنہا
کون کس کی سنتا ہے ایسے دور میں خاور
ہم نے دور چھیڑی ہے غم کی راگنی تنہا

اقبال ماہر حیدرآباد (دکن)

○

پرتوِ ماہ سرِ چرخِ کہن ہے کہ نہیں
کہیں اُمید کی ہلکی سی کرن ہے کہ نہیں
گرد آلود ابھی چرخِ کہن ہے کہ نہیں
وہی پژمردگیٔ صحنِ چمن ہے کہ نہیں
چادرِ گل کسی تربت کی ہے یہ کا بحشال
چاندنی پھیلی ہوئی مثلِ کفن ہے کہ نہیں
مطربا لب پہ حدیثِ مے و مینا کب تک
تیرے نغموں میں نیا طرزِ سخن ہے کہ نہیں
لالہ و گل بھی ہیں پابندِ عتاب دل بھی اسیر
کہیں آزاد کوئی اہلِ چمن ہے کہ نہیں
امن عالم کی کہانی ہے زباں پہ جن کے
ان سے پوچھو خبرِ اہلِ وطن ہے کہ نہیں
وہی ذرّے کہ جو مدت سے ہیں محرومِ سحر
اُن کی تقدیر میں سورج کی کرن ہے کہ نہیں
بیرِ ساقی ہے نہ ساغر سے حذر ہے مجھ کو
بادۂ نو سے بھرا جامِ کہن ہے کہ نہیں
عقل ہے اپنی ہی فطرت سے جہنم بردوش
عشق فردوسِ محبت میں مگن ہے کہ نہیں
عظمتِ عشق کا اقرار رہی تجھ کو مگر
میری جانب بھی ترا روئے سخن ہے کہ نہیں
جس کو تقدیر سے منسوب کیا تھا ماہر
وہ ستارہ بھی سرِ چرخِ کہن ہے کہ نہیں

ابن العزیز فطرت

○

کچھ ایسا تھا گمرہی کا سایا
اپنا ہی پتا نہ ہم نے پایا
دل کس کے جمال میں ہوا گم
اکثر یہ خیال ہی نہ آیا

ہم تو ترے ذکر کا ہوئے جزو
تو نے ہمیں کس طرح بھلایا؟

اے دوست! تری نظر سے میرا
ایوانِ نگاہ جگمگایا

خورشید اسی کو ہم نے جانا
جو ذرّہ زمیں پہ مسکرایا

مقصود تھی تازگی چمن کی
ہم نے رگِ جاں سے خوں بہایا

اُفتاد ہے سب کی اپنی اپنی
کس نے ہے کسی کا غم بٹایا

محرومیٔ جاوداں ہے، اور میں
میں ذوقِ طلب سے باز آیا

ہر غم پہ ہے میرے نام کی مُہر
فطرتؔ کوئی غم نہیں پرایا

حافظؔ لدھیانوی

○

رات بھر لطف رہا انجمن آرائی کا
یہ بھی دیکھا ہے کرشمہ شبِ تنہائی کا

اپنی ہی آگ میں جل بجھنا کوئی کھیل نہیں
حوصلہ دیکھیے کوئی لالۂ صحرائی کا

اب ترے نام سے پہچانتے ہیں لوگ مجھے
مل گیا مجھ کو صلہ میری جبیں سائی کا

لطفِ دیوانگیٔ عشق بڑی نعمت ہے
دامنِ ہوش پہ سَو داغ ہے رُسوائی کا

دل کے ویرانے سے کوئی نہیں گزرا حافظؔ
کس کو اندازہ ہوا اس دشت کی پہنائی کا

پروفیسر شبیر رضانی

(ثقافتی ورثہ)

خوشحال خان خٹک کے افکار

سارا جہاں زیرِ نگیں ہو تو پھر بھی تم
جاؤ گے یاں سے داغِ تمنا لئے ہوئے

سفید و سادہ کاغذ ہے مگر کردارِ انساں کا
سیاہی اس پہ گر جائے تو پہلا سا نہیں رہتا

میں اس کا دوست ہوں اس کو عزیز رکھتا ہوں
کہ جس کے ظاہر و باطن میں کوئی فرق نہیں

میں سوچتا ہوں کہ کیوں کر گزار دیتے ہیں
وہ زندگی کہ جو بے آبرو گزرتی ہے

یہ حسن یہ سرخیٔ لالہ یہ رنگ رنگ چمن
دکھائی دیں تو تجھے دیکھنا مبارک ہو

زلف اس کی ہے زنجیر تو رخ اس کا ہے کعبہ
کعبہ کی طلب ہو تو یہ زنجیر پکڑ لے

خوشحال ایک چہرۂ زیبا کی ہے تلاش
پکھلی[۱] میں ہو، ہو بونیر[۲] میں ہو یا سوات[۳] میں

سابق صوبہ سرحد کے علاقے ۳۔ ریاست سوات

ضیاالمحسن موسوی

اُستاد ناظم

اُستاد ناظم نے کلک کے قلم اور سیاہ روشنائی سے خالی کاغذ پر کوئی دس مرتبہ یہ شعر لکھا تھا

یادشہ زادہ ستمگری شود
تیغ چوں بشکست خنجری شود

حاشیۂ پرستگر کاغذ نسخ نستعلیق ثلث شکست کی خطوں میں بار بار لکھا گیا تھا۔ میں نے قدموں کی آہٹ سن کے کاغذ گاؤ تکیے کے نیچے رکھ دیا وہیں جہاں اُستاد اُسے چھوڑ گئے تھے اور اس شیشی سے کھیلنے لگا جس میں ریت بھری ہوئی تھی جس سے اُستاد جاذب کا کام لیتے تھے۔ اُستاد نے مجھے دیکھ کے میرے سلام کا انتظار کئے بغیر "جیتے رہو سلامت رہو" کا نعرہ لگایا اور میں سلام کو جھک گیا۔ مسند پر بیٹھتے ہی اُستاد نے میرے بائیں ہاتھ کی طرف ناگوار نظروں سے دیکھا جس میں ریت کی شیشی تھی، مڑ کے صندوقچہ کھولا اور ایک جھنجھنا نکال کے مجھے دیتے ہوئے بولے۔ "لیجئے شوق فرمائیے!"

میں نے شرمندہ ہو کے شیشی ہاتھ سے رکھ دی مگر اُستاد کا ہاتھ اب بھی بڑھا ہوا تھا۔

"جناب آپ کے اپنے متعدد کھلونے میرے پاس آ سکتے ہیں اور میرے قلم دوات اور کاغذ دبانے کے پتھروں سے شغل فرمایا کرتے ہیں اس لئے میں نے آپ حضرات کے لئے یہ جھنجھنا خرید لیا ہے لیجئے۔ بجائیے! کوئی حرج نہیں بچپن کی عادتیں مشکل سے چھوٹتی ہیں۔ ہاتھ میں چل ہوتی ہے تو کھلونے سے چل مٹائیے مگر اس بندۂ عاجز کے دوات قلم پر رحم فرمائیے"

میں نے مزید شرمندگی کا اظہار کرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"جی اُستاد غلطی ہو گئی۔ یونہی میں دیکھنے لگا تھا کہ شیشی میں کیا چیز ہے؟

"یونہی؟ ارے صاحب یونہی آپ پاجامے گئے ہیں اور کرتا ٹانگوں میں کیوں نہیں ڈالتے؟ آخر یونہی کا کیا مطلب ہوا! آپ تو شریف زادے ہیں تعلیم یافتہ خاندان کے فرد ہیں آپ کوئی شہزادے نواب زادے تو ہیں نہیں کہ ساری زندگی یونہی گزر جائے۔

اور مجھے موضوع بدلنے کا موقع مل گیا میں نے پوچھا "اُستاد شہزادے صاحب کا کیا حال ہے۔ ان کی شاعری کا کیا رنگ ہے؟"

میرا حربہ کامیاب رہا اب اُستاد کی ناگواری کا رخ دوسری طرف ہو چکا تھا۔

"شہزادے صاحب! عالی جاہ بہادر! اور ان کی شاعری!
[illegible] سوال کیا تم نے میاں اہل کمال کا قدرت امتحان لیتی
[illegible] غالب کے احوال سے تو تم آگاہ ہو وہ واقعی اہل کمال
[illegible] لئے سے

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے

[illegible] تو ہم نے استادوں کی جوتیاں سیدھی کی ہیں
[illegible] پھرے ہیں اہل کمال کی صحبت اٹھائی ہے اس لئے
[illegible] مقدر پھر میرا بھی امتحان قدرت کو مطلوب ہے
وہ ہو رہا ہے اب اس کا شکوہ کیا؟!

ہم نے سوچا تھا ہمارے باپ دادا اہل سخن تھے اہل قلم تھے ایرانی تورانی درباروں میں قصیدے سنائے پنج ہزاری شش ہزاری منصب حاصل کئے یا درباری [illegible] مقرر ہوئے گل و بلبل کی زبانی آدم زادوں کے دکھ درد مدح و ثنا کی مخمل کشتیوں میں لگا کے پیش کئے اول [illegible] کمانا تھی پھر یہ بھی مطلوب تھا کہ شاید گراں گوشی کم ہو اور دل کی دھڑکنیں بھی سن سکیں مگر اس ڈھنگ اسلاف [illegible] سے پالا پڑا ہے وہ خدا کسی پر نہ ڈالے. لونڈے [illegible] ہوتے ہیں ہر جمعرات ہوتی ہے گویوں سے اپنی غزلیں [illegible] ہیں. اپنے کو امیر خسرو سے کم نہیں سمجھتے شاعری میں ان کو کمال حاصل موسیقی میں وہ موجد کا درجہ رکھتے ہیں فلسفے میں بو علی سینا کی کیا حقیقت ہے غرض جہل مرکب کی چلتی پھرتی تصویر ہیں. ابھی تک استاد کی سفید داڑھی میں کالک نہیں لگائی ہے مگر بڑی گھڑی سے اللہ محفوظ رکھے لونڈے نہ معلوم کیا کیا سمجھا دیتے ہیں اور اسی کے مطابق غزل میں اصلاح کی فرمائش ہوتی ہے. اب یہی دیکھو کہ کل رات ایک مصرعے کو اس طرح بدلنا چاہتے تھے کہ اعلان نون ہو رہا تھا اور منافقت کے ساتھ! میں نے کہا نا بابا نا مجھ سے فن کا خون [illegible] اب اصلاح پر صاد نہیں کر سکتا علمائے کرد [illegible]. [illegible] ہے کہ اعلان نون [illegible] السلف والاضافت نادرست ہے کھلا ہوا عیب ہے مگر صاحبزادے مصر تھے کہ استاد یہاں تو یہ لفظ میرا معلوم ہوتا ہے میرا......"

میں خوش تھا کہ استاد کی بوچھار کا رُخ تو بدلا میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا

"استاد غزل تو آپ کی ہوتی ہے عالی جاہ کو ایسے شعر کہنے کی کب تمیز ہے؟"

"ہا! خبردار! اب تو ایسی بات کی ہے کہ آئندہ کبھی میں تمہاری زبان سے نہ سنوں! ایسی باتیں کہی جاتی ہیں اول تو استاد کا مال شاگرد کا مال پھر امیروں اور رئیسوں اور دربار سرکار کے معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے. میں تو اس زمین میں کبھی اپنی غزل بھی نہیں سناتا جس میں نواب عالی جاہ بہادر کی غزل ہوتی ہے کوئی شعر ان کے شعر سے چست ہو گیا کوئی قافیہ زیادہ اچھا نظم ہو گیا تو آفت آئی سمجھو...."

یہ کہہ کے استاد اٹھے اور دیوان خانے کے باہر تک جھانک کے دیکھ آئے کہ کوئی آدمی پاس کھڑا سن تو نہیں رہا ہے شہر کی فضا ہی کچھ ایسی تھی کہ محتاط اور تجربہ کار لوگ تو کجا عام آدمی بھی ایسے معاملات میں کھسر پھسر کرتے تھے کہیں کوئی خفیہ پولیس والا نہ سن رہا ہو. خفیہ پولیس کیا تھی فرشتے تھے جو ہر دم ہر جگہ مسلط تھے نوکر چاکر مامائیں سائیس ڈرائیور تو لپٹے والے ہوٹلوں کے بیرے تو خیر شناکر سب کے سب خفیہ پولیس کے تنخواہ دار ملازم ہی ہوا کرتے تھے اور روز کی خبریں پولیس ناکہ تک پہنچ جاتی تھیں اس کے علاوہ مسجد کے پیش امام واعظوں اور اسکول کے ماسٹروں کو بھی لوگ شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے دوست دوست سے دل کا راز کہتے ڈرتا حالانکہ راز ہی کیا تھا ہر راز کا تا پھر کسی کے سہارے یوں پھیل جاتا جیسے اخبار میں چھپ گیا ہو [illegible] راز ہی ہوتا ہے. ہر راز گھوم [illegible] سے خاندان [illegible]

رجواڑوں کی ملازمت اور درباری سازشوں کے گرد گھومتا تھا یا پھر جاگیرداروں اور امیروں کے پوست کندہ حالات جن کے جاننے کے لئے ایک دوسرے کے ملازمت کے ملازمین کو انعام اکرام دیا کرتا اور یہ ملازمین پیش خدمت ادھر کی اُدھر اور اُدھر کی ادھر پہنچایا کرتے ایسے حالات میں استاد کی احتیاط قابل حیرت نہ تھی، استاد کو اگرچہ اس ریاست میں آئے چند ہی سال ہوئے تھے مگر وہ اس سے پہلے بھی دو ایک ریاستوں میں رہ چکے تھے اور پھر یہاں ان کی آنکھوں کے سامنے کتنے باعزت بے عزت ہوئے کتنے کمینے شریف ہوگئے اور کتنے شریف معتوب ہو کے کمینوں سے بدتر ہو چکے تھے۔

میں ادھر اُدھر کی دو چار باتیں سن کے واپس چلا آیا اور اگلے ہفتے ایک کام سے بمبئی چلا گیا اور کئی مہینے تک وہیں رہا یکایک بمبئی میں بلارڈ پیئر پر بارود اور دوسرے آتش گیر مادے اور اسلحے سے بھرا ہوا جہاز پھٹا اور اس حادثے سے سارا شہر ہل گیا کچھ تو دھماکوں اور ساحلی عمارتوں کے انہدام سے اور زیادہ تر افواہوں سے کوئی کہتا تھا جرمن کی آبدوز کشتی سے ہٹلر کا ایک آدمی اُترا اور اس نے بندوق سے تاک کے ایک آگ لگانے والی گولی ماری اور جہاز میں آگ لگ گئی کوئی ہندوستانی فوج کی اندرونی بغاوت کو اس کا سبب بتلاتا تھا غرض طرح طرح کی افواہوں میں ایک عجیب قسم کی دہشت انگیزی تھی۔ مجھے ان خبروں سے بڑی دلچسپی تھی ایک دن میں نے سوچا کہ چلیں محمد علی روڈ پر ایک اُردو اخبار کے دفتر میں جو میرا دوست ہے اس سے شاید کچھ حقیقت معلوم ہو۔ میں اخبار کے دفتر پہنچا تو میرا دوست خبروں کے ترجمے میں مشغول [illegible]

خبروں کے کاغذ سنبھالے [illegible] میں حیرانی سے ان کا منہ تک رہا تھا بے اختیار میرے منہ سے نکلا

"اُستاد ناظم آپ!!"

"جیتے رہو بیٹے سلامت رہو! یہ کام کا وقت ہے مجھ سے ملنا ہے تو دو گھنٹے بعد آنا کام ختم کر کے تمہارے ساتھ چلوں گا" یہ کہہ کے وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

میرا صحافی دوست حیرانی سے مجھ کو دیکھ رہا تھا

"تم ان بڑے میاں کو جانتے ہو؟"

"خوب اچھی طرح مگر یہ کب سے یہاں ہیں؟"

"کوئی پندرہ دن سے یہ آئے ہیں بہترین کاتب ہیں اور سب سے بڑھ کے یہ کہ کام کے وقت میں کوئی دوسری بات نہیں کرتے نہایت وضعدار آدمی ہیں معلوم ہوتا ہے کسی بڑے خاندان کے ہیں بہت دل لگا کے کام کرتے ہیں مگر بہت غم زدہ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ معلوم کرنے کی کوشش کی مگر ہمیشہ ایک زخمی ہنسی ہنس کے ٹال گئے۔"

میں ہٹلر جرمنی اور برطانوی جنگی جہاز کی آتش زدگی سب کچھ بھول گیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کے دفتر سے باہر نکلا اور ادھر اُدھر بے تابی سے گھومنے لگا چار بجے پھر میں اخبار کے دفتر پہنچا اُستاد ناظم ایک ہاتھ میں چھوٹا سا تھیلا لئے سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔

"جیتے رہو سلامت رہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور میرا انتظار کرو گے میں بھی تم سے ملنے کو بے قرار تھا آؤ چلیں قریب ہی میرا مکان ہے۔"

میں حیرت بھری خاموشی کے ساتھ ان کے پیچھے [illegible]

بنی ہوئی تھی اور آن بان سے بڑھے جا رہے تھے گویا ہماری تہذیب چل پھر رہی ہو۔ کئی گلیاں طے کر کے ایک شکستہ سی عمارت میں وہ داخل ہوئے اور ایک کوٹھری کا قفل کھول کے مجھے اندر بلا لیا۔ میری نگاہیں اس تنگ و تاریک کوٹھری میں سلیقے سے رکھے ہوئے سامان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ دروازہ تلاش کر رہی تھیں جس کے پردے کے پیچھے ایک سرسراہٹ محسوس ہو اور استاد ناظم کہیں "بیٹی یہ حضرت آئے ہیں ایک پیالی چائے بھیجو اور آج کل کے لڑکے معلوم نہیں کیوں چائے پر جان دیتے ہیں حالانکہ چائے سگریٹ تمباکو طول عمر کے دشمن ہیں ..." اگر وہاں نہ کوئی دروازہ تھا نہ پردہ نہ استاد ناظم نے بیٹی رضیہ کو پکارا نہ بیٹی رضیہ کی چاپ سنائی دی البتہ مجھے اپنے دل کی دھڑکن ضرور سنائی دے رہی تھی اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ قصہ کیا ہے کہاں استاد ناظم اور کہاں یہ کوٹھری کہاں اخبار کی کتابت یہ سب کچھ کیا ہوا ---- استاد نے اچکن اتار کے پھر پہن لی اور بولے

"بیٹے تم بیٹھو میں ابھی آیا پھر اطمینان سے باتیں ہوں گی"

وہ باہر چلے گئے اور تھوڑی دیر میں واپس آ گئے ان کے ساتھ "بارہ دالا" چائے کی کشتی لئے ہوئے تھا

"کم بخت بمبئی والے اخبار کے کاغذ میں پان باندھتے ہیں بھلا یہ سپاری بھرے پان کوئی شریف آدمی کھا سکتا ہے اور گلوری بنانا تو ان کو آتی ہی نہیں" انھوں نے جیب سے ایک سفید کاغذ کی پڑیا نکالی کاغذ کے اندر سفید کپڑے میں لپٹے ہوئے پان تھے وہ طشتری میں رکھے اور چائے کے ساتھ پان کی طشتری میرے سامنے چوکی پر رکھتے ہوئے بولے "لو جلدی پی لو ویسے ہی جوشاندہ ہو گئی ہو گی ٹھنڈی ہو گئی تو اور بیکار ہو جائے گی"

"استاد یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں!"

"بیٹا اللہ کا شکر ہے کہ تم جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ میری کامیابی ہے۔ میری سفید داڑھی میں تم کو کالک تو نظر نہیں آتی اللہ نے مجھے سربلند کیا تم کو یاد ہوگا میں نے تم سے ایک دن کہا تھا کہ اللہ اہل کمال کا امتحان لیتا ہے۔ میرا جو امتحان ہوا ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے بڑے اہل کمال کے امتحان کے لائق سمجھا حالانکہ میں ان کی خاکِ پا بھی نہیں ہوں۔ میں تم سے سب کچھ بتانا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ تم چاہنے والے ہو اور پھر اس شہر میں تم کو واپس جانا ہے جو میں نے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیا مگر تم سے لوگ نہ جانے کیا کیا کہیں سنو! عالی جاہ نے ایک دن مجھ سے کہا کہ: استاد ہم آپ کے گھر آئیں گے: میں نے پہلے تو اپنے گھر کی بدحالی کا ذکر کر کے عذر معذرت کرنا چاہی مگر جب ان کا اصرار بڑھ گیا تو میں راضی ہو گیا میرا خیال تھا کہ شاگردان کو استاد کا احترام منظور ہے چلو کیا مضائقہ ہے مگر جب میں نے رضیہ سے اس کا ذکر کیا تو وہ پریشان ہو گئی تھوڑی دیر کے بعد سر جھکا کر بولی: ابا جان سیدوں کے گھر میں کبھی ایسا ہوا ہے؟ میں حیران تھا کہ یہ لڑکی کیا کہہ رہی ہے وہ لڑکی جس نے شرم و حیا سے کبھی مجھ سے کھل کے بات نہ کی تھی ماں کو مرے ہوئے بیس برس ہوئے مگر ہوش سنبھالنے کے بعد سے جو روش رہی ماں کے بعد بھی اس پر قائم رہی۔ آخر دوسرے دن اس نے مجھے رقعہ لکھ کے دیا تو میری آنکھیں کھل گئیں اس نے لکھا تھا: بادشاہ اور شہزادوں سے یہاں کی عورتیں پردہ نہیں کرتیں مولویوں نے بھی فتوے دے رکھے ہیں کہ بادشاہ سے پردہ ناجائز ہے شہزادے بھی اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور دندناتے گھروں میں چلے آتے ہیں اور جسے پسند کرتے ہیں حرم میں داخل کر لیتے ہیں۔ آپ عالی جاہ کے آنے سے پہلے مجھے زہر کی ایک پڑیا لا دیجئے ---- میں یہ رقعہ پڑھ کے رو دیا اور دو رکعت نماز شکرانہ پڑھی میری رضیہ مجھ سے زیادہ ہوشمند ہی نہیں نکلی بلکہ وہ بزرگوں کی غیرت کا نمونہ بھی تھی۔ میں بڑے شش و پنج میں تھا کہ عالی جاہ کو میں زبان دے چکا

تھا وہ جمعہ کو آنے والے تھے اور یہ بدھ کے دن کا واقعہ ہے حقیقت امر معلوم ہونے کے بعد اس ایفائے وعدہ سے مر جانا بہتر تھا مگر وادہ رے میرے ملک اللہ بات والے کی بات کہتا ہے مجھے خیال آیا کہ میرے ایک قریبی عزیز بڑے اصرار سے اپنے لڑکے کے لئے رضیہ کی نسبت دے رہے تھے میں نے ان کو بلوا کے کہا کہ جس بات کے لئے تم دو سال سے خواہشمند تھے آج میں اس کا خواہش مند ہوں مگر ایک شرط ہے اور وہ یہ کہ آج ہی رات عقد ہو گا اور کل تمہارا لڑکا رضیہ کو لے کے ہمیشہ کے لئے اس ریاست سے نکل جائے گا: میں نے اجمالاً ان کو اس خاموشی اور عجلت کے راز سے آگاہ کیا وہ میری طبیعت سے واقف تھے کچھ دیر توقف کے بعد بولے منظور ہے اگرچہ میں نے لڑکے کی نوکری کا بندوبست کر لیا تھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کو وطن کی جائداد باقی رکھنا منظور ہے جو نگرانی نہ ہونے سے تباہ ہو رہی ہے اگر مقدمہ بازی نے اتنا طول نہ پکڑا ہوتا تو میں بھی تلاش معاش میں ادھر کا رخ نہ کرتا اب تو جائیداد واگزاشت ہو گئی ہے اور ایک چھوٹے سے خاندان کا پیٹ بھرنے کو کافی ہے۔ چنانچہ اسی رات رضیہ کا عقد ہو گیا اور دوسرے دن یعنی جمعرات کو وہ فیجو روانہ ہو گئی۔ جمعہ کو عالی جاہ آئے اور کچھ دیر بے قرار بیٹھنے کے بعد بولے میں استانی ماں کو سلام کرنا چاہتا ہوں۔ اگرچہ ان کو معلوم تھا کہ وہ "میر کے دائرے" کے قبرستان میں سو رہی ہیں۔ مگر یہ تو ایک بہانا تھا میں نے کہا شوق سے اندر چلئے اور مرحومہ کے کمرے میں ان کی روح کے لئے ایک فاتحہ پڑھ دیجئے۔ وہ اس پر بھی نہ رکے اور اندر گئے اور ہر ہر کمرے میں اس طرح جھانکتے رہے جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہوں اور گھر کو خالی پا کے بولے استاد جلیل آپ بالکل اکیلے ہیں۔؟ میں نے کہا۔ جی ہاں حضور ایک لڑکی تھی وہ اپنے گھر کی ہو گئی اب تو بالکل اکیلا ہوں۔ ارے کب! انھوں نے اس شدت سے کہا جیسے یہ خبر ان کے لئے بالکل غیر متوقع ہو اور پھر

انھوں نے انتہائی غصہ کی نگاہ سے اپنے سکریٹری کو دیکھا وہ بے چارا بے قصور تھا میں نے نکاح اور روانگی کا سامان اس طرح سے کیا تھا کہ کسی ماما یا ملازم کو بھی پتہ نہ چلا تو پھر اسے کیسے خبر ہوتی۔ ساتھ ہی میں نے کہا حضور کچھ دنوں کی چھٹی عطا کریں تو میں وطن سے جا کے لڑکی کو لے آؤں میرے علاوہ اس کے میکے میں اور کون ہے ورنہ اگر اس کا بھائی زندہ ہوتا تو وہ جاتا —! اس پر عالی جاہ کچھ مطمئن سے ہوئے اور بولے:۔ استاد آپ نے غضب کیا لڑکی کی شادی کی اور ہم کو اطلاع بھی نہ کی آپ ضرور جائیے اور اس کو لے آیئے ایک ہفتے تک وہ ہماری مہمان رہے گی اور ہم اپنے استاد کے شایانِ شان اس کے ساتھ سلوک کریں گے پھر آپ اپنے داماد کو بلا لیجئے گا ہم اس کو بھی کچھ تحائف دیں گے:۔ اس کے بعد عالی جاہ نے اپنے سکریٹری کو حکم دیا کہ ایک ہزار روپے استاد کے سفر خرچ کے لئے اور دو ہزار استاد کی صاحبزادی کے لباس کے لئے پیش کئے جائیں۔ عالی جاہ کچھ دیر کے بعد چلے گئے اور رقم گھر آ گئی۔ یہ دیکھو دو ہزار روپے تو میں نے یتیم خانہ مسلمین کو بے سہارا لڑکیوں کی شادی کے لئے دے دیئے یہ اس کی رسید ہے تم اپنی آنکھ سے دیکھ لو اور سفر خرچ والے ہزار روپے میں نے عالی جاہ کے ایک خادم کو دے تاکہ وہ ان کی میز سے رضیہ کی تصویر اور جس کاسے کاغذ سے تصویر بنتی ہے وہ نکال کے مجھے دیدے۔ یہ بات رضیہ نے روانگی سے قبل ایک رقعہ کے ذریعہ مجھے بتلائی تھی کہ عالی جاہ نے جب گھر آنے کی خواہش ظاہر کی ہے اس سے ایک ہفتے قبل ایک لیڈی ڈاکٹر آئی تھی اور کہتی تھی کہ عالی جاہ سے آپ کے والد نے ذکر کیا تھا کہ آپ اپنی والدہ کو یاد کر کے اکثر روتی ہیں اور سنا کہ آپ کی آنکھیں خراب ہونے کا اندیشہ ہے اس لئے میں آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرنا چاہتی ہوں حس آنے سے اس لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ کیا تھا مجھے شبہ ہے کہ وہ تصویر کھینچنے کا آلہ تھا چنانچہ میرے

شبیں منہ چھو کر کمرے میں سو چکے ہیں عالی جاہ کے پیر پائے سکھ دیے ساری حقیقت معلوم کرکے وہ تصویر غائب کرادی اور مجھ سے ایک ہزار روپے اپنی عزت کی قیمت ادا کرکے اوپر سے سو رکعت نماز ادا کی۔ عالی جاہ بار بار پوچھتے تھے کہ انشا آپ صاحب زادی کو لینے کب جا رہے ہیں اور میں تصویر حاصل ہونے تک طبیعت کا بہانہ کرتا رہا اس کے بعد میں بھی آگیا۔ اللہ نے مجھے ہنر دیا ہے میں اچھا خاصا خوشنویس ہوں ایک اللہ کے بندے نے مجھے اخبار میں کام دلوا دیا ہے چند روز مجھے کاپی نویسی میں دقت ہوئی پھر ڈھب آگیا اب صاحب چھ روپے روز کماتا ہوں ایک تن تنہا آدمی کے لئے چھ روپے روز بہت ہیں "اللہ نے مجھے جو سرفرازی عطا کی ہے اس کے بعد اگر وہ کھوکھا بھی رکھتا تب بھی میرا سر نہ اُٹھتا تم حیرانی سے میری صورت کیا دیکھ رہے ہو ان کچھ کمروں کا گھر بہتر تھا جہاں عزت خطرے میں تھی یا یہ چھوٹا سا تاریک کمرہ جہاں میں آرام کی نیند سوتا ہوں اور اپنے مالک کا شکر ادا کرتا ہوں۔ یہ تمہاری عادت ابھی نہیں چھوٹی تم بانسری کی طرح سے کھیل رہے ہو۔ میں ابھی وہ جھنجھنا نکال کے تم کو دیتا ہوں ـــــ ارے بھئی تم اپنے ہاتھ کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو دل و دماغ کیسے قابو میں رکھ سکو گے۔ لو اس جھنجھنے سے شغل کرو!

میں نے بغیر شرمائے ہوئے وہ جھنجھنا لے لیا۔ میرا جی چاہا کہ بمبئی کیا دنیا کے ہر شہر ہر گاؤں میں اسے بجاتا پھروں!۔

عبدالشکور چودھری
ترجمہ : احمد سعدی

لال میگھ

(بنگالی افسانہ)

آسمان پر قدرے سُرخی مائل بادل چھائے ہوئے تھے اور شام کے سرمئی دھندلکے میں شفق کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس کی سنہری روشنی میں گرجا کے اُوپر بنا ہوا صلیب بہت خوبصورت نظر آرہا تھا۔

بھام جی نے مسلسل پیدا ہونے والی کھٹ کھٹ کی آواز بند کر کے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا، پانچ بج چکے تھے اور تین منزلہ عمارت کے اس کمرے سے نیچے آدمیوں کا اژدہام یوں نظر آرہا تھا جیسے موجیں چڑھ رہی ہوں اور اُتر رہی ہوں۔ بڑے صاحب کے تمام خطوط اور آرڈر ٹائپ کر کے انھیں ہے۔ اپنی اپنی جگہ پر حفاظت سے رکھنے کے بعد بھام جی اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس وقت اس کا تمام جسم پسینے میں یوں بھیگا ہوا تھا جیسے ابھی ابھی اس کا بخار اُترا ہو، ایک ہفتے سے اس کے پاس بہت سارے کام جمع ہو گئے تھے یا یوں کہا جائے کہ بہت سارے کام اس کے سر پر ڈال دیئے گئے تھے، اس پر بھی بڑے صاحب آنکھیں سُرخ کر کے اُسے دھمکی دیتے تھے ـــــ "نہیں جی، اب تم سے کام نہیں ہوگا، ذرا سا کام تم چار دن میں بھی نہیں کر سکتے، اسپیڈی ہینڈ چاہیئے، اسپیڈی ہینڈ"

بھام جی کوئی جواب نہیں دیتا تھا، وہ سر جھکائے کھڑا رہتا اس کے بعد پھر وہ سرک کر آہستہ آہستہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھ جاتا، گزشتہ پانچ سال کے [illegible] عمارت جو پہلے یک منزلہ تھی اب تین منزلہ بن گئی تھی اور پرائیویٹ لیمیٹڈ کمپنی کی آمدنی پہلے سے دس گنا زیادہ ہو گئی تھی، بڑے صاحب کی کرسی گدی دار ریوالونگ چیر میں تبدیل ہو گئی تھی اور پرانی ٹوٹی پھوٹی ماڈل فورڈ کی جگہ چمکتی ہوئی ہیلمن آگئی تھی اور ٹائپسٹ کا کام پہلے سے دس گنا زیادہ بڑھ گیا تھا، لیکن پھر بھی اکیلا بھام جی ہی یہ تمام کام کر رہا تھا، ابراہیم اسمٰعیل بھام جی، جس کی تنخواہ اب بھی صرف پچھتر روپے ماہانہ تھی۔

بھام جی نے کرسی پر رکھا ہوا کوٹ اُٹھا کر پہن لیا، عینک کو اچھی طرح ناک پر جمایا اور اس کے بعد سڑک پر آکر کھڑا ہو گیا اور جب وہ بیڑی خریدنے گیا تو یکایک اس کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ اس نے دو پیسہ کا ایک سگریٹ خرید لیا اور ابھی وہ جلتی ہوئی رسی سے سگریٹ سلگانے ہی والا تھا کہ کسی نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھام جی شتاب"

"کون؟"

"آبی پیار بخش"

"او" بھام جی نے اطمینان کی سانس لی، وہ [illegible] کا خاص چپراسی تھا، اس نے ٹوٹے پھوٹے بنگلہ میں پوچھا ـــــ "کوئی نوکری سوچا دو کچھ؟"

[illegible] ـــــ صاحب [illegible]

ہیں، پانچ برس بنگال میں رہ کر بھی بنگلہ نہ سیکھ سکے۔"
بھام جی نے کہا ـــــ "کچھو، کچھو"
پیار بخش بولا ـــــ "کچھو کچھو نہ پوچھو۔"
بھام جی سگریٹ کا ایک لمبا کش لے کر مسکرانے لگا ـــــ
"کیا کوئی خاص بات ہے؟"
"خیر یہی ہے کہ تمھاری قسمت پھوٹنے والی ہے، سب کام ختم ہوگیا ہے نا؟"

بھام جی نے سر ہلایا ـــــ "ہاں، ہاں، سو ب۔"
"پھر بھی کیا ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا" پیار بخش نے اندیشہ کا اظہار کرتے ہوئے سر ہلایا ـــــ "ایک چھوکری صاحب کے پیچھے لگ گئی ہے۔"
"چھوکری!"

پیار بخش کا یہ بزرگانہ لہجہ بھام جی کو ناگوار گزرا، پیار بخش بڑے صاحب کا خاص چپراسی ہونے کی وجہ سے آجکل کسی کو خاطر میں ہی نہ لاتا تھا۔ یہاں تک کہ ملازمت دلانے والے خود بھام جی کی بھی وہ کوئی پروا نہیں کرتا تھا۔ وہ کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا، وہ اس سے ایسے لہجہ میں باتیں کرتا، جیسے اس کی چپراسی کی ملازمت اور بھام جی کے ٹائپسٹ کے عہدے میں کوئی فرق نہ ہو، جیسے دونوں کا درجہ برابر ہو بلکہ پیار بخش کا مرتبہ ہی زیادہ ہو، بھام جی نے پہلے ہی دن اسے قبول کر لیا تھا، زندگی کی ریت ہی یہی ہے، قبول نہ کرنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا؟ بھام جی نے ایک دن جس آدمی پر ترس کھایا تھا، آج اسی پر اسے رشک آرہا تھا۔

پیار بخش جب پہلی بار اس دفتر میں آیا تھا تو وہ ایک میلا خاکی بش شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے بھام جی کے پاس آکر گھگھیاتے لہجے میں کہا تھا
"کوئی نوکری دے سکتے ہیں حضور؟ بال بچوں کے ساتھ بھوکوں مر رہا ہوں۔"

بھام جی بڑے صاحب کا ذاتی فائل تیار کر رہا تھا، اس نے ناگواری ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا ـــــ "نوکری دو کری نہیں ملے گی۔"

لیکن پیار بخش کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی، نہ جانے کیوں اس کا دل درد و غم سے بھر گیا، اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ خود کس مپرسی کے عالم میں لکھنؤ سے ڈھاکہ آکر ملازمت کی اُمید میں نیشنل بلڈرز پرائیوٹ لمیٹڈ کمپنی میں بڑے صاحب کے سامنے کھڑا ہو۔

اس کے بعد فائل سے ایک کاغذ نکال کر اس نے خود اس کی درخواست ٹائپ کر دی تھی، میٹرک پاس ہونے کی وجہ سے جہاں تک اُسے انگریزی آتی تھی، اس نے پیار بخش کی درخواست سلجھے ہوئے لہجہ اور موثر الفاظ میں لکھ دی تھی، اس نے خاص طور پر اس کا بھی ذکر کر دیا تھا کہ وہ جنگ میں پہلے دستے کا ماہر فیلڈ مین تھا، درخواست ٹائپ کرنے کے بعد بڑے صاحب کے پاس بھیج کر اس نے کہا تھا ـــــ "جاؤ، اب تمھاری تقدیر!"

بھام جی نے سر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا، یہ وہی پیار بخش تھا؟ پھر بھی اس نے اپنی ناگواری کے احساس کو چھپا کر پوچھا۔
"چھوکری کی ہندو؟"

پیار بخش نے اتنی دیر میں ایک بیڑی سلگا لی تھی، اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا ـــ "نہیں جی نہیں، مسلمان ہے۔"
بھام جی کی حیرت اور بڑھ گئی ـــــ "بنگالی!"
"ہاں، ہاں، بنگالی۔"

بنگالی لڑکی دفتر میں کام کرے گی؟ بھام جی کو یقین نہیں آیا، ہندو عورتیں آزاد ہوتی ہیں، تعلیم یافتہ ہوتی ہیں، انھیں کے ڈر سے وہ لکھنؤ اور کلکتہ سے بھاگ کر ڈھاکہ آگیا تھا، کم از کم یہاں کی عورتیں اتنی آزاد نہیں تھیں کہ چھوٹی چھوٹی ملازمت سے کم تعلیم یافتہ مردوں کو بے دخل کرنے کے لئے میدان میں آئیں، ویسے بھی بنگالی مسلمان عورتیں پردہ کی سخت پابند ہوتی تھیں، لیکن پانچ ہی سال کے عرصے میں کتنا بڑا انقلاب آگیا تھا۔

سڑک پر بجلی بتی جل گئی اور پیار بخش پان کی پیک سے اپنے ہونٹ رنگ کر چلا گیا، بھام جی اس وقت میز پر جھکے اونگھ رہے

موڑ پر آگیا تھا۔

دوسرے دن حاضری کے رجسٹر میں دستخط کرنے سے پہلے ہی بڑے صاحب نے اُسے اپنے کمرے میں بلا بھیجا، بھام جی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اسپرنگ لگا ہوا دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی وہ یکایک چونک اُٹھا۔ ایسی کوئی خاص بات تو نہ تھی مگر تئیس چوبیس سال کی ایک بنگالی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی وہ چھاپے کی ساڑی پہنے ہوئے تھی اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا منی بیگ تھا اور بہت زیادہ میک اپ ہونے کی وجہ اس کے چہرے کا اصلی رنگ میک اپ میں چھپ گیا تھا، پیار و کشش کی وہ خوبصورت چھوکری شاید ہی تھی۔

بھام جی کو دیکھتے ہی بڑے صاحب نے اپنے ہاتھ کا فائل اس کی طرف پھینک دیا —— "یہ کیسا ٹائپ ہے، اسی کو ٹائپ کرنا کہتے ہیں! ایک جگہ ٹی، ایل بن گیا ہے اور جگہ جگہ ایل، آئی بن گیا ہے، پڑھنے سے خط کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے، دیکھ کر ٹائپ نہیں کرتے؟"

بھام جی سر جھکائے خاموش کھڑا رہا، آج کل وہ اس قسم کی ڈانٹ کی کوئی پروا نہیں کرتا تھا، لیکن اس لڑکی کے سامنے بہت دن کے بعد آج پہلی بار اُسے اپنی ذلت کا احساس ہوا تھا، اس کی دونوں آنکھیں جیسے جلنے لگیں، اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے لئے بڑے صاحب سے زیادہ وہ لڑکی قصوروار ہے۔

حیرت ہے، بھام جی کو حیرت ہو رہی تھی، اس کی عمر زیادہ نہیں تھی، جس عمر میں لڑکیاں آنکھوں میں رنگ بکھیر دیتی ہیں، اب تک اس نے اس عمر سے تجاوز نہیں کیا تھا، بھام جی کتنے ہی دنوں تک سیوج روڈ یا ڈی، آئی، ٹی ایونیو کے موڑ پر کھڑے ہو کر پیاسی آنکھوں سے زندگی کے ایک حسین اور سحر انگیز بھاگن کی انوکھی خوبصورتی کا رس پیتا رہا تھا، کسی کی ساڑی، کسی کے گاؤن اور کسی کے شلوار قمیص کو تکتا رہا تھا، کوئی حسین ہوتی، کسی کے جسم کی رنگت سنہری ہوتی، کسی کا چہرہ سانولا ہوتا اور کوئی گلاب کے پھول کی طرح سرخ ہوتی اور اس کی نگاہوں کے سامنے مختلف رنگ اور ڈھب کی نمائش ہوتی رہتی تھی اور بھوک ... کے احساس

سے ٹھنڈی سانس لیتے وقت بھام جی کا دل زور زور سے دھڑکتا رہا تھا۔

لیکن آج جاڑے کی اس صبح کے رنگین ماحول میں چھلکتا ہوا شباب سے بھرپور جسم والی اس لڑکی کو دیکھ کر بھام جی کے حلق سے وہ جانی پہچانی ٹھنڈی سانس نہیں نکلی ایک ناقابل برداشت غصے کو دبائے ہوئے وہ خاموش کھڑا رہا۔

اتنی دیر میں بڑے صاحب بکتے جھکتے اور دھمکی دینے کے بعد ٹھنڈے پڑ چکے تھے، انھوں نے کہا — "جب کام میں تمہارا دل نہیں لگتا تو استعفیٰ کیوں نہیں دے دیتے؟"

بھام جی کو یاد آیا کہ وہ اپنی عمر سے بھی زیادہ عمر کی پرانی ٹائپ رائٹر مشین کے بارے میں کم از کم پچاس مرتبہ بڑے صاحب سے کہہ چکا تھا کہ اب وہ مشین کام کرنے کے قابل بالکل نہیں ہے لیکن اب اس بات کو یاد دلانے سے بھی کوئی فائدہ نہیں تھا، بڑے آدمیوں کی غلطی پکڑنے والوں کی کیا حالت ہوتی ہے، یہ بھام جی اچھی طرح جانتا تھا، اسی لئے گھسے ہوئے ٹی اور ایل کے حروف کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے کر وہ خاموشی سے اپنے سینڈل کے تلے کو فرش پر گھسنے لگا۔

بڑے صاحب نرم ہو کر بولے — "جاؤ، تم کمپنی کے پرانے آدمی ہو، اس لئے یکایک تمہیں نہیں ہٹا رہا ہوں، دیکھ بھال کر کام کرو، اور انھیں لے جاؤ، آج سے یہی میرا پرسنل فائل ڈیل کریں گی، تم آرڈنری فائل دیکھو گے، ایک نئی ٹائپ رائٹر مشین کا آرڈر دے دیا گیا ہے، وہ انھیں دے دو گے۔"

بھام جی نے تشکر آمیز نظروں سے بڑے صاحب کی طرف دیکھا، انھوں نے پھر منہ میں پائپ دبا لیا اور وہ لڑکی بھام جی کے قریب آکر بولی "چلوں، مسٹر بھام جی!"

بھام جی چونک اٹھا، اس نے باہر آتے ہی پوچھا "آپ ہمارا نام جانیں!"

لڑکی نے سر ہلایا — "ہاں، بڑے صاحب سے معلوم ہوا ہے میرا نام روزمینہ ہے"

بھام جی مسکرایا — "مس روزینہ!"
اور مس روزینہ شرماتے ہوئے زبردستی دھیرے سے مسکرادی

دو دن کے اندر ہی بھام جی کے کمرے کی حالت بدل گئی، چھوٹے سے کمرے کے درمیان ایک پتلا سا سرمئی پردہ لگا دیا گیا، اور دوسری طرف مس روزینہ کے لئے چمکتی ہوئی کرسی اور نئی میز آگئی، ساتھ ہی ایک نئی ٹائپ رائٹر مشین بھی آگئی، دیوار کے ایک کونے میں کسی انشورنس کمپنی کا ایک خوبصورت کلنڈر ٹانگ دیا گیا جس پہ اجنتا کے غار کی ایک ناری کی تصویر بنی ہوئی تھی اور کمرے میں بجلی کا پنکھا بھی لگ گیا تھا، بھام جی کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی تھی، پھر بھی روزینہ پر غصہ ہونے یا اس پر شک کرنے کا بھام جی کو موقع ہی نہیں ملا، اتنے دنوں تک جو تصویر بھام جی کے خیالوں میں بسی ہوئی تھی، آج وہی تصویر انسانی روپ دھار کر اس کی پناہ میں آگئی تھی، اس کے علاوہ تعارف ہونے کے بعد سے لے کر ابتک اس نے بھام جی کو ذرا بھی اپنے سے دور نہیں رہنے دیا تھا اور نہ ہی اپنے حسن پر نازاں ہو کر اس نے مغرورانہ طور پر اس کی نظروں سے خود کو چھپانا چاہا تھا، اب بھام جی اگر خوف کھاتا یا رشک کرتا تو کس سے؟ وہ تو اس کی قربت سے جیسے مسحور ہو کر رہ گیا تھا، اس نے تو بھول کر بھی نہ سوچا تھا کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے۔

پہلے ہی دن روزینہ نے اپنے ہاتھ سے پتلا سرمئی پردہ ہٹا کر کہا "جب ہم دونوں ایک ہی کام کرتے ہیں تو پھر ہم دونوں کے درمیان یہ پردہ کیوں حائل رہے، کیا کہتے ہیں؟"
"آپ کی مرضی" بھام جی مسکرایا۔
اور اس کی اردو سن کر روزینہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئی۔

بھام جی شرمندہ سا ہوگیا، پانچ سال کے عرصہ میں پہلی بار اُسے بنگلہ نہ جاننے کی وجہ سے شرمندگی اٹھانی پڑی، اُسنے کہا — "ہامی بانگلا شیکھبے، شیکھابن"
روزینہ نے بڑے پیار سے حامی بھرلی۔

اس کے دوسرے دن ایک عجیب واقعہ ہوا، روزینہ جب بڑے صاحب کا خط ٹائپ کرنے بیٹھی تو آپ ہی آپ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی، ہنسی کی آواز سے چونک کر بھام جی نے اس کی طرف دیکھا، روزینہ نے کہا — "اوماں، ای تیرتکھار کی چھیری!"
بھام جی چھیری کا مفہوم نہ سمجھ کر خاموش رہا۔
روزینہ نے اپنے ہاتھ کے چھوٹے سے رومال سے پیشانی پر پھیلے ہوئے پسینے کے قطروں کو پونچھ کر ہنستے ہوئے پوچھا — "ہیو یو ایور سین سچ اے ہینڈ رائٹنگ؟"
بھام جی کے منہ سے غیر ارادی طور پر نکلا — "کبھی نہیں"
روزینہ ہنستے ہوئے اس کے قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ بھام جی نے خط کی طرف دیکھا، تحریر اتنی زیادہ خراب نہیں تھی، ویسے بھی بڑے صاحب کی تحریر کوئی اتنی زیادہ بد خط نہیں تھی، اور اب تو پانچ سال تک مسلسل اس تحریر کو پڑھتے رہنے کی وجہ سے بھام جی کا وہ تحریر بھی آسان معلوم ہونے لگی تھی، اس نے ہنس کر کہا — "ہامی پوڑے دیبے؟"
روزینہ بڑے دلفریب انداز سے مسکرائی — "صرف پڑھ دینے سے کیا ہوگا صاحب؟ اس ہاتھ کی تحریر پہچاننے میں بھی کم از کم مجھے سات دن لگے گا" اتنا کہہ کر وہ بڑی مایوسی کے ساتھ اپنی کرسی پر جاکر بیٹھ گئی۔

بھام جی نے مزید کوئی بات نہیں کی، اس نے وہ خط لے کر اپنی مشین پر کاغذ چڑھا دیا اور دھیرے سے بولا "گھابڑائے مت، ہامی سوب ٹھیک کورے دیبے، پہلا پہلا اکٹو تو کلیف ہوبے، زیادہ نہیں"

اور روزینہ اس کی طرف تشکر آمیز نظروں سے دیکھنے لگی۔
بھام جی کی زندگی میں یہ ایک انوکھا تجربہ تھا، پہاڑ کی کھوہ میں جمی ہوئی برف جیسے اچانک پگھل گئی ہو، اس کی رگوں میں جوانی دریا کے تیز دھارے کی طرح خون گردش کرنے لگا۔ بھام جی [illegible]

نشہ کی سی کیفیت چھا گئی اور ایک عجیب خیال اور خواہش کے زیر اثر اس کا دل سنتھالیوں کے مردنگ کی طرح دھم دھم بجنے لگا۔ بھام جی نے اب سیوج روڈ پر کھڑے ہو کر لڑکیوں کو دیکھنا چھوڑ دیا تھا، اب ... سے اتنی فرصت بھی کہاں تھی!

دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی کا کانٹا چار کے ہندسے سے آگے بڑھ گیا، لیکن روزینہ پھر بھی خاموش اپنی کرسی پر بیٹھی رہی، اس کا تمام کام بھام جی نے خود ہی کر دیا تھا، پھر بھی چھٹی ہو جانے کے بعد اسے اس طرح بیٹھی ہوئی دیکھ کر بھام جی کو حیرت ہوئی، اس نے اپنی ٹوٹی پھوٹی بنگالی زبان میں پوچھا ـــ "آپنی جابچھے نا؟"

"نہیں، ایک ساتھ جاؤں گی" روزینہ نے جواب دیا ـــ "جلدی کیجئے"

جیسے اچانک کسی نے اس کے جسم کی تمام رگوں کو پکڑ کر جھنجھوڑ دیا ہو، وہ مارے حیرت کے چند لمحوں کے لئے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے روزینہ نے اس کے ذہن میں بہت سارے پھول بکھیر دیئے ہوں۔

روشنی سے جھلملاتی ہوئی شام میں وہ دونوں باہر نکلے، روزینہ کی نیلی ساڑی پر سفید روشنی پڑ رہی تھی اور نیلی ساڑی کا عکس اس کے سارے بدن پر نیلے رنگ کی چاندنی بن کر پھیل گیا تھا، تھوڑی دیر کے لئے بھام جی اپنے وجود کو بھول سا گیا، تمام دکھ، تکلیف اور غربت و افلاس کے احساسات کو پرے دھکیل کر اس کے ذہن پر ایک ایسا خیال چھا گیا جیسے وہ کوئی ملک فتح کر کے آ رہا ہو، اس کے دماغ کے ہر گوشے میں چنگیز خاں کے گھوڑے کی ٹاپ کی آواز گونجنے لگی، اس وقت کون کہہ سکتا تھا کہ وہ نیشنل بلڈرز پرائیوٹ لمیٹڈ کا ایک غریب اور ذلیل معمولی ٹائپسٹ ہے۔

لاٹانی سے قریب آ کر روزینہ رک گئی ـــ "چلئے، ایک کپ چائے پی جائے، آپ کو اپنی دور تک پیدل گھسیٹ لائی ہوں" بھام جی تذبذب میں پڑ گیا، روزینہ نے ہنسی کی لہریں پیدا کرتے ہوئے کہا ـــ "کوئی بات نہیں، اس کے بدلے میں آپ بھی کسی دن پلا دیجئے گا"

بھام جی کوئی فیصلہ نہ کر سکا اور پھر جیسے چنگیز خاں اپنی مفتوحہ سلطنت میں داخل ہو رہا ہو، بھام جی بہت ساری میزوں اور لڑکیوں اور کھوئی ہوئی نگاہوں کو نظر انداز کر کے ایک فاتح کی طرح دروازے کے اندر داخل ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی چمکتی ہوئی سفید روشنی میں صابن کے رنگین بلبلے کی طرح اس کے خیالات ٹوٹ گئے، روزینہ کے قریب کھڑے ہوتے ہی یکایک دل ہی دل میں بھام جی شرمندہ ہو اٹھا، چھی، اس کی شکل کتنی بری لگ رہی ہے اور لباس کتنے بے ڈھنگے ہیں! اب تک اس نے تو اس کا خیال ہی نہیں کیا تھا، آج دو دن سے بلیڈ نہ رہنے کی وجہ سے وہ شیو بھی نہ کر سکا تھا اور اس کے پورے چہرے پر خود رو گھاس کی طرح داڑھی اگ آئی تھی اور تیل سے بے نیاز خشک بال بے ترتیبی سے الجھے ہوئے تھے، اس کے علاوہ جو کپڑے وہ پہنے ہوئے تھا ان کی حالت بھی درست نہ تھی ہوائی شرٹ کا رنگ کبھی گہرا نیلا تھا، لیکن اب اس کے لئے باقاعدہ ریسرچ کرنے کی ضرورت تھی، سفید پتلون میں جگہ جگہ دھول بھی اڑی تھی اور کیچڑ کے چھینٹے بھرے ہوئے تھے اور پیروں میں جو سینڈل تھا وہ بہت سارے رنگوں کے چمڑے کی تالی لگتے لگتے اب دیکھنے کے قابل ایک "چیز" بن گیا تھا۔

بھام جی دل ہی دل میں شرم سے گڑ سا گیا، چھی، کیا اس کی شکل اور اس کا لباس ایسا ہے کہ وہ روزینہ کے قریب کھڑا ہو سکے؟

روزینہ اتنی ہی دیر میں ایک میز کی طرف بڑھ گئی تھی، بھام جی کو کھویا ہوا دیکھ کر اس نے کہا "او کی، ڈانڑے رہلی کینو؟ آشون"

اور بھام جی نے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر ایک کرسی کھینچ لی۔ . . .

دوسرے دن دفتر میں داخل ہوتے ہی بھام جی اپنے کمرے میں جانے کی بجائے سیدھا کیشیر کی میز پر جا کر کھڑا ہو گیا اور بولا ـــ "کچھ ایڈوانس"

"ایڈوانس!" کیشیر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

بھام جی اپنی پانچ سالہ ملازمت کے دوران پہلی بار ایڈوانس لینے

آیا تھا۔

اس نے پوچھا — "کتنا؟"

"پچاس"

"پورے پچاس؟"

بھام جی نے سر ہلایا — "ہوں"

حیرت زدہ کیشیر نے مزید کوئی بات نہ کی، وہ جانتا تھا کہ بھام جی بہت کفایت شعار رہا ہے، اپنی ملازمت کے دوران اس نے کبھی ایڈوانس نہیں لیا تھا، اور آج اگر اسے روپوں کی شدید ضرورت نہ ہوتی تو وہ ہرگز اپنی تنخواہ کے پچھتر روپوں میں سے پچاس روپے ایڈوانس نہ لیتا۔ اس نے روپے گن کر دیتے ہوئے پوچھا — "باقی روپیوں میں مہینہ بھر کیسے چلے گا جی؟"

بھام جی نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ خود بھی یہی سوچ رہا تھا، گنا ہوا تو روپیہ تھا، پچیس روپے وہ اس چھوٹے سے گودام کا کرایہ دیتا تھا، جس میں وہ رہتا تھا، تیس روپے کھانے کا میس میں دیتا تھا، دس روپیہ اپنی ریسٹورنٹ کے مالک کو دیتا تھا، جس کے بدلے میں اسے ہر روز دو ٹوسٹ، ایک پیالی چائے اور ایک سگریٹ مل جاتا تھا، اس کے بعد موقع بے موقع دھوبی، حجام، سینما اور دوست احباب کی خاطر مدارات کا خرچ بھی اُسے پورا کرنا پڑتا تھا، اس لئے اگر وہ یہ کہے کہ اس ماہ میں اس کا ہاتھ ذرا تنگ ہو گیا ہے تو میس، ریسٹورنٹ کے مالک سے لے کر مکان مالک تک بھی کم از کم دو ایک ماہ تک اس سے روپوں کا تقاضہ نہیں کریں گے

پچاس روپیہ خرچ ہوتے دیر نہ لگی، اس دن دفتر پہنچنے میں بھام جی کو ذرا دیر بھی ہو گئی، روزینہ بڑے صاحب کا خط ہاتھ میں لئے گھبرائی سی ٹائپ رائٹر کے سامنے بیٹھی تھی، بھام جی کو دیکھتے ہی وہ مسکرا دی، آج بھام جی کا شیو بنا ہوا تھا، اور وہ سخت کریز کا سفید ترین کا پتلون اور سفید ہوائی شرٹ پہنے ہوئے تھا، اس بار کابلی سینڈل کی جگہ قدیم یونانی چپل کے ڈیزائن کا سینڈل شو تھا، روزینہ ہاتھ اٹھا کر سلام کرنے کے انداز سے بولی —

"صبح بخیر"

بھام جی شرما سا گیا، لیکن روزینہ نے اس کے لباس کی اس اچانک تبدیلی پر کچھ اور تو خیال نہیں کیا، لیکن اس نے اس کا کوئی اور مطلب نہ اخذ کر لیا ہو، یہ سوچ کر وہ قدرے پریشان سا ہو گیا اس نے کوئی جواب نہیں دیا،

روزینہ نے بڑے پیار بھرے لہجہ میں کہا — "کیوں بیٹھے کھڑے کیوں ہیں؟"

اور بھام جی اپنی شرمندگی کے احساس کو زبردستی ذہن سے جھٹک کر کرسی پر بیٹھا ہی تھا کہ روزینہ نے بڑی افسردگی سے ٹھنڈی سانس لے کر کہا — "میری نوکری اب نہیں رہے گی مسٹر بھام جی"

بھام جی کا چہرہ یکایک سیاہ پڑ گیا، اس نے پوچھا — "کیوں؟"

روزینہ نے نئی مشین کو زور سے ہلاتے ہوئے کہا "یہ دیکھئے نا، اس مشین پر میں کام نہیں کر سکتی، اتنے دنوں تک تو آپ نے مہربانی کر کے میرا کام کر دیا ہے، اس وقت بڑے صاحب کی تحریر میرے لئے مصیبت بن گئی تھی اور اب جبکہ بڑے صاحب کی تحریر سمجھ میں آ گئی ہے، یہ مشین مصیبت بن گئی ہے، نئی مشین پر کام کرنا اتنا مشکل ہے، یہ کون جانتا تھا، یہ دیکھئے"

بھام جی نے اس کے قریب آ کر دیکھا، ایک خط کا نصف حصہ روزینہ نے ٹائپ کیا تھا، ٹائپ دیکھتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اُسے ٹائپ کرنا نہیں آتا، کہیں پر لائن ٹیڑھی ہو گئی تھی، کہیں پر حروف اچھی طرح نہیں اُبھرے تھے، اور اسپیس بھی کہیں کم اور کہیں زیادہ تھا، اسی لئے وہ مشین کے سر الزام تھوپ رہی تھی، اس کے ساتھ ہی بھام جی پر یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ اس نے پہلے دن بڑے صاحب کی تحریر نہ پڑھ سکنے کا بہانہ کیوں کیا تھا۔

روزینہ نے اس کے دلی تاثرات کا اندازہ کر کے خود کو سنبھال لیا — "شاید آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ میں ٹائپ نہیں جانتی، کیونکہ میں نے فریب دے کر نوکری حاصل کی ہے، لیکن آپ کا خیال غلط ہے مسٹر بھام جی، میرے پاس ان لینڈ کمرشیل کالج کا سرٹیفکیٹ ہے، دیکھئے گا؟"

بھام جی نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر کہا ــــ "تم ابھی بھولی ہو روزی۔"

روزینہ نے سنجیدگی سے کہا ــــ "نئی مشین ہے، ابھی تو اس میں تیل وغیرہ نہیں پڑتا ہے، اسی لئے ٹھیک نہیں چل رہا ہے، آپ تو مرد ہیں، دیکھئے نا، اپنے سخت ہاتھوں سے اسے ٹھیک کر سکتے ہیں یا نہیں۔"

بھام جی نے کوئی جواب نہیں دیا، اس کے اندر جو جھجک تھی وہ اب ختم ہو گئی تھی، اس نے مشین کو اٹھا کر اپنی میز پر رکھ لیا اور تیزی سے ٹائپ کرنے لگا اور روزینہ اس کی طرف دیکھ کر شرماتے ہوئے بڑے دل فریب انداز سے مسکرا دی۔

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان جو فاصلہ تھا وہ اور بھی کم ہو گیا، اس کے ساتھ ہی بھام جی کی زندگی میں اور گھڑی دیکھ کر روزانہ کام کرنے کے دستور میں بھی تبدیلی آ گئی، اب وہ ہر روز شیو کرنے لگا، صاف ستھرا لباس پہننے کی طرف بھی توجہ دینے لگا، ہر روز جب وہ گھڑی کا کانٹا دیکھ کر دفتر سے باہر نکلتا تو اس کے ساتھ روزینہ بھی ہوتی، ہر مہینے کے شروع میں وہ دونوں رکشا پر جاتے اس کے بعد پھر پیدل جاتے اور رفتہ رفتہ اس کے چال ڈھال اور بات چیت میں بنگالیت آ گئی۔ بھام جی پہلے بیچ سے مانگ نکالتا تھا لیکن اب وہ کان کے قریب سے مانگ نکالنے لگا، دفتر میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے روزینہ کے ارجنٹ فائل کا کام ختم کرتا، اس کے بعد وہ روزینہ کو نئی مشین چلانے کا طریقہ سکھانے کے بہانے ٹائپ کرنا سکھاتا، یہ بات وہ دونوں ہی جانتے تھے کہ یہ محض ایک فریب ہے اس کے نتیجے میں بھام جی کے فائل کا کام دن پر دن جمع ہوتا گیا، وہ ہر روز سوچتا کہ کسی فرصت کے دن تمام کام ختم کرے گا اور روزینہ بھی اُسے بڑھاوا دے کر کہتی ــــ "کسی روز دونوں آدمی مل کر ختم کر لیں گے، اس کام میں کتنی دیر ہی لگے گی؟"

بھام جی اس کے چہرہ کی طرف دیکھ کر بے پروائی سے ہنس دیتا، سرما کے آخر میں موسم بہار کے شروع ہوتے ہی جس طرح درختوں پر نئے پتے اُگ آتے ہیں اور درخت خوبصورت نظر آنے لگتے ہیں، اسی طرح پہلے کا افسردہ اور مضمحل بھام جی اب ایک نئے انسان کے قالب میں ڈھل گیا تھا۔

گھڑی کا کانٹا چار کے ہندسے پر پہنچتے ہی آج بھام جی نے "چلئے اب چلیں۔"

وہ اب بہت اچھی طرح بنگلہ بولنے لگا تھا، روزینہ نے خوش ہو کر کہا ــــ "آپ نے تو ایک ہی مہینے میں کافی ترقی کر لی ہے، چلئے، دفتر سے نکل کر ہم دونوں، آدمیوں کے ہجوم میں کھو جائیں۔"

آدمیوں کے ہجوم میں کھو جانے والی زندگی بھام جی کو بہت حسین معلوم ہوئی، جیسے اتنے دنوں تک اس کی یہی زندگی منتشر ہو کر کئی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی اور وہ ایک آسمان پر بھاگتے ہوئے آوارہ بادلوں کی طرح انجانی منزل کی طرف بھٹکتا رہا تھا، لیکن یکایک سورج کی کرنیں بکھرتے ہی پھاگن کے موسم میں کرشن چوڑا کے پیڑ کی طرح رنگین اور بہت زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی، بھام جی نے آسمان پر پھیلے ہوئے سرخ بادلوں کی طرف دیکھا، ٹھیک اسی طرح اس کی زندگی بھی رنگین ہو گئی تھی۔

دفتر سے وہ سرتیشائل لیک کی طرف گھومنے کے لئے جانے کا ارادہ کر کے نکلا تھا، لیکن سینما کے سامنے سوسن ہیورڈ کی رنگین تصویر دیکھ کر بھام جی رُک گیا، تھوڑی دیر تک وہ ہچکچاتا رہا، پھر زبردستی اپنی جھجک دور کر کے اس نے کہا "پکچر تا دیکھتے چلو تو؟"

روزینہ نے یکایک ڈھٹائی سے سر ہلا دیا ــــ "نا"

بھام جی حیران رہ گیا، اسے ایسے جواب کی قطعی اُمید نہیں تھی، وہ پھر کچھ نہیں بولا۔

روزینہ اس کے قریب سمٹ کر کھڑی ہو گئی اور آہستہ سے بولی ــــ "ہم دونوں کے بارے میں دفتر میں باتیں ہونے لگی ہیں، جانتے ہیں؟"

"کو ــ تھا، کیشر کو ــ تھا؟"

روزینہ نے بھنویں نچا کر کہا ــــ "چھی! چھی! اتنے دنوں بعد بھی آپ کا تلفظ ٹھیک نہیں ہوا، کو ــ تھا نہیں کوتھا لفظ ہے۔"

بھام جی نے اپنی غلطی درست کرتے ہوئے کہا ــــــ

"ہاں، ہاں کوتھا، کیشر کوتھا؟"

روزینہ نے تیز لہجے میں جواب دیا "کیا آپ نہیں جانتے کہ کس بات پر سرگوشیاں ہو رہی ہیں؟ ہم دونوں ہر روز جو کام ختم کرکے ایک ساتھ دفتر سے نکلتے ہیں، اسی وجہ سے دفتر کے دوسرے لوگ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگے ہیں، اس پر اگر ان لوگوں نے دیکھ لیا کہ ہم دونوں ایک ساتھ سینما دیکھنے گئے تو پھر مصیبت ہو جائے گی۔ بڑے صاحب کا وہ جو چپراسی ہے، کیا نام ہے اس کا، ہاں پیار بخش، وہ تو ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر سامنے ہی بلا وجہ ہنسنے لگتا ہے۔"

بھام جی معاملہ کی نزاکت کو سمجھ کر خاموش ہو گیا، روزینہ کا یہ سلوک بلا وجہ نہیں تھا، یہ جان کر اس کا دل ہمدردی کے جذبے سے بھر گیا، اس نے کہا۔ "ٹھیک، ٹھیک، پھر دیکھنا مناسب نہیں ہے۔"

روزینہ نے کہا — "چھٹی تو پھر آج میں یہیں سے رخصت ہوتی ہوں، کیوں؟ کل پھر ملاقات ہوگی۔" وہ دھیرے سے مسکرائی اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے رستے کے موڑ پر جا کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

بھام جی کے دل میں اتنے دنوں تک جو خوف سمایا ہوا تھا، وہ تیسرا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی حقیقت بن کر سامنے آ گیا، مکان مالک چار مہینے کا کرایہ مانگ رہا تھا اور ہیپی ریسٹورنٹ کے مالک نے کہہ دیا تھا کہ اب وہ اُسے اُدھار نہیں کھلائے گا، دوست احباب کے علاوہ پان بیڑی کی دکان اور ادھر اُدھر سے بھی وہ کافی مقروض ہو گیا تھا، اتنے دنوں تک جن لوگوں کو اس پر پورا پورا اعتماد تھا، اب اس اعتماد میں شگاف پڑ گئی تھی اور شگاف پڑتے ہی ان لوگوں کا سخت تقاضہ شروع ہو گیا تھا، اس کی سابقہ زندگی میں آرام نہیں تھا لیکن سکون ضرور تھا، لیکن اب وہ آرام کی طرح اپنا سکون بھی کھو چکا تھا اور اب اُسے اپنے چاروں طرف بے اطمینانی کی سیاہی پھیلی ہوئی نظر آنے لگی تھی، وہ گزشتہ تین ماہ تک چڑیوں کی طرح ہوا میں اُڑتا رہا تھا اور یہ تین مہینے کیسے گزر گئے بھام جی کو اس کا کچھ پتہ ہی نہ چلا، وہ روزینہ کی رفاقت میں اپنی جیب کا آخری پیسہ بھی خرچ کرکے بے انتہا مسرت محسوس کرتا رہا تھا لیکن تیسرا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی جیسے کسی نے اس خوشی کے فوارہ کے منہ پر ایک دبیز پتھر رکھ دیا۔

پہلے روز وہ بہت افسردہ تھا اس لئے اس نے کوئی خیال نہیں کیا، لیکن دوسرے دن جب اس نے دیکھا کہ ایک ہی کمرہ میں اس کے اور روزینہ کے درمیان وہ پتلا نیلا پردہ حائل ہو گیا ہے تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

روزینہ سے جب اس کا سامنا ہوا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ خفا تو نہیں ہیں نا؟"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ میں نے پھر پردہ گرا دیا ہے۔"

بھام جی نے کوئی جواب نہیں دیا، چند لمحوں کے بعد اس کے بجھے ہوئے چہرے کو دیکھ کر روزینہ نے تلخ لہجے میں کہا —
"دفتر کے لوگوں کا طنز اب مجھ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا، اسی لئے گرا دیا ہے، میں نے سوچا، یہ تو محض ایک فارملیٹی ہے، اس میں حرج ہی کیا ہے، اسی طرح شاید ان بے شرم لوگوں کی سرگوشیاں بند ہو جائیں۔"

بھام جی نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "بہت اچھا کیا ہے۔"

اس کے بعد وہ تھکے تھکے قدموں سے آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا، لیکن میز پر ہاتھ رکھتے ہی وہ چونک اٹھا، اس کی فائل غائب تھی، اس کی فائل کہاں گئی؟ اس نے بڑی جانفشانی سے کام کرکے تمام فائل کا کام تقریباً ختم کر لیا تھا، کہیں اسی درمیان بڑے صاحب اس سے فائل نہ طلب کر بیٹھیں، تو کیا انھوں نے ہی فائل منگوالی ہے!

وہ روزینہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ "میری فائل کہاں گئی؟"

"بڑے صاحب لے گئے ہیں۔" روزینہ کی آواز ٹائپ مشین کی کھٹ کھٹ میں گم ہو گئی۔

اس کے بعد بھام جی تمام دن اپنی پرانی مشین کے سامنے خاموش بیٹھا رہا اور روزینہ کی نئی مشین سے پیدا ہونے والی کھٹ کھٹ کی آواز گنتا رہا اور ہر لمحہ اس کا دل دھڑکتا رہا کہ اب بڑے صاحب کا بلاوا آئے گا، لیکن بڑے صاحب نے اسے نہیں بلایا، چار بجے روزینہ اس کے قریب آکر کھڑی ہو گئی، اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے بڑے پیار سے کہا — "آج میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتی، ایک ضروری کام آ پڑا ہے، خفا مت ہوئیے گا، کیوں؟ کل سے پھر ایک ساتھ جاؤں گی" اور دوسرے ہی لمحہ وہ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

دوسرے دن بڑے صاحب نے اسے بلا بھیجا، اس وقت وہ منہ میں پائپ دبائے ہوئے ضروری کاغذات اُلٹ پلٹ کر رہے تھے، بھام جی کو دیکھتے ہی انھوں نے کہا — "گزشتہ کئی ماہ سے تمہارے کام کا جو ریکارڈ میں نے دیکھا ہے اسے دیکھ کر تمہیں برخواست کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے، تم کمپنی کو صرف دھوکہ دیتے رہے ہو، پھر بھی چونکہ تم کمپنی کے پُرانے آدمی ہو، اس لئے نوٹس پیریڈ کی تنخواہ تمہیں مل جائے گی، جاؤ۔"

بھام جی کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکل سکی، بڑے صاحب نے ہونٹوں سے پائپ ہٹا کر کہا۔ "اور سنو میں کوئی اپیل نہیں سنوں گا، مس روزینہ نے نئی ہونے کے باوجود تم سے اچھا کام کر کے دکھایا ہے، اس لئے اب میں سوچ رہا ہوں کہ تمہاری جگہ پر بھی کسی ینگ گرل کو بٹھا دوں گا، کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، جاؤ، میں نے تمہاری نوٹس پر بھی دستخط کر دیا ہے۔"

بڑے صاحب نے غلط نہیں کہا تھا، کمرے میں داخل ہوتے ہی اپنی میز پر پڑے ہوئے ایک بادامی رنگ کے لفافے پر بھام جی کی نظر پڑی، لفافہ کھولتے ہی جیسے ٹائپ کی ہوئی نوٹس باتیں کرنے لگی — "یور سروس از نو لونگر ریکوائرڈ ....." باقی الفاظ وہ پڑھ نہ سکا، اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، بھام جی نے آنکھیں مل کر دیکھا، نیچے بڑے صاحب کا دستخط تھا اور اس کے نیچے ٹائپسٹ کے نام کا پہلا حرف "آر" یعنی روزینہ لکھا ہوا تھا، اس نوٹس میں کہیں بھی کوئی لائن ٹیڑھی نہیں ہوئی تھی۔ اسپیس کم یا زیادہ نہیں تھا، حروف اُلٹ پلٹ نہیں ہوئے تھے، بہت ہی خوبصورت اور صاف ستھرا ٹائپ کیا ہوا نوٹس تھا، لمحہ بھر کے لئے بھام جی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

پھر وہ آخری مرتبہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑا ہو گیا، عقب میں پتلا نیلا پردہ ہوا میں آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور روزینہ کی مشین کی مسلسل کھٹ کھٹ کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

اور بھام جی آہستہ آہستہ دفتر سے باہر نکل آیا۔

پاکستانی ادب کے ترجمے

ہم نے انگلستان - مغربی جرمنی - ہالینڈ - اٹلی - سوئٹزرلینڈ - فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے نئے روابط پیدا کر لئے ہیں۔ ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحال وہاں کے چند کلاسیکی کتابوں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔

اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کر لئے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں کی طرف توجہ کریں۔ اور اس سب کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبعزاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں۔ فی الحال ہم انگریزی ترجموں اور طبعزاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کر لیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں۔

۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک سبق یا باب کا ترجمہ کر کے پورے ناول یا کتاب کے خلاصے کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کر لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے۔ نظم۔ افسانے اور ڈرامے ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں۔ اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا

واضح رہے کہ اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زریں موقعہ کھو دیں گے ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔ اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلا معاوضہ ہی پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا۔ ناولوں اور ثقافتی کتابت کے ترجمے پر زر پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم چند مترجمین یا ادیبوں کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک دعوت عام دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں مواقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھالیں گے ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کی جائے۔

صالحہ اعظم
(ایک سندھی کہانی)

سورٹھ اور رائے دیاس

سن ۸۷۵ عیسوی میں رائے چوڑاسمے راجپوت نے کاٹھیاواڑ میں اپنی حکومت کی بنیاد رکھی۔ اور ونتھلی کو اپنا پایۂ تخت قرار دیا اور پھر اس کے بعد آنے والی نسل کے راجاؤں نے اپنے آپ کو چوڑاسما کہلوانا شروع کر دیا۔ اس خاندان کا سب سے مشہور حاکم گرہریو ہو گزرا ہے۔ جوناگڑھ کا مشہور قلعہ جسے اپرکوٹ کہا جاتا ہے۔ اسی کا بنوایا ہوا ہے۔ ۹۸۲ عیسوی میں رائے گرہریو کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا رائے کوات تخت نشین ہوا۔ جو ۱۰۰۳ عیسوی میں مرگیا۔ اور اس کے بعد رائے کوات کا بیٹا   گدی پر بیٹھا۔

اس زمانے میں گجرات کا حاکم راجہ ددلیہ سین تھا۔ جس کا پایۂ تخت انہلواڑہ پاٹن تھا۔ اور اس وجہ سے اسے انہلرائے بھی کہتے تھے۔ راجہ گرہریو کے زمانے ہی سے گجرات اور کاٹھیاواڑ کے راجاؤں میں دشمنی چلی آرہی تھی۔ اور جب بھی گجرات کے راجکمار یا راجکماریاں گرنار تیرتھ کے لئے جاتی تھیں۔ تو وہاں کے حاکموں کی شہ سے انھیں ستایا جاتا تھا۔ راجہ رائے دیاس کے دور حکومت میں راجہ دھرلپ سین کی رانی اور راجکماری چندرودنا اپنے لوگوں کے ایک گروہ کے ساتھ ہندوستان کی مشہور تیرتھ یاترا کے لئے پہاڑ پر چڑھ ہی رہی تھیں کہ ایک گھوڑے سوار نے ان کا راستہ روک لیا اور کہا "خبردار اگر ایک قدم بھی آگے بڑھے۔" قافلے کے ساتھ جو دیوان تھا۔ وہ آگے بڑھا اور ہاتھ باندھ کر عرض کی "حضور ہم نے کون سا گناہ کیا ہے؟"

گھوڑے سوار نے جواب دیا "میں سوراشٹر کا حاکم رائے دیاس ہوں اور گرنار میری حدود میں ہے۔ پہلے خراج دو پھر آگے بڑھو۔"

دیوان نے کہا "ہم خراج دینے کے لئے تیار ہیں لیکن یہ بھی تو فرمایئے کہ ہمیں کیا دینا ہوگا۔"

دیاس نے جواب دیا "یہاں دولت کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ تم اپنی راجکماری کو مجھ سے فوراً بیاہ دو۔ ورنہ تم کو ایک قدم بھی آگے نہ بڑھنے دیا جائے گا۔"

جب دیوان نے دیکھا کہ بغیر چالاکی کے یہاں سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ تو اس نے رانی سے مشورہ کرنے کے بعد دیاس سے کہا۔—

"ہمارے ایسے بھاگ کہاں تھے کہ آپ جیسا نامور بادشاہ ہماری راجکماری کو مانگتا۔ لیکن سوچئے تو سہی ددلیہ سین کی بیٹی یوں چپ چاپ کیسے بیاہی جا سکتی ہے۔ اور ایسا کرنے میں نہ صرف ہم ذلیل ہوں گے بلکہ یہ آپ کی بھی ذلت ہوگی۔ ابھی آپ ہمیں اجازت دیں تاکہ ہم تیرتھ کرکے اپنے ملک واپس جا سکیں۔ میں اپنی رانی کی طرف سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگلے مہینے کی آج ہی کی تاریخ کو ہم بڑی دھوم دھام سے بارات لے کر آئیں گے۔" کافی ردوکد کے بعد دیاس نے یہ بات مان لی۔ اس کے بعد جلدی جلدی تیرتھ کر

کے وہ لوگ اپنے ملک پہنچے۔ اور پہنچتے ہی راجہ کو تمام قصہ کہہ سنایا۔ مہاراجہ اپنے خاندان کی بے عزتی کا حال سن کر آگ بگولا ہو گیا اور انتقام لینے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ اور آخر کار دیوان کے مشورہ سے پوشیدہ طور پر ایک منصوبہ بنایا۔

وعدے کا دن آ پہنچا۔ دتھل میں گھر گھر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ بازار سجا کر دلہن بنا دیئے گئے تھے۔ ہر طرف سے باجوں گاجوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اور رائے دیاس خوشی کے مارے اپنے قیمتی لباس میں پھولا نہیں سما رہا تھا۔ فقیروں اور محتاجوں کو دل کھول کر دان دیا جا رہا تھا کہ اتنے میں قاصد نے آکر بارات کے آنے کی اطلاع دی۔ تمام امرا استقبال کے لئے قلعہ کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اور باراتیوں کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ لیکن پالکیوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ باراتیوں کی اتنی کثیر تعداد دیکھ کر امیروں کو شک ہوا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ دیوان جو باراتیوں میں شامل تھا اس نے ان کے شک کو بھانپ لیا۔ اور اپنے ساتھیوں کو للکار کر کہا

اے بہادرو پالکیوں سے نکلو اور نادانوں کو بتا دو کہ تم عورتیں نہیں ہو بلکہ جنگی جوان ہو"۔۔۔ بس پھر کیا تھا ہر پالکی سے چار چار جنگی ہتھیار بند جوان نکل نکل کر صف آرا ہونے لگے۔ اتنے میں دیوان آگے بڑھا۔ اور ایک آراستہ پالکی کا پردہ اٹھا کر ایک نقلی دلہن کو باہر نکالا۔ اور اس کا گھونگٹ الٹ کر کہا

"کہاں ہے رائے دیاس تاکہ اس کے شایان شان دلہن کو اس کے حوالے کر دوں"

اس کے بعد رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ رائے دیاس جو شادی کے نشہ میں مست تھا۔ اور جس کے خواب میں بھی دشمنوں کا خیال نہ تھا مقابلہ نہ کر سکا۔ اور اپنے خاندان کے ساتھ ایک سرنگ کے ذریعہ ایرکوٹ میں جا نکلا۔

دشمنوں نے دتھل پر قبضہ کر لیا۔ اور رائے دیاس کی تلاش شروع کی تاکہ اسے گرفتار کر کے راجہ دولبھ سین کے سامنے پیش کیا جا سکے لیکن محل ویران پڑا ہوا تھا۔ اور رائے دیاس کا دور دور تک پتہ نہیں تھا دیوان دتھل میں قیام پذیر ہوا۔ اور راجہ دولبھ سین کے پاس فتح کی خوشخبری بھیجی۔ راجہ دولبھ سین دتھل کی فتح سے بہت خوش ہوا۔ اور سوچا کہ کاٹھیاواڑ پر قبضہ کرنے کا اچھا موقعہ ہاتھ آیا ہے۔ لہٰذا ایک لشکر جرار کے ساتھ جوناگڑھ پر حملہ آور ہوا۔ اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسے معلوم ہو گیا کہ ایرکوٹ کو فتح کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں۔ لیکن پھر بھی اس امید پر محاصرہ کئے رہا کہ آخر کچھ دنوں میں قلعہ کے اندر رسد کی کمی ہو جائے گی۔ اور دیاس خود ہی ہتھیار ڈال دے گا۔ لیکن یہ اس کا خیال خام تھا۔ کیونکہ قلعہ میں دانے پانی کی کمی نہ تھی۔ اور اتنا ذخیرہ موجود تھا کہ برسوں چل سکتا تھا ایک دن راجہ دولبھ سین کی رانی نے لشکر کے بڑھتے ہوئے اضطراب کو دیکھ کر کہا اب تو فتح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ قلعہ پر قبضہ کرنے کے لئے کوئی چال چلنی چاہئے۔ اس نے ابھی اپنی بات پوری نہ کی تھی کہ باہر سے آواز آئی۔۔۔ "راجہ دولبھ سین کی جے"

یہ سن کر راجہ دولبھ سین نے دربانوں کو حکم دیا کہ اس شخص کو ہمارے سامنے حاضر کرو" صدا لگانے والے نے آکر "سلام" کیا اور کہا "میرا نام بیجل ہے۔ اور میں ایک خانہ بدوش جوگی ہوں اگر آپ کسی انعام کا وعدہ کریں تو دیاس کا سر آپ کے قدموں میں لا ڈالوں"

دولبھ سین نے کہا مجھے منظور ہے" نہ صرف تمہیں دولت سے مالا مال کر دیا جائے گا۔ بلکہ تمہیں دربار میں کوئی معزز عہدہ بھی ملے گا لیکن یہ تو بتاؤ تم دیاس کا سر کس طرح قلم کر دو گے۔

جوگی نے مسکرا کر کہا۔ شائد آپ کو تعجب ہو رہا ہو گا۔ کہ آپ کا اتنا بڑا لشکر دیاس کا سر کاٹ کر نہ لا سکا تو میں کیسے لاؤں گا لیکن

آپ کو صرف سر سے مطلب رکھنا چاہیئے۔" یہ کہا اور اُٹھ کر چلا گیا۔

ایرکوٹ تعمیر ہونے کے بعد دیاس کی رانی سورٹھ نے ایک خوفناک خواب دیکھا اس نے دیکھا کہ ایک جوگی نے دیاس کا سر کاٹ لیا ہے۔

اور سورٹھ نے اسی دن سے دیاس کی حفاظت کے لئے محل کے گرد اتنا سخت پہرہ لگوا دیا تھا کہ خاندان کے افراد کے علاوہ دیاس کے پاس کوئی بھی نہ جا سکتا تھا۔

بیجل در لبھ سین سے رخصت ہو کر اپنا ساز کاندھے پر رکھ کر ایرکوٹ پہنچا اسے قلعہ میں داخل ہونے سے کسی نے بھی نہ روکا کیونکہ اس زمانے میں جوگیوں کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ اور وہ جہاں چاہتے تھے بے دھڑک چلے جاتے تھے۔ بیجل ایرکوٹ کے قلعہ میں تو باآسانی داخل ہو گیا۔ لیکن دیاس تک پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس نے آہستہ آہستہ پتہ چلا لیا کہ دیاس قلعے کے کس حصے میں رہتا ہے۔ پھر اسی طرف اپنا ساز لے کر بیٹھ گیا۔ اور دیاس کی تعریفوں کے گیت گانے لگا۔ اپنی تعریف سن کر دیاس نے کھڑکی سے باہر منہ نکالا اور کہا مانگ کیا مانگتا ہے۔ بیجل نے کہا

مجھے آپ کے دیدار کی خواہش ہے۔ مہربانی فرما کر آپ مجھے اوپر بلوائیں۔ کیونکہ مجھے آپ سے ایک راز کی بات بھی کہنی ہے۔" چونکہ اصلی رستے سے جوگی کا جانا ذرا مشکل تھا۔ اس لئے دیاس نے کھڑکی سے ایک رسی لٹکا دی جس کے ذریعہ جوگی اندر پہنچ گیا۔ اور اندر کودتے ہی اس نے ایک نعرہ لگایا۔

"جو داسوں کے سردار راجہ دیاس کی جے ہو"

دیاس نے کہا" اے جوگی مانگ کیا مانگتا ہے"

بیجل نے کہا" مانگنا تو بہت کچھ چاہتا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے دینے سے انکار کر دیا تو ناحق میرے دل میں آپ کی طرف سے میل آئے گا۔

دیاس نے کہا، تو فکر نہ کر میں وچن دیتا ہوں کہ تو جو کچھ مانگے گا اسی لمحے پائے گا،

جوگی نے سوچا کہ اب تو پانچوں انگلیاں گھی میں ہیں۔ چنانچہ ہاتھ باندھ کر عرض کی

"دیاس مجھے دان میں تیرا سر چاہیئے۔

دیاس نے مسکرا کر کہا" بس مانگا بھی تو سر مانگا ارے تجھے ان ہڈیوں سے کیا حاصل ہوگا؟"

بیجل نے کہا" آپ کو اس سے کیا سروکار! میں عام راگیوں اور جوگیوں کی طرح مال متاع کا بھوکا نہیں ہوں۔ صرف یہ آرزو ہے کہ کوئی نیا دان مانگوں تاکہ دور دور تک مشہور ہو جاؤں۔ اور مجھے تیرے سر کے علاوہ کچھ بھی نہیں چاہیئے"

دیاس نے کہا" اگر تیری یہی مرضی ہے تو میں تجھے بڑی خوشی سے اپنا سر کاٹ کر دوں گا" شوہر کے کمرے میں اجنبی کی آواز سن کر سورٹھ کی جان ہی تو نکل گئی۔ وہ تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اور جوگی کو دیکھتے ہی خواب کا منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اور دل بیٹھنے لگا۔ اس نے بیجل کی منتیں بھی کیں اور انعام و اکرام کا لالچ بھی دیا۔ لیکن وہ باز نہ آیا۔ اتنے میں دیاس کی بہن بھی اندر آگئی۔ اور حقیقت حال سے واقف ہونے کے بعد اس نے سوچا کہ اگر میرا بھائی وعدہ سے پھر گیا تو ہمارے خاندان پہ ہمیشہ کے لئے کلنک کا ٹیکہ لگ جائے گا۔ لہٰذا اس نے ہمت دلاتے ہوئے کہا

"اے بھائی تو اس سوالی کو سر کاٹ کر دیدے"

شور و غل سُن کر دیاس کی ماں بھی دوڑی ہوئی آئی اور تمام قصہ سن کر بیٹے کی پیٹھ ٹھونکتے ہوئے بولی "شاباش بیٹے اپنا سر دے کر سرخرو ہو۔ کہیں ایسا نہ کرنا کہ وعدے سے پھر جاؤ۔ ساس تندکی یہ ہمت دیکھ کر سوریٹھ نے بھی کہا

"جوگی میرا سر کاٹ لے اور کوئی فکر نہ کر میں تیرے اوپر اپنا ملک بھی قربان کرنے کو تیار ہوں"

پھر کٹار نکال کر اپنی گردن پر ماری اور سرتن سے جدا کر کے ہاتھ میں لے کر بیجل کو دے دیا۔ لیکن بیجل کا دل اسے ملامت کرنے لگا۔ اس نے چیخ کر کہا اے بھگوان میں نے یہ کیا کیا۔ ایسی خواہش میرے دل میں کہاں سے پیدا ہو گئی۔

جیسے جیسے بیجل چیختا دیاس کا چہرہ نورانی ہوتا جاتا۔ جیسے کہہ رہا ہو "جوگی جلد سر اٹھا لے" لیکن جوگی پیلا پڑتا جا رہا تھا۔ اس میں سر کو اٹھانے کی طاقت بھی نہ رہی تھی۔ آخر راجہ کی ماں نے کہا "بیجل جب تک تو یہ سر اپنے ہاتھ میں نہ لے گا۔ دیاس کی آتما کو شانتی نہ ملے گی۔ مہربانی کر کے یہ سر قبول کر۔" بیجل نے لاچار ہو کر سر کو ہاتھ میں لیا اور اسی وقت دیاس کا دھڑ زمین پر گر پڑا۔

دیرکوٹ میں چندن سے چتا تیار کی گئی۔ بے تعداد آدمی سوریٹھ کو ستی ہوتے ہوئے دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ سوریٹھ سولہ سنگار کئے چتا میں کودنے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ کہ اچانک ایک دیوانہ اپنے ہاتھ میں ایک متبسم چہرے والا سر لئے ہوئے آیا۔ اور چیخ کر کہا

"بچاؤ بچاؤ!! ارے کوئی ہے جو مجھے میرے من میں لگی ہوئی آگ میں جلنے سے بچائے۔ اے دیوی یہ مقدس سر میرے ہاتھ میں زیب نہیں دیتا۔"

سوریٹھ نے سر لے کر بیجل کو دعا دی اور کہا۔ "اے پرماتما اس بھٹکی ہوئی روح کو سکھ اور شانتی دے"۔ یہ کہا اور پتی کی لاش کو گود میں لے کر ستی ہو گئی۔

افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس

۱۔ ژاں پال سارتر کا معاملہ
۲۔ روس اور چینی مندوب کے درمیان جھڑپ
۳۔ گلڈ سے مکمل خط کتابت کا ترجمہ
۴۔ دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس

۱۲ فروری سے ۱۶ فروری تک قاہرہ میں دوسری افریشیائی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں افریشیا کے متعدد ملکوں نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں البتہ پاکستان شریک نہیں ہوا۔ اس کی تفصیل آپ کو اس خط وکتابت میں مل جائے گی جو اس کانفرنس کے دفتر اور گلڈ کے درمیان ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ کانفرنس میں بعض دیگر اہم واقعات بھی رونما ہوئے۔

ژاں پال سارتر کا معاملہ

کانفرنس کی تیاری کمیٹی نے مشہور برطانوی ادیب گراہم گرین اور فرانس کے نامور ناول نویس اور ادیب فرانسیس موریس اور شہرۂ آفاق ادیب "فلسفی" ناول نویس اور ڈرامہ نگار ژاں پال سارتر کے دعوت نامے منسوخ کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس کمیٹی کی طرف سے اس فیصلے کی کوئی وجہ تو نہیں بتائی گئی۔ البتہ اتنا معلوم ہوا کہ سوڈان کے نمائندے حسن عباس صبوحی نے سارتر پر سخت نکتہ چینی کی تھی۔ حالانکہ الجزائر کے نمائندے مصطفےٰ الاشرف نے سوڈانی نمائندے کی تقریر کے جواب میں اُن پر کڑی نکتہ چینی کی اور یاد دلایا کہ سارتر ان فرانسیسی ادیبوں کے سرخیل ہیں جنہوں نے زبان وقلم کی پوری طاقت سے الجزائر کی تحریک آزادی کی حمایت کی ہے۔ الجزائری نمائندے کی بھرپور اور مدلل حمایت کے باوجود سارتر کا دعوت نامہ منسوخ کر دیا گیا انھیں اس کانفرنس میں مبصر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔

چینی اور روسی نمایندوں کے درمیان جھڑپ

کانفرنس میں چینی اور روسی نمایندوں کے درمیان سخت موجودہ بین الاقوامی حالات کے پیش نظر اشتراکی کیمپ کے ان دو ممتاز ملکوں کے نمایندوں کے درمیان سخت جھڑپ ہو جانا، خاصا اہم واقعہ ہے، لیکن کانفرنس کے اندر اور باہر اس پر زیادہ حیرت واستعجاب کا اظہار نہیں کیا گیا گویا لوگ اس صورت حال کے لئے پہلے سے ذہنی طور پر تیار تھے۔

ترکی مندوب ناظم حکمت نے تخفیف اسلحہ کے متعلق کانفرنس میں ایک قرارداد پیش کی یہ کانفرنس عالمی امن کونسل کو ایک پیغام بھیجے نیز تخفیف اسلحہ کے حق میں ایک قرارداد منظور کی جائے۔ چین وفد کے قائد اور چینی وزیر ثقافت ماؤتن نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ روسی وفد کے قائد مرزا ترسون زادہ نے ان کی تقریر کے دوران مداخلت کرتے ہوئے کہا "آداب واحترام کرنا سیکھئے"۔ جس پر چینی مندوب نے برجستہ کہا کہ روسی مندوب کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ چین سے کس چیز کا اور کس شخص کا احترام کرانا چاہتے ہیں" ان کی تقریر کے دوران روسی مندوب نے مداخلت کرنے کی کوشش کی مگر انھوں نے اپنا سلسلۂ تقریر جاری رکھا۔

خبر رساں ایجنسی کا کہنا ہے کہ کانفرنس کے دیگر مندوبین جو اس واقعہ سے خاصے ہراساں تھے، کانفرنس کا مزید حال بیان کرنے سے گریز کیا۔

افریقہ کے بہت سے ملکوں کے نمایندوں نے چینی موقف کی حمایت کی۔

کانفرنس نے متعدد افریشیائی ملکوں کی تحریک آزادی کی حمایت میں قرارداد منظور کی۔

مکمل خط و کتابت

نقل تار مورخہ ۲۸ دسمبر موصولہ ۳۰ دسمبر

افریشیائی ادیبوں کی دوسری کانفرنس کی مجلس ابتدائیہ آپ کے ایک مندوب کو پہلی جنوری کی کانفرنس منعقدہ قاہرہ کے لئے مدعو کرتی ہے دوسری کانفرنس فروری میں ہے تاریخ سے بین الاقوامی کمیٹی مطلع کرے گی۔

سیناناٹک از بیورو کولمبو

نقل مکتوب از گلڈ مورخہ یکم جنوری بنام سینا نائکے صاحب

مکرمی سینا نائک صاحب

آپ کے تار کا شکریہ اس سے پیشتر کہ ہم معاملہ کی گفتگو کریں دو نکات عرض کئے جاتے ہیں۔

(۱) ہمارے ادارے کا پتہ بہت دن سے بدل گیا ہے اب ہمیں مندرجہ بالا پتے پر لکھا کیجئے۔

(۲) ہمارے پاس آپ کا پتہ اور دیگر متعلقہ اطلاعات نہیں ہیں۔ از راہ کرم ہمیں اپنا پورا پتہ اور متعلقہ معلومات سے آگاہ فرمائیں۔

جہاں تک وفد بھیجنے کا معاملہ ہے گزارش ہے کہ آپ نے ہمیں اتنا مختصر نوٹس دیا ہے کہ ہم اس دوران میں ضروری معاملات طے نہیں کر سکتے آپ خود غور فرمائیے کہ ہمیں آپ کا تار ۳۰ کو ملا اور یکم جنوری تک ایک وفد کا انتخاب زر مبادلہ کی فراہمی اور دیگر ضروری مراحل سے گزرنا اور اسے وقت مقررہ کے اندر بھیج دینا ناممکن ہے صرف ایک دن میں اتنے کام نہیں ہو سکتے۔

ہم بہت ممنون ہوتے اگر ہمیں کافی پہلے سے مدعو کیا جاتا اور ایجنڈا بھی بھیجا جاتا معلوم نہیں آپ کے ادارے نے پاکستان کو آخری دن تک کیوں نظرانداز کیا۔

آپ یہ بھی مانیں گے کہ کسی بھی بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت سے پہلے (خاص طور پر جبکہ کانفرنس ہماری افریشیائی برادری کی ہو) کوئی بھی وفد اس کانفرنس کے ایجنڈے کی ترتیب و تدوین میں حصہ لینا چاہے گا زیر غور معاملہ میں ہمیں ایجنڈا معلوم نہیں نہ یہ معلوم ہے کہ ایجنڈے کی ترتیب میں ہمارا بھی دخل ہوگا یا نہیں بہ صورت حال ایک مندوب کیلئے کس قدر پریشان کن ہوگی۔

بہرحال معلوم ہوتا ہے کہ اس بار آپ کی مصروفیات بہت ہیں۔

ہم نہایت خوشی سے فروری کی کانفرنس میں ایک وفد بھیجنا چاہتے ہیں لیکن نہایت ضروری ہے کہ ہمیں کانفرنس

کے بارے میں ضروری اطلاعات بہم پہنچائی جائیں۔ ہم مندرجہ ذیل نکات پر اطلاع کے لئے ممنون ہوں گے۔

(۱) کانفرنس کی تاریخیں۔

(۲) وفد کتنے مندوبین تک کا ہو۔

(۳) وفد کا انچارج کون ہوگا اور اس کے قیام و طعام وغیرہ کا انتظام کون کرے گا۔

(۴) ایجنڈا

(الف) ایجنڈا تیار کرنے کا طریقہ کیا ہے۔

(ب) کیا ہم ایجنڈے پر کوئی بات پیش کر سکتے ہیں تاکہ اپنے افریشیائی بھائیوں سے کوئی ہدایت حاصل کر سکیں۔

(۵) کانفرنس کے ضوابط

(۶) قاہرہ میں پوسٹل اور تار کے پتے جہاں ہمیں مراسلت کرنی ہے۔

(۷) کانفرنس کے گزشتہ فیصلوں سفارشات اور کارروائیوں کی نقل

چونکہ آپ نے اپنا پتہ تار میں نہیں لکھا اس لئے ہم آپ کو وزارت تعلیم حکومت سیلون کی معرفت یہ خط بھیج رہے ہیں جن کو یقیناً آپ کے بارے میں علم ہوگا۔ازراہ کرم ہمیں اس خط کی فوری رسید دیجئے تاکہ ہمیں اطمینان ہو جائے کہ ہم نے آپ سے رابطہ قائم کر لیا ہے۔

مخلص جمیل الدین عالی

نقل تار از گلڈ مورخہ ۱۸ جنوری بنام وزارت تعلیم کولمبو

ہم نے آپ کو مسٹر سینانائکے کے نام ایک خط بھیجا تھا ازراہ کرم مطلع کیجئے کہ کیا وہ خط انہیں دے دیا گیا ہے اور ان کا پتہ کیا ہے۔

گلڈ

نقل مکتوب وزارت تعلیم حکومت سیلون مورخہ ۲۴ جنوری

مکرمی

آپ کے مکتوب مورخہ یکم جنوری اور تار مورخہ ۱۸ جنوری کے حوالے سے اطلاع دی جاتی ہے کہ آپ کا سابقہ مکتوب سینانائکے صاحب کارکن انجمن افریشیائی ادبا کو دے دیا گیا ہے ان کا پتہ درج ذیل ہے۔

نقل تار از گلڈ بنام سینانائکے صاحب مورخہ ۲۵۔جنوری

ہمیں اپنے مکتوب مورخہ یکم جنوری کے جواب کا انتظار ہے۔ ہم کانفرنس میں شرکت کے مشتاق ہیں بشرطیکہ ہمیں ایجنڈا وغیرہ بھیج دیا جائے۔

گلڈ

باقی صفحہ ۷۶ پر

(مرکز)

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے چہرے سے نقاب اٹھانے اور ان پوشیدہ مقاصد کو منظر عام پر لانے سے پہلے جن کی تکمیل کا کام اس نام نہاد ثقافتی کانفرنس سے لیا جا رہا ہے، ہم چند ضروری معروضات پیش کرنا چاہتے ہیں۔

افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے علاقائی دفتر (کولمبو) اور مرکزی دفتر (قاہرہ) سے گلڈ کی مکمل خط و کتابت اسی شمارے میں من و عن درج ہے جس کے مطالعے سے ہمارے موقف اور کانفرنس کے حقیقی خدوخال سمجھنے میں قارئین کو مدد ملے گی۔

اس سلسلے میں ہمارے بیانات بھی پریس میں شائع ہو چکے ہیں لیکن چونکہ مختلف اخبارات خبروں کو اپنے اپنے نقطۂ نظر سے پیش کرتے ہیں جس کی وجہ سے بسا اوقات حقیقت حال واضح نہیں ہو پاتی اس لئے ضروری ہے کہ سارا معاملہ نہایت وضاحت سے بیان کر دیا جائے۔ خاص طور پر جبکہ ہماری مرکزی کمیٹی نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے لئے ایک بڑا وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا۔

اب تک افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس کے نام پر اس سے پہلے تین بڑے اجتماع ہو چکے ہیں۔ چونکہ اس سلسلہ میں اس ادارے کی طرف سے اب تک باقاعدہ لٹریچر دستیاب نہیں ہو سکا، (پتہ نہیں کہ چھپا بھی یا نہیں) اس لئے ہماری اطلاعات ہمارے مندوبین اور محولہ بالا ریکارڈ پر مبنی ہیں۔

پہلا اجتماع ۱۹۵۶ء کے اواخر میں دہلی میں منعقد ہوا۔ اس میں کئی پاکستانی مندوب شریک ہوئے۔ یہ اجتماع زیادہ تر ثقافتی حیثیت رکھتا تھا۔ اس اجلاس کے نتیجہ میں کوئی باقاعدہ تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ اس کانفرنس میں مختلف مسایل پر جو تبادلۂ خیالات ہوا اس کا ریکارڈ نامعلوم وجوہ کی بنا پر نہ تو مندوبین ہی کو بھیجا گیا اور نہ عام اطلاع کے لئے شائع کیا گیا۔

اس کے بعد دوسرا اجلاس اکتوبر ۱۹۵۸ء میں تاشقند میں بلایا گیا۔ وہاں بھی پاکستان کے دو مندوبین فیض احمد فیض اور حفیظ جالندھری شریک ہوئے۔ اس اجتماع کی نوعیت کاروباری کم تھی اور ثقافتی زیادہ۔

اس اجتماع کے بعد افریشیائی ادیبوں کے نام پر ایک مستقل مرکزی دفتر قاہرہ میں قائم کیا گیا۔ اس کی ایک شاخ کولمبو میں بھی قائم کی گئی۔ ایک مستقل کمیٹی بھی تشکیل ہوئی جس میں اہل ترین آبادیوں کے ممالک تو شامل تھے لیکن پاکستان کا ذکر نہیں تھا۔ یہ تو اس کانفرنس کے ارباب بست و کشاد ہی بتا سکیں گے کہ کانفرنس کے کس موثر گروہ کو خوش کرنے کی خاطر پاکستان کو اس کمیٹی میں شامل نہیں کیا گیا۔ لیکن بعد کے واقعات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ پاکستان کو اس کی تشکیل کے ابتدائی دور میں محض دکھاوے کے لئے

شریک کیا گیا تھا جب تک اس کی باقاعدہ تشکیل نہیں ہوئی تھی اور اس کا دائرہ عمل صرف ثقافتی گفت و شنید تک محدود تھا تو پاکستان کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی تھی لیکن کانفرنس کے مستقل مرکزی دفتر اور مستقل کمیٹی کے قیام کے بعد جس میں [illegible] شامل نہیں کیا گیا، جب وہ اپنے اصلی مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے سرگرم عمل ہوئی تو پاکستان کو دانستہ طور پر اس کی کارروائیوں میں شرکت سے محروم رکھنے کے لئے مختلف ہتھکنڈے استعمال کئے گئے۔

سب سے پہلے مارچ ۱۹۶۱ء میں ٹوکیو میں ایک کاروباری' کانفرنس بلائی گئی۔ جس میں پاکستان کو شرکت کی دعوت تو دی گئی لیکن اس انداز سے کہ پاکستان کا کوئی نمائندہ عملی طور پر شریک ہی نہ ہو سکے۔ اس دعوت نامے کی بھی رُوداد مختصر الفاظ میں سنتے چلئے تاکہ آپ تصویر کا دوسرا رُخ بالکل واضح طور پر دیکھ سکیں۔ مذکورہ بالا کانفرنس کا دعوت نامہ مرکزی ایجوکیشنل سکریٹری کے نام لندن میں اس وقت پہنچا جب کانفرنس "نشستند و گفتند و برخاستند" کی منزل سے بھی آگے گزر چکی تھی۔

ہم نے انہیں (ٹوکیو) لکھا کہ ضابطے کی رُو سے آپ کو انفرادی دعوت کی بجائے ہمارے نامزد نمائندے بلانے چاہیئے تھے نیز کم از کم اتنا وقت تو دینا چاہیئے تھا کہ کانفرنس میں شرکت ممکن ہو سکتی۔ لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی جب ٹوکیو پوسٹ آفس نے ہمارا مکتوب اس نوٹ کے ساتھ واپس کر دیا کہ مکتوب الیہ اس پتے پر رہتا ہی نہیں حالانکہ خداوندان کانفرنس نے ہی خط و کتابت کے لئے ہمیں یہ پتہ دیا تھا ہم سوچتے رہ گئے۔ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

یہ سب تحریریں گلڈ کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔

اس کے بعد دوسری "کاروباری" کانفرنس بمقام قاہرہ فروری میں بلائی گئی۔ جس کے متعلق مکمل خط و کتابت شائع کر دی گئی ہے۔ اس کی رُوداد کانفرنس کی طرف سے ابھی تک شائع نہیں کی گئی۔ البتہ مختلف خبر رساں ایجنسیوں نے پس پردہ ہونے والے واقعات کی جو چند جھلکیاں پیش کی ہیں وہ اس کانفرنس کے حقیقی مقاصد کو سمجھنے کے لئے کافی مواد فراہم کرتی ہیں۔ خود اس کیمپ میں جس طرح جوتیوں میں دال بٹی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ "آپس" میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔

اس کانفرنس میں پاکستان کی عدم شرکت کے بارے میں جب چہ میگوئیاں ہوئیں تو اس شو کے ڈائریکٹروں نے عذر گناہ کے طور پر یہ کہنا شروع کر دیا کہ پاکستان افریشیائی برادری میں شریک نہیں ہونا چاہتا۔ اس سلسلے میں مشہور چینی ادیبہ ڈاکٹر ہن سوئن نے جو قاہرہ کی اس کانفرنس میں شرکت کرنے کے بعد پاکستان آئیں اور گلڈ کی مہمان ہوئیں، جو کچھ بتایا ہے اس کا یہاں تذکرہ بیجا نہ ہوگا۔ انھوں نے بتایا کہ کانفرنس میں جب کسی نے پاکستان کے بارے میں پوچھا تو صرف یہ "بتایا گیا" کہ پاکستان افریشیائی برادری میں شریک نہیں ہونا چاہتا اس لئے اس نے شرکت سے انکار کر دیا ہے۔

کوئی بتلائے ہمیں بتلائیں کیا

اصل قصہ یہ ہے کہ جب سے نام نہاد افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس نے "کاروبار" کا آغاز کیا ہے، اس وقت سے اس کے [illegible] پاکستان کی شرکت سے ڈرتے ہیں کہ

ہیں کہتا ہے کچھ اپنی زباں میں

ہم حقائق کی روشنی میں اس کانفرنس کو ایک لمحہ کے لئے بھی افریشیائی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں۔ افریشیائی کا لیبل یا بورڈ لگا دینے سے اس کی روح نہیں بدل سکتی۔ ہم سے زیادہ خود کانفرنس کے کرتا دھرتا افراد اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ کن مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے یہ سارا ڈھونگ رچا رہے ہیں۔ جس کانفرنس میں ایشیا سے سات سمندر دور کے ملک کیوبا کو بطور مندوب

(بجز مصر [illegible] پاکستان کو جو کہ اس کی آبادی کے باوجود نظر انداز کر دیا جائے اس کو افریشیائی کہنا افریشیائی وحدت کے ساتھ کتنا بڑا مذاق ہے۔ ممکن ہے کہ کانفرنس کے شاطروں نے یہ سوچا ہو کہ وہ اس طرح ایک طرف پاکستان کو اس کانفرنس [illegible] طور پر شرکت سے محروم رکھیں گے اور دوسری طرف اُسے افریشیائی ادیبوں میں یہ کہہ کر مطعون بھی کریں گے کہ وہ افریشیائی برادری سے الگ رہنا چاہتا ہے تاکہ اُسے ان ملکوں کے نیک نیت ادیبوں اور عوام کی خیر سگالی حاصل نہ ہو سکے لیکن بساط سیاست کی یہ بہت پرانی اور پٹی ہوئی سامراجی چال ہے انھوں نے پاکستان کو دعوت دینے کے بعد نظر انداز کر کے دراصل غیر شعوری طور پر اپنے ذہنی، اس، دل کے چور اور نیت میں کھوٹ کا نیز پاکستان کی اہمیت اور عظمت کا اعتراف کر لیا ہے۔ اس کو مدعو نہ کرنا بھی ان کے بس کی بات نہ تھی اور اس کی شرکت سے حق گوئی اور بیباکی کے مظاہرے کا جو قومی امکان تھا جسے وہ کسی صورت میں برداشت نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ پاکستان کا کوئی نمائندہ اس "کاروباری" کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے۔ پونے دس کروڑ آبادی کے ملک کی جو ایشیا کے قلب میں واقع ہے کسی فرد یا جماعت کو نمائندگی نہ دینا ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ پاکستان کو اس کانفرنس کی کارروائی سے دور رکھ کر اس پورے "شو" کے ڈائرکٹروں نے اپنی نمائندہ حیثیت کا خود ہی پول کھول دیا ہے۔ صاف بات یہ ہے کہ ایجنڈے کے مطالبے نے ہمارے دوستوں کو (بلکہ مصر کی رعایت سے بھائیوں کا لفظ استعمال کرنا زیادہ مناسب ہوگا) ایسا بوکھلا دیا کہ انھوں نے جواب نہ دینا ہی مناسب سمجھا۔ اور اس طرح انھوں نے افریشیائی ادیبوں اور پڑھنے والوں کو جن تک اس کانفرنس کی خبریں پہنچی ہوں گی، پاکستان کے موقف سے محروم کر دیا۔ یہ گندی سیاست ہو جو کھلاڑی اور بد اخلاقی ہے اور ہم اس کے خلاف سخت احتجاج بلند کرتے ہیں۔

ادب اور دانش کے نام پر عالمی سیاست اور سرد جنگ کا کھیل کس طرح کھیلا جا رہا ہے، یہ اس کانفرنس کی دیگر رُوداد سے ظاہر ہے جو بندشوں کے باوجود کسی حد تک خبر رساں ایجنسیوں میں پہنچ گئی تھی ادیبوں کی اس نام نہاد کانفرنس میں چینی وزیر ثقافت نے مدعو کئے ہوئے ترک نژاد مہندوب ناظم حکمت کی توہین کی جس پر روسی وفد کے قائد مرزا ترسون زادہ نے سخت احتجاج کیا۔ شہرۂ آفاق ادبی شخصیت ژاں پال سارتر کو پہلے مبصر کی حیثیت سے کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ لیکن عین وقت پر الجزائری احتجاج کے علی الرغم ان کا دعوت نامہ منسوخ کر دیا گیا ارباب کانفرنس نے اپنے اس اضطراری اقدام کی کوئی وجہ تو نہیں بتائی لیکن بظاہر سارتر کا قصور یہی تھا کہ وہ حق گوئی اور بیباکی پر مصلحت اندیشی کو ترجیح نہیں دیتے۔ جس ادیب نے فرانسیسی ہوتے ہوئے الجزائری حریت پسندوں کی جنگ آزادی کی علی الاعلان حمایت کی ہو اس کی شرکت سے ارباب کانفرنس کا خائف ہونا بڑی حد تک معقول بھی تھا، بے چاری ڈاکٹر ہن سوئین ایشیائی ہوتے ہوئے بھی مبصرین کی صف میں بٹھائی گئیں اور مندوبین میں شامل نہ کی گئیں۔

اب تک اس تنظیم کی دو "کاروباری" کانفرنسیں ہو چکی ہیں۔ لیکن کانفرنس کے نیتاؤں کے "حسن تدبیر" کی بدولت پاکستان دو نوں کانفرنسوں میں شرکت سے محروم رہا ہے۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ بھی ہو کہ جس کانفرنس کا نہ کوئی ایجنڈا چھپتا ہو اور نہ کارروائی، نہ رپورٹ شائع ہوتی ہو اور نہ قرار دادیں، نہ یہ معلوم ہو کہ اس کے اخراجات کہاں سے پورے کئے جاتے ہیں۔ ساری رقم کوئی ایک ملک فراہم کرتا ہے یا متعدد ممالک۔ اس میں پاکستان کی عملی شرکت واقعی ارباب کانفرنس کے لئے ایک دردِ سر ثابت ہوتی۔

افسوس کہ اس کانفرنس میں کچھ یا جیسے سات سمندر پار ملک کے مسایل کو کشمیر کے حق خود اختیاری پر ترجیح دی جاتی ہے لہٰذا کہ عالمی سیاست کے داؤں پیچ میں لاکھوں انسانوں کی آزادی یا غلامی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ نام نہاد افریشیائی [illegible] جیسے مسئلے پر تو ہر قسم کی بقراطیت دکھانے پر تیار رہتے ہیں لیکن کشمیر کے مسئلے سے گریز کرتے ہیں۔ [illegible] دانشور [illegible]

صفحات سے اقدام کا ضمیر ایک جیسا ہو گیا ہے۔ کانفرنس میں ہندوستان سے سات مندوبین مدعو کئے گئے جبکہ پاکستان سے صرف ایک مندوب بلایا گیا۔ یہ امتیازی سلوک بھی ہماری سمجھ میں نہیں آیا اور نہ خداوندان کانفرنس نے اس اہم مسئلہ پر کوئی تسلی بخش جواب ہی دیا۔

آخر میں ہم اس کانفرنس سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ۔

۱۔ اپنی کارروائیوں اور قراردادوں کی ایک رپورٹ شائع کرے۔

۲۔ اس کا بجٹ اور اس کے ذرائع کی تفصیلات بھی شائع کرے تاکہ معلوم ہو کہ وہ کس سہارے قائم ہے اور اس کے اخراجات کے لئے روپیہ کہاں کہاں سے آتا ہے؟ "ہم قلم" اور "پتریکا" کے صفحات اس کے لئے حاضر ہیں۔

اس موقع پر یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری اطلاعات کے مطابق ہندوستان کے ڈاکٹر ملک راج آنند اور سجاد ظہیر صاحب اس کانفرنس کی کارروائیوں میں پیش پیش تھے۔ بعض حلقوں کا یہ خیال بھی ہے کہ پاکستان کا دعوت نامہ ہندوستانی وفد کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے منسوخ کر دیا گیا۔ ہمیں یقین نہیں کہ ایسا ہوا ہو لیکن کشمیر کے معاملے میں ہندوستانی ترقی پسندوں کا موقف دیکھتے ہوئے ہم اسے بعید از قیاس بھی تصور نہیں کرتے ہیں امید ہے کہ پاکستانی ادیب بھی معاملات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھیں گے۔

بقیہ خط وکتابت

نقل مکتوب مورخہ ۲۹ جنوری از سینا نائکے صاحب

مکرمی عالی صاحب

آپ نے جو افریشیائی ادیبوں کی دوسری کانفرنس منعقدہ ۱۰ تا ۱۵ فروری بمقام قاہرہ کے سلسلے میں انکوائری کی اس کا شکریہ۔

آپ کی فرمائش قاہرہ کی بین الاقوامی انتظامیہ کمیٹی کو بھیج دی گئی ہے اور وہاں سے آپ کو تمام ضروری اطلاعات بھیج دی جائیں گی۔ قاہرہ کا پتہ یہ ہے۔

پتہ

مخلص

سینا نائکے

سکریٹری جنرل مستقل بیورو برائے افریشیائی ادبا

نقل تار مورخہ ۹ فروری از گلڈ بنام قاہرہ کمیٹی

ہمارے نام دعوت نامے کے سلسلے میں خط وکتابت کا حوالہ دے کر عرض کیا جاتا ہے کہ ہمیں آپ کے جواب کا انتظار ہے ہمارے تار کا پتہ یہ ہے

پتہ وغیرہ

گلڈ

قاہرہ سے کوئی جواب نہیں آیا کانفرنس بارہ فروری سے شروع ہو گئی۔

بیرونی روابطہ

کراچی میں ہن سوئین کی آمد

چین کی مشہور ادیبہ ڈاکٹر ہن سوئین ۲۷ فروری کو پاکستان رائٹرز گلڈ کی دعوت پر قاہرہ سے کراچی آئیں تھیں وہ قاہرہ میں افریشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں مبصر کی حیثیت سے شرکت کرنے گئی تھیں کراچی سے وہ لاہور، پشاور اور ڈھاکہ بھی گئیں جہاں پاکستانی ادیبوں نے آنکا شاندار خیر مقدم کیا —

ان کا پورا نام ایلزبتھ کے چاؤ، مسز ار ای کومبر ہے وہ ۱۹۱۷ء میں پیکنگ (چین) میں پیدا ہوئیں — ۱۹۴۸ء میں انہوں نے لندن یونیورسٹی سے میڈیسن میں ڈگری لی — انہیں تصنیف و تالیف سے گہرا لگاؤ ہے — ان کی چار کتابیں ڈسٹی نیشن چنکنگ (۱۹۴۲) اے مینی اسپلنڈرڈ تھنگ (۱۹۵۲) دی ریپ مائی ڈرنک (۱۹۵۵) اور دی ماؤنٹین از ینگ (۱۹۵۸) شائع ہوچکی ہیں —

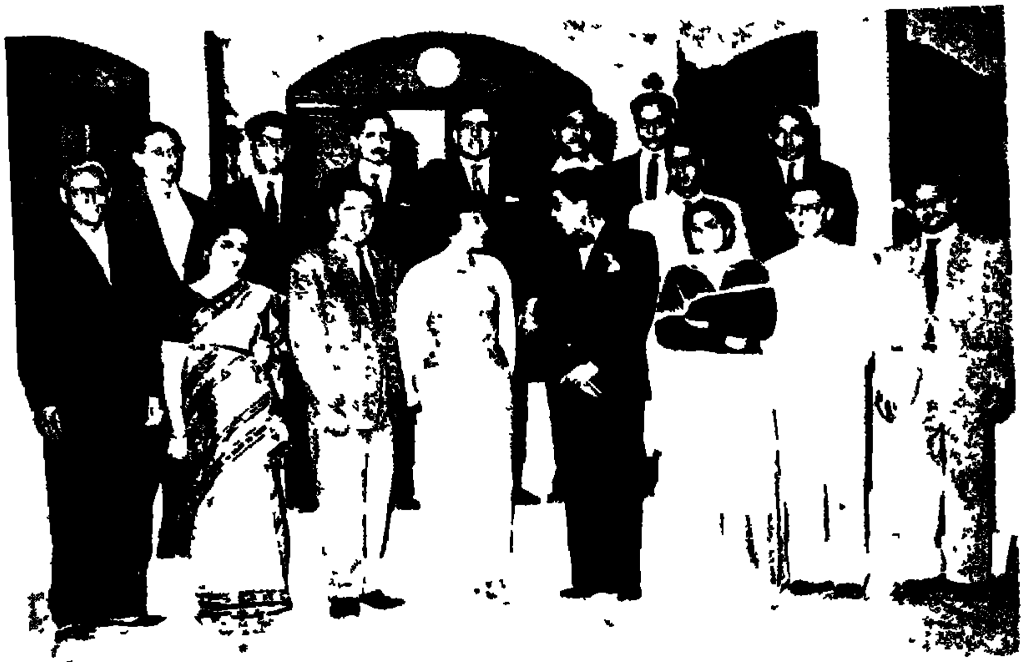
ہوائی اڈے پر استقبال



(اگلی صف میں) دائیں سے بائیں — مسٹر جمیل الدین عالی (ایگزیکیٹو سکریٹری پاکستان رائٹرز گلڈ) ڈاکٹر ہن سوئین، ممتاز شیرین صاحبہ، مسرت تیموری صاحبہ

(پچھلی صف میں) دائیں سے بائیں — مسٹر مظاہر حسین، ڈاکٹر صمد شاہین اور مسٹر تمائی

پاکستان رائٹرز گلڈ کا عشائیہ



۲۷ فروری کو پاکستان رائٹرز گلڈ نے مشہور چینی ادیبہ ڈاکٹر ہن سوئین کے اعزاز میں عشائیہ دیا

(اگلی صف میں) دائیں سے بائیں — سید محمد تقی ایڈیٹر جنگ، ممتاز شیریں، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری
ہن سوئین، پروفیسر احمد علی، مسرت تیموری، شان الحق حقی،
طفیل احمد جمالی

(پچھلی صف میں) دائیں سے بائیں — مسٹر مشتاق احمد، مسٹر تمنائی، مسٹر رضوی، مسٹر جمیل الدین عالی،
مسٹر شوکت صدیقی، مسٹر مظاہر حسین، مسٹر ابن انشا اور
ڈاکٹر صمد شاہین

بیرونی روابط

ڈاکٹر ھن سوئین کا خط

ڈیر مسٹر عالی

سنگاپور پہنچنے پر یہ خط اس لئے لکھ رہی ہوں کہ پاکستان میں میرا جو اچھا وقت گزرا ہے اس کے لئے آپ کا خلوص دل سے شکریہ ادا کروں — آپ میرے تاثرات ''ایسٹرن ہوریزن'' میں پڑھیں گے یہ میگزین میری کتابوں کے ساتھ آپکو بھیجی جارہی ہے — اگر آپ چاہیں تو میری کتابیں آپ کی لائبریری کے لئے یا گلڈ کا جو رکن میری کتابیں پڑھنا چاہتا ہو آپ کے دینے کے لئے بھی بھیجدی جائنگی — میری آئندہ شائع ہونے والی کتابیں بھی آپ کو بھیجی جائنگی —

میں نے واقعی آپ کے ملک کو '' دریافت '' کیا ہے حالانکہ یہ کہنا تو بیجا ہوگا کہ وہاں ہر چیز بہت اچھی ہے — لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اچھے الفاظ سے یاد کئے جانے اور قدر و منزلت کی نظروں سے دیکھے جانے کا مستحق ہے — میں سب سے زیادہ آپ کے عوام کی جرأت اور راست بازی سے متاثر ہوئی —

ایک ایشیائی کی حیثیت سے میں اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہوں کہ مغربی طرز کی جمہوریت برائیوں کی پیشرو ہے اور میرا خیال ہے کہ آپ کے ملک نے عارضی طور پر ایک معقول فارمولا تیار کرلیا ہے — ایشیا کے تمام ممالک آزمائشی دور سے گزر رہے ہیں — ایک ایشیائی کی حیثیت سے میں نے کبھی '' جمہوری کی بنیاد پر نکتہ چینی نہیں کی بلکہ یہ دیکھنے کی خواہاں رہتی ہوں کہ چیزیں عملی شکل اختیار کرنے میں کس طرح عمل کرتی ہیں —

میرا سارا وقت بہت عمدہ گزرا - میں *مسرت کی گرویدہ ہوں - وہ بہت ہی اچھی لڑکی ہے - لاہور بھی مجھے بہت پسند ہے مجھے وہاں کی ہر چیز بہت پسند آئی - میں ایک بار پھر آؤنگی اور وہاں گلڈ کے ہوٹل میں قیام کرونگی - اور سیر سپاٹے میں مصروف رہونگی - وہ بہت اچھا شہر ہے -

مجھے امید ہے کہ ہم ایکدوسرے سے رابطہ رکھیں گے - مجھے آپکی طرف سے تمام کتابیں وغیرہ ملنے کی توقع ہے ہمیں امید ہے کہ ہم اپنے میگزین میں پاکستان ادیبوں کی کہانیاں مضامین اور نظمیں وغیرہ شامل کرتے رہینگے —

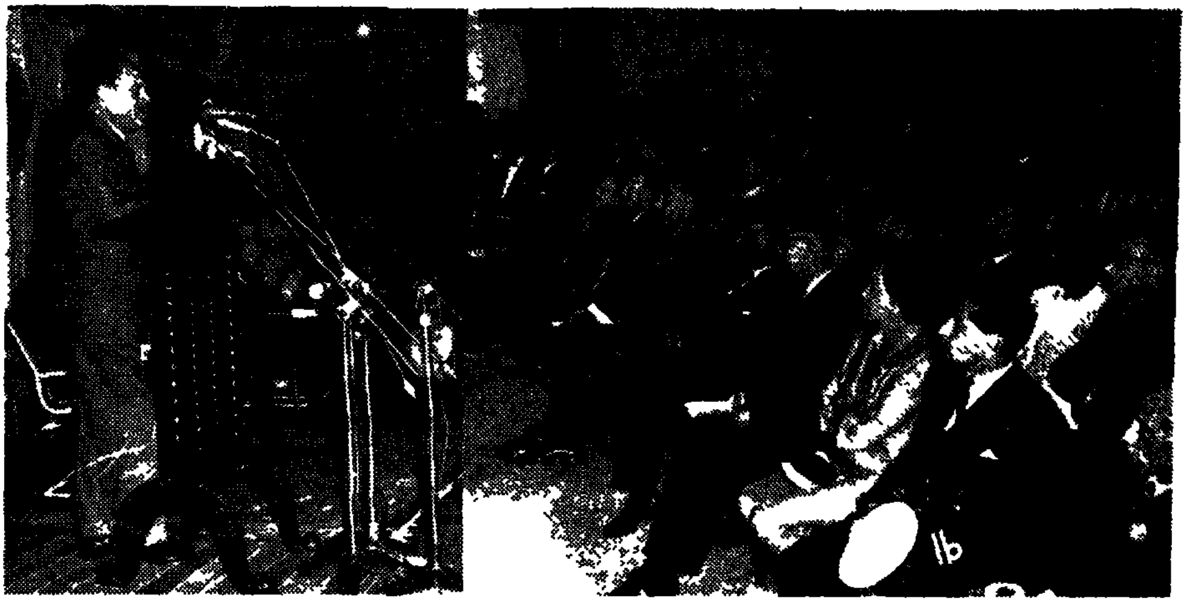
آپکی مخلص

ھن سوئین

---

* ہماری رکن مسرت جہاں تیموری جو ڈاکٹر ھن سوئین کے دوران قیام پاکستان میں '' آفسر تقریبات '' رہیں

پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ



فیلڈ مارشل محمد ایوب خان آدمجی ادبی انعامات کی تقسیم کے موقع پر پاکستان رائٹرز گلڈ کے ممبروں کو خطاب کر رہے ہیں۔



پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب آدمجی ادبی انعام کی تقسیم کے موقع پر اپنی رپورٹ پیش کر رہے ہیں یہ تقریب ۳۱ جنوری ۶۲ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہوئی تھی۔



فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، حمیلہ ہاشمی کو اُن کے ناول "تلاش بہاراں" پر آدمجی ادبی انعام برائے ۱۹۶۱ع دے رہے ہیں—



فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، مسٹر راشد کریم کو ۱۹۶۱ع کا آدمجی ادبی انعام دے رہے ہیں—



فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، مسٹر عبدالرزاق کو ۱۹۶۱ع کا آدمجی ادبی انعام دے رہے ہیں



پروفیسر وقارعظیم، پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ۱۹۶۱ع میں اردو ادب کا ایک سرسری جائزہ پیش کررہے ہیں



مسٹر غلام مصطفیٰ گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ١٦ع میں بنگالی ادب کا
ایک جائزہ پیش کررہے ہیں



جناب صوفی تبسم گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ١٦ع میں پنجابی ادب کا
مختصر جائزہ پیش کررہے ہیں



مسٹر شیخ ایاز پاکستان رائٹرز گلڈ کی
تیسری سالگرہ کی تقریب میں ۱۹۶۱ء
میں سندھی ادب کا مختصر جائزہ پیش
کر رہے ہیں —



پاکستان رائٹرز گلڈ حلقہ مشرقی پاکستان کے آنریری سیکریٹری ڈاکٹر قاضی مطاہر حسین، رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ۱۹۶۱ء کے دوران حلقہ مشرقی پاکستان کی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کر رہے ہیں۔

گلڈ کی تیسری سالگرہ

۱- روسی ادیب اور مسئلہ کشمیر —— قدرت اللہ شہاب
۲- قدرت اللہ شہاب کی تقریر
۳- فیلڈ مارشل صدر ایوب کی جوابی تقریر
۴- مقالات - (مندرجہ ذیل مقالات گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر پڑھے گئے)
اُردو ادب کا ایک سال
بنگالی ادب کا ایک سال
پنجابی ادب کا ایک سال
پشتو ادب کا ایک سال
سندھی ادب کا ایک سال
۵- ایوان ثقافت
۶- گلڈ کے چھاپے خانے
۷- گلڈ کے نئے ممبروں کی فہرست

قدرت اللہ شہاب

روسی ادیب اور کشمیر

(سوویت ادیبوں کی یونین نے گلڈ کو اس کی تیسری سالگرہ پر خیر سگالی کا پیغام بھیجا تھا۔
اس کے جواب میں قدرت اللہ شہاب نے انھیں ایک مکتوب بھیجا جس کا ترجمہ مندرجہ ذیل ہے)

پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر آپ نے جو پیغام ارسال کیا ہے اس کے لئے وہ آپ کی شکر گذار ہے۔

حقیقت کہ سوویت ادیبوں کی یونین مناسب مواقع پر ہم سے خیر سگالی اور تہنیت کے پیغامات کا تبادلہ کرتی ہے "اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان بھی جو مختلف نظریاتی، سیاسی اور دیگر رجحانات کے حامل ہیں، ذہنی مفاہمت کے مواقع ہیں، اس حیثیت سے مجھے آپ کو ایسے لب ولہجہ میں، خطاب کرنے کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے جس کا تعلق نہ تو رسمی امور سے ہے اور نہ ڈپلومیسی سے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے ایسی اسپرٹ میں قبول کریں گے۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے پاکستان ایک نظریاتی مملکت ہے۔ ہم اپنی آئیڈیالوجی یعنی اسلام پر فخر ہے اور اس میں مداخلت کرنے کی ہر کوشش یا گفتگو کو ناپسند کرتے ہیں۔

ہمیں علم ہے کہ آپ بھی ایک نظریاتی مملکت سے تعلق رکھتے ہیں اور آپ کو بھی ایسے ہی جذبات رکھنے کا حق ہے۔

یہاں تک تو ٹھیک ہے۔ لیکن شک وشبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ان میں سے کوئی ایک دوسرے کو تمام ذرائع اور مقاصد کے ذریعہ منحرف کرنے، ہم خیال بنانے یا تبدیل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہماری ایسی کوئی خواہش یا مقصد نہیں ہے۔ آپ کو بھی ایسے ہی جذبات کا حامل دیکھنا چاہتے ہیں لیکن بارہا ایسے حالات پیدا ہوئے جن کی وجہ سے ہمیں تشویش اور مایوسی ہوئی۔

کشمیر

کشمیر ہی کے مسئلہ کو بطور مثال لے لیجئے۔ یہ صرف پاکستان اور ہندوستان کے درمیان محض سیاسی یا علاقائی مسئلہ نہیں ہے۔ یہ دراصل کشمیر کے عوام کا ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اصل مسئلہ صرف اتنا ہے کہ آیا انھیں اپنے حق خود اختیاری کے استعمال کا حق ہونا چاہیئے یا نہیں اس طرح اس کی نوعیت ایک اخلاقی اور انسانی مسئلہ کی سی ہے۔

جہاں تک تھیوری کا تعلق ہے ہمارے خیال میں آپ کی آئیڈیالوجی کے تحت عوام کے حق خود اختیاری پر آپ کا ایمان ہے۔ لیکن درحقیقت عملاً اس کی صورت کیا ہے؟ لیکن جب کشمیری عوام کے حق خود اختیاری کا مسئلہ سیکیورٹی کونسل میں پیش ہوتا ہے تو روس ساری دنیا میں واحد ملک ہے جو اسے ویٹو کرنے کا اعلان کر دیتا ہے۔

اس طرح حق خود اختیاری کا علمبردار اس کی نفی کا علمبردار بن جاتا ہے۔ ایک آئیڈیل کو سیاسی مصلحت بندیوں کے تقاضوں پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

تحریف ـــــــ

آپ کی پولیٹیکل سائنس کی زبان میں اگر یہ تحریف نہیں ہے تو پھر کیا ہے حال ہی میں آپ نے اسٹالن کی لاش کو اس مقام سے ہٹایا ہے جو عزت و توقیر کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ آپ نے اسٹالن پر ظلم و تشدد اور تحریف کا الزام لگایا ہے۔

آج کشمیری عوام کو حق خود اختیاری سے محروم کر کے کشمیری عوام کی غلامی اور ان پر ظلم و تشدد کو مستقل بنانے میں مدد دینے کے لئے آپ کی آئیڈیالوجی کی بنیاد پالیسی تبدیل کی جا رہی ہے۔

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ زمانہ خود ایک سخت گیر محاسب ہے اگر کوئی شخص آگے نہیں بڑھتا تو خود تاریخ ایک نہ ایک دن ان جرائم کے ڈھانچے کو نکالے گی اور اسے انسانی وقار اور عظمت کے معزز مقام سے دور ہٹا دے گی۔

تمام ادیب جو جذباتی شعور کے مالک ہیں اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اخلاقی اقدار انسانیت کی روح ہیں۔

یہ اقدار تمام ملکوں، مدیروں اور حالات کے بعد تک زندہ رہنے والی ہیں۔

کیڑے مکوڑے

مادے اور سائنس کے فلسفے میں جد و جہد کافی نہیں، جس وقت انسان نے خلا میں داخل ہونے کا خواب تک نہیں دیکھا تھا اس وقت پرندے اور مکھیاں وغیرہ آسمان پر پرواز کر رہی ہیں۔ جدید میزائیلوں اور جوہری ہتھیاروں کے تصور سے صدیوں پہلے ٹڈیاں طویل الفاصلہ تباہیوں کا ایک زبردست ذریعہ رہی ہیں، لیکن اس حقیقت سے ٹڈیوں، مکھیوں اور پرندوں کو انسان پر فوقیت حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ کی دیگر مخلوقات پر انسان کی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ انسان

دیانتداری اور ہمدردی [illegible] اخلاقی اوصاف کو ترقی دیتا، جامہ پہناتا اور انہیں باقی رکھتا ہے۔ ان اقدار کے پس منظر میں مسئلہ کشمیر کا جائزہ لینا چاہیئے۔

اس المناک قصے کے صرف ایک پہلو سے آپ واقف ہیں۔ کیا آپ مصیبت زدہ کشمیری عوام سے دیانتداری برتتے ہوئے اس تصویر کا دوسرا رخ دیکھنا بھی پسند کریں گے؟ آپ جس طرح چاہیں گلڈ آپ کو اس سے واقف کرانے میں مسرت محسوس کرے گی۔

لیکن ٹالسٹائی، چیخوف اور گورکی کی روایات کے وارثوں کی حیثیت سے روسی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ اپنی حکومت سے کشمیری عوام کے حق خودارادیت کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کریں۔ یہ فرض روس کے ادیبوں پر ان کے ملک اور بنی نوع انسان کی طرف سے عائد ہوتا ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے اراکین میں پاکستان کی تمام زبانوں، علاقوں اور تمام مکاتیب فکر کے ادیب شامل ہیں جو ایشیا کے قلب میں واقع ساڑھے نو کروڑ انسانوں کی نمائندگی کرتے ہیں، اُمید ہے کہ آپ بھی ایسا کریں گے۔

گلڈ کے تین سال

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب نے یہ تقریر گلڈ کی تیسری سالگرہ کے موقع پر ۳۱ جنوری ۱۹۶۲ء کو ڈھاکہ میں کی تھی اس اجلاس میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان بھی موجود تھے۔

جناب صدر!

تین سال پہلے جب آپ نے پاکستان رائٹرز گلڈ کنونشن کو اپنی شرکت سے نوازا تھا تو اس وقت نہ ہم اپنے اور نہ ہی آپ کے مستقبل کے بارے میں کوئی بات یقین سے کہہ سکتے تھے۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ ادیبوں کا یہ طبقہ جس میں ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے برتر سمجھتا ہے کس حد تک ایک ایسی تنظیم کو چلا سکے گا جس کی بنیاد افہام و تفہیم، خیرسگالی، رواداری اور اپنی مدد آپ کے اصول پر رکھی گئی ہے جہاں تک آپ کا تعلق ہے ہم آپ کو ایک قابل قدر اور لائق فوجی لیڈر کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ لیکن ہم میں سے کسی کو بھی اس کا اندازہ نہ تھا کہ ایک قومی رہنما کی حیثیت سے آپ کتنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ حال ہی میں دوسرے کئی ملکوں میں بھی فوجی کمانڈروں نے حکومتیں سنبھالی ہیں۔ لیکن دوسروں کی یہ مثالیں زیادہ حوصلہ افزا نہ تھیں۔ چنانچہ بہت سارے لوگوں اور خاص کر ادیبوں کے ذہنوں میں ایک بہت بڑا سوال پیدا ہوا تھا۔

بہت سارے ادیب ایسے بھی ہیں جو سال بھر میں نظم یا نثر کی ایک سطر تک نہ لکھنے کے باوجود اس احساس کے لئے بے چین رہتے ہیں کہ انھیں جب جی چاہے جو جی میں آئے لکھنے کی آزادی حاصل رہے۔ شکوک و شبہات اور تشویش کی اس فضا میں اُمید کی پہلی کرن اس وقت نمودار ہوئی جب آپ نے اپنی ناسازئ مزاج کے باوجود ہمارے کنونشن میں شرکت کرنے پر آمادگی کا اظہار کیا۔ آپ کے ذاتی معالج اس پر سخت برہم ہوئے تھے اور انھوں نے انتہائی سخت الفاظ میں مجھ پر آپ کی زندگی سے کھیلنے کا الزام لگایا تھا۔ یہی وہ موقع تھا جب کہ میں آپ کے اسٹاف کے رُکن کی حیثیت سے ایک بار اور صرف ایک بار اپنے فرض کی ادائیگی میں ناکام رہا۔ اور میں نے گلڈ کے اس کنونشن میں آپ کی شرکت کو روکنے کیلئے کوئی قدم نہیں اٹھایا اس طرح آپ نے طبیعت ناساز ہونے کے باوجود کنونشن میں شرکت کی تھی۔ آپ نے عام حاضرین کے ساتھ بیٹھنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی۔ ہمارے بزرگ ادیب ڈاکٹر عبدالحق مرحوم کنونشن کی صدارت کر رہے تھے۔ آپ نے ہماری باتیں بڑے تحمل سے سنی تھیں۔ پھر اچانک اسٹیج پر آ کر آپ نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا تھا اور ایک مدبر، ایک باکمال مقرر، فکری اور نظریاتی دیانتداری دوراندیشی اور غیر معمولی بصیرت رکھنے والے انسان کے روپ میں آپ نے ہم سے دل کھول کر باتیں کی تھیں۔ آپ کی تقریر ختم ہونے سے پہلے ہی ہمیں یہ احساس ہو گیا تھا کہ ہم نے صدر مملکت، سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کی اس شخصیت میں ایک سچا دوست پالیا ہے۔

مگر جناب والا! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہمیں سے ہمارے لئے چند مصیبتوں کی ابتدا بھی ہوئی۔ کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں یہ شبہ ہوا کہ انقلابی حکومت کے اشارے پر گلڈ کو معرض وجود میں لایا گیا ہے تاکہ فکر و فن کی صلاحیتوں پر پہرے بٹھا دیئے جائیں۔ اور کچھ

پرقیت وفیاض کو پورا کیا جائے۔ چند اور لوگ ایسے تھے جن کے خیال میں تمام ادیبوں اور دانشوروں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا اور انھیں ارباب حکومت کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا سراسر احمقانہ حرکت تھی۔ یہی نہیں بعض سرکاری حلقوں نے بھی ہمیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا اور ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کیں۔ وہ سرکاری افسر جو فکر کے غیر ہیں جمود کو پسند کرتے ہیں، اور اگر اس جمود کو توڑنے کی کوشش کی جائے تو نہ صرف اس کوشش کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ اس کی راہ میں روڑے بھی اٹکاتے ہیں۔ چنانچہ جب انھوں نے دیکھا کہ رنگ برنگ کے سفید، سبز، سرخ، گلابی، بھورے، پیلے، کالے اور مختلف زبانوں کے ادیب پہلی مرتبہ ایک ہی پلیٹ فارم پر اکٹھے ہوئے ہیں تو ان افسروں کو سخت تشویش ہوئی اور وہ خوف زدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج نے نوکر شاہی کو جس قسم کی ترتیب دی تھی اس کا ایک خاصہ یہ بھی تھا کہ ہر نئی چیز کو مشکوک سمجھا جائے۔ میں خود سرکاری افسروں کی اس برادری کا ایک رکن ہوں اور میں یہاں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہم ادیب اس رویہ سے بڑے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ گلڈ کے دامن میں غلط طور پر ان چند ادیبوں کو پناہ دی گئی ہے جن کے نام بائیں بازو والوں (   ) کی مستند فہرست میں شامل ہیں اس انداز سے سوچنے والے بڑی آسانی سے یہ بھول گئے تھے کہ گلڈ کے ایسے گیارہ سو اور بھی ارکان ہیں جن کے نام کبھی بھی کسی پولیس رجسٹر میں درج نہیں ہوئے ہیں آج یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ گلڈ کا کوئی دایاں یا بایاں راستہ نہیں۔ اس تنظیم کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے سیدھا سادھا راستہ۔

جناب صدر! ہمارے ملک میں غلط یا صحیح طور پر لفٹ ازم کی اصطلاح کے کئی معنے لئے جاتے ہیں۔ عام طور سے اس اصطلاح کو دانستہ یا نادانستہ طور پر ان لوگوں کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا جاتا ہے جو سیاسی، علاقائی یا ایسی ہی دوسری وجوہ کی بنا پر کسی فرد یا فریق کے مفاد کے مطابق نہیں سمجھے جاتے۔ اس سلسلے میں یہ عرض کرنے کی جسارت کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ تخلیقی صلاحیتوں کو فطری طور پر مضطرب رہنا ہی پڑتا ہے اور اضطراب کی کیفیت ان کے لئے لازمی امر ہے۔ انہیں کسی مقررہ حد کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ اور اس کا واحد سبب یہ ہے کہ تخلیقی صلاحیتیں خوب تر نصب العین کی جستجو میں سرگرداں رہنا چاہتی ہیں۔ لہذا بہترین مقررہ وقت یا موقع بھی کسی حقیقی تخلیقی ذہن کے ذوق جستجو کی تسکین کے لئے کافی نہیں۔ یہی اضطراب بے چینی اور خوب تر کی تلاش زندگی کو رواں دواں رکھتی اور اسے ساکت و جامد کی بجائے متحرک بناتی ہے اگر اسی کا نام لفٹ ازم ہے تو پھر ایک خوبی کے طور پر اس کا خیر مقدم کیا جانا چاہیئے اور قومی تعمیر نو کے کام کی طرح اس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ لفٹ ازم ایک گناہ اور جرم کی صورت صرف اس وقت اختیار کرتا ہے جب وہ بیرون ملک کہیں سے راہنمائی حاصل کرتا اور اندرون ملک گڑبڑ پیدا کرتا ہو۔ اور ایسی صورت میں آپ کے پاس بیشمار قوانین موجود ہیں جنھیں آپ کسی رُو رعایت کے بغیر پوری سختی سے بھی استعمال کریں تو ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

گلڈ کے قیام کے بعد ہماری تیسری بڑی مشکل مالی دشواری تھی۔ اور یہ دشواری فنڈ کی کمی کے سبب نہیں بلکہ کئی گوشوں سے متعدد پیش کشوں کو قبول کرنے سے احتراز کے باعث پیدا ہوئی۔ ہمارے ذہنوں پر پیسہ سوار نہیں تعلیمی اخراجات کے لئے جو کچھ درکار ہوتا ہے وہ ہمیں آپ کی حکومت سے امداد کی صورت میں مل جاتا ہے جس کے لئے ہم آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ جب گلڈ کا قیام عمل میں آیا تو بین الاقوامی سیاست کی منڈی کے بہت سے تاجروں نے یہ سمجھا کہ بازار میں ایک ایسی اور جنس بھی آگئی ہے جسے خریدا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہمیں کئی عام اور کئی خاص بیرونی حلقوں سے خفیہ اور علی الاعلان امداد کی متعدد پیش کشیں موصول ہوئیں۔ ہم نے بڑی شائستگی کے ساتھ انھیں مسترد کر دیا۔ کیونکہ گلڈ کا آئین کسی غیر ملکی حکومت یا تنظیم سے مالی امداد حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

کس قدر حیرانی کی بات ہے کہ اپنے ملکی وسائل پر ہی زندہ رہنے کی ہماری اس خواہش نے ان تمام بیرونی حلقوں کو سخت ناراض

درہم کر دیا۔ ہمارے پاس یہ باور کرنے کی وجوہ موجود ہیں کہ ہم میں سے مایوس ہو جانے والے ان غیر ملکیوں نے چند نا قابلِ ذکر افراد تنظیموں اور ملک کے کم از کم دو اخباروں کو گلڈ کے خلاف مہم چلانے کے لئے مالی امداد دی ہے۔ اس اندرونی و بیرونی دباؤ کا ہم نے صرف ایک جواب دیا ہے اور وہ ہے ہمارا کام۔ ہم کسی بہت بڑے کارنامے کا دعوے نہیں کرتے، مگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ذہنی اور نفسیاتی سطح پر ایک مؤثر قومی یکجہتی اور اتحاد کی کم از کم بنیادیں تو ڈال دی ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ زبان اور لباس کے فرق کے باوجود ہم متحد رہ سکتے ہیں۔ دوسرے لوگ جو ادیبوں کے مقابلے میں کم احساس ہیں اور کم انفرادیت پسند ہیں اگر متحد نہیں رہ سکتے تو اس کی وجہ ان کی خود غرضی ہے۔ ہمارے وطن عزیز میں پہلی مرتبہ ادیب کو اپنے نظریات کی بھینٹ چڑھائے بغیر اپنے پیر پر کھڑے ہونے کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور اس کے عوض اس سے کچھ طلب نہیں کیا گیا۔ طرح طرح کے دباؤ اور رکاوٹوں کے باوجود اسے اس سطح پر لانے میں سب سے زیادہ مدد ایک اور صرف ایک شخص نے دی ہے اور صدر مملکت! وہ آپ کی ذات گرامی ہے جس کے لئے ہم انتہائی خلوص کے ساتھ آپ کے شکر گزار ہیں۔

صدر محترم!

آخر میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ یہ اُمید رکھتے ہیں کہ ایک دن آپ کو رائٹرز گلڈ کا رکن بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ فی الحال تو آپ تاریخ بنانے میں مصروف ہیں اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ ایک دن آپ تاریخ لکھ بھی ڈالیں گے۔ جب آپ لکھ لیں تو گلڈ پبلشنگ ہاؤس اسے شائع کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ ہماری معاوضے کی شرائط کافی دلکش ہیں۔ مصنفوں کو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ رائلٹی دیتے ہیں۔ ہماری طباعت کا معیار بھی بہت بلند ہے اور ہماری مطبوعات کی قیمت بہت کم ہے۔

جناب صدر! ہمیں اُمید ہے کہ جب آپ کی کتاب تیار ہو جائے گی تو ہم سے رجوع کرنے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔

صدر ایوب کی تقریر

رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کی تقریب میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے حسب ذیل تقریر کی

صدر ایوب نے پاکستان رائٹرز گلڈ کی تیسری سالگرہ کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ادیبوں کو لازمی طور پر ایک ایسے مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت تھی تاکہ وہ عوام کی رہنمائی کرسکیں۔ انھوں گلڈ کے منشور کی تعریف کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ نظریات سے بھرپور ہے اور اسے اقوام متحدہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ادیبوں کو بین الاقوامی مسائل کے بجائے قومی مسائل پر توجہ دینی چاہیئے۔ انھیں اپنے ملک اور اپنے عوام کے مسائل پر نظر ڈالنی چاہیئے۔

یاد رکھیئے کہ اگر آپ کامیاب و کامران بننا چاہتے ہیں تو آپ کو پاکستان کی سرزمین پر قدم جمانا چاہیئے۔ اگر آپ ایسا کرینگے تو عوام آپ کو دعائیں دیں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی کی جزا دے گا۔

صدر ایوب نے خانوادۂ آدمجی کی تعریف کی۔ انھوں نے کہا کہ اس خانوادے نے ادبی انعامات دے کر ادیبوں کی بہت زیادہ حوصلہ افزائی کی ہے۔

نے مزید کہا کہ میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ ملک کی مدد کرنا چاہتے ہیں انھوں نے اس توقع کا اظہار کیا کہ ان کے متجسس ذہن مختلف مسائل حل کرنے کے لئے نئے نئے نظریات اور نئی نئی راہیں تلاش کرینگے لیکن انداز فکر حقیقت پسندانہ ہونا چاہیئے۔

زندگی کے مختلف شعبوں کی ترقی کی راہ میں ہمارے ملک کے سامنے مختلف مسایل ہیں۔ ادیبوں کو ان مسائل کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی چاہیئے اور ان کے حل کی تلاش میں اپنی مساعی شامل کرنی چاہیئے۔

صدر ایوب نے مزید کہا۔ پاکستانی ایسے لوگوں کا مجموعہ ہیں جو اس معاشرے سے اُبھرے ہیں جس کی خصوصیت جاگیرداری اور علاقائیت تھی، ادیبوں کا فرض ہے کہ انھیں نئی عادات و اطوار اور نئے تصورات سے روشناس کرائیں۔

آپ کے زیادہ تر مسائل نفسیاتی ہیں لیکن مجھے امید ہے کہ ادیب اس رکاوٹ کو دور کرانے کے بہت سی باتیں تو لوگوں کی طبعی فطری اور ماحولی لگن سے رونما ہو سکتی ہیں اب یہ ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ عوام الناس کے دلوں میں اُخوت کا جذبہ پیدا کریں

(اعلان)

گلڈ کی مجالسِ عاملہ کے انتخابات

پاکستان رائٹرز گلڈ کی مرکزی اور صوبائی مجالسِ عاملہ کے
انتخابات کے لئے حسبِ ذیل تاریخیں مقرر کی گئی ہیں

حلقہ کراچی	۱۵- اپریل ۱۹۶۲ء
حلقہ مغربی پاکستان	۸- اپریل ۶۲ء
حلقہ مشرقی پاکستان	۱۵- اپریل ۶۲ء
مرکز ــــــ	۱۱- مئی ۶۲ء

سید وقار عظیم

۱۹۶۱ء کا اُردو ادب — سرسری جائزہ

مجھے ۱۹۶۱ء کے اُردو ادب کا جائزہ لینے کا حکم دیا گیا ہے اور مجھے بہر حال اس حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ لیکن میرے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ جب تک ۱۹۶۱ء کی تمام مطبوعات پیشِ نظر نہ ہوں اس جائزے کا حق کس طرح ادا کیا جائے۔ کوئی ایک جگہ ایسی نہیں جہاں سال بھر کی تمام کتابیں ایک جگہ مل جائیں اور ایسی کوئی تنظیم نہیں کہ اس کے ذریعے سے سال بھر کی چھپی ہوئی کتابوں کی فہرست ہی مہیا ہو سکے اس لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ دوکان دوکان پھر کر کتابوں کے نام لکھے جائیں اور پھر اُن کے متعلق اظہارِ خیال کیا جائے لیکن اس اظہار کی حیثیت تبصرے کے بجائے محض جائزے کی ہو کہ اس میں کتابوں کے حسن و قبح کے بیان کے بجائے اُن کی خاص خاص میلانات کا ذکر ہو جن کی جھلک بہ حیثیت مجموعی اِن مطبوعات میں نظر آتی ہے۔

۱۹۶۱ء کے اُردو ادب کے اس جائزے میں میرے لئے یہ بتانا مشکل ہے کہ سال بھر میں کتنی کتابیں چھپیں اور بعض مجبوریوں کی بنا پر جو سب کے سامنے ہیں یہ بھی مشکل بلکہ نا ممکن ہے کہ میں اس جائزے میں ہندوستان میں چھپی ہوئی کتابوں کو شامل کروں۔ یہ جائزہ جنوری ۱۹۶۱ء اور دسمبر ۱۹۶۱ء کے درمیان میں پاکستان میں چھپی ہوئی کتابوں کا ہے۔

کتابوں کی اس فہرست کو موضوع وار تقسیم کرنے کے بعد سب سے پہلی بات جو نظر کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سال شائع ہونے والی کتابوں میں ناول، افسانے، ڈرامے، نظموں کے مجموعے، تنقید، تحقیق، تاریخ، سوانح، مکتوبات، ہلکے پھلکے مضامین کے مجموعے اور ٹھوس علمی کتابیں (جن میں فلسفہ، نفسیات، معاشیات، سیاسیات، تصوف سب کچھ ہیں) سب چیزیں شامل ہیں۔ اور ان سب چیزوں کی تعداد میں باہم ایک ایسا توازن ہے کہ پڑھنے والا یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ناشروں نے ہر طرح کے پڑھنے والوں کے مذاق کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ میرے اس بیان پر کہ ناشروں نے ہر طرح کے پڑھنے والوں کے مذاق کو پیشِ نظر رکھا ہے ممکن ہے بعض صاحبان کو یہ اعتراض ہو کہ جب ناشروں میں اس طرح کی کوئی تنظیم موجود نہیں جس کے تحت وہ مطبوعات کے پروگرام میں کسی طرح کے سمجھوتے سے کام لیکر اپنے اپنے لئے کام تقسیم کرلیں تو یہ کہنا کیا معنی کہ ناشروں نے ہر طرح کے پڑھنے والوں کے مذاق کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ اعتراض یقیناً صحیح ہے لیکن جو کچھ میں نے عرض کیا ہے وہ بھی صحیح ہے اس لحاظ سے کہ پاکستان بننے کے بعد سے اس وقت تک ہمارے ناشروں کو اونچ نیچ کے جن مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑا ہے اُس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ حالات کے تقاضے کی بنا پر ایسے حالات پیدا ہو گئے ہیں کہ اب ہم سال بھر کی چھپی ہوئی کتابوں کا جائزہ لینے بیٹھیں تو توازن کی وہ کیفیت بہت نمایاں طور پر ہمارے سامنے آتی ہے جس کی طرف میں نے ابھی اشارہ کیا۔

بات شاید بے محل معلوم ہو اور بظاہر تھوڑی سی طوالت کا سبب بھی بنے لیکن میں آپ سے اپنے خیال کی وضاحت کی اجازت چاہتا ہوں۔ پاکستان بننے کے بعد سے مصنف اور ناشر کتابیں لکھنے اور چھاپنے کے متعلق طرح طرح کی باتیں سوچتے اور اُن پر عمل کرتے رہے ہیں۔ مصنف نے

مختلف وقتوں میں جو کچھ سوچا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ میرے گرد و پیش کی زندگی میں کیا کچھ ایسا ہے جسے میں اپنا موضوع بناؤں، میں کیا لکھوں کہ اُس سے قوم اور ملک کی خدمت ہو سکے، میں تصنیف و تالیف کا کون سا راستہ اختیار کروں کہ اُس پر چل کر اپنے تہذیبی ورثے کو محفوظ رکھ سکوں یا ادب اور اُس کی روایت کو اُس سے کوئی فائدہ پہنچ سکے اور یہ کہ قاری اور ناشر کی مانگ کیا ہے اور کونسی راہیں شہرت اور مالی منفعت کی منزل مقصود تک پہنچاتی ہیں۔ دوسری طرف ناشر مختلف وقتوں میں جو کچھ سوچتا رہا ہے اُس کا انداز کچھ اس طرح کا ہے کہ قاری کو کس چیز کی طلب اور خواہش ہے، اُسے کس طرح خوش رکھا جا سکتا ہے، قومی نقطۂ نظر سے اور تہذیبی ورثے کو زمانے کی دستبرد سے بچانے اور محفوظ رکھنے کے خیال سے کون کون سے کام کرنے کے ہیں، ایسے کون سے کام ہیں جنہیں اس کے اپنے پروگرام میں شامل کرنا چاہیے کہ وہ سوچنے کے نئے انداز اور اس انداز کے پیدا کیے ہوئے تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہیں اور پھر یہ کہ ہر چیز سے قطع نظر مالی منفعت کس کام میں ہے۔ مصنف اور ناشر تیزی سے بہتے ہوئے حالات کی رو میں بہتے، اپنے خیالات بدلتے اور ان بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے کام کے پروگرام کو نئے سانچوں میں ڈھالتے رہے ہیں۔ ادیبوں نے کبھی اپنے خیالات اور منصوبے کے تحت، کبھی ناشر کے مقاصد اور منصوبوں کے تحت اور ان دونوں باتوں سے قطع نظر کبھی دوسروں کی کامیابی سے متاثر ہو کر تقلید کا اور کبھی قاری کی بھوک سے فائدہ اُٹھا کر استحصال (EXPLOITATION) کا راستہ اختیار کیا اور اسی دوران میں بعض بیرونی مفادات نے ملک بھر میں ترجموں کا جال پھیلا کر نہ ادیب دونوں کا رُخ اس طرف پھیر لیا اور اس چکاچوند میں ادیب اور ناشر دونوں نے . . . چھوڑ دیا کہ . . . دل کا، ہمارے ماحول کا ہماری قومی ضروریات کا اور اس کے ساتھ ساتھ ہماری تہذیبی روایات کا تقاضا اور پکار کیا ہے۔ کئی برس تک افراتفری پھیلی رہی اور اچھی بُری دونوں طرح کی کتابیں چھپتی رہیں اور ان میں وہ توازن . . . جو مختلف ذوقوں کی تسکین کے لئے ضروری . . . اچھے اور بُرے کی . . . تمیز اور بعض حیثیتوں سے افراتفری اور بحران کے بعد کتابوں کی دنیا میں ایک ٹھہراؤ اور توازن پیدا ہوا ہے۔ اب . . . رکھی . . . یا بعض . . . رومانی ناول کو اوّلیت . . . سمجھتا . . . اس میں . . . طرف

اچھے اور بُرے کا امتیاز پیدا ہوا ہے وہاں اُسے یہ بھی اندازہ ہے کہ اُس کے ذوق اور دوسروں کے ذوق میں کیا چیز فرق پیدا کرتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناشر نے بھی گو بہ حیثیت مجموعی کوئی جما ہوا منصوبہ نہیں بنایا ہے، یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ کیا چیزیں چھاپے کہ قاری بھی خوش رہیں، ادب کی روایت اور ورثہ بھی محفوظ رہے اور پڑھنے والوں کے حلقے میں بھی برابر اضافہ ہوتا جائے۔ اس سال کی مطبوعات میں توازن کی جس کیفیت کا ذکر میں نے کیا ہے وہ شاید اُردو ادب کی دیر تک قائم رہنے والی روایت بن جائے۔

یہ روایت جن مختلف رُخوں پر چل رہی ہے اُس میں سے تین یا چار بہت واضح ہیں اور وہ اس سال کی مطبوعات میں بھی نمایاں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارے زیادہ تر ناشروں نے ایسی کتابوں کو جنہیں اب ہمارے یہاں کلاسیکی ادب کا درجہ دیا جاتا ہے یا پچھلے ۲۵ — ۳۰ برسوں میں علمی اور فنی نقطۂ نظر سے سندِ قبول حاصل ہوئی تھی اپنے اشاعتی پروگرام کا حصہ بنایا ہے — گو اس انتخاب میں ابھی کلیات اور دیوانوں کی باری نہیں آئی لیکن اس مقصد کے تحت جو پروگرام بنایا گیا ہے اُس میں مشہور کتابوں اور معروف اور مستند کتابوں کے علاوہ ایسی کتابیں بھی شامل ہیں جن میں عام قاری دلچسپی محسوس نہیں کرتا۔ اس رُجحان یا میلان کے تحت اس سال جو کتابیں شائع ہوئیں اُن میں مندرجہ ذیل کتابوں کے نام اہم ہیں: مولانا نذیر احمد کی توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا اور ابن الوقت، شرر کی فردوسِ بریں، رُسوا کی امراؤ جان ادا اور شریف زادہ اور اختری بیگم، منشی سجاد حسین کی حاجی بغلول اور احمق الذین، قاری سرفراز حسین کی شاہدِ رعنا، فورٹ ولیم کی کتابوں میں باغ و بہار اور مذہبِ عشق اور ان کے علاوہ رسومِ ہند اور کرم آرد سی اور قصے کہانی سے ہٹ کر حیاتِ سعدی، مقالاتِ سرسید اور مسافرانِ لندن اور پھر عصمت چغتائی کی چوٹیں اور ضدی۔ ان کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں دو ایک باتیں اور بھی پیشِ نظر رکھنے کی ہیں — ایک تو یہ کہ ان کے ناشر وہ کاروباری لوگ بھی ہیں جن کا پیشہ ہی کتابیں چھاپنا اور ان کے ذریعے روزی کمانا ہے اور دوسرے وہ ادارے بھی جن کے قیام کا مقصد ادب کی ترقی و ترویج ہے اور جو حکومت کی مالی مدد کے سہارے پر چلتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس طرح کی کتابیں صحیح چھاپتے وقت ناشروں کے یہ دونوں گروہ ایک طرف . . .

بات کو ملحوظ رکھتے ہیں کہ کتابیں صحیح چھپیں، دیکھنے میں خوبصورت ہوں اور قیمت کے اعتبار سے ایسی ہوں کہ پڑھنے والا اُن کے خریدنے میں بوجھ نہ محسوس کرے۔ کتابوں کو خوبصورت چھاپنے اور انہیں کم سے کم قیمت پر مہیا کرنے کے میلان کے دو نتیجے ہوئے ہیں' ایک تو یہ سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے ناشر کتابیں اخباری کاغذ پر چھاپ کر اُن کی کاغذی جلد بندی کرواتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ سرکاری ادارے بہتر وسائل مہیا ہونے کی بنا پر کتابیں ٹائپ میں چھاپ رہے ہیں۔ چنانچہ میں نے ابھی جتنی کتابوں کی فہرست پیش کی وہ سب کی سب اخباری کاغذ پر چھپی ہوئی' کاغذی جلد کی صاف ستھری اور دیدہ زیب کتابیں ہیں' دوسرے اُن کی قیمتیں اُن کتابوں کے مقابلے میں نسبتاً آدھی ہیں جن میں بڑے خوشنما ٹائپ میں چھپی ہیں۔

موضوع کے انتخاب کے معاملے میں ۱۹۶۱ء میں چھپنے والی کتابوں میں ایک اور نمایاں رُجحان یہ ہے کہ مسلمانوں کے فکر اور خصوصیت سے اُن کی تاریخ اور اکابر اسلام کی زندگی کو کتابوں کا موضوع بنایا جائے۔ اس رُجحان کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ذیل کی مطبوعات میں ہوتی ہے۔ دس بڑے مسلمان (مولوی اسماعیل پانی پتی)' سلطان محمد فاتح (امین ذکریا)' امام زین العابدین (عبدالعزیز سید اہلی)' عمر بن عبدالعزیز (احمد زکی)' ابوذر غفاری (عبدالحمید)' تذکرہ صوفیائے ہند' تذکرہ علمائے ہند' تعلیمات عبدالقدوس گنگوہی و تذکرہ صوفیائے ہند (اعجاز الحق قدوسی)' سوانح خواجہ معین الدین چشتی' الفوز الکبیر (شاہ ولی اللہ)' فلسفۂ اقبال میں خدا' کائنات اور انسان کا تصور' اقبال اور تصوف' ان کتابوں میں سے بعض طبع زاد ہیں' بعض عربی سے ترجمہ ہیں' بعض نئی تالیفات ہیں' بعض قدیم کتابوں کے نئے ایڈیشن ہیں لیکن یہاں بھی اکثر و بیشتر یہ بات پیش نظر رکھی گئی ہے کہ کتابیں مہنگی نہ ہوں' اچھی چھپیں اور متن میں صحت ہو گو جہاں تک متن کی صحت کا تعلق ہے اب بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ کام زیادہ توجہ اور وقت نظر سے نہیں کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ ناشر کی خواہش اور کوشش قیام پاکستان کے بعد سے برابر یہ رہی ہے کہ ایک خاص طرح کے جذباتی ہیجان میں سے گزرتا ہوا قاری جس چیز کی طلب کر رہا ہے وہ زیادہ سے زیادہ مقدار میں اُس کے لئے مہیا کی جائے۔ ناشر کی اس خواہش اور کوشش میں بعض صورتوں میں ادیبوں نے اُس کا ساتھ دیا اور اُس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شروع کے چند برسوں میں کثرت سے ایسے افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں جن کا موضوع وہ حوادث تھے جن میں سے ہو کر انسان کو ۱۹۴۷ء سے ذرا پہلے اور اُس کے کچھ بعد گزرنا پڑا تھا۔ ان کہانیوں اور ناولوں کے علاوہ' کچھ تو انہیں کے ساتھ ساتھ اور زیادہ تر ان کا ہنگامی دور گزرنے کے بعد ہمارے ادب میں تاریخی ناولوں کی جو رَش شروع ہوئی' سیاسی اور معاشرتی پس منظر رکھنے والے وہ ناول لکھے گئے جن کے اصلاحی ہونے پر فخر کیا گیا یا ایسے رومانی ناول جن کا مقصد بوالہوسی کی نمائش کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بد لیبل کئی برس تک ادب کی فضا پر چھائی رہنے کے بعد آہستہ آہستہ چھٹنی شروع ہوئی یہاں تک کہ اس سال کے اُردو ادب کی افسانوی تخلیقات کی بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اِکا دُکا کتاب کو چھوڑ کر کوئی ایسی نہیں جس کی بنیاد غور و فکر پر نہ ہو یا جو محض قاری کی خوشنودی اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے یا ناشر کے حکم کی تعمیل کی غرض سے لکھی گئی ہو۔ ناولوں میں تلاش بہاراں' علی پور کا ایلی اور سنگم افسانوں کے مجموعوں میں ہاجرہ مسرور' واجدہ تبسم اور انور کے افسانوں کے مجموعے اور مرزا ادیب کے ایک ناول ڈرامے کسی اور چیز کے زیادہ ایک ایسے فنی تجربہ کے مظہر ہیں جس کی بنیاد خلوص پر ہے۔ ان کتابوں کے ناشروں نے اپنی مطبوعات کو ظاہری محاسن کے لحاظ سے بھی اپنے اپنے وسائل اور ذوق کے مطابق اچھا بنانے کی کوشش کی ہے۔

نظموں اور غزلوں کے مجموعے اس سال بھی حسب معمول کم ہی چھپے۔ ان کی تعداد ۶۔۷ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ یہ مجموعے بھی خوش ذوقی سے چھپے ہوئے ہیں۔ لیکن ان میں بھی صوفی تبسم کا مجموعہ 'انجمن' اور منیر نیازی کا مجموعہ "جنگل میں دھنک" لیتھو اور ٹائپ کے اس بلند معیار کو قایم رکھنے کی سعی کوشش ہیں جسے بعض ناشروں نے اپنا معمول بنایا ہے۔

اِس سال کی مطبوعات کی فہرست کو دیکھ کر جس طرح اُسے رسمی قسم کے ناولوں سے خالی پانا اور اس بات پر خوش ہوتا ہے اُسی طرح

ایک اور چیز کو کم ہوتا دیکھ کر بھی وہ خوشی اور اطمینان کا سانس لیتا ہے اور وہ ہیں انگریزی اور خصوصیت سے امریکی کتابوں کے ترجمے۔ ترجمے اس سال بھی ہوئے ہیں اور اب بھی اُن کی طباعت اور اشاعت میں ثقافتی اور بیرونی ناشروں کا اشتراک شامل ہے لیکن اب اُن وہ غلغلہ نہیں سنائی دیتا جس کے نیچے ہر اچھی آواز دب کر رہ جاتی تھی۔ ترجموں کی افزائش کی کوششیں اب بھی جاری ہیں اور انہیں برابر جاری رہنا چاہئے لیکن ہمارے قاری نے جس طرح افسانوی ادب کی تخلیقات کے معاملہ میں پسند کے ایک خاص معیار کا ثبوت دیا ہے اُسی طرح وہ ترجمہ کرنے والوں کے لئے بھی آہستہ آہستہ ایک راستہ متعین کر دیا ہے۔ اُس نے ترجموں کے بجائے طبع زاد تخلیقات کو اپنے ذوق کی تسکین کا وسیلہ بنایا ہے اور ادیب کو یہ سبق سکھایا ہے کہ وہ خواہ ناول لکھے خواہ افسانہ، خواہ نظم کہے خواہ غزل جذبے کے خلوص، فکر کی سنجیدگی اور بیان کی شگفتگی سے رشتہ قائم رکھنے کو اپنا فنی منصب جانے اور دوسرے یہ کہ یہ سمجھنا چھوڑ دے کہ قاری صرف اُن چیزوں سے خوش ہوتا اور اُن کی داد دیتا ہے جو فکر کی گہرائی اور منطق کے ربط سے خالی ہوں۔ اس سال کی مطبوعات میں قاری کے اس میلان کا عکس ایک طرف تو اُن کتابوں کی کثیر اشاعت سے ظاہر ہے جن کا ذکر میں نے اسلامی فکر اور تاریخ کے موضوع کے ضمن میں کیا اور دوسری طرف تنقید اور تحقیق کی اُن کتابوں سے جن کی فہرست میں اب پیش کر رہا ہوں۔ اُن چند تحقیقی اور تنقیدی کتابوں کو چھوڑ کر جن کے نئے ایڈیشن شائع ہوئے ہیں اس سال کی خاص خاص کتابوں کے نام یہ ہیں:

حکمت رومی (ضیاء الدین برنی)، تذکرۂ جگر (محمود علی خاں)، جدید اُردو شاعری (عبادت بریلوی)، اردو میں سوانح نگاری کا ارتقا (دو کتابیں شاہ علی، الطاف فاطمہ)۔ مومن اور مطالعۂ مومن (دو کتابیں۔ عبادت بریلوی اور فائق رامپوری)۔ شعر العجم فی الہند (شیخ اکرام الحق)۔ سرشار کی ناول نگاری (طلعت حسین ادیب) دکنی ادب کی تاریخ (ڈاکٹر محی الدین قادری زور)۔ تاریخ ادب اُردو (عبدالقیوم)۔ مقالات سلیم۔ مکتوبات عبدالحق۔ مقالات سرسید۔ مقالات یوم شبلی — یہ فہرست بھی دوسرے موضوعات کی کتابوں کی طرح مکمل نہیں۔ اس کے باوجود یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمارے ناشر نے زمانے کے بہت سے اونچ نیچ دیکھ کر اب جس راستے پر چلنا شروع کیا ہے اُس پر چلنے میں بظاہر کئی فائدے ہیں — یوں رفتہ رفتہ وہ کتابیں جو ناپید ہوتی جارہی تھیں پھر سامنے آجائیں گی۔ یوں ادب کے ذخیرے میں ایسی چیزوں کا اضافہ ہوگا جن کا مطالعہ ایک طرف پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کا سبب بنتا ہے اور دوسری طرف مسرت و انبساط کا وہ سرمایہ بہم پہنچاتا ہے جو صرف ادب کا امتیاز ہے۔ کسی عہد کی ادبی تخلیق میں جب تک فکری یا فنی پہلوؤں کا پلّہ بھاری نہ ہو ادب کی ترقی کی راہیں محدود رہتی ہیں اور اس سال کی ادبی تخلیق اسی طرف بڑھتی نظر آرہی ہے جو اُسے ترقی کی طرف لے جاتی ہے۔

قاضی مظاہر حسین

بنگالی اَدب

(ایک سال کا جائزہ)

صنعت دو معنوں میں مستعمل ہے۔ انڈسٹری اور آرٹ۔ غیر ترقی یافتہ ممالک میں انڈسٹری کا لفظ آرٹ کے مقابلے میں زیادہ سُنا جاتا ہے۔ مگر مشرقی پاکستان میں آرٹ کی اہمیت انڈسٹری سے کسی طرح کم نہیں یہاں یہ دونوں شانے سے شانہ ملائے ہوئے ترقی کر رہے ہیں۔ پچھلے سال کی ادبی تخلیقات کا جائزہ لیتے وقت یہ حقیقت بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔

پچھلے سال جو کتابیں منظرِ عام پر آئی ہیں۔ ان میں دو باتیں نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ ایک افسانوی ادب کی کتابوں کی تعداد اور دوسری ان کا گٹ اَپ گرد پوش اور گٹ اَپ کی خوب صُورتی اور دیدہ زیبی کا تعلق براہِ راست آرٹ سے ہے اور آرٹ یہاں برابر ترقی کر رہا ہے۔ آزادی کے فوراً بعد مشرقی پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کو اگر گزشتہ سال کی کتابوں کے سامنے رکھا جائے تو ان میں بڑا فرق نظر آئے گا۔ سیدؐ ولی اللہ کا ناول "لال سالو" کے دوسرے اڈیشن ہی کو لے لیجئے! پہلے اڈیشن کے مقابلے میں کہیں زیادہ دیدہ زیب اور خوب صورت ہے۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ آرٹ انسٹیٹیوٹ کی خدمات خاص طور پر لائق تحسین ہیں۔ گرد پوش اور گٹ اپ کے ساتھ ساتھ پہلے کی بہ نسبت یہاں طباعت کا معیار بھی کافی بلند ہو گیا ہے۔ غرض یہاں آرٹ اور انڈسٹری دونوں دوش بہ دوش ترقی کر رہے ہیں۔

افسانوی ادب پر مشتمل کتابوں کی تعداد گزشتہ سال بھی دیگر اصناف ادب کی کتابوں سے زیادہ رہی۔ اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ پڑھنے والوں کی اکثریت کہانیوں کی دلدادہ ہے۔ دیہاتوں میں رہنے والے جس طرح داستانی اُدب پر جان دیتے ہیں، اسی طرح شہر میں بسنے والے افسانوں اور ناولوں کے شیدا ہیں۔

جدید شاعری افسانوی عنصر سے عاری ہے، اس کا میدان ہی مختلف ہے اس لئے نثری ادب سے اس کی کوئی ٹکر نہیں! افسانوی ادب بتدریج شہری زندگی کو مرکزیت دینے کی طرف مائل نظر آ رہا ہے۔ سماج کا متوسط طبقہ زیادہ تر شہروں میں آباد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں متوسط طبقہ اور شہر دونوں نے اپنی اپنی جگہ بنالی ہے۔ افسانوی ادب کی مقبولیت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ پڑھنے والوں کی نظر کے سامنے ان کی اپنی زندگی کی تصویریں ہوتی ہیں۔ پچھلے سال دو ناول "اتم پروشش" اور "کنیا کماری" منظرِ عام پر آئے ہیں اور آدم جی انعام بھی پا چکے ہیں رشید کریم کے ناول "اتم پروشش" کے کردار متوسط مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح عبدالرزاق کے "کنیا کماری" کی ہیروئن اگرچہ کچھ دنوں دیہات میں زندگی گزارتی ہے مگر اس کے باوجود اس کا مذاق اور احساس شعور عام متوسط گھرانے کی لڑکیوں جیسا ہے۔ ان دونوں ناولوں کے کردار دولتمند نہیں مگر پھر بھی ان کے دلوں میں بڑی کشادگی ہے "اتم پروش"

کا ہیرو کسی بیں افسانہ نگاری کی طرف مائل نظر آتا ہے اور "کنیا کماری" کی ہیروئن آگے چل کر آرٹسٹ کی حیثیت سے بین الاقوامی شہرت حاصل کرتی ہے۔

عبدالغفور چودھری کے ناول "شیش رنجنی پر چاند" کے کردار متوسط سے بھی کچھ نیچے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور بڑی جدوجہد کے بعد غم واندوہ کی تاریکیوں سے نکل کر زندگی کی روشنی میں سانس لیتے ہیں۔ یہی چیز علاء الدین الآزاد کے "۲۳ نمبر وائل پینٹنگ" میں ملتی ہے۔ ناول کا ہیرو ایک آرٹسٹ ہے اور ۲۳ نمبر پینٹنگ اس کی نئی تصویر ہے۔ اسی طرح شو دھیر چودھری کے ناول "سنہری دھوپ" میں بھی شہری زندگی کے مسئلوں اور گتھیوں کا ذکر ملتا ہے۔ افسانوی ادب کی جتنی کتابیں اس وقت تک شائع ہوئی ہیں، ان میں جذبات شعور اور ذہنیت کے اعتبار سے سارے کے سارے کردار خالص شہری ہیں۔ ہر شخص ایک الگ جزیرہ ہے مگر اس کے باوجود ایک دوسرے کے سکھ اور دکھ سے متاثر نظر آتا ہے۔ عبدالغفار چودھری کا "سندر ہے سندر" انیس چودھری کے افسانوں کا مجموعہ "شو قیر پوتوں" عبدالشکور کا "کچی پومان" اور "آسمان پر بے شمار کنکوے" یہ سب اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ ابوالحسن شمس الدین کی کتاب "سیلاب زدہ کھیت" اور محمد شمس الرحمٰن کی تصنیف "شام کا ستارہ" بھی اسی ضمن میں آتی ہیں۔

افسانوی ادب کا سرمایہ صرف شہری زندگی کی عکاسی تک محدود نہیں ان میں ہمیں دیہاتی زندگی کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ دیہات ہمارے شہروں کے Hinter Land ہیں اور یوں بھی شہر دیہاتوں سے زیادہ دور نہیں۔ منظر الاسلام نے اپنی کتابوں کا نام "تال تمال" رکھا ہے جس سے فطرت سے قربت کا احساس ہوتا ہے۔

ان کے علاوہ کئی ایک ناول اور بھی شائع ہوئے ہیں۔ شوکت عثمان کا "جننی" اور ابوالکلام شمس الدین کا "کنچن مالا" ان دونوں ناولوں میں مرکزی کردار عورت ہے۔

"مان" اور "ستیش گھیر کہانی" کے مصنف قاضی ابوالحسن اور بندے علی میاں ہیں۔ دونوں ناولوں کا پس منظر دیہات ہے۔ بندے علی میاں ایک کہنہ مشق شاعر بھی ہیں۔ نورالنہار کا ناول "جنگل پر بیٹے" پچھلے سال ہی شائع ہوا ہے۔ یہ بھی دیہاتی زندگی سے متعلق ہے۔

مشرقی پاکستان کے افسانوی ادب میں دیہات جب بھی پس منظر کی حیثیت سے سامنے آتا ہے، اس میں عورتوں کا کردار مردوں کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے، فطرت کو یہاں ہمیشہ جنس لطیف سے تشبیہ دی گئی ہے۔ چنانچہ عورت کی محبت اور اس کے دل کا سوز و گداز افسانوی ادب کی روح ہیں۔ سوشل سائنس کے ماہرین کیلئے یہ بات شاید قابل توجہ ہو۔

افسانوی ادب میں شہر اور دیہات کے درمیان ایک اور پس منظر بھی ہے اور وہ پرانے زمیندارانہ نظام کا انحطاط ہے۔ عبدالغفار چودھری کا "چندر دو دیپ پرا و پچھان" اور سید شہادت حسین کا "شاہجیر بیلار کہانی" دونوں کا یہی پس منظر ہے، اگر یہ دونوں ناول صرف انحطاط کی داستان نہیں دہراتے بلکہ تعمیر کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ پرانے نظام کے انحطاط کے معنی یہ نہیں کہ ہیرو اور ہیروئن بھی روبہ انحطاط ہیں۔ ان دونوں ناولوں کے کردار ایک نئی زندگی اور ایک نئے نظام کی سمت بڑھتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مشرقی پاکستانی ادب کی دو صنفیں اور بھی ہیں جو قابل توجہ ہیں سفرنامے اور Belles lettres ابتدا میں ہم نے ادب پر شہروں کی اثر اندازی کا ذکر کیا ہے سفرناموں اور Belles letters پر نہ صرف شہر اثر انداز ہیں بلکہ دونوں کا ایک دوسرے سے چولی دامن کا ساتھ ہے حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں اصناف ادب کا تعلق شہروں کے مذاق اور پسند سے ہے۔ سید شہادت حسین اور عبدالوہاب کے سفرنامے "دور پر شور" اور "دیکھے ملے ہم رشیا" پچھلے سال شائع ہو چکے

ہیں۔ حسن فردوسی کے "آزمو" اور سبین الدین احمد کے "روپ ہوتے روپے" کو Belles lettres میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ آخر الذکر کتاب میں قانون اور کچہری کو مرکز بنا کر معاشرے کے مسائل اور ان سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ عبد الحق کے طنزیہ مضامین کا مجموعہ "بان پر دسیتر پورے" سماج اور موجودہ حالات پر ایک بھرپور طنز ہے۔

تنقیدی مضامین critical essays بھی ترقی کی دوڑ میں دیگر اصناف ادب سے پیچھے نہیں۔ ابوالفضل کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "ساہتیو وشنشکریتی سادھونا" پچھلے سال ہی شائع ہوا ہے۔ ابوالفضل ہمارے پرانے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ ادب سے متعلق ان کی رائیں ہمارے لئے قابل قدر ہیں۔

راجشاہی یونیورسٹی کے پروفیسروں میں منظر الاسلام اور قاضی عبد المنان کی کتابیں "کوی حیات محمود" اور "آدھونک بانگلا شاہتے مسلم شادھونا" تحقیقی کارنامے ہیں۔ "کوی حیات محمود" عہد متوسطین کا ادیب تھا۔ منظر الاسلام نے اپنی کتاب میں اس کی زندگی اور کارناموں پر روشنی ڈالی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ عبد المنان کی کتاب بھی ہماری اُدبی روایتوں کو اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوگی۔

مشرقی پاکستانی ادب شاعر انقلاب قاضی نذر الاسلام کا ممنون احسان ہے عبد القادر نے حال ہی میں نذر الاسلام کی ان تمام چیزوں کو جو وقتاً فوقتاً اخباروں اور رسالوں میں چھپتی رہی ہیں، یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔

ہمارے ادب میں ایک اور روشن ستارہ میر مشرف حسین ہیں۔ اشرف صدیقی نے ان کی کتاب "غازی میاں آر بستانی" کو اڈٹ کرنے کے بعد شائع کیا ہے۔

پچھلے سال بنگالی اکاڈمی نے بھی "شہید تیتو میر" اور "سلہٹی بھاشا تیتر بھومیکا" نامی دو کتابیں شائع کی ہیں۔ "شہید تیتو میر" کے مصنف عبد الغفور صدیقی ہیں جو چند سال قبل ہم سے جدا ہوگئے ہیں۔ اس کتاب میں ہماری جدوجہد آزادی کا پہلا مجاہد تیتو میر کی زندگی کے واقعات درج ہیں۔ پچھلے سال احمد شریف نے ویشنب مت کا پرچار کرنے والے مسلمان شاعروں کی نظموں کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے۔ قاضی افسر الدین احمد کی کتاب "شا ہتیر پوری دھی" ادب اور اس کے مسائل سے متعلق ہے۔

پچھلے سال "بوہی پیر"، "تال" اور "اُبر تو" نامی تین مختصر ڈراموں کا ایک مجموعہ P.E.N. سے انعام پا چکا ہے۔ سید ولی اللہ، عظیم الدین احمد اور رضیہ خان ان ڈراموں کے مصنف ہیں۔ عسکر ابن شیخ اور جبید الحق کے ڈرامے "ملے پار او پار" اور "بیتیر کروم" بھی پچھلے سال ہی شائع ہوئے "نوفل و حاتم" فرخ احمد کا منظوم رزمیہ ڈرامہ ہے۔ گلڈ کے پبلشنگ ہاؤس نے اسے پچھلے سال ہی شائع کیا ہے۔ غیر زبانوں کے ایک ایکٹ کے پانچ ڈراموں کا ایک مجموعہ منیر چودھری نے ترتیب دیا ہے۔

کوی غلام مصطفےٰ نے اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ کا منظوم ترجمہ بھی پچھلے سال شائع کیا ہے۔ علاء الدین الآزاد، سید شمس الحق محمد منیر الزماں اور عمر علی کے شعری مجموعے بھی پچھلے سال شائع ہوئے ہیں۔ یہ سب کے سب جدید رجحانات کے حامل ہیں۔ عورت اور فطرت ان کی شاعری کے خاص موضوع ہیں، مگر ان کا اسلوب اور زاویۂ نگاہ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ "تان چترو" اور "ایکودا ایک راجے" علاؤالدین اور شمس الحق کے مجموعوں کے نام ہیں۔ منیر الزماں کے مجموعے "درلوب دن" میں سنہ ۔ سنہ تک کی نظمیں شامل ہیں۔ عمر علی ان سب میں عمر کے لحاظ سے چھوٹے ہیں: "اے دیشے شیمل رنگ رمو نیر شونام شونے چھی" ان کے مجموعے کا نام ہے۔

ہمارے ادب میں مزاح نگاری کا ایک اہم مقام ہے کوی جسیم الدین کی کتاب "بنگالیر ہاشیر گولپو" جو پچھلے سال

شائع ہوئی ہے، مزاحیہ ادب کے سرمائے میں ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

مشرقی پاکستان کے مشہور موسیقار عباس الدین کے یوم وفات کے موقعے پر ان کے گائے ہوئے گیتوں کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے جس کا نام "عباس الدین کے گائے ہوئے گیت" ہے۔

پچھلے سال ہم بچوں کے ادب سے بھی غافل نہیں رہے۔ بنگالی اکاڈمی نے ہمارے نوعمر پڑھنے والوں کے لئے "جھنجھنی" اور "عجب دیشے ٹام کنس" دو دلچسپ کتابیں شائع کی ہیں! آخر الذکر کتاب کو فردوس خاں نے انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ فرینک لین پبلکیشنز نے بھی اس سلسلے میں شاہ فضل الرحمٰن، ظہور الحق اور عبداللہ المطیع کی "نانے کالو جیب جنیتو" "چھبو کیر کو تھا" "مدھا کرشن" "مانی" "پوکا ماکوڑیر کوتھا" "آلو وشو ریر سے کولیر موتو" شائع ہوئی ہیں۔ یہ سب کتابیں انگریزی سے بنگالی میں منتقل کی گئی ہیں۔ ابراہیم خاں صاحب نے "ایتی ہاشیر آگیر مانوش" کا ترجمہ بنگالی میں کیا ہے۔ اسی طرح "پاکھیر راجے" اور "وانوب ماچھیر عجب کوتھا" کے مترجم اکبر الدین اور عسکر ابن شیخ ہیں۔ "موٹر گاڑیر گوڑار کوتھا" اور "ریل گاڑیر گوڑار کوتھا" کو پروجیش کمار رائے نے بنگالی کا جامہ پہنایا ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ انورہ خاتون کی "سلائی سیکھا" نور الحق کی "بانو ریر راجے" "حبیب الرحمٰن کی "پھولیر کو تھا" اور رئیس الدین احمد کی "مور و بھومیر کوتھا" بچوں کے ادب میں خاطر خواہ اضافہ ہیں۔

پچھلے سال چند نئے ادبی رسالوں کا بھی اجرا ہوا ہے، جن میں رائٹرز گلڈ اور اسلامی اکاڈمی کے ماہنامے اور ابوالحسن کی ادارت میں شائع ہونے والے سہ ماہی سنگلاپ نے کافی مقبولیت حاصل کر لی ہے۔ "روپ شا" نامی ایک اور ادبی رسالہ بھی ماہ بہ ماہ نکل رہا ہے۔ خواتین کے لئے ایک پندرہ روزہ کا بھی اجرا ہوا ہے۔ اسی طرح "مدنگن" نامی ایک اور ثقافتی ماہنامہ بھی پابندی کے ساتھ شائع ہوا ہے۔

پچھلے سال شائع ہونے والی کتابوں کی فہرست کو دیکھ کر ہمیں خوشی ہوتی ہے۔ خوشی صرف اس لئے نہیں کہ صنفِ ادب پر کتابیں چھپ رہی ہیں۔ اشاعت وطباعت کی صنعت دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ ان کتابوں میں ہمیں جیتی جاگتی تصویریں نظر آ رہی ہیں، مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک بات بڑی حد تک تشویشناک بھی ہے اور وہ یہ کہ ہمارے یہاں کچھ پبلشر ایسے ہیں جو مغربی بنگال کے مصنفوں کی کتابیں بے دھڑک شائع کر رہے ہیں۔ بازار میں ان کتابوں کی مانگ بھی ہے، اس سے مشرقی پاکستان کے ادیبوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اس قسم کی دھاندلی کو روکنے کے لئے سخت مدافعتی اقدام کی ضرورت ہے۔

قدرت اللہ شہاب کو صدمہ

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب کی والدہ یکم مارچ ۱۹۶۲ء کی شب عارضۂ قلب سے اچانک انتقال کر گئیں، ادارہ ہم قلم ان کے غم میں شریک ہے۔

خدا مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

صوفی تبسم

پنجابی ادب کا ایک سال

صدہا سال سے پنجابی ادب کا دائرہ رزمیہ، عشقیہ اور متصوفانہ شاعری تک محدود رہا ہے۔ جہاں تک ہمیں علم ہے اس کی تاریخ اس ملک میں اسلام کی آمد کے وقت سے شروع ہوتی ہے اس نئی سرزمین پر اپنی تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لئے بہت سے صوفی اور درویش مسلم فاتحین کے ساتھ یہاں آئے تھے۔

یہ خاموش کارکن جو عربی اور فارسی زبانوں کے زبردست عالم تھے اور اپنے حلقۂ عمل میں کہیں بہتر اور اعلیٰ خدمات انجام دینے کے بہت زیادہ اہل بھی تھے لیکن انھوں نے مقامی آبادی کو خطاب کرنے کی غرض سے پنجابی شاعر بننا پسند کیا اور غالباً ان کا یہ اقدام دانشمندانہ تھا۔ ان کی متصوفانہ شاعری نے مقامی لوگوں سے قریبی رابطہ پیدا کر دیا۔ حالانکہ ان میں سے بہت سے محض نظم گو تھے لیکن وہ اپنے مقدس مقصد میں کامیاب ہوئے اس کے ساتھ ساتھ پنجابی شاعری کو مقبول بنانے میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے اور اس کی آئندہ کی ترقی کے لئے انھوں نے ٹھوس اور صحیح روایات قائم کیں۔

اُن کی مساعی کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجابی زبان کو فارسی شاعری کی بعض ادبی روایات اور عربی رسم الخط ورثے میں ملا۔ جو اس ملک میں مسلم ادبیات کا اس وقت تک ایک طرۂ امتیاز رہا ہے جب تک سکھوں نے گورمکھی رسم الخط جاری نہیں کیا جو در اصل دیوناگری کی ایک بھونڈی شکل ہے۔

فارسی کی ادبی روایات کے نتیجہ میں ہمارے چوٹی کے بعض شاعروں نے ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال، سسی پنوں اور مرزا صاحباں جیسی طویل عشقیہ نظمیں لکھیں۔ متعدد ادیبوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے اور دوسروں سے ریس کرنے کے لئے طویل نظمیں لکھیں جیسا کہ نظامی اور اس کے نقالوں کی فارسی میں ہوا۔

تقریباً دو سو سال کے زمانے یعنی ۱۷ویں اور ۱۸ویں صدی کو پنجابی ادب کا زریں دور کہا جا سکتا ہے ہمیں اس عہد میں شاہ حسین بلھے شاہ، علی حیدر، ہاشمی، وارث شاہ اور فضل شاہ جیسے شاعر ملتے ہیں یہ دور پنجابی کے کلاسیکی ادب کا ایک خاکہ فراہم کرتا ہے جو بعد میں آنے والے شعراء کے لئے ایک مثالی نمونے کی حیثیت رکھتا ہے ایک عرصہ تک ان روایات میں کوئی نمایاں تبدیلی نظر نہیں آتی۔ اور پنجابی ادب صرف شاعری کے دائرے میں محدود ہو رہا۔ اس دور میں پنجابی نثر تقریباً ناپید تھی، بیسویں صدی کے آغاز میں بعض تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ پنجابی ادب کی ترقی اس وجہ سے رُکی رہی کہ کسی قابل ذکر ادیب نے گزشتہ زمانے کے علاوہ پنجابی میں لکھنے کی مطلق پروا نہیں کی۔

موجودہ صدی کے نصف اول میں بالعموم سکھ اسکالر اور بعض ہندو ادیبوں نے پنجابی زبان کی وکالت کی۔ انھوں نے پنجابی رسائل نکالے اور اس میں کتابیں تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے نصاب میں اسے شامل کر کے اس کا درجہ بلند کیا۔

پنجابی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ بات تھی کہ ہر ادیب اسے کمتر سمجھتا تھا اور اردو یا فارسی کو ذریعۂ اظہار و ابلاغ بناتا تھا۔ آزادی کے بعد پاکستانیوں میں ہر سطح پر خود شناسی پیدا

ہو لاؤ پنجابی ادیبوں کو جنہوں نے ابتک فارسی ادب کے بعض اسالیب کی محض نقالی کی تھی، پرانی روایات کی روح اور ادبی سرمایہ چھوڑے ہیں نو اور اسے نئے شعور اور جدید تجربات سے مزین کیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ ماضی میں پنجابی نثر کو ہمیشہ نظر انداز کیا گیا اس لئے ابھی وہ عہد طفولیت میں ہے۔ بہرحال گزشتہ سال جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں مختصر افسانے، تنقیدی مقالات، ناولیں، ڈرامے اور نئے رجحانات کی عکاسی کرنے والی نظمیں شامل ہیں۔ قدیم پنجابی کلاسکی کتابیں جو یا تو نایاب تھیں یا ابتک نہایت بھونڈے طریقے سے طبع کی گئی تھیں۔ اب ان کی صحیح طریقہ پر تدوین و طباعت ہو رہی ہے۔ یہ ایک صحتمند علامت ہے۔

ریڈیو سے نشر ہونے والے پنجابی پروگرام کی مقبولیت بذات خود ایک حوصلہ افزا بات ہے پنجابی نظمیں تیزی سے ترقی کر رہی ہیں اور وہ قدیم عوامی گیتوں اور شاعری کا احیا کر رہی ہے عوامی موسیقی اور اس کی دھنیں روز بروز مقبولیت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ یہاں یہ بتا نا بے جا نہ ہوگا کہ پنجابی ادیبوں میں اکثریت بنیادی طور پر اُردو ادیبوں کی ہے۔

قطری سطح پر زیادہ سے زیادہ یکسانیت پیدا کرنے کیلئے جو ایک تاریخی عمل ہے یہ ضروری ہے کہ مقامی ثقافتوں کے تنوع کو نہ صرف برقرار رکھا جائے بلکہ انھیں پھلنے پھولنے میں مدد بھی دی جائے۔

پنجابی میں دلچسپی لینے کی موجودہ رو ایک صحتمند علامت ہے جسے منفی یا علحدگی پسند رجحان ہرگز نہ سمجھنا چاہیئے۔

احمد فراز

پشتو ادب کا گزشتہ سال

پشتو ادب کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ ابتدائی مدارج سے ہی اسے احتساب کا شکار ہونا پڑا دنیا کا شائد ہی کوئی ایسا ادب ہو جسے صدیوں میں چند لمحے بھی آزادی سے سانس لینا نصیب نہ ہوا ہو چنانچہ پچھلی تین چار صدیوں میں یعنی اکبر کے دین الہٰی کے دور سے لے کر قیام پاکستان تک سابق صوبہ سرحد کا ادب اور ادیب دار و گیر کا شکار رہا۔

یوں تو پشتو کا پہلا معلوم شاعر امیر کروڑ ۱۳۹ھ ہجری میں یعنی آج سے قریباً ۱۲ صدی پہلے گزرا ہے لیکن نثری ادب کی باقاعدہ کوئی دستاویز نہ ملنے کی وجہ سے اس کی قدامت کا تعین نہیں ہو سکا تھا۔ ابتدائی نثر کا ایک رسالہ خیرالبیان کا ذکر مختلف تذکروں میں ملتا ضرور تھا مگر اس رسالے کا مسودہ حال ہی میں جرمنی کے ایک کتب خانے سے مولانا عبدالقادر صاحب کو دستیاب ہوا اور اب پشتو اکیڈمی اسے نئے پیرائے سے مرتب کر کے عنقریب شائع کر رہی ہے۔ یہ رسالہ اکبر کے زمانے میں پیر روخان (پیر روشن) نے چار زبانوں یعنی پشتو عربی فارسی اور ہندوستانی[1] میں لکھا تھا، اور اس میں اکبر کے دین الہٰی کو اسلامی عقائد کی رو سے باطل اور کفر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

جہاں تک تاریخی شواہد کا تعلق ہے پشتو ادب پر احتساب کا پہلا وار اسی زمانے میں ہوا چنانچہ سابق صوبہ سرحد کے ایک اور بزرگ اخون درویزہ نے جو پیر روخان کے ہمعصر اور مد مقابل تھے اور بعض محققین کے قول کے مطابق وہ مغلیہ سلطنت کے طرفداروں میں سے تھے پیر روخان کی خاصی مخالفت کی ان کا کہنا تھا کہ پیر روخان دراصل پیر تاریک ہیں ان کے عقائد گمراہ کن اور پشتونوں کے بنیادی تصورات کے منافی ہیں بعد میں پیر روخان کی لاش کو قبر سے نکال کر جلا یا گیا اور حکم تھا کہ اس کتاب کے ہر نسخے کو جلا دیا جائے اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ سات پشتوں تک کافر رہے گا۔

اسی طرح بعد میں خوشحال خان خٹک اور اورنگ زیب کی چپقلش نے پشتو ادب پر خاصی مصیبتیں نازل کیں اور یہ سلسلہ انگریزوں کے عہد حکومت تک برقرار رہا۔ انگریز اگرچہ پورے ہندوستان پر قابض ہو چکے تھے مگر قیام پاکستان تک سابق صوبہ سرحد کا علاقہ ان کے لئے لوہے کا چنا بنا رہا چنانچہ انھوں نے جہاں سیاسی اعتبار سے پشتونوں کو اپنے ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا وہاں ادبی لسانی اور تمدنی اعتبار سے بھی ان کو بڑھنے سے روکے رکھا۔ ایک تو خود پشتونوں کو بیرونی حکمرانوں سے نفرت رہی اور وہ ان کی ہر ایک کی

---

[1] (ہندوستانی سے مراد اُردو ہے، اور اس تحریر سے اُردو نثر کی قدامت کے متعلق معلومات کا نیا باب کھلتا ہے)

رعایت اور اصلاح کو حقارت کی نظروں سے دیکھتے رہے دوسرا انگریز اس قوم کو علمی اور ثقافتی اعتبار سے پس ماندہ رکھنے ہی کو مصلحت سمجھتے رہے نتیجہ یہ ہوا کہ پشتو ادب چند حجروں پہاڑیوں اور گھاٹیوں تک محدود رہا۔ قیام پاکستان تک پشتو سکولوں کے ابتدائی درجوں میں بھی نہیں پڑھائی جاتی تھی چنانچہ جن پشتون ادیبوں نے اس زبان میں لکھنا پڑھنا سیکھا ان کی درسگاہیں صرف مسجد میں تھیں۔

قیام پاکستان کے بعد جہاں دوسری علاقائی زبانوں پر توجہ دی گئی وہاں پشتو زبان و ادب کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا سکولوں اور کالجوں میں پشتو زبان ادب پڑھایا جانے لگا بلکہ گزشتہ برس سے پشتو ایم اے کی کلاسیں بھی شروع کر دی گئی ہیں۔ اس طرح ریڈیو پشاور نے نہ صرف پشتو لوک گیتوں اور کہانیوں کو مقبول عام کیا بلکہ نئے ڈرامے، افسانے اور گیت بھی لکھوائے اور نشر کئے اور اس سے اس زبان سے دلچسپی رکھنے والوں کی نہ صرف تسکین طبع کے اسباب فراہم کئے بلکہ انھیں نئی چیزیں لکھنے پر اکسایا۔ ریڈیائی ادب نے جہاں سمندر خان سمندر اور امیر حمزہ شنواری جیسے کہنہ مشق اساتذہ کی خدمات حاصل کیں وہاں نوخیز ادیبوں کی حوصلہ افزائی میں بھی خاصہ حصہ لیا البتہ یہ ادب ایک خاص ڈھب اور خاص ضرورتوں کا آئینہ دار رہا۔

لیکن پشتو ادب کی بدقسمتی آزادی کے بعد بھی پوری طرح ختم نہ ہو سکی کیونکہ افغانستان۔ پاکستان کے تعلقات روز بروز ناخوشگوار ہو رہے تھے اور ان تعلقات نے پشتو ادب پر بھی ایسے ہی اثرات ڈالے۔ حکومت افغانستان نے سیاسی اغراض کے لئے بعض پاکستانی پشتون ادیبوں کو خریدنے کی کوشش کی اور ان کو ایسا ادب پیدا کرنے پر اکسایا جسے کسی بھی آزاد مملکت میں برداشت نہیں کیا جا سکتا تھا یعنی یہ ادب بلاواسطہ اور بعض اوقات بالواسطہ پاکستان کی سالمیت کے منافی محرکات کا حامل تھا۔ کچھ ادیب نادانی میں ایسے ادب کی زد کے شکار ہو گئے اور بعض کو محض شک و شبے کی نذر ہونا پڑا اس طرح ہمیں کئی اچھے ادیبوں سے جو معیاری ادب پیش کرنے کی صلاحیتیں رکھتے تھے محروم ہونا پڑا اور اس طرح ادب کی رفتار میں وہ ہموار بہاؤ پیدا نہ ہو سکا جس کی اُمید یا تمنا آزادی کے بعد کی جا سکتی تھی۔

ان تمام دشواریوں کے باوجود پشتو ادب اپنی تمدنی فضا اور ماحول کی طرح سخت جان ثابت ہوا اور قیام پاکستان سے احتساب کا جو بڑا بند ٹوٹا تھا اس سے اس نے کافی فائدہ اٹھایا اور مختصر سے عرصے میں اتنا کچھ لکھا گیا اور اتنا اچھا لکھا گیا کہ حیرت ہوتی ہے۔

جہاں اس مسلسل احتساب اور گیر و دار نے پشتو ادب کو پھلنے پھولنے سے روکے رکھا وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس ادب نے اپنے لسانی اور تمدنی سرمایے کو گلے سے لگائے رکھا اور وہ انفرادیت جو کسی بھی ادب کی عظمت کی ضامن ہو سکتی ہے موجود رہی۔ چنانچہ اب جبکہ بعض پشتو ادیبوں کو انگریزی فارسی اور عربی زبان کے ساتھ ساتھ اردو، بنگالی سندھی اور پنجابی ادب کے مطالعے کا موقع ملا تو انھوں نے موضوع ہیئت اور خیال کے نئے نئے نقش و نگار پیش کئے اور وہ بھی اس طرح کہ ان کی علاقائی انفرادیت دھندلانے کی بجائے اس پر زیادہ صیقل نظر آتی ہے۔ یہی انفرادیت پشتو ادب کا نمایاں جوہر اور مزاج ہے اور یہی اسے اردو ادب کی طرح تعطل اور جمود کا شکار ہونے کی بجائے نئی توانائی اور حرکت عطا کر رہی ہے۔

پھر یہ احساس بھی پشتون ادیبوں کے لئے تازیانے کا کام کر رہا ہے کہ نہ صرف ان کی زبان اپنی قدامت کے اعتبار سے دنیا کی کئی دوسری زبانوں سے آگے ہے بلکہ اس زبان میں اظہار و ابلاغ کی صلاحیتیں بھی کہیں زیادہ ہیں۔

چنانچہ وہ زبان جو آج سے چند برس پیشتر تک محض لوک گیتوں منظوم کہانیوں اور چند صوفی شعراء کے کلام تک محدود تھی اب اس کی جلو میں ایک طرف تو قدیم پوشیدہ خزانے بے نقاب ہو کر جمع ہو رہے تھے اور دوسری طرف جدید اور ترقی پسند ادب

کے موتی بکھر گئے تھے۔ اور تو اور خود پشتونوں کو اپنے عظیم ادبی ورثے کا اس وقت تک علم نہیں تھا جب تک مشہور مغربی مستشرق میجر ریورٹی نے خوشحال خان خٹک کے کلام کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا تھا یا پھر علامہ اقبال نے اسی انگریزی ترجمے کے مطالعے کے بعد اردو زبان سے اس عظیم شاعر کا تعارف نہیں کرایا تھا۔

یوں تو قیام پاکستان کے بعد پشتو ادیبوں نے نہایت تیزی بے باکی گرفتاری سے ادب کی تقریباً ہر قدیم و جدید اور سنگلاخ و شگفتہ صنف سخن (نظم و نثر) میں قلم آزمائی کی اور اس مختصر سے عرصے میں بہت کچھ لکھا لیکن اس وقت صرف گزشتہ برس کی پشتو نگارشات کا سرسری سا جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

شاعری۔ گزشتہ سال میں غزلوں نظموں کے بے شمار مجموعے شائع ہوئے جن میں دسپرلے نغمہ (نغمۂ بہار) امیر رحمٰن غازی کی قومی نظموں کا مجموعہ ہے دزڑہ وحوئیے (غنچۂ دل) رب نواز اورگ زئی کی رومانی اور قومی نظموں کا مجموعہ ہے نوی ژوند (نئی زندگی) فضل غنی مجاہد کی رومانی نظموں کا مجموعہ ہے زڑہ سے لوگے (غبار خاطر) محمد الدین مقید کا دیوان ہے ولولے پیر گوہر کی نظموں کا مجموعہ ہے ان نظموں کا انداز زیادہ تر روایتی ہے گل عبدالرازق حکمت مرحوم دیوان اور راحت اللہ راحت زاخیلی کی سیاسی اور رومانی نظموں کا مجموعہ داغونہ (داغ) کے نام سے شائع ہوا ہے۔

ان مجموعوں کے علاوہ پشتو کے جرائد۔ روزناموں اور ریڈیو پشاور سے کئی اچھی غزلیں اور نظمیں شائع اور نشر ہوئیں۔

پشتو غزل میں بھی تھوڑی بہت فارسی غزل کی روایت ضرور موجود ہے مگر اس عروس ہزار داماد کو سنگلاخ زمین کی آب ہوا خاصی راس آئی۔ یہاں کے غزل گو شاعروں نے اس صنف سخن میں بھی اپنی مقامی انفرادیت اور اپنے ماحول کا مزاج برقرار رکھا اس اجتماعی انفرادیت کے ساتھ ساتھ اکثر غزل گو نوجوانوں کی غزل میں اپنے اپنے انداز کی انفرادیت بھی قائم ہے اس سلسلے کے رہنما سید رسول رسا اجمل خٹک مفتون فضل حق شیدا۔ سیف الرحمٰن سلیم۔ قلندر مومند ایاز۔ یوسف اور مراد شنواری ہیں مراد کی ایک تازہ غزل کے شعر کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے غزل کا شعر ہونے کے باوجود اس میں پیٹے کی پیچ و خم موجود ہے جو اپنے ماحول سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

"اپنے چہرے کی بہار آنچل میں سمیٹ کر پھر کب آؤ گی۔ تمہارے انتظار میں میرے شملے کے پھول مرجھا گئے ہیں"

مفتون جو ہر روایت سے باغی ہے اپنے ایک شعر میں کہتا ہے۔

"جب تو اپنے کو جبار اور قہار سمجھتا ہے تو پھر مجھ سے کیوں کہتا ہے کہ یہ کر اور وہ نہ کر"

اسی کا دوسرا شعر ہے۔ "اے خدا تیری دنیا میں یا تو کم ظرف اور یا بے وقوف آرام سے ہیں۔ مجھ جیسے کے لئے آنسوؤں اور صدموں کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں"

سیف الرحمٰن سلیم کی غزل کے ایک شعر سے اس کی ذہنی نہج کا پتہ چلتا ہے۔ کہتا ہے۔

تاکہ تجھ پر شہنشاہ کا انصاف ظاہر ہو جائے اس لئے میں نے اپنا جھونپڑا تاج محل کے سامنے بنا دیا ہے اسی طرح نظم میں بھی نوجوان پشتو شعرا نے موضوعات کے تنوع اور ہیئتی تجربوں کے ساتھ ساتھ اپنی علاقائی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے اور اس اعتبار سے گزشتہ برس میں بھی بے شمار اچھی نظمیں دیکھنے میں آئیں۔ نئی نظم میں غنی خان۔ رسول رسا اجمل خٹک۔ عبداللہ جان مغموم قلندر مومند۔ راہی۔ دہقان۔ وہبی۔ یونس خلیل ولی اللہ داؤد زئی اور مراد شنواری کی نظم جو دا چھی نظمیں ہیں: مراد کی نظم جو دے کے ایک بند کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔

میرا ذہن اُجڑے اُجڑے خیالوں کا مدفن ہے ۔
جس میں لاشیں اور انسانی پنجر ناچ رہے ہیں
یہاں زندگی کی آنچ سرد اور پتھر کے کتبے یخ بستہ ہیں
قبریں گونگی زبانوں سے خاموشی کے گیت گا رہی ہیں
سوئے سوئے ماحول پر کابوس کا عالم طاری ہے
یہاں زندگی بیداری میں بھی موت کے خواب دیکھتی ہے

نثری ادب میں افسانے ناول رپورتاژ سوانح تذکرے ڈرامے اور تنقیدی و تحقیقی مضامین بھی خاصے لکھے گئے ہیں افسانوں میں امیر محمد ساغرؔ آفریدی کا افسانہ تربور نہ صرف پشتون معاشرے کی بہترین تصویر ہے بلکہ نہایت چابک دستی سے لکھا گیا ہے۔ امیر حمزہ کا ناول نوے پچھے شائع ضرور ہوا ہے لیکن میری نظر سے نہیں گزرا بہرحال امیر حمزہ شنواری نظم و نثر خوب لکھتے ہیں اور ہر چند ناول کا میدان ابھی تک پشتون راہواروں کے لئے دشوار گزار ہے پھر بھی کوئی کوئی سایہ اس میدان میں نظر آنے لگ گیا ہے پشتو ادب میں ناولوں کی ابھی کمی ہے رشید علی دہقان اور اشرف درّانی نے اچھے ناول لکھے ہیں مگر ابھی مقدار اور معیار کے اعتبار سے زیادہ درخور اعتنا نہیں ۔

تذکرہ و تاریخ کے سلسلے میں عبدالحلیم اثر کی دو کتابیں گزشتہ برس شائع ہوئی ہیں (۱) تذکرہ افغانی جس میں جمال الدین افغانی کی زندگی کے حالات تاریخی اور سیاسی پس منظر کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں اور "پختو ادب" جس میں پشتو ادب کا بھرپور جائزہ اور امہات سخن پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ کتابوں کے علاوہ کئی تاریخی و تحقیقی مضامین پشتو جریدوں میں شائع ہوئے جن میں سے اکثر مضامین عبدالحلیم اثر صاحب کے ہیں اور انھوں نے خاصی محنت سے لکھے ہیں ۔

ڈرامہ ۔ پچھلے برس بھی زیادہ تر ریڈیائی ڈرامے لکھے گئے اور حق یہ ہے کہ ریڈیو سے اچھے اچھے ڈرامے نشر ہوئے پھر بھی محدود موضوعات کی وجہ سے اس صنف میں ابھی پوری جولانی نظر نہیں آتی ۔ اسی طرح دو ایک سٹیج ڈرامے بھی لکھے گئے جس میں میجر ایس ایم رحمان کا ڈرامہ "دروالو" "آگ اور پانی" قابل تعریف کاوش ہے اباسین آرٹ سوسائٹی کی طرف سے مصنف کو اس تصنیف پر انعام بھی دیا گیا ۔

ان نگارشات کے علاوہ پشتو اکیڈیمی نے پشتو ادب و زبان کی ترویج کے لئے قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اور گزشتہ برس بیس بائیس کے لگ بھگ معیاری کتابیں شائع کی ہیں چونکہ اس ادارے کی بنیادی ذمہ داریوں میں پشتون تمدن زبان اور ادب کو صحت مندانہ انداز سے ترقی دینا ہے اس لئے اس کی زیادہ تر توجہ ٹھوس اور جامع قسم کی تصنیفات پر مرکوز ہیں۔ پشتو اکیڈیمی نہ صرف پشتو کی ایک نہایت جامع لغت تیار کر رہی ہے بلکہ ضرب الامثال کا بکھرا ہوا خزانہ جمع کرنے میں بھی کوشاں ہے اور اور اب تک تقریباً بیس ہزار پشتو ضرب الامثال اکٹھی ہو چکی ہیں اس کے علاوہ اس ادارے نے کئی گمنام و قدیم پشتون شعرا کے دواوین جمع کئے اور انھیں از سر نو ترتیب دے کر تنقیدی حاشیوں اور معلوماتی تعارف ناموں کے ساتھ شائع کیا ہے ۔

اس کے علاوہ پشتو اکیڈیمی نے گزشتہ برس بھی اردو اور دوسری زبانوں کے کلاسیکی شاہپاروں کو پشتو میں منتقل کیا اور اسی طرح پشتو کے معیاری فن پاروں کو اردو میں ترجمہ کرکے شائع کیا۔ ان میں سعدی کی "گلستان"، اقبال کی زبور عجم بانگ درا پیام مشرق کو پشتو میں منتقل کر دیا گیا ہے۔ جو نہ صرف علمی بلکہ ادبی اعتبار سے بھی قابل قدر کوششیں ہیں۔ آخر میں ان پشتون ادیبوں

شیخ ایاز

سنہ ۱۹۶۱ء کا سندھی ادب

گزشتہ سال گلڈ کی سالگرہ کے موقعہ پر ایسی ہی ایک تقریب میں سنہ ۱۹۶۰ء کے سندھی ادب کا جائزہ پیش کرتے ہوئے میں نے کچھ نئے تجربوں اور نئے ذہنی محرکات کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ سنہ ۱۹۶۰ء کے سندھی ادب کا سب سے زیادہ جاذب نظر اور جاندار پہلو یہ ہے کہ ہم نے اسے افسانوی اور شعری ادب میں ان اقدار کو نسبتاً بہتر طور پر برتا ہے جو ہماری اپنی عہد آفریں ثقافت سے گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ کچھ ایسا ہی اندازہ میں نے سنہ ۱۹۶۱ء کے سندھی ادب کا جائزہ لیتے ہوئے کیا ہے۔

شعری ادب میں اب ہمارے یہاں بیت، کافی، دوہے اور گیت لکھنے کا رواج پہلے سے زیادہ ہو رہا ہے۔ ان تمام اصناف سخن کے جو نمونے سنہ ۱۹۶۱ء کی شاعری میں نظر آئے ان میں سے بیشتر میں مقامی رنگ آمیزی اور لب و لہجے کے کس قدر نئے پن کے باوجود روائتی بازگشت زیادہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے کچھ اچھا لکھنے والے خاموش رہے ہیں اور نئے لکھنے والوں نے خوب خوب لکھا ہے لیکن نئے لکھنے والوں میں سے زیادہ تر لکھنے والوں کے یہاں وہ فنی پختگی اور فکری گہرائی پیدا نہ ہو سکی جس کے لئے صرف سندھی زبان و ادب کا جاننا ہی ضروری نہیں ہے بلکہ اس شعوری ارتقا کا ادراک بھی لازم ہے جس کی جھلک آج کے عالمی ادب میں نظر آتی ہے روائتی بازگشت اور تقلید کے باوجود نئے لکھنے والوں کی ان کوششوں کا ایک خوشگوار پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ ان اصناف شاعری میں جو زبان استعمال کی گئی ہے وہ واقعی عوامی زبان ہے اسے ہم خالص سندھی زبان کہہ سکتے ہیں کچھ نوجوان لکھنے والوں کے یہاں فکر و فن کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے جو واقعی امید افزا ہے۔

سنہ ۱۹۶۱ء کی سندھی شاعری میں نظموں کی خاصی تعداد ہے یہ نظمیں زیادہ تر مقفیٰ ہیں مقفیٰ شاعری میں کچھ ایسے نئے تجربے بھی کئے گئے ہیں جن کی مثال سنہ ۱۹۶۱ء سے پہلے کی شاعری میں ذرا کم ہی ملتی ہے یہ تجربے جدید سندھی شاعری کو نیا اسلوب عطا کرنے میں خاصے کامیاب رہے ہیں۔

آزاد نظمیں بہت ہی کم کہی گئی ہیں ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ سندھی ادب کے پڑھنے والے مقفیٰ شاعری ہی کو زیادہ شوق سے پڑھتے ہیں۔ ویسے سندھی شاعری میں آزاد نظمیں پچھلے پندرہ بیس سال سے مسلسل لکھی جا رہی ہیں لیکن سنہ ۱۹۶۱ء میں ان کا رواج کچھ کم رہا ہے

منظوم ڈرامے لکھنے کا رواج سندھی شاعری میں کچھ کم ہے لیکن پچھلے سال کی منظومات میں کئی منظوم ڈرامے

بھی شامل تھیں یہ ڈرامے سندھ کی قدیم تہذیبی زندگی کا عکس پیش کرتے ہیں اس لئے ان میں تمثیل نگاری کا ایک نیا شاعرانہ انداز بھی پیدا ہو گیا ہے اور ہماری شاعری میں منظوم ڈراموں کی جو کمی نظر آتی ہے اس کو دور کرنے کی کوشش بھی ظاہر ہونے لگی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس سال اس قسم کی کوشش کچھ اور اچھے نتائج برآمد کر سکے۔

سنہ ۶۰ء میں غزلیں کم کہی گئی تھیں لیکن سنہ ۶۱ء کی شاعری میں غزلوں کی تعداد زیادہ ہے یہ بات الگ ہے کہ ان غزلوں میں بہت کم غزلیں ایسی ہیں جو غزل کے نئے لب و لہجہ اور نئے مزاج سے ہم آہنگ ہوں ویسے بھی سندھی زبان غزلگوئی کے لئے اتنی موزوں نہیں جتنی گیتوں اور دوہوں کے لئے ہے۔

سنہ ۶۱ء کے افسانوی ادب میں زیادہ تر مختصر افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں میں اور ایسے افسانے بھی جو انگریزی اُردو اور ہندی وغیرہ سے ترجمے کی صورت میں پیش کئے گئے ہیں۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے سندھ کی دیہی یا شہری زندگی کی معاشرت کو اپنے افسانوں میں بڑے فنکارانہ انداز میں پیش کرتے ہوئے ہمیں کئی اچھے افسانے دیئے ہیں

طویل مختصر افسانوں، ناولٹ اور ناولوں کی تعداد افسانوی ادب میں بہت کم رہتی ہے۔ نہ جانے کیوں سندھی افسانہ نگار ناول نویسی کی طرف رجوع نہیں ہوتے حالانکہ بعض سندھی افسانہ نگاروں میں اچھے قسم کے ناول لکھنے کی بڑی اچھی صلاحیتیں موجود ہیں۔ پچھلے ایک سال میں کوئی قابل ذکر ناول شائع نہیں ہوا البتہ کچھ ناولٹ منظر عام پر آئے جو اس لحاظ سے غنیمت ہیں کہ ان سے بڑے ناول اور اسی قسم کے ناولٹ لکھنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ میں خود بھی پچھلے تین چار سال سے سندھی میں ایک ایسے ناول کی تخلیق میں مصروف ہوں جو فکر و فن کو نئے انداز میں پیش کر سکے۔

میں نے زندگی، ادب، کلچر اور اپنے ملک کی معاشرت پر مکتوبات کی شکل میں سندھی ادب کو ایک نئی صنف ادب سے روشناس کرایا ہے۔ یہ مکتوبات ایک ادیب کی ڈائری سمجھے جا سکتے ہیں جہاں ایک طرف زندگی اور فن کے متعلق میرے نظریات کو ظاہر کرتے ہیں وہاں دوسری طرف نثری ادب میں ایک نئے تجربے کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ میری یہ تحریریں کچھ تاثراتی قسم کی ہیں۔ جن میں منظر و پس منظر کو دل کی آنکھوں سے دیکھنے والی کیفیت ہے۔

سندھی ادب میں اب سے دو تین سال پہلے بعض اچھے قسم کے طنزیہ اور مزاحیہ مضمون لکھے گئے تھے لیکن اب وہ مضمون نگار جو اس طرح کے مضمون لکھتے رہے تھے اپنی معاشی مصروفیات میں شاید کچھ اتنے الجھے ہوئے ہیں کہ سنہ ۶۱ء کا سندھی ادب طنزیہ و مزاحیہ مضامین سے خالی رہا ہے۔ جدید سندھی ادب میں اس کمی کا پورا کرنا اشد ضروری ہے اور اس ضرورت کی طرف ہمارے ان سندھی اہل قلم کو رجوع ہونا چاہیئے جو اس قسم کے مضامین لکھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

سندھی ادب میں تنقیدی مضامین کی طرف بہت کم توجہ دی جا رہی ہے صرف دو ایک ادیب ہی ایسے ہیں جنھوں نے شعوری طور پر اپنی ادبی صلاحیتوں کو تنقید نگاری کی طرف راغب کیا ہے۔ سنہ ۶۱ء کی تحریروں میں جو تنقیدی مضامین میری نظر سے گزرے ان میں لکھنے والوں کے اپنے غور و فکر کا حصہ زیادہ نہیں کچھ مضامین دور حاضرہ کے اُردو اور انگریزی تنقید نگاروں کے مضمونوں کا ترجمہ کر کے لکھے گئے ہیں اور کچھ مضامین شاہ لطیف سچل سرمست اور سندھ کے دوسرے مشہور و معروف شاعروں کے کلام پر لکھے گئے ہیں جنہیں کچھ اُپج اور نیا تنقیدی شعور منظر آتا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے سندھی تنقید نگار سنجیدگی سے نئے ادبی رجحانات اور نئے سندھی ادب کا جائزہ لیں۔ مختلف قسم کی تخلیقات کو غور و فکر کی کسوٹی پر رکھیں اور اس طرح تخلیقی تنقید کا ایسا شعور پیدا کریں جو ہمارے اپنے ملک کے ادب اور ادبی میلانات کو نئی راہ سجھا سکے۔

تحقیقی مقالات سندھی میں عام طور پر زیادہ لکھے جاتے

رہے ہیں ۱۹۶۱ء کے ادب میں بھی ایسے کئی مقالات مل جاتے ہیں جن کو ادبی و علمی تحقیق کے خانے میں رکھا جا سکتا ہے۔ تحقیقی مقالات کی طرف ہمارے دیس کی اپنی تاریخ قدیم سے قدیم تر زمانوں کی ثقافتی اقدار کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہے ۔

ہماری ادبی و ثقافتی تاریخ کا یہ پہلو نہ صرف سندھی اہل قلم کے لئے پرکشش ہے بلکہ دور دراز ملکوں کے صاحب فکر و نظر بھی ادھر رجوع ہو رہے ہیں۔ تحقیقی مضامین میں کچھ مضمون ایسے بھی نظر آئے ہیں جو علم اللسانیات سے تعلق رکھتے ہیں یہ مضامین اُن پراکرتوں، کی بڑی دلچسپ اسٹڈی (   ) پیش کرتے ہیں جو برصغیر کی قدیم زبان سنسکرت سے نکلیں اور دور دراز علاقوں میں پھیل گئیں۔ سندھی زبان کا شجرہ بھی سنسکرت سے نکلی ہوئی کئی پراکرتوں کو اپنائے ہوئے ہے۔ جدید سندھی پر عربی، فارسی اور اُردو کے جو اثرات ملتے ہیں وہ قاضی قاضن، شاہ کریم اور شاہ لطیف کے زمانے کی سندھی میں برائے نام ہی نظر آتے ہیں۔

۱۹۶۱ء میں سندھی ادب کی جو قابل ذکر کتابیں شائع ہوئیں ان کتابوں میں غلام ربانی کا افسانوی مجموعہ "آبِ حیات" اور بردو سندھی کا شعری مجموعہ جو حال ہی میں "اکثریوں ھیکھ طھار" کے نام سے شائع ہوا۔ تخلیقی ادب میں قابل قدر اضافوں کا درجہ رکھتے ہیں۔

گزشتہ دنوں مرکزی گلڈ نے پریزنٹنگ پاکستان پوئٹری میں جہاں اُردو، بنگالی اور دیگر علاقائی زبانوں کے منظوم انگریزی ترجمے شامل کئے ہیں وہاں سندھی شاعری کی نمائندگی کے لئے پرانے اور نئے شاعروں کی کچھ منتخب نظموں کے منظوم ترجمے بھی شائع کئے ہیں جن سے انگریزی داں طبقے اور بیرونی ممالک کے ادبی حلقوں کو سندھی شاعری کے بنیادی مزاج کا تھوڑا بہت اندازہ ہو سکتا ہے۔

گلڈ کے ویسٹ پاکستان ریجن نے مغربی پاکستان کی علاقائی

زبانوں کی بہترین کتابوں اور بہترین ادبی تخلیقات پر جو ادبی انعامات رکھے ہیں ان میں سندھی ادب اور ادیبوں کا بھی حصہ ہے۔ سندھی ادب میں تخلیقی کام کرنے والے اہل قلم کی یہ حوصلہ افزائی یقیناً خوش آئند ثابت ہوگی اور ہمارے ادیب و شاعر جو اعلیٰ تخلیقی صلاحیتیں رکھنے کے باوجود ناقدرشناسی کا شکار ہوتے ہیں اب نسبتاً زیادہ تخلیقی لگن کے ساتھ سندھی ادب میں خوشگوار اضافے کر سکیں گے۔

بحیثیت مجموعی ۱۹۶۱ء کے سندھی ادب کے مختلف شعبوں میں جو کچھ پیش کیا گیا وہ اس لحاظ سے امید افزا ہے کہ ہمارے لکھنے والے اچھا یا برا لکھ ضرور رہے ہیں صرف کچھ ہی اہل قلم ایسے ہیں جو گزشتہ ایک دو سال سے وقتی خاموشی اختیار کئے ہوئے ہیں ہو سکتا ہے کہ سال رواں میں ایسے لکھنے والے جو اچانک خاموش ہو گئے تھے کسی نئی ذہنی رو کو آگے بڑھا سکیں اور ہمارے ادب کو اپنے اپنے معیار کے مطابق اچھی تخلیقات دے سکیں۔

نئے لکھنے والوں کی کوشش اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ وہ سندھی زبان و ادب کو وسعت دینے کے لئے بڑے جوش و خروش سے میدان عمل میں آئے ہیں ۔

سندھی ادب کے ایک سال کا یہ سرسری سا جائزہ جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا اس میں میں نے اپنے طور پر یہ کوشش کی ہے کہ ایک سال میں سندھی ادب نے جو کچھ اپنے فنکاروں سے ادبی تخلیقات کی صورت میں پایا ان تخلیقات کی روشنی میں ہر صنف ادب کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکوں۔ ضروری نہیں کہ ہر سال کے ادب میں صرف بہترین تخلیقی شاہکار ہی شامل ہوں تخلیق ادب کا معاملہ ویسے بھی کچھ کٹھن ہوتا ہے۔ ۱۹۶۱ء کا سندھی ادب ہر قسم کی ادبی تخلیقات کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ان تخلیقات میں کچھ تخلیقات ایسی بھی ہیں جن کو سندھی ادب میں گرانقدر اضافہ کہنا چاہیئے۔ میرا خیال ہے کہ سال رواں میں سندھی ادب کو زیادہ اچھے اور مثالی شاہکار ملیں گے کیونکہ ہمارے نئے اور ذہین لکھنے والے بڑے جوش و خروش سے تخلیق ادب کے میدان میں آگے بڑھ رہے ہیں ۔

نئی معیاری کتابیں

ادب اور شعور
ممتاز حسین

ادب اور تنقید پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں جتنا ادب اور تنقید کم اور غیر متعلق باتیں زیادہ ہیں لیکن ممتاز حسین بڑے باشعور نقاد ہیں انھوں نے تنقید کو تخلیق کا ہم پایہ کر دیا ہے۔ یہ انھی کے گرانقدر ادبیات و تنقیدات کا مجموعہ ہے۔ قیمت دس روپے

روح اور فلسفہ
سید محمد تقی

رُوح ہو یا فلسفہ، دونوں ہی دشوار گزار گھاٹیاں ہیں اور جب یہ دونوں ایک ہی جگہ جمع ہو جائیں تو بات اور زیادہ پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ سید محمد تقی نے ان دونوں کو جس طرح اس کتاب میں سمو دیا ہے یہ انھی کا کام تھا۔

قیمت آٹھ روپے

نئی قدریں
ڈاکٹر شوکت سبزواری

چودہ گرانقدر مقالات کا شاندار مجموعہ۔ ان تنقیدات میں قدیم اور جدید ادبی روایات کا بہترین امتزاج موجود ہے۔ ادب کی نئی اور پرانی اقدار پر سیر حاصل بحث اور تبصرہ۔

مقالات یوم شبلی
مرتبہ: خالد عبداللہ حسان

ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، خواجہ دل محمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی اور ڈاکٹر وزیر آغا وغیرہ نے مولانا شبلی اور ان کے فن کے مختلف پہلوؤں کا غائر مطالعہ کیا اور انھیں اپنے مضامین میں محفوظ کر دیا۔ مولانا شبلی اور ان کے کام پر ایک شاندار تحقیقی کارنامہ۔

قیمت:- ۱۰/۵۰ روپے ۵۰ پیسے

فصیل شب
میرزا ادیب

ڈرامہ نگار اپنے مطلب کے اظہار، کردار نگاری اور ماحول کی عکاسی میں افسانہ نگار اور ناول نویس کے مقابلے میں زیادہ پابند ہوتا ہے۔ میرزا ادیب نے اس مشکل صنف ادب کو اپنا کر اُردو ادب کو وہ کچھ دے دیا جسکی بابت ادب میں بڑی کمی تھی میرزا ادیب کے نو ڈراموں کا مجموعہ

قیمت: چار روپے

معیار ادب

ادب کیا ہے؟ اور ادبی معیار کسے کہتے ہیں؟ اس تنقیدی مجموعے میں اسی کا جواب دیا گیا ہے نظری اور عملی تنقید کا ایک بلند پایہ مجموعہ۔ ۲/۵۰

جام سرشار

رتن ناتھ سرشار کا سرمایۂ ادب 'فسانۂ آزاد' ہی تک محدود نہیں، انھوں نے اُردو ادب کو اس کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا ہے اور اس میں جام سرشار کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ سرشار سے متعلق چکبست کا معرکہ آرا مضمون اور ایک فرہنگ کے ساتھ

جذبات نادر
(ترتیب و مقدمہ ممتاز حسن)

نادر کاکوروی نے حالی اور آزاد کی انقلابی ادبی تحریک کو اپنی فکری اور شعری مساعی سے بڑی تقویت بخشی۔ انھوں نے انگریزی ادبیات عالیہ کے منظوم ترجمے اس مہارت اور روانی سے کئے کہ ان پر ترجمے کا گمان تک نہیں ہوتا لیکن نادر بھی زمانے کی عام ناقدری کے شکار ہو گئے۔ ممتاز حسن نے جذبات نادر کو ترتیب دے کر اپنے گراں قدر مقدمے سے انھیں حیات نو بخش دی۔ علامہ مور کی مشہور زمانہ مثنوی 'لالہ رخ' بھی اس مجموعے میں شامل ہے — قیمت دس روپے

اُردو اکیڈمی سندھ

۱۴ - بہادر شاہ مارکیٹ - بندر روڈ - کراچی

اُردو مرکز
گنپت روڈ - لاہور

کتاب ایجنسی
تلک چاڑی - حیدرآباد

ایوانِ ادب

(اکیڈمی آف لیٹرز)

گلڈ کی مرکزی عاملہ نے اپنے اجلاس ڈھاکہ (منعقدہ ۲۹ و ۳۰ جنوری ۱۹۶۲ء) میں جمیل الدین عالی کی تجویز منظور کرلی ہے۔ اب اسے گلڈ کی سفارشات کی شکل میں مرکزی حکومت کے حوالے کردیا گیا ہے۔ ان کی مکمل قرارداد کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

اس کمیٹی نے ایک قرارداد مورخہ ۲۴ جولائی ۱۹۵۹ء کے ذریعے ایک "ایوانِ ادب" قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن اس وقت کوئی منصوبہ نہیں بنایا گیا تھا شاید حکومت نے بھی اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا لیکن کوئی حتمی فیصلہ منظرِ عام پر نہیں آیا۔

گزشتہ سال راقم الحروف نے اپنے دورۂ یوروپ و امریکہ میں مختلف ادبی انجمنوں کے دساتیر اور طریقِ کار کا مطالعہ کیا (مشرقِ وسطیٰ کی انجمنوں کا مطالعہ پہلے کیا جاچکا ہے) اور بطورِ خاص مندرجہ ذیل انجمنوں سے استفادہ کیا۔

رائل سوسائٹی آف لٹریچر	،	لندن
امریکی اکادمی آف لیٹرز اینڈ آرٹس		نیویارک
سوویت انجمن ادبا	..	ماسکو
اکادمی فرانس	....	پیرس
برمی دار الترجمہ	...	رنگون

معلوم ہوا کہ مندرجۂ بالا ادارے سرکاری قوانین کے ذریعے معرضِ وجود میں آئے تاکہ وہ ٹھوس بنیادوں پر قائم ہوں انھیں پوزیشن حاصل ہو اور وہ سندِ قبولیت کے حامل ہوں۔

مختلف دساتیر پر غور وفکر کے بعد اپنے ملکی حالات و کوائف کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل اُصول پیش کئے جاتے ہیں اور اگر انھیں اس منتظمہ نے قبول کرلیا تو وہ حکومت کو سفارشات کی شکل میں بھیج دیئے جائیں گے۔

۱۔ یہ ایک بین اللسانی ادارہ ہوگا۔

۲۔ اس کی ایک فعال شاخ مشرقی پاکستان میں قائم ہوگی۔

۳۔ اکادمی کو مندرجہ ذیل مضامین کے معاملے میں ایک خصوصی اور مضبوط مشاورتی حیثیت حاصل ہوگی۔

(الف) زبانیں اور رسوم الخط

(ب) ایسے تحقیقی منصوبے جو خالص حکومت کے فنڈ سے قائم ہیں یا جو حکومت سے مالی امداد لینے والے اداروں

پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے گزشتہ
دس سال کے کارناموں نے قوم کو خود اختیاری اور نئے ولولے
کے ساتھ اقتصادی خوشحالی کی طرف گامزن کر دیا ہے۔
زیل پاک ۔ پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن
کے صنعتی اداروں کی وہ کڑی ہے جو
قومی بہبود کے منصوبوں کی بنیادوں کو
مضبوط بنا رہی ہے۔

مستقبل کیلئے زیل پاک سے تعمیرات کیجئے

اس دورِ ترقی
کا یادگار نشان



زیل پاک سیمنٹ فیکٹری لمیٹڈ ۔ حیدرآباد

مینیجنگ ایجنٹس
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

کے دائرہ عمل میں شامل ہیں۔

(ج) سرکاری ادبی اعزازات

(د) ادب سے متعلق سرکاری فیلوشپ، اعزازیے، وظائف۔

۵۔ اکادمی نامور ادیبوں اور ماہرین لسانیات کو اپنی رکنیت کے لئے از خود منتخب کرے گی (انھیں درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہوگی)۔ جملہ اراکین کی تعداد کبھی کسی صورت میں تناوے سے تجاوز نہیں کرے گی۔ ابتدائی انتخاب کے بعد حکومت کرے گی اراکین کا انتخاب خود اراکین کی ایک کمیٹی کیا کرے گی جو اس مقصد کے لئے اصول و ضوابط اپنے آپ بنائے گی جن پر پانچ سال بعد نظر ثانی کی جاسکے گی۔ اراکین اہل کاران اور ڈائرکٹروں وغیرہ سے الگ ایک جماعت ہوں گے۔

۶۔ اکادمی دوسری ادبی اور لسانی انجمنوں اور اداروں کے مقاصد، منصوبوں اور طریق کار میں مداخلت کی مجاز نہ ہوگی مگر اس پر فرض ہوگا کہ اگر کوئی ادارہ اس سے مشورہ یا مالی امداد طلب کرے تو وہ اس پر ہمدردانہ غور کرے بقدر ضرورت اس کی امداد کرے۔

۷۔ اکادمی کا کوئی صدر نہیں ہوگا کیونکہ ایسے اداروں میں صدارتی مناصب سب بزرگوں اور اکابر کی خوشنودی حاصل نہیں کرسکتے۔

۸۔ گلڈ کا سکریٹری جنرل اکادمی کی بنیادی اہلکار ہوگا اور گلڈ کو اکادمی کی انتظامیہ میں مناسب نمائندگی دی جائے گی۔

۹۔ گلڈ اپنے ادبی اعزازات، انعامات اور آدم جی ادبی انعام اکادمی کو مستقلاً تفویض کر دے گا۔

۱۰۔ مختلف موضوعات کے لئے جو مشاورتی کمیٹیاں ہوں گی وہ منتخب اور نامزد اراکین پر مشتمل ہوں گی اور اس مقصد کے لئے ضوابط بنائے جائیں گے۔

۱۱۔ اکادمی ایک خالص غیر سرکاری ادارہ ہوگی اس کا حکومت سے تعلق صرف یہ ہوگا کہ وہ اسے مالی امداد اور سند قبولیت دے۔ یہ اکادمی ملکی وظائف، امدادیں اور وظائف قبول کرنے کی مجاز ہوگی مگر کسی عنوان کسی غیر ملکی فرد حکومت یا ادارے سے مالی امداد قبول کرنے کی مجاز نہ ہوگی۔

۱۲۔ اس اکادمی کا رکن بربنائے رکنیت ایک خصوصی سماجی حیثیت کا حامل قرار پائے گا وہ تمام خصوصی تقریبات میں مدعو ہوگا اور پاکستان کی بیرونی ممالک میں (ثقافتی) نمائندگی کے سلسلے میں بطور خاص اس کی نیابت پر غور کیا جائے گا۔

۱۳۔ چالیس برس سے کم عمر کا کوئی شخص رکنیت کا اہل نہیں ہوگا گر آدم جی ادبی انعام یافتگان یا کوئی اور ایسا ہی بڑا ادبی اور علمی اعزاز پانے والے جو چالیس برس سے کم عمر کے ہوں رکنیت کے لئے زیر غور آسکیں گے یعنی ان کے لئے مندرجۂ بالا شرط عائد نہ ہوگی اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا کہ یہ انعام یافتگان لازمی رکن قرار پائیں گے۔

۱۴۔ حکومت سوائے تشخیص حسابات کے کسی اور عنوان اکادمی کے ضوابط، لائحہ عمل، طریق کار وغیرہ میں مداخلت نہیں کرے گی۔

۱۵۔ چند خصوصی تحقیقی منصوبے مثلاً لغات، قاموس، قدیم ادب کے انتخابات و تدوین خود اکادمی کے منصوبوں میں شامل ہوں گے اور جہاں یہ منصوبے شروع ہو چکے ہیں اکادمی متعلقہ انجمنوں کی معاونت کرے گی۔

۱۶۔ جیسا کہ انجمن ہائے امداد باہمی کے قوانین میں مذکور ہے اس اکادمی کے علمی اور انتظامی معاملات اور فیصلوں کے خلاف عدالتی کارروائی از روئے قانون ناجائز قرار دے دی جائے گی اور اکادمی کے خلاف ۔ کرنی حکومت سے اپیل کی

جائے گی۔

مزید سفارش کی جاتی ہے کہ سکریٹری جنرل کو اختیار دیا جائے کہ وہ حکومت سے ضروری مذاکرات کریں اور مندرجہ بالا نکات میں مناسب ترمیم و اضافہ کریں۔

حکومت سے درخواست کی جائے کہ وہ اس منصوبے پر جلد از جلد عمل کرے۔

توقع ہے کہ اپنے قیام کے بعد یہ اکادمی وقت کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت، اہمیت، افادیت اور روایات از خود پیدا کرے گی۔ یہ اپنے مستقبل کی خود ضامن ہوگی۔

اگر دوسری انجمنیں چاہیں تو اس اکادمی کی انتظامیہ میں اپنا اپنی نیابت کی خواہش ظاہر کر سکتی ہیں لیکن ابتدائی منزلوں میں گلڈ کو اس سے گہرے طور پر وابستہ رہنا ہوگا کیونکہ

(۱) دوسری انجمنوں اور گلڈ کے بیشتر اراکین مشترک ہیں۔
(۲) یہ خیال یہ منصوبہ گلڈ نے پیش کیا ہے اور اس پر کام کیا ہے۔
(۳) گلڈ ملک کا سب سے بڑا اور کثیر التعداد بین اللسانی نمائندہ ادارہ ہے۔

بقیہ

"پشتو ادب"

کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے جو پشتو اُردو دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں ان میں مولانا عبدالقادر، سید انوار الحق اور میر عبدالصمد کے نام سرفہرست ہیں گزشتہ برس انھوں نے کئی تحقیقی و تنقیدی مضامین لکھے جن میں پشتو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں سے اُردو داں طبقے کو متعارف کرایا گیا،

خصوصیت سے میر عبدالصمد کی انعام یافتہ کتاب "خوشحال و اقبال" نہ صرف موضوع کے اعتبار سے اچھوتی ہے بلکہ ملکی تمدن کی آئینہ داری کے ساتھ ساتھ ملک کے دو عظیم مفکروں کے بارے میں ایک اہم دستاویز ہے۔

آخر میں مجھے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پشتو ادب میں جس قدر توانائی وسعت اور زندگی فطری طور پر موجود ہے اگر اسے اس قدر وسائل بھی میسر ہوں تو چند ہی برسوں میں اس زبان کا ادب کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ خصوصیت سے پشتو اکیڈیمی رائٹرز گلڈ اور ابا سین آرٹ سوسائٹی جیسے سرپرست اداروں کا فروغ اور پشتو مجلوں کے اجرا سے اس کہستانی ادب کے نقش و نگار زیادہ بن سنور سکتے ہیں۔

گلڈ کے چھاپے خانے

ایگزیکٹو سیکریٹری کی رپورٹ سے اقتباس

یہ بات بدیہی ہے کہ گلڈ کے دفاتر کے اخراجات اور گلڈ کے پروگراموں کو بالخصوص (۱) ادیبوں کی سماجی بہبود اور (۲) پبلشنگ ہاؤس کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گلڈ کے موجودہ فنڈ ناکافی ہیں، مرکزی حکومت مبلغ ایک لاکھ روپیہ بطور امداد دیتی ہے صوبائی حکومتیں کوئی امدادی رقم نہیں دیتیں، اگر تمام اراکین سے ایک روپیہ ماہانہ فی رکن کے حساب سے رکنیت فیس وصول ہو تو مبلغ بارہ ہزار روپیہ سالانہ وصول ہوں گے۔

پبلشنگ ہاؤس نے ابھی چند ماہ پہلے کام شروع کیا ہے، اس کا ابتدائی سرمایہ ایک لاکھ روپیہ ہے، اندازہ کے مطابق اگر زیادہ سے زیادہ ۱۵ فیصد منافع حاصل ہو تو کل منافع ۱۵ ہزار روپیہ ہوگا، بشرطیکہ سرمایہ میں اضافہ نہ ہو، اگر سرمایہ کو بڑھایا جائے یعنی دوسرے سال کتابوں کی فروخت سے جو منافع حاصل ہوا سے اصل رقم میں شامل کیا جائے اور دوبارہ لگا دیا جائے تو آئندہ دو سال میں منافع بیس ہزار روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں ہوگا۔

ملتان گلڈ ہوٹل سے جو گذشتہ سال گلڈ کے انتظام میں لے لیا گیا ہے اندازاً پندرہ ہزار روپیہ سالانہ کی آمدنی ہوگی۔ فی الحال ہماری متوقع آمدنی حسب ذیل ہے:۔

مرکزی حکومت کی امدادی رقم :۔	ایک لاکھ روپیہ
پبلشنگ ہاؤس :۔	پندرہ ہزار ،
گلڈ ہوٹل :۔	پندرہ ہزار ،
فیس رکنیت	بارہ ہزار ،
کل آمدنی :۔	ایک لاکھ بیالیس ہزار

ہمارے دفاتر اور پروگراموں کے پیش نظر یہ رقم نہایت معمولی ہے یعنی یہ رقم درحقیقت ہماری بنیادی ضروریات کے ایک چوتھائی کے برابر بھی نہیں، گذشتہ سالوں کے دوران سرمائے کی قلت ہماری سماجی بہبود کی سرگرمیوں کی راہ میں بنیادی رکاوٹ بنی رہی ہے، حالانکہ ان حالات میں جتنا کام ہو چکا ہے وہ کسی دوسری تنظیم کی سرگرمیوں کے مقابلہ میں مثالی حیثیت کا مالک ہے، اس پر بھی ہم اس سے بالکل مطمئن نہیں۔

ہم نے اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھانے کے لئے مختلف طریقوں پر غور کیا، ثقافتی شو بھی زیر بحث آئے لیکن اس سے دوسرے اداروں کے مفادات سے ٹکراؤ ہونے کا امکان تھا، ادبی اجتماعات میں سے صرف مشاعرے کے ذریعہ کچھ آمدنی ہو سکتی تھی لیکن اولاً تو بنگال میں اردو مشاعروں کی روایات موجود نہیں ہے ثانیاً کاروباری قسم کے مشاعروں کی وجہ سے ہمیں اکثر و بیشتر شعراء کے انتخاب کے ناخوشگوار فرائض سے دوچار ہونا پڑتا جس سے تلخی ہے بعد میں اور چپقلشیں پیدا ہو جاتیں اس کے علاوہ مغربی پاکستان میں مشاعروں کا موسم سال کا صرف تین ماہ تک رہتا ہے مجموعی طور پر مشاعرہ مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں۔

گزشتہ سال ہمارے ایگزیکٹیو سکریٹری نے آکسفورڈ یونیورسٹی پریس اور کولمبیا یونیورسٹی پبلیکیشنز کا مطالعہ کیا تھا اور یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ علمی و ادبی مطبوعات کا کاروبار تجارتی خطوط پر چھاپے خانے چلا سکتے ہیں۔

متعلقہ عوامل کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اگر مغربی اور مشرقی پاکستان میں چھاپے خانے قائم کئے جائیں تو تقریباً ۸ ہزار روپے ماہوار کی قطعی آمدنی ہوگی جسے ہم اپنے پروگراموں بالخصوص اشاعتی منصوبہ پر خرچ کر سکتے ہیں، یہ واحد ممکنہ منصوبہ ہے جس کی مدد سے ہم خود کفیل بن سکتے ہیں۔

اس سلسلے میں حکومت سے بھی رجوع کیا گیا اور انہوں نے اس خیال کی تائید فرمائی اور امداد کا یقین بھی دلایا بشرطیکہ ہم موجودہ قوانین کے اندر صحیح منصوبہ بندی کریں۔ پریس کے متعلق ایک جامع منصوبہ تیار کیا گیا جو مرکزی مجلس عاملہ نے منظور کیا۔ اس منصوبہ کی پالیسی کے خاص خاص نکات درج کئے جا رہے ہیں نیز اس کی متوقع آمدنی کا اندازہ بھی درج ذیل ہے:-

۱۔ ہم مشینری، زمین اور کاروبار کی گارنٹی پر مشینری اور زمین کے لئے ۱۰ تا ۲۰ لاکھ روپیہ کی مالیت کا قرضہ لیں گے۔

۲۔ آئی سی اے وغیرہ جیسی ایجنسیوں سے زر مبادلہ کی دشواریوں سے دوچار ہوئے بغیر مطلوبہ مشینری متعلقہ ملکوں سے حاصل کرنے کے لئے مذاکرات کریں گے

کیوں کہ بہترین طریقہ کار یہ ہے کہ پاکستانی روپیہ کے بدلے میں مشینیں حاصل کی جائیں۔ بعض بیرونی اور دوستانہ ایجنسیوں کے توسط سے ایسا ممکن ہے۔ طویل المیعاد قرضے بھی ایک مزید امکان کی حیثیت رکھتے ہیں۔

۳۔ زمین کراچی، ڈھاکہ اور لاہور میں حاصل کی جائے گی، انہیں مقامات پر بڑے پیمانے پر کاروبار کیا جا سکتا ہے، لیکن ان جگہوں میں زمین حاصل کرنے میں دشواریاں ہیں، نیز یہاں زمین کی قیمتیں اور متعلقہ ساز و سامان کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں، با اثر اراکین اجتماعی اور انفرادی طور پر اس مقصد کے لئے سخت کوشش کریں گے۔

۴۔ چھاپے خانے کا انتظام و انصرام ٹھوس کاروباری بنیادوں پر ایسے افراد کے ذریعہ چلانا پڑے گا جو ضروری طور پر مجلس عاملہ سے ہوں کیونکہ بینک، حکومت، وہ سرمایہ فراہم کرنے والے ضرور اس بات کی ضمانت چاہیں گے کہ ان کی رقم سہولتیں اور فراہم کردہ اشیاء گلڈ کی داخلی سیاست کا شکار نہ ہوں۔

۵۔ صلاح و مشورے کی فیس، مذاکرات کے سلسلے میں ملاقاتوں اور عند الضرورت سفر وغیرہ اور دیگر غیر متوقع اخراجات پر کچھ رقم صرف کرنی ہوگی ایگزیکٹیو سکریٹری واحد شخص ہے جو اس منصوبے پر کام کر رہا ہے اور دوسرے کام بھی انجام دے رہا ہے۔

۶۔ جس وقت یہ منصوبہ شروع کیا جائے گا تو اس کے لئے ضروری عملہ درکار ہوگا، لیکن یہ ایک معمولی سا انتظامی مسئلہ ہے۔

۷۔ اس سلسلے میں مطلوبہ مشینری کی تفصیلات طے کرنے کے ابتدائی مراحل مکمل ہو چکے ہیں (گوشوارہ پیش کیا گیا) اور ماہرین سے مسلسل مشورے جاری ہیں۔

ہم اپنی چھ لاکھ روپیہ سالانہ کی متوقع آمدنی میں سے چند سال کے اندر بینکوں کا قرضہ ادا کر دیں گے، ہمارے خیال میں تقریباً پانچ چھ سال کے عرصہ میں اپنی تمام مالی ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائیں گے۔ یہ صورت حال حکومت اور گلڈ کے بوجھ کم کرنے میں مدد ہوگی۔

اراکین جو جنوری ۱۹۶۲ء کو ادارے میں شامل کئے گئے

(کراچی)

نام	پتہ	پیشہ	ادبی شعبہ
سید رضا کاظمی	نشاط شبنم الف/۱۱۱۔ ۲۰/۷ ناظم آباد کراچی ۱۸	ملازمت	افسانہ نگار، مضمون نگار
نجم فاضلی (یونس فاروقی)	آر۔ ۸/۹، ۹ دستگیر سی ایچ سوسائٹی۔ فیڈرل ایریا کراچی ۱۹	"	افسانہ نگار، ناول نگار
مشفق خواجہ	۷۱/۹/۱۰ سندھ مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی	صحافت	شاعر
اشتیاق حسین قریشی	زیبا منظر، شرافت آباد، شہید ملت روڈ۔ کراچی ۵	پروفیسر	ڈرامہ نگار۔ نقاد
خواجہ محمد امیر صبا اکبرآبادی	۲۸۷۔ فادر جمینیز روڈ۔ کراچی ۵	تجارت	شاعر، ناول نگار، مضمون نگار، نقاد
شکور احمد رضا اکبرآبادی	۲۸۷ فادر جمینیز روڈ، روبرو پرانی نمائش کراچی ۵	"	شاعر، ناول نگار، مضمون نگار
محمد الیاس	بی ۷/۳، پاک کالونی، منٹگمری روڈ کراچی ۱۶	"	افسانہ نگار، مضمون نگار، نقاد
محمد امین الدین	الف ۶/۱ فیڈرل کیپٹل ایریا، لالوکھیت کراچی ۱۹	ملازمت	افسانہ نگار، مضمون نگار
سحر انصاری	سی۔ ۴۸۔ پاپوش نگر۔ کراچی۔ ۱۸	مدرس	شاعر، مضمون نگار، نقاد
سیدہ رشیدہ مظفر حسین	۸/۱۷ پی اے۔ ایف اسٹیشن، کورنگی کریک کراچی ۲	امور خانہ داری	افسانہ نگار
سالک ہاشمی	۲/۱۰۷۷ فیڈرل بی۔ ایریا۔ کراچی	ایڈوکیٹ	شاعر، مضمون نگار، نقاد
شکیب جلالی	معرفت کاشانہ جاوید ۳۵/۱ بی۔ I لالوکھیت۔ کراچی	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار
افضل صدیقی	آر۔ بی ۵۷/۱۱ رتن تلاؤ، رام چندر ٹمپل روڈ کراچی		شاعر، ناول نگار، مضمون نگار، نقاد
مس سیدہ سلطانہ نکہت	۱۳۱، حیدرآباد کالونی جیل روڈ۔ کراچی ۵	طالب العلم	افسانہ نگار
ڈاکٹر محمد سلیم جیلانی	شعبۂ سماجیات۔ کراچی یونیورسٹی کراچی۔ ۳۲	مدرس	افسانہ نگار، مضمون نگار
مسز میمونہ کلثوم	معرفت ڈاکٹر ایم ایس جیلانی، شعبۂ سماجیات کراچی یونیورسٹی کراچی ۳۲	امور خانہ داری	افسانہ نگاری، نقاد

محمد عزیز الحق	حق منزل نیم نگر، دیناج پور (مشرقی پاکستان) موجودہ پتہ۔ الف ۱۸/۲ الف۔ سی۔ ایریا۔ کراچی۔ ۲۹	سرکاری ملازمت	افسانہ نگاری، ناول نگاری، مضمون نگار
محی الدین اشرف	۵/۴۴۵ لیاقت آباد۔ کراچی ۱۹	صحافت	شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار
مس وحیدہ نسیم	ای آئی۔ جہانگیر روڈ۔ کراچی	لکچرر	شاعر، افسانہ نگار
یزدانی ملک	سروسز کلب۔ وکٹوریہ روڈ۔ کراچی	تجارت	افسانہ نگار، ناول نگار
شاہ حسن عطا	۱۴۹ ای۔ جہانگیر ویسٹ۔ کراچی	سرکاری ملازمت	شاعر، مضمون نگار، نقاد
رضی اختر شوق	براڈکاسٹنگ ہاؤس۔ کراچی	ملازمت	شاعر
اختر خاتون ہمدانی (بیگم اے۔ آر۔ خلیل)	۱/۲۳ موتی لال نہرو روڈ۔ ہوائی کالونی۔ کراچی۔ ۵		افسانہ نگار، ناول نگار
نادرہ خاتون	بالائی منزل۔ آمنہ منزل فیض محمد فتح علی روڈ، سعیدہ حقانی چوک کراچی		افسانہ نگار، ناول نگار
مسرور جعفری	ایم پی ۲/۳۴ کندیو اسٹریٹ۔ کراچی	ملازمت	شاعر، مضمون نگار، نقاد
رفیع احمد صبا متھراوی	جی۔ ۲/۱۵۔ جیکب لائنز۔ کراچی	مدرس	شاعر، افسانہ نگار، نقاد اور مضمون نگار
ایس۔ فضل الرحمٰن جعفری	ایس۔ ۱/۱۳۸۔ سعود آباد۔ کراچی	صحافی اور ادیب	شاعر، مضمون نگار، نقاد
ایم۔ ایوب اولیاء	معرفت سلیم فاؤنڈری ورکشاپ۔ لارنس روڈ۔ کراچی	طالب علم	مضمون نگار، نقاد
عابدہ سیاست رضوی	۱۲۰، بلاک اے۔ سندھی مسلم ہاؤسنگ سوسائٹی۔ کراچی	مدرس	افسانہ نگار، مضمون نگار
[illegible] عالم	۲/۵۲ مسلم لیگ کوارٹرز، ناظم آباد کراچی	ملازمت	افسانہ نگار، مضمون نگار، نقاد

اراکین جو جنوری سنہ ۱۹۶۲ء کو ادارے میں شامل کئے گئے

(مشرقی پاکستان)

احمد حسینا	۱. ڈاک خانہ اور گاؤں ملارشہ۔ پولیس تھانہ حافظ صافی جانگلہ ۲. سکریٹری۔ بنگالی اکیڈیمی۔ بردوان ہاؤس۔ ڈھاکہ	ملازمت	مضمون نگار
نیلوفر بیگم	۵۵۔ شانتی نگر۔ ڈھاکہ۔ ۲	〃	شاعرہ

محمد رفیق الاسلام	گاؤں۔ کالاکرتلا۔ ڈاکخانہ سن گرچہ ڈسٹرکٹ کومیلا، شعبۂ بنگالی یونیورسٹی آف ڈھاکہ۔ ڈھاکہ	معلم	مضمون نگار، نقاد
محمد منیر الزمان	ڈاکخانہ خارکی، ضلع جیسور مشرقی پاکستان۔ ۲۰۔ ۳۱، منی پوری پاٹہ، تیج گاؤں ڈھاکہ ۔۵	ریسرچ اسکالر	شاعر، نقاد اور مضمون نگار
تارک العالم ابوالحسنات	(الف) بابو خان روڈ۔ کھلنا۔ (ب) ۱۲ نار ستھرا ماؤ سندری ڈھاکہ ۳۱۔ توپ خانہ روڈ۔ ڈھاکہ	اسسٹنٹ ایڈیٹر سابق آئی جی پی	نقاد، مضمون نگار مضمون نگار
عبدالقدوس سعدی دبچا چھالا	(الف) گاؤں اوتاپاڑا ڈاکخانہ دیگھو ضلع پبنا مشرقی پاکستان (ب) ۶۰ پاتاؤ تلی۔ ڈھاکہ ۔۱	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار، ڈرامہ نگار
محمد شمس الرحمن	(الف) گاؤں مالیتا ڈاک خانہ چوک ناگر کھلنا (ب) اسسٹنٹ سشن جج ڈھاکہ	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار اور نقاد
نور العالم	(الف) گاؤں اور ڈاکخانہ، مگ دھارار، ساندریپ چٹگاؤں (ب) لکچرر، بنگالی راج شاہی گورنمنٹ کالج۔ راج شاہی	مدرس	افسانہ نگار، مضمون نگار ڈرامہ نگار
قاضی محبیب الرحمن	پوراتنگا شا، ڈاکخانہ اور ضلع جیسور	مدرس	شاعر، افسانہ نگار نقاد اور ڈرامہ نگار
سراج الاسلام	(الف) گاؤں رسول پور ڈاکخانہ کیرانی گنج ضلع ڈھاکہ۔ (ب) ۱۰ مقیم کٹارا، معرفت پرچون اسٹور ڈھاکہ	تجارت	شاعر، افسانہ نگار ڈرامہ نگار، نقاد
ڈاکٹر محمد شہید اللہ	رحمت میڈیکل ہال۔ ۱۔ ایس کے داس روڈ۔ ڈھاکہ ۴۔	میڈیکل پریکٹیشنر	مضمون نگار
برہان الدین خان جہانگیر	(الف) گاؤں گل بہار، ڈاکخانہ راجھو ناتھ پور بذریعہ حاجی گنج کومیلا (ب) ۲ سیگن بگان۔ ڈھاکہ	اسسٹنٹ ایڈیٹر	ناول نگار
ابو احمد فضل الکریم	۱، نیلمبر سیہا روڈ، ڈاک خانہ، فیل خانہ۔ ڈھاکہ	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار، نقاد ڈرامہ نگار
بندے علی میاں	(الف) رادھا نگر پبنا (ب) پاکستان بک کارپوریشن ۴/۴۳، پاتاؤ تلی۔ ڈھاکہ	تصنیف وتالیف	مضمون نگاری
سید اسد اللہ شیرازی	بنی فوجہ ڈاکخانہ سراج گنج بازار ضلع پبنا	مدرس	شاعر، مضمون نگار نقاد
گیرش چندر بار دی یاد ڈیا بنیو	گاؤں سپول ڈاکخانہ لعقوب ڈانڈی جٹ گاؤں (ب) اے۔ کمال پور ٹھاکر پورا۔ ڈھاکہ۔۳۔	ریٹائرڈ اسکول ماسٹر	شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار، نقاد، مضمون نگار

لطف الحمید چودھری	(الف) کتابخانہ خالصتی پیرزادہ کمال الدین (ب) بنگالی اکیڈمی بردمان ہاؤس، ڈھاکہ-۲	بزنس	مضمون نگار، نقاد
اے ایف ایم غلام مصطفیٰ قریشی	(الف) کتب خانہ امدادیہ چوک بازار، میمن سنگھ (ب) ۲۷ جگن ناتھ شاہا روڈ، ڈھاکہ-۱	اسسٹنٹ ایڈیٹر	مضمون نگار، نقاد
عبدالحامد	(الف) ریویرائن ویلا-۳۹ لنتھو منشی سینٹ کاشتیا (ب) ۴۸-آغا صادق روڈ، ڈھاکہ-۱	وکالت	شاعر
حامد فضل ربی	۱۷-ایچ۔ کے بنرجی روڈ۔ نرائن گنج۔ ڈھاکہ	اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز افیسر	مضمون نگار
محمد عبدالقیوم	۹-آرمینی اسٹریٹ، ڈھاکہ۔	ملازمت	مضمون نگار، نقاد

اراکین جو جنوری ۱۹۶۲ء کو ادارے میں شامل کئے گئے

مغربی پاکستان

اکرام عزیز	روزنامہ "انجام" پشاور	لیکچرار	افسانہ نگار، مضمون نگار
سید افضال حسین اظہر	جے ۱۶- پشاور یونیورسٹی	اردو لیکچرار	شاعر، مضمون نگار
مصطفیٰ اجتوئی	۱۴۰۷ اے سائوتھ رسالہ روڈ حیدرآباد، مغربی پاکستان	صحافت	شاعر، مقالہ نگار، ڈرامہ نویس
محمد علی بھٹی	معرفت ادارۂ آفاق ادب حیدرآباد	استاد	مختصر کہانی نویس، ناول نگار، مقالہ نگار
خورشید انور	محلہ نگر، میو روڈ، لاہور	تصنیف و تالیف	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار، ناول نویس، ڈرامہ نویس، اور نقاد۔
(راجا) اے حمید کوثر	قاسم بلڈنگ، لاہور چھاؤنی	انسٹرکٹر	شاعر۔
[illegible]	پروفیسر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج گلبرگ، لاہور	تعلیم و تدریس	مضمون نگار

علیم اللہ صدیقی	۴۲ سنی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور	سرکاری ملازمت	افسانہ نگار، مضمون نگار نقاد
(سید سبط حسن رضوی نقوی بخاری)	۱۲/۵۔ رام نگر دیو سماج۔ لاہور	سرکاری ملازمت	شاعر، مضمون نگار، ڈرامہ نویس
غلام رسول ازہر	اے۔۲۔ بیڈن روڈ، لاہور	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار
میر منظور محمود (ولی وارثی)	۲ حت اسٹریٹ موہنی روڈ لاہور۔۲	طبابت	شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس مضمون نگار، ڈرامہ نویس
وقار احمد	۳۱۱۔ شیفرڈ روڈ، مغلپورہ لاہور۔ ۱۵	تدریس	افسانہ نگار، مضمون نگار
وحید قریشی	۲۴۹۔ این، سمن آباد۔ لاہور۔ ۴	لیکچرار	شاعر، مضمون نگار، نقاد
سکینہ محمود	وائس پرنسپل گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج فار وومن گلبرگ۔ لاہور	درس و تدریس	شاعر، ناول نویس
عمر فیضی	۹۔ دارا اسٹریٹ اسلامیہ پارک	سرکاری ملازمت	شاعر
افضل احسن	۱۱۹۔ بی۔ پیپلز کالونی لائلپور	ملازمت	افسانہ نگار، ناول نویس مضمون نگار۔
اعجاز قریشی	مین بازار، غلام باری پورہ لائل پور	لیکچرار	شاعر، مضمون نگار،
مسز کے۔ این۔ احمد خاور (درانی)	۵۴۔ گرو تیغ بہادر روڈ۔ کرشن نگر۔ لاہور		
راجہ محمد اکرم اعظم	۳۳۵ ماموجی روڈ۔ راولپنڈی کینٹ	ملازمت	شاعر، افسانہ نویس، ناول نویس
فضل کریم اختر ضیائی	موضع و پوسٹ آفس کالا گوجران ضلع جہلم	کلرک	شاعر، افسانہ نویس، ناول نویس، مقالہ نگار، نقاد
شجاعت حسین عباسی	گورنمنٹ انڈسٹریل ہائی اسکول، منٹگمری	سرکاری ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار
عبد الغفور سہیل اختر	بلاک جے۔ ڈیرہ غازی خان	ٹیچر	شاعر، افسانہ نگار، مقالہ نگار، نقاد
عبد الرزاق شعور صدیقی	مکان نمبر ۱۸۱۔ بی۔ ہزاری مل۔ لاڑکانہ	کاشتکاری	شاعر
سید عزیز الحسنین عزیز مظفر پوری	حسینی لاج، نواتک لاڑکانہ	کاشتکاری و جرنلزم	شاعر، مضمون نگار، نقاد
مفتاح الدین ظفر	ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز۔ بہاول پور ڈویژن بہاولپور	ملازمت	مقالہ نگار، افسانہ نگار، ناول نویس
محمد اعظم	لیکچرار، اردو۔ ایس ای۔ کالج، بہاولپور	لیکچرار	افسانہ نگار، ناول نویس مضمون نگار
سید محمد جعفری	۶۰۔ اے۔ سیٹلائٹ ٹاؤن مری روڈ۔ راولپنڈی	سرکاری ملازمت	شاعر

محمد عبداللہ شہزاد	۳۵۔ جمال پیسہ کالونی، ملتان شہر	کاروبار	مختصر کہانی نگار، ناول نویس
صمد رضوی لاسانوی حیدرآبادی	ہزاری لین پوسٹ آفس لاڑکانہ	ایڈووکیٹ	شاعر، ڈرامہ نگار
راجا رسالو	۲۷۔ محمد علی اسٹریٹ، شاہجہاں روڈ۔ لاہور	سرکاری ملازمت	مختصر کہانی نگار، مقالہ نگار، ڈرامہ نگار
تنویر جیلانی	اسٹریٹ نمبر۱۔ مکان نمبر۱۴، پرتاب نگر لائلپور	ملازمت	شاعر
عزیز لدھیانوی	گول بازار (صابن والا) لائلپور	کاروبار	شاعر
ظفر اقبال	لیکچرار۔ انگلش، گورنمنٹ کالج، لائلپور	لیکچرار	شاعر، مضمون نگار، نقاد
آزاد جمال دینی	نوشکی (چاغی ڈسٹرکٹ)	زمیندار	شاعر، مختصر کہانی نویس، مقالہ نگار، ڈرامہ نگار
عبدالشکور احسن	یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور	پروفیسر	شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار، ڈرامہ نویس، نقاد
محمد جعفر پھلواروی	۵۰ این۔ سمن آباد۔ لاہور	ملازمت	مضمون نگار، مقالہ نگار،
نفیس احمد ناصر	۹، ڈی۔ گلبرگ لاہور	ملازمت	مضمون نگار۔ نقاد۔
عبدالسلام	۴۰۔ مزنگ روڈ لاہور	سیلز مین	افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار
کلب علی خان فائق (رام پوری)	احمد نگر (براستہ ہیڈ خان کی) گوجرانوالہ	ملازمت	شاعر، مضمون نگار، نقاد
صاحبزادہ مرزا	۱۲۹۴ بی فیروز پور روڈ	زمینداری و ملازمت	شاعر، مقالہ نگار۔
صمصام الدین فیروز	گارڈن ٹاؤن، لاہور	ملازمت	
مرزا صلاح الدین احمد محشر	اردو روڈ، بہاول نگر	ملازمت	شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس
محمد اسلم قریشی	پی/۱۱۵۵ سعید پور۔ راولپنڈی	لیکچرار	نقاد
سید باقر علیم	معرفت مطبوعات، بک سیلرز، اسٹیشنرز، لال کرتی۔ راولپنڈی	ادب	افسانہ نگار، مضمون نگار،
محمد مسلم شمیم	۱۹/۱۴۰۸۔ کیری کوارٹرز، بیراج سکھر	تدریس	شاعر، نقاد،
نجم الاسلام	۱۹۔ اسلام گنج سکھر	تدریس	نقاد
عطاء الرحمٰن (راحت ملک)	محلہ جٹاں متصل بیرانی چیک، گجرات	ملازمت	شاعر، مضمون نگار
ایس فضل الحسن (شفقت کاظمی)	ڈیرہ غازی خان، مغربی پاکستان	ملازمت	شاعر
حافظ احمد رفیق خادم جسکانی	بلاک نمبر۱۱۔ ڈیرہ غازی خان	سرکاری ملازمت	شاعر، مضمون نگار، نقاد

عبدالغفور بیگ (غفور عابد)	سی۔۵۵ وکیل اسٹریٹ، سول لائنز جہلم	وکالت	شاعر۔ مقالہ نگار
مہربان احمد	سول لائنز۔ جہلم	کاروبار	مختصر افسانہ نگار، ناول نگار، مقالہ نگار، ڈرامہ نگار، نقاد
مسعود مفتی	سب ڈویژنل مجسٹریٹ، پنڈدادن خان ضلع جہلم	ملازمت	مختصر کہانی نویس، مقالہ نگار
ناصر شہزاد	اسلام آباد، منٹگمری	زمینداری	شاعر
بشیر احمد بشیر	کنوینر بزم فکر و ادب منٹگمری	زمینداری	شاعر، مضمون نگار
اشرف قدسی	اسسٹنٹ ایڈیٹر، ہفت روزہ منٹگمری گزٹ، منٹگمری	صحافت	شاعر، ناول نویس، مضمون نگار۔ نقاد۔
سید مراتب اختر	گیلانی، قادری منزل، گلی سید محمد حسین شاہ منٹگمری شہر		
مسعود اشعر	ریزیڈنٹ ایڈیٹر، روزنامہ امروز ملتان	صحافت	افسانہ نگار، مضمون نگار۔ نقاد
سلطان احمد	۱۰/۷ احسن سیوانہ کالونی ملتان		
محمد کریم تونسوی	اسسٹنٹ ڈائریکٹر، محکمہ تعلقات عامہ ملتان	ملازمت	شاعر، مقالہ نویس، مضمون نگار
رشد ملتانی	پاک دروازہ۔ ملتان	طب و جراحی	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار
شریف احمد عاصی کرنالی	مکان نمبر ۲۶۷۔ ممتاز آباد ملتان	لیکچرار	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار، نقاد۔
سید جابر علی جابر	وزیر آباد نئی آبادی، ملتان شہر	لیکچرار	شاعر
محمد علی کیفی جام پوری	بستی دیگران بیرون لوہاری دروازہ ملتان	معلم	شاعر، مضمون نگار، نقاد
پروفیسر صادق مصور	معرفت رشید واکر سپلائی کمپنی، چوک شہیداں، ملتان		
ربانی ملک	نشتر میڈیکل کالج، ملتان	طبابت	شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس
افتخار حسین شاہ	افتخار حسین شاہ، مکان نمبر ۶ گلی نمبر ۵، عثمان گنج بیرون شیرانوالہ دروازہ، لاہور		
ایم اے حمید کے سی	قلعہ گجر، مین بازار مزنگ لاہور	ملازمت	افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار، نقاد۔
ابوالطاہر فدا حسین فدا	ادارہ مہر و ماہ چوک متی لاہور	صحافت و تالیف	شاعر، مضمون نگار، ناول نویس، نقاد۔
سید بقا نقوی	۵۵ الف پی اینڈ ٹی کالونی ملتان روڈ، لاہور	سرکاری ملازمت	شاعر۔
نوید انجم	معرفت آفتاب احمد تابش ویج اینڈ پوسٹ آفس ڈھولن وال، ملتان روڈ لاہور۔	صحافت	افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار، ڈرامہ نویس
منظور احمد احمر	مکان نمبر ۱۱/۸۲، اندرون لوہاری گیٹ چوک لوہاری منڈی گلی کچہلا قوالی، لاہور۔	پروف ریڈر	شاعر، افسانہ نگار، مضمون نگار

محمد افضل خان	۴۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور	ایڈیٹری	افسانہ نگار، مضمون نگار نقاد
حامد جلال	۴۲۔ لکشمی منشن۔ دی۔ مال۔ لاہور	سرکاری ملازمت	مقالہ نگار، نقاد۔ مترجم
مظہر ہاشمی	معرفت مین سنٹر۔ لاہور	ملازمت	شاعر۔ افسانہ نگار
محمد حسین عرشی	گیتا بھون (دارالقرآن) لسنبت روڈ۔ لاہور	تصنیف و تالیف	شاعر، مضمون نگار، نقاد
پروفیسر فخرالدین رازی	گورنمنٹ کالج۔ لاہور، مکان نمبر ۱۵ اسٹریٹ نمبر ۹ بیڈن روڈ۔ لاہور۔	پروفیسر	شاعر، مضامین نگار۔ نقاد
محمود اختر کیانی	۱۱۴۔ گلبرگ روڈ۔ لاہور	سرکاری ملازمت	شاعر
سید اکبر کاظمی	۵۳، حبیب اسٹریٹ، محمدی محلہ، دسن پورہ لاہور		
سید عابد علی عابد	ساگر روڈ۔ صدر بازار، لاہور چھاؤنی		ناول نویس، مضمون نگار، ڈرامہ نویس، نقاد
عبدالرحیم شبلی	۷۔ جیارام بلڈنگ کبیر اسٹریٹ، نئی انارکلی، لاہور	صحافت و معلمی	شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس، مضمون نگار، ڈرامہ نویس، نقاد۔

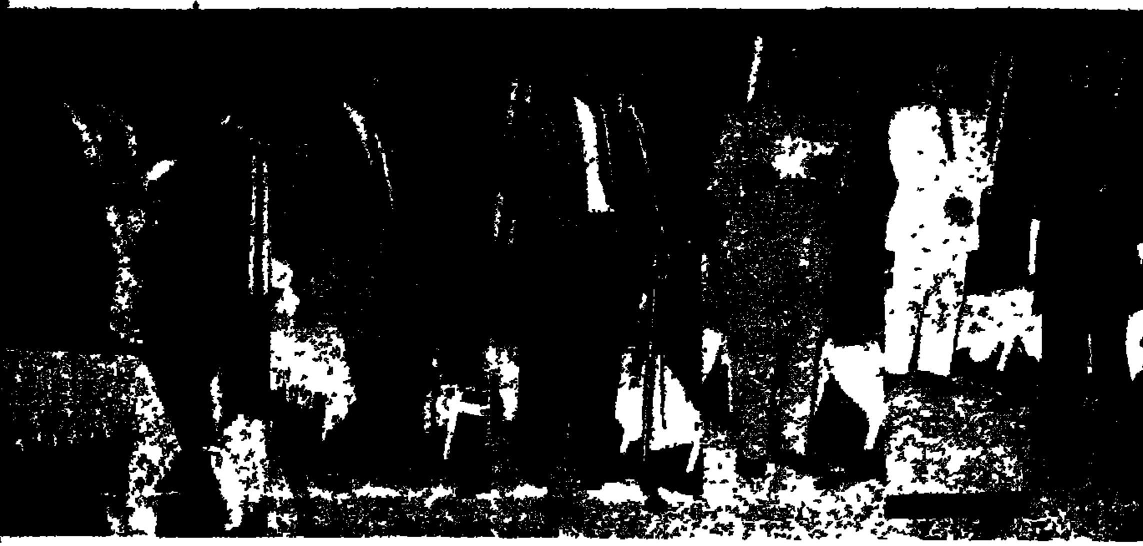
بقیہ

چھاپے خانے

۹۔ (سب میں) گلڈ کی بقا کا انحصار چھاپے خانوں کے قیام پر ہے، یہ ایک عظیم الشان منصوبہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ دیانت محنت اور انتھک کام کے ساتھ اس پر کامیابی سے عمل نہ ہو سکے، گلڈ کا خود کفیل ہو جانا اسے حکومت کی احتیاج سے آزاد کرنے کے ساتھ ساتھ اسے ایک مضبوط اور فعال جماعت بنا دے گا، ابتک ہمارے برصغیر میں صرف برما ٹرانسلیشن سوسائٹی نے قابل ذکر پیمانہ پر اپنا چھاپہ خانہ قائم کیا ہے لیکن ہماری تحقیقات کے مطابق اس میں بیشتر سرمایہ غیر ملکی امداد کا ہے، ہمارا منصوبہ خاص قومی وسائل کی بنیاد پر بنا ہے اور بہت سی دشواریوں کے باوجود کامیابی کے درخشاں امکانات رکھتا ہے اس کی کامیابی ہمارے مسائل کو حل کرنے کے علاوہ دوسرے اداروں بلکہ دوسرے ممالک کے لئے بھی عمدہ مثال قائم کرے گی۔

اراکین ان کی کامیابی کے لئے دعا فرمائیں۔

گجراتی ادیبوں کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے ادبی انعامات کی تقسیم



گلڈ کو خراج تحسین پیش کئے جانے کا ایک منظر

۱۷ فروری کو پی ایم - اے بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں ایک شاندار اجتماع میں گجراتی کے پانچ ادیبوں کو پاکستان رائٹرز گلڈ کے انعامات تقسیم کئے گئے — اس تقریب میں ملک کے بڑے بڑے ادیب، صنعت کار، تاجر اور دیگر معززین شریک ہوئے —

هزهائی نس کرنل محمد دلاور خان نواب جوناگڈھ نے تقسیم کی تقریب کی صدارت کی گجراتی کے ۱۲ ادبی اور سماجی اداروں کے زیر انتظام تقسیم انعامات کی تقریب منعقد کی گئی تھی — حسب ذیل پانچ ادیبوں کو انعامات دیئے گئے —

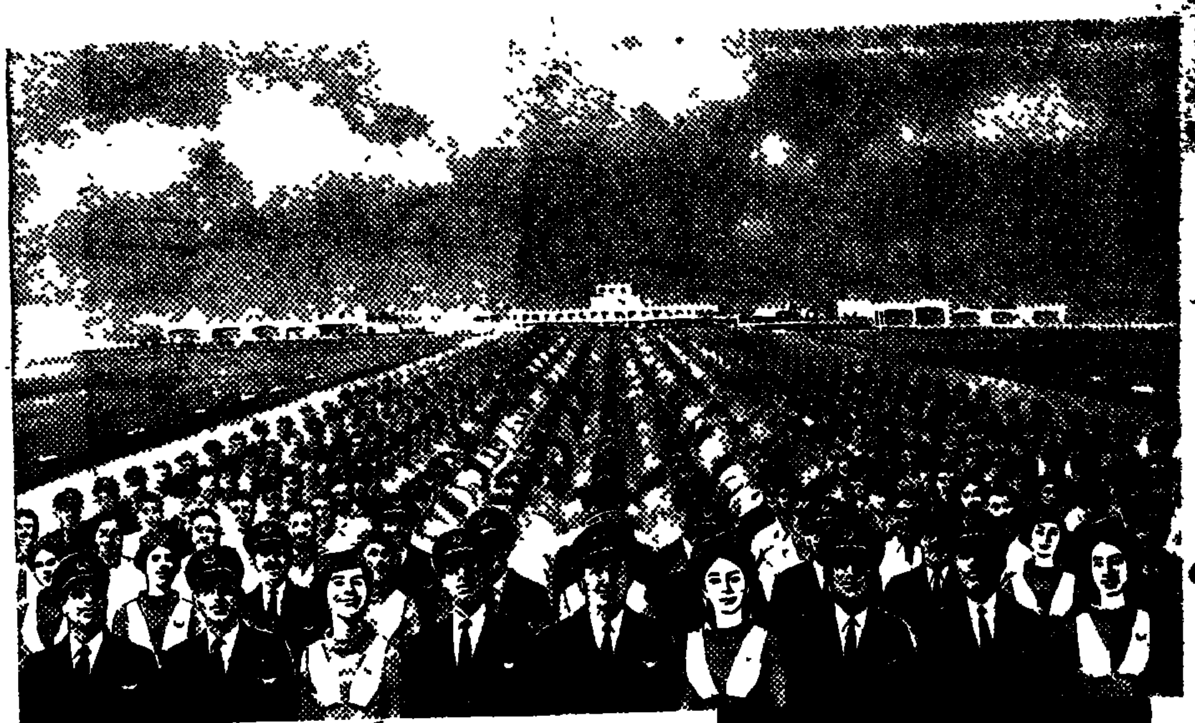
ایم سالک پوتیا، مسٹر شمع پور بندی، محمد اختر (مرحوم قاضی احمد میاں میاں اختر جوناگڑھی کے صاحبزادے جنہوں نے اپنے والد کا انعام لیا) مسٹر سہراب کٹرک (جنہوں نے مسٹر فیروز شاہ مہتا کی طرف سے انعام وصول کیا) مسٹر محمد ادیب جو تقسیم انعامات کی تقریب کے موقع پر شہر سے باہر تھے —

نواب جوناگڈھ نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ معاشرے میں ادیبوں کو اعلیٰ حیثیت حاصل ہے دنیا میں ہزاروں انقلابات رونما ہوچکے ہیں لیکن ادیبوں کو ہمیشہ ایسی اہمیت حاصل رہی ہے جو زمان و مکان کی قیود سے آزاد ہے

انہوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک انوکھا اور مثالی ادارہ ہے - اس کی کامیابی کا سہرا قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور ان کے دیگر شرکائے کار کے سر ہے جنہوں نے اس ادارے کے ذریعہ ادیبوں کی سماجی حیثیت کو بہت بلند کردیا ہے -

انہوں نے آخر میں انعام یافتگان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان میں ملک و قوم کی خدمت کرنے کی توفیق برقرار رہے —

باکمال لوگ لاجواب پرواز



اپنے اپنے کام کے ماہر ۶۲۷۶ افراد

پی۔ آئی۔ اے کا ہر فرد اپنے کام میں گہری دلچسپی لیتا ہے۔ اور اسے نہایت احتیاط اور ہوشیاری سے سرانجام دیتا ہے۔ ۶۲۷۶ افراد پر مشتمل پی۔ آئی۔ اے کا پورا عملہ ہر طیارے اور ہر پرواز کی ایک ایک تفصیل پر نظر رکھتا ہے، اس میں رتبے یا درجے کی کوئی خصوصیت نہیں، خواہ بوئنگ اڑانے والے دوسند یافتہ تجربہ کار کپتان ہوں یا زمین پر ہوائی جہاز کے کل پرزوں کی دیکھ بھال کرنے والے کاریگر، ایئر ہوسٹس ہوں یا ٹریفک اسسٹنٹ ان سب کے پیش نظر صرف یہی مقصد ہوتا ہے کہ آپ اپنی منزل مقصود پر بہ نہایت آرام کے ساتھ ٹھیک وقت پر پہنچ جائیں۔

پی۔ آئی۔ اے نے پابندیٔ وقت کا شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے یہی وجہ ہے کہ گزشتہ سال ۶۳ فیصدی زائد مسافروں نے پی۔ آئی۔ اے سے سفر کیا، جس کی بدولت اس نے ۴۱ فیصدی زائد منافع کمایا۔

آپ روم جانا چاہتے ہوں یا نیویارک، لندن کا قصد رکھتے ہوں یا جنیوا کا۔ پی۔ آئی۔ اے کے ۶۲۷۶ آدمی ہر وقت اس کام پر مستعد ہیں کہ آپ وہاں سہولت سے اور وقت پر پہنچ جائیں۔ ان میں سے ہر ایک فرد اپنے ہنر میں یگانۂ روزگار ہے۔

PIA

پاکستان
انٹرنیشنل ایئر لائنز

مزید تفصیل اپنے سفر کے ایجنٹ یا ہم سے دریافت فرمایئے

نیویارک، لندن، جنیوا، روم، بیروت، تہران، برما، انڈیا اور پورے پاکستان میں پی۔ آئی۔ اے سے سفر کیجئے۔



گجراتی ادیبوں کو گلڈ کے ادبی انعامات کی تقسیم کی تقریب کا ایک منظر

پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایکزیکیٹو سکریٹری مسٹر جمیل الدین عالی نے جو اس تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے، کہا کہ گلڈ ابتدا ہی سے گجراتی کی اہمیت سے واقف ہے اور اس نے گجرتی کو اس کا جائز مقام دیا ہے —

انہوں نے علم و ادب اور تہذیب و ثقافت کی ترقی میں گجراتی بولنے والے حضرات کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گلڈ کا سالانہ ادبی انعام مالی حیثیت سے ایشیا کا سب سے بڑا انعام ہے اس کا سہرا بھی گجرتی بولنے والی برادری کو جاتا ہے۔ میرا اشارہ آدمجی ادبی انعام کی طرف ہے

صدر ایوب نے بھی گجراتی حضرات کی ادب نوازی کو سراہا ہے میں گلڈ کی طرف سے مجوزہ گجراتی اکیڈمی کے قیام میں بھر پور تعاون کا وعدہ کرتا ہوں۔ اس وقت گجراتی ادیبوں کو انعام کی شکل میں جو کچھ دیا جارہا ہے وہ دراصل کوئی مالی اعانت نہیں ہے بلکہ اس بات کی ایک معمولی علامت ہے کہ ہمارے دلوں میں آن کی کتنی قدر و منزلت ہے۔

آخر میں مسٹر عالی نے قابل انعام تخلیقات کے انتخاب میں جج حضرات کی مخلصانہ کوششوں کا شکریہ ادا کیا۔ حسب ذیل افراد نے ججوں کے فرائض انجام دیئے تھے۔ مسٹر شبنم مسٹر یوسف مانڈویا اور مسٹر صادق۔



گجراتی ادیب اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں

خبرنامہ

شکسپیر کے ڈرامے عربی میں

مشہور ڈرامہ نگار ولیم شکسپیر کے ڈراموں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ یہ منصوبہ عرب لیگ نے متحدہ عرب جمہوریہ کے مشہور مصنف طٰہٰ حسین کی تحریک پر تیار کیا ہے۔ موصوف نے اس سے پہلے مشہور یونانی تمثیل نگار سوفوکلیس کی تحریروں کا بھی عربی میں ترجمہ کیا ہے اور ایچی لس کے متعدد المیوں کو عربی میں منتقل کر چکے ہیں۔ شکسپیر کے ڈراموں کے عربی تراجم کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ہر جلد میں دو ڈرامے شامل ہیں۔

عرب لیگ نے اس کے علاوہ متعدد قدیم یوروپی کلاسیکی ادب پاروں کو عربی میں منتقل کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہے۔ ان میں یونانی شاعر ہومر کی "الئیڈ" قابل ذکر ہے۔

مولانا رومی کا ایک قدیم نسخہ

فارسی کے مشہور شاعر مولانا جلال الدین رومی کے کلام کا ایک قدیم نسخہ بخارا میں دریافت ہوا ہے۔ خیال ہے کہ تیرھویں صدی عیسوی میں یہ مجموعہ مرتب ہوا تھا جو چھ جلدوں پر مشتمل ہے۔ ازبکستان میں رومی کے فارسی کلام کے جو قدیم نسخے دستیاب ہوئے ہیں ان میں سے قدیم ترین نسخہ یہی ہے۔

پشکن کا ۱۲۵واں یوم وفات

۱۰ فروری کو روسی زبان کے سب سے بڑے شاعر پشکن کا ۱۲۵واں یوم وفات منایا گیا۔ اس موقع پر پشکن کے ناٹک کئے گئے اور ان کی کہانیوں پر مبنی فلمیں دکھائی گئیں۔

روس میں اُردو کی درسی کتابیں

ازبکستان کے ایک اشاعت گھر نے اُردو اور ہندی کی درسی کتابیں شائع کی ہیں جو روس کے اسکولوں کی چھٹی اور ساتویں جماعت کے نصاب میں داخل ہیں۔ پانچویں جماعت کی کتابیں پہلے ہی شائع ہو چکی ہیں۔

یہ کتابیں تاشقند یونیورسٹی میں ہندوستانی زبانوں کے اساتذہ نے تیار کی ہیں جو روس کے ان تمام اسکولوں کے نصاب میں داخل ہیں جہاں اُردو اور ہندی کی تعلیم دی جاتی ہے

علامہ عرشی کے دیوان غالب کو انعام

دیوان غالب مولفہ علامہ عرشی کو ساہتیہ اکیڈمی کا پانچ ہزار روپے کی مالیت کا سالانہ انعام دیا گیا۔ بھارت کی ساہتیہ اکیڈمی ہر سال بھارت کی مختلف زبانوں کی کتابوں پر پانچ پانچ ہزار روپے کی مالیت کے انعامات دیتی ہے۔ اس سال بھی اکیڈمی نے بھارت کی مختلف زبانوں کی ۱۳ کتابوں کو انعام دیا ہے جس میں دیوان غالب بھی شامل ہے۔

اثر لکھنوی اور نیاز فتحپوری پدم بھوشن ہو گئے

حکومت ہند نے اردو کے مشہور شاعر جناب نواب جعفر علی

خاں اثر لکھنوی اور اُردو کے مایۂ ناز نقاد اور انشا پرداز علامہ نیاز فتحپوری کو ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں پدم بھوشن کا خطاب دیا ہے۔ یاد رہے اس سے پہلے یہ خبر آچکی ہے کہ اترپردیش کی حکومت نے اثر لکھنوی کو "لغات اثر" کی اشاعت کے لئے پانچ ہزار روپے دیئے ہیں۔

غالب کی یادگار کے طور پر ادبی مرکز کا قیام

انجمن ترقی اُردو دہلی نے فیصلہ کیا ہے کہ اُردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کی یادگار کے طور پر ایک تحقیقی اور ادبی مرکز قائم کیا جائے اس سلسلہ میں غالب ہال تعمیر کیا جائے گا جس میں ایک لائبریری ہوگی۔ لائبریری میں مرزا غالب کی تمام کتابیں اور مرزا غالب کے متعلق تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابیں اور مضامین فراہم ہوں گے غالب کی نگارشات اور غالب کے متعلق تحریر کردہ تمام مضامین اور کتابوں کے ترجمے بھارت کی دوسری زبانوں میں شائع کئے جائیں گے۔ مشاعرے اور ادبی اجتماعات کے لئے ایک ہال بھی تعمیر کیا جائے گا جو غالب ہال کہلائے گا۔

عربی میں فنی اصطلاحات کی تدوین

عراقی سائنس اکیڈمی کے صدر ڈاکٹر نجی الاصل نے بتایا ہے کہ سائنس اکیڈمی نے عربی زبان میں ریلوے، تیل، ریلوے انجینیری، آب پاشی، تعمیرات، جہاز رانی، پٹرولیم، نجوم اور آراضیات کے متعلق ابتدائی فنی اصطلاحات وضع کرلی ہیں۔ انھوں نے مزید بتایا کہ سرکاری ٹرانسپورٹ سروس نے اکیڈمی سے درخواست کی ہے کہ وہ مواصلات اور موٹر گاڑیوں کی مختلف فنی اصطلاحات بھی عربی زبان میں مرتب کر دے۔ اکیڈمی عنقریب ان اصطلاحات کی تدوین کا کام شروع کر دے گی۔

ناول نگاروں کی عالمی کانفرنس

معلوم ہوا ہے کہ اس سال موسم گرما میں ایڈنبرا کے مقام پر ناول نگاروں کی ایک پانچ روزہ عالمی کانفرنس منعقد ہوگی جس میں دنیا کی مختلف زبانوں کے مشہور ناول نگاروں کو شرکت کی دعوت دی جاچکی ہے جن ناول نگاروں کو دعوت نامہ بھیجا گیا ہے۔ ان میں دو ادیب نوبل انعام یافتہ بھی ہیں۔

اس کانفرنس میں بھارت سے خشونت سنگھ، روس سے ایلیا اہرن برگ فرانس سے ژاں پال سارتر اور امریکہ سے ولیم فاکنر کی شرکت متوقع ہے۔

ابھی تک پاکستان کے کسی ناول نگار کو اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ نہیں ملا ہے۔

حلقۂ کراچی

ملک بھر میں زبردست خیر مقدم

فیلڈ مارشل صدر ایوب نے یکم مارچ کو نئے آئین کا اعلان کردیا، انھوں نے ریڈیو پاکستان سے قوم کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے نئے آئین کا پس منظر اور اس کی خصوصیات بیان کیں آئین پر دستخط کرنے کے بعد ایوان صدر کی خصوصی تقریب میں صدر ایوب نے فرمایا کہ انھیں اس آئین سے بڑی توقعات ہیں سارے ملک میں اور بیرونی ممالک میں نئے آئین کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ یہ آئین نظریہ پاکستان، اسلامی شعائر اور قومی مزاج کا آئینہ دار ہے۔ باخبر حلقوں کی رائے میں اس آئین کے نفاذ سے پاکستان سیاسی استحکام، معاشی ترقی اور بین الاقوامی میدان میں عظمت حاصل کرنے کی منزلیں تیزی سے طے کرے گا۔

ایشیائی افریقی ادیبوں کی کانفرنس

پچھلے ماہ افریشیائی ادیبوں کی جو کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی تھی اس میں پاکستانی ادیبوں کو دانستہ شرکت سے محروم رکھا گیا تاکہ پاکستان کے سند و بین کانفرنس میں مگر کا مسئلہ پر کشمیر کے مسئلہ

کو زیر بحث نہ لا سکیں۔ اس سلسلہ میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایگزیکیو سیکریٹری جمیل الدین عالی نے ایک بیان میں کانفرنس کے رویے اور طریقہ کار پر سخت حیرت کا اظہار کیا۔

معلوم ہوا ہے کہ بعض مندوبین نے کانفرنس میں یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ فرانس کے مشہور ادیب ژاں پال سارتر کا دعوت نامہ کس وجہ سے منسوخ کر دیا گیا، سارتر کے علاوہ ایک اور فرانسیسی ادیب فرانسوا موریاک اور گراہم گرین کے دعوت نامے بھی منسوخ کئے گئے۔

معلوم ہوا ہے کہ چینی اور روسی مندوب کے درمیان بھی بعض امور پر شدید اختلاف رائے ہوا۔

اُردو میں قانونی کتابوں کی فہرست

پاکستان اُردو مجلس قانون کراچی نے اُردو میں قانونی کتابوں کی جامع فہرست شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں اس نے تمام اداروں، کالجوں، کتب خانوں اور وکیلوں سے استدعا کی ہے کہ ان کے پاس جو قانونی کتابیں موجود ہوں ان کا سنہ طباعت و مقام اشاعت وغیرہ ترتیب دے کر مجلس کے دفتر واقع جنگ ہاؤس نمبر ۱ حبیب اسکوائر بندر روڈ کراچی پر ارسال کریں۔

گجراتی اکیڈمی کا قیام

روزنامہ لیڈر اور ملت کے ایڈیٹر جناب فخر ماتری نے گجراتی سنگیت محفل کراچی کے ایک جلسہ میں اعلان کیا ہے کہ گجراتی زبان اور ادب کو ترقی دینے کی غرض سے عنقریب کراچی میں ایک گجراتی اکیڈمی قائم کی جائے گی۔ یہ اکیڈمی گجراتی ادیبوں اور شاعروں کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی کرے گی۔

گجراتی سنگیت محفل کی تقریب میں گجراتی ادیب کلیم امروہوی کو گجراتی ڈرامے مساوعناء کے گیت لکھنے پر صدیق ہلال نے پانچ سو روپے چیک اور محمد مسلم نے ایک طلائی تمغہ دیا

حلقہ مغربی پاکستان

انجمن ادبی رسائل کا سالانہ اجلاس

گزشتہ ماہ کی ۲۸ تاریخ کو انجمن ادبی رسائل پاکستان کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا۔ سید ہاشم رضا سکریٹری اطلاعات و نشریات و تعمیر نو نے سالانہ اجلاس اور ادبی جرائد کی نمائش کا افتتاح کیا۔

تلاوت کلام پاک سے اجلاس کی کارروائی شروع ہوئی۔ جنرل سیکریٹری جناب ضیاء الدین برنی نے مختصر رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد صدر مجلس استقبالیہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایڈیٹر اورینٹل کالج میگزین نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا جو ادبی رسائل کے تقریباً تمام اہم مسائل پر حاوی تھا۔

آخر میں سید ہاشم رضا صاحب نے اُردو میں نہایت دلچسپ اور فکر انگیز تقریر فرمائی۔ اور ادبی رسائل کے مدیروں کو حکومت کی طرف سے ممکنہ تعاون کا یقین دلایا۔

رات کو جسٹس جان کی صدارت میں اُردو، پنجابی، بلوچی اور بنگالی زبانوں اور ادب اور رسائل پر فکر انگیز مقالے پڑھے گئے۔ مقالات کا دور ختم ہونے کے بعد محفل مشاعرہ منعقد ہوئی۔

دوسرے روز صبح انتخابات عمل میں آئے اور متعدد تجاویز منظور کی گئیں۔ اسی روز عشرت رحمانی کا لکھا ہوا ڈرامہ جنسی ہنسی بھی پیش کیا گیا۔

کراچی کے تقریباً ایک درجن رسالوں کے مدیروں کے علاوہ سالانہ اجلاس میں کوئٹہ اور ڈھاکہ کے نمائندوں نے بھی شرکت کی۔

اردو سب رپجن حیدرآباد

۱۰ فروری ۱۹۶۲ء کو جناب شوقین حبیت پوری کی صدارت میں پاک مسلم گجراتی ساہتیہ منڈل کا ساتواں سالانہ عام اجلاس ہوا جس میں گجراتی ادیبوں کو پانچ انعامات دینے پر پاکستان رائٹرز گلڈ پر متفقہ طور پر مسٹر منظور فاروقی کی پیش کردہ قرارداد منظور کی گئی۔

قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ہم پاک مسلم گجراتی ساہتیہ منڈل کے اراکین گجراتی زبان کی ترقی و فروغ کے پاکستان رائٹرز گلڈ کی مساعی پر دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ قرارداد میں مزید توقع ظاہر کی گئی ہے کہ گلڈ ایسے مزید انعامات دیکر آئندہ نسلوں کی دلچسپی میں مزید اضافہ کرے گی۔

قرارداد کے آخر میں ادبی مقاصد کے لئے مسٹر جمیل الدین عالی کی خدمات پر انہیں دلی مبارکباد دی گئی۔

۱۱ فروری ۱۹۶۲ء کو سچل کالج ہال میں پاکستان رائٹرز گلڈ اردو سب ریجن حیدرآباد کے زیر اہتمام گلڈ کی تقریب سالگرہ منائی گئی۔ ریجن کے سیکریٹری ارشد رضا نے اپنی تقریر میں گلڈ کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور گزشتہ نشستوں کی روداد پڑھی جوائنٹ سیکریٹری جناب محسن بھوپالی نے گلڈ کا منشور پڑھ کر سنایا

پروگرام کے مطابق پہلے جناب شفیق شکیب صاحب نے اپنا مقالہ بعنوان "انفرادیت" پیش کیا۔ انہوں نے بتلایا کہ انفرادیت موضوعات کے تنوع اور عمدگی کا نام نہیں بلکہ ادیب یا شاعر کا اپنے دور کے تہذیبی، سماجی، فکری اور وجدانی قدروں کو خود میں رچا بسا کر اس کے اظہار کا نام ہے جو اس کے فنی اسلوب، ہئیت اور طرز نگارش میں نمایاں ہوتی ہے، منفرد ادبی شخصیت کو عام لوگوں سے کہیں بڑھ کر عرفان ذات ہوتا ہے اور وہ اپنے ہمعصروں سے ہزار گنا زیادہ محبت ذات کا شعور رکھتا ہے۔

جناب حمایت علی شاعر نے اپنا منظوم ڈرامہ "دستک" پڑھا یہ ڈرامہ ایک فن کار کی دوہری شخصیت کا آئینہ دار تھا۔

آخر میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب نے جو اس جلسہ کے صدر تھے اپنی تقریر میں جناب شفیق شکیب اور جناب حمایت علی شاعر کی تحریروں پر تبصرہ کیا۔

اس جلسہ میں حیدرآباد کے علم دوست اور ادب نواز حضرات نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔

بزم خیابان اُدب، کوہاٹ کی تشکیل

کوہاٹ میں نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کے لئے ایک نئی ادبی انجمن "بزم خیابان ادب" کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور اس کے لئے مندرجہ ذیل عہدیدار اتفاق رائے سے منتخب کئے گئے ہیں:-

نگراں:- پروفیسر اشرف بخاری ایم اے۔ صدر:- احمد پراچہ نائب صدر:- فیضی القادری جنرل سکریٹری:- شجاعت علی راہی نائب سکریٹری محمد حفیظ قریشی۔ پروپگنڈا سکریٹری:- محمد اقبال خزانچی:- سیف اللہ

اس نئی انجمن کے زیر اہتمام مورخہ ۲ فروری کو ایک تنقیدی اجلاس رات کے آٹھ بجے جناح میونسپل لائبریری میں منعقد ہوا جس میں شجاعت علی راہی نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی غزل پر سیر حاصل بحث ہوئی اور شاعر کی اس کوشش کو بڑا سراہا گیا۔ بعد ازاں مشاعرے کا دور چلا جس میں متعدد شعراء نے حصہ لیا

لاڑکانہ کی اُدبی سرگرمیاں

۴۔ فروری ۱۹۶۲ء کو آٹھ بجے شب میں بزم ادب لاڑکانہ کی ماہانہ تنقیدی نشست اور طرحی مشاعرہ جناب صمد رضوی صدر بزم ادب، کی قیام گاہ پر منعقد ہوا۔ اس نشست کی صدارت جناب صمد رضوی ساز حیدرآبادی نے فرمائی۔

تنقیدی نشست میں جناب عزیز مظفر پوری نے لاڑکانہ کے ایک معتدر بزرگ شاعر نجم الشعراء جناب دیوان صاحب کی

شاعری پر ایک مقالہ پڑھا۔ مقالہ کے افتتاح کے بعد تنقید کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے جناب سید احمد نے کہا کہ شاعر کے ابتدائی دور کلام پر بھی بھرپور تبصرہ ہونا چاہیئے تھا اور نمونتاً کچھ کلام میں اس دور کا پیش کیا جانا چاہیئے تھا۔ جناب شوکت عابدی جناب سید احمد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ مقالہ نگار کے پیش نظر جناب دیوان نعلیف کی شاعری کو متعارف کرانا مقصود تھا۔ اسلئے زیر بحث مقالہ میں شاعر موصوف کے ابتدائی کلام پر تبصرہ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد پروفیسر مسلم شمیم نے مقالہ کو مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور مقالہ نگار کی کامیاب کوشش کو بہت سراہا۔ انھوں نے کہا کہ جناب سید احمد کی رائے کچھ حد تک درست ہے کیوں کہ تنقید کے بنیادی اصولوں کے پیش نظر مقالہ کو صرف نثر میں قصیدہ خوانی نہیں ہونا چاہیئے۔ تصویر کے دونوں رُخ یکساں طور پر غیر جانبداری کے ساتھ سامنے لانا چاہیئے۔ پھر طرحی مشاعرہ کا آغاز ہوا۔ مصرعہ طرح۔ حضرت جگر مراد آبادی کی غزل کا ایک مصرعہ تھا۔ جو

" خود گردو پیش آکر کعبہ ہو کہ بُت خانہ "

اس مشاعرہ میں شرکت کرنے والوں میں مندرجہ ذیل افراد کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔ ان شعرائے کرام کے ایک دو منتخب اشعار بھی حاضر خدمت ہیں۔

رمز ــــ گم گشتہ نگاہی کا عالم تو کوئی دیکھے
منزل کے قریب آکر، منزل سے ہوں بیگانہ

ماہر براری کیوں ذکر گلستاں ہے کیوں قصہ کاشانہ
منزل کے قریب آکر، منزل سے ہوں بیگانہ

عسکری وہ لائق عزت ہے وہ فخر کے قابل ہے
جو وقت پہ کام آئے اپنا ہو کہ بیگانہ

شعور صدیقی ساقی سے کوئی سیکھے انداز کریمانہ
میں تشنہ دہن مبکش، گردش میں ہے پیمانہ

شوکت عابدی وہ اہل خرد ہوں گے جو لٹ گئے راہوں میں
ہم اہل جنوں پہنچے منزل پہ دلیرانہ

پروفیسر مسلم شمیم یہ شکوۂ دوراں ہے اک رسم قدیمانہ
کچھ اور قدم آگے اُسے جراَتِ رندانہ

یہ تھے وہ اشعار جو بزم میں بڑی توجہ سے سُنے گئے اور سراہے گئے۔ اس کے بعد جناب توحید احمد معتمد بزم ادب شرکائے مجلس کا شکریہ ادا کیا اور صدر کی اجازت سے جلسے کے خاتمے کا اعلان کیا۔

رائٹرز گلڈ پشاور کی مجلس عاملہ کا اجلاس

رائٹرز گلڈ پشاور کی مجلس عاملہ کا اجلاس ۲۴ رجنوری کو ۴ بجے روز نامہ انجام پشاور کے دفتر میں منعقد ہوا۔ گلڈ کے سیکرٹری مسعود انور شفقتی نے مندرجہ ذیل قرارداد پیش کیں، جنہیں بالاتفاق رائے منظور کر لیا گیا۔

۱۔ پشاور رائٹرز گلڈ کا یہ اجلاس صدر فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خاں کی ادب پروری کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے کہ انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) کی سفارش پر پاکستان کے مشہور طنز نگار مرزا محمود سرحدی اور عمر رسیدہ شاعر حضرت جگر کاظمی (پشاور) کے وظائف مقرر کئے۔ یہ اجلاس صدر پاکستان سے استدعا کرتا ہے کہ ان وظائف کو مستقل صورت دی جاتے۔ یہ اجلاس کمشنر پشاور ڈویژن سے پر زور استدعا کرتا ہے کہ پشاور رائٹرز گلڈ کو دفتر کے لئے معقول جگہ مہیا کی جائے یہ جگہ مطربانغ کے فلیٹس یا پشاور کے میونسپلٹی کے دفتر میں دی جاسکتی ہے اجلاس میں کہا گیا کہ جس طرح دوسرے شہروں میں میونسپلٹی کی جانب سے دفتر وغیرہ کی مراعات گلڈ کو میسر ہیں اس طرح کمشنر صاحب پشاور شاخ کے لئے بھی ایسی جگہ فراہم کرکے ادب نوازی کا ثبوت دیں یہ اجلاس حکومت مغربی پاکستان سے استدعا کرتا ہے کہ ہسپتالوں میں شعرا و ادبا کو مفت طبی سہولیات دی جاتیں علاوہ ازیں سفری سہولیات بھی دی جاتیں۔ آخر میں بالاتفاق رائے منظور کیا گیا کہ شاخ کا حساب آسٹریلشیا بنک پشاور میں کھولا جائے۔

اورالائی میں گلڈ ڈے

ڈاکٹر رب نواز اورک زئی نے ۱۳ رجنوری کو ادبا و شعرا

کو ایک نمائندہ اجتماع بحیثیت ممبر پاکستان رائٹرز گلڈ بلایا۔ ڈاکٹر رب نواز اور کرک زئی نے نہ صرف پاکستان رائٹرز گلڈ کا منشور پڑھا۔ بلکہ اپنی تقریر میں اس ادارے کو پاکستانی ادبا و شعرا کا پاکستان گیر نمائندہ ادارہ اور ادبی ترقی کی روشن علامت قرار دیا۔ ڈاکٹر موصوف نے اپنی تقریر میں ادبا و شعرا سے اس "ادبی برادری" میں شمولیت کی اپیل کی اور گلڈ کے موسسین کی تاسیسی کوششوں کی تعریف بھی کی۔ علاوہ ازیں انھوں نے گلڈ کی ہمہ گیریت اس کی ادبی پیش رفت اور قلمی نہفت کو ادبی تاریخ میں قابل قدر کارنامہ قرار دیا اور اس ادارے سے اس مثبت امید کا اظہار کیا کہ اس ادارے کے ذریعے نہ صرف پاکستانی قلم کاروں پر کسی قسم کی سیاسی و سماجی قدغن حال اور مستقبل میں باقی نہیں رہے گی، بلکہ اس سے ادیبوں کی سماجی و معاشی حیثیت مسلم، حال و مستقبل محفوظ اور تخلیقی و فنی ترقی اعلیٰ پیمانے پر ممکن ہو سکے گی۔

ڈاکٹر موصوف نے اپنی تقریر کے آخر میں پاکستان رائٹرز گلڈ سے بھی اپیل کی کہ وہ ملک میں نبھنے والی مستقبل کی پارلیمنٹ میں ملک کے فنکاروں کے لئے "ہاؤس آف لارڈز" کے قیام کی کوشش کرے اور اس سلسلے میں ملک کے آئندہ آئین کی روشنی میں کام کرے۔ اس جلسے کی صدارت حافظ عبدالقیوم حافظ نے کی اور کارروائی سید احمد گوہر نے ڈائرکٹ کی۔ جلسے کا سامعین پر بڑا اچھا اثر ہوا اور انھوں نے گلڈ کو کامیاب بنانے میں امکانی امداد و تعاون اور غور و خوض کا ڈاکٹر موصوف سے وعدہ کیا۔

حلقہ مشرقی پاکستان

مغربی پاکستان کے ادیبوں کے اعزاز میں عصرانہ

ڈھاکہ ۸ ۲ مارچ ۱۹۶۲ء:۔ سید مہدی امام سکریٹری نشر و اشاعت دبستانِ فکر و نظر مطلع کرتے ہیں کہ کل دبستانِ فکر و نظر ڈھاکہ مغربی پاکستان کے ادیبوں کے اعزاز میں ایک عصرانہ ڈھاکہ وانڈررس کلب کے ہال میں ترتیب دیا۔ مغربی پاکستان کے ادیبوں میں ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، مولانا رازق الخیری اور شاہد احمد دہلوی کے نام قابل ذکر ہیں مقامی ادیبوں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، جناب محمد معز الدین، جناب اقبال عظیم، جناب ارشد کاکوری، جناب سید اظہر علی بجناب نظیر صدیقی، بیگم حمیرہ عبیداللہ جناب افسر ماہ پوری، جناب شبیر علوی وغیرہ نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی و کالجوں کے طلبا اور عمائدین شہر کی کافی تعداد موجود تھیں۔

بنگالی اکیڈمی کونسل کا اجلاس

پچھلے دنوں بنگالی اکیڈمی کونسل کا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کے گورنر جنرل اعظم خان نے کہا کہ اُردو اور بنگالی دونوں پاکستان کی سرکاری زبانیں ہیں اور انھیں ساتھ ترقی کرنی چاہئے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ اُردو بولنے والے حضرات بنگالی سیکھیں اور بنگالی بولنے والے اُردو،

دبستان فکر و نظر کی طرف سے افطار پارٹی و مشاعرہ

ڈھاکہ ۲۴ فروری ۱۹۶۲ء بروز شنبہ "دبستان فکر و نظر" نے پروفیسر ارشد کاکوی کے دولت کدے پر شعرا و ادبا، کالج یونیورسٹی کے طلبا، اساتذہ و عمائدین شہر کو ایک افطار پارٹی دی، افطار پارٹی کے بعد بزم شعر و سخن منعقد ہوئی جس کی صدارت ڈاکٹر عندلیب شادانی نے فرمائی۔ سب سے پہلے ذکی صدیقی صاحب نے اپنی نظم "آگ وہی ہے" پیش کی جس کا یہ بند بہت پسند کیا گیا۔

کتنی چاندنی پگھل گئی ہے
کتنا سونا دمک اٹھا ہے

پتھر میں بھی جان پڑی ہے
ٹھہرا پانی ہلک اٹھا ہے
دل کی لیکن پیاس وہی ہے
آگ وہی ہے

اس کے بعد نوشاد نوری صاحب نے اپنی نظم "پتھر کا ندا" پیش کی جو بہت پسند کی گئی۔ اس کے بعد جناب عیش برنی صاحب نے ایک غزل پیش کی جس کا یہ شعر بہت پسند کیا گیا:۔

ہم نے دیکھا مگر کبھی ہنستے ہوئے
تم جو چاہو تو یہ کام مشکل نہیں

عیش برنی کے بعد جناب اویس انجم نے بھی اپنی غزل پیش کی۔ اس کے بعد پروفیسر سید اظہر علی نے اپنی ایک طویل غزل مخصوص قدیم رنگ میں پیش کی

گھٹا جب چرخ پر چھایا کرے ہے ؛ وہ اکثر مجھ کو یاد آیا کرے ہے

اس کے بعد پروفیسر ارشد کاکوی نے اپنی غزل:۔

"چارہ گری کا بار اٹھانا چارہ گری سے مشکل ہے
راہ روی کی پوچھو تو یہ راہبری سے مشکل ہے"

پیش کی۔

اس کے بعد مضطرب صاحب نے اپنا کلام پیش کیا۔ اب افسر ماہ پوری صاحب سے کہا گیا۔ انہوں نے اپنی غزل تحت اللفظ میں پڑھی۔ افسر ماہ پوری صاحب کی غزل کا مقطع بے حد پسند کیا گیا اور بار بار پڑھنے کی درخواست کی گئی۔ آپ بھی محظوظ ہوئیے:۔

بس اتنا یاد ہے اک سانحہ سے دل پہ گذرا تھا
پھر اس کے بعد سے افسر ہنسی مشکل سے آتی ہے

پروفیسر نظیر صدیقی صاحب نے خلاف معمول ایک پوری غزل سنائی غزل کا آخری شعر آپ بھی سنئے:۔

یہ حیرت کیوں قیامت کیوں جو ہم آلودہ داماں ہیں
جہاں سب تھے وہاں آلودہ داماں ہو گئے ہم بھی

اس کے بعد عابد داناپوری نے ایک غزل پیش کی جس کے دو شعر بہت پسند کئے گئے:۔

بڑھتے رہے بساط پہ مہرے نئے نئے
کھلتے رہے زمانہ سے باتیں نئی نئی
ہر چند صحن باغ سے طائر الگ رہیں
صیاد سے ہی آتا ہے گھاتیں نئی نئی

آخر میں ڈاکٹر عندلیب شادانی نے متعدد غزلیں اور قطعات پیش کئے جو بہت زیادہ پسند کئے گئے:۔

Regd. S. No. 2410 Monthly HAM-QALAM Karachi March-April 1962.

Printed at the Central Printing Pres…

قلم


PIA
باکمال
لوگ
لاجواب
پرواز
نیویارک
لندن
جنیوا
بیروت
تہران
کراچی
پشاور
راولپنڈی
لاہور
دہلی
بمبئی
ڈھاکہ
چٹاگانگ
کلکتہ
رنگون

ماہنامہ

ہم قلم

جلد ۲ نمبر ۹

مئی ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)
سالانہ چندہ چھ روپے
(اراکین ادارہ مصنّفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

ادارۂ مصنّفین پاکستان
(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو اور وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

(پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر جمیل الدین عالی (سنٹرل ایگزیکیٹو سکریٹری) نے انجمن پریس کراچی سے شائع کیا)

اداریہ

گھر ہونے تک

منصوبے کے مطابق مئی میں گلڈ کے تمام انتخابات مکمل ہو جانے کی اُمید ہے۔

یہ دو سالہ انتخابات پہلے علاقائی بنیاد پر ہوتے ہیں یعنی ہمارے تین حلقوں میں گیارہ گیارہ اراکین خفیہ رائے شماری کے ذریعے چُنے جاتے ہیں جو اپنا اپنا معتمد اور خازن چن لیتے ہیں۔ پھر ان علاقائی منتظمہ کمیٹیوں کے ۳۳ اراکین اور سابقہ مرکزی عاملہ کے پچیس اراکین مل کر ایک اجلاس عام کی شکل میں دو سالہ کارگزاریوں، کوتاہیوں اور اگلے منصوبوں پر غور و خوض کرنے کے ساتھ پچیس اراکین پر مشتمل ایک مرکزی منتظمہ ایک خازن اور ایک معتمد عام (سکریٹری جنرل) منتخب کرتے ہیں۔

ہمارے پہلے انتخابات ادیبوں کے پہلے کنونشن میں گلڈ کے وجود میں آنے کے ایک گھنٹے بعد ۳۱ رجنوری ۱۹۵۹ء کو منعقد ہوئے تھے مگر یہ عبوری دور کے لئے تھے اور دستور میں ایک دفعہ رکھی گئی تھی کہ اگر باقاعدہ انتخابات ڈیڑھ برس کے اندر اندر نہ ہوئے تو گلڈ از خود ختم ہو جائے گا۔ اصل میں دستور ساز اراکین یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ گلڈ کی تحریک اگلے سالوں میں کیا شکل اختیار کرتی ہے اور اس کے بانیوں میں واقعی ادب اور ادیب کی بہبود کے لئے کتنے گہرے اور دیرپا جذبات ہیں۔ جو کچھ گذرا سب نے دیکھ لیا اور اور سب نے اس میں عملی حصہ بھی لیا۔

مارچ سے اپریل ۱۹۶۱ء تک حلقوں میں اور پھر ۲۴ راپریل مرکزی اجلاس لاہور میں اختتام پذیر ہوئے اور اب یہ دوسرے باقاعدہ انتخابات کا زمانہ ہے

حالیہ اور گزشتہ انتخابات کے تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ رائے دہندگی کا اوسط ساٹھ سے ستاون فیصدی رہا ہے اور مزید تحقیق سے ظاہر ہوتا ہے کہ چونکہ کراچی کے علاوہ دیگر علاقوں میں انتخاب بذریعہ ڈاک ہوئے ہیں جہاں اراکین ایک خاصی تعداد میں کاروباری اور پیشہ ورانہ ضروریات کے تحت بدلتے رہتے ہیں (اور یہ حضرات نئے پتے بدلتے میں محتاط نہیں ہوتے) یا دَوروں پر ہوتے ہیں اس لئے رائے شماری میں ضروری دلچسپی کا اظہار نہیں کرنے پاتے۔ ابھی مغربی پاکستان میں ۱۶۸ اراکین میں سے ۱۲۱۸ اراکین نے رائے شماری میں حصہ لیا اس کا اوسط ۸۰ فیصدی ہوتا ہے یہ سب متعلقہ بلکہ غیر متعلقہ اداروں کے لئے ایک نہایت مبارک فال ہے۔

بد دماغی سے سوچنا تو الگ بات ہے کون کس طرح نہیں سوچ سکتا لیکن اس انتشار اور خلفشار میں مبتلا دنیا میں ادیبوں کا کسی قسم کے انتخابات میں بھی حصہ لینا یہ ثابت کرتا ہے کہ سخت سے سخت انفرادیت پسند افراد اور طبقے بھی اپنے مسائل پر اجتماعی سوچ بچار اور عمل کے لئے آمادہ ہو گئے ہیں۔

گلڈ کو فخر ہے کہ اس نے اس برصغیر میں پہلی بار ایک ایسے معاملے میں انتخابی طرز عمل کی بنا ڈالی جو گزشتہ صدی تک تو سرکار دربار کی توجہ سے بنتا بگڑتا تھا اور اس کے بعد یا نوکر شاہی کے طنطنے سے مرعوب رہتا تھا یا یک رُخی جماعت بندی کا شکار ہو جاتا تھا۔ ابھی چند برس پہلے اس ملک میں کوئی وقیع ادبی یا ثقافتی ادارہ افسران بالا کی مستقل سرپرستی بغیر نہیں چل سکتا تھا جن کی نگہ انتخاب "معاملات" میں کسی جمہوری کارروائی مشورت یا دباؤ کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ یہ کیفیت آج بھی بہت سے اداروں میں جاری ہے مگر گلڈ نے ایک ایسی روایت پیدا کر دی ہے جس کے اثرات آہستہ آہستہ ہر جہت میں نمایاں ہو رہے ہیں اور ایک دن ہمارے ثقافتی اداروں کی ہیئت و فضا میں نہایت دوررس اور خوشگوار تبدیلیوں کا باعث ہوں گے۔

صرف اکابر کے دباؤ سے متاثر ثقافتی ادارے ایک طرف تو بہت سے خوددار بد دماغ اہل علم و فن کی عملی شرکت اور ان کے گوناگوں فوائد سے محروم رہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے طریق کار اور انداز نظر یکسانیت اور جمود کے شکار ہو جاتے ہیں اور ان کا دائرہ عمل و اثر وسیع نہیں ہونے پاتا۔ بڑے پیمانے پر انتخابی ہیئت تشکیل ان امراض کو قریب نہیں آنے دیتی اور سب سے زیادہ اہم یہ امر ہے کہ وہ اجارہ داری کے خطرناک رجحان کو سختی سے دبا دیتی ہے جو انسانی فطرت ایک بڑی کمزوری ہے۔ افسوس کہ اس پورے برصغیر کی طرح ہمارے ملک میں بھی ایسے افراد اور ادارے تقریباً ناپید ہیں جو فنون لطیفہ کو حکومتوں کی احتیاج سے بے نیاز کر دیں نتیجتاً تقریباً تمام ثقافتی ادارے مالیاتی طور پر مدت دراز تک حکومتوں کے محتاج رہے ہیں اور یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں کسی قسم کی امداد بھی ڈھکے یا چھپے ایسے اثرات اور دباؤ اپنے جلو میں لا سکتی ہے جو اس شاخ فن اس علم اس مقصد سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے جس کے لئے امداد آئے بلکہ وہ بسا اوقات دانستہ یا نادانستہ اصل مقاصد سے متخالف حالات پیدا کر دیتے ہیں۔ مدتوں خود ہمارے ہاں آرٹ اور زبان اور ادب کو وزیروں اور بڑے افسروں کی سرپرستی صرف اس لئے نصیب رہی کہ وہ فقط اپنے عہدوں کی بنا پر متعلقہ اداروں کو مالی فائدے پہنچا سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ انسانی کمزوریوں اور احساس اقتدار کے سبب یہ حضرات یک نظری، ذاتی پسند ناپسند اور دل آزاری کے مرتکب ہو کر بنیادی اغراض و مقاصد کو بھول جانے کے علاوہ اداروں کو کی اور ترقی پسند بننے اور ان کے فوائد کو پھیلنے سے روک دیتے تھے۔ ہماری عام اقتصادی ابتری سونے پر سہاگہ ہے جو ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم کسی علم کسی فن کے بہانے اہل اقتدار سے قربت حاصل کر کے انہیں اپنے ذاتی فوائد کے لئے استعمال کریں یا کم از کم ان کی ناخوشی مول نہ لیں۔ لہٰذا ہم بہت کچھ جاننے کے باوجود بھی کوئی مؤثر احتجاجی یا اصلاحی اقدام نہیں کر سکتے۔ ان سب مجبوریوں کے علاوہ ایک صحت مندانہ رویہ بھی سد راہ رہتا ہے اور وہ یہ ہے

کہ اس ریگ زار میں یہ دو چار نخلستان جو نظر آتے ہیں کہیں یہ بھی برباد نہ ہو جائیں۔

یہ صورت حال افسوسناک ہے مگر ہماری تہذیبی زندگی کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے اور ہمیں تمام ان مجبوریوں تمام دشواریوں اور تمام "حقیقتوں" کے ساتھ ساتھ مسائل کو بہتر سے بہتر طور پر حل کرنا ہے۔ اس حل کے لئے ایک عملی تربیت گلڈ نے کی ہے آج گلڈ کا سب سے بڑا عہدہ دار یقیناً ایک اعلیٰ سرکاری عہدے دار ہے مگر وہ نہ صرف ایک لکھنے والا ہے بلکہ کئی شائع شدہ اور زیر اشاعت کتابوں کا مصنف بھی ہے۔ اگر ہمارا موجودہ سکرٹری جنرل مصنف نہ ہوتا تو ممکن ہے کسی اور بہت بڑے کارنامے کا سہرا اس کے سر باندھا جاتا مگر وہ گلڈ کا اعلیٰ عہدیدار منتخب نہیں ہو سکتا تھا اور ہمیں یقین ہے کہ گلڈ اپنی یہ مقدس روایت ہمیشہ قائم رکھے گا۔

پہلے دو سال میں ہمارے علاقائی سکرٹری مندرجہ ذیل رہے

کراچی	(i) ابن سعید	(چند ماہ)
	(ii) طفیل احمد جمالی	
لاہور	اشفاق احمد	
ڈھاکہ	متین الدین احمد	

دوسری میقات میں

کراچی	طفیل احمد جمالی
لاہور	سید وقار عظیم
ڈھاکہ	ڈاکٹر انعام الحق ۔ ڈاکٹر مطاہر حسین

یعنی گزشتہ ساڑھے تین سال میں ہمارے آٹھ اہم ترین عہدے داروں میں سے صرف ایک سرکاری ملازم (وہ بھی چند ماہ کے لئے) یعنی ابن سعید اور دوسرے پنشنر یعنی متین الدین احمد تھے باقی حضرات پیشے کے اعتبار سے صحافی ادیب اور ادب کے اساتذہ تھے۔ اس بار لاہور میں اب تک عہدیداروں کے انتخابات مکمل نہیں ہوئے مگر کراچی کے معتمد شاہد احمد دہلوی منتخب ہوئے ہیں جو ایک آزاد ادیب اور بزرگ ہیں۔ اس کے علاوہ ہماری حلقہ جاتی اور مرکزی منتظمہ میں غالب اکثریت غیر سرکاری ملازمین کی رہی ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ادیبوں کی برادری میں سرکاری ملازم کا شامل ہونا منع یا ناپسندیدہ ہے۔ ہمارے ہاں ادب کو باقاعدہ پیشے کی حیثیت اختیار کرنے میں ابھی بہت دن لگیں گے اور اس کے بعد بھی کسی کی تخلیقی صلاحیتوں کو کسی مخصوص پیشے کی عینک سے دیکھنا غلط ہوگا۔ فی الحال ان گذارشات کا مطلب یہ ظاہر کرنا ہے کہ گلڈ کے انتخابی طریق کار نے اہم عہدوں کے لئے معیار انتخاب اہلیت کار بنا دیا ہے نہ کہ آمدنی یا عہدہ یا دیگر اسباب وجاہت۔ ان خصوصی عناصر کے ساتھ ساتھ ہمارے ہاں ہر مسلک کے ادیبوں کو مل جل کر سوچنے کے مواقع بھی اس طریق انتخاب کی وجہ سے میسر آئے ہیں اور تجربات سے ثابت ہے کہ ان مواقع نے نہ صرف

انھیں ایک دوسرے کے موقف سمجھنے اور اندازِ فکر کو سمجھنے میں مدد دی ہے بلکہ بڑی حد تک ایک دوسرے سے عدم واقفیت بیزاری بلکہ کہا جا سکتا ہے منافرت کی خلیجیں بھی پاٹ دی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہماری مختلف زبانوں کے مشاہیر کو (جو ایک دوسرے سے ناواقف رہتے تھے) ایک دوسرے سے واقف اور وابستہ کرا دیا ہے۔

ہمارا طریقِ کار ان دوستوں بزرگوں اور خاص طور اور ہر اکابر و افاسرہ کے لئے ایک شمعِ ہدایت ہے جو اپنے خول سے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ یہی نسخہ علوم و فنون کے دوسرے شعبوں میں بھی آزمایا جا سکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس سے انھیں بے شمار فوائد حاصل ہوں گے اور وہ اپنے مضمون یا شاخِ فن کے ماہرین کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی عملی معاونت حاصل کر سکیں گے۔

اس انتخابی طریقِ کار کے ساتھ ساتھ وہ نقصانات بھی ہمارے حصے میں آئے ہیں جو جمہوری طرزِ زندگی کے ابتدائی عمل سے پیدا ہونے لازمی ہیں۔ بہت سے مخلص اور اہل الرائے لوگوں نے محسوس کیا ہے کہ گلڈ کی بعض منتظمہ کمیٹیوں میں بہت سے اچھے اور مشہور ادیب اپنی گوشہ نشینی اور ہمت آزمائی نہ کرنے کے سبب منتخب نہیں ہونے پاتے اور جو نسبتاً کم مشہور لوگ دوڑ بھاگ کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر لیتے ہیں وہ کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس بات میں واقعیت موجود ہے مگر ہم کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ ہماری مجالسِ منتظمہ کو بنیادی طور پر ایسے مستعد کارکنوں کی ضرورت ہے جو ادب کے نام لیوا ہوں صرف بڑے ادیبوں کی ضرورت نہیں جو اپنی افتادِ طبع یا دیگر حالات کی بنا پر ادارے کی ذمہ داریاں پوری نہ کر سکیں۔ اگر ایسا ممکن ہوتا کہ ہمارے بہترین دماغ اپنے ادارے کے لئے جمہوری اقدار کی عملی محنت کوششوں سے گزرتے ہوئے ہماری منتظمہ کمیٹیوں میں شامل ہو جاتے تو یقیناً یہ ایک آدرشی صورتِ حال ہوتی مگر سو فیصدی ایسا ہونا ممکن نہیں۔ کسی ملک میں بھی ایسا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ ہمارے کارکن ہماری کمیٹیاں ہمارے عہدے دار اسی مقصد اسی غرض کے لئے کام کرتے ہیں جس کے نام لیوا وہ بڑے لوگ بھی ہیں۔ ہمارا مقصد ادب اور ادیب کی منزلت ہے اور ہماری ہر کوشش کا فائدہ براہِ راست ہمارے اکابر ادبا کو زیادہ پہنچتا ہے کیونکہ ان کا استحقاق پہلے ہی محتاجِ تسلیم نہیں۔ مزید برآں ہم نے کبھی یہ دعوے بھی نہیں کیا کہ ہمارے عہدیداروں کا ادبی مقام ان کے عہدوں کے اعتبار سے معین کیا جائے۔ ادب کی محفل میں وہ ہمیشہ اپنی اپنی اہلیت کے مطابق جگہ پاتے رہیں گے۔ اور اس میں کلام نہیں کہ ان میں سے اکثر و بیشتر اپنے ادبی کارناموں کی وجہ سے پہلے سے اعلیٰ مراتب کے حامل ہوتے ہیں۔

ہمارے اس جمہوری نظام میں چند دیگر معائب بھی ہیں جن سے ہم انکار نہیں کر سکتے۔ مثلاً ہمارے دستور میں ادیب کی واضح تعریف نہ ہونے سے (جو کسی دستور میں نہیں ہے) ہماری صفوں میں کم ادیب بلکہ بقول چند غیر ادیب بھی کچھ نہ کچھ لکھ لکھا کر شامل ہو گئے ہیں اور ان کا ووٹ ہماری منتظمہ کے انتخابات میں اکابر کے ووٹ جیسا ہی گنا جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری رکنیت سازی کا طریقہ کچھ ایسا ہے کہ کسی کے سیاسی یا مذہبی خیالات کی بنا پر اسے مسترد نہیں کیا جا سکتا جس کے نتیجے میں ایسے ادیب بھی ہمارے رکن

ہو گئے ہیں جو کسی وقت بھی اپنے غیر ادبی اعتقادات و مسالک کے باعث مجبور ہو کر ہماری تنظیم میں مختلف طریقوں سے انتشار پیدا کر سکتے ہیں۔ یقیناً ہمیں بارہا نہیں تو کبھی کبھی ایسی ناگہاں صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا تصور بھی ادیبوں کی محفل میں نہیں آ سکتا مثلاً ہمارے یہاں اکا دکا ایسے معاملات پیش آئے ہیں جب ہمارے کسی رکن نے ادارے کے کسی اہم پروگرام میں صرف اپنے ذاتی اختلاف رائے کی بنا پر قانونی رکاوٹ ڈالنے کی دھمکی دی ہو۔ ہمارا دستور کافی پیچیدہ اور کہیں کہیں تکلیف دہ حد تک مبہم ہے اور ہمارے سبھی کارکن اور کارکن اور عہدیدار ماہرین قانون نہیں ہوتے چنانچہ بعض اوقات ایسے معاملات پیش آ جاتے کہ کوئی بھی رکن عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا کر اچھے خاصے پروگراموں کو کم از کم معرض التوا میں ڈال سکتا ہے اس بار مغربی پاکستان میں یہ صورت حال پیش آتے آتے رہ گئی تھی اور مشرقی پاکستان میں پیش آ گئی ہے گو اسباب مختلف ہیں۔ وہاں ایک رکن نے عدالت کے ذریعے ہمارے مجوزہ علاقائی انتخابات ملتوی کرائے ہیں ان کا موقف یہ سنا جاتا ہے کہ دستور کے مطابق جن ادیبوں نے چندہ ادا کیا ہو وہ از خود رکنیت سے خارج ہو جاتے ہیں جبکہ دوسرا رخ یہ ہے کہ اراکین مرکزی عاملہ کی سفارش پر سکریٹری جنرل نے دستوری اختیارات خصوصی سے کام لیتے ہوئے پورے پاکستان میں سالانہ چندے کی ادائیگی کے لئے مزید سہولتیں فراہم کرنے کا فیصلہ کر دیا تھا جس کا بڑا مقصد یہ تھا ہمارے نمائندوں کے انتخاب میں زیادہ سے زیادہ اراکین کو شرکت کا موقع ملے تاکہ اگلی میقات میں کام کرنے والوں کو اراکین کی اکثریت کا تعاون حاصل رہے۔ بہرحال چونکہ یہ معاملہ عدالت کے زیر غور ہے اس لئے اس کے حسن و قبح پر تبصرے کی گنجائش نہیں لیکن اس قضیے کا ایک پہلو یہ ہے کہ مشرقی پاکستان میں ہمارے انتخابات دو بار ملتوی ہو چکے ہیں اور مرکزی اجلاس علاقائی انتخابات کے بغیر منعقد نہیں ہو سکتا اور اسی میں مرکزی انتخاب ہوتا ہے یہ تمام صورت حال صرف ایک موقف کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں اعزازی کارکن مخلصین جس ذہنی اذیت اور ادارہ جس مالی نقصان سے گزر رہے ہیں وہ ہماری تاریخ کا ایک المناک باب ہوگا مگر اسی کے ساتھ ساتھ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ہمارے ہاں اپنے معاملات میں کسی قسم کے دباؤ سے کام نہیں چل سکتا اور ہماری ہیئت تشکیل نہایت جمہوری اور آزادانہ بنیادوں پر قائم ہو چکی ہے۔ ہم اس صورت حال کو جملہ تکالیف کا نعم البدل سمجھتے ہیں اور بہتر حالات کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہاں اب وقت آ گیا ہے کہ ہم دستوری طور پر ادارے میں ڈسپلن کے ضوابط بنائیں تاکہ ہمارے وسیع تر مفادات کو بار بار نقصانات نہ پہنچ سکیں۔

گلڈ کم از کم مضبوط اصولی بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے اور اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ صرف ایک ہے اور وہ ہیں اس کی مالیات جن کے لئے وہ اب بھی تمام تر سرکاری امداد کا محتاج ہے۔ سرکاری امداد لینا ہم دیگر قومی اداروں کی طرح اپنا حق سمجھتے ہیں۔ حکومت ہمارے ہی محاصل کی حامل ہے اور اس کا فرض ہے کہ وہ گلڈ جیسی فلاحی تحریک کی ہر ممکن خدمت کرے لیکن ایک تو یہ بات یقینی نہیں کہ ہر حکومت گلڈ کو ہر حالت میں کافی امداد دے گی کیونکہ ملک کے چند بااثر افراد و طبقے آج بھی گلڈ کے وجود تک کو ناپسند کرتے ہیں اور آج نہیں تو کبھی نہ کبھی اسے ختم کرنے کی مؤثر کارروائی کر سکتے ہیں

دوسرے خود گلڈ کے کام اس حد تک پھیل گئے ہیں کہ موجودہ گرانٹ نہایت ناکافی ثابت ہو رہی ہے اور بعض اوقات حکومت ہمارے لئے بہترین خواہشات کے باوجود اپنی محدودات کی وجہ سے ہمارے مالی مطالبات پورے نہیں کر سکتی۔ ان تمام جزویات کو سامنے رکھ کر ہماری مرکزی عاملہ نے فیصلہ کیا کہ گلڈ بڑے پیمانے پر چھاپے خانے قائم کرے تاکہ ان سے ایک اچھی آمدنی کی صورت نکل آئے۔ اس طرح ہم حکومت کے لئے مستقل بار بھی نہ رہیں گے اور کاروبار کی وجہ سے خود مکتفی ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے پیمانے پر بہترین ادب اور دوسری مفید تخلیقات کو عام کر سکیں گے۔ چھاپے خانے کا منصوبہ نہایت پیچیدہ، مہنگا اور کار طلب ہے لیکن اگر ہم استقلال سے کام کرتے رہے تو انشا اللہ ایک دن یہ مہم بھی سر ہو جائے گی۔ ہم صدر مملکت کے نہایت ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری تیسری سالگرہ پر اپنے پیغام میں واضح طور پر اس منصوبے کی تائید فرمائی اور اس کے بعد بھی ہمارے کارکنوں سے عملی امداد کا وعدہ کیا ہے۔

اب کہ دو برس کے لئے ہماری تشکیل نو ہو رہی ہے لازم ہے کہ اپنے نئے اراکین منتظمہ اور عہدیداروں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے پرانے کارکنوں کی خدمت میں ہدیہ تشکر پیش کریں۔ یہ کارکن ہماری تینوں علاقائی کمیٹیوں اور ذیلی علاقائی کمیٹیوں کے رکن اور عہدیدار ہیں جنھوں نے دو برس ایک فلاحی تحریک کے انتہائی دشوار ابتدائی دور میں بڑی محنت اور خلوص سے کام کیا۔ اداروں کا کام مختلف شعبوں میں بٹا ہوا ہوتا ہے سبھی لوگ فائلوں پر کام نہیں کرتے اور ان حضرات کے کام کی اہمیت کم نہیں جو بار بار اپنی عاملہ کی مجلسوں میں شریک ہو کر مختلف مسائل پر بحث و مشاورت کرتے ہیں اور بعد میں مشترکہ فیصلوں کی حمایت میں بعض اوقات اپنے قریبی احباب کو بھی ناراض کر لیتے ہیں۔ مل جل کر کام کرنے کا نعرہ لگانا الگ بات ہے اور واقعی مل جل کر کام کرنا اور بات۔ یہ بات وہی جانتے ہیں جنھوں نے اداروں میں کام کیا ہو اور نئی عاملہ کمیٹیوں کے اراکین پر بھی اپنے پیشروؤں کی قدر و قیمت اسی وقت واضح ہوگی جب انھیں خود وہی ذمہ داریاں سنبھالنی پڑیں گی۔ گلڈ کی منفرد خصوصیات کے سبب یہاں کام دشوار تر کیونکہ یہاں ادیبوں کو مختلف الخیال اور مختلف اللسان جماعت میں کام کرنا پڑتا ہے۔ ایک منتظمہ کے چند اراکین کسی مکتب خیال کے ہیں تو چند کسی اور کے۔ بعض اوقات ان لوگوں کو شانہ بشانہ کام کرنا پڑتا ہے جو ایک دوسرے ملاقات کے روادار بھی نہ تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھیں دوسری زبانوں کے اراکین سے بھی واقفیت حاصل کرنی پڑتی ہے جن سے اب تک ان کا کوئی واسطہ نہ تھا اور یوں انھیں زیادہ دشواریاں پیش آئی ہیں مگر ان سب عوامل کے نتیجے میں ان کا فکری حلقہ وسیع تر ہو جاتا ہے ان میں مسائل سے بڑی سطح پر عہدہ برآ ہونے کی عادت پڑ جاتی ہے اور ان کی رائیں اور فیصلے وقیع تر اور مفید تر ہو جاتے ہیں۔

ہمارے عہدے دار کوئی مشاہرہ نہیں پاتے نہ کسی قسم کے سرکاری مناصب سے سرفراز کئے جاتے ہیں بلکہ ان کے حصے میں کبھی کبھی تو حسد، طعن تشنیع، اعتراض اور نا قبولیت کا "خراج تحسین" بھی آتا ہے۔ وہ اپنا نہایت بیش قیمت وقت فائلوں، دوڑ بھاگ، مجالس، بحث مباحثے اور "تعلقات عامہ" پر صرف کرتے ہیں اور

اور ہر ادیب ان کی ہر بات سے مطمئن نہیں ہو سکتا اور ہمارے مزاج میں ہر دوسرے آدمی کی پگڑی اچھالنا
ایک جزو طبیعت ہے اس لئے ہم ان کا خلوص ان کی مشقت ان کی خدمت بھول جاتے ہیں اور انھیں طرح طرح
برا بھلا کہتے ہیں بلکہ اگر جی چاہے تو دو چار اتہام بھی تراش دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک بنتی ہوئی قوم کے
اجزائے تشکیل کو ناپختگی خود غرضی غیر ذمہ داری جیسی ہزاروں دشواریوں سے ٹکرانا پڑتا ہے اور اسی چکی
میں ہمارے ادارے کو بھی پسنا پڑا اور اب تک پسنا پڑتا ہے مگر یہ شعور بجائے خود اس بدمزگی کھولن اور
نزاکت احساس کو پہنچنے والے بے شمار صدمات کا تریاق نہیں جن سے ہمارے خالص رضاکار عہدیداروں
کو گزرنا پڑتا ہے۔ آخر وہ انسان ہیں اور گلڈ کوئی ایسی شدید مذہبی یا سیاسی تحریک نہیں جس کے لئے سب
کے سب ادیب دیوانہ وار اپنا سب کچھ بھول کر تن من دھن کی بازی لگا دیں اور دو برس تک ایک سے
جوش و خروش کی کیفیت میں مبتلا رہیں۔

ان عوامل کے پیش نظر ہمارے وہ عہدے دار وہ کارکن جو اب تک منتظمہ کمیٹیوں کے رکن رہے
بڑی قدر و منزلت کے مستحق ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم کھل کر ان کا شکریہ ادا کریں۔ گلڈ ان کی خدمات
کے جواب میں انھیں کچھ پیش نہیں کر سکا لیکن گلڈ کی تاریخ یہ کبھی فراموش نہیں کرے گی کہ ابتدائی دور
میں اگر ڈاکٹر قاضی معاہر حسین اشرف الزماں خاں سید وقار عظیم، احسان دانش، طفیل احمد جمالی اور انور نے
بے شمار مشکلات سے جنگ نہ کی ہوتی بے شمار حملے نہ سنبھالے ہوتے تو شاید یہ ادارہ کئی برس اور نہ پنپتا۔ ان
حضرات میں سے نہ کوئی صاحب ہمارے کسی 'وفد' میں بیرون ملک گئے نہ ان میں سے کسی کو کوئی ادبی انعام
یا ادبی خطاب ملا نہ کوئی وظیفہ نہ کوئی سرکاری اعزاز۔ ان میں سے کسی نے گلڈ کو یا گلڈ کے کسی عہدیدار
کی سفارش کو ذریعہ آمدنی یا ذریعہ ترقی بنایا نہ انھوں نے اپنے عہدوں کے ذریعے ادبی چودھراہٹ قائم
کرنے کی کوشش کی۔ اُردو جاننے والوں کے لئے ڈاکٹر قاضی معاہر حسین اور اشرف الزماں کے نام شاید
نئے ہوں۔ یہ صاحبان مشرقی پاکستان میں (بالترتیب) ہمارے معتمد اور خازن رہے ہیں۔ سید وقار عظیم
جس طرح اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود گھر گھر اور قریے قریے گھوم کر سب کو ایک دوسرے کے قریب
لائے وہ بڑی جاں کاہی کا کام تھا۔

ہمارا کام اواریوں کے ذریعے ادبی خطابات تقسیم کرنا نہیں ہے مگر نا سپاسی ہوتی اگر ہم ان
کارکنوں کی خدمات کا اعتراف کھل کر نہ کرتے۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ حضرات گلڈ کی رکنیت برقرار رکھنے
کے ساتھ ساتھ گلڈ کے معاملات سے اپنا تعلق حسب سابق برقرار رکھیں گے۔

ہمارے مرکزی کارکنوں میں مرکزی عاملہ کے اراکین شامل ہیں جو متعلقہ علاقائی عاملہ کمیٹیوں کے
ساتھ مل کر کام کرتے رہے۔ ان خواتین حضرات نے گلڈ کو مضبوط اور مقبول بنانے میں خاموشی سے جو کام کئے ہیں
ان کی اہمیت کسی طرح کم نہیں۔ مرکزی عاملہ کے اراکین کا سب سے اہم فرض گلڈ کی پالیسی بنانا اور ہمارے
مختلف دفاتر سے اس پر عمل کرانا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے سب سے بڑا کام یہ کیا ہے کہ مشرقی اور
مغربی پاکستان کے لسانی اختلافات کی خلیجیں کم از کم ادب کی سطح پر پاٹ دی ہیں۔ نئے مرکزی انتخابات

کے بعد ہم کسی اشاعت میں حالیہ مرکزی نامزدگیوں کی فہرست شائع کریں گے جس سے پتہ چلے گا کہ عام طور پر مغربی پاکستان کے ادیبوں کی نامزدگیاں مشرق سے آئیں اور اسی طرح بہت سے بنگلہ ادیبوں کی تجویز و تائید مغرب کے ادیبوں نے کی۔ ہمارے ملک کی تاریخ میں یہ ایک عجیب و غریب مثال قائم ہوئی ہے جس کے بے شمار فوائد کو اہل نظر خود دیکھ سکتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ہماری تنظیم میں سب سے اہم عہدہ سکرٹری جنرل کا ہے۔ جو اس وقت قدرت اللہ شہاب ہیں۔ اس بار دستور کے مطابق ان کے عہدے کی میعاد ختم ہوتی ہے اور تا وقتیکہ دستوری ترمیم نہ کی جائے وہ سکرٹری جنرل نہیں رہیں گے۔ دستوری ترمیم کا مجاز صرف مرکزی اجلاس عام ہے۔ جو علاقائی اور مرکزی منتظمہ کے اراکین پر مشتمل ہے۔ اس سال ڈھاکے کے اجلاس میں ہماری مرکزی منتظمہ نے قدرت اللہ شہاب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے تجربے اور افادیت کے پیش نظر ایک اور میقات کے لئے سکریٹری جنرل رہیں اور شہاب صاحب نے معاملہ مرکزی اجلاس عام کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

ہمیں معلوم نہیں کہ وہ اگلی میقات کے لئے سکریٹری جنرل رہیں گے یا نہیں لیکن چونکہ ہم قلم مرکز کی تحویل میں آگیا ہے اور وہ مرکز کے سربراہ ہیں اس لئے ہم ان کا شکریہ اور توصیف مناسب نہیں سمجھتے۔ کام اپنا انعام خود ہوتا ہے اور ہمیں بھروسہ ہے کہ تاریخ ان کی قرار واقعی قدر دانی کرے گی۔ ان کے بارے میں اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ عام اراکین کو آج گلڈ کی درخشاں کامیابیوں کے پس منظر میں ان کی مشکلات کا ذرہ برابر اندازہ نہیں اور اس وقت تک نہ ہو سکے گا جب تک بہت سے اہم واقعات منظر عام پر نہ آئیں۔

ایک تنظیم کی ہیئت تشکیل میں جو اہمیت دفتر کی ہوتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ ہمارا مرکز اعصاب ایک پھیلتی ہوئی طاقتور تنظیم کا دفتر ہے جو ایک ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے سے گزرتا ہوا ایک وسیع احاطے میں منتقل ہوگیا ہے۔ ہماری سالانہ خط و کتابت کا شمار چار ہزار خطوط سے اوپر ہے ہمیں تین حلقوں اور متعدد ذیلی حلقوں اور مختلف مسائل سے دوچار اراکین اور یونیسکو اور مرکزی اور صوبائی حکومتوں اور غیر ملکی اداروں اور افراد سے ہر وقت رابطہ رکھنا پڑتا ہے۔ اس پھیلاؤ سے کام میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے جس کا بوجھ دو تین تنخواہ دار کارکن نہیں اٹھا سکتے۔ ہمارے دفتر کے اعزازی کارکنوں میں ابن انشا کا نام سب سے پہلے آتا ہے جو ڈیڑھ برس پہلے صرف شعر کہتے تھے اور اب مرکزی خازن ہیں اور بہی کھاتے لکھتے ہیں۔ انھیں روز شام کو دو تین گھنٹے محنت شاقہ کرنی پڑتی ہے اگر راقم الحروف اس سے بھی مطمئن نہیں) اور ہمارے پیچیدہ حسابات کے ساتھ ساتھ حلقوں اور ذیلی حلقوں کے خازنوں اور محاسبوں سے روز کے حسابی معاملات و اختلافات طے کرنے پڑتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بہت سے دوسرے مرکزی معاملات کے ذمے دار بھی ہیں اور چند ماہ جب راقم الحروف باہر تھا اس کی ذمہ داریوں کا بار بھی اٹھاتے رہے۔ جو لوگ گھر بیٹھ کر ہر بات پر اعتراض کرنے کے عادی ہوں وہ اس شخص کی کیفیت نہیں سمجھ سکتے جس کی شامیں مستقل حرام ہو گئی ہوں جس پر ایک نرم طبیعت اور شاعرانہ

زندگی اور اسکے احتجاج کے باوجود حساب کتاب کا بوجھ لاد دیا گیا اور جس پر مرحوم منتظمہ کے اراکین اور حکومت کے حاسبین مسلط رہتے ہوں اور جیسے ان سب ذمہ داریوں کی وجہ سے شعر گوئی کی نعمت سے قریباً محروم ہونا پڑے اس بات پر ان اہل انا کو ہنسی بھی آسکتی ہے جو ابنِ انشا کو مانتے ہی نہ ہوں مگر انصاف شرط ہے۔

ہمارے دوسرے اہم مرکزی اعزازی کارکن سید احمد رفعت ہیں جو یہاں آنے سے پہلے ریڈیائی ڈراموں کے ذریعے خاصے متعارف رہ چکے ہیں مگر اب ہمارے فائلوں سے سر پھوڑتے رہتے ہیں۔ ہم نے سنا ہے کہ تقریباً ایک سال سے انھوں نے کوئی نیا ڈرامہ نہیں لکھا ۔ امید ہے کہ جب تک گلڈ میں رہے کچھ لکھ سکیں گے ؟۔

دیوں کا یہ گلڈ ایک طلسمات ہے کہ جو ادیب یہاں کام کرنے آتا ہے وہ اس کے مسائل سے اتنا وابستہ اور ان میں اتنا اُلجھ جاتا ہے کہ ادب کا نہیں رہتا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دن میں اپنی ملازمتوں میں مصروف رہتے ہیں اور شام سے لے کر رات گئے تک گلڈ میں کام کرتے ہیں ۔ سوچنے اور لکھنے کا وقت کہاں سے ملے ۔

ان کے علاوہ بہت سے شہروں میں ہمارے جزوقتی رضاکار ہیں جن میں طالب علم بھی شامل رہے ہیں ۔ یہ ہمارے ایسے محسنین ہیں جن کا پورا شکریہ ہم کبھی بھی ادا نہ کرسکیں گے ۔ یہ ہماری آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہمارے ایسے مشکل انتظامی کام انجام دیتے ہیں جن پر بصورت دیگر ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑیں ۔

ہم آدم جی ادبی انعام کے ججوں کے خاص طور پر ممنون ہیں جنھوں نے اس ملک کی ایک عظیم روایت قائم کرنے میں ہماری مخلصانہ معاونت کی ہر سال ان ججوں کو تین ماہ کی مدت میں پچاس ساٹھ خاصی ضخیم اور اہم کتابیں پوری ذمے داری کے ساتھ پڑھنی پڑیں اور اس کے بعد اپنے انتخابی فیصلوں کے سبب چند احباب اور چند حلقوں میں معتوب بھی ہوئے ۔ ادب کی دُنیا میں کوئی انعامی فیصلہ سو فی صدی مقبول نہیں ہوتا نہ ہوسکتا ہے ۔ نوبل انعام پلیٹزر انعام ۔ ہندوستانی ساہتیہ اکادمی کے انعامات موہام ایوارڈ اور گنکورٹ انعام پر سالانہ تبصرے چھینٹے اور جھگڑے اس بیان کے شاہد ہیں ۔ لیکن چونکہ ہمارے ملک میں اس پیمانے پر ادبی انعام کی روایت نئی ہے اس لئے ابھی اعتراض و تنقید کی نہج مرتب نہیں ہوسکی ہے اور معترضین غیر ادبی مباحث و شبہات پر اتر آتے ہیں ۔ انھیں برداشت کرنے میں ججوں پر جو گزرتی ہوگی وہ ہم ان سے ہمدردی کے باوجود پوری طرح محسوس نہیں کرسکتے سونے پر سہاگہ یہ کہ گلڈ ججوں کو تشخیص کا کوئی خاطر خواہ معاوضہ پیش نہیں کرتا اور صرف خدمتِ ادب کے نام سے ہی کام چلانا چاہتا ہے ۔ ہمیں وثوق کے ساتھ حقائق کا علم نہیں مگر چند اداروں کے بارے میں خبر یہ ہے کہ وہ انعام سے زیادہ روپیہ ان کی تشخیص میں خرچ کر دیتے ہیں جبکہ آدم جی انعام کے جج کو ڈاک وغیرہ کے خرچ اور کتاب پڑھوانے کا "ہدیہ" صرف پانچ روپے فی کتاب پیش کیا جاتا ہے اور وہ روپیہ بھی ہم خانوادۂ آدم جی سے وصول کر لیتے ہیں ۔

ہم ان سرکاری عہدیداروں کے بھی شکر گزار ہیں جنھوں نے گلڈ کی اہمیت و افادیت سمجھتے ہوئے ضروری امداد و مشورت سے دریغ نہ کیا۔ جبکہ اگر وہ چاہتے تو مختلف بہانے نکال کر بلکہ بغیر بہانے کے بھی صرف سُرخ فیتے کے زور پر ہمیں مختلف اُلجھنوں میں مبتلا کر سکتے تھے۔ انھوں نے اپنے فرائض منصبی کے ماسوا بھی گلڈ کو ہر آسانی پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اگر ہمیں احتمال نہ ہوتا کہ وہ اپنے مصالح کی بنا پر کھلے شکریے کو پسند نہ کریں گے تو ہم نام بنام ان کے احسانات کا حوالہ دیتے۔ ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کے ضمن میں اتنا بتا دینا بہرحال ضروری ہے کہ انھیں جیسے ہی ترقی ملی تو انھوں نے حکومت کو لکھ دیا تھا کہ ان کی سابقہ تنخواہ میں جو اضافہ ہوا ہو وہ گلڈ کو دے دیا جائے۔ افسوس کہ یہ صاحب دل اب سرکاری ملازم نہیں۔

یہاں ہم گلڈ کے سرکاری اور غیر سرکاری مخالفین کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھتے جو کم "خراج عقیدت" کے مستحق نہیں۔ تاریخ خود انھیں ان کے استحقاق و خدمات کے مطابق یاد کرے گی۔ ممکن ہے ان میں سے بعض حضرات گلڈ کے خلاف اس لئے رہے ہوں کہ انھیں اس کے چند عہدیدار پسند نہ تھے یا ان سے ان کی پیشہ ورانہ رقابتیں اور شکایات وابستہ ہوں۔ اگر ایسا تھا تو بدلتی ہوئی تشکیل کے ساتھ ساتھ ان کے اختلافات ختم ہو جائیں گے اور اگر وہ اس ادارے کے وجود سے ہی نفرت کرتے ہیں تو

مری دُعا ہے تری آرزُو بدل جائے

ان سب کے ساتھ ساتھ اور ان سب کے علاوہ گلڈ کے متعلقین میں ایک شخص اور ہے جس نے یہ اداریہ لکھا ہے۔ وہ گلڈ کا ایک اعزازی کارکن ہے اور بہت سی کوتاہیوں کمزوریوں اور نا اہلیت کا ایک مجموعہ ہے مگر اس نے ابتدا سے اب تک گلڈ ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا گلڈ ہی کے لئے دشمنیاں اور دوستیاں مول لیں گلڈ ہی کے لئے اپنی چھوٹی سی (مگر اپنے لئے اہم) ذات کو مختلف النوع عناصر کے سمجھوتوں ناخوشیوں اور خوشیوں کی چکیوں میں پیس کر رکھ دیا۔ اس کے عیوب اور کوتاہیوں سے گلڈ کو بہت سے نقصانات پہنچے ہوں گے۔ جنہیں اس کی خود ناشناسی نہیں پہچانتی ہو گی کچھ فوائد بھی ہوں گے جنھیں اس کی اُنا بڑھا چڑھا کر گنتی ہو گی مگر اس کی پوری زندگی کا نصب العین ہمیشہ کے لئے ایک ادارہ نہیں ہو سکتا اس لئے اور چند دیگر وجوہ کی بنا پر شاید یہ کارکن بھی دُوسری میقات کے لئے موجودہ شکل میں کام نہ کر سکے تو اس کے دل و دماغ اور ذرائع ہمیشہ گلڈ کے لئے حاضر رہیں گے خواہ اسے کوئی چلائے کیونکہ وہ گلڈ کی سگی ماں کی طرح ہے جسے اپنے بچے کی زندگی اور ترقی ہر حال میں عزیز رہتی ہے۔ بہرحال اس کا ذکر نیکی یا بدی کے ساتھ دوسرے لوگوں پر چھوڑنا چاہیئے جن کی بصیرت اس کی اپنی "خود شناسی" سے کہیں زیادہ منصفانہ اور واضح ہو گی۔

ع - ج

قومی ایوان کتب، پاکستان

(نیشنل بک سنٹر آف پاکستان)

برطانیہ میں نیشنل بک لیگ ایک غیر سرکاری اور غیر تجارتی ادارہ ہے جس کا مقصد ملک میں کتابوں کی صنعت کو فروغ دینا ہے۔ یہ ادارہ لوگوں میں کتابوں کا ذوق عام کرنے، ان کی کھپت بڑھانے، ان کی ساخت میں خوبصورتی اور جاذبیت پیدا کرنے کے لئے مختلف تدابیر اختیار کرتا ہے اور اسی صنعت کے سبھی شعبوں کو مفید فنی مشورے فراہم کرتا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے ہمیشہ گشتی نمائشیں برطانیہ کے طول و عرض میں گردش کرتی رہتی ہیں۔ برطانوی کتابوں کی برآمد بڑھانے کے لئے بھی نیشنل بک لیگ اجتماعی کوششیں کرتی ہے۔ اس ادارے کا صدر دفتر لندن کی البے مارلی اسٹریٹ میں اٹھارویں صدی کی ایک پرشکوہ عمارت میں ہے۔ اس میں ایک کلب لائبریری اور ریستوران بھی ہے۔ ادارے کے اراکین میں مصنفین، ناشرین، کتب فروش، لائبریرین، کتاب بینی کے شوقین، سبھی لوگ شامل ہیں اور چندے دیتے ہیں۔ اسے برطانیہ کے 'اہل کتاب' کا مرکز کہنا چاہیئے۔ بعض اور ملکوں میں بھی اس قسم کے ادارے ایک مدت سے کام کر رہے ہیں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کے اراکین میں سے جناب قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور ابن انشا لندن میں اس ادارے کے نظم و نسق اور طریق کار کا مطالعہ کر چکے ہیں۔

حکومت پاکستان نے جو قومی تعلیم کا کمیشن مقرر کیا تھا اس نے یونیسکو کے مشورے پر ملک میں اس قسم کے ادارے کے قیام کی پرزور سفارش کی تھی، جسے حکومت نے منظور کیا اور نتیجتہً اس کی داغ بیل ڈال دی گئی۔ اس کے صدر حکومت پاکستان کے معتمد تعلیمات ڈاکٹر شریف ہیں اور سکرٹری ابن انشا۔ منتظمہ بورڈ میں پاکستان رائٹرز گلڈ کی نمائندگی جناب قدرت اللہ شہاب، جمیل الدین عالی اور کوی غلام مصطفےٰ کرتے ہیں، تین نمائندے پبلشرز اور بک سیلرز ایسوسی ایشن کے ہیں۔ صوبائی محکمہ ہائے تعلیمات اور مرکز کی تعلیمات اور اطلاعات کی وزارتوں کا بھی ایک ایک نمائندہ شریک ہے۔

ایک ایک نمائندہ انٹر یونیورسٹی بورڈ، پاکستان لائبریری ایسوسی ایشن "اپوا" وغیرہ کا ہے اور پانچ نمائندے حکومت نے نامزد کئے ہیں۔ جناب ممتاز حسن صدر ترقی اردو بورڈ، مولانا عبدالقادر ڈائرکٹر پشتو اکیڈمی، سید علی احسن ڈائرکٹر بنگالی اکیڈمی، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھی ادبی بورڈ۔ اور جناب ابو رشد متین الدین۔ یونیسکو کے علاقائی دفتر کی نمائندگی اس کے ڈائرکٹر مشہور ادیب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کرتے ہیں۔

اس ادارے کا صدر دفتر کراچی میں ہے اور اس کے ساتھ ایک ٹیکنیکل لائبریری ہے جسے کتاب سازی اور کتاب نویسی سے تعلق رکھنے والے سبھی طبقے استعمال کر سکتے ہیں۔ چند ماہ تک اس کی شاخ ڈھاکے میں قائم ہوگی۔ اور ڈاکٹر ایس۔ ایم شریف نے اعلان کیا ہے کہ آگے چل کر مشرقی اور مغربی پاکستان میں متعدد بک سنٹر قائم ہوں گے جن کا الحاق مرکزی نیشنل بک سنٹر سے ہوگا۔

ڈاکٹر شریف نے ۱۴ اپریل کو بک سنٹر کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ ہماری بنیادی ضروریات ہیں۔ "بہتر کتابیں، وافر کتابیں، ارزاں تر کتابیں"۔ کیونکہ ذہنی نشوونما کے بغیر مادی ترقی بربریت پر منتج ہو سکتی ہے۔ پہلے سال میں یہ ادارہ کتابوں کی صنعت کی بنیادی ضرورتوں کا جائزہ لے گا۔ مثلاً کاغذ کے مسائل۔ ان کی قیمتیں، قسمیں، ہماری ضروریات، ہمارے وسائل۔ حکومت کو اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیئے وغیرہ۔ یہ لوگوں کی کتب بینی کی عادات کا بھی جائزہ لے گا۔ ادیبوں اور ادبی رسائل کی مشکلات، کتابوں کی درآمد کی دقتیں، مضمون وار فہرستوں کی تدوین واشاعت تاکہ قارئین اور لائبریریوں کی صحیح رہنمائی ہو سکے۔ حوالے کی کتابوں کی فہرست بندی اور اشاعت وغیرہ۔ یہ محض چند مسائل ہیں جن کا بیڑا پہلے سال میں اٹھایا گیا ہے۔

یونیسکو نے اس ادارے کو فنی امداد بصورت لائبریری وغیرہ کے علاوہ سامان اور مشینیں دی ہیں اور مخصوص منصوبوں کے لئے بعض رقوم بھی مختص کی ہیں۔ فی الحقیقت اس سلسلے میں منصوبہ سازی کا بیشتر کام یونیسکو کے علاقائی ڈائرکٹر ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ہی نے کیا ہے جو سارے جنوبی ایشیا مواد خواندگی تیار کرانے کے منصوبے کے نگراں ہیں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ اس ادارے کے قیام کا پرزور خیر مقدم کرتا ہے اور اچھی سستی اور معیاری کتابیں تیار کرنے کے سلسلے میں پورا پورا عملی تعاون پیش کرتا ہے۔

بیرونی روابط کے سلسلے میں ایک نیا اور اہم قدم

لٹریری پاکستان

LITERARY PAKISIAN

پاکستان رائٹرز گلڈ "لٹریری پاکستان" کے نام سے ایک انگریزی سہ ماہی پرچے کی اشاعت کا آغاز کر رہا ہے۔ "لٹریری پاکستان" میں پاکستان کی ادبی سرگرمیوں کے احوال کے ساتھ ساتھ اردو، بنگالی اور علاقائی زبانوں کے منتخب ادب پاروں کے انگریزی تراجم بھی شائع ہوں گے مختلف ناشرین پاکستانی ادب کو بیرون ملک متعارف کرانے کے لئے جو کتابیں شائع کریں گے۔ ان کا مختصر خلاصہ اور اشتہار بلا معاوضہ اس پرچہ میں شامل کیا جائے گا۔ پاکستان کے قومی اور علاقائی ادب کے کسی شعبے کے پس منظر کے متعلق مبسوط مضامین کا معقول معاوضہ ادا کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں مرکزی دفتر سے خط و کتابت کیجیے

(مرکز)

فنکاروں کی تنظیم — ایک تجویز

لیل و نہار مورخہ ۲۲ را پریل میں "اسٹاف آرٹسٹ" کے عنوان سے ایک نہایت المناک مضمون چھپا ہے جس میں ہمیں ریڈیو پاکستان کے عارضی ملازم فنکاروں کی سقیم حالت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ مضمون اسی اشاعت میں نقل کیا جا رہا ہے۔

صاحب مضمون نے حالات کا جائزہ تو اچھا لیا لیکن فنکاروں کے تمام مصائب کا علاج یہ بتایا کہ انقلابی حکومت خود کوئی قدم اُٹھائے۔ افسوس کہ یہ صورت حال برسہا برس سے جاری ہے اور ہندوستان میں بھی حالات مختلف نہیں مزید برآں یہ پہلی بار نہیں کہ اس موضوع پر لکھا گیا ہو۔

قصہ یہ ہے کہ ان معاملات کے پس منظر میں انقلابی حکومت کوئی فرد واحد نہیں بلکہ سب سے پہلے تو ایک محکمہ ہے جس کا نام ریڈیو پاکستان ہے اور وہ ایک وزارت کے ماتحت ہے جو وزارت اطلاعات ہے جو ایک وزیر کے تحت ہے اور صدر مملکت تک کسی تجویز کسی اسکیم کے پہنچنے کے لئے ان منزلوں کے متعلقہ افسران سے اپنے مطالبات پر ضابطے کے مطابق سائنٹفک طریقے سے مذاکرے ضروری ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ محکمے اس صورت حال کو اس لئے روا رکھتے ہیں کہ یا تو وہ اسے مناسب سمجھتے ہیں یا وہ کسی دوسری وزارت مثلاً وزارت مالیات کے دباؤ سے مجبور ہیں کوئی محکمہ از خود کوئی فلاحی تحریک چلاتا بھی نہیں۔

ہمارا خیال ہمیشہ سے یہ ہے کہ موجودہ معاشرے میں فنکاروں کی بھلائی ایک مضمون ایک آرٹیکل ایک آہ نیم شبی یا نعرہ تند و تیز سے نہیں ہو سکتی بلکہ اپنے مطالبات کے لئے سب سے پہلے خود فنکاروں کو کام کرنا پڑے گا۔ گلڈ نے کچھ نہ کچھ کر دکھایا ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ ملک میں ایک دوسرا ادارہ ان ہی خطوط پر قائم ہو کر کامیاب نہ ہو۔

فن کاروں کی ایک تنظیم اپنے حالات کا جائزہ بھی سائنٹفک بنیادوں پر لے گی اور اس کے مطالبات میں یک آہنگی مضبوطی اور معقولیت ہوگی اور پھر یقیناً حکومت ان پر نہایت سنجیدگی سے غور و فکر کرے گی بصورت دیگر بڑے پیمانے پر احتجاج کا امکان پیدا ہو جائے گا۔

ڈھائی برس قبل ہم نے ملک حسیب احمد صاحب (لاہور) کو ان ہی خطوط پر مشورہ دیا تھا کہ وہ جملہ فنکاروں کے نمائندوں کی ایک کنونشن بلائیں ۔ چند ماہ قبل ہم نے ذوالفقار بخاری صاحب سابق ڈائرکٹر جنرل ریڈیو پاکستان سے بھی عرض کیا تھا کہ وہ اپنے وسیع تعلقات اور تجربے کی بنا پر ایک فعال ادارے کی بنیاد ڈال سکتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ بیشتر لوگ جو مسائل سے واقف ہیں اداروں کی بنیاد ڈالنے کے لئے کسی عرصے کے لئے بھی تن من دھن سے کام نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات میں اُلجھے رہتے ہیں۔

ہم ان صفحات کے ذریعے فنکاروں کو کھلا مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ایک کل ملکی ٹریڈ یونین بنائیں گلڈ کے دونوں رسائل اور اراکین حتی المقدور ان کا ساتھ دیں گے۔ (بہت سے اسٹاف آرٹسٹ خود گلڈ کے رکن ہیں) اور ہمیں یقین ہے کہ ملکی صحافت بھی ان کی مدد کرے گی۔ سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنا ایک نمائندہ جلسہ منعقد کریں یہ جلسہ ادیبوں کے کنونشن کی طرح تو منعقد نہیں ہوسکتا کیونکہ اس میں بہت رقم کی ضرورت ہوگی اور ان کے ہاں اتنے مختلف الخیال لوگ بھی نہیں ہیں جن سے مشورے کے لئے بڑی سے بڑی تعداد کو جمع کرنا ضروری ہو۔

فی الحال انہیں ہر اسٹیشن سے ہر شعبۂ فن کا ایک ایک نمائندہ چن لینا چاہیئے اور پھر یہ سب نمائندے لاہور کراچی یا ڈھاکہ میں جمع ہوکر ایک ٹریڈ یونین قائم کریں (مناسب ہوگا کہ اس کا نام گلڈ نہ رکھا جائے اس لفظ سے ہماری شدید وابستگی ہے اور یہ پیٹنٹ (Patent) بھی ہے)

مجوزہ جلسے کے لئے زیادہ سے زیادہ دو تین ہزار روپے درکار ہیں جو اول تو کسی بھی بڑے فنکار (ایکٹر یا ایکٹریس) سے مل سکتے ہیں اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو گلڈ خود اپنے مالی یا دیگر وسائل سے انتظام کردے گا۔

افسوس کہ گلڈ از خود یہ تحریک شروع نہیں کرسکتا کیونکہ یہ مضمون اس کے اغراض و مقاصد میں شامل نہیں ہے مگر ملک کے بہترین ثقافتی مفادات کے لئے وہ اس تحریک کی ہر ممکن امداد ضرور کرسکتا ہے

ہمیں یقین ہے کہ ایک مضبوط تحریک ریڈیو اور دوسرے شعبوں کے فنکاروں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوگی۔ صحافیوں کی انجمن کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

اگر فنکاروں کو یہ تجویز منظور ہو تو وہ فوراً مقامی طور پر لاہور، ڈھاکہ اور کراچی میں الگ الگ جلسہ کریں اور ایک ایک کنوینر مقرر کرلیں جو ایک دوسرے سے ابتدائی رابطہ قائم کریں اس کے بعد ان کے ابتدائی خدمات کے لئے گلڈ حاضر ہے۔

(ع - ح)

اسٹاف آرٹسٹ

آپ آئے دن ریڈیو پاکستان سے اس قسم کے اعلان ریڈیو پر سنتے ہیں :۔

"شکیل احمد، مسعود الحسن تابش، انور بہزاد کی زبانی خبریں سنیئے "

"آج کی مجلس کے اناؤنسر ہیں مصطفےٰ علی ہمدانی، اخلاق احمد دہلوی، عزیز الرحمٰن، مظفر حسین "

"یہ کھیل ریڈیو پاکستان کے لئے سلیم احمد، میاں لطیف الرحمٰن، اشفاق احمد نے لکھا "

"یہ کھیل رفیع پیرزادہ، میاں لطیف الرحمٰن نے پیش کیا "

"اس کھیل میں صوتی اثرات قدیر ملک نے دیئے "

"اس کھیل میں موہنی حمید، آفتاب احمد، رفیع پیرزادہ عقیل احمد۔ ایم اے رشید، بیگم عارف یاسین امتیاز علی تاج محمد نور احمد، سلطان علی کھوسٹ نے حصہ لیا "

"اس پروگرام کی موسیقی رفیق غزنوی، نذیر حسین شامی، عبدالحق قریشی، طفیل علی، جی اے خان گوالیاری نے ترتیب دی "

"امراؤ بندو خاں، استاد نبی بخش، ظہوری خان اشتن خاں سے سارنگی پر ــــ سنیئے "

"استاد کریم بخش پیرنا، طفیل علی، شوکت حسین سے طبلہ پر ــــ سنیئے "

"کبیر خاں، سراج احمد قریشی سے ستار پر ــــ سنیئے "

"آپا شمیم خطوں کے جواب دیں گی "

وغیرہ وغیرہ۔

ــــ یہ سب نام جو آپ آئے دن ریڈیو پر مختلف اعلانوں میں سنتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے اسٹاف آرٹسٹ ہیں۔ ان میں ڈرامے کے پروڈیوسر، صدا کار، مصنف بھی شامل ہیں اور عورتوں، بچوں اور دیہاتی پروگرام پیش کرنے والے مستقل کردار آپا شمیم۔ چودھری نظام دین۔ ماجاجی، سلطان کھوسٹ۔ بھائی جان وغیرہ ایسی ہر دلعزیز ہستیاں بھی ہیں اس فہرست میں خبریں سنانے والے News Reader اعلان کرنے والے اناؤنسر موسیقی اور سازینے ترتیب دینے والے موسیقار گلوکار اور سازندے سب ہی قسم کے فنکار شامل ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے ناموں سے سب ہی سننے والے واقف ہیں

لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے آرٹسٹ آواز کی دنیا سے علیحدہ پس منظر میں مفید اور ضروری کام کرتے ہیں مثلاً مسودہ نگار، تلفظ کی اصلاح کرنے والے ریکارڈوں اور سازوں کی دیکھ بھال کرنے والے، مسودوں کو نقل کرنیوالے ان کارکنوں کی مجموعی تعداد ساڑھے تین سو سے زیادہ ہے اور یہ

شاف آرٹسٹ ۲۴ گھنٹے کی سرکاری ملازمت کے باوجود باقاعدہ سرکاری ملازم نہیں، حالانکہ ریڈیو ایک سرکاری محکمہ ہے اور ان ملازمین میں سے اکثر نے اپنی ساری زندگی اس سرکاری ادارے کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ کو شاید اس پہیلی کو سمجھنے میں الجھن ہوگی، اس لئے آیئے اس کی وضاحت کر دیں :۔

ریڈیو پاکستان کے کارکنوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک وہ جو ریڈیو پاکستان سے باقاعدہ سرکاری ملازم کی حیثیت سے وابستہ ہیں اور دوسرے وہ جن کی ریڈیو سے وابستگی سالانہ معاہدے کی مرہون منت ہے۔ اس دوسرے گروہ میں بیشتر فن کار مسودہ نگار، صداکار اور موسیقار ہیں یہ سب اسٹاف آرٹسٹ ہیں جن کی نگائی روزی بیک جنبش قلم کسی دن، کسی وقت بھی ختم کی جاسکتی ہے۔ یہ لوگ سرکاری ملازموں کی طرح پنشن، طبی مراعات اور معینہ میعاد ملازمت کسی چیز کے حقدار نہیں۔ یہ اپنی ساری زندگی اپنی فنکارانہ صلاحیتوں، اُپج اور فنی استعداد ریڈیو کی نذر کرنے کے بعد ایک دن اپنے آپ کو بیکار محض پاتے ہیں جو کسی قسم کی ہمدردی، توجہ اور مالی امداد طبی دیکھ بھال کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔ مثال کے طور پر امراؤ ضیا بیگم اور بھائی لال محمد کو لے لیجئے۔ تھوڑے ہی دنوں کی بات ہے ایک زمانہ تھا کہ ان دو فن کاروں کی شرکت پروگراموں کی کامیابی کی ضامن تھی۔ ساری زندگی ریڈیو کی خدمت کرنے کے بعد جب ان مشہور فنکاروں کی آواز ان کا ساتھ نہ دے سکی تو انھیں ریڈیو سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ زندگی کی اس منزل پر ان کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا، نہ پنشن کی صورت میں مالی امداد کی توقع اور نہ ہی وہ کوئی نیا کام شروع کرنے کے قابل تھے۔ اس قسم کے بھلائے ہوئے اور ستائے ہوئے فن کاروں میں بہت سے ایسے فنکار بھی تھے، جنھوں نے ریڈیو کی عمر بھر خدمت کی اور آخری دم تک ریڈیو سے وابستہ رہے لیکن اپنی اچانک موت کے بعد اپنی اولاد کے لئے نہ انھوں نے کوئی اثاثہ چھوڑا نہ پنشن اور آج ان کی اولاد انتہائی کسمپرسی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسے بدنصیبوں کی مثال آپ کو ریڈیو پاکستان کے مشہور صداکار محمد حسین مرحوم اور سارنگی نواز استاد حیدر بخش مرحوم کی زندگی اور کسمپرسی کی موت اور ان کے پسماندگان کی بیکسی کی زندگی کی صورت میں عبرت کا سامان مہیا کرتی ہے۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ریڈیو پاکستان راولپنڈی کے مشہور و مقبول فنکار ریڈیو ڈرامے کے عظیم صداکار تاج محمد موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ انھیں تپ دق کی مہلک بیماری نے بے دست و پا کر دیا ہے۔ تاج محمد کو قدرت نے پرشکوہ پُر وقار آواز سے نوازا ہے اور عظیم فنکارانہ صلاحیتیں بخشی ہیں کہ وہ محض آواز کے اُتار چڑھاؤ سے کردار کے نازک ترین جذبات اور احساسات کے حسین ترین اظہار پر قادر ہیں اور پُر وقار کردار کی عکاسی میں رفیع پیرزادہ اور کوئی فنکار ان کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ کئی مہینے پہلے سالی سینی ٹوریم میں مخلص دوستوں اور عقیدتمندوں نے ان کے لئے بستر کا انتظام بھی کر لیا تھا ایک مدت تک تاج محمد اس انتظام اور علاج معالجے سے کوئی فائدہ اس لئے نہیں اُٹھا سکے کہ سینی ٹوریم میں داخلے کے فوراً بعد انھیں ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا اور اس طرح اس ماہانہ قلیل معاوضے سے بھی محروم ہو جاتے جو بحیثیت ایک اسٹاف آرٹسٹ کے انھیں ریڈیو پاکستان سے ملتا ہے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا کہ ساری زندگی سننے والوں کے لئے تفریح کا سامان مہیا کرنے والا سینی ٹوریم میں ایڑیاں رگڑتا اور اپنی ناکام زندگی پر ہاتھ ملتا رہتا اور چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں پر فاقے پر فاقے گزرتے کیونکہ ریڈیو میں از کار رفتہ، مجبور، بے بس، لاچار اور بیمار اسٹاف آرٹسٹوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں اور حکومت کی طرف سے معاہدہ کی شرائط کی رُو سے انھیں طبی امداد، چھٹی اور پنشن وغیرہ کسی قسم کی مراعات کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ سُنا ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ نے از راہِ ترحم اس عظیم فنکار کے لواحقین کو ان کی علالت کے زمانے میں فاقوں سے بچانے کیلئے سو روپے ماہانہ وظیفے کا انتظام کیا ہے۔ خدا رائٹرز گلڈ کو جزائے خیر دے تاہم ہمارے ملک کے مخیر لوگوں کو توفیق دے کہ اس ملک کے بے نوا فنکاروں کی زندگی کا جائزہ لے کر انھیں اُن جائز مراعات سے نوازے جو اُن کا حق ہیں۔

ہماری انقلابی حکومت نے زندگی کے ہر شعبے میں خوش آئند انقلابی اصلاحات جاری کی ہیں اس لئے توقع کی جاسکتی ہے کہ ریڈیو اسٹاف آرٹسٹوں کی حالت سُدھارنے کے ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری

ادبی تنقید اور لسانیات

لسانیات بالکل نیا لفظ ہے جسے طبعیات والٰہیات کی وضع پر لسان (زبان) سے اس طرح ڈھالا گیا کہ آخر میں نسبت کی 'ی' (مشدد) بڑھا کر عربی کی علامت جمع "ات" اضافہ کر دی گئی۔ لسانی کے معنی ہیں زبان سے منسوب۔ لسانیات کے معنی ہوئے زبان سے متعلق مسائل و مباحث۔ لسانیات ہر چند نیا لفظ ہے لیکن زبان سے متعلق بحثیں نئی نہیں۔ جب انسان کا شعور بیدار ہوا اور اس نے گردوپیش پر ہوشمندانہ نظر ڈال کر ان کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اس کے دل میں زبان سے متعلق بے شمار سوالات پیدا ہوئے جن میں سے کچھ ایسے ہیں جن کا اس نے اپنی بساط اور ذہنی سطح کے مطابق جواب بھی دیا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ جواب خود اس کے لئے اطمینان بخش نہ تھا۔ سوالات پیدا ہوتے رہے، جوابات دئے جاتے رہے۔ اُلجھنوں کے ساتھ سلجھاوے اور دقتوں کے ساتھ ان کے حل نکلتے رہے۔ یہ سلسلہ قدیم سے ہے اس لئے لسانیات کو نیا نہیں کہا جا سکتا۔

قدیم زمانے میں لسانیات کو گرامر (صرف نحو) یا علم اللغت یعنی علم اللسان کہا جاتا تھا۔ اس وقت یہ علم سادہ اور اپنی عمر کی ابتدائی منزلوں میں تھا۔ اس کے مسائل گرامر اور لغت کے مسائل و مباحث سے گڈمڈ تھے۔ حد فاصل نہ ہونے کی وجہ سے ان کے درمیان امتیازی خط نہیں کھینچا جا سکتا تھا۔ لسانیات نے ایک قدم آگے رکھا اور گرامر کی چار دیواری توڑ کر باہر آئی تو اس کا نام علم اللغۃ (زبان کا علم) کی جگہ فقہ اللغت (زبان کا فلسفہ) قرار پایا۔ آج ہم گرامر کے اس اگلے قدم کو لسانیات کہتے ہیں۔ لسانی مسائل کا پہلا قدم گرامر تھا۔ دوسرا قدم قدیم زبان میں فقہ اللغت اور جدید زبان میں لسانیات ہے۔

لسانیات کا تعلق انسان کی زبان سے ہے اس لئے زبان لسانیات کا موضوع ہے۔ لسانیات میں زبان کے بارے میں ہر قسم کے سوالات کئے جا سکتے ہیں۔ اس میں اتنی ہی وسعت ہے جتنی انسان کی زبان میں ہے۔ زبان کی دو بڑی شاخیں ہیں۔ بسیط آوازیں جن سے زبان کے بامعنی الفاظ بنتے ہیں اور ان آوازوں کی گوناگوں ترکیبیں۔ بسیط آوازوں کا علم صوتیات ہے اور آوازوں کی ترکیب و ترتیب کا فن اشتقاقیات (صوریات) لفظ و معنی کے تعلق کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ جس شعبہ لسانیات میں اس تعلق سے بحث کی جائے اسے معنویات کہتے ہیں۔ لسانیات کی یہ تقسیم اجزائے زبان کے لحاظ سے ہے۔ مسائل و مباحث کے لحاظ سے اس کی اور بھی کئی قسمیں ہیں۔ اس فرصت میں مجھے لسانیات کی فن کی حیثیت سے وضاحت کرنی ہے اس لئے اس کی انہی قسموں پر اکتفا کروں گا۔

زبان کی بسیط آوازوں سے گرامر میں بحث کی جاتی ہے۔ اسے علم الہجا کہتے ہیں۔ اشتقاق علم صرف کا موضوع ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ لفظ یا مادّے سے الفاظ اور صیغے کس طرح وضع کئے

جاتیں اور "کر" سے کرنا، کرتا، کیا، کرے گا، کرنے والا یہ تمام صیغے کیسے اور کیوں کر ڈھلیں۔ اسی طرح لفظ و معنی کا تعلق لغت یعنی ڈکشنری و قاموس سے بھی ہے۔ پھر ان میں اور لسانیات کی مذکورۂ بالا تین قسموں میں کیا فرق ہوا؟ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ موضوع کی حد تک تو ان میں اور لسانیات میں کوئی فرق نہیں۔ ان کے مباحث بھی وہی ہیں جو لسانیات کے ہیں۔ لیکن لسانیات چونکہ گرامر کا اگلا قدم ہے اس لئے اس میں گرامر سے زیادہ وسعت ہے اور ساتھ ہی گہرائی بھی۔ وسعت اس لحاظ سے ہے کہ لسانیات کے مسائل و مباحث نامحدود ہیں۔ ان میں زندگی کا سا تنوع ہے۔ اور گہرائی یہ ہے کہ گرامر میں موضوعات سے سرسری بحث ہوتی ہے۔ لسانیات میں بال کی کھال نکالتے اور دقت نظر سے کام لے کر حقیقت تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک حقیقت دریافت نہ ہو لسانی ذوقِ جستجو آسودہ نہیں ہوتا۔

علم ہجا میں صرف یہ بتا دینا کافی ہے کہ [illegible] دو میں اٹھتیس حروف (یا آوازیں) ہیں اور وہ یہ ہیں۔ ان میں سے اتنے شمسی ہیں اور اتنے قمری۔ ان حروف کے نام بھی ہیں جن کا پہلا حرف اس کی آواز کو ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً سین کہ "س" اس کا پہلا حرف ہے۔ حروف کے مخارج اور ان کی صفات مختصر طور سے بیان کر دی جاتی ہیں اور بس۔

لسانیات کے شعبہ علم الاصوات (صوتیات) میں بسیط آوازوں سے بڑی جامع، عمیق اور عام طور سے تین طرف سے بحث ہوتی ہے۔ تشریحی، تاریخی اور تقابلی۔ جب تک یہ تینوں گوشے بحث میں نہ آئیں حقیقت آئینہ نہیں ہوتی۔ تشریحی بحث میں آوازوں کے مخارج، تلفظ، ادا اور صفات کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اور ہر آواز کی تاریخ دی جاتی اور دوسری متعلقہ زبانوں سے مقابلے کے بعد اس کے مختلف ارتقائی دوروں کو روشنی میں لایا جاتا ہے۔ یہی کیفیت اخذ و اشتقاق کی ہے۔ گرامر میں صرف یہ بتا دیا جاتا ہے کہ "پڑھا" مثلاً ماضی ہے اور صیغۂ واحد غائب جو مادۂ "پڑھ" سے الف بڑھا کر وضع ہوا ہے۔ پڑھنا اس کا مصدر ہے۔ علم صرف کی حدیں ختم ہوئیں اس سے آگے وہ آپ کا ساتھ نہ دے گا۔ لسانیات آپ کو بتائے گی کہ "پڑھ" کے اصلی معنی کیا ہیں؟ وہ کیسے بنا، کہاں بنا، اس کے معنی پڑھنا کیوں کر ہوئے، اور پڑھا کس لئے ماضی کا صیغہ واحد غائب ہے؟ ان تمام سوالوں کا جواب دینے کے لئے لسانیات کو "پڑھا" کی تشریح کے ساتھ اس کی تاریخ کا کھوج لگانا پڑے گا اور تاریخ کے لئے تقابل ضروری ہے اس لئے اُردو کی ہمرشتہ قدیم و جدید سرشتے کو کھنگال کر لسانیات یہ دیکھے گی کہ ان زبانوں میں قدیم ماضی کے صیغے کس طرح وضع ہوئے اور ان کے مختلف روپ کیا ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ لسانیات کے تشریحی، تاریخی اور تقابلی تین بڑے شعبے ہیں جن پر وہ مشتمل ہے۔ یہ تینوں شعبے ایک دوسرے کے ہم عنان ہیں۔ لفظ کی تحقیق اور دریافت کے لئے بیک وقت لسانیات کے ان تینوں شعبوں سے کام لینا پڑتا ہے ممکن نہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کر دیا جائے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ لسانیات کے مسائل و مباحث میں بڑی وسعت ہے۔ وہ زبان کے ہر پہلو کو لے کر اس پر بحث کرتی ہے۔ گرامر عام طور سے زبان کے وہی پہلو لیتی ہے جن کی کوئی عملی اہمیت ہے۔ یعنی جن کے جاننے اور سیکھنے سے زبان پر قدرت حاصل ہوتی ہے اور اس کو صحیح طور سے استعمال کر کے خیالات کے اظہار کا موثر اور کسی قدر واضح آلہ بنایا جا سکتا یا ذریعہ اظہار کی حیثیت سے اس کی اہمیت اور افادیت کو روشن تر کیا جا سکتا ہے۔ لسانیات ایک طرح کی سائنس ہے۔ زبان اس کے نزدیک فطری مظاہر میں سے ہے۔ اسے زبان کے ہر پہلو سے دلچسپی ہے۔ وہ یہ بھی جاننا چاہتی ہے کہ زبان کب وجود میں آئی اور کیسے؟ وہ قدرت کی پیداوار ہے یا ضرورت کی یعنی عام فطری مناظر و مظاہر کی طرح فطرت نے اسے پیدا کیا یا انسان نے بقول شخصے ضرورت ایجاد کی ماں ہے، اپنی گوناگوں سماجی ضرورتوں کے پیش نظر وضع کر لیا۔ اور اگر انسان نے وضع

کیا تو کسی ایک فردِ واحد نے یا پورے سماج نے۔ بالارادہ وضع کیا یا بلا ارادہ، شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر۔ یہ اور اسی قسم کے متعدد اہم سوالات لسانیات کے سامنے ہیں جن کا اسے جواب دینا ہے۔ اور ان میں سے بعض کا اس نے جواب دیا بھی ہے۔ یہ زبان کی تاریخ کا صرف ایک پہلو ہے۔ اس کا ایک پہلو اور بھی ہے مثلاً یہ کہ زبان جامد ہے یا نامی یعنی جب سے وہ وجود میں آئی برابر ایک حالت پر قائم رہی یا نت نئے رُوپ بدل رہی ہے۔ اور اگر روپ بدل رہی ہے تو اس کا یہ رُوپ بدلنا تاریخی ارتقا ہے یا فطری نشو و نما اور اگر تاریخی ارتقا ہے تو فردِ واحد کے اختیار و ارادے کا اس میں کس حد تک عمل دخل ہے۔

اس کے بعد زبان کے تغیرات کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ تغیرات کتنے ہیں اور کیوں ہیں۔ تحت یا تخریب صوتی کے مثلاً کیا اسباب ہیں۔ ان اسباب سے تفصیل کے ساتھ بحث ہوتی ہے۔ لسانی تغیرات کے سلسلے میں زبان کی ارتقائی تاریخ اور مختلف زبانوں کے رشتے سامنے آتے ہیں جن کی بنا پر لسانیات ایک طرف زبان کی تاریخ کے مختلف دور بناتی ہے۔ دوسری طرف ملتی جلتی متعدد زبانوں کے خاندان، خانوادے، گروہ اور زمرے قرار دیتی ہے۔ مثلاً بیس ایک لفظ ہے۔ اس کی اصلیت کا کھوج لگاتے لگاتے لسانیات اس کی ایک قدیم شکل "بیسی" تک پہنچی جو اُردو کی ایک کہاوت "وہی تین بیسی وہی ساٹھ" میں ہے۔ سنسکرت "وِن شت" اور لاطینی "وگنتِ" سے ہو کر (جو بیس کی قدیم ترین شکلیں ہیں) جب اس کی نظر جدید فارسی بست اور انگریزی "ٹوینٹی" پر پڑی تو اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ "بیس" اصل میں "دُوِشت" تھا (دُو + شت = دو دس یا بیس) کہیں شروع کی دال تخریب صوتی کی نذر ہوئی اور کہیں آخر کی "ت"۔ اس سے لسانیات نے نتیجہ نکالا کہ جن زبانوں میں یہ لفظ مختلف شکلوں میں موجود ہے ان کے درمیان قریب کی قرابت ہے۔ لسانیات زبانوں کے رشتوں اور قرابتوں کو دریافت کرنے کے لئے مفرد الفاظ کا کھوج نہیں لگاتی زبان کے صرفی و صوتی سرمایہ کی تحقیق کرتی ہے جو لسانی پیکر کی گویا ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس کے بعد لسانی رشتوں کا سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کتنی قسم کے ہیں۔ اور یہ سوالات برابر اسی طرح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

لسانیات کے ان متنوع اور رنگارنگ مسائل کو دیکھ کر یہ رائے قائم کرنا دشوار نہیں کہ لسانیات فن نہیں سائنس ہے۔ کس قسم کی سائنس ہے؟ نفسیات و حیاتیات کی طرح طبعی سائنس ہے یا معاشیات و اجتماعیات کے انداز کی تاریخی۔ ہنوز یہ طے نہیں ہوا۔ مشہور ماہر لسانیات میکس مولر اسے طبعی سائنس جانتا ہے اور اس کا خواجہ تاش وِٹنے اس پر مصر ہے کہ وہ تاریخی سائنس کا ایک شعبہ ہے۔ میں میکس مولر اور وِٹنے کے اس اختلاف سے زیادہ زبان و ادب کے رشتے کو اہمیت دیتا ہوں۔

زبان اظہار خیال کا ایک ترقی یافتہ ذریعہ ہے۔ سائنس دان کے نزدیک فطری مظہر کی حیثیت سے وہ اہم ہے اور ادیب کے نزدیک ذریعۂ اظہار و بیان کے لحاظ سے ادیب کا تعلق ادب سے ہے اور ادب زبان کے ذریعے وجود میں آتا ہے اسلئے ادیب زبان سے بھی دلچسپی رکھتا ہے لیکن اس کی دلچسپی ادب و زبان دونوں سے ایک عام قاری کی دلچسپی سے مختلف ہے۔ ادیب کی دلچسپی ایک طرح کی ہوشمندانہ اور بصیرت افروز دلچسپی ہے ایک عام قاری بقول شخصے آم کھاتا ہے پیڑ نہیں گنتا۔ بات کرتا ہے تو اس پر غور نہیں کرتا کہ جس زبان میں بات کر رہا ہے وہ کب اور کہاں پیدا ہوئی۔ ادب پڑھتا ہے اور کوئی نثر پارہ یا شعر اسے پسند آتا ہے تو بار بار پڑھنے کے باوجود یہ نہیں سوچتا کہ نثر پارے یا شعر میں کیا خوبی ہے جس نے اس کے دامنِ دل کو کھینچا۔ بقول ایک نقاد کے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ نقاد کی اس نثر پارے یا شعر کے بارے میں کیا رائے ہے اور وہ بھی اسے پسند کرتا ہے یا نہیں۔ اس کی پسند زیادہ تر ذاتی قسم کی ہوتی ہے۔ سماج سے زیادہ شخصی تأثر اس میں دخیل ہوتا ہے۔ اس کے

مقابلے میں ادب بات کے ہر پہلو پر نظر رکھتا ہے، ہر جملے کو پرکھتا اور ہر لفظ کی جانچ پڑتال کے بعد قیمت متعین کرتا ہے۔ وہ اہم نکتہ چیں کہانا پسند بھی کرتا ہے۔

ادیب کا یہ انداز نظر تنقید ہے۔ لسانیات بھی تنقید ہے عام طور سے ادب کی تنقید کو تنقید کہتے ہیں۔ لسانیات زبان کی تنقید ہے۔ ادبی تنقید میں اسالیب بیان کو پرکھا جاتا ہے۔ لسانی تنقید میں زبان کے تعمیری عناصر کے اظہار و بیان پر اثرات دکھائے جاتے ہیں۔ اس کو ادب کی تنقید کی طرح عام تنقید میں جگہ ملنی چاہیے۔ تنقید تخلیق ہونے کے باوجود سائنس ہے اور سائنس کی سی باقاعدگی، نظم وضبط، ترتیب و تسلسل اس میں پایا جاتا ہے۔ لسانیات سائنس ہونے کے باوجود تخلیق ہے۔ اس میں تخلیق کی سی جدت، بوجت ندرت اور بداعت کے کرشمے نظر آتے ہیں۔ یہ خیال محال ایک برافگندہ نقاب حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ تنقید تجزیہ ہے جب تک ادب کا تجزیہ نہ کیا جائے حسن کاری اور تخلیقی منزلوں منزلوں کی وضاحت نہیں ہوتی۔ لسانیات کا دار و مدار ہی تجزیے پر ہے۔ وہ زبان، اس کے اجزا اور ضابطوں کا پوسٹ مارٹم کرتی ہے۔ تجزیہ میں دونوں شریک ہیں۔ ادبی تنقید کا مقصد حسن کی دریافت اور اس کی باز آفرینی ہے۔ لسانی تنقید کی غایت حقیقت نفس الامری کا انکشاف اور اس کی بازیابی ہے۔ خالص تخلیق میں ذوق نظر سے کام لیا جاتا ہے اور تنقیدی تخلیق میں دقت نظر سے۔ اور یہی دقت نظر لسانی تحقیق و تنقید میں کارفرما نظر آتی ہے۔ جدید تنقیدی نظریات کے مطابق دقت نظر کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی ذوق نظر کی ہے۔ بلکہ شاعر مشرق علامہ اقبال کے نزدیک دقت نظر کے بغیر ذوق نظر نظر نہیں خبر ہے۔

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

بہرحال اس میں شبہ نہیں کہ لسانیات زبان کی تنقید ہے۔ اور اگر تنقید تخلیق ہے تو لسانیات کو بھی تخلیق کی ایک صنف قرار دینا ہوگا۔

مشہور ماہر لسانیات میکس مولر نے گرامر اور لسانیات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان میں "کیا" اور "کیوں" کا فرق ہے۔ گرامر کیا ہے اور لسانیات کیوں۔ گرامر لفظ اور کلمے کی شناخت کر کے بتاتی ہے کہ وہ کیا ہے۔ اسم ہے یا فعل، اسم ہے تو اسم ذات ہے یا اسم صفت۔ فعل ہے تو ماضی ہے یا مضارع۔ ماضی ہے تو غائب کا صیغہ ہے یا حاضر کا۔ لسانیات یہ بتاتی ہے کہ اسم کیوں ہے۔ فعل ماضی کس لئے ہے۔ وہ الفاظ و کلمات کی شناخت نہیں کرتی ان کی حقیقت اور اصلیت کے چہرے سے نقاب اٹھاتی ہے۔ ان کی زندگی کے مختلف دوروں کی نشان دہی کرتی ہے۔ گرامر کی شناخت ناقص اور نامکمل تھی لسانیات اسے مکمل بناتی ہے۔ اس میں بھی وہ ادبی تنقید کے ہمدوش اور ہم عنان ہے۔ ادبی تنقید کا کام بھی یہی ہے کہ وہ ادب پارے کی نقاب کشائی کرے اور اس کے جمال جہان نما کے جلوے اہل نظر کو دکھائے۔

پروفیسر محمد اسلم قریشی

غالب کی فارسی شاعری

(ایک تعارف)

مرزا غالب اس زمانے میں فارسی میں فکر شعر کر رہے تھے جب مغلیہ فرماں روائی اور فارسی سخن سرائی کا چراغ بجھا چاہتا تھا۔ غالب کے صریر خامہ سے اس وقت نوائے سروش آرہی تھی جب مدح وستائش اور داد و دہش کی بساط الٹ چکی تھی۔ غالب کے ہم عصروں میں اگرچہ ہند کے اطراف واکناف میں بعض اور شعراء بھی فارسی شاعری کی جوت جلا رہے تھے اور شاہ جہاں آباد میں مولینا مفتی محمد صدرالدین خاں آزردہ، مولوی عبداللہ خاں علوی، مولوی امام بخش صہبائی، حکیم مومن خاں مومن، نواب مصطفےٰ خاں حسرتی، نواب ضیاءالدین احمد خاں نیر، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہ فارسی میں نغمہ سرائی کر رہے تھے جن کا ذکر غالب نے اس طرح کیا ہے۔

هندرا خوش نفسا نند سخنور که بود
باد در خلوت شاں مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیر و صهبائی و علوی وانگاه
حسرتی اشرف و آزرده بود اعظم شاں
غالب سوخته جاں گرچه نیرزد به شمار
هست در بزم سخن هم نفس و هم دم شاں

لیکن آخری تاجدار مغلیہ کے ساتھ فارسی شاعری کا ذوق بھی رخصت ہو رہا تھا۔ خواص وعام کی نظریں عروس اردو پر لگی ہوئی تھیں۔ ہر طرف اس کے حسن ورعنائی کا چرچا تھا اور ہر نگاہ اس کی والہ وشیدا تھی۔ خود دودمان مغلیہ بہادر شاہ ظفر اسی کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔ ریختہ گوئی میں ناسخ کی عشوہ طرازیاں اہل لکھنؤ کو فریفتہ کرنے کے بعد دلی والوں کے دلوں کو موہ رہی تھیں۔ شاہ نصیر، بادشاہ اور شہزادے ان اداؤں پر مرتے تھے۔ ذوق نے بھی ان کو اپنا یا اور استاد شاہ کا مرتبہ پایا۔ خاص وعام شعرا تاسخیت پر جان چھڑکتے تھے اور مضمون کی ہوا باندھتے تھے۔ غالب کی افتاد طبع اور ان کی شاعری کا مزاج اور ہی آب وگل کا آفریدہ تھا۔ اس بزم میں کون تھا جو غالب کی فارسی گوئی پر کان دھرتا اور ان کی ریختہ کو سمجھتا۔ حکیم آغا جان عیش کا یہ کہنا

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے، اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

غالب کے کلام پر ایک طنز ہی نہ تھی بلکہ اس سے عوامی رجحان کی ترجمانی ہوتی ہے۔ غالب بے چارے کو اپنے

نکتہ چینیوں کے جواب میں یہ کہتے تھے کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور وہ ہمیشہ اس کشمکش و پیچ میں مبتلا رہے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کچھ کہتے ہیں تو سمجھنے والا کوئی نہیں اور کچھ کہے بغیر چارہ بھی نہیں۔ یہ بات صرف قیام آگرہ کے زمانہ ہی کی نہ تھی جب یہ رباعی کہی گئی تھی اور غالب اپنے معترضین کو "جاہل" قرار دیتے تھے۔ اس وقت اس رباعی کا دوسرا مصرع اس طرح کہا گیا تھا ـــ "ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے جاہل" لیکن جب دہلی میں مولانا فضل حق خیرآبادی جیسے سخن فہم اور مسلم الثبوت استادوں نے انھیں ان کی "بیدلانہ" روش پر متنبہ کیا اور وہ اپنے کلام کے حسن و قبح سے آگاہ ہوئے تو اس رباعی کے دوسرے مصرعے کو بدل دیا گیا اور "جاہل" کے بجائے "سخن ورانِ کامل" کر دیا۔ لیکن یہ شکایت غالب کو ہمیشہ رہی۔ ان کا آخری سہارا یہی تھا کہ

تا ز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن
این می از قحط خریداری کہن خواہد شدن
کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

یہ خیال صرف مرزا غالب ہی کا نہ تھا آج بھی اکثر کہا جاتا ہے کہ غالب اپنے وقت سے بہت پہلے پیدا ہوئے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بقول اقبال مرزا غالب

زیبِ محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

اس عہد میں لوگوں کا مذاق سخن اس قدر بلند نہ ہوا تھا کہ وہ غالب کا صحیح مقام اور ان کے کلام کی مناسب قدر افزائی کر سکتے یا بقول نیاز فتحپوری یہ کہہ لیجئے کہ

"غالب بھی اپنے ذوق کے لحاظ سے مستقبل کا شاعر تھا اور وہ اپنے اندر چند در چند مستقبل چھپائے ہوا تھا"
(نگار غالب نمبر ص...)

غالب کے اردو کلام کی موجودہ مقبولیت کے پیش نظر اس رائے میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ وہ اپنے عہد کے ایک سو سال بعد سخن سرا ہوتے تو انھیں قدر شناسوں کی کمی کا شکوہ نہ ہوتا لیکن ان کی فارسی شاعری کے بارے میں شاید یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ ان کو اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں کے زمانے میں فیضی، نظیری، عرفی، ظہوری، صائب تبریزی، طالب آملی اور ابوطالب کلیم کی محفلوں میں شریک ہونا چاہئے تھا۔ غالب کے فارسی کلام کی صحیح داد رسی صرف اکبر، جہانگیر اور شاہ جہاں جیسے قدرداں اور حکیم ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں جیسے سخن فہموں کی سرپرستیوں میں ممکن ہو سکتی تھی اور ان کے شاعرانہ کمالات صرف اس وقت کھل سکتے تھے۔ جہاں تک ان کے اردو کلام کا تعلق ہے پچھلی ایک صدی میں اس کے سمجھنے اور سمجھانے میں حتی المقدور کوشش جاری رہی اور بلا شبہ ان کی شہرت ایک عالم میں پھیل گئی لیکن ان کی فارسی شاعری کی افہام و تفہیم کا معاملہ ابھی جوں کا توں ہے۔ ان کے فارسی کلام کی داد و تحسین کا زمانہ ابھی تک نہیں آیا۔ فارسی زبان و ادب سے بڑھتی ہوئی بے اعتنائی اور بے رغبتی کی بدولت اول تو ایسے دور کی توقع کم نظر آتی ہے۔ اگر اس طرف توجہ ہوئی بھی تو غالب کے فارسی کلام اور اس کی قدر و قیمت سمجھنے کے لئے کچھ زمانہ اور درکار ہوگا۔

غالب اپنے دور کی روایتی شاعری کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھتے تھے اور کہتے تھے۔

ما ست می گویم من و از راستی سر نتواں کشید
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ منست

اگرچہ مرزا نے ریختہ کو بھی رشک فارسی بنا دیا ـــ فرماتے ہیں

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

لیکن انھوں نے ریختہ کے مروجہ طرزِ سخن کو کبھی اپنا شعار نہ بنایا بلکہ وہ اپنے اُردو کلام کے مقابلے میں اپنی فارسی شاعری پر ہمیشہ فخر کرتے رہے

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگِ منست

لیکن زمانے نے اسی "مجموعہ بے رنگ" کو صحیفہ الہامی جانا اور بجنوری نے "محاسن کلام غالب" کا آغاز اس طرح کیا۔

"ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں۔ ایک وید مقدس دوسری دیوانِ غالب۔"

غالب کے کلام کو سمجھانے کی پہلی کوشش مولانا حالی نے "یادگارِ غالب" میں کی تھی اور انھوں نے اُردو اشعار کے ساتھ فارسی کلام کے رُموز و اسرار بھی کھولے۔ غالب کے دلدادگان نے حالی کی یادگارِ غالب سے نیاز کی شرح "مشکلاتِ غالب" تک اس "مجموعہ بے رنگ" کی شرحوں کے طومار باندھ دیئے اور مقالوں اور کتابوں کے انبار لگا دیئے لیکن ان "نقشہائے رنگ رنگ" پر انتقادات تو کجا توضیحات تک کی نوبت بہت کم آئی۔ مرزا کی شاعری کے پرستاروں اور ان کے فارسی کلام کے متوالوں نے اس کی دلرُبائی کی داد دی بھی لیکن ——

"حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔"

افراسیاب کے اخلاف اور سمرقند کے مکینوں میں فارسی جن کے گھر کی لونڈی تھی غالب پیدا ہوئے۔ فارسی میں رچے بسے ہوئے ماحول میں پروان چڑھے۔ فارسی میں دستگاہی اور فارسی شاعری سے رغبت انھوں نے ورثہ میں پائی۔ وہ خود ایک قطعہ میں یوں لکھتے ہیں۔

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم
لاجرم در نسب فرہ مندیم
ترک زادیم و در نژاد ہمے
بسترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعۂ اتراک
در تمامے ز ماہ دہ چندیم
فیضِ حق را کمینہ شاگردیم
عقلِ کل را ہمینہ فرزندیم

ایک اور قطعہ کا آغاز اس طرح کیا ہے

ساقی چو من پشنگی و افراسیابیم
دانی کہ اصلِ گوہرم از دودۂ جم ست

مرزا غالب ۷۳ برس بقیدِ حیات اور بندِ غم میں اسیر رہے۔ مولانا حالی کے بیان کے مطابق انھوں نے آٹھ نو برس کی عمر میں اُردو شاعری شروع کر دی تھی اور اسی عمر میں انھوں نے اپنی پتنگ بازی کے متعلق ایک اُردو مثنوی لکھی تھی۔ کلکتہ کے قیام کے دوران مولوی سراج احمد کی فرمائش سے غالب نے اپنے اُردو اور فارسی کلام کا انتخاب کیا تھا۔ اس کے دیباچے میں خود غالب کا بیان ہے کہ انھوں نے اوّل اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ لیکن ان کے ابتدائی زمانے کی ریختہ میں فارسیت کی ریل پیل سے قیاس ہوتا ہے کہ اسی نو عمری میں انھوں نے فارسی شاعری کی طرف بھی توجہ کی ہوگی اور فارسی شاعری کا یہ سلسلہ وفات سے کچھ عرصہ پہلے تک جاری رہا۔ اس لحاظ سے انھوں نے کم و بیش ساٹھ سال فکرِ سخن میں بسر کئے۔ اس عرصے میں ذہنی پختگی کے بیس برس یعنی تیس سال کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک زیادہ تر فارسی شاعری میں صرف ہوئے اگرچہ اس سے قبل اور بعد بھی فارسی میں فکرِ سخن کرتے رہے۔ مرزا کے فارسی کلام میں غزلیات، رباعیات، قطعات، قصائد، مرثیہ اور مثنویاں سبھی کچھ موجود ہے اور ان میں سے ہر صنفِ سخن میں غالب اپنی انوکھی شان اور منفرد آن بان کے ساتھ جلوہ آرا ہیں۔ ان کے فارسی کلام کا کلیات مطبوعہ نولکشور جو ان دنوں دستیاب ہوتا ہے اس میں ۲۶ قطعات، ایک مخمس، دو ترکیب بند، ایک ترجیع بند، گیارہ مثنویاں، ۶۴ قصیدے

۲۰۴ رباعیاں اور ۱۴۰ غزلیں شامل ہیں۔ اس کلیات کے آخر میں غالب کی تحریر کردہ تقریظ اس رباعی پر ختم ہوتی ہے

گر ذوقِ سخن بدہر آئین بودے
دیوان مرا شہرتِ پروین بودے
غالب اگر این فنِ سخن دین بودے
آن دین را ایزدی کتاب این بودے

بجنوری ہی کیا خود غالب اپنے فارسی کلام کو کتاب الٰہی کا درجہ دیتے تھے اور اپنے آپ کو خدائے سخن قرار دیتے تھے غالب کا احساس خودی انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ ان کی انانیت کسی کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ ایک جگہ وہ استاذالاساتذہ خسرو اور سعدی پر اپنا تفوق اور برتری ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

باخذ فیض ز مبدا، رفتہ و نم از اسلاف
کہ بودہ ام قدرے دیر تر بدان گاہ
نزول من بجہان بعد یک ہزار و دویست
ظہور سعدی و خسرو بہ ششصد و پنجاہ

غالب عرفی و زلالی کے شاعرانہ کمال کے قائل تھے لیکن اپنے کو ان سے بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں

مسیح شوکت عرفی کہ بود شیرازی
مشو اسیر زلالی کہ بود خوانساری
بسومنات خیالم در آئی تا بینی
رواں فروز بر و دوش شہبائی زنّاری

غالب نے اکثر جگہ اپنے شاعرانہ کمال و عظمت پر فخر کیا ہے۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں

ما ہمانے گرم پروازیم فیض از ما جوی
سایہ ہمچوں دود بالا میرود از بال ما
خارہا از اثر گرمی رفتارم سوخت
منتے بر قدم رہروان است مرا
ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آن کرد کہ گردد فن ما

دل جلوہ می دہد ہنر خود در انجمن
رحمی مگر بجان حسودش نماندہ است
بر روئے حاسداں در دوزخ کشادہ اند
از بہر خویش جنت در بستہ ایم ما

ایک مسلسل غزل میں بیان کرتے ہیں کہ قضا و قدر نے جو کچھ عرب کی فتوحات کے وقت عجم سے چھینا اس کے عوض مجھ کو کچھ نہ کچھ دیا۔ فارس کی جو کچھ پونجی لوٹی تھی وہ قدرت نے مجھے قلم اور زبان کی صورت میں دے دی۔

سوخت آتشکدہ ز آتش نفسم بخشیدند
ریخت بتخانہ ز ناقوس فغانم دادند
گہر از رایت شاہان عجم برچیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند
گوہر از تاج گسستند و بدانش بستند
ہرچہ بردند بہ پیدا بہ نہانم دادند
ہرچہ از دستگہ پارس بہ یغما بردند
تا بنالم ہم از آں جملہ زبانم دادند

اس طویل مضمون کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے

دانش و گنجینہ پنداری یکے ست
حق نہاں داد آنچہ پیدا خواستم

بہادر شاہ کے ایک قصیدے میں اپنی نظم و نثر کی یوں تعریف کی ہے۔

نظم را موجۂ سرچشمۂ حیواں فہمند
نثر را نسخۂ اعجاز مسیحا بینند

نواب یوسف علی خاں والیٔ رامپور کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

غالب بہ سخن نام من آمد ازل آورد
دانی کہ درین شیوہ نیم عامی و جاہل
در فن سخنے دم مزن از عرفی و طالب
این آیۂ خاص است کہ بر من شدہ نازل

غالب کو جس قدر اپنے علم و فن اور شعر و سخن پر ناز تھا اس زمانے میں اس کی حسبِ دلخواہ قدر و منزلت نہ ہوئی۔ انھیں ہمیشہ یہ غم رہا کہ ان کے پایۂ شاعری کو کسی نے نہ پہچانا اور ان کے کلام کی قدر و قیمت کسی نے نہ جانی وہ ہمیشہ اپنے زمانہ کی ناقدری کا شکوہ کرتے رہے۔ ایک جگہ اس کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"حیف کہ ابنائے روزگار حسن گفتار مرا نشناختند۔ مرا خود دل بر آناں می سوزد کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند و از بی نمایشہائے نظر افروز کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سرگراں گزشتند"

غالب نے اپنے اشعار میں بھی جا بجا اس ناقدری کا بیان کیا ہے اور زمانے کی شکایت بڑے درد و سوز سے کی ہے۔ اس کی چند مثالیں دیکھئے

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

در دل ہمی ز بینش من کینہ داشت چرخ
چوں دیدگاں نماند نہاں۔ آشکار کرد

غربتم ناسازگار آمد وطن فہمیدمش
کرد تنگی حلقۂ دام آشیاں نامیدمش

غالب سوختہ جاں را چہ بگفتار آری
بدیاری کہ ندانند نظیری ز قتیل

زخم جگرم بخیہ و مرہم نہ پسندم
موج گہرم، جنبش و رفتار ندانم

شعلہ چکد غم کرا، گل شگفد مزد کو!
شمع شبستانیم۔ باد سحر گاہیم

مولانا حالی نے غالب کی شاعرانہ عظمت اور ہمعصروں کے ہاتھوں ان کی ناقدر دانی کا بیان ان الفاظ میں کیا ہے

"وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے۔ جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لے جائے۔ جو رباعی میں عمر خیام کی آواز میں آواز ملائے اور جس کی نثر کے آگے ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں اس کو بادشاہ کی سرکار سے صرف پچاس روپے ماہوار ملتا تھا اور وہ بھی چھ سات برس سے زیادہ نہیں ملا" (یادگار غالب ص ۴۷)

اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ کون سے اسباب تھے کہ غالب کو ان کے اپنے عہد میں بہت کم سمجھا گیا اور ان کے کلام کی حقیقی قدر شناسی نہ ہوئی؟ تو غالب کی عظمت کا راز اس سوال کے جواب میں پنہاں نظر آتا ہے۔ قطع نظر ان خارجی عوامل کے جن سے کہ غالب کو دوچار ہونا پڑا اگر ان کے کلام ہی پر توجہ کی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان کی ذہنی کاوشوں کی روحِ رواں دو چیزیں تھیں۔ سوچنے کا عمیق مفکرانہ انداز اور اظہار کا نادر اسلوب۔ فکر و نظر کا عمق اور ابلاغ کی ندرت یہ دونوں باتیں اس عہد کے مزاج کے خلاف تھیں۔ اس زمانہ میں سطحی چیزوں کا سطحی انداز میں بیان ہوتا تھا۔ اس کے برعکس غالب سخن سرائی میں انتہائی ریاض سے کام لیتے تھے۔ وہ گداز دل سے ڈھالے ہوئے جام و مینا میں شراب سخن پیش کرنے کے عادی تھے۔

بینیم از گداز دل در جگر آتشے چو سیل
غالب اگر دم سخن رہ بہ ضمیر من بری

ان کا کلام دل گداختگی اور جگر سوزی کا نتیجہ تھا۔ وہ تو اس بات کے قائل تھے

تا بادہ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم

لیکن اس بزم ناؤ نوش کے بادہ کش اس شراب آبگینہ گداز کی تلخیوں کے متحمل نہ ہو سکتے تھے۔

یہ غالب کی مفکرانہ افتاد طبع تھی کہ وہ فہم و فراست کے ابتدائی ایام ہی میں مرزا عبد القادر بیدل جیسے بے بدل مفکر سے لو لگا بیٹھے اور ان کے طرزِ تماشہ انداز بیان اور

نزاکت تخئیل کی باریکیوں میں کھو گئے۔ غالب نے ایک خط میں لکھا ہے۔

"ــــ ابتدائے فکر سخن میں بیدل، اسیر، شوکت کے طرز پر ریختہ لکھتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تک مضامین خیالی لکھا کیا۔ دس برس میں بڑا دیوان جمع ہو گیا۔ آخر جب تمیز آئی تو اس دیوان کو دور کیا۔ اوراق یک قلم چاک کئے۔ دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوان حال میں رہنے دیئے"

غالب کا یہ بیان ان کی اردو شاعری کے متعلق ہے لیکن جہاں تک فارسی شاعری کا تعلق ہے انھیں "تمیز" تو خیر آئی لیکن "اوراق یک قلم چاک" کرنے کی نوبت شاید کبھی نہیں آئی۔ اس زمانے میں متاخرین شعرائے فارسی کا طوطی بولتا تھا۔ بیدل کے ساتھ غنی اور ناصر علی سرہندی نغمہ طراز تھے۔ غنی کا طرۂ امتیاز مثالیہ شاعری تھا اور ناصر علی کا مضمون آفرینی۔ بیدل ان دونوں کا مجموعہ بلکہ سب سے بلند و بالا۔ غالب کے عہد شباب کی ناتجربہ کاری اور ان کہنہ مشقوں کی طلسم بافیاں ظاہر ہے کہ غالب کا اس دور کا کلام کیسا ہوگا۔ زبان بہت ثقیل، عجیب و غریب خیالات، عام مشاہدے اور دنیائے شاعری سے دور کی باتیں، واردات قلب کا فقدان۔ مضامین خیالی بعنوی حسن غائب دور از کار تشبیہیں، کلام شاعرانہ حسن سے عاری، زعم لفظی کی بھرمار۔ آمد کم، آورد اور تصنع زیادہ۔ غرض غالب کی ہر بات بعید از فہم معمہ اور چیستاں تھی اور بقول غالب۔

مدعا عنقا ہے اپنے عالم تقریر کا

بیدل، غنی اور ناصر علی کے رنگ سخن کے پرستاروں کے لئے تو غالب کا اس زمانے کا کلام بھی "ندرت خیال" اور "مضمون آفرینی" کا گراں مایہ نمونہ ہو سکتا ہے مگر جوں جوں غالب کو "تمیز" آنے لگی وہ بھانپ گئے کہ یہ محض خیالی قلابازیاں اور لفظی بازی گریاں ہیں کمال شاعری ہرگز نہیں۔ اگرچہ یہ شاعری قلبی اور وجدانی نہ تھی تاہم یہ باور کرنا پڑے گا کہ اس دماغی ورزش اور لفظی شعبدہ گری نے وادی شعر میں آنے والی مسافتوں کے لئے مرزا کے ذہن کو بے تھکن گامزن ہونے کے لئے تیار ضرور کر دیا۔ مرزا عبدالقادر کی شیفتگی نے کچھ اور فائدے بھی پہنچائے اور اس کے دور اس نتائج برآمد ہوئے۔ بیدل "آئینہ زدودن وصورت معنی نمودن" کے قائل تھے اور یہی شعار غالب نے اختیار کیا۔ بیدل کی شاعری محض برائے شاعری نہ تھی بلکہ انھوں نے شاعری کو زندگی کی عمیق حقیقتوں کی پردہ کشائی کا آلۂ کار بنایا تھا۔ ان کے اشعار حقائق و معارف کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ یہی رنگ غالب کے یہاں رچ بس گیا۔ چنانچہ آئندہ غالب نے یہ مسلک اختیار کیا کہ ـــ "صنعت الفاظ را بر معنے نہ گیرندہ" ـــ بیدل کے یہاں حقیقت کو نئے نئے زاویوں اور نوع بہ نوع پہلوؤں سے دیکھنے کی کوشش جلوہ گر نظر آتی ہے چنانچہ وہ ایک ہی حقیقت کو جداگانہ پیراؤں میں بیان کرتے ہیں غالب کے یہاں بھی مشاہدے کا یہی انداز نظر کارفرما ہوا۔ غالب کے یہاں جب ژولیدہ بیانی کی گھٹائیں چھٹ گئیں تو غالب کے یہی طور و تیور بروئے کار آئے۔ بیدل کے تعمق خیال اور جدت مضامین کے دوش بدوش اس تنظر و فکر نے غالب کے گلستان شاعری میں رنگارنگ پھولوں کی بہار دکھائی۔ صرف یہی نہیں بیدل کی بیباکی، مذہبی آزاد خیالی اور وسیع المشربی نے بھی مرزا کی زندگی اور شاعری میں جگہ پائی اور تصوف کا رنگ خواہ "برائے شعر گفتن" ہی سہی بیدل ہی کی لگن کا نتیجہ تھا۔

غالب نے سفر کلکتہ سے پہلے فارسی شعر گوئی پر زیادہ توجہ صرف کرنا شروع کر دی تھی اس سفر و حضر کے دوران (اگست ۱۸۲۶ء سے نومبر ۱۸۲۹ء تک) زیادہ تر فارسی ہی میں شعر کہے گئے۔ غالب نے کلکتہ میں "گل رعنا" کے نام سے جو کلام منتخب کیا تھا اس میں ایک قصیدہ در مدح اندر و استرلنگ (۴۵ شعر) دو قطعات (۴۴ شعر) ایک مثنوی بعنوان "باد مخالف" (۱۰۴ شعر) اور ستائیس غزلیں (۲۵۳ شعر) شامل تھیں۔ غالبیات کے محقق مالک رام کی رائے ہے کہ ان

مجموعے کے کل ۴۵۵ شعروں میں سے ۳۴۹ شعر اس سفر کی یادگار ہیں اور باقی ۱۰۶ اشعار ماقبل کے کلام سے لئے گئے ہیں۔ غزلیات میں اضطرار ما۔ دشوار است۔ زندخوانی ماست، بجوش آمد۔ آرزو کنند، بے نیاز باید بود، دیدنم بنگر، جایم ہنوز، سردارم، خوناب شستہ ایم، ایماں نیستن برگراں خواہم شدن، درآئینہ، زما یاری۔ قوافی و ردیف کی غزلیں اس زمانے کی یادگار بتائی جاتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اس وقت تک بیدل کا رنگ قائم ہے۔ خیالات دقیق ہیں۔ دوراز کار تشبیہات موجود ہیں لیکن وہ پہلی سی بھرمار نہیں۔ کلام میں اجنبیت و غرابت نظر نہیں آتی۔ اس دور کی یہ غزل

بیا و جوش تمنائے دیدنم بنگر
چو اشک از سر مژگاں چکیدنم بنگر

فارسی میں سعدی اور اردو میں میر کی سی غمزدہ فتادگی اور سوز و گداز کی حامل ہے۔ اس غزل کے ایک دو شعر اور ملاحظہ ہوں۔

ز من بہ جرم تپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر
شنیدہ ام کہ نہ بینی و نا امید نیم
نہ دیدن تو شنیدم، شنیدنم بنگر

اس دور کی مثنوی "باد مخالف" کا شمار بھی غالب کی اعلیٰ مثنویوں میں ہوتا ہے۔ اس کی زبان صاف انداز بیان رواں اور شگفتہ ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت غالب، عرفی، نظیری، ظہوری، طالب وغیرہ سے متاثر ہو چکے تھے چنانچہ انھیں کے کلام کو سند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

دامن از کف کنم چگونہ رہا
طالب و عرفی و نظیری را
خاصہ روح و روان معنی را
آں ظہوری جہان معنی را
آنکہ از سرفرازی قلمش
آسماں سایست پرچم علمش
طرز اندیشہ آفریدۂ اوست
در تن لفظ جان دمیدہ اوست
پشت معنی قوی ز پہلویش
خامہ را فخر ہم ز بازویش
طرز تحریر پر زانوی از وی
صفحہ از تنگ مانوی از وی
فتنۂ گفتگوے اینانم
مست لائی سبوے اینانم

ذہنی ارتقا کے اس مرحلے پر غالب متاخرین شعرائے فارسی کی محفل سے اُٹھ کر عہد اکبر، جہاں گیر اور شاہجہاں کے شعرا کی بزم میں آ بیٹھے اور ان کی سخن سرائیوں سے لطف اندوز ہوئے۔ غالب نے خود اس اصلاح و تربیت کا ذکر کلیات کے آخر میں مذکورہ تقریظ میں کیا ہے اور اس کا ترجمہ مولانا حالی نے یادگار غالب میں یوں کیا ہے۔

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا رہا جو راہ صواب سے نابلد تھے آخر جب ان لوگوں نے، جو اس راہ میں پیش رو تھے دیکھا کہ میں باوجودیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور پھر بے راہ بھٹکتا پھرتا ہوں ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا

اور نظیری نے اپنی خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔

اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا
کلک رقاص چال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقا
جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا ؎

(یادگار غالب ص۲۲۲ - ص۲۲۳)

اس حقیقت کا اظہار غالب کے اشعار میں بھی جا بجا ہوا ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیرون
با ظہوری و صائب محو ہم زبانی ہاست

چوں نشاز و سخن از مرحمت دہر بخویش
کہ برد عرفی و غالب بہ سوش باز دہد

زفیض نطق خویشم بہ نظیری ہم زباں غالب
چراغی را کہ دودی ہست در سر زود در گیرد

عرفی، نظیری و ظہوری وغیرہ نے غالب کو عنی اور ناسر کے شاعرانہ سراب سے نکالا۔ عرفی کا جوش بیان، استدلال کی قوت اور جذبات کی گہرائی، نظیری کی سادگی، پرکاری، افتادگی، دربودگی، معاملہ بندی، انداز کا تیکھا پن اور شوخی، ظہوری کے علو خیال اور عمق فکر سے غالب نے اپنے مزاج کے مطابق حصہ پایا یہیں سے غالب کے ہمہ گیر مشاہدے اور بالغ نظری کا دور شروع ہوتا ہے۔ ذہنی اور جذباتی تجربات میں وسعت پیدا ہوتی۔ مت بڑا ہی تنوع کارفرما ہوا عشق و محبت کی چاشنی سے کلام میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوئی۔ ترہ جذبات کے باوجود زندگی کی صحیح اور سچی تصویر کشی کی گئی۔ مضامین خیالی کے بجائے حالی بن گئے اظہار خیالات میں خلوص جلوہ نما ہوا۔ شوخی اور ظرافت نے خندہ زیر لب کی کلیاں کھلائیں۔ غدیانی ندرت بینی تازگی کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔ ایک طرف یہ کیفیت ہوئی کہ ؎ آید بہ زباں ہر آں چہ از دل بر زد ـــــ اور دوسری جانب حسن ظاہری کی مشاطگی کرنے لگے۔ آرائش گفتار کا خیال دائم سلامت رہا اور یہ دعویٰ کیا

گر بہ معنی نہ رسی جلوۂ صورت چہ کم است
شکن زلف و سر طرف کلا ہے دریاب

مرزا کی فارسی شاعری کا عہد زریں سفر کلکتہ سے شروع ہو کر ۱۸۴۷ء کے قریب ختم ہوتا ہے۔ بہت سی غزلیں اور طویل نظمیں اسی عہد کی کاوشیں ہیں۔ اسی زمانے میں سب سے پہلے مرزا کا فارسی کلام "میخانہ آرزو انجام" کے نام سے ستمبر اکتوبر نومبر ۱۸۳۵ء کی سہ ماہی میں مرتب ہوا جو اب دستیاب نہیں ہوتا۔ سب سے پہلا نسخہ جو اب تک محفوظ ہے وہ ۴ر جولائی ۱۸۳۸ء کا لکھا ہوا ہے لیکن غالب کا فارسی دیوان پہلی مرتبہ ۱۸۴۵ء میں طبع ہوا جو ۶۶۷۲ اشعار پر مشتمل ہے۔ ۱۸۴۷ء میں جب بہادر شاہ ظفر سے غالب کے تعلقات خوشگوار ہوئے تو بپاس خاطر شاہ ریختہ غالب کی شاعرانہ کاوشوں سے زیادہ فیض یاب ہوئی۔ ۴ر جولائی ۱۸۵۰ء کو مرزا غالب نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ کے خطاب اور خلعت سے سرفراز ہوئے اور چھ سو روپے سالانہ پر شاہان تیموری کی تاریخ نویسی پر مامور ہوئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ولی عہد شاہ شہزادہ فتح الملک نے ان کی شاگردی اختیار کی اور چار سو روپیہ سالانہ مشاہرہ مقرر کیا۔ اس دور میں مرزا نے شاہ اور شہزادے کی مدح میں بلند پایہ قصائد لکھے۔ یہ غالب کی قصیدہ گوئی کا شباب تھا۔

اس دور کے قصائد معنوی خوبیوں اور ظاہری حسن سے مزین ہیں۔ اس زمانے میں بعض معرکۃ الآرا مدحیہ قصائد لکھے گئے لیکن غالب کا مسلک صرف مدح سرائی ہی نہ تھا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض دفعہ غالب کو حالات سے مجبور ہو کر یہ بھی کرنا پڑی لیکن اکثر انھوں نے اس صنعت کو فلسفہ زندگی نظم کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ غالب کا سب سے دلآویز قصیدہ

از نکوئی نشاں نمی خواہم ✦ خویش را بدگماں نمی خواہم

توانگرستائی کا نتیجہ نہیں۔ غالب کے اکثر قصیدوں میں تشبیب مدح سے زیادہ ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے۔ ان میں اکثر مناظرِ قدرت کے رنگا رنگ پہلوؤں اور فطرت کے بوقلمون نظاروں کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ منظر نگاری کے اعلیٰ نمونے اور منظریہ شاعری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ غالب کے قصیدے

(۲۲) داد گوتا ستم براندازد

طرح نہ چرخ دیگر اندازد

میں صبح کے دل کش منظر کی مرقع کشی کی گئی ہے۔ مندرجہ ذیل قصیدوں (۱۴ و ۴۳)

خیز تا بنگری بشاخ نہال

طوطیاں زمردیں تمثال

باز پیغام بہار آورد باد

مژدہ بہر روزگار آورد باد

میں موسم بہار کی تصویر کشی اور اس کی پر کیف اور حیات بخش کیفیتوں کا بیان ہے۔ ایک اور قصیدے (۵۷)

عید اضحیٰ بسر آغاز زمستان آمد

وقت آراستن حجرہ و ایوان آمد

میں موسم سرما کے احوال و اثرات کا دلفریب بیان ملتا ہے غالب کے قصیدے جہاں مدح سرائی، مناظر قدرت اور مظاہر فطرت کی لفظی تصویر کشی کے اعلیٰ نمونے ہیں وہاں حکیمانہ افکار سے لبریز بھی ہیں۔ غالب کے فلسفیانہ تصورات کے دلدادگان انہیں بحرِ زخار میں غوطہ زنی کرتے اور دُرِّ لطیف نایاب پاتے ہیں۔

آج کل قصیدہ گوئی کو زیادہ پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن غالب کے زمانے تک یہی صنف شاعر کے کمالات کی کسوٹی تھی۔ امیر خسرو قصیدہ گوئی ہی کو شاعری کی معراج سمجھتے تھے چنانچہ انھوں نے پہلے پہل اپنے دیوانوں میں غزلوں کو جگہ تک نہ دی۔ خود غالب کا بیان ہے

”جو قصیدہ نہیں لکھ سکتا اس کو شعرا میں شمار کرنا نہیں چاہیئے“

دراصل یہی وہ صنف ہے جس میں شاعر بقصد و ارادہ غزل کی تنگنائے سے نکل کر رمز و کنایہ کے بجائے بالتفصیل اپنے خیالات و افکار بیان کرتا ہے اور اس کی فکر و نظر اور تکمیل فن کا اظہار ہوتا ہے غالب کے قصیدے معنوی حسن اور طرز ادا کی پختگی کے اعلیٰ نمونے ہیں حالی کا بیان ہے

”مرزا کے قصائد کیا باعتبار کمیت اور کیا بلحاظ کیفیت ان کے اصناف نظم میں سب سے زیادہ ممتاز صنعت ہے“

غالب ایک جگہ درباری دور کی اُردو غزلیات اور فارسی قصائد کے بارے میں لکھتے ہیں۔

”یہ غزلیں کا ہے کو ہیں پیٹ پالنے کی باتیں ہیں۔ جیسے فارسی قصیدے جن پر مجھ کو ناز ہے کوئی ان کا لطف نہیں اُٹھاتا“

بھلا ان کا لطف کون اُٹھائے جب ریختہ دلوں کو موہ رہی ہو۔ چنانچہ ”پیٹ پالنے کی باتیں“ ہی باعث قدر و افتخار ثابت ہوئیں اور جس پر مرزا کو ناز تھا ان پر توجہ کرنے سے لوگ بے نیاز رہے۔

قصائد کے علاوہ حمد، نعت، منقبت اور دیگر طویل نظموں میں بھی غالب نے وہ زورِ قلم صرف کیا ہے جس کی مثال کم ملتی ہے۔ مرزا کی گیارہ مثنویاں جن کی طرف بہت کم توجہ دی جاتی ہے کیا بلحاظ موضوع اور کیا باعتبار اسلوب خاصے کی چیزیں ہیں۔ ”سرمۂ بینش“، ”درد و داغ“، ”رنگ و بو“ اور ”بیان نموداری شان نبوت و ولایت کہ درحقیقت پرتو نور الانوار حضرت الوہیت ست“ متصوفانہ موضوعات اور حکیمانہ افکار کی حامل ہیں۔ ”سرمۂ بینش“ جو سراج الدین بہادر شاہ کی مدح میں لکھی گئی تھی درحقیقت متصوفانہ مسائل پر مشتمل ہے اور اس میں شعرائے متصوفین کی طرح حسن و عشق کے پردے میں وحدت اور تہذیب اخلاق کو پیش کیا گیا ہے ”درد و داغ“ میں بڑی لطیف اور دلکش تعبیرات کے ساتھ مسلک تقدیر

کو بیان کیا گیا ہے اور ایک حکایت کے ذریعے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ لاکھ کوشش کے باوجود نوشتۂ تقدیر مٹ نہیں سکتا ۔ "رنگ و بو" میں حکایت کے پیرائے میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ دنیاوی جاہ و دولت اور قوت و جبروت بے اعتبار چیزیں ہیں اصل چیز روحانی ریاضت و ہمت ہے جس سے انسان شہود حق کی منزل تک پہنچتا ہے ۔ آخر الذکر متصوفانہ مثنوی میں فلسفہ الہیات زیر بحث آیا ہے اور وحدت الوجود ، وحدت الشہود ، لا وجود الا اللہ وغیرہ متصوفانہ مسائل کو بیان کیا ہے ۔ رضائے الہی اور تقدیر الہی کو ایک ہی چیز بیان کیا ہے اور راضی بر مشیت الہی رہنے کی تلقین کی گئی ہے ۔ مسئلہ امتناع نظیر یعنی یہ کہ رسول اللہ کا نظیر و مثل پیدا ہونا ممکن ہے یا نہیں ، کی وضاحت کی ہے ۔ غرض ان مثنویوں میں تصوف کے خاص و عام موضوعات کو مرزا نے اپنے خاص انداز بیان میں پیش کیا ہے ۔ غالب کی مثنویاں "چراغ دیر" اور "باد مخالف" سفر کلکتہ کی یادگار ہیں ۔ "چراغ دیر" بنارس میں قیام کے دوران لکھی گئی تھی ۔ یہ مرزا غالب کے جمالیاتی ذوق کا مرقع ہے جس میں جذبات کا جوش و خروش ، تشبیہ و استعارہ کی ندرت اور طرفہ تعبیرات ایسی چیزیں ہیں جنھوں نے اس فن پارے کو شاعرانہ محاسن کا گراں مایہ نمونہ بنا دیا ہے ۔ "باد مخالف" معترضین کے جواب میں لکھی گئی تھی اس میں ان کی اپنی داستان غم بھی بیان ہوئی ہے جو اس مثنوی کی جان ہے ۔ اس کے چند شعر دیکھیے کس درد و سوز سے کہتے ہیں

کیستم ، دل شکستۂ غم زدۂ
بیدلے خستۂ ستم زدۂ
دردمندے جگر گداختۂ
از غم دہر زہرہ باختۂ
چہ بلا ہا کشیدہ ام آخر
کہ بہ اینجا رسیدہ ام آخر
بسیہ روز عزتم بنشیند
تیرہ شبہائے وحشتم بینید

مرزا کی دو مثنویاں تہنیت شاہ و شہزادہ کے بیان میں ہیں اور دو منظوم تقریظیں ہیں ۔ آخری مثنوی "ابر گہر بار" مرزا کے انداز فکر اور جوش بیان کا ایسا کارنامہ ہے جس کی مثال فارسی شاعری میں ملنی محال ہے ۔ اس میں حمد ، نعت ، منقبت ، ساقی نامہ ، مغنی نامہ وغیرہ بہت سی چیزیں شامل ہیں لیکن اصل چیز مناجات ہے جو اس مثنوی کی روح رواں ہے ۔ اس کی ابتدا سپاس نامہ سے ہوتی ہے جس میں مبداء فیاض کا ذکر کیا ہے اور پھر خدا اور کائنات کے تعلق کو واضح کیا ہے پھر مناجات شروع ہوتی ہے اور شاعر حرف شکایت زبان پر لاتا ہے ۔ اس میں طنز و شوخ نگاری اور شدید احساس غم کی آمیزش نے دیگر شاعرانہ محاسن میں گھل مل کر اسے صدر اول کی چیز بنا دیا ہے ۔ اس مثنوی میں غالب کے طرفہ طرز فکر کی عمدہ مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں جن سے مرزا کی حکیمانہ نگاہ اور مفکرانہ نظر کا مظاہرہ ہوتا ہے ۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو ۔ انسانی ارتقاء و بقا اور تعمیر و استحکام "انا" کے جتنے نظریات معرض وجود میں آئے ہیں ان میں حرکت و قوت ہی ارتقاء کی ضامن ہے ۔ انسانی فعالیت کی نمو تضاد اور ارتقاء بالضد سے ہوتی ہے جو قانون فطرت کے ہر عمل میں بنیادی طور پر موجود ہے ۔ حیات جو شعلہ مزاج ، شورانگیز ، سوختن ناتمام ہے اور جس کی سرشت میں مشکل کشی اور جفا طلبی ہے اسے ایسی جنت کیسے راس آسکتی ہے جس میں کوئی حرکت نہیں کوئی ہنگامہ نہیں ، کوئی تصادم نہیں ۔ قوت عمل میں جوش و خروش اور حیات جاوداں کے لئے ستیزہ کاری کا کوئی سامان نہیں ۔ اس جہان "سوز و ساز و درد و داغ و جستجو و آرزو" (اقبال) ۔ کے مکین کو بھلا یہ "پاک میخانہ بے خروش" یا بقول اقبال "جان کور ذوقے" کیوں کر بھا سکتا تھا چنانچہ غالب انتہائی شاعرانہ تعبیرات سے کہتے ہیں ۔

دراں پاک میخانۂ بے خروش
چہ گنجائی شورش نائی و نوش
سیہ مستی ابر و باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غم ہجر و ذوقِ وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ انیشش کجا
فریبد بسوگند و ینشش کجا
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند دلالۂ
نہ دل تشنۂ ماہ پرکالۂ

اقبال نے بھی قدرے کم شاعرانہ اور زیادہ فلسفیانہ انداز میں انسانی فعالیت کے لئے اسی تضاد کی اہمیت اور ارتقار بالضد کے فلسفے کو پیام مشرق کی ایک نظم "بہشت" میں پیش کیا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے

مرے اندر جہانے کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

غالب کے قصائد اور مثنویوں کی قدر قیمت کو بہت کم جانچا اور پرکھا گیا ہے جو کیا بلحاظ موضوع اور کیا بہ اعتبار اسلوب فارسی شاعری میں بلند پایہ چیزیں ہیں۔ اسی طرح مرزا کی مرثیہ نگاری کی طرف بھی بہت کم توجہ کی گئی ہے اور اس صنفِ شعر میں مرزا کا کلام مناسب قدر افزائی سے محروم رہا ہے۔ ان کے مندرجہ ذیل نوحوں میں مضمون کی طرفگی و ندرت کے ہمراہ سوز و گداز اور درد و اثر کی فراوانی ملتی ہے۔

اے فلک شرم از ستم بر خاندان مصطفیٰ
داشتی زیں پیش سر بر آستان مصطفیٰ
اے کج اندیشہ فلک حرمت دیں بایستی
غم شاہ نجوں شد نہ چنیں بایستی
وقت ست کہ در پیچ و خم نوحہ سرائی
سوز و نفس نوحہ گر از تلخ نوائی
سرو چمن سروری افتاد ز پا ہائے
شد غرقہ بخوں پیکر شاہ شہدا ہائے

اہل بیت کی محبت میں گریہ و ماتم کے یہ والہانہ اظہارات فارسی شاعری کے نادرات میں سے ہیں۔ غالب نے ایک ترکیب بند میں شاہزادہ کا مرثیہ قلمبند کیا ہے جو غمناکی اور اندوہ گینی کے اعتبار سے مرثیہ نگاری کی اعلیٰ مثال ہے اس کے دو بندوں کے چند اشعار دیکھئے

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو
اے چشم از تراوش دل اشکبار شو
اے خوں بدیدہ در رو گداز جگر فرست
اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو

اے رہ نورد عالم بالا چگونۂ
مابی تو در ہمیم تو بی ما چگونۂ
با گل رخان دہر وفائے نداشتی
با حوریان آئینہ سیما چگونۂ
بے مطرب و ندیم و غلامان خرد سال
بے باغ و قلعہ و لب دریا چگونۂ

غالب کی افتاد طبع میں احساس غم کا عنصر نمایاں حیثیت رکھتا ہے جس میں حادثات زمانہ سے اور تپ تاب پیدا ہوئی۔ مذکورہ فوق نوحوں اور مرثیہ کے علاوہ اُن کے فارسی کلام کی ہر صنف میں غم و اندوہ کے جذبات کی فراوانی ملتی ہے انھوں نے ایسے جذبات کے اظہار

میں ندرت خیال و بیان سے کام لیا ہے اور سوز و گداز اور زاری و نالی کے دل نشیں پیکر تراشے ہیں ۔ ان کی مثالیں ملاحظہ ہوں ۔

می پرد مور گر جاں بسلامت ببرد
تا چہ برق ست کہ شد نامزد خرمن ما
گشتہ در تاریکی روزم نہاں
کو چراغے تا بجویم شام را
وقتست کہ خون جگر از دیدہ بجوشد
چنداں کہ چکد از مژہ داد رس ما
مو بر آید ز کف دست اگر دہقاں را
نیست ممکن کہ کشد ریشہ سر از دانہ ما
آں کشتی بشکستہ ز موجم کہ تباہی
افگند در آتش گر از آبم بدر آورد
ہفت آسیا بگردش و ما در میانِ او
غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود
نومیدی ما گردش ایام ندارد
روزے کہ سیہ شد سحر و شام ندارد
بلبل بچمن بنگر و پروانہ بمحفل
شوق ست کہ در وصل ہم آرام ندارد
چرخ ہر روز غم فردا بخوردن می دہد
تا قیامت فارغ از فکر معاشم کردہ اند
کوثر اگر بمن رسد خاک خورم نہ بے نمی
طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم نہ بے بری

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے بعد جب دربار برخاست ہوئے اور درباداری کا دور ختم ہوا تو مرزا غالب پھر فارسی شاعری میں منہمک ہو گئے اور ان کی عمر کے باقی بارہ سال بھی بہت ممتاز توجہ کا مرکز بنا رہے ۔ اس دور تک وہ رندی و درویشی، خوشی و افسردگی، بیقراری اور تسلیم و رضا — غرض حیات کے تمام نشیب و فراز سے گزر چکے تھے ۔ اب ان کی زندگی میں ہمواری آ چکی تھی ۔ اس دنیائے غم و الم سے بے پروائی پیدا ہو گئی ہے " نہ دارم غم ہستی خویشتن " ۔ وہ زندگی کے پست و بالا اور ادنیٰ و اعلیٰ پر خندہ زن ہوتے ۔

رازداں خوئے دہرم کردہ اند
خندہ بر دانا و ناداں می زنم

یہ جذبات کے توازن اور ذہنی ارتقا کے معراج کا زمانہ تھا ۔ غالب نے عمر بھر ایک طرف نہاں خانہ دل کا مطالعہ کیا

بجہم نقب ہمی زد بہ نہاں خانۂ دل
مژدہ باد اہل ریا را کہ ز میداں رفتم

اور دوسری طرف کائنات اور انسانوں کا مشاہدہ کیا ۔ ایک خط میں غلام غوث بے خبر کو لکھتے ہیں

" ستر برس کی عمر ہے ۔ بے مبالغہ کہتا ہوں ستر ہزار آدمی نظر سے گزرے ہوں گے زمرۂ خاص میں سے زمرۂ عام کا شمار نہیں ۔ میں آدمی نہیں آدم شناس ہوں "

زندگی کے آخری دور میں مرزا نے کہن سالی اور خرابی صحت کی بدولت مضمون تازہ اختراع کرنے کے بجائے زیادہ وقت کلام کی عروضی خصوصیات، الفاظ کی تراش و خراش، ترکیبوں کی نشست و برخاست اور اشعار کی نوک پلک سنوارنے میں صرف کیا ۔ وفات سے چھ برس قبل مرزا کے فارسی کلام کا دوسرا اڈیشن ۱۸۶۳ء میں طبع ہوا اس دور تک مرزا فن کاری کے تمام مراحل طے کر چکے تھے ۔ اس "کلیات نظم فارسی" میں مرزا کے کل ۱۰۴۲۴ اشعار شامل ہیں ۔ گویا اس میں پہلے اڈیشن (مطبوعہ ۱۸۴۵ء) سے ۳۷۵۲ شعر زیادہ ہیں ۔ مرزا کا جو کلام اس مجموعے میں شامل نہ ہو سکا تھا یا اس کے بعد کہا گیا تھا اسے " سبد چین " (مطبوعہ ۱۸۶۷ء) اور " سبد باغ دو در " (مرتبہ ۱۸۶۹ء) میں شامل کیا گیا ۔ ان میں علی الترتیب ۷۳۰ اور ۱۴۶ اشعار ہیں ۔ ان کے علاوہ غالب نے " دعا ر صباح " کا منظوم فارسی ترجمہ بھی کیا جس میں کل ۱۲۹ شعر ہیں ۔ یہ مثنوی بھی غالب کی زندگی میں

الگ طور پر مطبع نولکشور لکھنو سے شائع ہوئی تھی

اس "رازدانِ خوئے دہر"۔ "آدم شناس"۔ "نہاں خانۂ دل کے نقیب"، "نغمہ سنج عشق" اور "نکتہ دانِ علم"۔۔۔ ہم نغمہ سنج عشقم و ہم نکتہ دانِ علم ۔۔۔ کے "نقشہائے رنگ رنگ" اور "ریز دی کتاب" کو اگر فکر و نظر کی باریکیوں، علم و حکمت کی وسعتوں، فلسفیانہ موشگافی اور نفسیاتی ژرف نگاہی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو اس میں انسان، کائنات، خدا، دنیا و عقبیٰ، بہشت و دوزخ ۔۔۔ غرض ہر چیز پر مرزا کی گہری نظر کا اظہار ہوتا ہے۔ اشیاء کی حقیقت و حقائق کے علاوہ خدا، کائنات اور انسان کے روحانی ربط و تعلق پر روشنی پڑتی ہے ۔۔۔ حقیقت اشیاء کا سراغ لگاتے ہوئے غالب عدم اور وجود لا اور الا کے منفی و مثبت پہلوؤں کا حل نظریہ وحدت الوجود میں تلاش کرتے ہیں اور لاموجود الا اللہ اور لا مؤثر فی الوجود غیر اللہ کے پردے اٹھاتے ہیں۔ حیات و ممات، بقا و فنا، ہستی و نیستی کے رموز کھولتے ہیں۔ فلسفۂ حیات کے بیان میں کہیں نظریۂ نشاط اور کبھی فلسفۂ حزن کی گتھیاں سلجھاتے ہیں۔ کہیں زندگی کے نشاط میں کھو جانے کے اشارے ہیں کہیں رنج و غم کی رفعت اور اندوہ و الم کی عظمت کا اظہار ہے اور کبھی صوفی صافی کی طرح رنج و راحت سے بے نیازی غالب کے کلام کو اگر زندگی کی عکاسی اور حقیقت نگاری کے پہلو سے جانچا جائے تو اس میں کہیں حسن کائنات کے دلآویز مرقعے ملتے ہیں اور کہیں جمال انسانی کے جلوے دل و نظر کو خیرہ کرتے ہیں۔ کہیں قدرت کے مظاہر آشکار ہوتے ہیں اور کہیں انسانی فطرت کے راز افشا کیے جاتے ہیں۔ کہیں عشق و محبت کا سوز و گداز اور عجز و انکساری، کہیں ہوس کی ستیزہ کاری۔ کہیں انبساط اور نائے و نوش کے ترانے کہیں غم و الم کے نالے، آرزوؤں کی ہلچل اور بیتابی، انسانی سعیٔ لاحاصل اور حرماں نصیبی، ہجوم تمنا اور ناامیدی، کہیں قضا سے دعوت سربازی اور کبھی دنیا سے تنفر اور بیزاری، کبھی خدا سے بغاوت اور کبھی اس کے رحم پر اعتماد۔ غرض شعر کیا ہیں موجودات کی مصوری اور دلی کیفیات و قلبی واردات کی تصویریں ہیں جو حروف کی صورت صفحۂ قرطاس پر کھینچی گئی ہیں۔ کہیں کائنات کے اسرار اور کہیں انسانی نفسیات کے سربستہ راز اجاگر ہوتے ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ اس جہان رنگا رنگ میں انسان کا ذکر ہو یا خدا کا، دنیا کا بیان ہو یا عقبیٰ کا، بندے پیش نظر ہوں یا فرشتے احباب ہوں یا محبوب، این جہانی ہوں یا آنجہانی، خوشی کے قہقہے ہوں یا نالہ ہائے ماتم ہر جگہ مرزا کی طبعی ظرافت و خوشی بجلی کی طرح کوندتی اور دلوں کو جگمگاتی ہے جس سے حزن و الم کے بادل، درد و غم کی تاریکیاں، مایوسی و حرمانی کی گھٹائیں چھٹ جاتی ہیں۔ شوخ و شگفتہ مسکراہٹوں کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔ مرزا کی ظرافت بڑی متین، سنجیدہ اور ذہن کو چونکانے والی ہوتی ہے جس سے محض خندہ زیر لب پیدا ہوتا ہے۔ شوخ نگاہی اور شوخ نگاری ایسی صفات ہیں جو فارسی ادبیات میں صرف غالب ہی کا حصہ ہیں۔ اس کا بھی ذرا لطف اٹھاتے چلیے۔

پاک خور امروز و زنہار از پئے فردا منہ
در شریعت بادہ امروز آب فردا آتش است

نیکی زتست از تو نخواہیم مزد کار
در خود بدیم کار تو ایم، انتقام چیست

رموز دیں نشناسم درست۔ معذورم
نہاد من عجمی و طریق من عربی است

خواجہ فردوس بہ میراث تمنا دارد
وائے گر در روش نسل بہ آدم نرسد

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نکرد

شنیدہ کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

پاکستان رائٹرز گلڈ
کے
اپنے اشاعت گھر کی مطبوعات

اُردو

ہاجرہ مسرور	"تیسری منزل"	(افسانے)	۵/۵۰ روپے
میرزا ادیب	"فصیلِ شب"	(ڈرامے)	۴/- روپے
یوسف ظفر	"صدا بصحرا"	(مجموعۂ کلام)	۲/۵۰ روپے
انور	"سورج بھی تماشائی"	(افسانے)	۵/۵۰ روپے
یونس احمر	"لال چادر"	(بنگالی افسانہ نگار سید ولی اللہ کے مشہور ناول "لال شالو" کا ترجمہ)	۲/۵۰ روپے
ڈاکٹر سید علی شاہ	"اُردو میں سوانح نگاری"	(تاریخ و تنقید)	۷ روپے

بنگلہ

فرخ احمد	"نوفل و حاتم"	(منظوم ڈرامہ)	۲/۵۰ روپے
مستفیض الرحمٰن	"آخری نبیؐ"	(نثر)	

انگریزی

پریذنٹنگ پاکستان پوئٹری	(منتخب اُردو نظموں کے انگریزی تراجم)	۱۰ روپے

پاکستان رائٹرز گلڈ - اسٹریچن روڈ - کراچی

ایک قطعے میں کہتے ہیں کہ اے زاہد ہمیں لعن طعن نہ کر اور زندقیوں سے نسبت نہ دے۔ ہم مسلمان ہیں، قرآن کو کلام حق مانتے ہیں۔ اس میں اوامر و نواہی کے احکامات ہمیں تسلیم ہیں لیکن چونکہ حافظہ ذرا کمزور ہے اس لئے صرف دو ہی باتیں یاد رہ گئی ہیں۔

لا تقربوا الصلوٰۃ زنہیم بخاطر است
و ز امر یاد ماندہ کلوا و اشربوا مرا

ایک رباعی میں کہتے ہیں کہ بے مقدوری کی حالت میں جب زندگی تلخ ہوتی ہے نجات کی امید پر اطاعت نہیں ہوسکتی۔ کاش ایسا ہوتا کہ جس طرح حج اور زکوٰۃ میں استطاعت اور تمول شرط ہے روزہ اور نماز میں بھی یہی شرط ہوتی

در عالم بے زری کہ تلخ ست حیات
طاعت نتواں کرد بامید نجات
اے کاش ز حق اشارت صوم و صلوٰت
بودی بوجود مال چوں حج و زکوٰت

بعض اوقات غالب کی شوخی، گستاخی کی حد سے بھی گزر جاتی ہے۔ ایک رباعی ہے

یارب تو کجائی کہ بہ ما زر نہ دہی
بیدرد خدائی کہ بہ ما زر نہ دہی
نے نے۔ تو نہ غائبی و نے بے رحمی
بے مایہ چوں مائی کہ بہ ما زر نہ دہی

شاعر کا مقصد کوئی بات کہہ دینا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ دیکھنا بھی ہوتا ہے کہ وہ بات کس طرح کہی جائے۔ غالب کی فن کاری کا کمال یہ ہے کہ اس نے دنیا بھر کے موضوعات کو بڑی چابکدستی اور ہنرمندی، جامعیت فصاحت و بلاغت، کہیں تفصیل و اطناب کہیں ایجاز و اختصار اور رمز و کنایہ سے شاعری کے نازک آبگینوں میں ڈھالا ہے۔ شاعری میں حسن بیاں کے تمام کارندے، تغزل میں اثر و تاثیر کی تمام لونڈیاں مرزا غالب کے اشاروں پر رقصاں ہوتی ہیں۔ غالب کے فن شاعری کا سب سے بڑا اعجاز معنی آفرینی ہے۔ اس میں موضوع بھی نیا اور اچھوتا ہوتا ہے اور اسلوب بھی انوکھا۔ یہ خصوصیت ایک نابغہ ہی کا حصہ ہے۔ مرزا غالب نکتہ وری میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ اس میں خیال خواہ کہنہ اور پامال ہی کیوں نہ ہو لیکن پیرایہ بیان میں ایسی جدت، ندرت اور طرفگی ہوتی ہے جس سے خیال کی کہنگی دور ہو جاتی ہے اور اس میں ایک انوکھی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے لئے غیر معمولی شاعرانہ مہارت، قدرت زبان اور رفعت تخیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ معنی آفرینی اور نکتہ وری کے اظہار کے لئے حسن تعبیر لازم ہے حسن تعبیر کا دامن ایک طرف زبان پر قدرت، نادر تشبیہات، استعارہ و کنایہ و تمثیل میں ندرت اور دوسری طرف تخیل کی نزاکت و رفعت اور طرفگی خیالات سے بندھا ہوتا ہے۔ غالب کا کلام ان خصوصیات کا مرقع ہے جس کی بہت سی مثالیں اوپر گزر چکی ہیں۔ یہاں چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں

در بلا بودن بہ از بیم بلا ست
قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

از گداز یک جہاں ہستی صبوحی کردہ ایم
آفتاب صبح محشر شاعر سرشار ما

گرفتہ خاطر ام اسباب دسر خوشی باقی است
ترانہ گر نہ گنجد بہ سازی خواہم

اے کہ اندریں وادی مژدہ از ہما دادی
بر سرم ز آزادی سایہ را گرانہاست

مرا دمیدن گل در گمان فگند امروز
کہ باز بر سر شاخ گل آشیانم سوخت

نوید آمدن رشک از قضا دارد
شگفتہ روی گلہائے بوستانم سوخت

نازم فروغ بادہ ز عکس جمال دوست

گوئی فشردہ اند بجام آفتاب را
سرگرمی خیال تو از نالہ باز داشت
دل پارہ آتشے ست کہ دودش نماندہ ہست
ز جوش دل ہنوز ش ریشہ در آبست پنداری
بمژگاں قطرۂ خوں غنچہ نا چیدہ را ماند
شوخی نمیش ہیں جنبش نیمشں ہیں
غنچہ راست آہنگے سرو راست رفتارے
جلوہ کن منت منہ از ذرہ کمتر نیستم
حسن با ایں تا نباکی آفتابے بیش نیست

غالب نے شاعری میں بیدل سے فیض پایا تھا جن کی تخیل ماورائی ادراک کی تخلیق اور انداز بیان اس تخیل کا آفریدہ ہے۔ یہ رنگ غالب کی انفرادیت میں کچ بس کر جدت ادا، حسن تعبیر، ابداع بیان اور جوش و سرمستی کی صورت نمایاں ہوا۔ غالب کی معنی آفرینی اور نکتہ وری سے ایک طرف حسن تعبیر میں تخیل کی رفعت، مضمون کی بلندی، خیال کا علو، نزاکت، لطافت، باریکی، شوخی، بیباکی اور بانکپن، طرح داری اور تیکھا پن رونما ہوا اور دوسری طرف طرز ادا میں الفاظ کی دروبست، ترکیبات کی چستی و شستگی، محاکات کی مصوری، تشبیہات و استعارات کی صورت گری غرض ہر چیز میں شکوہ، جدت اور تنوع نے جلوہ دکھایا۔ غرض غالب کا فارسی کلام افکار کی گہرائی اور گیرائی، مضمون کی اختراع و ابداع، تخیل کی بلندی و رفعت، جذبات کی کی شدت و گھلاوٹ، ظرافت کی شوخی و شگفتگی، اسلوب کی جدت و ندرت کا نادر نمونہ ہے۔ غالب کا فارسی کلام خیال و زبان کے ایسے ایسے گراں بہا جواہر پاروں کا گنجینہ ہے جن کے شمار اور توصیف کے لئے ایک زمانہ درکار ہے۔

مصطفیٰ زیدی

دُوری

پہلے، تیری محبتیں، چُن کر
آرزو کے محل سجاتے تھے
بے نیازانہ زیست کرتے تھے
صرف تجھ کو گلے لگاتے تھے

زندگی کی متاعِ غم کو فقط
تیری آواز لُوٹ جاتی تھی
تیرے ہونٹوں کی لے اُبھرتے ہی
زخم کی تان ٹوٹ جاتی تھی

تو کنول تھی، ایاغ تھی، کیا تھی
روشنی کا سُراغ تھی، کیا تھی
میرا دل تھی، دماغ تھی، کیا تھی
ساری دُنیا چراغ تھی، کیا تھی

اور اب، یا شراب پیتے ہیں
یا، فلک کو دعائیں دیتے ہیں
تیرے خاوند کی معیت میں
دُور سے تجھ کو دیکھ لیتے ہیں

اعجاز اکرم

دِیدَہ وَر

اے آبروئے اہلِ چمن کے محافظو!
کس کو تمہاری دیدہ وری میں کلام ہے
ان پہ بھی اک نگاہِ کرم ہو تو جانیئے
جن پر ہر ایک قیمتِ ہستی حرام ہے
کس کس کے زخم دیکھوگے کس کس کی بے بسی
یہ زندگی تو کربِ مسلسل کا نام ہے
فرصت کہاں کہ جشنِ بہاراں میں ہوں شریک
حصے میں جن کے گردِ الم صبح و شام ہے

مانا کہ کوئی نغمہ نہیں کوئی لے نہیں
ہنگامۂ نشاط کے ارماں ہمیں سے ہیں
جلوہ گہِ حیات میں ہم بے نشاں سہی
آرائشِ حیات کے ساماں ہمیں سے ہیں
ہم رک گئے تو وقت کا آہنگ ہٹ گیا
تسخیرِ کائنات کے عنواں ہمیں سے ہیں

عرصہ گہِ حیات میں تم برق پا سہی
ہم خستگانِ راہ کا بھی کچھ خیال ہے
مہرِ سکوت لب پہ، نگاہوں میں داستاں
وہ تیرگیٔ غم ہے کہ جینا محال ہے
گر آگہی ہے جرم تو یہ جرم ہے عزیز
اب آبروئے اہلِ چمن کا سوال ہے

یوں تو سراغ درد کے ملتے ہیں دور تک
لیکن جو اپنا حال ہے، ایسا کہیں نہیں
گلشن میں رہ کے اور بہاروں سے دشمنی
گلشن پرست ہم بھی ہیں تنہا تمہیں نہیں

احمد ندیم قاسمی

○

دیارِ عشق کا یہ حادثہ عجیب سا تھا
رخِ رقیب پہ بھی پرتوِ حبیب سا تھا

فراق زخم سہی، کم نہ تھی جراحتِ وصل
معانقہ مرے محبوب کا، صلیب سا تھا

ترے جمال کی سرحد سے، کبریا کا مقام
بہت قریب تو کیا تھا، مگر قریب سا تھا

سُنی ہے میں نے صدائے شکستِ نکہتِ رنگ
خزاں کی راہ میں، ہر پھول عندلیب سا تھا

برادرانِ وطن کے سلوک کی سوگند
ندیم، یوسفِ کنعاں کا ہم نصیب سا تھا

ناز اکبرآبادی

○

کام آتی ہے کب عشق کی محتاط روی بھی
بڑھ جاتی ہے کچھ ان کی اداؤں میں کجی بھی

پھر ہوگا کہاں اے دلِ برباد ٹھکانا
آئی نہ ہمیں راس اگر ان کی گلی بھی

ہوتی ہے فقط دیدۂ بینا کی ضرورت
کونین کے اسرار جلی بھی ہیں خفی بھی

کچھ یوں ہی غمِ دل میں اضافہ نہیں ہوتا
ہو جاتی ہے کچھ ان کی توجہ میں کمی بھی

بڑھتے ہی چلے جاتے ہیں ہم جانبِ منزل
ہوتی نہیں کچھ دوریٔ منزل میں کمی بھی

اب عالمِ حیرت سے فراغت نہیں دل کو
آنکھوں کو بہت تھی ہوسِ جلوہ گری بھی

پاکر بھی رہا ہے انھیں کھو دینے کا احساس
آغوشِ محبت رہی خالی بھی بھری بھی

ہو بے خودیٔ شوق سے جب تک نہ علاقہ
ہوتا نہیں انسان کو عرفانِ خودی بھی

برباد ہوا ان کے لئے ان کی بدولت
ہے نازؔ مجھے اپنی تباہی کی خوشی بھی

خاور رنگرامی

○

ناکامیوں میں زیست اب آزار ہی تو ہے
یہ سر ہمارے دوش پہ اک بار ہی تو ہے

آؤ رگِ گلو کی سکت آزما ہی لیں
لے دے کے اُنکے ہاتھ میں تلوار ہی تو ہے

جی چاہتا ہے حق کی صدا پھر کریں بلند
حق بات کی سزا رسن و دار ہی تو ہے

اے دوستو سمٹ کے جو آنکھوں میں آگئی
یہ اور کیا ہے حسرتِ گفتار ہی تو ہے

خاور جو مثلِ برق تڑپتی ہے بار بار
گلشن میں رُوحِ مرغِ گرفتار ہی تو ہے

○

بھولی بسری یادوں کے انبار لگائے بیٹھے ہیں
دل کے شیش محل کو ہم بازار بنائے بیٹھے ہیں

ہم کس کو احساس دلائیں آج اپنی بربادی کا
دُنیا والے خود اپنا دامن پھیلائے بیٹھے ہیں

کرنوں کی بارات کبھی تو گزرے گی ان راہوں سے
پھول سی پلکوں پہ شبنم کا بار اُٹھائے بیٹھے ہیں

بیت گئے وہ دن تو یہ راتیں بھی کٹ ہی جائیں گی
اپنے دل کی دھڑکن پر ہم کان لگائے بیٹھے ہیں

بند دریچوں سے چھُپ چھُپ کر جھانکنے والے کیا جانیں
لوگ اپنی آنکھوں میں کتنے چور چھُپائے بیٹھے ہیں

جوہر لوگ بڑے دانا ہیں دل کا بھید نہیں کہتے
ایک ہمیں ناداں ہیں یہ دولت ٹھکرائے بیٹھے ہیں

نثار ناسک

ثقافتی ورثہ

پشتو لوک گیت

میں تو سکھیو! جسے ہار پہناؤں گی
عمر بھر کے لئے اس کی ہو جاؤں گی
میں تو سکھیو! اُسے ہار پہناؤں گی

جو مرے واسطے
کلفتیں جھیل کر
جان پر کھیل کر

دن دہاڑے بھری پال کے سامنے
مجھ کو میرے قبیلے سے لے جائے گا
میں اسے پیار کا ہار پہناؤں گی
عمر بھر کے لئے اس کی ہو جاؤں گی

رضیہ فصیح احمد

کانٹوں کا ہار

باجی عورتوں اور لڑکیوں کے جلو میں مجھے دلہن بنانے پر تلی ہوئی تھیں۔ دلی والی ممانی نے آکر کہا بھی کہ نکاح سے پہلے نہیں بنایا کرتے لڑکی کو مگر باجی نے اپنی ستواں ناک سکیڑ کر کہہ دیا۔ کب تک انھیں دقیانوسی لکیروں کو پیٹے جائیں گی آپ۔ نانی بے چاری منہ بنا کر چلی گئیں تو انھوں نے بستر کی چادر کھینچ و نیچا سا پردہ بنا کر مجھے مسہری پر ہی کپڑے پہنانا شروع کر دئے زندگی میں پہلی مرتبہ عجب عجب بے ڈول قسم کے کپڑے پہننے پڑے۔ ساڑھے چھ گز کا یہ جگادری ڈھیلا پجامہ جس پر سیروں مسالہ لگا تھا اور سرخ شیفون کا ہوا کی طرح باریک اور ہلکا کرتہ۔ ابھی بمشکل اس مرحلے سے گزری تھی کہ دروازہ کھڑکا یا گیا۔ معلوم ہوا وکیل اور گواہ ایجاب و قبول کے لئے آرہے ہیں۔ باجی نے جھٹ وہی چادر میرے سر پر ڈال گٹھری بنا کر بٹھایا جب وہ لوگ میرا بے نام سا ہنکارہ سن کر باہر سدھارے اور مردوں میں دولھا کو نکاح پڑھایا جانے لگا باجی اپنے میک اپ کا پٹارہ کھول میرے اوپر پل پڑیں۔ ماربھر بھر ہتھیلی فاؤنڈیشن کریم چہرے اور گردن پر تھوپ دی اور پھر پفوں پاؤڈر میں نہلا دیا۔ پھر جب وہ آئی شیڈو Eye Shadow اور آئی بروپنسل Eyebrow Pencil لے کر میری اچھی خاصی آنکھوں اور بھنووں کی نوک پلک بگاڑنے لگی تب بھی میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔ ان کے میک اپ کے بیچ میں کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ باجی کی اپنی زبانی سنا تھا کہ انگلینڈ میں انھوں نے کسی بڑے ایکسپرٹ سے میک اپ کرنا سیکھا ہے اور وہ یوں حلیہ بدلتی ہیں کہ آدمی کا پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے (گویا یہ بھی کوئی بڑی تعریف کی بات ہے) مگر جب انھوں نے مسکارا (Mascara) سنبھالا تو میں ماش کے آٹے کی طرح صاف اکڑ گئی۔

"چلو تم چپکی رہو۔ آئیں بڑی وہاں سے —— دلہن ہو کر دماغ ہے۔" لے کر انھوں نے نیلے نیلے رنگ کا مسکارا میرے پپوٹوں پر اور آنکھ کے نیچے آزمانا شروع کر دیا۔ اور میں ٹک ٹک دیدم۔ دم نہ کشیدم کی تمثیل بن کر رہ گئی کہ اس وقت ایک دم کچھ بھگدڑ سی مچی۔ مشن بھیّا نے مار کواڑ پیٹ پیٹ دروازہ کھلوایا اور الماری میں سے کچھ نکال جلدی سے کچھ منمناتے ہوئے باہر نکل گئے۔ ہنگامے میں کسی کے کان میں اتنی ہی آواز پڑی کہ کوئی بیہوش ہو گیا —— باجی تجسس کی ماری میرا میک اپ ادھ بیچ میں چھوڑ لپ اسٹک

ہاتھ میں لئے لئے باہر نکل گئیں۔ واپس آئیں تو بولیں "کوئی نہیں وہ ہے پگلا۔ اپنے مُشن کا دوست۔"

"کون؟ —" میں نے تازہ تازہ لپ اسٹک لگے ہونٹ کھول کر پوچھا۔ "محمود؟"

"ہاں وہی، عجب بے ڈھنگا لڑکا ہے۔ بھلا یہ کوئی وقت ہے بیہوش ہونے کا؟"

باجی کی اس بے ڈھنگی سی بات پر بہت سی لڑکیاں اور عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں مگر میں خاموش ہو گئی۔ آج تک اس بے چارے کو وقت پر سُوجھا ہی کیا۔ جب بھی کچھ کیا بے وقت ہی کیا تب ہی تو پُور نہیں پڑی کسی چیز میں۔

... باجی اب بھی تھوڑی اُٹھا اُٹھا کر چہرہ کبھی یوں کر رہی تھیں کبھی ووں۔ کبھی لپ اسٹک دیکھتیں اور پھر سے ڈبیہ لے کر پل پڑتیں۔ کبھی بالوں کے لہریے درست کرنے لگتیں۔ اور میں تھی کہ اتنے مجمع میں چُپ چاپ اپنی گت بنتی دیکھ رہی تھی مگر جیسے سو رہی ہوں کیونکہ اب سے سالوں پہلے کے خوابوں میں گم تھی ...

یہ ان دنوں کی بات تھی جب ہم بہن بھائی ساتویں، آٹھویں اور نویں میں پڑھتے تھے اور ایک سرے سے سب کے سب خود کو بڑے علامہ سمجھتے تھے۔ لڑکیوں اور لڑکوں کا جدا جدا گویا ایک محاذ سا بنا ہوا تھا۔ وہ ہم کو ناقص العقل سمجھے پر مُصر، اور ہم رتّی بھر بھی کسی بات میں ان کی بڑائی ماننے سے مُنکر۔ غرضیکہ خوب خوب چلتی۔ انھیں دنوں ایک رات جب آماں اور آبا ماموں کے ہاں گئے ہوئے تھے مُشن بھیا محمود کو لے کر اندر چلے آئے اور یہ کہہ کر اس کا تعارف کروایا۔ "یہ ہے محمود۔ بڑے بڑے اس کی زبان کے آگے عاجز ہیں لڑکیوں سے تو خدا واسطے کا بیر ہے ذرا سنبھل کر رہیے گا آپ لوگ۔"

"اُونہہ ہوں۔ ذرا دیکھیں شکل ——— زبان کے تیس مارخاں ہوں گے۔ دیکھنے میں تو بھتنے پہلوان ہیں قطعی۔"

باجی نے چھوٹتے ہی چوٹ کی کہ وہ سنبھل بھی نہ پایا۔ اور کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ گیا۔

"یہ وہی ہیں ناجن کے بال دیکھ کر ماٹ صاحب نے انگلی ہاتھ پر رکھ کر کہا تھا۔ پہلے حجامت بنوا کر آؤ پھر کلاس میں آنا۔" نفیس نے اس کے بڑھے ہوئے بالوں پر بھرپور چوٹ کی۔ "ارے بھئی یہ وہ کہاں ہیں   ارے جواب دو نا ان لونڈیوں کو۔ سب کی سب پیچھے پڑ گئی ہیں" مُشن بھیا غالباً بڑی امیدیں لے کر آئے تھے اس کی ذات سے۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ صرف اس کا رنگ گلابی سے سُرخ پڑ گیا۔

"جانے دیجئے ابھی پہلی دفعہ آئے ہیں۔ کھلتے کھلتے ہی زبان کھلے گی۔" میں نے کہا۔

"اخوہ۔ وہ بھی بولیں۔ مینڈکی کو بھی زکام ہوا" مُشن بھیا چڑا کر بولے

محمود نے پلٹ کر ایک نظر مجھے دیکھا اور مُشن بھیا کا ہاتھ پکڑ کر بولا "آؤ یار باہر چلیں ——— پھر دونوں باہر چلے گئے۔

اس کے بعد بھی وہ کبھی کبھار آتا رہا۔ امی کی کسی پچھلے زمانے میں اس کی آماں سے دوستی تھی۔ پھر امی اُوپر تلے بچوں کے انبار میں دب کر گھر سے نکلنے کی نہ رہیں۔ اُدھر جب محمود کے آبا اکلوتے محمود کو چھوڑ کر سدھار گئے تو اس کی آماں نے گھر سے نکلنا ہی بند کر دیا۔ اب صرف تقریبوں میں ملاقات ہوتی یا محمود اور مُشن بھیا سے ایک دوسرے کی خیریت معلوم کر کے مطمئن ہو جاتیں۔ وہ آتا تو زیادہ تر باہر ہی گپ لگتی۔ گھنٹوں تین چار لڑکے بغلوں میں ہاتھ دیئے باہر کھڑے قہقہے لگاتے رہتے۔ جب دوسرے چلے جاتے تو مُشن بھیا محمود کو اندر لے آتے۔ وہ شروع میں لڑکیوں کے مجمع میں گھٹا گھٹا رہا لیکن پھر چل نکلا۔ خوب چوٹیں چلیں۔ کبھی تاش میں شرکت

کرتا تو خوب بے ایمانیاں کرتا۔ کبھی بھیا کے کہنے پر ہمارے ساتھ پکچر بھی چلا جاتا۔ مشن بھیا اور یہ دونوں اپنی کلاس میں اچھے چلتے تھے اس لئے کچھ زیادہ ہی اتراتے۔ کوئی دو ایک سال یوں ہی رہا پھر ابا کی پوسٹنگ ہو گئی۔ ہم اس شہر سے چلے گئے۔ مشن بھیا کی چند روز محمود سے خط و کتابت رہی۔ رفتہ رفتہ وہ بھی بند ہو گئی۔

پھر جب ہم بٹوارے کے بعد کراچی آئے تو ایک شام مشن بھیا اچانک محمود کو لئے اندر داخل ہوئے۔ کراچی میں بیس بیس سال کے بچھڑے مل رہے تھے۔ کچھ عجب حشر کا سا سماں تھا۔ شاید وہاں بھی سالوں کے بچھڑے یوں ہی دوڑ دوڑ کر گلے لگیں گے اور اپنی بپتا سنائیں گے مگر نہیں وہاں تو سنا ہے کہ ایسا نفسا نفسی کا عالم ہو گا کہ کوئی کسی کو پہچانے گا بھی نہیں۔ خیر یہاں نفسا نفسی تو تھی مگر یہ عالم نہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کو پہچان کر، ایک دوسرے کے زخموں کی گہرائیاں دیکھ کر اپنے زخموں پر مرہم رکھتے تھے اور بعض بعض جگہ پرانی دوستیاں پھر استوار کی جا رہی تھیں مگر کچھ یوں جیسے پرانی گلی ہوئی رسیوں کو گرہ دے کر جوڑا جا رہا ہو۔ آخر درمیان کے خلا کو کس چیز سے پُر کیا جاتا لیکن تازہ زخموں نے دل کو کچھ اتنا نرم کر دیا تھا کہ وہ ہر پرانے ملاقاتی کو دیکھ کر بہنے لگتا تھا —— محمود کو دیکھ کر یہی عالم امی کا ہو جیسے ان کی کوئی کھوئی ہوئی چیز مل گئی ہو۔ بہت دیر تک نام لے لے کر ایک ایک رشتے دار کی خیریت پوچھتی رہیں۔ میں نے دیکھا کہ محمود پر پھر اس پہلے دن والی شرم طاری ہے۔ وہ تھوڑی دیر ہی اندر بیٹھا۔ سب سے اس نے کچھ باتیں ضرور کیں مگر رسمی قسم کی اور پھر چلا گیا۔ کئی روز بعد مشن بھیا نے بتایا کہ محمود کو آجکل زبردست احساسِ کمتری نے گھیر رکھا ہے کیوں کہ اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر آنے کے بعد یہاں یہ کسی کے سرونٹ کوارٹر میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ خیال کسی وقت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ چاہتا ہے بی۔ اے کر کے جلدی سے کہیں نوکر ہو جائے اور مکان کی فکر کرے۔ اس زمانے میں مکان کراچی میں۔ ایں خیال است و محال است و جنوں والی بات تھی۔ محمود کو شاید حالات کا صحیح اندازہ نہیں تھا یا وہ ضرورت سے زیادہ پر امید تھا۔

رفتہ رفتہ پھر اس کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی۔ امی بھی گھر کے "جھگڑوں" سے ذرا کی ذرا فرصت نکال کر ایک دن محمود کے ہاں چلی گئیں۔ واپسی پر وہ کئی گھنٹے ان کی حالت پر افسوس کرتی رہیں کہ پختہ کوٹھی والوں کا ڈیڑھ کمرے کے ایک چھوٹے سے کوارٹر میں رہنا جہاں ٹاٹ کا پردہ پڑا تھا، نالیوں کی سڑاند تھی اور پاس پڑوسیوں کی دن رات کی گالی گلوج۔ امی کو بڑی عبرت حاصل ہوئی اور اپنا فلیٹ جسے وہ بارہ گھنٹے موئے کبوتروں کا کابک کا خطاب دیتی تھیں یکایک انھیں محل سا نظر آنے لگا۔ چند دن بعد جب ملک کی مشینری نے گھڑ گھڑا کر تیزی سے چلنا شروع کیا ابا کو پنجاب میں کسی چھوٹی سی جگہ پوسٹ کر دیا گیا اور میں اور مشن بھیا اپنی پڑھائیوں کے سہارے باجی کے گھر جم گئے۔ پھر ایک دن جب چار پانچ لڑکے باہر بغلوں میں ہاتھ دیئے، کھڑے قہقہے لگا رہے تھے مشن بھیا اندر آئے اور بولے "محمود آیا ہے۔ میں اسے اندر لے کر آؤں گا۔ آپ لوگ اسے منگنی کی مبارکباد دے دیں" یہ کہہ کر وہ جانے لگے تو باجی نے ہاتھ پکڑ کر روکا "ارے پوری بات بتاؤ۔ کس کے ساتھ منگنی ہو گئی! اس مچھ پہلوان کی؟"

"جن کے سرونٹ کوارٹر میں وہ رہتا ہے نا۔ ان کی لڑکی سے۔ بڑی خوبصورت ہے۔ ایف۔ اے میں پڑھ رہی ہے۔"

"کمال ہے" ہم دونوں کے منھ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ "اپنے سرونٹ کوارٹر میں رہنے والے لڑکے سے

جو دھیلے بھر کا ملازم نہیں انھوں نے اپنی لڑکی کی منگنی کر دی ہے۔"

آفتاب صاحب محمود کے خاندان کو بہت پہلے سے جانتے ہیں۔ ان کو معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ سرونٹ کوارٹر میں نہیں رہتے رہیں گے۔ لڑکا لائق ہے کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے تو ہم بہت دیر اس کی قسمت کو سراہتے رہے۔

باجی نے کہا: "لڑکا تیز ہے۔ لڑکی کو گانٹھ لیا ہوگا پھر ماں باپ بے چارے کیا کرتے۔"

بات یہ تھی کہ ہمارے اپنے علاقے میں لڑکے لڑکیوں کی مرضی سے آگے پیچھے شادیاں ہو رہی تھیں کہ زمانہ خراب آگیا تھا اور ماں باپ اپنی عزت بچانے کے لئے وہ پرانے معیار حسب نسب، ذات برادری، ٹیکے جہیز کا لین دین اور چھان پھٹک، جانچ پڑتال، گھر گھرانا، نہال ددھیال، کھری کھوٹی جانچ کر بیٹیاں بیاہنے کی رسم ختم کر چکے تھے۔ جو لڑکا صورت سے شریف نظر آیا اور ان کی بیٹی کو بیاہنے کو تیار ہوا والدین نے دو بول پڑھوا دیئے۔ آگے اس کی قسمت۔ کئی مرتبہ بعد میں پتہ چلا کہ دولہا میاں اچھا خاصا مرد ہے دو بیویاں اور نصف درجن بچے پہلے سے ہیں۔ یا پکا شرابی اور جواری ہے مگر اب ایسی باتوں کا کیا کیا جائے۔ سب نصیبے کے سر جاتیں۔

محمود آیا تو ہم نے باری باری مبارکباد دی۔ وہ ہنس ہنس کر شکریہ ادا کرتا رہا۔ آج احساس کمتری کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ خلاف معمول وہ بہت دیر تک اندر بیٹھا رہا۔ مشی بھیا نے تاش کھیلنے کی فرمائش کی تو وہ آستین چڑھا تیار ہو بیٹھا۔ کچھ دیر بلیک کوئن اور رمی کھیلے۔ یک لخت باجی کو برج سیکھنے کا سودا سمایا۔ مشی بھیا کو برج آتا تھا اور محمود کو بھی گو وہ کچھ بھول چکا تھا۔ باجی کو کچھ اُلٹی سیدھی کال دینی آتی تھی لیکن میں خدا کے فضل سے بالکل کوری تھی اس معاملے میں۔ باجی اور مشی بھیا ساتھی ہو گئے میں اور محمود۔ اب برج کیا تھا ایک مصیبت کا ایک طومار معلوم ہوا۔ نمبر یاد رکھنے اور ہر ایک کی کال کو ([illegible]) یاد رکھنی۔ پھر یہ اندازہ لگانا کہ پارٹنر کے ہاتھ میں کون کون سے پتے ہیں اور کون کون سے پتے مخالفین کے پاس کیا ہے اور پھر ایک ایک پتے کا حساب رکھنا جیسے فرشتے ہمارے گناہ اور ثواب کا حساب رکھتے ہیں۔ مجھے یہ سب بڑا گورکھ دھندا سا لگا۔

بار بار میں اُلجھ اُلجھ کر محمود کے بعد پان اور ہارٹ کے بعد چڑیا کی "کال" دے ڈالتی اور مجھے بتایا جاتا کہ اوّل الذکر بڑے ہیں اس لئے ان کے بعد موخر الذکر کی "کال" نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ کال میں اضافہ نہ کیا جائے۔ پھر ایک "نو ٹرمپ" کی بلا تو اچھی خاصی مصیبت تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اتنی جان میں کسی اور چیز میں مارتی تو یقیناً پارس ہو جاتی مگر یہاں یہ حال تھا کہ اگر خدانخواستہ میری کال جم جاتی اور میرے سامنے "ڈمی" کھل جاتی تو جیسے میرے ذہن سے سارا پڑھا پڑھایا یک لخت دُھل جاتا اور میں خود "ڈمی" سی بیٹھی رہ جاتی۔ اس وقت محمود اُٹھ کر میری کرسی کے نزدیک تپائی پر آ بیٹھتا اور مجھے کھیل سوجھاتا رہتا۔ پھر جب اس کی کال پکی ہوتی وہ مجھے دعوت دیتا کہ میں آکر اس کا کھیل دیکھوں تاکہ مجھے بھی کھیلنا آئے۔ اسے یقین تھا کہ میں باجی سے جلد یہ مشکل سا کھیل سیکھ جاؤں گی۔ اور مجھے خیال تھا کہ شاید ساری عمر بھی یہ میری کھوپڑی سے گزر کر گودے میں نہ سما پائے گا۔ چونکہ برج کبھی کبھار کھیل لینے سے نہیں آ سکتا تھا اس لئے طے پایا کہ ہر روز پابندی سے اور ہر شام دولہا بھائی کے دفتر سے آنے سے پہلے یہ برج پارٹی جمتی۔ اسی دوران میں محمود نے ایک دن مجھے برج سیکھنے کے لئے جلد بازی ([illegible]) کی سیلف ٹیچر لاکر دی۔ باجی نے اس بات پر بڑا اخبار کھایا۔ تلملا کر بولیں "تو برج سیکھنے کا شوق ہمیں تھا کہ اگلی رات کو وہ دو بجے تک اکیلے برج نہ کھیلیں اور کتاب ان کے لئے آ رہی ہے۔"

"آپ ہی لے لیجئے" میں نے کتاب جلدی سے باجی کو تھمادی: "مجھے سیکھ کر کرنا ہی کیا ہے۔"

"ہاں آپ کو تو ویسے بھی جلدی آجائے گا۔ کتاب باجی کو دے دیجئے" محمود نے شرارت بھری معصومیت سے کہا۔ باجی نے چڑ کر زرا شے سے اسے دیکھا اور وہ ہنس پڑا۔

اب ایسے موقعوں پر کبھی میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھے بتاتا تھا یا باجی کو۔ کیونکہ جہاں تک برج کا تعلق ہے ہم دونوں ایک جیسی بکس تھیں۔ کھیل کے دوران باتوں کی گنجائش تو تھی نہیں اس لئے ہمیں آپس میں باتیں کرنے کا موقع بہت کم ملتا۔ زیادہ تر باتیں مُنّی بھیا سے بعد میں ہی معلوم ہوئیں اس قسم کی کہ محمود اور آماں آفتاب صاحب پر منزّہ کے نکاح کے لئے زور دے رہے ہیں مگر وہ محمود اچھی سی ملازمت مل جانے کے انتظار میں ہیں۔ ایک دن برج کھیلتے ہوئے باجی کی کوئی سہیلی ٹپک پڑی۔ باجی اُٹھ کر چلی گئیں تو ہم باتیں کرنے لگے۔ پھر جب بھیا کسی کام سے اُٹھ کر گئے تو میں نے محمود سے کہا: "کسی دن ہمارے ہاں لایئے نا اپنی" ان کو۔"

"کیا کیجئے گا؟"

"دیکھیں گے۔"

"دیکھ کر کیا کریں گی؟"

"کوئی کسی کو دیکھ کر کیا کرتا ہے؟" میں اس کے احمقانہ سوال سے جھنجھلا اُٹھی۔ وہ ہنس پڑا۔ بولا۔

"آپ کا دیکھنا اس لئے فضول ہے کہ وہ آپ سے بہت ملتی ہیں۔ آپ خود کو آئینے میں دیکھ لیجئے۔ یہی جسم ہے۔ یہی رنگ روپ ہے۔ آنکھیں ذرا آپ سے بڑی ہیں اور مزاج ذرا آپ سے.... تیکھا ہے۔" یہ کہہ کر وہ پھر ہنس پڑا۔

"مذاق نہ کیجئے۔"

مذاق کی بات نہیں۔ کسی دن میں آپ کو ان کی تصویر دکھاؤں گا۔ وہ آپ سے بہت ملتی ہیں اگر ان ہی کو دیکھنا ہو تو گھر جانا پڑے گا یہاں آنا مشکل ہے۔ ان کے والدین ابھی میرے اُوپر اتنا اعتماد نہیں کرتے۔"

"آپ سے پردہ تو نہیں کرتیں؟" میں نے پوچھا

"جی ابھی تک تو نہیں۔ بلکہ جب کہیں سے جاتا ہوں تو باقاعدہ پوچھ گچھ ہوتی ہے کہ اتنی دیر کہاں رہے، کیوں رہے۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں سے انھیں میرے آنے جانے کی پوری ڈائری ملتی رہتی ہے۔"

"اچھا۔ میں ہنسی۔ ابھی سے یہ حال ہے۔

دیکھ لیجئے۔۔۔ جلد یا بدیر یہ تو ہونا ہی تھا۔ ہم نے کہا چلو اچھا ہے ابھی سے پابندی کی عادت پڑی رہے گی کام آئے گی ـــ" ہم دونوں ہنس پڑے۔

دوسرے دن محمود منزّہ کی ایک بڑی سی تصویر لایا۔ لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں عجیب انداز سے نیم وا تھیں اَن جانے خوابوں میں کھوئی ہوئی ہوں۔ بڑے فخر سے سب سے پہلے تصویر اس نے میرے ہاتھ میں دی۔ میں نے غور سے دیکھی مجھے اس میں اپنی شباہت محسوس نہیں ہوئی گو مُنّی بھیا اور باجی نے اس بات کی تصدیق کی کہ کوئی چیز مجھ سے ملتی ہے، چہرے کا کٹ یا آنکھیں یا صرف (APPEARNCE) آپیرنس بہر حال کچھ نہ کچھ شباہت ہے ضرور۔ میں خاموش ہو گئی۔ لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے۔ اس دن کھیل کچھ بے دلی سے ہی ہوا۔ محمود زیادہ تر اپنی منگیتر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے بتایا کہ آج کل وہ اس کے لئے ایک بڑا خوب صورت سا پوری آستینوں کا سوئٹر بُن رہی ہے۔ پچھلی سردیوں میں اس نے اماں کے لئے بھی ایک سوئیٹر بُن کر دیا ہے۔ پھر نہ جانے کس رَو میں وہ یہ بھی کہہ گیا کہ سب کو معلوم ہے منزّہ کی منگنی ہو چکی ہے پھر بھی اس کے لئے پیغام آتے رہتے ہیں جن سے اُسے بڑی ذہنی کوفت ہوتی ہے کہ منزّہ کے والد یا وہ خود کسی موٹے مرغے پر پھسل جائے ـــ یہ کہہ کر وہ ہنسا جیسے محض مذاق کر رہا ہو۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کی ہنسی کھو چکی تھی۔

چند دنوں بعد محمود نے یہ کہہ کر کھیل ختم کر دیا کہ اس کے امتحان نزدیک ہیں اور سارے دن جی سے پڑھائی کرنی ہے۔ امتحانوں کے ختم ہونے تک وہ کبھی کبھار دس پندرہ منٹ کے لئے آتا اور چلا جاتا۔ اس کے بعد جب وہ ...

سے آنے کی پیشکش کی تو چھٹیوں میں ہمارا گھر جانے کا پروگرام بن چکا تھا۔ اسٹیشن پر وہ مجھے اور بھتیا کو چھوڑنے آیا۔ میں نے اسے پھر خاموش اور گم سُم سا پایا۔ بھیڑ بھڑکتے ہیں جب وہ دونوں کمپارٹمنٹ کی کھڑکیوں سے لگے گپ شپ ٹھونک رہے تھے بھیا نے اچانک پوچھا: "ہمارے ساتھ چلتے ہو؟"

"اب کہہ رہے ہو۔ پہلے بتاتے تو ایک بات بھی تھی۔"

"اب کیا ہے۔ آماں تو حیدرآباد گئی ہوئی ہیں — تم ہمارے ساتھ چلے چلو۔"

وہ کچھ سوچنے لگا۔ "مگر بھئی پیسے اور کپڑے۔"

"پیسے بھی میرے پاس ہیں اور کپڑے بھی۔" مشن بھیا نے کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ بھیا خواہ مخواہ ایسی بات کہہ رہے ہیں جو کسی طرح قابل قبول نہیں۔ اسٹیشن پر چھوڑنے آنے والا یوں ہی منہ اُٹھا کر کسی کے ساتھ ہو لے بھلا کوئی تک ہے۔ مگر وہ بولا۔ "اچھا کچھ پیسے تو میرے پاس ہیں۔ میں ٹکٹ لے آؤں۔ آپ لوگوں کے ساتھ تو نہ بیٹھ سکوں گا تھرڈ یا انٹر کا ٹکٹ لے لوں گا۔"

"ہمارے پاس سرونٹ کا پاس تو ہے اگر تم چاہو۔ بھتیا کہتے کہتے رُک گئے۔ مگر مجھے ان کا اشارہ دینا بھی بُرا لگا۔ اگر وہ کسی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہے تو اُس کے معنے یہ نہیں کہ اب وہ دوسروں کا نوکر ہو کر گاڑی میں سفر کرنے لگے۔ اگر وہ اس بات پر تیار ہو جاتا تو مجھے یقیناً دُکھ ہوتا۔

"نہیں میں ٹکٹ لے آتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا بھیڑ میں غائب ہو گیا۔

"عجب پگلا ہے۔ میں نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا وہ تیار ہو گیا۔" بھتیا بولے۔ میں خاموش رہی تھوڑی دیر میں وہ انٹر کا ٹکٹ لے کر آگیا۔ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہیں وہ اس ارادے سے ہی تو اسٹیشن پر نہیں آیا تھا۔ ورنہ اس کے پاس اتنے پیسے اس وقت جیب میں کیوں تھے!؟ گارڈ نے جھنڈی ہلائی تو وہ اپنے کمپارٹمنٹ کی طرف لپکا۔ بھیا بولے۔ "یہیں آجاؤ۔ کوئی پوچھے گا تو آپا کا نام لے دیں گے۔"

"تو پھر تم نے مجھ سے ٹکٹ کیوں خریدوایا؟" وہ بولا "ٹکٹ ہونا تو ضروری ہے باقی یہ کہ کس کلاس میں بیٹھے ہیں یہ جائز ہے۔ اتنے پر شاید آپا بھی بُرا نہ مانیں۔"

گاڑی چلی تو وہ اندر چڑھ آیا۔ اس کمپارٹمنٹ میں ہم ہی ہم تھے۔ جب ہم سب اطمینان سے بیٹھ گئے اور اسٹیشن خاصا دور نکل گیا تو بھیا بولے: "واپسی پر تمھاری پٹائی ہو گی کہ کیسے بغیر کہے سُنے چلے گئے۔" محمود کا رنگ سنولا سا گیا۔ بولا۔

"اب نہیں ہوتی پٹائی۔"

"کیوں اب کیا ہوا؟"

"اب پردہ شروع ہو گیا۔"

"اچھا — کیوں؟"

"اُن کی امی کہتی ہیں کہ لوگ باتیں بناتے ہیں۔۔۔ منزل پر پہنچ کر خط لکھ دوں گا کہ جب آپ کے دیدار ہی نہیں ہوتے تو نزدیک رہیں یا دور کیا فرق پڑتا ہے بلکہ۔۔۔ وہ آہستہ سے بولا،

"وہاں رہتا ہوں تو دل پر ایک بوجھ سا رہتا ہے طرح طرح کے خدشے گھیرے رہتے ہیں۔"

اس وقت اس کا چہرہ اتنا سنجیدہ تھا کہ بھیتا جو غالباً مذاق اُڑانے کے موڈ میں تھے خاموش ہو گئے موضوع بدلنے کے لئے انھوں نے تاش کی آڑ لی۔ سارے راستے ہم تاش کھیلتے اور پھل کھاتے آئے۔

گھر پہنچے تو مزا آگیا۔ امی نے ہم پردیسی بچوں کی خاطر داریوں میں دن رات ایک کر دیا۔ پھر پھر پیالے کھمبی اور کھیر۔ کبھی جنگل سے بٹیر پکڑ کر منگائے جا رہے تو کبھی دریا سے مچھلیاں پکڑ کر تازی تازی پکائی جا رہی ہیں۔ سارا دن بھر بھر چارپائی آم اور دو دو جنوں کے

حساب سے امرود کھاتے۔ پھر باغ میں لگی ہوئی یہ بڑی بڑی جامنیں جھاڑ کر کھاتے باقی دن تاش۔ بیڈ منٹن سوفٹ بال، کبھی کبھی لیک ڈنڈا قسم کی کوئی چیز اور رات کو چھوٹے بہن بھائیوں کے ساتھ دھوپ چھاؤں اور چادر چھپائی کھیلتے۔ کبھی کبھار آپا کو منا کر دریا کے کنارے پکنک کرتے جہاں پہلے سے خانساماں اور چار چھ نوکر جا کر جنگل میں منگل کر دیتے۔ ان دنوں محمود بھی بڑا خوش نظر آتا۔ اگر کوئی غیر دیکھتا تو کبھی اندازہ نہ لگا سکتا کہ وہ ہم بہن بھائیوں میں سے نہیں ہے۔ امی اور ابا سے تو وہ ہم سے زیادہ بے تکلف تھا۔ مشن بھیا کی لمبی پتلونوں کے پائنچے چڑھا کر ان کی ڈھیلی ڈھیلی قمیصیں وہ بڑے مزے سے لادے پھرتا تھا۔ اسے یہ احساس دلاتے بھی دکھ ہوتا کہ وہ کیسا مضحکہ خیز سا نظر آتا ہے۔

روز کسی نہ کسی وقت وہ ایک خط منزہ کو لکھتا۔ لیکن منزہ کا خط تیسرے چوتھے آتا۔ ایک دن میں دور امرودوں کے جھنڈ میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی کہ وہ منزہ کا خط ہاتھ میں لئے آیا اور میرے پاس زمین پہ بیٹھ کر بولا "میں دیکھنا چاہتا ہوں کیا آپ دونوں کی ہینڈ رائیٹنگ بھی ملتی ہے"

"نہیں۔ میری ہینڈ رائٹنگ بھی ملتی ہے؟" میں نے شرما کر کہا۔

"یہی حال ادھر ہے۔ ضرور آپ دونوں کی تحریریں بھی ملتی ہوگی۔ ذرا لکھ کر دکھائیے تا" اس نے منزہ کا خط اور قلم آگے بڑھا دیا "اس پر لکھ دیجئے"

"خط کو کیوں خراب کرتے ہیں۔ میں کسی اور چیز پر لکھتی ہوں"

"اور کوئی چیز ہے ہی نہیں" اس نے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔

"تو ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے، پھر کبھی سہی ـــ اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ کیا بلیک میل کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ ہنس پڑا۔

"نہیں، یونہی مجھے خیال آگیا تھا ـــ اچھا لیجئے ـــ ذرا منزہ کا خط تو پڑھ کر دیکھئے۔ کیسے بے تکے خط لکھتی ہے یہ لڑکی۔

"واہ میں کیوں پڑھوں کسی کے خط" میں ہچکچائی

"اوہو ـــ ایسی ویسی کوئی بات نہیں ـــ .... پڑھیئے تو۔" اس نے زبردستی خط میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے یونہی جلدی جلدی نظر ڈال لی۔ بڑا روکھا پھیکا سا خط تھا۔ کہاں تو میں سمجھتی تھی کہ جانے کیسے پیار بھرے، درد فراق میں ڈوبے ہوئے خط لکھتے ہوں گے یہ منگیتر ایک دوسرے کو۔ سچ پوچھئے تو یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اس قسم کا کوئی خط پڑھا۔

"دیکھا آپ نے۔ مجھ سے ناراض ہیں صاحبزادی۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ بھائی میں کیا کروں آپ کے والدین مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتے، بات تک نہیں کرنے دیتے۔ باہر میں چھپ کر ملنے کی آپکی غیرت اجازت نہیں دیتی تو میں کس طرح آپ کے در پر پڑا رہوں اور دور سے ان کھڑکیوں کو دیکھتا رہوں جن کے پیچھے آپ سب سے ہنستی ہیں بولتی ہیں۔ قہقہے اور چہچہے ہوتے ہیں۔ پھر یک لخت وہ سنجیدہ ہو کر بولا "شاید آپ اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ اس بات کا میرے دل پر کتنا بوجھ رہتا ہے اور منزہ ہے کہ دن بدن چڑچڑی ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر تلخی ہوتی ہے تو وہ غصہ مجھ پر اتارتی ہے شاید وہ سمجھتی ہے کہ اگر میں کسی قابل ہوتا تو ....." وہ خاموش ہو گیا۔ کچھ دیر کیاری میں مٹی کے ڈھیلوں کو توڑتا رہا پھر بولا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں اسے اس کوفت سے آزاد ہی کر دوں۔ شاید وہ کسی دوسرے کے ساتھ زیادہ خوش رہ سکے مگر اب ایسا بھی نہیں کر سکتا۔ میں سوچ ہی نہیں سکتا کہ اس کے بغیر ....." اس

نے بات ادھوری چھوڑ دی شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں۔

"آپ کی شادی کب ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"نکاح جب کہیں نوکر ہو جاؤں گا اور رخصتی جب مجھے مکان مل جائے گا۔ اور اب یہ دونوں چیزیں مشکل نظر آرہی ہیں۔ سفارش کی ضرورت ہے۔ آفتاب صاحب کہتے ہیں کہ اگر اچھے نمبر آگئے تو وہ کوشش کریں گے مگر اب وہ اتنے پرجوش نظر نہیں آتے جتنے پہلے تھے۔

"منگنی ان کی مرضی سے ہی ہوئی تھی نا؟"

جی ہاں ـــ جب شروع شروع کی بات تھی۔ اس زمانے میں لوگ جذباتی بھی تھے، پرامید بھی تھے اور اس وقت ان کے پاس اتنا پیسہ نہیں تھا جتنا اب ہوگیا ہے۔ اس وقت نہ وہ اور نہ ان کے بچے اتنی آسائشوں کے عادی تھے

اس ایک آخری جملے میں بہت کچھ تھا۔ یہ خیال کہ جو کچھ منزہ کو اب میسر ہے وہ اسے نہیں دے سکتا شاید اسے سکھا رہا تھا۔ میں نے ہمت کرکے وہ سوال پوچھ ڈالا جو بہت دنوں سے میرے ذہن میں بار بار سر اٹھا رہا تھا۔ "آپ کو منزہ پر تو اعتماد ہے نا؟" ایک مرتبہ محمود نے غور سے مجھے دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ زمین کو تنکے سے کریدتا ہوا وہ بولا ـــ ہاں ایک اسی یقین کے سہارے بیٹھا ہوں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں کب کا اسے اس پابندی سے آزاد کر دیتا۔ اب ایسی بات کہتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں مبادا اس کا دل ٹوٹ جائے ـــ"

اسی طرح نظریں جھکائے خوابیدہ لہجے میں وہ کہے جا رہا تھا۔ "لیکن لوگ کہتے ہیں عورت کی فطرت کو سمجھنا آسان نہیں اور میرا بھی خیال ہے کہ میں ابھی تک اسے اچھی طرح نہیں سمجھ پایا۔"

صرف کچھ کہنے کے لئے میں نے کہا: "سنا ہے ایسی باتوں میں سمجھنے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی اعتماد کی"

ہاں ـــ وہ تو ہے۔ مگر بعض اوقات میں سوچتا ہوں کہ آپ دونوں کی شکل تو ملتی ہے پر طبیعت نہیں۔ اگر وہ آپ کی طرح سیدھی سادھی اور پرخلوص ہوتی تو یہ کام نسبتاً آسان ہو جاتا۔"

یہ ایسی بات تھی جس پر میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ ہم دونوں خاموش بیٹھے رہے پھر کسی نے دوپہر کے کھانے کے لئے آواز دی اور ہم خاموشی سے اٹھ کر اندر چلے آئے۔

کھانے پر میں نے دیکھا کہ سب عجیب عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ میں گھبرا گئی۔ کہیں یہ محمود سے اتنی دیر تنہا باتیں کرنے کی وجہ سے تو نہیں مگر جلد ہی یہ راز کھل گیا۔ ہمارے ہاں کوئی چیز زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔ معلوم ہوا احمد صاحب کا خط آیا ہے جس میں انھوں نے میرے اور مراد کے اس رشتے کے ذکر کو دہرایا ہے جو عرصہ ہوا طے پا چکا تھا اور اسے جلد ہی اختتام تک پہنچانے کی استدعا کی ہے۔ تو یہ تھا ان شرارت بھری نگاہوں کا مطلب۔ اس ذکر میں سب سے زیادہ دلچسپی محمود نے لی معلوم نہیں پہلے سے اسے اس رشتے کے متعلق علم تھا یا نہیں کیونکہ مشن بھیا ان لوگوں میں سے ہیں جو بہت سی باتیں بلا وجہ بھی چھپاتے ہیں۔ ابا دورے پر چلے گئے تو محمود نے ان کا لحاظ کئے بغیر مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے تو اس نے وہ نیلا لفافہ جیب میں رکھا اور پھر بار بار میرے سامنے سے گزرنے لگا۔ اگر میں اتفاق سے اس کی طرف دیکھ لیتی تو جیب پر ہاتھ رکھ کر کہتا: "یہ نہیں ملے گا آپ کو چاہے آپ جتنی خوشامد کریں۔" اگر میں نہ دیکھتی تو چھیڑتا: "کیا بات ہے بڑی بے نیازی ہے کچھ ہم غریبوں سے بھی بات کیجئے کہ بس ایک ہی خیال میں مگن ہیں۔" دو تین دن مجھے اس نے اسی طرح پریشان کیا۔ اگر ذرا مشین پر بیٹھ جاتی تو کہتا: "امی انھوں نے ابھی سے تیاری شروع کر دی۔" اگر باغ میں نکل جاتی تو کہتا: "افوہ رے انہماک اب فیصلہ ہو رہا ہے کہ اپنے گھر میں پہلے گلاب لگواؤں یا

بیلا۔" میں کبھی چڑتی، کبھی شرماتی، کبھی جھنجلاتی اور کبھی ہنس ہی نہ لیتی مگر وہ میرا پیچھا نہ چھوڑتا۔ آخر مجھے ایک ترکیب سوجھی۔ اسی چھوٹی سی بستی میں ڈاک خانہ تو کوئی تھا نہیں صرف ایک اسکول تھا جو ڈاک خانے کا کام بھی دیتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب پوسٹ ماسٹر بھی تھے اور لڑکے جب پڑھ کر لوٹتے تو اپنے آس پاس کی ڈاک پہنچا دیتے۔ ہمارے ہاں یہ کام مالی کا بیٹا انجام دیتا تھا۔ اسے میں نے روڈ مانیلی دے کر راضی کر لیا کہ آئندہ ہر ڈاک سب سے پہلے مجھے دیا کرے۔ اب کے جو منزہ کا خط آیا وہ میرے قبضے میں تھا میں اسے دور سے محمود کو دکھاتی اور کتاب میں رکھ لیتی۔ وہ لاکھ بل کھاتا، اور دوسرے بھی اسی کھیل سے محظوظ ہو رہے تھے۔ آخر سارے دن کی خوشامد کے بعد جب اس نے وعدہ کر لیا کہ آئندہ وہ مجھے بالکل نہیں چھیڑے گا میں نے اسے خط دیا۔

دن پھر اسی طرح گزرنے لگے۔ مشن بھیا کبھی کبھی کہتے :"اس محمود کو تو دیکھو جانے کا ذکر تک نہیں کرتا جیسے پوری چھٹیاں یہیں گزارنے کا ارادہ ہو۔"

"چلو رہنے دو اس غریب کا ہے کون۔ یہاں دو گھڑی تم سب بہن بھائیوں میں ہنس بول لیتا ہے۔" امی کی ممتا جوش میں آجاتی۔ اس خط والے واقعہ کو پانچ دن گزر گئے تھے۔ میں اپنے کپڑوں کی الماری ٹھیک کر رہی تھی کہ محمود آکر بولا:" دیکھئے میں نے اتنے دن اپنا وعدہ نبھایا پھر بھی آپ چار سو بیس کر گئیں۔"

"کیسی چار سو بیس؟" میں نے پوچھا۔"

"مذاق چھوڑیئے۔ خط دے دیجئے۔" وہ سنجیدہ ہو گیا

— کونسا خط،

منزہ کا۔

"اس دن کے بعد تو کوئی خط نہیں آیا۔" میں نے کہا

"سچ؟" اس کے لہجے میں سوچ اور امید و بیم کی عجیب سی کیفیت تھی۔

"واقعی۔" میں نے اسے یقین دلانا چاہا۔

"قسم سے؟" وہ مصر تھا۔

"قسم سے۔" مجھے کہنا پڑا۔

وہ خاموش ہو گیا۔ دوسرے دن وہ ڈاک کے وقت سے پہلے خود ہی اسکول چلا گیا۔ بعد ازیں ٹرین کے وقت وہ اپنے وہی کپڑے پہنے جو پہن کر آیا تھا امی سے کہہ رہا تھا:" اچھا امی میں جا رہا ہوں۔

"ہیں کیوں؟" امی نے حیران ہو کر پوچھا

اماں کا تار آیا ہے وہ کراچی پہنچ رہی ہیں۔"

امی مجبوراً خاموش ہو گئیں، اس نے جا کر ابا کو سلام کیا اور ہاتھ ملایا:" بڑا اچھا وقت گزرا آپ لوگوں کے ساتھ" شاید اس نے سب کو مخاطب کر کے کہا

پھر باری باری سب بہن بھائیوں سے ملا۔ مجھ سے بولا:" آپ سے کراچی میں ملاقات ہوگی۔

میں نے کہا:" جی ہاں۔"

پھر کہنے لگا۔ میرا کوئی خط آئے تو کراچی کے پتے پر ری ڈائریکٹ کر دیجئے گا۔"

اس سے میں سمجھی کہ منزہ کا خط آج بھی نہیں آیا۔ گاڑی چلی گئی اور مشن بھیا اسٹیشن سے واپس آئے تو امی نے پوچھا:" کیا واقعی محمود کی ماں کا تار آیا تھا؟"

"نہیں" بھیا بولے

"میرے خیال سے منزہ کا خط جو نہیں آیا اتنے دن سے اس لئے حضرت بھاگے۔" میں نے قیاس آرائی کی۔

"نہیں —" بھیا اسی آہستگی سے بولے۔ "بے چارہ فیل ہو گیا۔"

"فیل ہو گیا؟" کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

"چہ چہ — غریب" امی نے سب سے پہلے ہمدردی کی —

بھیا بولے "یہ ہمیشہ کلاس کے بہترین لڑکوں میں ہوتا تھا اب نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے"

"طرح طرح کی فکریں بے چارے کی جان کو لگی ہوئی ہیں، دکھیا" امی نے ٹھنڈی سانس بھری اور کچھ اسی قسم کی بات میں نے بھی سوچی۔

برات کا کھانا شروع ہو گیا تھا۔ باہر کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کمرے کی عورتیں بڑھتے بڑھتے بیس بائیس تک پہنچ گئی تھیں اور سارے گھٹن کے بن ٹولا اُٹھی تھی۔ میک اَپ کب کا ختم ہو چکا تھا۔ اتنی دیر میں باجی نے ایک ایک کر کے زیور میرے بدن پر لا دیئے تھے۔ عادت نہ ہونے کی وجہ سے ان زیوروں کا وزن مجھے ناقابلِ برداشت معلوم ہو رہا تھا۔ آہستہ سے میں نے باجی سے کہا کہ یہاں سے عورتوں کو نکلوائیں میرا دل گھبرا رہا ہے باجی نے ایک ایک کی خوشامد کی تب کہیں کمرے کی بوجھل فضا کچھ ہلکی ہوئی۔ پھر باجی نے یہ کہہ کر کہ تھوڑی دیر آرام کر لو مجھے ایک گاؤ تکیے کے سہارے آدھا لٹا دیا۔ میں نے اپنا سرخ آنچل چہرے پر ڈال لیا اور آنکھیں موند لیں۔

یہ غالباً بی اے کا ریزلٹ نکلنے کے چھ ماہ کی بات ہو گی جبکہ محمود اچانک ایک برقع پوش لڑکی کو لئے ہمارے ہاں داخل ہوا۔ وہ منزّہ تھی۔ دبلی پتلی عشق پیچاں کی طرح نازک اور بل کھائی منزّہ۔ اس کی اُٹھتی گرتی پلکوں کی تہوں میں جو آنکھیں تھیں ان میں ایک تلاش تھی۔ اپنی منزل پانے پر بھی یہ کسی کی متلاشی ہیں۔ میں نے یونہی سوچا۔ اس نے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھا اور پلکیں گرا لیں —— باجی منزّہ کے پاس بیٹھی تھیں دوسرے کمرے میں گئی تو محمود اور پلکیں گرا لیں۔ باجی منزّہ کے پاس بیٹھی تھیں میں دوسرے کمرے میں گئی تو محمود اور مشن بھیا چپکے چپکے کچھ باتیں کر رہے تھے مجھے دیکھ کر

بھیا خاموش ہو گئے تو محمود بولا "ان سے کیا چھپانا ان کو سب کچھ معلوم ہے۔۔۔۔ میں نے منزہ کے ساتھ نکاح پڑھوا لیا ہے" اس نے مجھ سے کہا۔ مارے حیرت کے میں منہ پھاڑ کر رہ گئی "گھر والوں سے چھپ کر؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ حالات زیادہ خراب ہو گئے تھے۔ منزہ پر زور ڈالا جا رہا تھا کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے آخر ہم دونوں کی سمجھ میں یہی ترکیب آئی کہ چھپ کر نکاح کر لیں اور وقت آنے پر بتا دیں۔

"یہ کب ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"آج ہی —— ہم وہیں سے آ رہے ہیں۔ منزہ یہاں سے بس میں اکیلی گھر چلی جائیں گی اور میں بعد میں اپنے کنج قفس کو لوٹ جاؤں گا" اس کی آنکھیں بھیگ گئیں یا مجھے شبہ ہی ہوا۔ بہرحال اس نے منہ پھیر لیا۔

"بے چارہ!" میں نے دل میں سوچا۔

"میں نے منزہ کو بھی بتا دیا ہے کہ آپ ان سے کتنی ملتی ہیں" محمود نے موضوع پلٹ دیا۔

"تبھی وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھیں" میں ہنسی۔

"مگر انھیں معلوم ہے کہ میں ان سے آدھی بھی نہیں ہوں جہاں تک چہرے کی دلکشی کا تعلق ہے"

"واہ — کون کہتا ہے۔ کیوں مشن تم ہی بتاؤ کتنی ملتی ہیں یہ دونوں"

"چھوڑو ان باتوں کو ——" بھیا کو یہ ذکر سراسر بُرا لگا۔ "بس تم یہی کرو کہ یہ نکاح نامہ اپنے پاس رکھو اور یہ ہے کہ جب اس طرف سے زیادہ دباؤ ڈالا جائے تو منزہ بتا دیں کہ ان کا نکاح ہو چکا ہے اللہ اللہ خیر صلّا —— ثبوت جب مانگا جائے تب دکھا دینا" مشن بھیا کاروباری لہجے میں بولے چلے گئے۔

"ارے آؤ بھی کہاں چلے گئے تم لوگ۔ چائے

ٹھنڈی ہو رہی ہے" باجی نے پکارا اور ہم سب چائے پینے کے لئے دوسرے کمرے میں چلے آئے جہاں منزہ اپنی خواب آلود آنکھیں نیم وا کئے جانے کونسی سوچوں میں گم تھی۔ محمود جھک کر اس سے کہا۔ "بس اب سوچنا بند کر دو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا" منزہ جھینپ کر مسکرا دی۔

چائے پینے کے بعد مشن بھیا اور محمود منزہ کو بس اسٹینڈ تک چھوڑنے گئے اور واپس آکر بہت دیر تک ہمارے ساتھ تاش کھیلتے رہے۔ آج بہت دن بعد میں نے محمود کو پھر خوش دیکھا تھا۔

چند دن وہ باقاعدگی سے آیا اور پھر بے قاعدگی سے۔ اس کے بعد اس کا آنا قطعی بند ہو گیا۔ مشن بھیا بتاتے کہ وہ پھر سے امتحان کی تیاری میں مصروف ہے کبھی وہ نوکری کے لئے دفتروں کے چکر کاٹ رہا ہے اور کبھی وہ ناظم آباد یا فیڈرل ایریا میں ایک چھوٹا سا مکان بنانے کی فکر میں سرگرداں پھر رہا ہے۔ ان کا کچھ کلیم منظور ہو گیا تھا وہ اسی فکر میں تھا کہ اس سے ایک مکان بنوا لیں اور شادی ہو جائے۔ یہ بڑے اخراجات نکال کر ملازمت ملنے تک بھی کسی نہ کسی طرح گزارہ ہو ہی جائے گا۔ اس چکر میں محمود ہمارے گھر آنے سے قطعی معذور تھا۔ میرا خیال تھا کہ بھیا جتنا بتاتے ہیں اس کے درمیان میں کچھ اور بھی ہے جسے وہ ظاہر نہیں کرتے۔ ایک دن میں نے سیدھا سوال کیا کہ اب ان کی کہانی کہاں تک پہنچی۔ بھیا ٹال گئے۔ انھیں یہ بات ناپسند تھی کہ گھر کی کنواری بالیوں کو اس قسم کی باتیں معلوم ہوں۔

"ابھی تک منزہ کے گھر والوں کو ان کے نکاح کے متعلق معلوم ہوا یا نہیں؟" میں بھی صاف اڑ گئی اب اتنی بچہ بھی تو نہ تھی۔ چند دنوں ہی میں لڑکی سے عورتوں کے زمرے میں شامل ہونے والی تھی۔

شاید ان کو معلوم ہو گیا ہے۔ کچھ لے دے ہو رہی ہے" بھیا نے کہا اور پھر کچھ پچھتا سے گئے کہ بے تکا فقرہ وہاں سے بھاگ گئے۔

بہت دن بعد پھر جو محمود آیا تو اس دن جب میں شادی کے لئے مایوں بیٹھ چکی تھی۔ باجی کی اور میری مرضی کے خلاف ہلدی میں رنگے ہوئے پیلے کپڑے پہنا کر مجھے ایک کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ یہ سب خالاؤں اور ممانیوں کی شرارت تھی، منطق کیا تھی کہ لڑکی مایوں نہ بیٹھے تو شادی کے دن اس پر روپ نہیں چڑھتا۔ روپ نہ ہوا کچا رنگ ہو گیا۔ ویسے بھی میں ان دنوں گھر میں زیادہ گھومتی پھرتی نہیں تھی سوچا چلو ان کا ہی کہنا سہی۔ اب باجی انگلینڈ ہو کر آئی تھیں میں تو نہیں۔ . . ہاں محمود آیا تو مشن بھیا اسے میرے کمرے میں لے آئے۔ امی بھی وہیں تھیں۔ محمود نے ایک بڑے سے ڈبے سے ایک خوبصورت سا ٹرانزسٹر ریڈیو نکال کر امی کو تھما دیا۔ "امی یہ میری طرف سے سلمیٰ کے لئے تحفہ ہے۔"

"لے ہے اتنا قیمتی تحفہ میں نہ لوں گی اور ابھی سے کیا تحفہ۔ شادی کے دن دیکھا جائے گا۔"

"اب تو میں لے آیا ہوں۔ دل چاہے تو پھینک دیجئے۔" وہ بولا۔

"لے واہ۔ کوئی تک بھی ہو۔ لے مشن واپس بکسے میں رکھ دے۔ ایسا ہی ہے تو شادی کے دن لا دینا۔"

مشن بھیا بولے۔ "یہی میں اس سے اتنی دیر سے کہہ رہا ہوں کہ شادی کے دن تحفہ دیا کرتے ہیں۔"

"بھئی اب میں واپس تو نہیں لے جاؤں گا۔ یہیں کہیں رکھ لو۔ شادی کے دن پھر نکال لینا۔"

"پھر وہی۔ میں کہتی ہوں یہ ریڈیو وغیرہ میں تم سے لیتی اچھی لگوں گی۔ تمہاری اماں آئیں گی تو دولہا کو کچھ سلامی وغیرہ دے دیں گی۔ بس قصہ ختم۔ یہ چونچلے مجھے اچھے نہیں لگتے۔" امی صفا بگڑ گئیں۔

"امی۔ میں آپ کو نہیں دے رہا۔" وہ دھیرے سے بولا۔ "ہاں اگر سلمیٰ کہہ دیں کہ مجھے آپ کا تحفہ پسند نہیں واپس لے جائیے تو میں لے جاؤں گا۔"

"پسند کی بات نہیں۔ . . ." میں نے نظریں نیچی کئے کئے کہا۔ "لیکن تحفہ . . . . ."

"دیکھئے جناب" محمود نے میری بات کاٹ دی "کسی کے تحفے کو کرنا کہ تنہا ہے یا مہنگا ہے یا فضول ہے بے حد بد اخلاقی ہے۔ جب کوئی چیز دیتا ہے تو شکریہ کہہ کر رکھ لیتے ہیں آئی سمجھ سٹریف میں۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ امی کو آخری وقت کی شاپنگ اور بھیا کی لائی ہوئی کوئی فضول سی چیز واپس کرنی تھی۔ کیونکہ اس کج بحث سے بچنے جاتیں۔ "لے چل مشن جلدی کر ایک میں اور ہزار کام۔" امی مشن بھیا کے ساتھ ماموں کی موٹر میں ہوا ہو گئیں۔ محمود وہیں میرے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ کمزور اور زرد دکھائی دے رہا تھا۔ اتنا چھوٹا جیسے بمشکل ہائی اسکول میں پڑھنے والا امی کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر میں نے پوچھا "پھر کب ہو رہی ہے منزہ کی رخصتی؟"

"رخصتی؟" اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ سی مسکراہٹ اُبھری اور ڈوب گئی "آپ کو مشن نے نہیں بتایا؟"

"نہیں" میں نے گردن ہلا دی۔

"اچھا — حالانکہ میں نے اس سے کہا تھا آپ کو بتا دے۔ آپ کو تو سب ہی کچھ معلوم تھا" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ میرا تجسس بڑھنے لگا۔

"ہوا کیا —" میں نے پوچھا۔

"منزہ نے عدالت میں بیان دے دیا کہ اس کا نکاح مجھ سے نہیں ہوا اور یہ سارے گواہ اور نکاح نامہ جھوٹا ہے۔"

"اچھا — بڑا افسوس ہوا" حیرت ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ مجھے واقعی افسوس تھا۔

"سلمیٰ، میں وہ سین کبھی نہ بھول سکوں گا جب وہ آنکھوں میں قطعی اجنبیت لئے ہوئے عدالت میں آئی اور اس نے کہا کہ میں اس کے لئے اجنبی ہوں۔ صرف چند سال ان کے کوارٹر میں رہا ہوں اور اس کے ابا نے مجبوراً اس کی منگنی مجھ سے کر دی تھی ورنہ وہ ہمیشہ سے مجھے ناپسند کرتی تھی۔" یہ سب کہتے ہوئے اس کے چہرے پر اتنا دکھ تھا کہ میں نے آج تک کسی ایک آدمی کے چہرے پر یکجا نہیں دیکھا۔

"شاید اس پر دباؤ ڈالا گیا ہو — میں نے اپنی ہتک کو بچانے کی سعی کی۔

"شاید —" محمود دھیرے سے بولا۔ "لیکن جب وہ نکاح کے لئے راضی ہوئی تھی تب اسے معلوم تھا کہ اس پر دباؤ ڈالا جائے گا۔ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ عورت کی فطرت کو سمجھنا واقعی مشکل ہے۔" نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے منزہ نے اس قسم کا بیان دے کر اپنی ہی نہیں میری بھی تذلیل کی ہو۔

"میں اسے الزام نہیں دیتا" محمود پھر بولا۔ "واقعی وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکا تھا۔ وہ انکار کرنے میں حق بجانب تھی۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کہہ رہا ہو "اگر اس کی جگہ آپ ہوتیں تو آپ بھی یہ ہی کرتیں۔"

ہم دونوں پھر خاموش تھے۔ کچھ سوچ کر محمود نے ٹرانزسٹر کا ایریل نکالا اور سوئی گھمائی۔ اس میں سے ایک پرسوز آواز اُبل پڑی۔

جانے وہ کیسے لوگ تھے جن کے پیار کو پیار ملا ہم نے تو جب کلیاں مانگیں کانٹوں کا ہار ملا۔ محمود کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا جیسے یہ آواز اس کے زخم جگر کو چھو رہی

ہو۔ ہم دونوں خاموشی سے گانا سنتے رہے۔ گانا ختم ہوا تو اس نے ٹرانزسٹر بند کر دیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا اب میں چلتا ہوں"

"پھر یہ لیتے جائیے" اس کی زخمی آنکھیں دیکھ کر جلدی سے میں نے اضافہ کیا "شاید امی خفا ہوں"

"نہیں۔ وہ خفا نہیں ہوں گی۔ آپ لوگوں نے مجھ پر بہت احسان ہیں۔ ... اور شاید اب میرا کوئی نہیں جسے میں کچھ دے سکوں"

"کیا آپ "اس" دن نہ آئیں گے" بہت کوشش کر کے جاتے ہوئے محمود سے میں نے پوچھ ہی لیا۔

"کیوں نہیں آؤں گا۔ ضرور آؤں گا"

آج وہ کس وقت آیا مجھے پتہ نہیں چلا۔ دلہن کو ان باتوں سے کیا علاقہ۔ (؟) کا فرض ہے کہ عورتوں کے جھمگٹے میں میٹھی مٹی کی طرح سجتی بنتی رہے سہیلیوں کی عجیب عجیب نظروں پر پلکیں جھکا لے اور حنا آلود ہاتھوں پر نظر ڈال کر آئندہ زندگی کے خوابوں میں کھوئی رہے اور اگر آئندہ زندگی کی دھند دبیز ہو تو پرانی یادوں کی گٹھریاں کھول لے ... تو آج وہ آیا ضرور تھا مگر میں اسے نہیں دیکھ سکی تھی۔ شاید اسے معلوم تھا کہ شادی کے دن یوں ہی ہوگا تبھی وہ تحفہ لے کر پہلے آگیا تھا اور آج ..... نہ جانے کیوں بیہوش ہوگیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر باجی کو اشارے سے بلایا اور پوچھا "محمود کیسا ہے اب؟"

"پتہ نہیں" باجی بولیں "یہاں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔ کس کس کی خبر لیں۔"

"ذرا پچھوائیے تو" میں نے کہا

"تم لیٹی رہو آرام سے" باجی بولیں "ان فضول کے جھنجھٹوں میں نہ پڑو"

پھر مجھے محمود کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوا۔ چلتے وقت تمام بزرگ رشتے داروں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا بہنیں اور سہیلیاں گلے ملیں۔ بھائی بھی آنکھوں میں آنسو لئے وداع کرنے آئے مگر محمود کو رخصت ہونے تک میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ ممکن ہے سینکڑوں کے اس مجمع میں کہیں خاموش کھڑا وہ بھی اس سرخ گٹھری کو وداع ہوتے دیکھ رہا ہو۔

رات کے دل دھڑکتے سناٹے میں جب نرم چاپ نے کسی کے آنے کی اطلاع دی تو بند آنکھوں میں ہی اس کا سراپا میری نظروں میں گھوم گیا۔ پھر روایتی دلہن کی طرح گھونگھٹ کے پٹ کھول کر میری ٹھوڑی کو اونچا کیا گیا تو کوئی ان جانا پیار بھرا جملہ میرے کانوں میں گیت کی طرح بجنے لگا۔ لیکن گھٹی سی ایک آواز آئی "وہ کون تھا؟"

مارے حیرت کے میری آنکھیں پٹ سے کھل گئیں۔ میں نے دیکھا کہ جن آنکھوں میں پیار کا لہریں مارتا سمندر ہونا چاہیے تھا شک کے غبار سے دھندلائی ہوئی تھیں۔

"کون؟" گھٹی ہوئی آواز میرے منہ سے نکلی۔ اتنی آہستہ جیسے حلق میں پھنس کر ہی رہ گئی ہو۔

"وہی جو ہمارا نکاح ہوتے ہی بیہوش ہوگیا تھا"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے آہستہ سے کہا

"واقعی مجھے کیا معلوم وہ کون تھا۔ منت مشن بھتیا کا پگلا سا دوست ہی تو تھا۔ ...."

پاکستانی اَدب کے ترجمے

ہم نے انگلستان۔ مغربی جرمنی۔ ہالینڈ۔ اٹلی۔ سوئٹزرلینڈ۔ فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لئے روابط پیدا کر لئے ہیں۔ ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ فی الحال وہاں کے چند کلاسیکی کتابوں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔ اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کر لئے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں کی طرف توجہ کریں۔ اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی کی لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں۔ فی الحال ہم انگریزی ترجموں اور طبع زاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کر لیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ مندرجۂ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں۔

۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک سبق یا باب کا ترجمہ کر کے پورے ناول یا کتاب کے خلاصے کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دیئے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کر لیا جائے گا۔ واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے۔ نظم۔ افسانے اور ڈرامے ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں۔ اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا۔

واضح رہے کہ اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زرّیں موقعہ کھوئیں گے ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلا معاوضہ ہی پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا۔ ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو حسبِ ضرورت پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم چند مترجمین یا ادیبوں کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک دعوت عام دے رہے ہیں۔ تاکہ سب کو یکساں موقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھالیں گے ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کی جائے

سیدہ ناز کاظمی

دل کی مرضی

پُرانے خطوط میں بڑی تیزی سے پڑھ پڑھ کر پھاڑ رہی تھی۔ چندا بھیا سامنے میرے پلنگ پر بیٹھا "کیٹس" سے کچھ بنا رہا تھا اور کبھی کبھی ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھ بھی لیتے تھے۔ اتنے میں میز کے عین برابر والے دروازے کا پردہ اُٹھا کر دھوبن نے پوچھا۔

"میں آجاؤں آپا؟"

"آجاؤ بھئی ـــ!" ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ اور چندا ہنس دیا۔

وہ کپڑے پلنگ پر رکھ کر میرے پاس آکھڑی ہوئی۔

"کپڑے ابھی پورے کر لو آپا۔ پھر آپا ناراض ہونے لگا روخت پر کیوں نہیں پوچھ کر آئی کہ کیا رہ گیا اور کیا نہیں" وہ ایک ہی سانس میں یہ سب کچھ کہہ گئی۔ بولتے ہوئے اس کی اوپر کو اُٹھی ہوئی ناک بار بار پھولتی رہی تھی۔ چندا متواتر ٹکٹکی باندھے اس کی ناک کو دیکھ رہا تھا۔

"بس تو صبح لاؤں گی کپڑے" میں نے لاپروائی سے جواب دیا۔

وہ کچھ دیر تک خاموش رہی اور کھڑی مجھے دیکھتی رہی پھر آہستہ سے بولی

"ایک بات پوچھوں آپا؟" اس کی آنکھوں میں مسکراہٹ ناچ سی گئی تھی۔

"ہاں!" میں نے کہا

"آپا تمہیں سکول میں کھط لکھنا بھی سکھاتے ہیں۔؟" اُس نے بڑی ہی معصومیت سے پوچھا۔

چندا کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "پاگل کہیں کی۔!" اُس نے کہا

"ہاں .... ہاں سب کچھ" میں نے جلدی سے کہہ دیا۔ اور اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ میں جذبات پڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"تو آپا مجھے ایک کھط لکھ دو آج ـــ" اس نے شرما کے کہا "لاؤں کارڈ"

وہ کارڈ لانے کو مڑی۔

"ارے۔ ارے۔ رُکو میرے پاس کارڈ ہے۔ لیکن خط کل اس وقت لکھ دوں گی" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

"نا ہیں آپا ـــ میری اچھی آپا جی ابھی لکھ دو نا۔ غریب کا کام کر دو۔ دعائیں دوں گی۔ ـــ" وہ خوشامدیں کرنے لگی۔

میں دل میں تو بہت جھنجھلائی۔ لیکن مجھے "ہاں" کرنی ہی پڑی۔

وہ اپنی دھوتی کا پلو سمیٹ کر وہیں زمین پر میرے قریب بیٹھ گئی۔ اور جب میں نے کارڈ نکال کر قلم ہاتھ میں لے لیا تو وہ شرمائی شرمائی سی بولی، "چندا بھیا ذرا کی ذرا باہر چلے جاویں نا!"

"کیوں میں نہیں جاتا ـــ" چندا نے بل سے جواب دیا

"دیمیرے اچھے بھیا کہنا مانو۔" میں نے کہا۔ اور وہ اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

"بس آپا شروع تو تم کھود ہی لکھ لو۔ پھر آگے یوں لکھیو۔" وہ اپنے دونوں گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ اور جب وہ کبھی کبھی گردن اُٹھا کر میرے ہاتھوں کی طرف دیکھتی تو جانے کیوں اس کے سانولے سلونے چہرے پر شفق کا سا رنگ بکھر جاتا۔ اور اطمینان اور سکون کی ایک لہر سی اسکی آنکھوں کو اور بھی روشن کر دیتی۔ اور جب میں نے پوچھا کہ خط کس کو لکھوں اور کیا لکھوں۔؟ تو اس نے گردن جھکا کر جواب دیا "ان کو ــــ لکھواؤں ہوں آپا ــ"

"ان کو۔ کن کو؟" مجھے اُسے چھیڑنے میں لطف آیا

"جاؤ آپا جی میں نہیں بتاؤں ــــ" وہ روٹھ گئی۔ اور نظریں نیچی کر کے مسکرانے لگی۔

"اچھا . . . اچھا میں سمجھ گئی۔ اُسے لکھواؤگی خط ۔۔!" میں نے مسکرا کر کہا

"ہاں جی۔ شروع کرو نا آپا۔ !" اس نے دھوتی کا پلو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہا "سر پھو ہے اس کا نام" یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور وہ بار بار پلکیں جھپکانے لگی۔

"ایک بات بتاؤ سانولی۔ یہ تم اس کا نام لیتے ہوئے اتنا شرماتی کیوں ہو۔؟" میں نے اس کے ذاتی معاملے میں خواہ مخواہ دلچسپی لینی شروع کر دی۔

"ہائے۔ آپا جی۔ ابھی پہلی بار تو جانے کا ارادہ کرائی۔ پچھلے برس آیا تھا کہن لگیا جب تو کھود بلائے گی تب آؤں گا۔"

"اچھا۔ سب کے سامنے کہا تھا اُس نے ــــ" میں نے چھیڑنے کو پوچھ لیا

"ہائے توبہ ــ بڑا چالاک ہے آپا۔ گھاٹ پر آپ لادی لاسے کوئی اُدھر کو گیا تو جھٹ سے پوچھ لیا۔" اس نے آنکھیں مٹکا مٹکا کر بتایا

"اور اب تو یہ خط بلانے کا لکھوا رہی ہے۔ آپا

اماں سے پوچھ لیا تو نے؟"

"اماں آپا کی کیا بات وہ تو کبھی بھی نہیں جانے دینے کے۔ ان کا کام پھر کون کرے گا۔ پر اب تو میں جاؤں گی بیاہ کو سات آٹھ برس ہو گئے آپا۔ اور وہ جانو کا میاں تو کبھی کا لینے آ بھی لیا ــــ"

"آٹھ برس ہو گئے۔؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔ آپا تب میں آٹھ ہی برس کی تھی۔ اب کتنے کی ہوئی بھلا۔ بارہ برس کی۔ ہیں نا آپا۔" اس نے معصومیت سے گردن ہلا کر پوچھا

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ہنستے ہنستے کہا "نہیں سولہ برس کی۔"

"ہائے آپا اتی بڑی۔" اس کی گرامیوں میں دھنسی ہوئی چمکیلی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اور اُوپر کو اُٹھی ہوئی ناک بار بار پھولنے لگی۔ اس کے خمدار ہونٹ کئی بار پھڑکے جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی "تو اب تو تا پر بڑا حجاب ہو رہا ــ" اُس نے گردن ہلا کر کہا۔ "میں آپ کو بتاؤں گی۔ چودہ سال کی لڑکی بھی ــــ"

"چُپ رہ پگلی۔" مجھے اس کی یہ باتیں اچھی نہ لگیں۔ میں نے بات کاٹ دی

"اچھا آپا کھط بیچ میں ہی رہ گیا۔ لکھو نا۔"

"بولو جلدی۔"

"لولکھو ــــ یہ کھط سرفو کو ملے۔ اس کی سانولی کی طرف سے ــ اور یہ کہ سرفو مجھے آکر لے جاؤ۔ تم نے کہا تھا نا کہ کھود بلاؤ گی تو آؤں گا تو اب آجاؤ۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا کہ میری کمار کی بیٹی جانو کا میاں اس کے لئے کیسری رنگ کی دھوتی۔ کالی چولی۔ چاندی کی پازیبیں، چاندی کا ہار اور کنٹھا تمہارا بھلا کرے سونے کے کان پھول لایا ہے اور ساتھ میں کیسری چوڑیاں بھی لایا ہے۔ اور یہ سب چیجاں اس کی سسر والی بی بی نے کھرید کر دی ہیں اُسے۔

"اور ـــ ٹھہرو نا اب تمھیں تو مشین ہی لگ گئی۔" میں نے گھبرا کر اُسے ٹوکا

"اچھا آپا اب نہیں بولتی۔" وہ ڈر سی گئی "بس آپا ایسا لکھ دو کہ وہ کل کا آتا آج ہی آجاوے۔" اس نے مجھے کئی بار یہی کہا۔ "اور کیا لکھوں۔؟" میں نے یہ سب لکھ کر پوچھا

اور پھر وہ اپنی زبان میں بولنے لگی۔

"میرے لئے میرا مطلب ہے سانولی کے لئے۔" اُس نے سینے پر ہاتھ رکھا اور اپنی گھنیری پلکوں والوں چھوٹی چھوٹی آنکھیں بند کر کے کہا۔ ـــــــ مجھے اس کی اس ادا پر ہنسی آگئی۔

"ہاں۔ ہاں سانولی کے لئے۔ کیا؟" میں نے اسے تسلی دی

"میرے لئے بھی ایسی ایسی بھلی چچیاں لے کر آئے۔ بھل پھوٹ اور مٹھائیاں بھی لاوے۔ اور۔ اور آپا ایک اونچی اڑی کا جوتا بھی لاوے۔"

"اُف۔ فو ـــ" مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "اور اُسے پہنے گا کون؟" میں نے پوچھا

"بس یونہی رکھوں گی ـــ" اس نے جھینپ کر کہا

"بس یا کچھ اور بھی۔ اب جگہ تو کم رہ گئی ہے۔"

اور پھر وہ کہنے لگی کہ اُسے جلدی آنے کے لئے لکھ دیں اور یہ کہ خالہ کی بیٹی کا خاوند بہت دنوں سے آیا ہوا ہے اُسے دیکھ دیکھ کر تم مجھے یاد آرہے ہو۔ وغیرہ وغیرہ میں نے سب کچھ لکھ کر پتہ پوچھا

"بتایا تو آپا سرپھو کو ملے۔" اس نے بڑی شان سے کہا

"اری پگلی۔ شہر کا نام۔ محلے کا نام کچھ تو بتا۔"

"آ... چھا۔ یہ بھی بتانا پڑے؟" وہ کنپٹی پر انگلی رکھ کر کچھ سوچنے لگی اور یوں وہ بے حد اچھی لگی۔ بھرا بھرا گول سا چہرہ۔ چمکتی ہوئی آنکھیں اور خمدار ہونٹ۔ سانولا سلونا رنگ۔ وہ تو اچھی خاصی کسی ہندوستانی پکچر کی سوچ سمجھ کر بنائی ہوئی دیہات کی رہنے والی ہیروئن لگ رہی تھی۔ بہت دیر سوچ کر اس نے مجھے جو پتہ بتایا میں نے بالکل وہی لکھ دیا۔ وہ خط لے کر پلو میں باندھ کر چلی گئی۔

اور میں بعد میں بھی بہت دیر تک اُسی کے متعلق نہ صرف اس کے بلکہ اس کے طبقے کے سب لوگوں کی لڑکیوں کے متعلق سوچتی رہی۔ میرا دماغ یہ سوچ سوچ کر تھک گیا ـــ "کیا ان لوگوں کی ساری خوشی بس شادی کے انتظار ہی میں ہے۔؟"

متواتر کئی روز سے جھڑی لگی ہوئی تھی۔ سردی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ کمروں میں بند رہ رہ کر جی اُکتا سا گیا تھا۔ بس سارا سارا دن اپنے اپنے کمروں میں بستروں میں دبکے زبردستی ہی کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے جاؤ۔ کبھی کبھی تو دل ہی دل میں ہلانے لگتا "اللہ کہیں جنیر یا کوئی آہی جائے۔" باجی گھبرا کر کتاب مجھ سے چھین کر کہتیں۔ اور نہیں تو بس زیادہ سے زیادہ اُون سلائیاں لے کر امی جان کے کمرے میں آگ سے روشن آتشدان کے قریب بیٹھ کر بڑے ہی رومانی انداز میں کچھ سوچنا۔ مُونگ پھلی اور چلغوزے زیادہ کھانا۔ اور پھر امی کی تیز تیز نگاہوں سے گھبرا کر جلدی جلدی اور کچھ نہیں تو پھندے ہی نکال نکال کر ڈالنا۔

تینوں چھوٹے بچوں کو امی نے دو دن سے چھٹی دلوا دی تھی۔ کیونکہ (بقول امی جان) بچے بارش میں سکول جا جا کر بیمار ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ صرف امی کی محبت کی نگاہ کا قصور تھا۔ بچے سو فی صدی تندرست تھے۔ بس تمام دن کمرے میں ادھم مچانا۔ اور رنگ برنگ چیزیں کھانا تینوں کا کام تھا۔

اسی روز اچانک بارش تھم گئی۔ چندا، ہما اور روزی کے چہرے اُتر گئے ـــــ اور سب بڑوں کی گویا عید ہو گئی۔ سب اپنے اپنے کمروں میں سے نکل کر ضروری کاموں میں لگ گئے۔ جیسے کئی روز کی تعطیل کے بعد کوئی چھوٹا سا دفتر کھلا ہو ـــ امی رضائیاں، گدّے دھوپ میں ڈلوانے لگیں۔ باجی نے سارے گھر کی کھڑکیاں دروازے کھول دیئے اور نانی نے جھاڑو سنبھال لی۔ میں نے بھی جلدی جلدی اپنا کمرہ درست کر کے

نہانے [illegible] انتظام شروع کر دیا۔ ادھر کئی دنوں سے میں کالج سے چھٹی [illegible] سوچا "نہا دھو کر کل کالج جایا ہی جائے" بچوں کی پوری پارٹی کو نہلا کر میں نے دھوپ میں زبردستی بٹھا دیا۔ اور خود نہانے چلی گئی نہا دھو کر میں بال سکھانے کے لئے مشرقی چھوٹے برآمدے میں اپنی مخصوص کرسی پر بیٹھی۔ اپنی محبوب مصنفہ "جین آسٹن" کا ناول "ایما" پڑھ رہی تھی۔ یہ ناول میں نے اس روز رات کو شروع کیا تھا۔ اور صبح بارش ختم جانے کی وجہ سے مجبوراً چھوڑنا پڑا تھا۔ اور دراصل میں بھی بچوں کے دل کی بارش ختم جانے والی ناگواریت میں شامل تھی۔ ابھی ناول کے چند ہی صفحات میں نے پڑھے تھے۔ کہ خان پلیٹ میں کچھ پھل لے کر آیا میز پر رکھتے ہوئے وہ بولا

"او سانولی تو کب سے ادھر بیٹھی ہے۔؟" میں نے خط اٹھا کر دیکھا تو سانولی میری کرسی کے بالکل قریب زمین پر بیٹھی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر یونہی مسکرائی۔ اور مسکراتے ہوئے اس کے موٹے موٹے گالوں میں دو گڑھے پڑ گئے۔ میں نے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔

"تو اتنے دنوں کہاں رہی سانولی؟" میں نے پوچھا

"یہیں تو تھی آپا!" اس کا چہرہ اداس ہو گیا۔ اور آنکھوں کے روشن چراغ کچھ مدھم پڑ گئے۔

"اچھا بتا تیرے اس کا خط آیا یا وہ خود آیا" میں نے کچھ یاد کر کے پوچھا

"نہ تو کمبخت آیا نہ خط ہی آیا۔ آپا تم نے اچھا خط نہیں لکھا تھا۔ آج کے روز ہو گئے بھلا۔۔۔ دس یا پندرہ۔۔؟" اس کے سانولے چہرے کی رنگت اور بھی سنولا گئی تھی۔ سورج کے سامنے کہیں سے بادلوں کا بھٹکا ہوا کوئی ٹکڑا آ گیا۔ سانولی نے گھبرا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

"آپا آج پھر لکھ دو خط۔ اب کی بیما پھوڑ ڈالوں گی۔ یہ تو میں ساتھ لائی ہوں" اس نے لفافہ جھٹ سے میز پر رکھ دیا اور خود بھاگ کر اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر میں وہ میرا قلم اٹھا لائی۔

"ہمارے کپڑے کب آئیں گے۔؟" میں نے بے دلی سے قلم کھولتے ہوئے پوچھا۔

"بس آج دھوپ نکل آئی۔ کل کو آجائیں گے۔ اور آپا تمہارے کپڑے تو میں کھود استری کروں ہوں" اس نے گردن مٹکا کر کہا۔

"اچھا آپا جلدی سے لکھواب۔۔۔" وہ مسکرائی اور پھر وہی دو گڑھے اس کے گالوں میں پڑ کر غائب ہو گئے۔

پھر اس نے جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا۔ یہی کہ شرفو کو سانولی بہت یاد کرتی ہے۔ جانو کے میاں کو دیکھ دیکھ کر جلا کرتی ہے اور یہ کہ اب جلدی سے لوٹ آؤ۔ ورنہ میں جان دے دوں گی۔ اور جو خاص بات لکھوائی وہ یہی تھی کہ جانو کا خاوند بڑا اچھا آدمی ہے اور وہ اس کے ساتھ سارا دن مذاق کیا کرتا ہے۔ اور اس کی چھوٹی بہنوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اس کے اماں آپا کو بھی وہ بے حد اچھا لگتا ہے۔ جانو بہت جلتی ہے۔ اور وہ بڑی نمک حرام ہے ساری عمر اس کے آپا کا کھا کر اب اسی کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ کیونکہ صدیق سارا دن اسے چھیڑتا رہتا ہے اور ہر وقت اسے دیکھتا رہتا ہے۔

اس نے کالی چوڑیاں بھی لا کر دیں لیکن اسے۔ اور جانے وہ کیا کچھ بولتی رہی۔ لیکن میں اتنی دیر میں جتنی دیر میں وہ بہت کچھ کہہ جاتی تھی۔ اتنا کچھ ہی لکھ سکی ۔۔۔ اور میں زیادہ لکھنا چاہتی بھی نہیں تھی۔ خط بند کر کے میں نے اس کے حوالے کیا۔ وہ چلی تو میں نے پوچھا

"اچھا تو یہ چوڑیاں تجھے صدیق نے لا کر دی ہیں۔" میں جانے کیوں اس سے کچھ ناراض سی ہو گئی تھی۔

"ہاں آپا۔ اچھی لگ رہی ہیں نا میری کلائیوں میں" اس نے ہاتھ آگے کر کے کہا۔ "وہ جو جانو ہے۔ بری مریل سی ہے آپا کچھ بھی نہیں پھبتا اس پر۔ سچی تو کہے صدیق کہ وہ کہاں اس کی قسمت میں لکھی تھی۔ بھلا وہ تو اتنا سوہنا گھبرو۔ اور وہ کھپڑ مل

سی۔ — وہ بولتی بولتی چل دی۔ اور میں نے سوچا۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ اتنا غرور ہے اس کے بھولپن میں۔ اوہ دیکھنے میں کتنی معصوم لگتی ہیں اس طبقے کی اَن پڑھ لڑکیاں۔ لیکن گنوں کی کیسی پوری ہوتی ہیں۔ یہ سانولے سانولے معصوم چہرے اور یہ خیال۔ جیسے گدلے پانی کی تہہ میں چھپے ہوئے زہریلے کیڑے مکوڑے۔ مجھے سانولی کے وجود سے نفرت سی ہو گئی — لیکن کبھی اس کے معصوم حسن کا خیال آتا تو سوچتی کہ کم بخت کا کیا قصور؟ ہے بھی تو کافی دلکش۔ بے ساختہ ادائیں۔ معصوم مسکراہٹ اور نکھرا نکھرا سا حسن — گالوں پر بکھری ہوئی انجانی شہابیت۔ جیسے شام پڑے کسی خوبصورت پہاڑی مقام میں ہلکی ہلکی سی شفق ہلکے ہلکے سے اندھیروں پر چھا جائے۔ اور اس سے منظر اور بھی خوبصورت ہو جائے۔

پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ میں تو شاید اسے بھول ہی چکی تھی۔ کیونکہ داخلے کے ٹیسٹ ہونے والے تھے۔ اور فائنل کا داخلہ جانا تھا۔ پرنسپل صاحبہ کے اس اعلان نے تو اور بھی ڈرا دیا تھا کہ "کوئی لڑکی اگر کسی بھی مضمون میں فیل ہوئی تو داخلہ نہیں بھیجا جائے گا۔" اسی لئے میں نے پوری توجہ اور ایمانداری سے اسٹڈی شروع کر دی تھی۔ کہ امتحان میں فیل ہونے کی شرمندگی تو خیر پھر بھی اٹھائی جائے گی لیکن داخلہ نہ جانے کی بے عزتی کون برداشت کرے گا۔ اسی لئے ناول، ننگ اور افسانوں کے پلاٹ سوچنے چھوڑ کر میں بڑے خلوص سے پڑھ رہی تھی۔

شام کے کوئی چھ بجے ہوں گے۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھی میز پر "میکبتھ" رکھے پڑھنے کی کوشش ہی کر رہی تھی۔ سبز شیڈ والا لیمپ روشن تھا۔ باہر باغ میں کھلنے والی کھڑکی کا پردہ میں نے جان بوجھ کر ہٹا رکھا تھا۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ پڑھائی کے لئے کمرہ گرم نہیں ہونا چاہیئے۔ ورنہ نیند آنے لگتی ہے۔ صاف شفاف شیشوں میں سے میں نے کئی بار جھک کر آسمان کی طرف دیکھا۔ سیاہ بادل گھٹا ٹوپ چھا رہے تھے۔ بارش کے احساس سے ہی مجھے کپکپی سی آگئی۔ اور میں نے ایک حسرت بھری نگاہ اپنے گرم نرم بستر پر ڈال کر اپنے سرد ہاتھ سیاہ چادر میں چھپا لئے۔ اور کہنیوں میں کتاب پکڑ کر پڑھنے لگی۔ ابھی میں پڑھنے کے لئے کئی مرتبہ تمہید باندھ چکی تھی۔ کہ میز کے قریب والے دروازے میں سے سانولی نمودار ہوئی۔ چل تو جلال تو — میں نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ گاڑھے کی سفید چادر اتار کر میرے سامنے آکھڑی ہوئی۔ مجھے اسے دیکھ کر کچھ خوشی بھی ہوئی اور گھبراہٹ بھی۔ دراصل امی جان نے یونہی مجھے اس کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر ڈانٹ پلا دی تھی۔ (بقول امی) ایسی ویسی لڑکیوں کے پاس لڑکیوں کا بیٹھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ لیکن اس روز تو وہ حد سے زیادہ جاذب نظر ہو رہی تھی۔ کیسری دھوتی اور سیاہ چولی جیسے اسے کھائے جا رہی تھی۔ کانوں میں سونے کے کان پھول تھے۔ اور گلے میں چمکتا ہوا چاندی کا ہار — اس نے آنکھوں میں گہرا گہرا کاجل لگا رکھا تھا۔

"ارے۔ سانولی۔ اچھا اب سمجھی۔ تیسرا "وہ" آگیا نا؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ارے ناہیں آپا — جیر کھا دے وہ نہیں آیا تو نہ آئے۔ ہم نوں کونسی پروا پڑی —" اس نے بڑی ادا سے جواب دیا

"آ... اچھا — !" میرا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اس کا تو کہنا آگیا آپا کے ناؤں — کہ بئی میں نہیں آسکتا سال بھر میں آؤں گا۔ ابھی کمائی کچھ نہیں۔ اور پہلے بہنا کی شادی کرے گا۔ پھر آوے گا ڈولی لینے کو — جیر کھانا۔ بھلے کوئی پوچھے۔ پرائی بیٹی کو ٹھی کی موڑ لی سمجھ رکھیا — !"

اور مجھے اس کی باتوں سے گھن سی آنے لگی۔ میرا دل چاہا کہ اسے کہہ دوں کہ وہ چلی جائے۔ لیکن ابھی مجھے کچھ پوچھنا تھا۔

"اور یہ سب چیزیں تو اس نے بھیجی ہیں نا" میں نے تُو وہ لینے کے لئے پوچھا۔

"ناہیں آپا۔ ایسا وہ کہاں کا ہے۔ یہ تو مجھے صدر نے دی ہیں" وہ اترا کر بولی

"وہ کیوں!" مجھے حقیقتاً غصہ آنے لگا تھا

بائےکیا۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے بھلا۔ بس اس کے دل کی مرضی۔ اس کی وہ مریل گھوڑی تو ایک مہینے سے کھاٹ پر پڑی دم توڑ رہی ہے۔ بارسوں کے دنوں میں کپڑے دھوتی رہی۔ نمونیہ ہوگیا۔ بچارے نے بتھیرا علاج کروایا۔ پر وہ کہیں ٹھیک ہوسکے۔ عمر بھر کی یونہی سی ہے۔ سچی بات ہے آپا میں تو اپنا بہت خیال رکھوں۔ ذرا سی بارش ہوئی اور بخار سکھار کا بہانہ بنا اپنے بستر میں گھس گئے۔ تبھی تو جان بھی ہے۔ اور اُٹھتے بیٹھتے وہ صدیق گھور رہے تھا۔" وہ شرما کر بولی

"اچھا۔ تو اب کیا کام ہے جا منہ لے کر۔" میں یونہی جل گئی تھی۔ مجھے اس کے وجود سے نفرت ہوگئی تھی۔

"ایک کام ہے آپا۔ بس آخری کام۔ وہ جانو تو بس یوں سمجھو آپا دن گن رہی ہے۔ کڑھے بہت آپا۔ مجھ سے بھلا کیوں جلے۔ روپ نکھار کا دین والا تو وہ ہے۔ صدیق بھی تو مجھے اس کے سامنے ہی چھیڑ دے ہے۔ یہ بات میں بھی کہوں کہ بری ہے۔ پر میں تو یوں کہوں کہ جانو تو اپنی جان کو سنبھال۔ صدیق ایسے گبھرو کو اب کیا رسی ڈالے گی۔" میں اس کی سنگ دلی پر تڑپ اُٹھی

"اچھا۔ اچھا بس کرو۔ جاؤ میرے کان نہ کھاؤ۔" میں نے چیخ کر کہا۔

"میں تو جاؤں آپا۔ آج صدیق کے ساتھ بائیسکوپ دیکھن جانا ہے۔"

"اور جانو۔" میرے منہ سے بیساختہ نکل گیا۔

"وہ تو سائد مر بھی گئی ہو۔" اس نے مسکرا کر کہا اور اس کی اس مسکراہٹ کے پیچھے مجھے کتنی سنگدل چڑیلیں نظر آئیں کاش میں یہ بتا سکوں۔ اس کے گالوں میں گڑھے پڑ گئے اور آنکھوں میں کسی ناگن کی آنکھوں سی چمک آگئی۔

"اب جاؤ ساتولی۔ چلی جاؤ۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جیسے کسی تنگ باورچی خانے میں دھواں گھٹ جاتا ہے۔

"آپا ایک کھدا کھ دینا سر پھو جیر کھانے کو۔ کہ بہتا کی سادی کر یا متیا کی میری جو تی کو پروا ہے۔ تجھے میں نہیں بھائی تو کیا ہے۔ اپنے اپنے دل کی مرجی ہے۔" وہ بڑی شان سے چادر اُٹھا کر باہر نکل گئی۔ اسے آج میری ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میرے کانوں میں اس کے یہ الفاظ اس پانی کی طرح سرسراتے رہے۔ جو نہاتے میں بداحتیاطی سے کان میں چلا جاتا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اس کا دلکش لیکن قابل نفرت وجود گھومتا رہا۔ میں گھبرا کر امّی کے کمرے کی طرف بھاگی۔ اور میں نے وہاں جا کر دیکھا کہ امّی بڑی عقیدت سے خدائے بزرگ و برتر کے حضور جھکی ہوئی ہیں۔ مجھے امّی کے چہرے پر دُنیا بھر کا نور نظر آیا۔ میرے دل کو سکون سا مل گیا۔ "ویسے ہیں اس جہاں میں تو ایسے بھی ہیں۔" میرے دل سے آواز آئی۔ میں جلدی سے بچوں کے کمرے میں جا کر بچوں کے ساتھ کھیلنے لگیں۔۔

پھر اگلے ہی ہفتے خلاف معمول ہمارا دھوبی ساتولی کا آبا خود ہی کپڑوں کا گٹھڑ اُٹھا کر سیدھا میرے پاس لان میں ہی آگیا۔

"کپڑے ملا لو بی بی جی۔" اسے بھی معلوم تھا کہ کپڑوں کا کام میرے ہی حوالے ہے۔

"کل ملاؤں گی۔" یہ گویا میری کمزوری تھی۔ کہ جس دن کپڑے آتے تھے اس سے اگلے دن ملایا کرتی تھی۔

"اچھا جی آپ کی مرجی۔" وہ جانے لگا تو میں نے اچانک پوچھ لیا۔ "آج ساتولی کیوں نہیں آئی بابا۔"

"بس۔۔۔ اس کے۔۔۔ دل کی مرجی بی بی جی" وہ نگاہیں جھکا کر بولا۔

"جانو کا کیا حال ہے اب۔" میں نے دوسرا سوال کر دیا وہ ٹھٹک سا گیا۔

"مر گئی وہ تو۔" اس نے جلدی سے کہا

"کب۔" میرے منہ سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"سات آٹھ روج ہوگئے اس کو تو۔" اس نے کھدر کے کپڑے سے آنکھیں پونچھ کر جواب دیا

"بڑا افسوس ہوا مجھے تو —" میں نے آہستہ سے کہا
ہاں جی ۔ اس کا تو بے چاری کا کا ہے کا افسوس مر گئی
چلو اپنی محبت اپنی جان ساتھ لے گئی ۔ افسوس تو بی بی اُس جیر
کہانی سانولی کا کرو بی بی جی —" وہ آنکھیں پونچھ کر خود بخود بولا
پہلے تو میں متحیر سی رہ گئی۔ پھر کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے
لگا۔ لیکن میں نے پوچھ لینا ضروری سمجھا۔
"اُسے کیا ہوا بابا؟"

"وہ جانو کے میاں کے ساتھ بھاگ گئی بی بی جی۔ میری
برادری میں ناک کٹوا گئی ۔ مجھے جیتے جی مار گئی ۔ اور جانو کو سوکن
بن کر ڈس گئی ۔ اللہ کرے ایسی بیٹی کسی کے گھر نہ پیدا ہو۔ بی بی
جی اس کے دل کی یہی مرضی ہو گی۔
اُس کا سر جھکتے جھکتے بالکل سینے کو جا لگا۔ اور آنکھوں
سے گدلے گدلے آنسوؤں کا گویا دریا بہنے لگا۔

یونسکو کی اشاعتی سرگرمیاں

۱۔ یونسکو سورس بک فار سائنس ٹیچنگ

دنیا کے بہت سے ملکوں میں سائنس کی تعلیم کے انتظامات آج بھی بہت ناقص ہیں خاص طور پر ابتدائی اور ثانوی درجوں میں سائنس کی تعلیم کا اچھا انتظام نہیں ہوتا۔ اس کمی کو محسوس کرتے ہوئے یونسکو نے یہ کتاب ترتیب دی ہے اس میں آپ کو سائنس کے بہت سے آلے بنانے کے آسان طریقے ملیں گے۔ کتاب میں ۳۰۰ سے زیادہ نقشے اور تصویریں ہیں۔ قیمت ۱۵ اسٹرلنگ

۲۔ کرنٹ ٹرینڈز ان سائنٹفک ریسرچ

فزکس کے ممتاز فرانسیسی عالم پروفیسر پیرے اوگر نے اقوام متحدہ کے ایما پر سائنسی تحقیقات کے بارے میں یہ رپورٹ تیار کی ہے یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے اور مختلف شعبوں میں سائنسی تحقیقات کے مختلف رجحانات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۳۳ر اسٹرلنگ

کٹالاگ آف کلرری پروڈکشنز آف پینٹنگ

کٹالاگ آف کلر پروڈکشنز (۱۸۶۰ سے پہلے) قیمت :- ۶/۲۲ اسٹرلنگ
" " (۱۸۶۰ - ۱۹۶۱) قیمت :- ۶/۲۸ اسٹرلنگ

پروسیڈنگز آف دی انٹرنیشنل کانفرنس آف انفارمیشن پروسیسنگ

(انگریزی اور فرانسیسی زبان (ان کے علاوہ جرمن۔ روسی اور اسپینی زبانوں میں بھی خلاصہ موجود ہے)۔ قیمت ۷/۷ اسٹرلنگ

ملنے کا پتہ :- ویسٹ پاک پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ یونسکو پبلشنگ ہاؤس
پی۔ او بکس نمبر ۳۴۷، ۵۶۔ این گلبرگ ۔ انڈسٹریل کالونی ، لاہور



موسم گرما کی تفریحات !
ٹھنڈے پانی کا غسل
ہمدرد کے شربت بھی ایسے ہی
تازگی بخش ہیں۔
ہمدرد کے ۷ مشروب موسم گرما کی تفریحات میں
ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔ یہ خوش ذائقہ اور خوش تاثیر شربت
موسم کی خشکی اور ماندگی کو دور کر کے طبیعت کو فرحت پہنچاتے ہیں۔
۷ دلپسند مشروب - ۷ مختلف ذائقے
ہمدرد شربت
گلاب
کیوڑہ
انار
خس
صندل
کیلا
انناس
روح افزا کی طرح معیاری اور پسندیدہ
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس - لاہور - کراچی

نیا قانون

○ — "کہ یہ سال اچھا ہے"
○ — خبر کا خلاصہ
○ — تبصرے

(مرکز)

"کہ یہ سال اچھا ہے"

خبر ملی ہے کہ صدارتی کابینہ نے کاپی رائٹ قانون کا مسودہ منظور کر لیا ہے اب کسی روز بھی یہ مسودہ صدر مملکت کے دستخط کے بعد ایک ہنگامی قانون کی شکل اختیار کرے گا۔

جب تک یہ قانون شائع ہو کر منظرِ عام پر نہ آئے ہم تفصیل سے اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے مگر ملکی صحافت نے جس بے اختیارانہ طریقے سے اس خبر کا خیر مقدم کیا ہے اس سے ثابت ہے کہ ملک کے سب باشعور طبقے موجودہ کاپی رائٹ قانون کی کمزوریوں اور ان سے پیدا شدہ حالات سے عاجز تھے۔ ہندوستان میں نیا کاپی رائٹ قانون کبھی کا بن چکا۔ انگلستان اور امریکہ تو اپنے پرانے قوانین کو کئی کئی بار بدل چکے ہیں۔ رہی یہ بات کہ ایران وغیرہ میں کسی قسم کے موثر کاپی رائٹ قانون کا وجود ہی نہیں تو یہ کوئی بہت زیادہ تسلی بخش موازنہ نہیں۔

گلڈ نے وجود میں آتے ہی اس موضوع پر کام کرنا شروع کر دیا تھا اور یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں کہ گلڈ نے وجود میں آتے ہی اس موضوع پر احتجاج اور عملی تجاویز کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس منزل تک پہنچنے میں ہم نے بہت پاپڑ بیلے بہتوں کی ناخوشی مول لی بہت سے ایسے مفادات سے ٹکر لی جن کے اثرات بہت وسیع گہرے اور پرانے تھے۔ ادھر حکومت کسی معاملے میں جلد بازی سے کام نہ لینے کے زریں اُصول پر مُصر رہتی ہے لہٰذا اس سے بے شمار مذاکرات کرنے پڑے مزید تحقیق کے لئے یونیسکو کا سہارا لینا پڑا اور اس کے بعد گزشتہ ستمبر میں ایک "آل پارٹی" کانفرنس میں مسلسل سات مسودہ قانون پر بڑے فضلا سے بحث مباحثے رہے حتیٰ کہ ہمیں کبھی کبھی تلخ گوئی بھی کرنی پڑی۔

بہرحال ساڑھے تین برس کی اَن تھک کوششوں کے بعد خبر آئی ہے کہ

مسیحا نفسے می آید

ہم گلڈ کے اراکین کو ان کی ایک بڑی فتح پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ آج ہمیں اتنا ضرور معلوم ہے کہ ہمارے چند بنیادی مطالبات قانونی دفعات کی شکل میں آگئے ہیں لیکن ابھی ہم انتظار کریں گے۔ اس کے علاوہ اگر یہ قانون ایک بہترین قانون بھی ہے تب بھی متعلقہ افراد اور اداروں کو اس کی ڈگر پر چلانے اور اس کے فوائد سے بہرہ ور ہونے کے لئے ایک اور مہم ضروری ہو گی۔

حیاتِ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں"۔

خبر کا خلاصہ

ملک کے تمام حلقوں نے اس خبر پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ صدارتی کابینہ نے ملک میں کاپی رائٹ کا جامع قانون جاری کرنے کی منظوری دے دی۔ نیا قانون موجودہ کاپی رائٹ کی جگہ نافذ ہوگا اور مصنفوں، ادیبوں، ناشروں اور کتب فروشوں و باہمی مفادات کی حفاظت کرے گا۔ اس قانون کی رُو سے اُدبی تصنیفات ڈراموں نیز موسیقی آرٹ اور سینما ٹوگرافی کی تخلیقات، گراموفون ریکارڈ اور براڈ کاسٹنگ کے پروگرام کو کاپی رائٹ کا مضبوط تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت ہرجانہ ادا کرنا ہوگا اور ان پر فوجداری کا مقدمہ چلایا جاسکے گا مصنفوں کو اپنے کاپی رائٹ حقوق ایک وقت میں صرف دس سال کیلئے منتقل کرنے کی اجازت ہوگی۔ اس کے بعد انھیں یہ حقوق واپس مل جائیں گے اور وہ انھیں پھر منتقل کرسکیں گے۔ اس سے مصنفین کو اپنے حقوق کی غیر منفعت بخش منتقلی اور ناجائز لُوٹ کھسوٹ سے تحفظ ہو جائے گا۔ اس قانون میں یہ اہتمام بھی رکھا گیا ہے کہ کاپی رائٹ کے برن اور یونیورسل کنونشن کی پابندی ہو اور پاکستان کے مصنف ان کنونشنوں کے تحت غیر ممالک میں تحفظ کا مطالبہ کرسکیں ایک کاپی رائٹ بورڈ قائم ہوگا جس کے چیرمین کو ہائی کورٹ کے جج کا درجہ حاصل ہوگا۔ کاپی رائٹ کا ایک دفتر بھی قائم کیا جائے گا جو خلاف ورزیوں پر معاوضہ وغیرہ کے تعین کا کام کرے گا۔

ملک بھر میں جو کتاب چھپے گی اُسے کاپی رائٹ رجسٹرار کے دفتر میں داخل کرنا ضروری ہوگا اور اس طرح رفتہ رفتہ ایک عظیم الشان قومی کتب خانہ وجود میں آئے گا۔ واضح رہے کہ امریکی لائبریری آف کانگریس واشنگٹن اور برٹش میوزیم لائبریری لندن اور سوویت لائبریری ماسکو ایسے ہی قانون کے ذریعہ وجود میں آئی ہیں۔

تبصرے

کاپی رائٹ ایکٹ کے متعلق پاکستان کے متعدد مؤقر جریدوں نے جو تبصرے کئے ہیں وہ من و عن درج ذیل ہیں:۔

پاکستان ٹائمز

کاپی رائٹ ایکٹ:۔ مروجہ کاپی رائٹ قوانین کی وجہ سے اس ملک میں ادیبوں اور فنکاروں کے مفادات کو بہت زیادہ نقصان پہنچا ہے متعلقہ قانون میں خامیوں کی وجہ سے نقصان اُٹھانے والے ادیب یا ان کے قانونی ورثا وغیرہ بالکل بے دست و پا تھے، غیر محتاط ناشرین اپنے حقوق اور مراعات سے بھرپور فائدہ اُٹھاتے۔ ادیب اور فنکار ایک عرصے سے کاپی رائٹ قوانین میں ترمیم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ آج سے تین سال پہلے رائٹرز گلڈ نے اپنے قیام کے فوراً بعد اس مسئلے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اس قانون میں تبدیلی جسے کابینہ نے منظور کر لیا ہے، گلڈ کی مسلسل اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے نیا قانون جسے جلد ہی نافذ کر دیا جائے گا، کاپی رائٹ ایک قابل دست اندازی پولیس جرم ہوگا جس کی سزا قید و جرمانہ ہوگی۔ ایک کاپی رائٹ بورڈ بھی قائم کیا جائے گا جس کے چیئرمین کا درجہ ہائی کورٹ کے جج کے برابر ہوگا۔ بورڈ اس قانون کو عملی جامہ پہنائے گا۔ ملک کے اندر پاکستانی ادیبوں اور فنکاروں کو مناسب تحفظ فراہم کرنے کے علاوہ یہ قانون پاکستان میں برن اور یونیورسل کاپی رائٹ کنونشنوں کی صحیح تعمیل کی کوشش کرے گا۔ اس سے صرف یہی فائدہ نہیں ہوگا کہ بیرونی ممالک میں پاکستانی ادیبوں کے مفادات کا تحفظ ہو سکے گا بلکہ پاکستان میں غیر ممالک کے ادیبوں کی تخلیقات کی دوبارہ اشاعت یا ان کے ترجموں کی بلا اجازت اشاعت کو روک کر بیرونی ملکوں میں پاکستان کے وقار کو بلند کرنے میں مدد ملے گی۔ مجوزہ قانون کا پہلو اس حقیقت کے پیش نظر خاص طور سے قابل ستائش ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں بہت سی پاکستانی تخلیقات کو ہندوستان میں اور ہندوستانی تخلیقات کو پاکستان میں غیر قانونی طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اُمید ہے کہ اس قانون کے نفاذ سے ناشر کے رویے میں تبدیلی آئے گی اور اس قانون کو شاذ و نادر استعمال کرنے کی ضرورت پڑے گی۔ درحقیقت اگر ناشرین کی رضاکار تنظیمیں پورے تعاون کی پیشکش کریں تو ممکن ہے کہ نئے قانون کو بروئے کار لانے کی ضرورت نہ پڑے۔

انجام کراچی

کاپی رائٹ کا نیا قانون:۔ ہمیں مسرت ہے کہ مرکزی کابینہ نے کاپی رائٹ کے سلسلے میں ایک نیا مسودۂ قانون منظور

کر لیا۔ اور اس طرح صدر ایوب نے پاکستانی مصنفین کے معاملہ میں جو وعدہ کیا تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اس نئے قانون کی تشکیل میں سب سے زیادہ کوشش رائٹرز گلڈ نے کی ہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اب تک ہمارے ملک میں ۱۹۱۲ء کا ایک فرسودہ کاپی رائٹ قانون نافذ ہے جو ایک ایسے قدیم تر برطانوی قانون کی نقل ہے جو خود برطانیہ میں بھی کالعدم قرار دیا جا چکا ہے اور ہندوستان میں بھی آزادی کے بعد ختم کر دیا گیا تھا۔ رائٹرز گلڈ نے ملک میں پہلی بار ۱۹۵۹ء میں اس قانون کی خامیوں کی طرف توجہ دلائی اور بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ نئے قوانین کا مطالبہ کیا۔ یہ ایک بہت مشکل اور پیچیدہ مسئلہ تھا کہ نئے قانون میں کس طرح ان مفادات کی حفاظت کی جائے جو کاپی رائٹ سے متعلق ہیں یعنی مصنفین، ناشرین، کتب خانے، فلم ساز، موسیقار وغیرہ۔ اس کے لئے تمام طبقوں کو ہم خیال کرنے کی ضرورت تھی اس کے علاوہ یہ بھی ضروری تھا کہ نیا قانون بین الاقوامی معاہدوں کے مطابق ہو۔ چنانچہ مسودۂ قانون میں سب اُمور کا خیال رکھا گیا ہے۔ ہمارے ہاں اچھے مقاصد کے لئے کام کرنے والوں کو فراخ دلی سے داد دینے کا رواج نہیں ہے اور اس روش کی وجہ سے زیادہ کارکن میدان میں نہیں آتے۔ ناسپاسی ہوگی اگر ہم رائٹرز گلڈ اور اس کے کارکنوں کو اس کارنامے پر خراج تحسین پیش نہ کریں جن کی پیہم جدوجہد سے نہ صرف مصنفین بلکہ کاپی رائٹ سے ملحقہ جملہ مفادات کے تحفظ کی ایک بے مثال نظیر قائم ہو گئی ہے اس سلسلہ میں خاص طور پر گلڈ کے بانی اور ایگزیکٹیو سکرٹری جمیل الدین عالی صاحب کا ذکر کریں گے جنہوں نے نہ صرف ادیبوں کے حقوق کے لئے ملک گیر سطح پر ہمہ جہتی مہم کامیابی سے چلائی بلکہ اس مہم میں بہت سی کامیابیاں بھی حاصل کیں گزشتہ سالوں میں حکومت نے کئی افراد کو یونیسکو کے صدر دفتر اور دوسرے ممالک میں دُنیائے کتب پر تحقیق اور ضروری تربیت کے لئے بھیجا۔ لیکن ان حضرات نے واپس آکر کوئی مفید رپورٹ کوئی قابل عمل پروگرام مفاد عامہ کے لئے پیش نہیں کیا۔ بلکہ کئی نے اپنی تربیت کو کاروباری اداروں میں اعلیٰ ملازمت کا ذریعہ بنایا اس کے برخلاف گلڈ کے ایگزیکٹیو سکریٹری واپسی پر مفاد عامہ کے لئے کئی قابل قدر منصوبے منظر عام پر لائے جن میں کاپی رائٹ کے بنیادی اُصول اور اکیڈمی آف لٹریچرز (ایوان ادب) اور گلڈ پرنٹنگ پریس کے پروگرام شامل ہیں۔ ان ہی کی کوششوں سے گزشتہ ستمبر میں حکومت نے ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی صدارت میں ایک کاپی رائٹ کانفرنس بلائی جس میں نئے مسودۂ قانون پر سفارشات مرتب ہوئیں اس قانون کی سب سے اہم شق وہ ہے جس کی رُو سے کاپی رائٹ کی مستقل فروخت اسی طرح غیر قانونی قرار دے دی جائے گی جیسے غلاموں کی فروخت ناجائز ہے یعنی دوسرے الفاظ میں تصنیف کو قابل فروخت شے کی بجائے قانونی طور پر ناقابل فروخت تخلیق قرار دے دیا گیا ہے۔ یہ تصور بہت دُور رس فوائد کا حامل اور عالمی قوانین کے دائرے میں بالکل نیا ہے۔ مسٹر جمیل الدین عالی کے ذہن رسا کی پیداوار ہے۔ گزشتہ جنوری میں یونیسکو کے ماہر اور لائبریری آف کانگریس واشنگٹن کے ڈپٹی ڈائرکٹر کاپی رائٹ ڈاکٹر کامنسٹائن نے گلڈ سے مذاکرات کے بعد بیان دیا تھا کہ کاپی رائٹ کے بانٹنے میں یہ تصور بہت عظیم اور انوکھا ہے اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں بھی رائج نہیں اور یہ کہ خود وہ امریکی کانگریس کے سامنے اسی مضمون کی ترمیمات پیش کر رہے ہیں۔ ہمیں اس صورت حال پر نہایت فخر اور خوشی ہے کہ ہمارے ملک کا ایک نیا مسودۂ قانون جس کا ہماری ثقافتی زندگی سے نہایت گہرا اور دیرپا تعلق ہوگا ترقی یافتہ ممالک کے لئے بھی ایک مشعل راہ بن جائے گا ہم حکومت کو بھی اس نیک اور مفید اقدام پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور یونیسکو کے بھی ممنون ہیں کہ اس نے اس سلسلہ میں ماہرانہ خدمات بہم پہنچائیں اور اچھے کارکنوں کی تربیت کا انتظام کیا۔ اُمید ہے کہ یہ مسودہ قانون بہت جلد نافذ ہو کر ہماری تہذیبی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دے گا اور مصنفین اور ناشرین کے تعلقات کی استواری کے ساتھ ساتھ ملک میں شائع شدہ جملہ کتابوں کو ذخیرہ کرنے کا انتظام بھی ہو جائے گا جو تخلیقی کام کرنے والے افراد اور اداروں کے لئے ایک اشد ضرورت ہے اور جس کے بغیر سینکڑوں علمی منصوبے ناتمام پڑے ہوئے ہیں اس کے علاوہ کاپی رائٹ کی خلاف ورزی قابل دست اندازی حکومت

قرار دے کر ان ناز یبا حرکات کا خاتمہ کر دے گی جو سرقہ پسند ناشروں اور افراد سے بر روز سرزد ہوتی ہیں مشایع شدہ کتابوں کے ساتھ مسودات کی رجسٹری سے گوناگوں فوائد الگ حاصل کرے گا اور کاپی رائٹ ٹری بونل کے قیام سے مصنفین ناشرین بلا ز اور موبیقار طویل عدالتی کارروائیوں سے بچ جائیں گے۔ یہ مسودہ قانون ہمارے قانونی نظام میں ایک خوشگوار تبدیلی ہے۔

امروز۔ لاہور

نیا کاپی رائٹ ایکٹ صدارتی کابینہ نے کاپی رائٹ ایکٹ منظور کر کے ملک کے ادیبوں اور مصنفوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مرکزی حکومت نے دو برس قبل مصنفوں کے حقوق کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا اس قانون سے وہ پورا ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۴ء کا پی رائٹ ایکٹ جسے منسوخ کیا جا رہا ہے اس لحاظ سے بھی انتہائی ناقص تھا کہ مصنفوں کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف موثر اور موثر کارروائی ممکن نہیں تھی۔ اس میں شبہ نہیں کہ نئی تخلیقات کو مصنف کی اجازت کے بغیر شائع یا نشر کرنے والوں کے خلاف دیوانی عدالتوں میں ضابطے کی الجھنوں، وقت اور سرمائے کے اسراف اور دوسری مشکلات کی وجہ سے مصنفوں اور ادیبوں کے لئے اپنا حق حاصل کرنا ممکن نہیں تھا اور اس کارروائی میں غیر ذمہ دار ناشروں کا پلہ عموماً بھاری رہتا تھا۔ نیا ایکٹ اس خامی سے پاک ہے اس کی رو سے کاپی رائٹ کی خلاف ورزی کو قابل دست اندازی پولیس جرم تصور کیا جائے گا اور ملزموں کے خلاف فوجداری مقدمات دائر کئے جا سکیں گے۔ اس کے علاوہ ایک کاپی رائٹ بورڈ بھی قائم کیا جائے گا۔ جس کے چیئرمین کا درجہ ہائی کورٹ کے جج کے برابر ہو گا۔ اور کاپی رائٹ کی رجسٹریشن کے لئے ایک شعبہ موجود ہو گا۔ مصنفین کو دس برس بعد اپنی تصانیف دوبارہ فروخت کرنے کا حق دے دیا گیا ہے۔ جس سے "دائمی حقوق اشاعت" کی وہ پرانی روایت ختم ہو جائے گی جس کی وجہ سے مالی پریشانی میں مبتلا مصنفین اپنی تخلیقات سے کم سے کم معاوضے پر ہمیشہ کے لئے بے تعلق ہونے پر مجبور ہوتے تھے۔ ہندوستان اور پاکستان کے مصنفوں کو سب سے زیادہ شکایت ان دو ہمسایہ ممالک کے ناشروں سے ہے جنھوں نے ایک ملک کے مصنفوں کی تخلیقات بلا اجازت شائع کرنے میں کسی قانونی اور اخلاقی ضابطے کو ملحوظ نہیں رکھا، کاپی رائٹ ایکٹ میں اگرچہ ایسی دفعات رکھی گئی ہیں۔ جن کے مطابق پاکستان کے مصنفین بین الاقوامی کاپی رائٹ کنونشن کے تحت تحفظ کا مطالبہ کر سکتے ہیں لیکن ان دونوں ملکوں کے درمیان مصنفین کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک علیحدہ معاہدہ کی ضرورت محتاج تشریح نہیں ہے۔ گزشتہ برس اس سلسلے میں کچھ کارروائی بھی ہوئی تھی لیکن پھر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بین الملکتی سطح پر اس بارے میں کوئی فیصلہ کیوں نہیں ہو سکا۔

ہفت روزہ لیل و نہار۔ لاہور

نیا کاپی رائٹ ایکٹ دنیا کے کسی قانون کی رو سے کسی انسان کو اپنی اولاد کے بیچنے کا حق حاصل نہیں اور ایسا کرنا جرم سمجھا جاتا ہے۔ ایک مصنف کی تصنیف کی ہوئی کتابیں بھی اس کی اولاد ہوتی ہیں، روحانی اولاد۔ لیکن بعض مجبوریوں کے تحت وہ اپنی اس اولاد کو نہایت بے دردی سے بیچتا ہے اور دنیا کا کوئی ضابطہ، کوئی دستور العمل، کوئی قانون اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔

مصنف کی یہ اولاد لاوارث بچوں کی طرح اس یتیم خانے کی نذر ہو جاتی ہے جسے عرف عام میں ناشرین کا چھاپہ خانہ کہا جاتا ہے۔ وہاں یہ بچے بے تعلق نگرانوں کی بے رخی کا شکار ہوتے ہیں اور اسی ناسازگار فضا میں رہ کر پرورش پاتے اور اکثر مریض ہو کر بے دوا بے علاج مر جاتے ہیں۔ کوئی ان کے حال زار پر دو آنسو نہیں بہاتا اور باپ بے چارہ نہایت بے بسی کے عالم میں

یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور خاموشی سے آہ بھر کر رہ جاتا ہے

کتنے مصنف اس غلام فروشی کے نذر ہوئے اور کتنے ناشرین نے ان سادہ لوحوں کا خون چوسا اور لب تک نہ ہلائے انھیں اپنے ظلم کا احساس بھی ہوتا تو کیوں؟ معصوم فروش باپ مجبور تھے اور یہ خریدار اپنی دولت و ثروت کے نشے میں سرشار۔ سلے شے کے کاپی رائٹ ایکٹ ہی کا سہارا تھا لیکن ہمارے بے نیاز فن کار اس سے بھی بے نیاز ہوتے اور اپنی معذوریوں کے ہاتھوں تنگ آکر بغیر کسی معاہدے کے اپنی کتابیں ناشرین کے حوالے کر دینے پر مجبور ہو جاتے۔ جہاں معاہدہ ہوتا وہاں اس ایکٹ کی خامیاں اس معاہدے کو بے اثر بنا دیتیں اور مصنف اور ناشر کی دیرینہ چپقلش بدستور چلی جاتی۔ چند روز پہلے ہماری حکومت نے اس ناگفتہ بہ حالت کے پیش نظر کاپی رائٹ ایکٹ میں ترمیم کر کے ملک کے ادبی اور علمی حلقوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے حکومت کا یہ اقدام ہمارے ملک کی تاریخ میں ایک عظیم الشان واقعہ ہے

ابھی اس ترمیم کی تفصیلات ہمارے سامنے نہیں آئیں لیکن اس کے مرکزی اور بنیادی اُصول سے پتا چلتا ہے کہ آئندہ کوئی مصنف اپنی رُوحانی اولاد کو بیچنے اور کوئی ناشر اسے خریدنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ یہ اصول بالکل اس قانون کا مترادف ہے جس کی رُو سے اس دنیا میں غلاموں کی خرید و فروخت کا قطعی انسداد عمل میں آیا تھا۔

ہمارے قارئین میں سے شاید بہت کم لوگوں کو اس بات کا علم ہوگا کہ حکومت کا یہ مبارک اقدام پاکستان رائٹرز گلڈ کی اَنتھک کوششوں کا نتیجہ ہے۔ کاپی رائٹ کا یہ مسئلہ اسی وقت گلڈ کی مجلس عاملہ کے زیر بحث آ گیا تھا جب ابھی گلڈ کی تشکیل ہو رہی تھی اور مصنفین کے حقوق کی نگہداشت پر غور ہو رہا تھا۔ ہمیں بے حد خوشی ہے کہ رائٹرز گلڈ کے ارکان کی لگاتار توجہ اور مسلسل تقاضوں نے حکومت کو آخر کار اس کام کی تکمیل پر آمادہ کر لیا ہے۔ اس سلسلے میں گلڈ کے جہاں سال، پختہ کار اور عالی ہمت اعزازی ایگزیکٹو سیکرٹری خاص طور پر ہمارے شکریے کے مستحق ہیں جو اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اس مہم کو کامیاب بنانے میں سرگرم عمل رہے۔ انھوں نے پچھلے سال یورپ اور امریکا کے ممالک کا سفر کیا اور وہاں کے کاپی رائٹ ایکٹ کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد اپنی ضروریات اور حالات کے مطابق مسودہ تیار کر کے حکومت کے ارباب فکر کے سامنے رکھا اور آج ان کی محنتوں کا نتیجہ ہمارے زیر نظر ہے

ہم حکومت کے ارباب بست و کشاد کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور سکریٹری کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں اس اہم فرض شناسی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

امید ہے کہ اس نئے ایکٹ کے نفاذ سے مصنف اور ناشر کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں گے اور دونوں کو اپنے اپنے حدود میں رہ کر اپنے اپنے حقوق کے تحفظ کا زیادہ صحتمند اور باوقار موقع ملے گا مصنفین کو سکون حاصل ہوگا کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں اور کوئی ناشر انھیں کسی ناجائز طریق پر غصب نہیں کر سکتا۔ علاوہ بریں ناشرین کی وہ شکایات جو انھیں فرداً فرداً بعض مصنفوں اور ادیبوں کے ذاتی رویے سے پیدا ہو جایا کرتی ہیں، دور ہو جائیں گی۔ غرض اس ایکٹ میں فریقین کا مفاد ملحوظ رکھا گیا ہے اور ہمیں پوری توقع ہے کہ اس کے نافذ ہو جانے سے ہمارے ملک کی اُدبی فضا نکھر جائے گی۔

قومی زبان کراچی

نیا کاپی رائٹ ایکٹ :- قومی زبان کراچی نے اپنی حالیہ اشاعت میں "نیا کاپی رائٹ ایکٹ" کے زیر عنوان جو نوٹ

[illegible] درج ذیل ہے ۔

[illegible] دائمی حقوق اشاعت بحق ناشر محفوظ ہیں " اس جملے سے جو ہمارے ملک میں شائع ہونے والی کتابوں کی بڑی تعداد کی "زینت" ہوتا ہے ، اُردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے بظاہر تو یہ چند الفاظ ہیں ۔ لیکن ان چند الفاظ کے پیچھے ایک طویل داستان چھپی ہوئی ہے جو المناک بھی ہے اور عبرت انگیز بھی ۔ یہ داستان جہاں ایک طرف مصنفوں اور ادیبوں کی مجبوریوں کی عکاس ہے وہاں دوسری طرف منافع خور ناشروں کی ناپاک ذہنیت کی آئینہ دار بھی ہے جو چند سکوں کے عوض مصنفین کی زندگی بھر کی محنت پر قابض ہو جاتے ہیں ۔ یہ صورت حال صحت مند ادبی ماحول کے لئے سخت مضر ہے ، ادیب کو جب یہ احساس ہو جائے ، کہ اس کی تخلیقی صلاحیتیں چند سکوں کے عوض " سوداگروں " کا مال تجارت بن جائیں گی ۔ تو اس کا قلم اپنی شکست کی آواز بن جاتا ہے ویسے بھی یہ کتنی غیر منصفانہ بات ہے کہ ادیب اپنی ذہنی کاوشوں سے حاصل ہونے والے مادی فوائد سے بالکل محروم رہے ۔ دنیا کے تمام مہذب ممالک میں ادیب اپنی تخلیقات سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ہیں ، مگر ہمارے ملک میں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے ۔ مقام مسرت ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں اور صدارتی کابینہ نے نیا کاپی رائٹ ایکٹ نافذ کر دیا ہے جس کی رُو سے مصنفین کے حقوق کا تحفظ پوری طرح ہو گیا ہے ۔ اگرچہ اب تک ہمارے ملک میں ۱۹۱۴ء کا کاپی رائٹ ایکٹ نافذ تھا ، لیکن وہ اپنی بعض خامیوں کی وجہ سے بڑی حد تک غیر موثر تھا ، مصنفین کے حقوق غصب کرنے والوں کو یہ اطمینان تھا کہ مصنفین اس قابل کہاں ہیں کہ وہ ضابطے کے مطابق دیوانی عدالتوں میں مقدمے دائر کرتے پھریں ، لیکن اب کاپی رائٹ ایکٹ کی خلاف ورزی ایسا جرم ہے جو پولیس کی دست اندازی کے قابل ہے اور ملزموں کے خلاف فوجداری عدالتوں میں مقدمے دائر کئے جا سکتے ہیں ۱۹۱۴ء کے ایکٹ کے تحت مصنف کی تخلیق کے دائمی حقوق خریدے جا سکتے تھے ، لیکن اب اس کی ممانعت کر دی گئی ہے اور کسی تخلیق کے حقوق اشاعت دس سال سے زیادہ عرصے کے لئے نہیں خریدے جا سکتے یعنی دس سال بعد مصنف دوبارہ حقوق اشاعت فروخت کر سکتا ہے ۔ نئے کاپی رائٹ ایکٹ کے نفاذ سے ادیبوں کو ان کی تخلیقات سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل ہوں گے اس لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صدارتی کابینہ نے نئے کاپی رائٹ ایکٹ کی منظوری دے کر اس امر کا ایک اور ثبوت فراہم کیا ہے کہ ہماری نئی حکومت ادیبوں اور مصنفوں کی قدر و قیمت اور اہمیت سے پوری طرح واقف ہے اور اسے یہ معلوم ہے کہ ادیب کو معاشرے میں کیا مقام ملنا چاہیئے ۔

کوہستان لاہور

مصنفین کے حقوق کا تحفظ :۔ صدر نے کاپی رائٹ ایکٹ کی منظوری دیدی ہے ۔ اس قانون کے تحت ایک کاپی رائٹ بورڈ قائم کیا جائے گا ۔ جس کے چیئرمین کا درجہ ہائی کورٹ کے جج کے برابر ہوگا ۔ کاپی رائٹ کی رجسٹریشن کے لئے اس کا ایک علیحدہ دفتر بھی قائم کیا جائے گا ۔ جو کاپی رائٹ کے قانون کی خلاف ورزی کی نگرانی کرے گا اور معاوضے کا تقرر کرے گا ۔ مجوزہ قانون کے تحت اس کی خلاف ورزی کرنے والے کو ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا ۔ اور اس کے خلاف فوجداری مقدمہ چلایا جائے گا ۔
اس قانون کے تحت مصنفین کو پہلی بار صرف دس سال کے لئے کاپی رائٹ دینے کی اجازت ہوگی ۔ اس مدت کے ختم ہونے کے بعد مصنفین کو اپنی تصنیف کے حقوق ملکیت دوبارہ حاصل ہو جائیں گے ۔
کاپی رائٹ کا جو قانون ہمارے ملک میں نافذ تھا ، وہ اتنا ناقص تھا کہ اس سے ادیبوں اور مصنفوں کے حقوق کی خاطر

خواہ حفاظت ممکن نہیں تھی۔ جس کی وجہ سے مصنفین یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ اس کی جگہ ایک نیا قانون بنایا جائے۔ چنانچہ رائٹرز گلڈ نے اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لیا، اور اس کے لئے حکومت سے سلسلہ جنبانی شروع کی، جس پر حکومت نے ایک کمیٹی مقرر کی، جس میں گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری مسٹر عالی کو بھی شامل کیا گیا۔ گلڈ کا دعوےٰ ہے کہ یہ قانون اس کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔ بہرحال یہ جس کسی کا بھی کارنامہ ہو، وہ اس کے لئے سزاوار ستائش ہے "

اس ایکٹ کی منظوری کے ساتھ اس خیال کا بھی اظہار کیا گیا ہے کہ اس کی بعض دفعات ایسی ہیں۔ جن کے مطابق پاکستان بین الاقوامی کاپی رائٹ ایکٹ کنونشن کے تحت اپنے مصنفین کے حقوق کے تحفظ کا دعوےٰ کرسکے۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر حکومت کو اس سلسلہ میں سب سے پہلے اپنے ملک کے ان مصنفین کے مقدمے کو ہاتھ میں لینا چاہیے۔ جن کے ساتھ بھارت میں دوطرفہ زیادتی ہو رہی ہے۔ ان کے ساتھ ایک زیادتی تو یہ ہو رہی ہے، کہ ان کی تصانیف ناجائز طور پر چھاپی جا رہی ہیں، اور دوسرا ظلم یہ ہے کہ ان کے نام سے ایسی کتابیں منسوب کی جا رہی ہیں، جن کے وہ مصنف نہیں۔ اس سلسلے میں ہم ایک ناول "بغاوت" کی مثال پیش کریں گے۔ جسے ایک بھارتی پبلشر نے ہمارے ملک کے ممتاز ادیب جناب نسیم حجازی صاحب کے نام سے شائع کیا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ یہ ناول ناجائز طور پر پاکستان میں بھی فروخت ہو رہا ہے۔ حالانکہ نسیم صاحب اس طرح کے کسی ناول کے مصنف نہیں، اسی طرح انھیں یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ بھارت میں ایک اور ناول "خاک خیبر" کے نام سے ان کی تصنیف ظاہر کرکے فروخت کیا جا رہا ہے۔

یہ دوطرفہ ظلم پاکستان اور بھارت کے بعض مقبول مصنفین کے ساتھ محض اس وجہ سے ہو رہا ہے کہ بھارت اور پاکستان کی حکومتوں کو صورت حال کی اتنی سنگینی کا احساس نہیں۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں، اور ہمیں توقع ہے کہ رائٹرز گلڈ بھی اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے گا کہ بھارت اور پاکستان کے چور اور بددیانت ناشرین ایک دوسرے ملکوں کے ادیبوں کے حقوق اور ان کے نام اور شہرت کے ساتھ جو بےرحمانہ کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس کے تدارک کے لئے دونوں حکومتیں کچھ خاص اقدامات کریں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن
کے
انتخابات کے نتائج

پاکستان رائٹرز گلڈ حلقہ مغربی پاکستان کا جلسہ عام ۸ر اپریل ۶۲ء کو گلڈ آفس کے باغ واقعہ منٹگری روڈ لاہور صبح ساڑھے نو بجے شروع ہوا۔ حلقہ مغربی پاکستان کے ۴۸۹ اراکین میں سے ۴۱۸ اراکین نے بذریعہ خفیہ بیلٹ پیپر انتخابات میں حصہ لیا۔

اور مندرجہ ذیل اراکین علاقائی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے۔

۱۔ جناب فارغ بخاری صاحب پشاور
۲۔ جناب محمد طفیل صاحب لاہور
۳۔ جناب قتیل شفائی صاحب لاہور
۴۔ جناب عبادت بریلوی صاحب ،،
۵۔ جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم صاحب لاہور
۶۔ جناب ریاض انور صاحب ملتان
۷۔ جناب حافظ لدھیانوی صاحب لائلپور
۸۔ جناب محمود اختر کیانی صاحب لاہور

پاکستان رائٹرز گلڈ (کراچی ریجن) کے انتخابات

برائے ۱۹۶۲ - ۶۴ء

۲۲ر اپریل ۱۹۶۲ بروز اتوار صبح دس بجے جناب جمیل الدین عالی صاحب کی زیر صدارت کراچی ریجن کا جلسہ عام ۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کے دفتر واقع ایسٹریچن روڈ ۔ منعقد ہوا ۔ جو تقریباً تین بجے تک ہوتا رہا ۔ اس جلسۂ عام میں تقریباً ایک سو سے زائد اراکین نے شرکت فرمائی ۔ اور صوبائی مجلس عاملہ (کراچی ریجن) کے لئے مندرجہ ذیل اراکین کو منتخب فرمایا ۔

۱ ۔ جناب شاہد احمد دہلوی صاحب	علاقائی سیکرٹری
۲ ۔ جناب جمیل جالبی صاحب	" خازن
۳ ۔ جناب صہبا اختر صاحب	رکن صوبائی مجلس عاملہ
۴ ۔ جناب شوکت صدیقی صاحب	"
۵ ۔ جناب مشفق خواجہ صاحب	"
۶ ۔ جناب انجم اعظمی صاحب	"
۷ ۔ جناب منہاج برنا صاحب	"
۸ ۔ جناب ضیاالحسن موسوی صاحب	"
۹ ۔ جناب افضل الرحمٰن ممتاز صاحب	"

ان کے علاوہ بنگالی گروپ میں جناب مستفیض الدین احمد صاحب ۔ اور گجراتی گروپ میں چھٹا بھاؤنگری صاحب بلا مقابلہ منتخب ہوئے ۔

خبرنامہ

حلقہ کراچی

بھارتیہ گیان پیٹھ کو قدرت اللہ شہاب کا پیغام

پاکستان رائٹرز گلڈ کے سکریٹری جنرل مسٹر قدرت اللہ شہاب نے ہندوستان کی سربرآوردہ ادبی اور ثقافتی انجمن بھارتیہ گیان پیٹھ کو ایک لاکھ روپے سالانہ کا ایک ادبی اور ثقافتی انعام قائم کرنے پر مبارکباد کا تار بھیجا ہے۔ یہ انعام مختلف ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والی بہترین کتابوں پر دیا جائے گا۔ انھوں نے گیان پیٹھ کو یاد دلایا کہ پاکستان میں پہلے سے ہر سال ایک لاکھ روپے سے زیادہ کے انعامات پریذیڈنٹ کے تمغۂ حسن خدمت کی صورت میں بہترین ادبی ثقافتی معاشرتی اور سائنسی کارناموں پر دیئے جاتے ہیں ان سرکاری انعامات کے علاوہ گلڈ کے زیر اہتمام بیس ہزار روپے سالانہ آدم جی انعامات کی صورت میں تقسیم کئے جاتے ہیں۔ گلڈ کے اپنے انعامات جو مجموعی طور پر ۱۲ ہزار روپے کی مالیت کے ہیں اور علاقائی زبانوں کی تخلیقات پر دیئے جاتے ہیں، اسی کے علاوہ ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں افسوس ہے کہ ہندوستان کے مصنفین ابھی تک ایک پلیٹ فارم پر جمع نہیں ہو سکے اور اسی قسم کا ایک ادارہ قائم کرنے میں ان کی کوششیں ناکام ہو رہی تھیں تاہم گیان پیٹھ کی طرف سے اس انعام کا اجرا ایک مستحسن قدم ہے اور ہمیں اس پر واقعی مسرت ہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن کے بخار کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شہاب نے کہا کہ آجکل تو خود ہمارے ادیبوں کا درجۂ حرارت تیز پر ہے لیکن یہ ہمارا اپنا بخار ہے کیونکہ اسی مہینے ہمارے گلڈ کے مشرقی اور مغربی پاکستان کے تینوں حلقوں کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ یہ انتخابات بجائے خود طرفہ نوعیت کے ہیں۔ ان میں بیلٹ بکس کی جگہ دماغ استعمال ہوں گے تاہم امیدوار زور و شور سے انتخابی مہمیں چلائے ہوئے ہیں اور ووٹ امیدواروں کے جذبۂ خدمت اور ادبی قابلیت کی بنا پر مانگے جا رہے ہیں گلڈ کے گزشتہ انتخابات کا ذکر کرتے ہوئے مسٹر شہاب نے کہا کہ گلڈ کے پہلے انتخابات میں جو تین سال پہلے ہوئے تھے بیشک لوگوں نے علاقہ داری میلانات کا اظہار کیا تھا۔ دوسرے انتخابات تک علاقائی عصبیت تو جاتی رہی تھی لیکن ذاتی اور لسانی تعصب کا زور باقی تھا موجودہ انتخابات میں ووٹر اگر کوئی عینک استعمال کر رہے ہیں تو وہ فقط ذاتی صوابدید کی ہے۔ انھوں نے اس ضمن میں مزید کہا کہ ساٹھ فی صد مثالیں ایسی ہیں کہ مشرقی پاکستان کے مصنفین نے مغربی پاکستان کے مصنفین اور مغربی پاکستان کے مصنفین نے مشرقی پاکستان کے مصنفین کو امیدوار نامزد کیا۔ اتحاد کی ایک نمایاں مثال ہے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ پاکستان کے فنکار، پاکستان کے معمار بن سکتے ہیں اگر ادیبوں کی برادری کے لئے جو زود حسی باہمی رشک و حسد اور تاناشاہی طبیعت کے لئے بدنام ہے۔ ملی مفاد کی خاطر یوں اتحاد و یکجہتی کا مظاہرہ کر سکتی ہے تو کوئی و

انجمن ترقی اُردو کی نئی تنظیم اُدیبوں کی طرف سے خیر مقدم

صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ماہ اپریل میں انجمن کے لئے نئے دستور کی منظوری دے دی ہے اور انجمن کے صدر اور معتمد کے عہدوں پر جناب اختر حسین صاحب اور جناب جمیل الدین عالی صاحب کا علی الترتیب تقرر کیا ہے۔

کراچی کے ممتاز ادیبوں نے اپنے ایک مشترکہ بیان میں کہا ہے کہ صدر مملکت نے انجمن ترقی اُردو کے معاملات میں دلچسپی لے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اُردو زبان و اُدب کی ترقی سے انھیں گہری دلچسپی ہے۔

ان ادیبوں نے اپنے بیان کے آخر میں اُمید ظاہر کی ہے کہ صدر مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی سرپرستی اور جناب اختر حسین صاحب کی قیادت اور جمیل الدین عالی صاحب کی نگرانی میں یہ انجمن اپنی شاندار روایات کے مطابق اُردو زبان کی خدمت کرے گی۔ جن ادیبوں نے اس بیان پر دستخط کئے ہیں ان میں سے شاہد احمد دہلوی، ڈاکٹر شوکت سبزواری ڈاکٹر سید شاہ علی، ابن انشا، طفیل احمد جمالی، ضیاءُ الحسن موسوی اور ابراہیم جلیس خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

نیشنل بک سنٹر کا افتتاح

۱۴ اپریل ۶۲ء کو کراچی میں نیشنل بک سنٹر کا افتتاحی اجلاس جناب ایس۔ ایم شریف معتمد وزارت تعلیمات حکومت پاکستان کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اجلاس میں سنٹر کے اراکین نے شرکت کی جو مختلف علمی و ادبی اداروں کے نمائندے تھے جناب ایس ایم شریف نے اپنی تقریر میں اس ادارے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی اور اس امر پر زور دیا کہ ملک میں زیادہ سے زیادہ بہتر سے بہتر اور سستی سے سستی کتابیں شائع کی جائیں۔ جناب شریف نے یہ بھی بتایا کہ بہت جلد اس ادارے کی ایک شاخ ڈھاکے میں قائم کی جائے گی۔

حکومت پاکستان نے سنہ ۱۹۶۰ء میں ایک ریزولیوشن کے ذریعے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ ایس۔ ایم شریف صاحب اس کے صدر ہیں اور مشہور شاعر ابن انشا اس کے سکرٹری ہیں۔ اس ادارے کی مجلس نظما ۲۰ اراکین پر مشتمل ہے یہ اراکین ادیبوں، کتب فروشوں، اور مختلف تعلیمی و علمی اداروں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ نیشنل بک سنٹر کے فرائض مختصراً یہ ہیں۔ کتابیات اور دیگر کتب حوالہ شائع کرنا قارئین کے مذاق اور ضروریات کا جائزہ لینا۔ کتابوں کی طباعت کی طباعت اور تقسیم کے بارے میں ناشروں کو مشورے دینا۔ قارئین کے شوق کتب بینی کو وسیع کرنا نئی اور نادر کتابوں کی نمائش کرنا۔ ملک کے تمام علمی و تعلیمی اداروں کو ان کے کاموں میں مدد دینا۔ لائبریریوں کو بہتر بنانے کی تدابیر کو عملی جامہ پہنانا وغیرہ وغیرہ۔

"تاریخ اُدب اُردو" - انعامی مقابلہ

اطالوی ثقافتی مرکز برائے پاکستان نے تمام پاکستانی عالموں کے لئے ایک انعامی مضمون "بعنوان "تاریخ ادب اُردو" کا اعلان کیا ہے اس انعامی مقابلے کا مقصد پاکستانی اور اطالوی عالموں کے درمیان باہمی تعاون اور تمدنی رشتوں کو ترقی دے کر پاکستانی ثقافت کو اٹلی میں رُوشناس کرانا ہے۔ مقابلہ کے اس مضمون کو جسے انگریزی یا اُردو میں لکھا جا سکتا ہے تین ٹائپ شدہ نقلوں میں داخل کیا جانا چاہیئے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون بھرپور سائنسی نوعیت کا اور اپنے میدان میں بالکل نیا اضافہ ہو، نیز اس مضمون کا غیر مطبوعہ ہونا بھی ضروری ہے۔

انعامی مقابلہ جیتنے والے مضمون کو مبلغ پانچ ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا۔ جس کا فیصلہ تین آدمیوں کی ایک ماہرین کمیٹی کرے گی۔ جو زیر صدارت پروفیسر جی زیدی ٹوچی [illegible]

[illegible] ادارہ برائے ثقافتی تعلقات مابین ایشیا و اٹلی
[illegible] اور ایک پاکستانی عالم پر مشتمل ہوگی۔ نیز اطالوی
ادارہ برائے ثقافتی تعلقات مابین ایشیا و اٹلی کو بعد ازاں
اس مضمون کو چھاپنے کا بھی حق حاصل ہوگا۔
انعامی مقابلے کے مضامین ۳۱ مارچ ۱۹۶۲ تک

اطالوی ثقافتی مرکز برائے کراچی۔ ۲۲۲ ایلیٹ [illegible] نمبر ۲
بی۔ای۔سی۔ایچ کراچی کو بھیج دیئے جائیں۔
اس سلسلے میں مزید معلومات اطالوی ثقافتی مرکز
برائے کراچی سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

حلقہ مغربی پاکستان

پاکستان رائٹرز سب ریجن ملتان کی تشکیل

پاکستان رائٹرز گلڈ کے ایگزیکٹو سکریٹری سے سکریٹری جنرل کے حکم کے مطابق ملتان سب ریجن بشمول ڈیرہ غازی خاں کے لئے حسب ذیل افراد کو مندرجہ ذیل ذمہ داریاں سونپی ہیں

مسٹر رفیق خاور جسکانی آنریری سب ریجنل سکریٹری
" محمد علی بخاری " " خزانچی
پروفیسر عاصی آنالی رکن مجلس عاملہ
" جابر علی جابر "
" مسعود اشعر "
" حفیظ احسن "

مسٹر ریاض انور جو حال ہی میں مغربی پاکستان کی علاقائی مجلس عاملہ کے رکن منتخب ہوئے ہیں، علاقائی مجلس عاملہ کی رکنیت کی بنا پر اضافی رکن ہوں گے۔ یہ انتظام اس وقت تک برقرار رہے گا۔ جب تک سب ریجن کے انتخابات نہیں ہوتے۔

معلوم ہوا ہے کہ اس نئی تشکیل کے فیصلے کو ملتان کے ادبی حلقوں میں بڑی مسرت سے سنا گیا ہے اور ملتان کی ادبی مجالس اور دیگر علمی حلقوں نے اس تشکیل پر اظہار مسرت کیا ہے۔

مقامی رائٹرز گلڈ کی نئی تشکیل کے بعد گلڈ ہاؤس میں [illegible] ادیبوں اور شاعروں کا ایک شاندار اجتماع ہوا جس کی صدارت جناب اختر انصاری اکبرآبادی نے کی۔

مقامی شاخ کے نئے سکریٹری رفیق خاور جسکانی نے گلڈ کے مستقبل کے سلسلے میں اپنے مقاصد کی وضاحت کی سکریٹری نے اعلان کیا کہ ایک صاحب ذوق نے رائٹرز گلڈ کو ایک خطیر رقم کی پیشکش اس مقصد کے لئے کی کہ ہونہار طالب علموں کو تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے مشورے سے تعلیمی وظائف دیئے جائیں اور ان وظائف کو اقبال اسکالرشپ، غالب اسکالرشپ اور سرسید اسکالرشپ سے موسوم کیا جائے۔

سیالکوٹ کی ادبی سرگرمیاں ۔ "یوم اقبال"

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کی طرف ۲۱۔ اپریل کو شہر اقبال میں یوم اقبال منایا گیا۔ شہر کی دیگر ادبی مجالس نے مکمل طور پر تعاون کرتے ہوئے مشترکہ طور پر یہ تقریب منائی۔

یوم اقبال کی تقریبات کا آغاز ۲۱۔ اپریل کی صبح اسلامیہ ہائی اسکول میں فاتحہ خوانی سے ہوا۔

شام کو ۵ بجے کی نشست میں اقبال پر مقالات پڑھے گئے۔ نشست مقالات کی صدارت جناب ڈاکٹر سید محمد عبداللہ صاحب نے فرمائی [illegible] شباب لامپوری، اور چوہدری [illegible] مقالات

پیش کئے۔ حلقہ مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کے معتمد اقبالیات پروفیسر وقار عظیم نے علامہ اقبال کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے جس سے حاضرین بہت محظوظ ہوئے۔ ان کے علاوہ میرزا ادیب صاحب اور ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار صاحب نے مقالات پڑھے۔

نشست مشاعرہ کا آغاز ۹ بجے رات کو ہوا۔ مشاعرے کی صدارت کیپٹن ایم اے مجید صاحب نے کی۔ مقامی شعراء کے علاوہ بیرونجات کے شعراء کرام بھی شریک ہوئے جن میں جناب احمد ندیم قاسمی، شورش کاشمیری، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی اور بھارتی شاعر جناب انور صابری صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جناب احمد ندیم قاسمی صاحب کا یہ شعر یاد رہ گیا جو درج ذیل ہے۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کیساتھ

یوم پاکستان

اس سے پہلے پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ سیالکوٹ کے زیر اہتمام ۲۳۔ مارچ کو یوم پاکستان کے موقع پر ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوئی تھی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ سیالکوٹ کے زیر اہتمام یوم پاکستان کے موقع پر ایک محفل مشاعرہ منعقد کی گئی۔ رات کے ۸ بجے مشاعرہ کا آغاز ہوا اور ۱۱ بجے تک مقامی شعراء حاضرین سے داد وصول کرتے رہے۔ مشاعرہ کی صدارت کے فرائض جناب میرزا ادیب مدیر ماہنامہ ادب لطیف لاہور اور اسٹیج سکریٹری کے فرائض آثم میرزا کنوینر گلڈ شاخ سیالکوٹ نے سرانجام دئے پسند کئے جانے والے چند اشعار سے آپ بھی محظوظ ہوجیئے۔

عاقل ہوشیارپوری

دیدہ موسم گل تیغ ہے ہم سفیر مگر
[illegible]

سردار شاہجہاں پوری

دیوانوں کی قسمت میں ہمیشہ یہی دیکھا
آتے ہی بہاروں کے پیغام رسن آیا

شاہد مرادآبادی

اُف یہ کتنی نزاکت ہے احساس کی
دست گلچیں بڑھا پھول کمھلا گیا

میر عزیز

طوفان بلا تو لائے تھے خود ساختہ کشتی بان مگر
صد مرحبا اہل ایماں ہر یورش طوفاں ہلکی ہے

رائٹرز گلڈ سب ریجن لائلپور کے اجلاس کی کارروائی

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن لائلپور کا ایک عام اجلاس ۱۳ر اپریل ۶۲ء کو گلڈ ہاؤس واقع میونسپل لائبریری لائلپور میں بوقت ۵ بجے شام منعقد ہوا۔

اجلاس میں چار قرار دادیں اتفاق آرا سے منظور ہوئیں۔

ایک قرار داد کے ذریعہ مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کی مجلس عاملہ کے حالیہ انتخابات پر دلی اطمینان کا اظہار کیا گیا۔

دوسری قرار داد میں جناب حافظ لدھیانوی کو ان کی انتخابات کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد دی گئی۔ اور تمام منتخب ممبران سے امید ظاہر کی گئی کہ وہ رائٹرز گلڈ کے وقار کو بلند کرنے اور ادیبوں کی بہتری کے لئے کام کریں گے۔

ایک اور قرار داد میں پاکستان رائٹرز گلڈ، گلڈ کے سکریٹری جنرل جناب قدرت اللہ شہاب کی خدمات کا اعتراف کیا گیا اور ان سے درخواست کی گئی کہ چونکہ ابھی گلڈ کو ان کی رہنمائی اور خلوص کی شدید ضرورت ہے اس لئے وہ مزید طویل عرصے کے لئے گلڈ کی ذمہ داریاں سنبھالیں۔ اس مقصد کے لئے مرکزی گلڈ آئینی اور ضابطے کی ضروری کارروائی

کرسے۔

ایک قرارداد کے ذریعے مرکزی گلڈ کا شکریہ ادا کیا گیا کہ اس نے حیدر شکیب کے لئے جو تپ دق میں مبتلا ہیں، ڈیڑھ سو روپے ماہوار کا وظیفہ منظور کیا۔ قرارداد میں مرکزی گلڈ سے امید ظاہر کی گئی ہے کہ وہ حیدر شکیب صاحب کے لئے سینی ٹوریم میں علاج کرانے کے لئے تمام ضروری سہولتیں فراہم کرنے کا جلد از جلد انتظام کرے گی۔

مرکزی گلڈ سے درخواست کی گئی کہ وہ لائبریری سب کمیٹی کو گرانبار اخراجات کے لئے مالی امداد دے تاکہ لائبریری سب کمیٹی گلڈ ہاؤس لائبریری اور دوسری ضروریات کی تکمیل کی جا سکے۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کی اردو شاخ پشاور کا افتتاحی اجلاس

مغربی پاکستان رائٹرز گلڈ کے علاقائی سکریٹری سید وقار عظیم صاحب نے ۲۴ مارچ کو پاکستان رائٹرز کی اردو شاخ پشاور کے عارضی دفتر کا افتتاح کیا۔ افتتاح کے موقع پر فارغ بخاری، احمد فراز، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی، مرزا محمود سرحدی، جوہر میر، اشرف درانی، خلیل رامپوری، محسن احسان وغیرہ کے علاوہ دیگر عہدیدار اور معزز مہمان موجود تھے۔ اسی روز ۴ بجے شام گلڈ کا افتتاحی اجلاس سید وقار عظیم کی زیر صدارت ٹاؤن ہال پشاور میں منعقد ہوا۔ سکریٹری نے اپنی رپورٹ پیش کی جس کا خلاصہ درج ذیل ہے

<u>رپورٹ کا خلاصہ</u> :- پاکستان رائٹرز گلڈ کی اردو شاخ کی تاسیس کے لئے ۱۲۔ دسمبر ۱۹۶۱ء کو انشاء ہوٹل میں اردو مصنفین کا ایک عام اجلاس طلب کیا گیا جس میں ۳۴ اراکین نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ چند پشتو ادیب بھی اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ مذکورہ بالا اجلاس میں شریک ہوئے۔ مذکورہ بالا اجلاس میں متفقہ طور پر حسب ذیل حضرات عہدار

منتخب ہوئے۔

سکریٹری : مسعود انور شفقی

خازن : محسن احسان

<u>اراکین مجلس عاملہ</u> :-

رضا ہمدانی

شفیع صابر

سید مظہر گیلانی

عہدیداروں کے انتخابات کے بعد مولانا عبدالقادر، پروفیسر طاہر فاروقی، فارغ بخاری اور احمد فراز صاحبان نے حاضرین کو خطاب کیا

۲۴۔ جنوری ۶۲ء کو گلڈ کی مجلس عاملہ کا ایک ہنگامی اجلاس بلایا گیا جس میں چند قراردادیں منظور کی گئیں۔

ایک قرارداد میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی ادب پروری کو سراہا گیا کہ انھوں نے گلڈ کی سفارش پر مرزا محمود سرحدی اور سید جگر کاظمی صاحبان کے وظائف مقرر کئے۔

دوسری قرارداد میں پشاور کے ڈویژنل کمشنر صاحب سے درخواست کی گئی کہ وہ پاکستان کے دوسرے شہروں کی طرح پشاور رائٹرز گلڈ کو بھی ادبی محافل کے انعقاد کے لئے میونسپل کمیٹی پشاور کی وساطت سے دفتر قائم کرنے کی مراعات دلوائیں۔ ایک اور قرارداد کے ذریعہ حکومت پاکستان سے اپیل کی گئی کہ اسپتالوں میں ادبا، شعراء کے علاج معالجے کے لئے مفت طبی سہولتیں بہم پہنچانے کا انتظام کیا جائے نیز سفری مراعات بھی دی جائیں۔

۳۱ رجنوری ۶۲ء کو گلڈ کا ایک وفد کمشنر پشاور ڈویژن سے ملا۔ اس ملاقات میں کمشنر صاحب سے دفتر کی فراہمی کے لئے درخواست کی گئی۔ کمشنر صاحب نے پورے تعاون کا یقین دلایا۔

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ کی ادبی سرگرمیاں

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ کے زیر اہتمام یوم پاکستان کی تقریب پر جناح لائبریری کوہاٹ میں ۲۳ مارچ کو بوقت ۸½ بجے شب ایک علمی و ادبی اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کی صدارت پروفیسر سید اشرف بخاری نے فرمائی۔ صدر صاحب نے اپنے خطبہ میں پاکستان کے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد جناب میاں غلام حیدر خان اختر جمیل نے ان اسباب و علل کا تذکرہ کرتے ہوئے جن کی وجہ سے تحریک پاکستان نے جنم لیا، کہا کہ اس کا تصور ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال نے الہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ میں پیش کیا تھا۔ سنہ۴۰ء میں اس تحریک نے قرارداد پاکستان کی صورت میں قطعی مطالبے کی حیثیت اختیار کرلی۔ مسلمانوں کے اس مطالبے کو قائداعظم نے برطانوی اور ہندو سامراج سے بالآخر منوالیا۔ آج کا دن اسی تاریخی یادگار کے طور پر منایا جارہا ہے

ان کے بعد صاحب صدر سید اشرف بخاری صاحب نے ایک طویل تقریر کے دوران ہندوستان کی گزشتہ چند سو سال کی پرانی تاریخ اجمالی طور پر بیان کی۔ انھوں نے اس برصغیر میں مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان اور ان کے محرکات و عوامل سے بحث کی اور یہ بتایا کہ اگر پاکستان قائم نہ ہوتا تو برصغیر سے اسلامی تہذیب و ثقافت کا نام نیست و نابود ہو جاتا۔ صدر صاحب کے بعد وزیر زادہ عبدالقیوم خاں اسسٹنٹ کمشنر کوہاٹ نے اپنی تقریر کے دوران اس دن کی اہمیت پر روشنی ڈالی، عبدالقیوم خاں صاحب کی تقریر کے بعد صاحب صدر نے موضوعی مشاعرہ کا اعلان کیا۔ اس مشاعرے میں جناب غلام حیدر اختر، صوفی فضل علی فضل، عزیز اختر وارثی، شفیع اور مولانا ازہر القادری اور صاحب صدر نے نظمیں پیش کیں، بعدہ ایک غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں کوہاٹ کی تمام علمی و ادبی انجمنوں نے حصہ لیا۔

کوہاٹ میں یوم اقبال

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ نے ۲۱۔اپریل کو یوم اقبال منایا۔ اس ضمن میں ۸½ بجے شب جناح لائبریری کوہاٹ میں ایک علمی و ادبی اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت وزیر زادہ عبدالقیوم خاں نے کی۔ وزیر زادہ صاحب نے اپنے خطبہ صدارت میں تعلیمات اقبال کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ان کے بعد الحاج محمد شاہ حیران نے ایک مقالہ پڑھا۔ جس کا عنوان تھا "ہمارا قومی شاعر"۔ مقالے کے بعد پروفیسر سید وصی رضا صاحب نے تقریر کی جس میں انھوں نے اصطلاحات اقبال پر روشنی ڈالی۔

مقالات اور تقاریر کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ایک اردو پشتو مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مقامی شعراء کے علاوہ پشتو کے مشہور شاعر اعظم خاں اعظم نے بھی حصہ لیا۔

سندھی ادبی بورڈ کا نیا دفتر

سندھی ادبی بورڈ کے سیکرٹری نے اطلاع دی ہے کہ یکم مئی ۶۲ء سے سندھی ادبی بورڈ کا صدر دفتر حیدرآباد منتقل ہو جائے گا۔ لہٰذا مرکزی دفتر سے ساری مراسلت درج ذیل پتے پر کی جائے۔

سیکرٹری : دی سندھی ادبی بورڈ
۳۔ سول لائنز، گیدو روڈ
حیدرآباد (مغربی پاکستان)
فون نمبر ۲۷۶۴

بورڈ کا برانچ آفس اور بک اسٹال، سندھ اسمبلی بلڈنگ بندر روڈ کراچی میں برقرار رہے گا۔



جی یہ خوبصورت محترمہ
فلم اسٹار نہیں ہیں . . .
لیکن خوبصورتی میں
اپنا جواب آپ ہیں ۔
آپ بھی ان کی طرح ذوالفقار
ٹوائیلٹ سوپ سے جو تین خوشنما
رنگوں میں دستیاب ہے ، اپنے
حسن کی حفاظت کرسکتی ہیں
Beauty
تیار کنندہ
ذوالفقار انڈسٹریز لمیٹڈ کراچی

علم بڑی دولت ہے

پاکستان میں صنعتی نظام کے انقلاب نے علم کی دولت کو غریب و امیر
دونوں کے لئے عام کر دیا ہے۔
کھلنا نیوز پرنٹ کے تیار کردہ میکینیکل پرنٹنگ اور کریم لیڈ
— کاغذ سازی کی صنعت میں انقلاب کا نتیجہ ہیں۔
یہ کاغذ سستے ہونے کے علاوہ کثرت سے دستیاب ہیں
چاہے وہ اسکول یا یونیورسٹی کی کتابیں ہوں یا
تفریحی رسائل۔ یہ ہر ضرورت کے لئے بہترین ہیں
کھلنا میکینیکل اور کریم لیڈ ہر قسم کی سستی مطبوعات سپاروں
کتابوں اور کاپیوں کے لئے نہایت موزوں ہیں
کھلنا نیوز پرنٹ اخباروں اور رسالوں وغیرہ کے لئے پاکستان بھر میں
کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔



کھلنا نیوز پرنٹ مل۔ کھلنا
(مشرقی پاکستان)
زیر انتظام:-
پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

آدمجی

پارچہ جات

آخری انتخاب



چند لکھنے والے

حجاب امتیاز علی، احمد فراز
شاد عارفی، بہزاد لکھنوی
ظہور نظر، وفا راشدی
ڈاکٹر محمد ظفر خان، شمیم نسرین
سید احمد رفعت وغیرہ

ستان رائٹرز گلڈ

جون سنہ ۶۲ء


PIA
باکمال
لوگ
لاجواب
پرواز
نیویارک
لندن
فرینکفرٹ
روم
جنیوا
بیروت
تہران
کراچی
پشاور
راولپنڈی
لاہور
دہلی
بمبئی
ڈھاکہ
کلکتہ
رنگون

ماہنامہ

ہم قلم

جلد ۳ نمبر ۱۰

جون سنہ ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین اِدارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

فون نمبر ۳۵-۵۵۵۵

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادر وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بروز ۲۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

صفحہ

افسانہ اور ڈرامہ :-

پرنٹر، پبلشر اور ایڈیٹر جمیل الدین عالی (سنٹرل سیکریٹری) مطبع انجمن پریس۔ کراچی

۵

(مرکز)

گلڈ کا تیسرا دور

اس مرتبہ گلڈ کے علاقائی اور مرکزی انتخابات میں مختلف قسم کی دلچسپیوں اور سرگرمیوں کا مظاہرہ کیا گیا، اس سے جہاں چند پریشان
کن امکانات سامنے آئے ہیں وہیں یہ بات بھی ثابت ہے کہ ہمارے اراکین میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کا جذبہ پوری طرح بیدار ہو گیا ہے۔ اور
بڑی نئی منتظمہ کمیٹیاں کام کرنے کی لگن لے کر سامنے آئی ہیں، یہ کمیٹیاں زیادہ تر تازہ خون پر مشتمل ہیں، مگر ان میں بزرگوں اور اکابر کے نام
بھی نظر آتے ہیں، یہ سب کچھ گلڈ کے لئے ایک فال نیک ہے، کام کرنے والوں میں جوانی کے خروش، وہاں کی رہنمائی کے لئے جہاندیدہ مشاہیر
کی موجودگی سے ہمیں بہت سی توقعات ہیں اور یہ توقع بھی کہ ہماری توقعات انشاء اللہ ضرور پوری ہوں گی۔

ہمارے معاشرے میں شہریوں کو بنیادی سماجی تحفظات حاصل نہیں ہیں، اور کھل کر سوچئے تو تین چوتھائی سے زیادہ دنیا کا یہی حال ہے
بچے، زچائیں، بیمار، ضعیف، بے روزگار نوجوان سب بغیر کسی آسرے کے گھومتے ہیں اور مختلف اذیتوں جرائم اور پریشانیوں میں مبتلا ہو کر معاشرے
کو مزید تباہ کرتے ہوئے ختم ہو جاتے ہیں، یہ ایک بہت بڑا سانحہ ہے اور اس کے بہت سے حل مختلف ممالک مختلف اوقات میں تلاش کرتے رہتے
ہیں، جن ممالک نے بنیادی سماجی تحفظات کا معتدبہ انتظام کر لیا ہے ان میں امریکہ، انگلستان، ممالک سکینڈے نیویا اور شوہرانیہ روس نمایاں
ہیں، ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ اقتصادی اور سیاسی ہے اور ہم قلم کے چند صفحات اس کا کوئی حتمی حل پیش نہیں کر سکتے، مگر اس کا انسانی جو براہ راست
ہم سے متعلق ہے ہم اسے بھی نظر انداز نہیں کر سکتے آئیے اپنے چھوٹے سے کنویں میں واپس آ کر اپنی شدید محدودات کے پابند رہتے ہوئے اپنے
حالات کا جائزہ لیں۔

ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ادیبوں کی ایک برادری ہیں اور ہماری برادری کے زیادہ تر اراکین بدحال ہیں، ہم اپنی افادیت کے لحاظ
سے ملک کی ایک اعلیٰ و ارفع جماعت ہیں، ہماری حیثیت کا مقابلہ زیادہ سے زیادہ سائنسدان کر سکتے ہیں ہمارے سامنے ہمیشہ یہ سوال رہا ہے
کہ اس ملک کے مفکرین اور دانشوروں کی خوش حالی کے لئے ہم کیا کیا کر سکتے ہیں، اس کے لئے سب سے پہلے تو حکومت ہمارے محاصل کی امین
کی حیثیت سے ذمہ دار ہے، دوسرے خود ہماری ذمہ داریاں بھی بہت کچھ ہیں۔

حکومت کا تصور یہ ہے کہ ہم سے تمام تر ہمدردیاں رکھنے کے باوجود وہ اپنی ذمہ داریوں کی درجہ بندی میں ہمیں بہت نیچے رکھتی ہے مثلاً اس
کا تصور یہ ہے کہ عمال حکومت کے اعلیٰ طبقے کو اچھی تنخواہیں دی جائیں حالانکہ بہت سے سوچنے والوں کی نظر میں ایک فلاحی ریاست کے
سرکاری عمال اور عام شہریوں میں ذمہ داریوں کی مخصوص تقسیم کے علاوہ کوئی اور فرق نہیں ہونا چاہئے اور ان کو ان کی ضرورت کے مطابق مشاہرے
ملنے چاہئیں، اسی طرح سرکاری آمدنی اور اخراجات کی دوسری مدات قابل گفتگو ہیں مگر بہرحال حکومت کے طریق کار پر گفتگو سے کام نہیں چلے گا
اور جیسا کہ ہم نے عرض کیا ہمیں اپنی محدودات میں رہ کر بہترین نتائج حاصل کرنا ہی ہماری پالیسی ہونی چاہئے، اس سلسلے میں ہم نے چند کمیٹیوں

میں قدم اٹھاتے ہیں اور کہیں کہیں کامیاب بھی ہوتے ہیں، لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے بھی عرض کیا ہے ہمارا سب سے بڑا مسئلہ آمدنی کا ہے، جس کا تعلیم ہم اپنے مجلہ چھاپنے والوں کو سمجھتے ہیں، ایک بار ہم خود کفیل ہو گئے تو انشاء اللہ ہمارے منصوبے جلد از جلد قابل عمل ہو جائیں گے اور بطور خاص ہماری فلاحی کارروائیاں بڑے پیمانے پر کامیابی سے شروع ہو جائیں گی۔

مشکل یہ ہے کہ ابھی تک ہم بادیانی کردار کے تمام داغ ہمارے دامن سے نہیں دھلے، ان داغوں میں اختلاف رائے کی بنا پر بلکہ اس کے بعد بھی دوسرے کی تنقیص، ٹوپی اچھالنا، استہزاء، بدگوئی بہت نمایاں ہیں، اجتماعی مفادات کی قیمت پر ذاتی اقتدار پسندی بھی ہمارے معاشرے کا جزو ہے، نتیجتاً ملک کو چند کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا اور اب بھی گزر رہا ہے اور ایک مختصر سے پیمانے پر بھی ان تمام واقعات و تجربات کی روشنی میں تب بھی اگر ہمارے لئے یہ صورت حال قابل اطمینان ہے کہ انجمن نے چند ایسی روایات ضرور قائم کر دی ہیں جو ہماری ثقافتی زندگی میں دور تک کام آئیں گی مثلاً اس ملک میں جہاں قومی سطح پر پندرہ برس میں صرف ایک انتخاب ہوا ہے، گلڈ نے تین عام انتخابات منعقد کئے جن میں ملک کے ہر گوشے کے ادیبوں نے حصہ لیا اور اس طرح ہم نے ملکی ثقافت کے ایک گوشے کی بنیاد مستحکم کر دی۔

ہم نے احتساب کے خلاف بھی اجتماعی کارروائی کا انتظام کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ گلڈ کے قیام سے ادب پر احتساب کی جرأت کرنے والوں کی ہمتیں ٹوٹ گئی ہیں۔ مقام شکر ہے کہ حکومت کے اعلیٰ طبقوں نے ادھر ادھر کے چھوٹے بڑے محتسبین کو ابھرنے نہیں دیا۔ اس معاملہ میں جس عنصر نے ادیب کی سب سے زیادہ مدد کی وہ خود صدر مملکت کی ذات گرامی ہے۔ جن کی یقین دہانی جو ہم قلم کے صفحات پر اس لئے شائع ہوتی رہتی ہے کہ ایک طرف تو مصنفین دلجمعی سے اپنا کام کریں اور دوسری طرف محتسبین کسی اقدام سے پیشتر بار بار اپنے اقدامات کے نتائج پر غور کرتے رہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے ادبی سطح پر لسانی اور صوبائی تعصبات ختم کر دینے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی ہے گو اس سلسلے میں ابھی کئی اور مراحل طے ہونے ہیں۔ گلڈ کا تیسرا انتخاب بھی نئی منزلوں کی نشاندہی کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد ظفر خان

صادق ہدایت کے افسانے

صادق ہدایت ایران کے ان افسانہ نگاروں اور فن کاروں میں بلند مقام رکھتے ہیں جنہیں نہ صرف اپنی دری زبان پر عبور ہے بلکہ جنہوں نے مغربی زبان و ادبیات کا مطالعہ بھی بنظر غائر کیا ہے۔ یہ محب وطن افسانہ نگار حساس دل رکھتا تھا، انسان تو انسان حیوان بلکہ معمولی پرندے کے دکھ درد اور تکلیف پر اس کا دل کڑھتا، دنیا کی سرد مہری اور گردش دوراں کی کج روی اس کی آنکھوں کے سامنے مجسم ہو کر اُس کے دل پہ چرکے لگاتی زندگی کے معمولی معمولی واقعات جب اس کے قلب حزیں کو متاثر کرتے تو اس تاثر کو افسانوں کے قالب میں ڈھال کر دوسروں کے سامنے پیش کرتے ہوئے تسکین محسوس کرتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ عام واقعات جسے ایک انسان نظر انداز کر دیتا ہے اس کی نگاہوں سے چھپ نہیں سکے، اس نے معمولی سے معمولی بات بھی اپنے افسانوں کے کرداروں سے کہلوا دی ہے اور ہمیں سوچنے اور غور و فکر کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

صادق اپنے افسانوں کا تانا بانا اپنے گرد و پیش کے واقعات سے بنتا ہے، اس کے افسانوں کے کردار اسی دنیا کے جیتے جاگتے انسان ہیں جو آپس میں محبت بھی کرتے ہیں اور نفرت بھی، جن میں ہر طرح کی خواہشات جنم لیتی ہیں اور ان کی تکمیل کے لئے وہ تمام ہتھکنڈے بھی استعمال کرتے ہیں، ان میں بہت سے خوش عقیدہ لوگ بھی ہیں جو گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہیں اور پھر انھیں بخشوانے کے لئے دور دراز کے حوصلہ فرسا سفر بھی اختیار کرتے ہیں، کچھ ایسے شریف النفس بھی ہیں جو نفس امارہ کے مقابلہ کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لیتے ہیں اور کچھ ایسے زاہدانِ سالوس بھی ہیں جو جنسی بھوک کا شکار ہیں۔ ان میں ایسے بچے بھی ہیں جو اپنا پیٹ پالنے کے لئے محنت مزدوری کرتے ہیں اور کچھ ایسے نوجوان بھی ہیں جو توہمات کی دنیا سے نکل کر ملک و ملت کی سربلندی کے آرزومند ہیں۔ صادق ہدایت نے نچلے اور درمیانے طبقے کی عکاسی خوب کی ہے وہ مافوق الفطرت چیزوں کا قائل نہیں یہاں تک کہ وہ دوسری دنیا، آخرت، تقدیر، جن، بھوت پریت کسی چیز پر اعتقاد نہیں رکھتا وہ انھیں توہمات سمجھتا ہے، اس کا خیال ہے کہ انھیں اوہام نے قوم کو پستی کے عمیق گڑھوں میں دھکیل دیا ہے۔ یہاں پر ہم صرف ان چند افسانوں کا ذکر کریں گے جنہیں استاد سعید نفیسی نے شاہکارہائے نثر فارسی کے نام سے شائع کیا ہے اور شاید یہی اس کے بہترین افسانے ہیں۔

صادق کے افسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا

ہے ایک تو وہ افسانے ہیں جن میں زندگی کے خدوخال ایک دلچسپ انداز میں نظر آتے ہیں یعنی افسانہ نگار زندگی کے مختلف پہلوؤں کی نشان دہی کرتا ہے، اس ضمن میں گرداب، شہنائی ورایئن، سگ و نگرد، اور رواش آکل کے نام لئے جاسکتے ہیں۔ دوسرے وہ افسانے ہیں جو ایک خاص مقصد کو اپنے دامن میں چھپائے ہوئے ہیں، ان افسانوں میں بھی اگرچہ افسانہ نگار نے زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کو اجاگر کرکے ہمیں زندگی کو پہچاننے میں مدد دی ہے اور ہمارے اندازِ فکر کو بدلنے کی سعی کی ہے کیونکہ انداز کا تغیر ہی ہمیں عروس کامیابی و کامرانی سے ہمکنار کرسکتا ہے تاہم وہ ہم پر یہ منکشف کرنا چاہتا ہے کہ عوام الناس زندگی کو اس کے صحیح مفہوم کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ لالہ زار نشاط و انبساط کی آرزو تو کرتے ہیں لیکن اس کے حصول کے لئے جو ذرائع اختیار کرتے ہیں وہ ان کے نخلِ حیات کو شگفتگی و تازگی عطا کرنے سے قاصر رہتے ہیں، البتہ غم والم کے آنسوؤں کی شبنم اس پھول کی پتیوں پر ضرور پھیل جاتی ہے۔ صادق ہدایت کے افسانوں کو جن دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ان میں سے سب سے پہلے گرداب کو لیجئے۔

گرداب ایک ایسے گھرانے کی کہانی ہے جسے شک و شبہ کی بادِ تند و تیز نے برباد کردیا، یہ مختصر گھرانہ ہمایوں اس کی بیوی، اور بچی، ہما پر مشتمل تھا جن کی زندگی شگفتگی و تازگی، اور مسرت و شادمانی کے گہوارہ میں جھول رہی تھی لیکن دوست بلکہ ہمدم ملیہ کی خودکشی نے اوّلاً تو ان کے دل پر چرکہ لگایا لیکن بعد میں شک و شبہ کے خارزار میں پھینک دیا، ہمایوں کے دل میں اپنی بیوی کی عصمت و وفا کے بارے میں شکوک و شبہات نے جنم لیا تو چمن محبت و الفت ویران ہوگیا، ہمایوں کا شک اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ اپنی بچی کو اپنے دوست کے اپنی بیوی سے مجرمانہ اختلا

کا نتیجہ سمجھنے لگا، بیوی ناراض ہوکر اپنی بچی کو ساتھ لئے میکے چلی گئی ہمایوں اور اس کی بیوی کے درمیان نفرت کی ایک خلیج حائل ہوگئی، جس کا پاٹنا مشکل تھا، ہما کی محبت نے اس خزاں دیدہ چمن کو روشناس بہار کرنا چاہا یعنی باپ اپنی بچی کی الفت میں سرشار ہوکر اس کے ننھیال پہنچا لیکن اسے دروازے پر ہی معلوم ہوگیا کہ وہ موت کی آغوش میں جاچکی ہے، وہ بھی باپ سے ملنے کی آرزومند تھی لیکن آج سے چند روز قبل اسے بھی وہاں دفنایا جاچکا ہے جہاں اس کے خودکشی کرنے والے دوست کو دفن کیا گیا تھا، جذبہ نفرت کی شدت سے وہ وہیں سے ایک دور دراز شہر میں جہاں اس نے اپنا تبادلہ کرالیا تھا چلا گیا۔

اس افسانہ میں جذبہ دوستی کی قوت بھی واضح ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسی قوت ہے جس سے زندگی کے بنیادیں اور انسانی تعلقات کے رشتے مضبوط ہوتے ہیں۔ لیکن اس دوستی کے روپ میں مکروفریب اور بداندیشی کا اظہار کیا جائے تو یہ اظہار زندگی کے ستونوں کو متزلزل کردیتا ہے اور دوستی کی رفیع الشان عمارت میں نفرت و حقارت کی دراڑیں آجاتی ہیں جو کبھی بند نہیں ہوسکتیں، مختصر طور پر یوں کہا جاسکتا ہے کہ محبت کی تقدیس اس دریا کے مشابہ ہے جس کی سطح پر کشتی حیات رواں ہے، لیکن جونہی خارجی اثرات سے جذبات متاثر ہوکر اس دریا میں نفرت و حقارت کی لہروں کو ابھارتے ہیں تو زندگی کا سفینہ ساحل آشنا ہونے کی بجائے گرداب میں ڈوب جاتا ہے۔

"سگ ولگرد" میں اگرچہ ایک کتے کا خاکہ کھینچا گیا ہے مگر یہ ایک انسان پر بھی پوری طرح منطبق ہوتا ہے، انسان جب تقدس و پاکیزگی کی بلندیوں سے گرجات دنیا کی پستیوں میں گرتا ہے تو پھر گرتا ہی چلا جاتا ہے، ابتدا میں وہ اپنی محرومیوں پر نوحہ کناں ہوتا ہے اور اس روشنی کو حاصل کرنا چاہتا ہے جس سے اس نے آنکھیں موند لی تھیں یا خواہشات نفسانی نے اسے اندھا کردیا تھا۔ لیکن وہ ان تجلیوں کے حصول سے محروم رہتا ہے، ماحول سے

ساتھ ہی کہ اس کا [illegible] کر رہا ہے اور [illegible] پستی و پسماندگی کو اپنا لیا ہے۔ دل کی شگفتگی، ذہن کی تازگی، خیالات کی لطافت اور اخلاق کی نکہت کسی اجنبی دیس کی مکین معلوم ہوتی ہیں، زندگی کی مستی کا تمنائیں دل کے دھوئیں میں بدل جاتی ہیں، راحت و فرحت کے شاداب کنجوں کی بجائے غم و اندوہ اور حسرت و یاس کے ویران گوشے نگاہوں کے سامنے پھرتے ہیں خوش قسمتی سے اگر کبھی تکمیل آرزو کی رنگین و حسین وادی نظر بھی آتی ہے تو اس میں داخل ہونے سے اس لئے ہچکچاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس کا اہل ہی نہیں پاتا اور اس کی زندگی پر آئی ہوئی بہار خزاں میں بدل جاتی ہے۔

”داش آ گل“ ایک ایسے شریف انسان کی کہانی ہے جس کی فطرت میں نیکی ہے جو اپنے اخلاق و شرافت کی وجہ سے شہر بھر مشہور ہے، وہ ایک مرد باہمت اور ایثار پیشہ انسان ہے لیکن اسے اپنی کمزوریوں کا بھی احساس ہے اور یہی احساس کمتری اس کی ناکامی کا باعث بن جاتا ہے۔ اسے مرجان سے محبت ہے جس کے باپ کی وصیت پر اس کا خاندان اس کی کفالت میں دیا گیا ہے مگر کچھ تو احساس کمتری کے باعث اور کچھ لوگوں کے طعن و تشنیع کے خوف سے محبت کی سلگتی آگ کو دبانے کی کوشش کرتا ہے، وہ ضبط اور صبر سے کام لیتا ہے اور مرجان سے اتنا بھی نہیں کہہ پاتا ”مرجان میں تم سے محبت کرتا ہوں“، وہ بظاہر برف کی چٹان ہے لیکن آتش عشق اسے اندر ہی اندر تحلیل کرتی جا رہی ہے وہ اپنا دکھ درد بھی کسی سے نہیں کہتا۔ جب اس کا دل بھر آتا ہے تو طوطے کا پنجرہ سامنے رکھ کر پکار اٹھتا ہے ”اما چہ بکنم؟ این عشق مرا می کشد ....

مرجان ...... مرجان ...... تو مرا کشتی ...... بکہ بگویم ؟

...... مرجان ...... عشق تو مرا کشت ......“

سات سال اسی طرح بسر ہو جاتے ہیں اور بالآخر وہ گھڑی آ پہنچتی ہے جب اس کے من کی کلی مرجھا جاتی ہے وہ اپنے من مندر کی دیوی کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیتا ہے جو اس سے بھی گیا گزرا ہے اور خود عالم تنہائی میں تلخی حیات کو کم کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس [illegible] ایک قدیم ایرانی ذہن سے شکنجہ [illegible] ہمیشہ ہمیشہ کے لئے [illegible] [illegible] ہے۔

صادق ہدایت کے اس افسانے کے مرکزی خیال کی جھلک ہمیں واجدہ تبسم کے ”بے شعلے“ (دنیا زاد شمارہ ۲۱-۲۲) میں دکھائی دیتی ہے، لیکن واجدہ نے اپنے افسانہ کا تانا بانا جس [illegible] سے بنا ہے وہ قابل تحسین و آفرین ہے اسی لحاظ سے وہ ایک بلند پایہ افسانہ ہے، ”داش آ گل“ اور ”شعلے“ کا اسلم دونوں محبت کی دھیمی دھیمی آنچ میں سلگتے رہے وہ اپنے محبوب سے قریب بھی رہے لیکن حرف مدعا زبان پر نہ لا سکے وہ اتنا بھی نہ کہہ سکے ”میں تم سے محبت کرتا ہوں“، آرزوئیں دل کی اتھاہ گہرائیوں میں مچلتی ہی رہیں تمناؤں کی ڈولتی کشتی ساحل مراد سے ہمکنار نہ ہو سکی بلکہ حسرت و یاس کے بھنور میں ڈوب گئی۔

مقصدیت کے زمرہ میں آنے والے افسانوں میں ”شب ہائے ورامین“، ”محلل“ اور ”طلب آمرزش“ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ”شب ہائے ورامین“ میں افسانہ نگار نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہم تو توہمات کی دنیا کے مکین ہیں اور بچپن سے ہی ہمیں اوہام کے غار میں دھکیل دیا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسے واقعات ظہور میں آتے ہیں جن کی علت ہمارے آپ جیسے انسان ہوتے ہیں، مگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مردوں کی روحیں انہیں انجام دیتی ہیں اور ہم ان مافوق الفطرت چیزوں سے خوف کھاتے ہیں اس خوف و ہراس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ عام حالات کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس افسانہ میں ہیرو کا نفسیاتی تجزیہ خوب کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ توہمات کی بنا پر عام لوگوں کا یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ پرانے مکان میں راتوں کو فرنگیس (فریدون کی بیوی جو مر چکی ہے) کی روح وہاں آ کر ستار بجاتی ہے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ فریدون کی سوتیلی بہن ہمایوں کے ساتھ وہاں پر رنگ رلیاں مناتی اور ستار بجاتی تھی، فریدون نے یہ سب کچھ جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو پاگل ہو گیا لیکن لوگوں نے یہی خیال کیا کہ روح فرنگیس کا اس پر اثر ہے، سماجی نقطہ نظر سے اگر ہم صادق ہدایت کے افسانو

[illegible] حیات انسانی کے عجیب و غریب خدوخال ہیں [illegible] کیے ہیں۔

"آمرزش" اور "محلل" میں اس نے مذہب اور مولویان مذہب پر بھی تنقید کی ہے۔ مذہب کے معاملہ میں بات خدا دبی زبان سے کہتا ہے لیکن مذہب کے ٹھیکیداروں پر وہ صریح الفاظ میں سب کچھ کہتا ہے۔ حج و زیارات کے اس عقیدے کی تکذیب کی ہے کہ حج یا زیارت کرنے سے پہلے کیے گئے گناہ حج و زیارات کے بعد معاف ہو جاتے ہیں۔ اپنے افسانہ بعنوان "آمرزش" میں وہ ہمیں بتلاتا ہے کہ کس طرح ایک عورت اپنی سوت کے معصوم شیر خوار بچوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے اور پھر روضہ امام حسینؑ پر حاضر ہو کر رو رو کر اپنی آخرت کی بھلائی کے لئے دعا کرتی ہے۔ اسے خود بھی یقین نہیں آتا کہ اتنے گناہ کبیرہ کرنے کے بعد اس کی نجات کیونکر ہوگی گویا اشتباہ کا اظہار۔ گرایے اس نے اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ حاجیوں اور زائروں کی ذات پر بھی تنقید کی ہے کہ حج و زیارات کے لئے فقط وہ لوگ جاتے ہیں جو ابتدائی زندگی میں کتنے ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہوتے ہیں اور اس قدر طویل سفر کی زحمت برداشت کرنے سے ان کا مقصد کفارہ گناہ ہوتا ہے۔

مذہب کے ٹھیکیداروں یعنی پیروں اور ملاؤں کی قلعی بھی کھولی ہے۔ "محلل" میں ان لوگوں کی بدعنوانیوں کا جا بجا تذکرہ کیا ہے کہ مذہب میں دی گئی سہولتوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور خواہشات نفسانی سے مغلوب ہو کر نت نئی شادی رچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ بچپن کی شادی اور انمل بے جوڑ شادی پر بھی زبان طعن کھولی ہے۔ "محلل" میں ایک کردار کی زبانی سنئے۔

چون معروف بود کہ نفس مرحوم ابوی جری است
یک شب مرا سر بالین ناخوشی بردند تا دعا بدہم
دیدم دختری ہشت یا نہ سالہ ای آنجا نشستہ
می چکید تا با یک نظر گلویمانی گیر کرد، جوانی است
[illegible] ..... [illegible]
داشتم کہ ہر دو را مطلقہ کردہ بودم [illegible]
چیز دیگری بود، می گویند کہ لیلی را بچشم مجنون
باید دید، باری دو سہ روز بعد یک دستمال آجیل
آچار و سہ تومان پول نقد فرستادم عقدش
کردم، شب کہ او را آوردند آن قدر کوچک بود
کہ بغلش کردہ بودند من از خود خجالت کشیدم
از شما چہ پنہان؟ دختر تا سہ روز مرا کہ می دید
مثل جوجہ می لرزید حالانکہ سی سالم بود، جوان
در حال بودم، اما آن مردہای ہفتاد سالہ را بگو
کہ با ہزار جور ناخوشی دختر نہ سالہ می گیرند!

عوام میں پیر پرستی کی طرف جو رجحان پایا جاتا ہے اسے اس افسانہ میں ہدف تنقید بنایا ہے اس کے نزدیک اس خطرناک رجحان کی بدولت انسانی عظمت، اخلاق اور معصوم زندگیوں کو جو نقصان اٹھانا پڑتا ہے وہ قابل مذمت ہے۔ مرد اور عورت جب ازدواجی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں تو اپنی مرتبت کی سطح پر مساوی ہو جاتے ہیں۔ اختلاف نظریہ کے موقع پر عورت بھی مرد سے مرعوب ہوئے بغیر اپنا نقطہ نگاہ پیش کرنے میں بیباکی سے کام لیتی ہے اور یہ بیباکی اس کا حق بھی ہے۔ عورت اور مرد کے دلوں میں جب محبت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہو تو پھر بحث مباحثہ میں تلخ کلامی تک نوبت نہیں آتی۔ ایسے پرسکون ماحول میں اگر قسمت کے سنگین ہاتھوں سے کسی کا جام حیات ٹوٹ جاتا ہے تو دل و نگاہ میں ان گنت ویرانیاں بکھر جاتی ہیں لیکن جب میاں بیوی کے درمیان اختلافات کسی غلط فہمی کے سہارے ابھرتے ہیں تو دونوں کی زندگی متوازی خطوط کا روپ دھار لیتی ہے جو کبھی نہیں مل سکتے۔ "شب ہائے ورامین" اور "گرداب" میں ان حقائق کو بیان کیا گیا ہے۔

صادق ہدایت کے نزدیک عورت ایثار و قربانی کا مجسمہ ہے اس کی ذات جب کسی سے وابستہ ہو جاتی ہے تو وہ ہمیشہ کے لئے

اس کی ہوتی ہے جو اس کا شوہر اگر اس سے محبت نہیں کرتا تو وہ ہمت نہیں ہارتی بلکہ اس کی محبت جیتنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتی ہے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ منزل پالینے کے بعد حالات کچھ اس طرح کا رخ لیتے ہیں کہ عناصر حیات منتشر ہو جاتے ہیں۔ "عروسک پس پردہ" میں مہرداد درخشندہ سے خوفزدہ ہو کر اسے ریوالور کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ اس تصویر کا دوسرا رخ ہمیں "زنی کہ مردش را گم کرد" میں نظر آتا ہے جس میں زرین کلاہ ایک ایسی عورت ہے جو خاوند سے کوڑے کھاتی ہے لیکن اس کی محبت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔ آپ اسے جذبۂ آزار خواہی پر محمول کریں مگر اس کی محبت و شیفتگی کو نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ جب وہ چلا جاتا ہے تو اس کے بغیر وہ اپنی زندگی کو بے کیف محسوس کرتی ہے اور۔

نفس گرم او، حرارت تنش، پشم ہای زمخت
و آن بوی عرق طویلہ و حالا در مفارقت وی
او ہمہ این خواص بطرز مرموز و دلربائی بنظر
زرین کلاہ جلوہ می کرد و بطور یقین از لوازمات
بدون شک بوی زندگی بکند۔

لیکن جب وہ اسے نہیں پاتی تو وہ اپنے آپ کو کسی اور سے وابستہ کرنا پسند کرتی ہے جو انہیں خصوصیات کا حامل ہو۔ ڈاکٹر اور طبیب جن کا پیشہ اور توجہ ایک مریض کو کنارِ گور سے واپس لا سکتی ہے اس قدر بے پرواہی، خود غرضی، مردم آزاری اور سنگدلی کا ثبوت دیتے ہیں جس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ مریض کی جیب پر ہاتھ صاف کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں اور اس کی شفایابی کا خیال تک بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا۔ کسی کی مفلسی یا تہیدستی ان کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکتی۔ کسی بے کس و بے بس انسان کی موت سے بھی ان کی آنکھیں نم نہیں ہوتیں۔ ان کے ہر قول و فعل سے انسانی ہمدردی کا فقدان نمایاں طور پر عیاں ہوتا ہے اور اس کا سبب ہوس زر کے سوا کچھ نہیں۔ صادق ہدایت نے اپنے کرداروں کی زبانی ان کی بے حسی اور اخلاقی منفعت پر بھرپور طنز کیا ہے۔

چہ خود این مخلوق [illegible]
[illegible]
حاکمی است؟

اب ان کی دعاؤں کے بارے میں ان ہی سے سنیئے۔

و چہ فائدہ دارد بخشش بادا است کہ [illegible]
مجبوری خودم این ہا بدتر آدم را ناخوش می کند۔

صادق ہدایت کے افسانوں کے کرداروں کا تجزیہ اگر فرائڈ کی روشنی میں کیا جائے تو ہم بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں کہ اس کا نظریہ اپنے ہمعصر افسانہ نگار حسین قلی مستعان سے مختلف ہے جس کا خیال ہے کہ اکثر کردار جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، بچے یا درمیانہ عمر کے لوگ ہیں اور عام طور پر جنسی بھوک کا شکار۔ اس اشتہا کو رفع کرنے کے دو ہی طریقے ہیں، اول یہ کہ اس بھوک کے لئے خوراک مہیا کی جائے اور دوم خودکشی یا موت۔ یہ ہوس بازی اور تلذذ جیسا کہ اس کے تقریباً ہر افسانے کے کسی نہ کسی کردار میں پائی جاتی ہے اور اس وجہ سے وہ ایک اندرونی یا بیرونی کشمکش میں مبتلا ہوتا ہے۔ مستعان کا بوڑھا جس کے منہ میں دانت ہے نہ پیٹ میں آنت جب ایک لڑکی کو پالتا ہے اور وہ ایوان کم سنی سے نکل کر منزل شباب میں قدم رکھتی ہے تو اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ اس کی محبت ایسی محبت نہیں جو باپ کو بیٹی سے ہوتی ہے بلکہ ایسی محبت جو ایک مرد کو عورت سے ہو سکتی ہے۔ لہٰذا جب وہ اسے بابا کہہ کر پکارتی ہے تو اس کی حالت دگرگون ہو جاتی ہے۔ "[illegible]" بطور مثال کے پیش کیا جا سکتا ہے۔

حسین قلی مستعان نے امیر، غریب اور متوسط درجے کے افراد کی ترجمانی کی ہے۔ اس کے چند ایک افسانے جو راقم السطور کی نظر سے گذرے ہیں ان سے تو یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک امراء کا طبقہ برے درجہ کا عیاش ہے اور ان کے مقابلہ میں غرباء کا کردار بہت بلند ہے۔ مستعان کے نظریہ کے مطابق ان افراد کا کردار بھی بلند ہے جو مفلسی کی جھونپڑی سے کاخِ امارت میں قدم رکھتے ہیں۔ البتہ ان کی اولاد جو جاہ و ثروت کے گہوارے میں آنکھ کھولتی ہے، ہر طرح کی بداعمالیوں کی مرتکب ہوتی ہے۔ مختصر یہ کہ مستعان

کہ غیر ملکی تسلط ہی دولت پہ قدم پہنچ اوپر کی جڑ ہے، ان حقائق کے پیش نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عصر حاضر کے ان روایاتی افسانہ نگاروں کے نظریات میں بعد المشرقین ہے۔

صادق ہدایت کو اہل عرب سے سخت نفرت ہے، وہ ہمیشہ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اپنے افسانوں میں جہاں کہیں کسی عرب کا ذکر کرتا ہے تو تعصب کی عینک کبھی نہیں اتارتا، ہم یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے کیا اسے اس کی وطن پرستی پر محمول کیا جائے کہ وہ بھی فردوسی کی طرح اپنے وطن کی محبت میں سب کچھ بھول جاتا ہے، فردوسی نے بھی تو شاہنامہ میں یہاں تک کہہ دیا ہے سے

ز شیر شتر خوردن و سوسمار ٭ عرب را بجای رسیدست کار
کہ تاج کیان را کنند آرزو ٭ تفو بر تو ای چرخ گردان تفو

اسی طرح صادق ہدایت نے اپنے افسانے "آخرین لبخند" میں گشتاوک کی زبان سے ملی تعصب کو ہوا دی ہے ملاحظہ ہو:۔

این تقصیر خود مان بود کہ طرز مملکت داری را بہ
عرب ہا آموختیم، قاعدہ برای زبان شان درست
کردیم، فلسفہ برایشان تراشیدیم ......
فکر، روح، صنعت، ساز، علوم و ادبیات خود مانرا
دو دستی تقدیم آنہا کردیم تا شاید بتوانیم روح وحشی
و سرکش آنہا را رام و متمدن بکنیم ولی افسوس!
اصلاً نژاد آنہا و فکر آنہا از زمین تا آسمان با ما فرق
دارد و باید ہم ہمین طور باشد این قیافہ ہای درندہ
رنگہای سوختہ دستہای کورہ بستہ برای گردنہ
گیری درست شدہ...... افکاری کہ میان
شاش و پشکل شتر نشو و نما کردہ بہتر از این نمی
شود تمام ساختمان بدن آنہا گواہی میدہد کہ برای
دزدی و خیانت درست شدہ این عربہا کہ تا دیروز
پای برہنہ دنبال سوسمار می دویدند و زیر شیا
چادر زندگی می کردند باید ہم بیش از این از آنہا

متوقع بود"

اسی افسانہ میں ایک دوسری جگہ کہتا ہے:۔

"عرب چہ می خواہد؟ یک مشت ملخ و نقرہ و یک حرم
سرای پر از زن، این منتہی آرزو و کمال آنہاست"

حب الوطنی کے جذبہ سے سرشار ہو کر اگر وہ ایسا کرتا تو کسی حد تک قابل معافی تھا مگر اسے تو مذہب اسلام سے بھی کوئی دلچسپی معلوم نہیں ہوتی جس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے، یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ عربوں کا جہاں کہیں بھی ذکر کرتا ہے اس کے ہر لفظ سے نفرت و حقارت ٹپکتی ہے "طلب آمرزش" میں ایک عربی کا حلیہ ملاحظہ ہو:۔

"یہ جلو قہوہ خانہ عربی نشستہ بود، انگشت دو بینش
کردہ بود و با دست دیگرش چرک لای انگشت
ہای پایش را در می آورد و صورتش از مگس پوشیدہ
شدہ بود و پیشش از ریشش بالا می رفت"

بھلا ایسے شخص کی جانب کون دیکھنا گوارا کرے گا، اس افسانہ میں ایک اور عرب کا نقشہ کھینچتا ہے اور پس منظر میں جب ہمیں یہ معلوم ہے کہ یہ کاروان روضۂ مطہر امام حسین علیہ السلام پر جا رہا ہے تو ہمیں اس خچر ہانکنے والے عربی سے نفرت ہونے لگتی ہے جو اس قدر سنگدل ہے کہ خچر کے زخم پہلو پہ کی زنجیر مارتا ہے:۔

"عرب پا برہنہ ای با صورت سیاہ و چشم ہای
دریدہ و ریش کوسہ زنجیر کلفت آہنین در دست
داشت و بر آن زخم قاطر می زد، گاہی ہم می گشت
صورت زنہا را یکی یکی برانداز می کرد"

ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ صادق ہدایت کے افسانوں کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے مذہب اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں بلکہ سخت نفرت ہے، اسی نفرت کا اظہار اس نے بارہا کیا ہے اور بسا اوقات مذہب یا کسی عقیدے کے خلاف اپنے دلائل کے ثبوت میں ہی افسانہ کا تانا بانا بنتا دکھائی دیتا ہے اور بعض اوقات فقط دلائل سے قاری کے ذہن میں ایک تاثر چھوڑ جاتا ہے اور افسانہ

روح انسان مادی تخیل میں اس کی ہم نوائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے ممکن ہے بچگی عقیدے کے باعث سر کو جھکا دیکر زیر لب اور ہو چہ کہہ دے تاہم افسانہ نگار کے عقیدے کے جراثیم سرایت ضرور کر جاتے ہیں۔

صادق ہدایت کی مذہب پر تنقید و تنقیص محض اس وجہ سے ہے کہ اہل عرب نے اسلام کے ابتدائی دور میں ایران کو فتح کرلیا گویا ایران جیسی عظیم الشان سلطنت عرب کے صحرانشینوں کے قبضہ میں آگئی جس سے ایران کی آزادی سلب ہوگئی، اہل ایران غلام بن گئے عربوں سے نفرت کرنے کے لئے یہی وجہ کافی ہے، لہٰذا اسلام جو عربوں کے وسیلہ سے ہی ایران میں آیا اور اہل ایران اپنے قدیم مذہب کو ترک کرکے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور اس طرح ایران قدیم رسم و رواج، مذہب و ثقافت کی راہ سے ہٹ کر اسلام کی بتائی ہوئی صراط مستقیم پر گامزن ہوگیا، یہ سب کچھ اس امر کا متقاضی ہے کہ صادق ہدایت اسلام کو ناپسند کرے اور اس پر تنقید و تنقیص کے ابواب کھول کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے

"شبہای ورامین" میں وہ اپنے افسانے کے ایک کردار فریدون کا تعارف کراتے ہوئے صاف طور پر کہتا ہے کہ اسے اہل عرب سے نفرت ہے، فریدون حقیقت میں اس کے اپنے عقائد کی ترجمانی کرتا ہے، تقدیر، قسمت اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا، فریدون اور اس کی بیوی فرنگیس کا مکالمہ آپ بھی سنیں:-

فریدون با بی حوصلگی گفت:- از بسکه قسمت قسمت گفتی خسته شدم، چرا آن قدر حرفهای اهلی می زنی؟

فرنگیس گفت:- نقل پری شب است که منکر آن دنیا شده بودی، تو هم پاک فرنگی شدی و زیر همه چیز زده ای۔

فریدون گفت:- این که دیگر دخل بفرنگیها ندارد، اما خواهم بگویم که ما بد تربیت می شویم، همه خرابی۔

ما گرفتار همین خرافات است که بچگی توی کله مان چپانده اند، همه مردم را آن دنیائی کرده این دنیا را مادی کرده ایم و فکر موهوم را چسبیده ایم مگر ما چه چیز مان پست تر از دیگران است برای

نیست که فرنگی به بچه اش می گوید بحرف حسابت ... باید آن را آباد کرد باید منزلگاه دیگران جلوه ... باید سرنوشت شد، برعکس ما که به بچه مان می گوئیم این دنیا گذرگاه است و هر چه هست آن دنیاست، نمی دانم که انسان دنیا برگشته که خبرش را برای ما آورده، از توی خشت که می افتیم برای آن حسرت مان گریه می کنیم تا بمیریم، این همه زندگی شد؟

یہ تو ایک عام اور معمولی سی بات تھی، بسا اوقات اس کا حملہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ ہمارے عقیدے کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں "محلل" لکھنے سے شاید اس کا مقصد یہی ہے کہ مذہب اسلام کا مذاق اڑایا جائے "حلالہ" کرنے کے مسئلہ کو اپنے افسانہ "محلل" کا تانا بانا قرار دیکر بغیر کچھ کہے اپنا مطلب حاصل کرنے کی سعی کی ہے، البتہ مسئلہ قربانی پر تنقید اپنے ایک کردار سے کرائی ہے وہ کہتا ہے:-

"همین پریروز که عید قربان بود رفتم خانه یکی از اعیان که پیشتر معلم سرخانه بودم، بمن گفتند که بروم دعا برای گوسفند بخوانم، قصاب بی مروت حیوان زبان بسته را بلند کرد و به زمین کوبید داشت کاردش را تیز می کرد، حیوان تقلا کرد و از زیر پایش بلند شد، نمی دانم چه بود؟ زمین بو داد؟ چشمش ترکید و از ش خون می ریخت، دلم مالش رفت، به بهانه سر درد برگشتم همه شب همین کله خون آلود گوسفند جلو چشمم می آمد، آن وقت از ذهنم صرفت، کفر گفتم، کفر خیال کردم..... نه نمی دانم لال مرغ بی خدا که شکی نیست اما حیوان زبان بسته گناه دارد خدایا، پروردگارا تو خودت بهتر میدانی هرچه باشد انسان محل نسیان است"

صادق ہدایت کے افسانوں میں ہمیں جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا ہے وہ اس کی منظر نگاری اور کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ ہے منظر نگاری میں اسے ید طولیٰ حاصل ہے، وہ الفاظ کے رنگوں سے ایسی پیاری

تصویر بھی بن سکتا تھا اس طرح جب ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایک
مصور جس طرح رنگوں کے امتزاج سے تصویر کے ہر پہلو کو ابھار
کر تا ہے اسی طرح صادق ہدایت موزون الفاظ کے صحیح استعمال
سے ایک دلکش منظر ہماری آنکھوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے جس
سے پڑھنے والا اس کے مشاہدے، تجربے، تصور اور تخیل کی داد دئے
بغیر نہیں رہ سکتا۔ مناظر کی مصوری میں جب نفسیاتی مطالعہ کا ہلکا
سا رنگ ابھرتا ہے تو اس کی دلکشی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

صادق ہدایت کے افسانے تصاویر کا ایک البم ہیں کہیں
وہ جذبات کی مصوری کرتا ہے تو کہیں ذہنی کیفیتوں کی عکاسی کرتا ہے
کبھی کسی کردار کا نقشہ کھینچتا ہے تو کبھی ماحول کی تصویر بناتا ہے
ان تمام تصویروں میں اس کی باریک بین نظر کہیں بھی دھوکا نہیں
کھاتی اور یہی اس کے فن کا کمال ہے "گرداب" میں سردی و برف
باری کا ایک منظر ملاحظہ ہو۔

"ہوا ابر بود، بخار کم رنگی روی شیشہ ہای پنجرہ
را گرفتہ و از پشت آن شیروانی خانۂ ہمسایہ
دیدہ می شد کہ یک ورقہ برف رویش نشستہ
بود۔ برف پارہ ہا آہستہ و مرتب در ہوا می چرخیدند
و روی لبۂ شیروانی فرود می آمدند، از دود کش
روی شیروانی دود سیاہ رنگی بیرون می آمد
کہ جلو آسمان خاکستری پیچ و خم می خورد و کم کم
ناپدید می گردید۔"

اسی افسانہ میں ہمایوں جب اپنی بیوی سے الجھتا ہے اور
وہ ناراض ہو کر چلی جاتی ہے تو یہ بھی منزل کا تعین کئے بغیر بلا سوچے
سمجھے گھر سے نکل پڑتا ہے، اب سردی کی شدت اور برف باری سے
گلیوں اور بازاروں کا منظر نیز پس منظر میں ہمایوں کی ذہنی کیفیت
اور جذبات کی تصویر بھی ملاحظہ ہو۔

"از خیابانی سر در آورد کہ سر تا سر سفید و غم
انگیز بود، جای چرخ درشکہ میان آن تشکیل
شیارہای پست و بلند دادہ بود، آہستہ

گامہای بلند بر می داشت، آنوقت جلو [illegible]
گذشت۔ در برفہای آبدار و گل خیابانہا تا سیرد
روی او پاشید۔ ایستاد۔ لباسش را نگاہ کرد،
غرق گل شدہ بود، و شلوار این بود کہ [illegible]
...... راہ خودش را در پیش گرفت تا [illegible]
جلو شیشۂ دکانی ایستاد و جلو رفت پیشانیش
را بہ شیشۂ سرد چسپانید، نزدیک بود کلاہش
بیفتد، پشت شیشہ اسباب بازی چیدہ بودند،
آستین را روی شیشہ می مالید تا بکار آید روی
آن را پاک کند ولی این کار بیہودہ بود۔ یک عروسک
بزرگ با صورت سرخ و چشمہای آبی جلو او بود
کہ لب خندہ می زد۔ قیمت پای آن نگاشتہ بود۔ یادش
افتاد اگر این عروسک مال ہما بود چقدر او را خوش
حال می کرد۔"

اس افسانہ میں اس قسم کی بہت سی تصویریں ہیں لیکن
ہم آگے چلتے ہوئے "شبہای ورامین" کی سیر کرتے ہیں جو فریدون نے
بیوی کے مرنے پر ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے اور ہسپتال میں زیر علاج
رہنے کے بعد جب اس کی طبیعت سنبھلتی ہے تو وہ واپس اپنے گھر
آتا ہے جب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مالی اور نوکر اس خوف سے بھاگ
گئے ہیں کہ اس مکان پر بھوت پریت کا اثر ہے تو اس وقت ہمایوں
کی حالت کے ساتھ مکان کی حالت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

"فریدون گیج و منگ بود، سرش را پائین انداخت
وارد باغ شد و جلو خیابانی کہ بہ عمارت سر در می
آورد ایستاد، از دیدن حالت باغ افسردہ شد
بعد از [illegible] کوشک مسکونی خرابہ و بیمار
گردیدہ بود، بہ سایہ خودش نگاہ می کرد کہ جلو روشنائی
فانوس روی زمین بلند و کوتاہ می شد، برگ خشک
درختہا را کہ در ہمہ جا بی ترتیب ریختہ بود
شلوغ و ترسناک بود، آب جوی پائین رفتہ بود

دو ماه بعد که صبیه الاغی را به حد فلک نسترن بامی گرفت و به گلمیل منید، با الفت آتش این که کسی او را دنبال کرده باشد، مانند الاغ ناشیمی خویش شد، در را کیپ کرد، گرد و غبار روی میز نشسته بود، همه چیزهای ریخته و پاشیده بود، اول پنجره را باز کرد، هوای تازه داخل اطاق شد، چراغ روی میز را روشن کرد، رفت روی صندلی راحتی افتاد، نگاهی به دور اطاق انداخت مانند این بود که از خواب درازی بیدار شده چیزهای آنجا را از روی کنج کاوی نگاه می کرد، مثل این بود که برای اولین بار آنها را می بیند....."

اسی افسانہ میں فریدون کے احساسات، جذبات، ماحول کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے افسانہ نگار پس منظر کو فراموش نہیں کرتا اور موقع بہ موقع اس کی تصویر بھی کھینچتا چلا جاتا ہے واقعہ یہ ہے کہ فریدون کو نسترن باجی بتاتی ہے کہ یہاں راتوں کو ستار بجتا ہے اور اس طرح جیسے اس کی بیوی فرنگیس بجاتی تھی گویا فرنگیس کی روح اس مکان پر منڈلاتی رہتی ہے اور اس وجہ سے ان کا کتا بھی مر گیا ہے اور نوکر وغیرہ بھی بھاگ گئے ہیں، یہ واقعات سن کر فریدون کے تاثرات ملاحظہ ہوں:-

هزار جور اندیشه های موهوم و بی سر و پا جلو فریدون نقش بست، با خودش می گفت شبها تا صبح تنها مهمان آهنگی که فرنگیس می زد، نوکر، باغبان رفته اند، سگ مرده، بدشواری نفس می کشید، سایه های خیالی جلو او می رقصیدند چشمش افتاد به قالیچه بدقه دیوار که عکس حضرت سلیمان روی آن بود و سر نفر عمامه به سر دست به سینه کنار تخت او ایستاده بودند، زمینه قالیچه پر شده بود از اژدها و حیوانات خیالی و دیوهای خنده آوری که آن شان حال سیاه داشت، شیشه زیر بغل شان بود، این نقش که پیشتر ها جلب توجه او را نمی کرد، حالا که جان گرفته مانند آن را بشنید، بعد از آن بلند شد، چند گامی به دور اطاق راه رفت جلو صندوق عطرها ایستاد، دسته آن را پیچاند و باز شد، در تاریکی دید دو تا چشم درخشان باز دو فته شده، قلبش تند شد، پس یک رفت چراغ را برداشت، نزدیک آورد، دید گربه لاغری از شیشه شکسته پنجره بیرون جست، نفس راحتی کشید، این جا اطاق شخصی فرنگیس بود، روی میز گلدان را با گلهای خشکیده دید، نزدیک رفت آنها را ما بین انگشتانش فشار داد، فرو شد روی میز ریخت، اشک در چشمش حلقه زد، بوی بنفشه در هوا پراکنده بود، همان عطری بود که فرنگیس دوست داشت، پا پوش های او زیر نیمکت دید، پیچه او با نوار آبی شکل ... به دیوار آویزان بود، همه این چیزها خودمانی و دست نخورده سر جای خودشان بود، ولی صاحبش آن جا نبود، نه او می توانست باور بکند که فرنگیس مرده، در حقیقه او می توانست در را باز بکند و وارد اطاق خودش بشود"

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہے کہ کردار پر ایک موہوم سا خوف طاری ہے لیکن پس منظر کا ذرہ ذرہ اس خوف میں اضافہ کا موجب ہے، ایک باہمت مگر خوف زدہ انسان سے جس قسم کی حرکات سرزد ہوتی ہیں اس کا پورا نقشہ کھینچا ہے، اس کے علاوہ جب وہ اپنی مرحوم بیوی کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو یہاں کی ہر چیز اس کے دل میں محبت کے جذبات کو برانگیختہ کرتی ہے، وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتا ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں، وہ جانتا ہے کہ اب فرنگیس اس دنیا میں نہیں ہے لیکن اسے خیال آتا ہے کہ شاید ایک واہمہ ہو اور وہ چپکے سے کمرے میں داخل ہو جائے۔ ذہنی کیفیت اور جذبات کا اس

سے بہتر تصویر کھینچی ہے۔

اس سے یہ بھی عیاں ہوتا ہے کہ انسان ظلم و تعدی کے سایہ میں تنفس اور بسا اوقات بے ہوشی کی آرزو کرتا ہے، خوشی و مسرت کی تمنا اس کی زندگی کا جزو ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی تمنا پوری ہو یا نہ ہو۔

صادق ہدایت کے بعض افسانوں میں پختگی ذہن اور عمیق مشاہدہ کی جھلکیاں تو نظر آتی ہیں، مگر بعض مقامات پر فنکارانہ گرفت ڈھیلی ہوتی دکھائی دیتی ہے، اس مختصر مقالہ میں ہر افسانہ کی فنی خوبیاں یا نقائص کا ذکر کرنا اور ان کی تفصیل میں جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا لہذا صرف ایک دو افسانوں کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

"شبہائے ورامین" کی ابتدا میں جہاں افسانے کے کرداروں سے تعارف کرتا ہے وہاں آخر میں ہمایوں کا ذکر بھی ضمنی طور پر کرتا ہے لیکن کچھ اس انداز سے کہ بے ربط معلوم ہوتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے خواہ مخواہ گھسیٹ رہا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"گرد میز ناہار سہ نفر دور میز نشستہ بودند،
یک مرد نوجوان یک زن جوان و یک دختر
ہشت دہ سالہ سگ شان ژیگی ہم زیر میز خوابیدہ
بود فرنگیس تار ظریفی .... در دست داشت
.... سیم ہای نازک آن آہنگ سوزناکی
در می آورد و صدائے بیدہ آن در ہوا موج می زد
و ہنوز خفہ نشدہ بود کہ زخمۂ دیگری بسیم تار می
خورد ولی معلوم نبود چرا ہمیشہ ہمایوں رای زد
یا آن را بہتر بود دیا این کہ از آہنگ آن بیشتر
خوشش می آمد"

آپ تمام افسانہ پڑھ جائیے ہمایوں کا نام کہیں نہیں آتا۔ یہاں تک کہ آخر میں ہم قیاساً کہہ سکتے ہیں کہ گلناز کے جس کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں وہ شاید ہمایوں ہے، افسانہ نگار افسانہ کے اختتام پر یوں لکھتا ہے :-

"مردی بالباس خاکستری، صورت سرخ، گردن
کلفت و شانہ ہای تراشیدہ، موہای تیر کہ عالیدہ بود
گلناز خوش گل تر و تر از پیشتر با پیراہن خواب
و موہای ژولیدہ بحالت بہت زدہ ایستادہ بود
و تار فرنگیس با دستہ صدفی جلو پای او شکستہ
افتادہ بود ...."

"مردی بالباس خاکستری" وہ کون تھا کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن افسانے کی ابتدا میں چونکہ ہمایوں کا ذکر کیا گیا ہے اور استاد سے اس کی دلچسپی کا اظہار ضمنی طور پر ہوا ہے، اس لئے قیاساً ہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ ہمایوں تھا۔

صادق ہدایت اپنے افسانوں کے انجام میں جدت و ندرت پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے، مثلاً "گرداب" کا اختتام اس فقرے سے۔

"ہمایوں خیرہ بمشہدی علی نگاہ می کرد بایں جا کہ رسید بچۂ عروسک از زیر بغلش افتاد" پہ درست تھا لیکن صادق نے اس کے بعد ان جملوں کے اضافہ کی ضرورت بھی محسوس کی :-

"بعد مانند دیوانہ ہا بچہ پالتوش را بالا کشید و پاکا
ہای بلند بطرف گاراژ رفت، چون دیگر از بستن جمدان
منصرف شدہ با اتوبیل عصری توانست ہرچہ
زودتر حرکت بکند"

ان فقرات سے قاری یہ تو ضرور سمجھ گیا کہ میاں بیوی کے درمیان نفرت کی جو خلیج حائل ہوگئی تھی وہ قایم رہی اس سے ایک گہرا المیہ تاثر بھی پیدا ہو گیا تھا، لیکن اس سے لڑکی کے فوت ہو جانے کا جو المیہ تاثر تھا وہ نہ صرف ختم ہو گیا بلکہ ہمایوں کی کج فہمی کے شکار نے پر اس سے ہمدردی جاتی رہی اور قاری صرف ہمایوں کی بیوی سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو گیا۔

کہانی کا یہ انجام غیر متوقع بھی نہیں لیکن بسا اوقات افسانے کا انجام غیر متوقع اور تعجب خیز ہوتا ہے۔ "عروسک پس پردہ" اور "آخرین لبخند" کے زیر عنوان لکھے گئے افسانے بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں، ان افسانوں کے انجام پر بحث کرنے کی بجائے یہ عرض کریں گے کہ صادق ہدایت کے بہت کم افسانے ایسے ہیں جن میں سے اس نے

تجسس (Suspense) کو قائم رکھنے کی طرف توجہ دی ہے یعنی تجسس کہ اس کے بعد کیا ہوا قاری کو نہ صرف پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے بلکہ وہ افسانوی دنیا میں کھو کر کرداروں سے محبت یا نفرت کرنے لگتا ہے اور جب وہ اختتام پر پہنچتا ہے تو ایک گہرا تاثر اس کے دماغ پر چھا جاتا ہے ، یہ اس وقت ممکن ہے جب فن کار اپنی فن کارانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر زندگی کی عام [illegible] گئے واقعات کو اس ہنرمندی اور چابک دستی سے ترتیب دے کہ قاری اسے اپنی زندگی کے کسی واقعہ کے مطابق پاتے یا [illegible] ماحول میں ایسا گم ہو جائے کہ اپنے گرد و پیش کی اسے خبر نہ ہو ، یہ تاثر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب فن کار کسی خاص نقطۂ نظر کو پیرایۂ افسانہ میں پیش کرنے کا قصد نہ کرے اور اگر ایسا قصد کرے گا تو یقیناً اس کا فن اس مقصد کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔

فن کار جب زندگی کی عکاسی کرنے کی طرف متوجہ ہو تو اسے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ نہال حیات میں [illegible] کے پھول بھی کھلتے ہیں اور رنج و آلام کے کانٹے بھی پیدا [illegible] ہیں گل ہائے نشاط و انبساط کو چننے کی کوشش میں خار ہائے رنج و محن سے دامن بچانا مشکل ہے ، انسانی زندگی ان دونوں کا مجموعہ ہے ، زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنا فن کار کا مقصد ہونا چاہئے ، مگر صادق ہدایت کے افسانوں میں ہمیں حیات انسانی خوشی و مسرت کی روشنیوں سے محروم دکھائی دیتی ہے اگر کبھی کوئی انسان اس کی مدھم سی روشنی پاتا ہے تو فوراً یاس و حسرت کی تاریکیاں اس پر چھا جاتی ہیں اور وہ انہیں اندھیروں میں سسک سسک کر جان دے دیتا ہے "گرداب" کے تمام کردار "شب ہائے مدامین" کی [illegible] اور اس کا "اونڈ: عروسک پس پردہ" کی درخشندہ وغیرہ ایسے کردار ہیں جن کی ذات تلخی حیات پر نوحہ کناں ہے ، بالفاظ دیگر یہ افسانہ نگار ہمیشہ زندگی کے منفی پہلو کو ہی پیش کرتا ہے گویا اس کا نظریہ یہی ہے کہ شاخ زندگی پر خوشی کے پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جاتے ہیں ، اسی مقصد کے حصول میں وہ کوشاں رہتا ہے ، اس کے افسانوں کا شاید ہی کوئی کردار ایسا ہو جو اعلیٰ یا خارجی کشمکش میں مبتلا نہ ہوا ہو شاید ہی کوئی ایسا افسانہ ہو جس میں قتل کے جلنے یا خودکشی کرنے کا واقعہ موجود نہ ہو ، فی الجملہ یہ کہ اس کے افسانے منزہ نظریۂ حیات پیش کرتے ہیں اور یاسیت و قنوطیت کے مظہر دار ہیں۔

صادق ہدایت کی زبان کے بارے میں ہماری رائے وقیع نہیں ہو سکتی (اہل زبان کی زبان پر کسی زبان دان (اور ہم ہیں تو اس کا بھی دعویٰ نہیں) کا کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات کے مترادف ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اس کے افسانے نچلے درجے کے لوگوں کے ترجمان ہیں ، لہٰذا یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان کی زبان لکھنے میں اسے مہارت حاصل ہے لیکن بقول ڈاکٹر منظور الدین صاحب "اس کے بیان میں وہ روز مرہ کی چاٹ اور محاورہ کی شگفتگی ہے جو جمال زادہ کے اسلوب میں موجود ہے ، اس کی زبان میں وہ شستگی اور سلاست بھی نہیں جو حسین قلی مستعان کے طرز تحریر میں ہمیں نظر آتی ہے ، ڈاکٹر صاحب موصوف کا خیال ہے کہ صادق ہدایت نے مغربی مفکرین کی تصانیف کے بعد اپنی فکر کو جلا دی اور اس کو اپنے [illegible] کی ترجمانی کے لئے نئی اصطلاحات کنایات اور استعارات [illegible] کرنے پڑے ، اس سے یقینی طور پر فارسی زبان کی ثروت اور تنوع میں اضافہ ہوا۔

———— (✻) ————

کتاب ، علم و تہذیب کی پیامبر ہے
اور علم و تہذیب ہی انسان کو دوسرے
جانداروں سے ممیز کرتے ہیں ، لہٰذا
کتابیں پڑھئے ، انسان بنئے !



اپنے عزیز مہمانوں اور دوستوں
کو روح افزا پیش کرنا موسم گرما
کے آداب میں شامل ہے۔
روح افزا
اب بآسانی دستیاب ہے
مشروب مشرق
ہمدرد فروٹ پروڈکٹس — لاہور۔کراچی

وفا راشدی

ثقافتی ورثہ

میر عبدالحسین سانگی کی اردو شاعری

[زیر تصنیف کتاب "سندھ میں اردو" کے چند اوراق]

تحقیق و تفتیش سے پتہ چلتا ہے کہ سرزمین سندھ میں ابتدا سے ہر دور میں ایسے قابل قدر شعراء گذرے ہیں جنہوں نے سندھی زبان و ادب میں گراں قدر خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی ترقی و ترویج اور تبلیغ و توسیع میں بھی نمایاں حصہ لیا چنانچہ پنڈت چندر بھان برہمن (۹۹۴ھ تا ۱۰۷۳ھ) ملا عبدالحکیم عطا ٹھٹھوی (۱۰۷۰ھ تا ۱۱۴۰ھ) سچل سرمست (۱۱۵۲ھ تا ۱۲۴۲ھ) اور میر عبدالحسین سانگی جیسے سندھ میں اردو کے نامور و باکمال شیدائیوں کے نام سندھی ادب کی تاریخ تو کیا اردو ادب کی تاریخ بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

انیسویں صدی عیسوی کا آغاز سندھ میں اردو شاعری کے لئے نیک فال ثابت ہوا۔ شعراء کے دل و دماغ میں تقاضائے حیات و کائنات انگڑائیاں لینے لگا۔ زندگی کی نئی قدریں اپنائی جانے لگیں، سندھی شاعری میں بھی فارسی عروض اور اردو غزل کا رواج عام ہوا، اس دور میں نہ صرف سندھی زبان میں اردو فارسی کے بے شمار الفاظ و تراکیب کا اضافہ ہوا بلکہ سندھی شعراء نے بھی اردو زبان میں اکثر و بیشتر غزلیں و نظمیں کہیں اور اپنے خیالات گرانمایاں و افکار بے پایاں سے اس زبان کو مالا مال کیا۔ چنانچہ اس زمانے میں زارک خان لاشاری، مخدوم اللہ بخش، مولوی محمد صادق، آزاد نبی خان صوفی، دین محمد ادیب، حاجی شیر محمد مدنی، میر علی نواز ناز، میر غلام حسن احسن اور خلیفہ گل جیسے سندھی شعراء اردو کے بھی دلدادہ و پرستار تھے، انہوں نے پرانی روش سے ہٹ کر نئے نئے راستے نکالے اور اپنے اپنے رنگ میں گلستان اردو کو گلہائے رنگارنگ سے سجایا، بلاشبہ انیسویں صدی عیسوی میں اردو شاعروں کا ایک کارواں نظر آتا ہے اس کارواں کا میر، میر خاندان کا ایک شہزادہ تھا، یہ شہزادہ ہز ہائی نس میر عبدالحسین خان تھے جو سندھی میں سانگی اور اردو فارسی غزلوں میں عبدالحسین تخلص لکھتے تھے۔ وہ سندھ کے آخری تالپور حکمران میر محمد نصیر خان کے پوتے اور میر عباس علی خان کے صاحبزادے تھے، یہ خاندان برطانیہ کے عہد حکومت میں عرصہ تک کلکتہ میں نظر بند رہا۔ اس زمانہ یعنی ۱۸۵۱ء میں بمقام کلکتہ سانگی کی ولادت ہوئی، ان کی والدہ ایک انگریز خاتون تھیں، بارہ سال کی عمر میں سانگی اہل خانہ کے ہمراہ رہا ہو کر اپنے دیس میں واپس آئے، اس کلکتہ کو وہ کبھی نہ بھول سکے جس کے متعلق مرزا غالب نے کہا تھا

کلکتہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سانگی کلکتہ کو ان الفاظ میں یاد کیا کرتے تھے

پیالہ بہت جو سیالو الایا ایہا الساقی
اسا گجو ملک بنگال والا یا ایہا الساقی

عبدالحسین ساگی کی بقیہ زندگی وادی مہران کی صحرا نوردی میں گذری، یہاں اعلیٰ تعلیم سے آراستہ ہونے کے بعد فرسٹ کلاس اسپیشل مجسٹریٹ کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے سرکار برطانیہ سے بارہ سو روپے ماہوار بطور وظیفہ ملتے تھے ۱۹۲۴ء میں اس دار فانی سے رحلت کی، سید شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے جوار میں ان کی ابدی آرام گاہ ہے۔

میر عبدالحسین ساگی کی سوانح حیات یا تذکرہ سے کسی ادبی مجلہ کا دامن خالی ہے، یہاں تک کہ ثقافتی وفد کے باب میں اب تک سندھی شعراء سے متعلق جو کچھ لکھا جاتا رہا ہے اس میں بھی ساگی کا ذکر کہیں نہیں ملتا، مسلم ادبی پریس حیدرآباد (پاک) کا یہ اقدام مستحسن ہے کہ جس نے ساگی کا مکمل کلام ۱۹۵۲ء میں دو حصوں میں شائع کیا ہے "دیوان ساگی" کے پہلے حصہ میں ایک مبسوط دیباچہ (سندھی زبان) میں شامل ہے، اس دیباچہ کے شروع میں ساگی کے حالات زندگی درج ہیں، پھر ان کی سندھی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر بالتفصیل بحث کی گئی ہے، بڑے سائز کے ۲۰ صفحات پر مشتمل اس مضمون میں ساگی کی اردو شاعری کو کوئی اہمیت نہیں دی حالانکہ اسی دیوان میں فارسی زبان میں بھی ان کا خاصہ کلام ملتا ہے، ساگی کے فارسی دیوان کا ایک قلمی نسخہ بھی ان کے ایک عزیز کی ذاتی لائبریری میں محفوظ ہے۔

سندھی زبان تو ساگی کی آباؤ اجداد کی زبان تھی، اس کے علاوہ انہیں اردو اور فارسی زبانوں پر کامل دستگاہ تھی انگریزی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے، ساگی سندھ کے وہ باکمال سخنور ہیں جنہوں نے سندھی ادب کو قدیم رجحانات، پرانے خیالات اور فرسودہ مضامین کے بجائے جدید رجحانات، اچھوتے خیالات اور نئے نئے موضوعات عطا کئے، بات کا ایک انداز پیدا کیا، فارسی عروض کے اصول پر بحر و وزن کی پابندی کے ساتھ اردو نظمیں اور غزلیں کہیں، انہوں نے قدیم اساتذہ سخن سے بھی استفادہ کیا اور روایاتی شان کو برقرار رکھتے ہوئے جدت طرازی سے بھی کام لیا، بالخصوص سندھی ادب کو نہ صرف اردو فارسی بلکہ انگریزی کے بھی لاتعداد الفاظ دئے، انگریزی کے عام فہم اور ہلکے پھلکے الفاظ کو جس خوبی سے ساگی نے اپنے کلام میں استعمال کیا ہے وہ ان کی غیر معمولی ذہانت، فطری صلاحیت اور افتاد طبع پر دال ہے، ان کے کلام میں صحن سخن، فصل گل، لطف گل، سرخ رخسار، داغ لالہ، صفت رسا، زلف سنبل وغیرہ جیسے الفاظ کثرت سے استعمال ہوئے ہیں علاوہ بریں فارسی تراکیب، اصطلاحات، استعارات، تشبیہات، محاورات کے تجربے سندھی اشعار میں اس بے ساختگی کے ساتھ کئے ہیں کہ ان میں قند پارسی کا سا لطف پیدا ہو گیا ہے، اردو ان کا بڑا کارنامہ ہے، غرض کہ ان کے دامن فکر گلہائے رنگ رنگ سے گلستان سدا بہار بنا ہوا ہے۔

کلام ساگی کے مطالعے سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ وہ عاشق مزاج اور خوش مذاق آدمی تھے، فطرت نے ان کی طبیعت میں رنگین و شگفتگی کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی، بچپن سے عشق و محبت، حسن و جمال کے پرستار تھے، شکار ان کا دلچسپ مشغلہ تھا، عنفوان شباب میں شکار کھیلتے کھیلتے ایک بار خود شکار ہو گئے، اس واقعہ کا اظہار انہوں نے یوں کیا ہے ؎

نہ توقِ زشکار داشتم
آخر یقین شدہ کہ خود شکاریم

دیوان ساگی ص ۹۴

یہاں ذکر ساگی کی اردو شاعری کا کرنا ہے اس لئے بات ذرا موضوع سے ہٹتی ہے لیکن فارسی کا یہ شعر ان کی زندگی کی عکاسی کرتا ہے اور شاعر کے شباب و رعنائی کا پس منظر سامنے آتا ہے جس کے آئینہ میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ساگی کی شاعری ان کی زندگی سے کتنی قریب ہے، شکار کے اس واقعے سے ان کی زندگی کا ایک بڑا المیہ وابستہ ہے، یہ شکاری ایک ماہی گیر کی حسین و جمیل لڑکی تھی، وادی مہران کی اس دوشیزہ کو ساگی نے اپنے اقلیم دل کی ملکہ قبول کر لیا لیکن اس کی عمر نے وفا نہ کی اور وہ تھوڑے دنوں میں اپنے شریک حیات کو تڑپتا چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے چل بسی مرنے والی کی یاد میں ساگی

اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، عزیزوں نے ان کا جنون دیکھ کر دوسری شادی پہ اصرار کیا، چنانچہ ڈاکٹر ماتیٹ کی صاحبزادی مس ماتیٹ ان کے خزاں رسیدہ گلشن حیات میں بہار بن کر داخل ہوئیں۔ قدرت نے ان کی گود میں دو خوبصورت پھول کھلائے، سانگی کے خشک ہونٹ و فور مسرت میں مسکرا اٹھے۔

سانگی کا دیوان ایسے اشعار سے بھرا پڑا ہے جن میں حسن و عشق کے گہرے نقوش ثبت ہیں ؂

دندان و لب کی یاد میں رویا ہوں عمر بھر
کیوں اشک میری چشم کے لعل و گہر نہ ہو
پروانہ وار جلنے کی پروا نہیں مجھے
پروائے شمع رو کو میری جب خبر نہ ہو
گل رخسار پہ تیرے چمن ہستی میں
کونسی بلبل ہو نغمہ سرا میرے بعد
خون میرے کا پتا تجھ سے ملے گا آخر
رنگ لائے گا ترا رنگ حنا میرے بعد
گر تجھے قدر نہیں لیکن زمانے میں یقیں
یاد رہ جاوے مری مہر و وفا میرے بعد
مصرعۂ غیر ہو گیا دلچسپ
حسن تیرا عجب سیانا ہے
ہے جہاں ساقی و مے و مطرب
اپنا زاہد وہاں ٹھکانا ہے

کہیں کہیں رنگ تغزل کے اشعار بھی ملتے ہیں، شوخی و رنگین بیانی ملاحظہ ہو ؂

مولوی سید ابو الحسن مقدس القاب
شہد و شکر سے ہوا آپ کا اشعار لذیذ
زلف مشکین یا کالے ہیں ٹو ٹو
مار میرے یہ ہاتھ پلے ہیں ٹو ٹو
اک دن ہوں گے آفت جاں وہ
اب جو محبوب پیار سلے ہیں

رخ دلبر سے اس کو کیا تشبیہ
عارض چاند پر تو چھالے ہیں
کیا حسینوں کا دیکھنا ہے گناہ
قدرت حق کے وہ نقالے ہیں
سیف ابرو انہوں کی ہے جو کمان
تیر مژگان نہیں کٹارے ہیں
بہ لطف پیر مغان مے پرست کامل ہیں
پری کو شیشہ میں یکدم اتار رکھتے ہیں

سانگی جہاں بادۂ مجاز سے سرشار ہیں وہاں انہوں نے عشق حقیقی کے جام بھی لنڈھائے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی سے بے حد متاثر تھے ان کے صوفیانہ کلام اور شاعرانہ عظمت سے سانگی نے بچپن سے ہی استفادہ کیا تھا، اسرار و رموز اور حقائق و معارف کی لذتوں سے بھی آشنا تھے، ان کو اپنا روحانی استاد اور پیر و مرشد مانتے تھے، اپنی بے پناہ عقیدت کا یوں اظہار کرتے ہیں ؂

لطف لطیف شامل حال اگر نہ ہو
تو شاہراہ عشق میں میرا گذر نہ ہو

یہ شاہ لطیف کا روحانی فیض ہے کہ اکثر اشعار تصوف و روحانیت اور کیف و عرفان میں ڈوبے ہوتے ہیں مثلاً ؂

احمد سے تا بہ مہدی ہادی ہے موجزن
دریائے فیض حق جو کہیں مختصر نہ ہو
کشتی اہل بیت کا ہے ناخدا خدا
امواج حادثات سے اس کو خبر نہ ہو

سانگی امیر زادہ تھے ان کے رہن سہن اور رکھ رکھاؤ سے بیشک امیرانہ وضعداری عیاں تھی، لیکن اخلاق و کردار اور اخلاص و مروت میں اپنی مثال آپ تھے مزاج فقیرانہ پایا تھا ذہنی طور پر متوسط طبع اور غریب عوام سے بہت قریب تھے ان کی شاعری ان لوگوں کی زندگی اور سوسائٹی کی بھی آئینہ دار ہے۔ مناظر فطرت اور کائنات کی دلفریبی کی نقاشی بھی کی اور سیاسی

حالات اور سماجی کوائف کا جائزہ بھی لیا ہے، غمِ جاناں کے ساتھ ساتھ غمِ دوراں کی تصویریں بھی پیش کی ہیں، غرض کہ ان کے افکار طبعی حیات انسانی اور ذہنی ارتقاء کے بہت سے اہم پہلوؤں پر محیط ہیں، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

جو دل کے آئینہ کو بے غبار رکھتے ہیں
وہ ساری خلقِ خدا سے پیار رکھتے ہیں
جہاں میں اہلِ جہاں بے شمار رہتے ہیں
مگر وہ کم ہیں جو یاروں سے یار رہتے ہیں
غریب ملکِ عدم کو اگر ہیں جاتے تو کیا
ہمیشہ دہر میں کب مالدار رہتے ہیں

تہہِ زمین تو ہے رتبہ
جہاں میں مفلس اور شہریار رہتے ہیں
خدا کے واسطے ہمت تو عاشقوں کی دیکھو
کہ ایک دل ہے مگر غم ہزار رہتے ہیں

ان کی بعض غزلیں سہلِ ممتنع کا عمدہ نمونہ ہیں، چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں ؎

عمر گزری ہے میری یار عبث
غمِ ہجراں میں بیقرار عبث
گل بدن سے ہوا نہ اپنا وصال
رہ گیا دل میں خیال خال عبث
اب ہیں چالیس دو برس گذرے
تب جوانی کا انتظار عبث
میں ہوں عبدالحسین اے زاہد
مجھے دیتا ہے خوفِ نار عبث
نہ ہوا مہرباں یار ہنوز
رہا اپنا وہ حال زار ہنوز
کیا کروں میں شراب کو کہ مجھے
چشمِ ساقی سے ہے خمار ہنوز
میرے بالوں میں اب پڑا کافور
زلفِ دلبر ہے مشکبار ہنوز

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عبدالحسین سانگی کا اردو کلام اس پایہ کا نہیں جس پایہ کا سندھی کلام ہے، اکثر اردو اشعار فنی عیوب سے پاک نہیں ہیں، متروک الفاظ کثرت سے مستعمل ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کی زبان صاف، اسلوب سادہ ہے کہیں کہیں الفاظ کی بندش، بیان کی برجستگی و بے تکلفی اور ندرتِ خیال قابلِ داد ہے اور یہ ایک سندھی نژاد شاعر کے لئے بہت بڑی بات ہے۔

زیرِ نظر مضمون میں جتنے اشعار پیش کئے گئے ہیں سب کے سب دیوانِ سانگی سے نقل کئے گئے ہیں، اس دیوان کا ایک نسخہ راقم الحروف کے نجی کتب خانہ میں محفوظ ہے۔

(و۔ر)

مشین میں تیل نہ دیا جائے، تو وہ زنگ سے ناکارہ ہو جاتی ہے، انسان مطالعہ جاری نہ رکھے تو اس کا ذہن جمود اور پسماندگی کا شکار ہو جاتا ہے۔
کیا آپ مطالعہ جاری رکھتے ہیں، گذشتہ تین ماہ میں آپ نے کتنے پیسے دیگر تفریحات پر خرچ کئے اور کتنے کتابوں پر؟

احمد فراز

اظہار

پتھر کی طرح اگر میں چپ ہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھکو
اے سنگ تراش تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اولیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لئے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

جلیل حشمی

کوئی موج کوئی جھونکا!

موج موج شراب سے چہرے
آتش سے، عتاب سے چہرے، لہر لہر گلاب سے چہرے
پنکھڑیوں ایسے شبنم سے ہنستے ہوئے مہتاب سے چہرے

اڈے ہیں چہروں کے دریا
پھرتا ہوں میں ساحل ساحل جنم جنم سے تنہا تنہا
جیسے بھری بہار میں باغ کی روش روش پر ٹوٹا پتّا

کوئی ہوا کا جھونکا آئے
مجھ کو اڑائے دیوانی خوشبو کا لہرا ساتھ ساتھ
پیاسے کو یہ چمکتی ہوئی بے مہر دھوپ نہ لگنے پائے

کوئی موج کہے یہ مجھ سے:
میں چھان آئی دھرتی امبر، تجھ کو بتا رستے رستے
جھاگ کے پھول ہی کھلتے ہیں ساحل کی ریت پہ میرے بگلے!!

شمیم نسرین (ڈھاکہ)

قوسِ قزح

تخیّل کے سیمیں پردے پر
اے دوست! تیرا دلکش پیکر
ماضی کے حسین ایّام لئے
ہر رات اُجاگر ہوتا ہے

ہر صبح ـــــ نشیلی بادِ سحر
رنگین دریچوں سے آکر
ہر تارِ ربابِ دل کے لئے
مضرابِ الم بن جاتی ہے

جب آتے نظر شبنم کے گہر
آتا ہے خیالِ دیدۂ تر ـــــ

سورج کی روپہلی شوخ کرن
گلہائے شجر سے چھن چھن کر
دیتی ہے مجھے پیغامِ سحر
ایسے میں غمِ دوراں کی قسم
اے دوست! نہ جانے کیوں ہی ہم
تیرا ہی تصوّر آتا ہے
احساس نکھر سا جاتا ہے

ہر شام شفق کی سرخ کرن
جب جھیل کی مضطر لہروں پر
لاکے پھول بچھاتی ہے
فردوسِ نظر بن جاتی ہے
اے دوست مرا احساسِ جنوں
کچھ اور فزوں ہو جاتا ہے!

راتوں کی حسیں تنہائی میں
جب چاند کی سیمیں نرم ضیا
بادل کے عقب سے چھپ چھپ کر
وادی میں حسیں کہساروں پر
اک دامِ فسوں پھیلاتی ہے
اے دوست! مہِ تاباں کی قسم
احساسِ الم بڑھ جاتا ہے
ایسے میں دلِ سیماب صفت
رہ رہ کے تڑپ سا جاتا ہے!

تخیّل کے سیمیں پردے پر
اے دوست! ترا دلکش پیکر
یادوں کے چھلکتے جام لئے
ہر رات اجاگر ہوتا ہے!

سحر انصاری . .

زمین

تمام کائنات گردشوں کا جال ہے
سکونِ جسم و جان و دل محال تھا محال ہے

خلاؤں کی حکومتیں، بلاؤں کی ریاستیں
مہیب تیرہ ساعتیں کہ وقت کی سیاستیں

رواں ہیں بے نشان منزلوں کی سمت قلب و جاں
طلسمِ حرف و صوت کی طلب میں گنگ ہے زباں

قیام بے قیام ہے، ثبات بے ثبات تک
فریبِ ممکنات ہے شعورِ کائنات تک

[illegible]
[illegible]

کافی خواجہ غلام فرید
ترجمہ ظہور نظر

ساونول آئی بہار

پریتم آؤ!
آئی بہار!!
ڈھلے ہوتے آکاش پہ اُودے نیلے بادل کریں سنگار
پیلی بھوری، میلی ریت پہ اجلی اجلی پڑے پھوار
تن میں من میں بن میں چھیڑے پل پل ساون راگ ملہار
پریتم آؤ!
آئی بہار!!
کل کا تپتا جلتا صحرا آج بنا ہے سبزہ زار
آتے جاتے، جاتے آتے ہرنوں کی بدمست قطار
کوئل، مور، پپیہے، مل کر کریں محبت کا پرچار
پریتم آؤ!
آئی بہار!!
پورب پچھم، اتر، دکھن جانے والے سارے یار
لوٹ آئے ہیں اپنی اپنی بستی اپنے اپنے دوار
بس اک میں ہوں جس نے اب تک کیا نہیں پی کا دیدار
پریتم آؤ!
آئی بہار!!
بھوک کے مارے، پریت کے مارے سب کھیلے پائیں قرار
برکھا رت، بن میں یوں آتے جیسے وشنو اوتار
ایسی ہی اک رت میں پایا فرید نے جیون بھر کا پیار
پریتم آؤ!
آئی بہار!!

بہـــزاد لکھنوی

زندگی مغموم ہو کر رہ گئی — عشق کا مفہوم ہو کر رہ گئی
میری چشم آرزو وہ چشم ناز — خادم و مخدوم ہو کر رہ گئی
داستان زندگی اتنی سی ہے — بیکس مقسوم ہو کر رہ گئی
ان کی رحمت کے تصدق جائیے — ہر خطا معصوم ہو کر رہ گئی
کیا ہوا اے کثرت سوز دروں — اک کسک معلوم ہو کر رہ گئی
عشق کی سادہ مزاجی انکی گھات — لازم و ملزوم ہو کر رہ گئی
اے جبیں تو جھک گئی ہر گام پر — داستاں مرقوم ہو کر رہ گئی
کیا شب غم کی سحر ہوتی نہیں — اک کرن معلوم ہو کر رہ گئی

زندگی بہزاد احباب انکے بغیر
کیف سے محروم ہو کر رہ گئی

حجاب امتیاز علی

جینے کا حق

"یہ کھوں کھوں ——" ایک ننھے سے بچے نے اپنی ماں سے کہا۔ میں اس کا ترجمہ کئے دیتی ہوں، کیونکہ مجھے جانوروں سے گہری محبت ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں ان کی زبان بخوبی سمجھنے لگی ہوں۔

ہاں تو ایک ننھے سے پلّے نے اپنی ماں سے کہا۔

"امی —— مجھے بڑی بھوک لگ رہی ہے، جلدی سے مجھے دودھ پلاؤ۔ یا کہیں سے کچھ لا دو۔"

اس کی امی سفید رنگ کی تھی اور اس کے کان سیاہ تھے۔ بے حد نحیف و نزار تھی، ہڈیاں نکل آئی تھیں، آنکھوں میں زندگی کا شکوہ تھا، انسانوں کے خلاف بہت سی شکایات تھیں۔ اس نے غمگین لہجہ میں اپنے بچے سے کہا: "دودھ کہاں سے دوں میرے بیٹے! دو دن سے آپ بھوکی ہوں، میری ٹانگ میں زور کا درد ہے۔"

پلّے نے اپنا منہ ماں کے منہ پر ملتے ہوئے کہا: "تو امی، تم سالن کے نانبائی کے ہاں کیوں نہیں جاتیں، وہ ضرور تمہیں روٹی دیدے گا۔"

کتیا نے ایک ٹھنڈی آہ بھری اور بولی: "نہ بابا، امی کی بیٹے اس کا نتیجہ بھی دیکھ لو ——" یہ کہہ کر اس نے اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا اور رونے لگی۔

پلا اپنی ماں کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ دیکھ کر رہ گیا۔ پھر ماں کی تکلیف پر بے چین ہو کر رونے لگا۔ اپنا سر اس کے پیٹ سے ملتے ہوئے رو کر بولا۔ "میں خوشی سے بھوکا رہوں گا امی۔ لیکن اب تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جاؤ۔ لوگ تمہیں مار ڈالیں گے تو میں کیا کروں گا؟ کھوں کھوں کھوں کھوں۔" وہ زور زور سے رونے لگا۔

کتیا ماں نے زبان نکال کر اپنے بچے کو پیار سے چاٹنا شروع کیا اور کہنے لگی: "یوں رو نہیں میرے بیٹے۔ ذرا میری ٹانگ کا درد کم ہو جائے تو میں تمہارے لئے کھانے کو کچھ لے آتی ہوں ——"

"نہیں، نہیں ——" پلے نے گھبرا کر کہا۔ "اب تم انسانوں کے پاس نہ جاؤ۔ وہ بڑے ظالم ہوتے ہیں۔"

کتیا نے محبت سے کہا: "سب انسان برے نہیں ہوتے بیٹے۔ میں ایک خاتون کو جانتی ہوں جو سڑک کے پار اس اونچی کوٹھی میں رہتی ہے۔ کئی دنوں کی بات ہے، ایک دن میں اس کے باغ میں کسی ہڈی کی تلاش میں گئی تو وہ گلاب کے پودوں کے پاس کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں مارے خوف کے ایک جھاڑی کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا اور مجھے چمکار کر کہا: 'آ جا پیاری کتیا، میں تیری دوست ہوں۔' یہ سن کر میں جھاڑی سے نکل کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس نے مجھے غور سے دیکھا اور بولی: 'ارے یہ تو ماں ہے۔ اس کا پیٹ لٹکا ہوا ہے۔ یہ بھوکی ہے اور اپنے بچوں کو غذا پہنچانے کی فکر میں میرے گھر آئی ہے۔ یہ مہمان ہے۔ اس کی خاطر مدارات ہونی چاہئے۔' یہ

بچوں کی غذا کی تلاش میں آئی ہے۔ اس لئے یہ کارخانۂ قدرت کے ایک تخلیقی کام میں مصروف ہے۔" یہ کہہ کر وہ خاتون اندر گئی اور ایک بڑی سی روٹی لاکر میرے سامنے رکھ دی، روٹی منہ میں دبا کر میں ہمارے لئے لے آئی۔ آدھی تمہیں دی، آدھی خود کھائی پھر تیسرے دن جب میری ٹانگ اس سامنے کے دکاندار نے توڑ دی تو میں لنگڑاتی رہی، اسی خاتون کی کوٹھی میں گئی، وہ سامنے برآمدے میں بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی، میں ایک درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی ہو گئی، اخبار پڑھتے پڑھتے دفعتاً اس کی نظر میری ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر پڑی تو وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی:

"ہائے ہائے۔ کسی ظالم نے اس کی ٹانگ توڑ دی ہے، اس پر تشدد کا مقدمہ چلنا چاہئے۔" اور مجھے چمکارنے اور روٹی دینے لگی۔"

"یہ سن کر پلّے نے ضد کی۔ امی امی۔ وہ شریف عورت ہمیں بھی دکھاؤ۔"

کتیا مسکرا کر بولی۔ "تمہیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہو گی میرا ارادہ ہے آئندہ ہم اسی کے باغ میں پڑے رہیں۔"

پلا بولا۔ "لیکن اس نے مجھے مارا تو؟"

کتیا بولی۔ "وہ ایسی نہیں ہے، ایک دن یہی عورت بازار میں سے گذر رہی تھی، ایک بلی کا بچہ موری میں پڑا رو رہا تھا، اس کی زندگی خطرے میں تھی، وہ اپنی کار میں جھٹ اتر پڑی اور بلی کے بچہ کو اٹھا کر ایک منڈیر پر بٹھا دیا، اس کی ماں بے حد خوش ہوئی اور میاؤں میاؤں کرتی ہوئی اپنے لخت جگر کو منہ میں پکڑ کر چھت پر چلی گئی۔"

"پھر تو مجھے فوراً اس کے گھر لے چلو۔" پلے نے کہا۔

"ابھی نہیں۔ میری ٹانگ ذرا درست ہو جائے۔ پھر لے چلوں گی۔"

پلے نے ضد کی: "نہیں امی، ہمیں اس آدمی کو دیکھنے کا شوق ہے، شاید وہ مجھے کھانے کو مزے کی چیز دے۔ مجھے ابھی لے چلو۔"

کتیا نے بہت انکار کیا، مگر اس کے بچے نے ایک نہ مانی مجبوراً کتیا لنگڑاتی ہوئی اپنے بچے کو لے کر کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی اور ایک سائبان کے نیچے کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی، مگر اسے وہ عورت نظر نہ آئی جس کی تلاش میں وہ آئی تھی۔

اتنے میں باورچی خانہ میں سے ایک موٹا خانساماں باہر نکل آیا، اس کی نظر سائبان کی طرف گئی جہاں کتیا اپنے بچے کو لئے کھڑی تھی اس نے جھٹ زمین پر سے ایک اینٹ اٹھا کر زور سے کتیا پر دے ماری، اینٹ سیدھی اس کی کنپٹی پر جا لگی، کتیا آن واحد میں چکرا کر گر پڑی اور زمین پر تڑپنے لگی۔

ماں کا یہ حال دیکھ کر اس کا ننھا بچہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ ماں نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور کراہتے ہوئے بولی: "فوراً واپس چلے جاؤ۔" اس کا جملہ ختم بھی نہ ہوا تھا کہ خون کا ایک فوارہ اس کنپٹی سے پھوٹ نکلا اور کتیا بے ہوش ہو گئی۔

اکلوتا بد نصیب بچہ مارے خوف کے کانپتا ہوا ایک جھاڑی میں جا چھپا اور اپنی قریب المرگ ماں کو سہمی ہوئی نظروں سے دیکھنے اور کوں کوں کر کے بے اختیار رونے لگا۔

شقی القلب خانساماں باورچی خانہ میں واپس جا چکا تھا اور پتیلی میں سے ایک کوفتہ نکال کر مزے مزے کھانے لگا تھا

اس واقعہ کے کچھ دیر بعد میں ایک فلم دیکھ کر واپس آ رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں نے بچے کی دل خراش چیخیں سنیں، میں نے یک لخت اپنی کار باغ کی روش کے پاس روک لی، ادھر ادھر دیکھا میری نظر ایک کتیا کی لاش پر پڑی، میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے میں کار سے نیچے اتر کر کتیا کی لاش کو جھک کر دیکھنے لگی ہائے! یہ تو وہی کتیا تھی —— وہی ماں کتیا، جو اکثر میرے پاس اپنے ننھے بچے کے لئے روٹی کے سوکھے ٹکڑے لینے آجایا کرتی تھی اور بڑی شرافت اور صبر سے ایک درخت کے نیچے چپ چاپ کھڑی رہتی تھی اس انتظار میں کہ کوئی چیز اسے مل جائے اور جب اسے کوئی روٹی یا ہڈی کا کوئی ٹکڑا مل جاتا تھا تو وہ منہ

(باقی صفحہ ۷۶ پر)

سیدہ احمد رفعت

بدصورت

(ایک نغمہ ابھرتا ہے جو آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے)

برجیس۔ (تعجب سے) ارے میرے دوپٹہ کا یہ حال ـــــ اف اللہ (آواز دیتی ہے) بلقیس! بلقیس!! ...... نہ جانے کہاں لٹکا دیا میرا دوپٹہ کہیں کھرنچ لگی ہے۔ (آواز دیتی ہے) بلقیس!!.... بلقیس۔

بلقیس۔ ہاں باجی، کیا ہے؟

برجیس۔ (طنزاً) ذرا یہاں تشریف لائیے آپ؟

بلقیس۔ کیا ہوا باجی ـــ

برجیس۔ کیسی انجان بن کر معصوم صورت بنا کر پوچھ رہی ہیں (منہ بگاڑ کر) کیا ہوا باجی۔ یہ دیکھو.......

بلقیس۔ ارے یہ کھرنچ کیسے لگ گئی۔

برجیس۔ اف بلقیس آنکھوں میں کس قدر گھستی ہو تم ـ!!

بلقیس۔ سچ کہتی ہوں باجی مجھے نہیں معلوم کہ......

برجیس۔ (بات کاٹ کر) آج صبح تم نے میرا ٹرنک نہیں کھولا تھا؟

بلقیس۔ ہاں صبح کو وہ برقعہ نکالا تھا تمہارا......

برجیس۔ مجھے نہیں پتہ، تم اس کے بدلے اپنا دھانی دوپٹہ دو مجھے۔

بلقیس۔ لے لو باجی،

برجیس۔ مگر وہ ہے کس کام کا، میں نے کتنی احتیاط سے تو رکھا تھا یہ موا شیفون کا دوپٹہ اور تم نے......

بلقیس۔ باجی یہ کپڑا ہی اتنا باریک ہے۔

برجیس۔ تمہارے ان موٹے موٹے کھردرے ہاتھوں سے تو کتنا ہی مضبوط کپڑا ہو گا وہ بھی پھٹ جائے گا۔

بلقیس۔ باجی میں سچ کہتی ہوں کہ میں نے تمہارے کپڑے بڑی احتیاط سے نکالے تھے۔

برجیس۔ اچھا.... اور یہ کیا؟

بلقیس۔ کیا؟

برجیس۔ بیگم صاحب کس ٹھاٹھ سے میرا نکلس پہنے ہوئے ہیں۔

بلقیس۔ اوہ......ارے باجی بات یہ ہوئی.......

برجیس۔ شکل نہ صورت اور نکلس پہننے کا کس قدر شوق ہے، آئینہ میں صورت تو دیکھو اپنی.......

بلقیس۔ باجی بڑا پیارا نکلس ہے یہ!

برجیس۔ منہ بگاڑ کر بڑا پیارا نکلس ہے یہ، میں کہتی ہوں، آخر تمہاری رال کیوں ٹپک رہی ہے میری ہر چیز پر۔

بلقیس۔ میری اچھی باجی ـــ خفا ہو جاتی ہو تم تو.... تھوڑی دیر میں نے پہن لیا تو کون سا گھس گیا۔ یہ نکلس۔

برجیس۔ اس دن اس کا دھاگہ ٹوٹ گیا تھا تو کتنی مصیبت سے پروئے تھے میں نے یہ موتی...... اتنا سا سے.......

بلقیس۔ یہ لیجئے.......ارے میرے اللہ

برجیس (یکدم) دیکھا ـــــ اف میرے اللہ آخر توڑ دیا نا... بلقیس!!
.....(روہنسی ہوکر) سارے موتی بکھر گئے ـــــ

بلقیس۔ یہ ایک موتی آپ کے پیر کے پاس پڑا ہے...... باجی میں کیا
پرووں گی۔

برجیس۔ پھر پرووں گی...... حد ہے بھئی ـــ وہ دیکھو....
اس الماری کے نیچے لڑھک کر گیا ہے بڑا موتی اف، نہ جانے کتنے موتی
اور کم ہو گئے ہیں، کہتی ہوں بلقیس......آخر......

بلقیس۔ اچھی باجی...... امی سے نہ کہئے..... وہ خواہ مخواہ صلواتیں
سنائیں گی مجھے........

برجیس۔ جی آپ امی کو کہتی ہیں، میں ابا جان سے کہوں گی کہ غصہ میں
آکر تم نے اسے نوچ ڈالا تھا۔

بلقیس۔ باجی ـــ!!

برجیس۔ جب ہی تو باز آؤ گی میری چیزیں لینے سے۔

بلقیس۔ باجی......میری اچھی باجی......ارے امی آ رہی
ہیں باجی......

برجیس۔ امی!! امی......ادھر آئیے......

بلقیس۔ باجی.......

(معمولی سے وقفہ کے بعد)

برجیس۔ یہ دیکھئے امی ـــــ یہ سارے نکلس کا کیا کر دیا....
امی۔ کونسا نکلس!!.......

برجیس۔ جی یہ موتی ہے جو میں نے نمائش سے خریدا تھا....
یہ بلقیس نے توڑ کر رکھ دیا.......

امی۔ کیوں؟.......

برجیس۔ جل گرا تھی، کہنے لگی کہ ـــــ

بلقیس۔ میں نے جلکر کب توڑا ہے.......

امی۔ تم نے یہ لیا کیوں تھا؟

بلقیس۔ جی...... یونہی میں نے لیا تھا.......

امی۔ میں کہتی ہوں لڑکی، حرص تو تمہیں ہر چیز کی آتی ہے اگر ہو بھی اس
قابل ـــــ یونہی پہن لیا تھا۔

برجیس۔ اور امی میں نے جب اپنا نکلس مانگا تو جل کر اس کا دھاگہ
توڑ دیا.....

امی۔ اف ـــــ لڑکی کتنی گھنی ہے۔

بلقیس۔ امی ـــــ میں نے تو جل کر نہیں توڑا......

برجیس۔ یہ دیکھئے کس قدر مضبوط ڈورا تھا اس کا......

امی۔ ارے میں سب جانتی ہوں...... جیسی صورت ہے اس کی
ایسی ہی اس کی عادت ہے...... کیا سکھو گی کسی کے گھر جا کر
...... اب کھڑی کیا تک رہی ہو جاؤ یہاں سے دفع ہو جاؤ...

برجیس۔ امی ـــــ میں ایسا ہی ہار اور منگاؤں گی ابا جان سے....

امی۔ ہاں بیٹی منگا لینا ـــــ اور تم نے وہ کپڑوں کو استری کر دی....

برجیس۔ امی ـــــ اتنا تو کام کرنا ہوتا ہے اسکول کا ـــ ادھر
آج کل سالانہ جلسے کی تیاری کرنی ہوتی ہے۔ ڈرامہ ہوگا اسکول میں۔
بلقیس سے کرا لیجئے امی......

امی۔ بلقیس ـــــ بلقیس!!

بلقیس۔ (آتے ہوئے) جی امی!!

امی۔ ذرا وہ کپڑے رکھے ہیں، انہیں استری دیدو اور جلا نہ دینا
کوئی کپڑا سمجھیں۔

بلقیس۔ اچھا امی!

(ساز بجنے لگتا ہے اور پھر ختم ہو جاتا ہے کچھ وقفہ کے بعد)

برجیس۔ (روٹھے ہوئے انداز میں) جائیے ہم نہیں بولتے......
بڑے آئے یہاں سے...... ہاں ہاں خوب مسکرائیے......
بڑے اچھے لگتے ہیں ـــــ جیسے ـــــ اچھا یہ بتائیے کہ آپ مجھے اس
طرح دیکھ لیں تو کیا کریں.......

بلقیس۔ (یکدم) ایک زور سے چٹکی لیں.......

برجیس۔ اوئی اللہ میں ڈر گئی.......

بلقیس۔ بڑی ڈرپوک ہیں باجی.......

برجیس۔ اف تم...... بلقیس تم بڑی وہ ہو....

بلقیس۔ اب چھپانے کی کوشش نہ کیجئے.....

برجیس۔ کیا ہے یہاں...... کچھ بھی نہیں ہے.....

بلقیس۔ یہ !!........ یہ انور بھائی کا فوٹو رکھا ہے یہاں...
برجیس۔ بلقیس جاؤ یہاں سے ــــ بڑی آئی ــــ
بلقیس۔ باجی بہت اچھے ہیں انور بھائی ــــ ہیں نا ــــ کتنی اچھی فوٹو ہے ان کی.......
برجیس۔ تو تجھے کیا؟
بلقیس۔ مجھے کچھ نہیں اوں ــــ میرے بچے سے تو وہ لعل بھائی بنیں گے، انور بھائی، یہ گھونگریالے بال ــــ چوڑی پیشانی ــــ بڑی بڑی آنکھیں۔
برجیس۔ بلقیس!! ــــ خواہ مخواہ کی باتیں نہ بناؤ۔ جاؤ اپنا کام کرو.......
بلقیس۔ لو آپ پھر یہاں اس فوٹو سے باتیں کرنے لگیں۔
برجیس۔ تو تم بھی کر لیا کرو۔
بلقیس۔ میں باجی؟ ــــ
برجیس۔ ارے ہاں سنو بلقیس، تمہارے رشتہ کے لئے ایک پیغام آیا ہے.......... واہ شرما گئی ــــ ارے میں کیا کہہ رہی ہوں.........؟
بلقیس۔ ایں باجی ــــ
برجیس۔ تیرے رشتہ کے لئے پیغام آیا ہے۔
بلقیس۔ تیرے لئے!
برجیس۔ ہاں پگلی تیرے لئے! ــــ کیوں تو سمجھتی ہے کہ تیرے لئے شادی کا پیغام ہی نہ آئے گا۔ پگلی کہیں کی.......
بلقیس۔ باجی ــــ میری صورت.......
برجیس۔ صورت کیا ہوائی ہے تیری صورت میں، اچھی خاصی آنکھیں ہیں، رنگ ذرا سا سانولا ہے تو کیا ہوا ــــ اور کیا بات ہے ــــ واہ ــــ خاصا کتابی ــــ خیر کتابی نہ سہی اچھا خاصا چہرہ ہے تیرا ــــ خیر ــــ چہرے مہرے کا کیا دیکھنا ــــ ابا جان کے کوئی دوست ہیں، ان کا لڑکا ہے ــــ بہت اچھا خاندان ہے، اور ــــ میٹرک پاس ہے ــــ کسی کمپنی میں ملازم ہے لڑکا ــــ اور ہاں ڈیڑھ سو روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی ہے ــــ بس ٹھیک ہے

چپ کیوں ہو گئی ــــ ارے واہ اچھا خاصا رشتہ ہے، اس سے اچھا رشتہ اور کیا ملے گا تجھے.......
بلقیس۔ انور بھائی تو نہیں۔ اے پاس نہیں باجی.......
برجیس۔ ہاں تو کیا ہوا ــــ میری تو ان سے بچپن ہی میں منگنی ہو چکی ہے۔
بلقیس۔ اور وہ اعلیٰ تربیت حاصل کرنے امریکہ بھی گئے ہوئے ہیں امریکہ ہی سے تو یہ فوٹو بھیجا تھا انہوں نے؟ گھنگریالے بال ــــ بڑی بڑی آنکھیں۔
برجیس۔ بلقیس! ــــ آخر ابا جان تیرا ایسا ویسا رشتہ تھوڑا ہی کر دیں گے، کچھ دیکھا ہی ہوگا لڑکے میں ــــ ارے ہاں یہ تو میں بھول ہی گئی۔ لڑکے کا رنگ تیرا ہی جیسا سانولا ہے.......

(نغمہ ابھرتا ہے اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے)
(شہنائی پر ایک نغمہ ابھرتا ہے جو آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے)

ــــ (٭) ــــ

زاہد۔ (حساب لگاتے ہوئے) تیرہ اور سات بیس اور سات ستائیس ....اور آٹھ.......آٹھ.........
بلقیس۔ پینتیس.......
زاہد۔ ہاں پینتیس....... اور چار انتالیس۔
بلقیس۔ یہ کھڑکی بند کر دوں.......
زاہد۔ (اپنے خیال میں) انتالیس اور تین..... بیالیس۔
بلقیس۔ آج کافی سردی ہے ــــ یہ کھڑکی بند کر دوں۔
زاہد۔ بیالیس اور ــــ اف کیا مصیبت ہے، تم آخر ہر وقت میرے سر پہ کیوں سوار رہتی ہو.......
بلقیس۔ آپ کو ذرا کام ہو رہا ہے۔ اور یہ کھڑکی کھول رکھی ہے، سردی کافی ہے.......
زاہد۔ ذرا کام ہو رہا ہے ــــ کھڑکی کھول رکھی ہے سردی کافی ہے میں کہتا ہوں کہ آخر مجھے یہ کام بھی تو کرنا ہے کہ نہیں۔
بلقیس۔ کام کے پیچھے آپ اپنی صحت کا بھی خیال نہیں کرتے۔
زاہد۔ صحت سے زیادہ یہ کام ضروری ہے..... سمجھیں، اف ــــ

بلقیس۔ کتنی دیر سے چائے تیار رکھی ہے، سب ٹھنڈی ہو جائیگی

ناہد۔ چائے صحت ــــ سردی، اف !! ــــ میں کہتا ہوں کہ ہو جانے دو ٹھنڈا چائے کو ــــ ادھر تو دفتر والوں نے میرا ناطقہ بند کر رکھا ہے، کام گھر پر لیکر آتا ہوں، تو تم میرا ناطقہ بند کر دیتی ہو۔

بلقیس۔ آپ تو خواہ مخواہ ناراض ہو جاتے ہیں ــــ یہ چائے پی لیجئے

ناہد۔ لاؤ بھئی ــــ (جیسے ہی کر کے زور سے پیالی رکھ دے)

بلقیس۔ اتنی جلدی کیا ہے ؟ اف جلتی ہوئی پیالی منہ کو لگا لی ــــ زبان تو نہیں جلی آپ کی ؟ ــــ سارے ہونٹ لال ہو گئے ــــ یہ لیجئے رومال ــــ ساری چائے گر پڑی.....

ناہد۔ تمہاری جلد بازی بس....... میں کہتا ہوں کہ یہ جتنا کر لیتا تو اطمینان سے چائے پیتا...... مگر تم......

بلقیس۔ تیسری بار گرم کر کے لائی تھی میں.......

ناہد۔ اوہ تو کونسا کمال کیا تھا تم نے.......

بلقیس۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ........

ناہد۔ یہ مطلب نہیں وہ مطلب نہیں ــــ سر میں درد الگ ہونے لگا۔

بلقیس۔ میں آپ کا سر دبا دیتی ہوں...... واقعی اتنی محنت کرتے ہیں...... صبح سے شام تک دفتر میں اور پھر شام کو گھر آ کر بھی چین نہیں ملتا آپ کو......

ناہد۔ چین !! (ہنستا ہے) ــــ وہ چائے کی پیالی اٹھاؤ۔

بلقیس۔ یہ لیجے......

ناہد۔ بلقیس !!...... سوچتا ہوں کاش میں ایک خوبصورت پرندہ ہوتا......!!

بلقیس۔ خوبصورت پرندہ !!

ناہد۔ ہاں...... تم حیرت سے کیا تکنے لگیں میرے چہرے کو...... اگر میں ایک پرندہ ہوتا تو تمہیں اپنے پنکھوں پہ اٹھا کر اس کائنات کی وسعتوں سے اتنی دور لیجاتا جہاں ہی چین ہوتا ہے۔ (ہنستا ہے) جس دن سے ہماری شادی ہوئی ہے، کیا تمہیں چین نصیب ہے ؟

بلقیس۔ کیوں نہیں، مجھے کون سا چین نصیب نہیں ؟

زاہد۔ (ہنستا ہے) یہ صبح شام گھر کے کام دھندوں میں پھنسا رہنا، چولہے میں دھوں دھوں، پھوں پھوں کرنا، کپڑے دھونا ...... گھر کی صفائی...... ایسے گھر کی صفائی......

بلقیس۔ گھر کے سارے کاموں سے تو میرا دل بہلتا ہے...... اور آپ جو صبح سے شام تک......

زاہد۔ مجھے احساس ہے بلقیس...... کہ جو سکھ اور چین ایک لڑکی کو شادی کے بعد میسر ہونا چاہئے، وہ تمہیں اب تک نہیں ملا....

بلقیس۔ واہ...... آپ بھی عجیب ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ مجھے بے آرامی کیا ہے...... میرا اپنا گھر ہے...... آپ ہیں۔ یہ دیکھئے...... چھوٹا سا ریڈیو سٹ...... یہ شیشے کی الماری...... یہ بلوری سٹ اور گلدستوں کا سٹ۔

ناہد۔ ہا ہا ہا ہا...... کس قدر بھولی ہو تم...... بلقیس !!...... اور کس قدر حسین ہیں تمہارے جذبات...... بلقیس۔ کام کی زیادتی کبھی مجھے چڑچڑا کر دیتی ہے.... تم میری کسی بات کا خیال نہ کیا کرو......

بلقیس۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ، میں آپ کی کسی بات کا خیال بھی کیسے کر سکتی ہوں...... ؟

ناہد۔ بلقیس !!...... تم کتنی اچھی ہو..... زندگی میں تم جیسی ساتھی اگر کسی کو مل جائے۔ تو سمجھو وہ سب سے بڑا خوش قسمت ہے......

بلقیس۔ لیجئے اب آپ نے مجھے بنانا شروع کر دیا....

ناہد۔ ایک خوشخبری سنو گی۔

بلقیس۔ کیا ؟

ناہد۔ اگلے ماہ مجھے ایک مہینہ کی چھٹی مل رہی ہے۔

بلقیس۔ سچ !!

ناہد۔ اگلے ماہ کی آٹھ تاریخ کو ہم کراچی میں ہوں گے۔ اف تین سال بعد تم اپنے عزیزوں، ماں باپ سے مل سکو گی، تین سال بعد....

بلقیس۔ (سرگوشی میں) کتنے اچھے ہیں آپ......!!

(سازدھیرے دھیرے شروع ہوکر ختم ہوجاتا ہے)

امی۔ بیٹی...... آخر وہ تمہارا خاوند ہے......

برجیس۔ جی! خاوند ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر جائز اور ناجائز دباؤ مجھ پر ڈالا جائے ـــــ میں کہتی ہوں امی آپ سوچئے تو...... کہ اگر وہ مجھ سے یہ امید کرتے ہیں کہ میں ان کی ناز برداریاں اٹھاؤں تو کیا ان کا فرض نہیں ہے کہ وہ بھی میرا دل رکھیں۔

امی۔ کچھ بھی ہے۔ لیکن ـــــ

برجیس۔ آپ کو کیا معلوم امی۔ تین سال سے میں جس طرح ان کے ساتھ گزار رہی ہوں، میرا ہی دل جانتا ہے پہلے تو بڑا تیر مارا تھا تین تین نوکر رکھ چھوڑے تھے اب ایک بھی نہیں...... ـــ

امی۔ بیٹی نوکروں کے بل پر گھر نہیں چلتا۔

برجیس۔ اور امی...... نوکر موئے تو بس دماغ کے خراب ہوتے ہی ہیں۔ جہاں ذرا سی چکنی چپڑی باتیں کیں اور صاحب کا بھی دماغ خراب کر دیا۔ یعنی آپ کو میں کیا بتاؤں۔ کئی دفعہ تو میری ان سے نوکروں کے معاملہ پر اتنی سخت لڑائی ہوئی ہے...... آپ ہی سوچئے کہ اگر کوئی نوکر نقصان کر دے تو اسے کچھ نہ کہا جائے گا۔ میرے جہیز میں جو آپ نے بلورین جگ دیا تھا، وہ موا ایک نوکر تھا اس نے توڑ دیا...... تو صاحب بہادر الٹا مجھ سے لڑے۔

امی۔ بیٹی...... کیا چھوٹی چھوٹی باتوں پر......

برجیس۔ آپ چھوٹی باتیں کہتی ہیں، میں کہتی ہوں کہ میرا تو جیسے انہیں مطلق خیال ہی نہیں۔ شام کو دفتر سے آئیں گے، سارا سارا دن برج ہو رہی ہے...... اور پھر دوستوں کی دعوتیں تو ہر ہفتہ لے لو...... کوئی ایسا خوش قسمت ہفتہ جاتا ہوگا جو کوئی دعوت نہ ہو......

امی۔ اب آخر اس کے تعلقات ہیں بڑے آدمیوں سے......

برجیس۔ خاک بڑے آدمی...... ایک ہزار کے قریب تنخواہ ملتی ہے، اور سب دعوتوں کی نذر ہوتی ہے، یا پھر...... اور وہ موئی ایک کار ہے...... جب کبھی سوچتی ہوں کہ Shopping کو جاؤں گی، اور معلوم ہوا کہ آج شاہد صاحب کے یہاں Dinner ہو گئی ہے...... آج عزیز صاحب اسے پکنک پر لیکر جائیں گے یعنی اپنے گھر کی کار اور بیوی کو یہ حق نہیں کہ وہ اسے استعمال کر سکے۔

امی۔ بیٹی یہ سب تمہاری خطا ہے......

برجیس۔ اور اس میں انور کی کوئی خطا نہیں۔ امی آپ تو...... سوچئے تو سہی کہ میری آخر کونسی ناز برداری اٹھائی جاتی ہے ...... نمائش آئی بڑا کمال کیا۔ مجھے ساتھ لے گئے وہاں جیولر کی دوکان پر میں نے جھمکے پسند کئے تو وہ کہ بھوں چڑھا لیں کہ پرانا فیشن ہے...... میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے تم پر کیا اچھے معلوم ہوں گے۔ امی بھلا بتائیے، بات بات پر میری توہین کرتے ہیں۔

امی۔ اب تم جو یہ سب کچھ سنا رہی ہو۔ تو مجھے تو ہر ہفتہ تمہاری ڈاک میں یہ ساری تفصیل معلوم ہوتی رہتی ہے۔

برجیس۔ اور اس کے باوجود آپ کہتی ہیں کہ میری خطا ہے......

امی! جب تک انور سے ان سب باتوں کا فیصلہ نہ ہوگا میں نہ جاؤں گی۔

امی۔ پاگل ہوئی ہو تم ـــــ تمہیں آئے ہوئے ایک ہفتہ گذرا ہے اور ہر وقت انور کی برائیاں۔ ہر وقت اس سے نفرت کا اظہار آخر تمہاری دوسری بہن بھی ہے...... مہینوں ہوئے اسے آئے ہوئے آج تک ایک شکوہ یا شکایت کا لفظ منہ پر نہیں آتے دیکھا میں نے۔

برجیس۔ جی۔ تو آخر زاہد بھائی میں خوبیاں بھی تو ہیں۔

امی۔ بیٹی...... خوبیاں بیوی میں ہونی چاہئیں۔ زاہد کو میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی دفعہ بگڑتے دیکھا ہے، مگر آج تک بلقیس کے ماتھے پر بل پڑتے نہیں دیکھا، سوچتی ہوں کہ بلقیس اتنی خوبصورت نہیں۔ لیکن اس کا دل کس قدر خوبصورت ہے...... تم آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر اپنی اصلی صورت

کو فراموش کر چکی اور اس نے اپنی اصلی صورت کو پہچان لیا....

برجیس۔ امی!!

امی۔ وہ بلقیس آ رہی ہے...... کیا بات بیٹی....؟

بلقیس۔ کچھ نہیں امی!!.......

امی۔ چہرہ اترا ہوا سا ہے تمہارا......

بلقیس۔ میرا چہرہ نہیں تو...... امی!!...... بات یہ ہے کہ ان کے دفتر سے تار آیا ہے....

امی۔ ناہید کے؟

بلقیس۔ جی ہاں انہیں فوراً ڈیوٹی پر بلایا ہے....

امی۔ پھر!!؟

بلقیس۔ میں آج شام جا رہی ہوں....

امی۔ آج شام...... لیکن چھٹی ختم ہونے میں تو ابھی دس دن باقی ہیں۔

بلقیس۔ دفتر میں ان کی کوئی ضرورت پیش آگئی ہے....

امی۔ تو انہیں جانے دو...... تم کچھ دن بعد چلی جانا....

بلقیس۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے امی!!......

امی۔ میری بچی!...... تمہارے دل کی چمک اور رعنائی...... اس وقت تمہارے چہرے پر شفق کی طرح کھل رہی ہے۔ میں یہ سمجھتی رہی کہ تمہارا سانولا رنگ اور تمہاری چھوٹی آنکھوں نے تم کو بدصورت بنا دیا ہے...... مگر مجھے آج معلوم ہوا کہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ کتنی خوبصورت...... اور...... جسے سب نے خوبصورت سمجھا وہ...... وہ کس قدر بدصورت!

برجیس۔ امی!!......

امی۔ بیوی کے چہرے کی تابندگی سے زیادہ دل کے نورانی جذبات ایک خاوند کو خوبصورت معلوم ہوتے ہیں......

(اور ساز دھیرے دھیرے سروں میں شروع ہو کر ختم ہو جاتا ہے)

آہ! میرزا احسن کربلائی

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ لکھی جا رہی ہے کہ سندھی کے معمر اور کہنہ مشق ادیب و شاعر اور ڈرامہ نگار میرزا احسن کربلائی ۶۰ سال کی عمر میں ۲۸ اپریل ۱۹۶۲ء کو انتقال کر گئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم ادارۂ مصنفین پاکستان کے باقاعدہ ممبر تھے، اور ریڈیو پاکستان حیدرآباد پر بحیثیت اسکرپٹ رائٹر کام کرتے تھے، احسن کربلائی کی وفات نے سندھی ادب میں ایک جگہ چھوڑی ہے — وہ فی الحال نہیں بھر سکتی۔

مرحوم نے اپنے پیچھے ایک بڑا کنبہ چھوڑا ہے، جس کے لئے ادارہ مصنفین کو مختلف اخبارات نے اپنے ایڈیٹوریل لکھے ہیں کہ ان کو کچھ نہ کچھ امداد ملنی چاہئے۔

(ادارہ)

جسیم الدین
ترجمہ: سید یونس ناصر

کراچی اور ملتان میں چند روز

میں پھر کراچی آ گیا ہوں!

انجمن مصنفین پاکستان کے دفتر میں کئی پرانے دوست احباب سے ملاقات ہو گئی۔ مثلاً دوہوں کے سبک سجل سروں میں سدا مست رہنے والے جمیل الدین عالی، کوی ابن انشاء، صحافی اور ادیب جمالی اور کئی دوسرے۔ نئے رفیق سید احمد رفعت کو بھلا کیسے بھول سکتا ہوں۔ آپ تقریباً سو عدد ڈراموں کے مصنف ہیں۔ ان میں سے تین چار اسٹیج ہو چکے ہیں اور باقی ریڈیو پاکستان سے وقتاً فوقتاً نشر ہوتے ہیں۔ ان جیسا ہنس مکھ اور سدا بہار انسان بہت کم دیکھا ہے۔ دوسروں کا کام اپنا سمجھ کر کر دیتے ہیں۔ اور پیشانی پر بل تک نہیں لاتے ـــ ان سے میں نے متعدد کام لئے۔ یہ لوگ تنخواہ دار ملازموں کی طرح روزانہ سہ پہر کو انجمن مصنفین کے دفتر میں آ کر اپنا اپنا کام تندہی سے انجام دیتے ہیں۔ حالاں کہ ان میں سے کوئی بھی تنخواہ دار ملازم نہیں۔ میرے یہ دوست احباب پاکستان کے تمام ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لئے ایک عظیم ادارہ کو مستحکم بنا رہے ہیں۔ سبھوں کے پیش نظر ایک ہی نصب العین ہے، ایک ہی مقصد ہے؛

کچھ دن سے میں گٹھیا کے مرض میں مبتلا ہوں۔ ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق روزانہ صبح پورے کراچی سے تقریباً پندرہ میل دور منگھو پیر جاتا ہوں۔ اور تھوڑی دیر تک گرم چشمے میں جسم کو ڈبو کر بیٹھتا رہتا ہوں۔ یہاں پانچ چھ عدد گرم چشمے ہیں۔ ان میں سے ایک چشمے کے چاروں طرف دیواریں کھڑی ہیں اور اوپر ٹین کی چھت ہے۔ اس چشمہ کا پانی خاصا گرم رہتا ہے۔ موسم سرما میں گرم پانی سے غسل کرنا تو کوئی بات نہیں۔ لیکن گرمیوں میں ممکن ہی نہیں۔ غسل کرنے کے لئے فی کس چار آنے پیسے وصول کرنے کے لئے وہاں ہر وقت ایک آدمی متعین ہے۔ اس کی دیواریں جگہ جگہ سے کمزور ہو گئی ہیں لیکن ادھر کسی کی توجہ نہیں جاتی۔

اس چشمہ کے علاوہ دیگر چشموں میں غسل کرنے کے لئے پیسے نہیں دینے پڑتے۔ ان کا پانی بھی زیادہ گرم نہیں ـــ البتہ گندگی عام ہے ان چشموں میں جذامی اکثر غسل کرتے ہیں۔ عام آدمی نہیں آتے ـــ منگھو پیر کے اس گرم چشمے کے پانی میں بیٹھ کر کتنی باتیں یاد آتی ہیں ترکی میں بھی ایسے ہی کئی گرم چشمے میں نے دیکھے ہیں۔ ان چشموں کے آس پاس حکومت نے صحت گاہ بھی تعمیر کرائی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو خاصی آمدنی ہو جاتی ہے۔ دور دور سے گٹھیا کے مریض یہاں آتے ہیں۔ گرم چشموں میں غسل کرتے ہیں اور صحت گاہ میں قیام بھی کرتے ہیں فرانس میں بھی گرم پانی کا چشمہ ہے۔ ڈاکٹروں نے اس چشمے کے پانی کا کیمیاوی تجزیہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ اگر اس میں غسل کیا جائے یا

اس کو پیا جائے تو فلاں فلاں مرض دور ہوتا ہے۔ مختلف ممالک سے مریض اکثر اس چشمے کے قریب ترین ہوٹل میں قیام کرتے ہیں۔ اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے مطابق اس کا پانی استعمال کرتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے ضلع چاٹ گام میں باڑک کنڈ نامی ایک مقام ہے جہاں گرم پانی کا ایک چشمہ ہے جس کے اوپر سے ہمیشہ شعلے نکلتے ہیں۔ منگھو پیر کی طرح یہاں بھی دور دور سے ہندو تیرتھ یاتری آکر اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق اس کے پانی میں غسل کرتے ہیں اور اس طرح وہ اپنے گناہ دھو ڈالتے ہیں۔ یہ گرم چشمے دراصل قومی سرمایہ ہیں۔ قدرت کی طرف سے ملے ہوئے اس تحفہ کا آخر ہم کب تک غلط استعمال کرتے رہیں گے۔! یہاں کے پانی کا بھی ترکی اور فرانس کی طرح تجزیہ کرکے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ اس سے فلاں فلاں امراض دور ہوسکتے ہیں۔ یہاں بھی ترکی کی طرح صحت گاہ تعمیر کی جاسکتی ہے۔ اگر ایسا کیا گیا تو نہ صرف یہ کہ ہمارے ملک کے چاروں طرف سے مریض آکر اس میں قیام کریں گے۔ بلکہ دیگر ممالک سے بھی لوگ آسکتے ہیں۔ اور اس طرح ہم زرمبادلہ حاصل کرسکتے ہیں۔ صحت اور سماجی بہبود کے وزیر برکی صاحب کے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں۔ کاش کوئی اُن تک میری یہ درخواست پہنچا دے!

ان بے آب وگیاہ سڑکوں پر اور پہاڑوں کے کنارے کنارے چلتے چلتے موہنجو دارو کی قدیم تہذیب کی باتیں بھی یاد آجاتی ہیں۔ یہ پہاڑ جیسے اُن قدیم انسانوں کی پناہ گاہیں ہیں۔ اگر میں یہاں کھڑا ہوکر انہیں آواز دوں تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے میرے پاس آئیں گے۔ اور باتیں کریں گے۔ کبھی کبھی میں گاڑی سے اُتر کر پیدل بھی چل پڑتا ہوں۔ یہاں کتنے مجبور، بے کس اور بے بس انسان بستے ہیں۔ ان کے گھروں میں مکھیاں یلغار کرتی ہیں، فوج در فوج! ان کے بچے گندے، کمزور اور غلیظ ہیں۔ ان کے جسم کی ایک ایک ہڈی کو شمار کرنا مشکل کام نہیں۔ بعض بعض گھروں میں دودھ دینے والی گائیں بھی کھونٹی سے بندھی ہوئی ہیں — لیکن ان کے بچے دودھ نہیں پی سکتے۔ کیوں کہ دودھ بیچ کر ہی تو ان کے ماں باپ ان کی خوراک مہیا کرتے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو سمجھتا ہے کہ مغربی پاکستان میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ کاش وہ لوگ آکر ان بستیوں کو بھی دیکھ جائیں۔

آزادی سے پہلے ڈھاکہ میں ہر وقت مچھر بھنبھنایا کرتے تھے لیکن پاکستان بننے کے فوراً بعد ہی صوبائی وزیر صحت بہار صاحب نے شب و روز کی جدوجہد سے ان کا صفایا کردیا۔ ڈھاکہ میں جب یہ ممکن ہوسکتا ہے تو کیا کراچی کی بستیوں سے مکھیوں کا صفایا نہیں کیا جاسکتا ہر سال ان بستیوں میں ان گنت جانیں ہیضہ، ٹائیفائڈ اور چیچک سے ضائع ہوجاتی ہیں۔

چھوڑیئے ان باتوں کو۔ کراچی کے دوران قیام میں ایک دن الآنا صاحب کی طرف سے چائے نوشی کی دعوت ملی۔ انھوں نے راقم الحروف اور اُردو کے عظیم شاعر حضرت جوش کا شاندار خیر مقدم کیا۔ الآنا صاحب کو اللہ نے دھن دولت سے خوب نوازا ہے۔ آپ کراچی کارپوریشن کے میئر بھی رہ چکے ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے پاکستانی شعراء کے منتخب کلام کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو گلڈ کے اشاعت گھر سے کتابی شکل میں شائع ہوگیا ہے۔ اس میں سندھی، پشتو، اور پنجابی کے لوک گیتوں کے ترجمے بھی شامل ہیں جن کو پڑھ کر روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

اُس دن الآنا صاحب کے دولت کدے پر حاضر ہوا۔ کراچی کے اور بھی دیگر ادیب و شاعر، عالم و فاضل اور دانشور مدعو تھے۔ میری

اور جوش صاحب کی نشست ایک ساتھ نمایاں جگہ پر تھی۔ اردو شاعروں میں جوش صاحب کا مقام بہت بلند ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی ان کے قلم سے شعروں کے چشمے رواں دواں ہیں۔ پاکستان کے ممتاز قانون داں جناب بروہی صاحب نے ہمیں پھولوں کے ہار پہنائے اس کے بعد اہل خانہ کی درخواست پر انھوں نے مختصر سی تقریر بھی کی۔ اس سے پہلے بھی دو ایک بار بروہی صاحب کی عالمانہ تقریریں سننے کا مجھے اتفاق ہوا ہے۔ ایک حسین اور خوبصورت نظم کی طرح ان کی تقریر بھی لوگوں کے دلوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی تقریروں میں علم و دانش کا سمندر چھلکتا ہے۔ ان کی تقریریں سطحی نہیں ہوا کرتیں۔ ان تقریروں کو سن کر سامعین بھی غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بروہی صاحب نے اپنی تقریر میں بہت کچھ کہا۔ اس وقت میں ان کی ایک ایک بات کو دہرا نہیں سکتا۔ البتہ ان کی ایک بات کا جس کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا۔ ذکر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ انہوں نے کہا تھا۔ "کسی بھی ملک میں دولت بڑا ادیب پیدا نہ کر سکی اچھا ادیب بننے کے لئے سخت ریاض کی ضرورت ہے۔ مختلف ملکوں سے ہمیں بہت سی چیزیں حاصل کرنی ہیں۔ مثلاً ہمیں یورپ کی موسیقی کو اپنانا ہے۔ اس میں دھمک اور گرج ہے ــــ اور ہماری پاک بھارت کی سنگیت میں نہ گرج ہے نہ دھمک ــــ اسے سن کر ہم خواب میں گم ہو جاتے ہیں۔" بروہی صاحب کے ان خیالات سے مجھے اتفاق نہیں۔

تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ادیبوں کی حالت بھی بہتر ہوتی جاتی ہے۔ راجہ وکرمادت اور شہنشاہ اکبر کے عہد حکومت میں پاک بھارت کے ادیبوں کی خوش حالی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وینس کے راستے یورپ کو جو چیزیں ایشیا سے بھیجی جاتی تھیں۔ اور ان کے عوض وینس کو جو ٹیکس وصول ہوتا تھا۔ اس سے اس ملک کی خوشحالی میں جو اضافہ ہوا۔ وہ اظہر من الشمس ہے۔ اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وینس کے معبدوں اور محلوں کو رافیل اور ٹنٹارٹو کی تصویروں سے زینت بخشی گئی۔ غرضیکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اقتصادی ترقی کے ساتھ ساتھ ادب بھی پھلتا پھولتا ہے۔ ایک بات اور، ہمارے ملک کے سنگیت میں محض خواب اور نشہ نہیں ہے، پدما ندی کی چنچل لہروں کو چھو کر مانجھیوں کے گلے سے جو نغمہ پھوٹتا ہے۔ شاید اسے بروہی صاحب نے نہیں سنا۔ بروہی صاحب ملک کے مختلف کاموں میں رہنے کی وجہ سے سنگیت سنتے ہی خواب میں کھو جاتے ہیں۔ اور یورپ میں انہیں چونکہ فرصت کے اوقات بہت ملتے ہیں اس لئے ان کے کانوں کو وہاں کا ہر نغمہ بھلا لگتا ہے۔ ہمارے یہاں کے استادی گانے وہاں کے استادی گانوں سے قطعی مختلف ہیں۔ وہاں کے استادوں کے مقابلے میں زیادہ آزادی نصیب نہیں۔ ہمارے یہاں کے استاد اپنی طبیعت کے مطابق نئے نئے سُر تخلیق کرتے ہیں، ان گانوں کو سُن کر دیوانے آنکھوں ہی آنکھوں میں نہ جانے کتنی ہی راتیں کاٹ دیتے ہیں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بروہی صاحب سے اس موضوع پر تبادلۂ خیالات کروں۔ لیکن وہاں موقع نہ مل سکا۔ بہر کیف جب مجھ سے کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی تو میں نے اشارے ہی اشارے میں بہت کچھ کہہ دیا۔ میں کھڑا ہو گیا اور بروہی صاحب اور اہل خانہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا: "بروہی صاحب پاکستان کے ممتاز قانون داں ہیں اس لئے انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان میں آئینی جھلکیاں ہیں اور اُن جیسا کوئی قانون داں ان پر کچھ تبصرہ کر سکتا ہے۔ اس وقت اگر یہاں اُن جیسا ظریف، دانشور اور عالم ہوتا تو ان کے خیالات پر دلچسپ تبصرے سننے میں آتے لیکن افسوس کہ ہم اس سے محروم رہے۔ بروہی صاحب کی فاضلانہ تقریر پر میں ان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔" اس کے بعد میں نے ادب پر چند جملے اور کہے اور اس کے بعد تقریر ختم کر دی۔

چائے نوشی کے بعد مشاعرے کا دور شروع ہوا۔ مشاعرے میں پاک بھارت کے سارے شاعر اپنا کلام سُنا کر روحانی مسرت محسوس کرتے ہیں، خواہ یہ شاعر ہندی یا اُردو کے ہوں، گجراتی، پنجابی کے یا پشتو کے۔ مشاعرہ در اصل حصولِ علم کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ امریکہ اور یورپ کے شعرا کو موزوں کلام لکھنے کے لئے سخت جد و جہد کرنا پڑتی ہے۔ لیکن اُردو زبان کے شعرا کمسنی ہی سے مشاعروں میں شریک ہو کر شعروں کو سیکھنے لگتے ہیں۔ اور کلام بھی موزوں کہنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے کسی حصّے میں شاعری اور مشاعرے اتنی محبت کا مظاہرہ نہیں کیا جاتا جیسا مظاہرہ ہمارے اُردو داں بھائیوں کی طرف سے دیکھنے میں آتا ہے مشاعرہ اسلامی ممالک میں عام ہے۔ ترکی، مصر، عرب، ایران اور کابل تک میں مشاعرے منعقد ہوتے ہیں۔ لیکن مشرقی پاکستان کے بنگلا بولنے والوں میں اب تک اس کا رواج نہیں ہوا۔ ہم نے بارہا اُردو کی طرح بنگلہ مشاعرے منعقد کئے۔ مگر کسی نے ہمت افزائی نہیں کی۔ مغربی پاکستان میں مشاعرے عام ہیں۔ شادی بیاہ، سالگرہ اور دیگر تقریبات میں بھی مشاعرے ہوتے ہیں۔ مشاعروں میں شرکت کے لئے جوش و خروش کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ٹکٹ دستیاب نہ ہونے پر سینکڑوں سامعین پنڈال کے باہر جمع ہو جاتے ہیں اور ساری رات جاگ کر شاعروں کے کلام سے محظوظ ہوتے ہیں۔

خیر جانے دیجئے ان باتوں کو۔ آغا صاحب کے دولت کدے پر جو مشاعرہ منعقد ہوا۔ اُس میں اُردو کے علاوہ بنگلا، گجراتی پشتو، پنجابی اور انگریزی میں بھی کلام سنایا گیا۔ جوش صاحب کی نظم سُن کر مجھے بہت دن پہلے کی ایک بات یاد آگئی۔

رات کے آٹھ بجے تھے۔ میں یوں ہی تفریحاً سلیم اللہ فہمی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کی میز پر اُردو کتاب رکھی ہوئی تھی۔ میں نے ادھر اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ "کس کی کتاب ہے یہ؟"

انھوں نے کہا: "اُردو کے عظیم شاعر جوشؔ ملیح آبادی کی!"

میں نے ان سے کہا: "ذرا ان کے اشعار سنایئے اور پھر بنگلا میں ترجمہ کر کے مطلب سمجھایئے۔" اس وقت سامنے کی کھڑکی سے چاندنی ہلکی ہلکی روشنی اندر آرہی تھی اور سامنے پھولدان میں رکھے ہوئے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو ہواؤں کی مست خرامی میں مل کر مجھے دیوانہ بنا رہی تھی۔ فہمی صاحب نے پان کی گلوری منھ میں رکھی۔ پھر اشعار سنانے لگے ـــــ ان اشعار میں انقلاب کے نعرے تھے۔ بغاوت کی چنگاریاں تھیں اور آزادی کی لگن تھی ـــ نظم کے ایک ایک شعر میں پرانی تاریخ دہرائی گئی۔ اس کے بعد فہمی صاحب نے جوشؔ کی ایک اور نظم سنائی ـــ جس کا عنوان تھا: "انقلاب!" اس نظم میں بھی بغـــادت کا پیغام دیا گیا ہے۔ یہ نظم ختم ہوئی تو انھوں نے ایک اور نظم سنائی: "حُسن اور مزدوری":

ایک دوشیزہ سڑک پر، دھوپ میں ہے بے قرار ـ چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا ـ آنکھ میں آنسو بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر، زلفیں اٹی ہیں خاک میں ـ نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
ہو رہا ہے جذب مہرِ خونچکاں کے روبرو ـ کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت ـ ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزوِ سنگ و خشت
پی رہی ہیں سُرخ کرنیں مہرِ آتش بار کی ـ نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی

خسم کہ بادل خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے — عارضِ رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے

وغیرہ وغیرہ

اگر اس لڑکی کو تعلیم ملتی تو ایک دن وہ کسی شہزادے کی محبوبہ بن سکتی تھی۔ یا پھر جہدِ آزادی کی راہوں پہ چلنے والے نوجوان سورماؤں کے دلوں کو اپنے نغموں سے شاد کام کر سکتی تھی۔ مگر افلاس نے اس کو کہیں کا نہ رکھا۔ قحط اور اکال میں پلنے والی یہ لڑکی اپنے معاشرے کو اور پیچھے لئے جا رہی ہے۔

ایک نظم کے بعد دوسری نظم، پھر تیسری، پھر چوتھی —— کہاں تک لکھوں: جو کچھ میرے ذہن میں رہ گیا تھا اس کی چند جھلکیاں میں نے پیش کر دیں۔ جوش صاحب کی نظمیں پڑھ کر اور سن کر دلوں کو کتنا سرور ملتا ہے، اور آج وہی جوش صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے ہیں بس تھوڑی ہی دیر میں وہ کچھ سنائیں گے۔ مگر مترجم کے فرائض کون انجام دیگا۔ آج کی محفل میں سلیم اللہ فہمی جو نہیں ہیں۔ وہ ہوتے تو شاید ساتھ ہی ساتھ میں ترجمہ بھی سنا جاتا۔

جوش صاحب سنا چکے تو مجھ سے کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی —— میں مشاعروں میں کچھ سنانے سے ہمیشہ گریز کرتا ہوں کیونکہ بیشتر شعرا ترنم سے پڑھتے ہیں اور مجھے ترنم نہیں آتا۔ لیکن مجھے ترنم اچھا لگتا ہے۔ میں ترنم میں گم ہو جاتا ہوں اور اشعار کا مطلب نہ سمجھنے کے باوجود چند شعر ذہن میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ہم بنگالی اُردو شاعروں اور ادیبوں کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے رہنے کی وجہ سے وہ اُردو تو بخوبی سمجھ لیتے ہیں جس میں فارسی و عربی کی بجائے ہندی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ لیکن ہمارے اُردو ادیب و شاعر بنگلا شاعری کو سمجھ ہی نہیں پاتے۔ اور نہ وہ ہمارے کلام کو سن کر ہماری طرح سر دھنتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہم ترنم سے نہیں پڑھتے، چنانچہ میں اپنا کلام سنانے سے ہچکچاتا رہا۔ لیکن جب الآنا صاحب کی کتاب پر نظر پڑی۔ جس میں میری نظم قبر کا انگریزی ترجمہ بھی تھا تو مجھے اطمینان ہُوا اور میں نے ان سے پہلے ترجمہ سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے میری درخواست قبول کر لی اور سامعین کو انگریزی ترجمے سے محظوظ کیا۔ اسکے بعد میں نے پوری نظم سنائی۔ سامعین نے پوری نظم بڑے انہماک سے سُنی۔ اس دن کے بعد سے میری ہچکچاہٹ دور ہو گئی

اسکے بعد جوش صاحب سے اور کئی نظمیں سنی گئیں۔ مختلف بحور و قوافی میں مختلف نظمیں سُن کر مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے اُن کے مُنہ سے گلباری ہو رہی ہے —— میں حیران رہ گیا کہ اس بڑھاپے میں بھی ان کی نظموں میں کتنا تنوع ہے۔ ان کے خیالات و محسوسات کتنے حسین اور ارفع و اعلیٰ ہیں۔ میں نے ان کے دو ایک شعر گنگنائے اور اُن سے پڑھنے کی فرمائش کی لیکن انھوں نے معذرت چاہی کیوں کہ ان کے حافظے میں وہ نظم محفوظ نہیں تھی جس کے دو ایک شعر کا میں نے حوالہ دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ پرانی نظمیں یا غزلیں بڑے شاعر کو کب یاد رہتی ہیں —— سمرسٹ مام نے کہا ہے —" بڑے ادیبوں کی نگاہ میں پُرانی تحریروں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حال کی لکھی ہوئی چیزیں ان کو عزیز ہوتی ہیں۔" رات کے دس بجے جوش صاحب کی نظمیں سُن کر میں ہوسٹل واپس آ گیا۔ رات بھیگ گئی اور میں بستر پر دراز ہُوا تو بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ ہمارے ملک کے قائدین تہذیبی اور ثقافتی تقریبات سے دور دور رہتے ہیں، انہیں سیاست سے فرصت نہیں ملتی۔ لیکن جن کے شانوں پر تہذیب و ثقافت کا بار ہے وہ غیر ملکوں سے موٹی موٹی کتابیں از بر کر کے تو آتے ہیں پر یہ کتنے دکھ کی بات ہے کہ ہمارے وطن کی مٹی میں صدیوں سے جو فلسفہ، ادب اور فن پروان چڑھ رہا ہے۔ اسکے ساتھ ان کو کوئی دلچسپی نہیں۔ مزید افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ سیاست داں جن کا جنم کاشت کاروں کی جھونپڑیوں میں ہوا ہے۔ وہ بھی اپنے فن، ادب

تہذیب اور ثقافت سے واقف ہیں۔ انگریزی پڑھ کر ہم نے بہت کچھ تو حاصل کر لیا لیکن انگریزوں کو اپنی قدیم تہذیب اور قدیم ادب و فن سے جو محبت اور لگاؤ ہے، وہ محبت اور لگاؤ ہم نے اُن سے نہیں سیکھا۔

آج مجھے صرف ایک بات یاد آ رہی ہے کہ اگر بدایونی صاحب کی طرح کوئی خوش بیان مقرر کوئی دانشور ہماری عوامی تہذیب و ثقافت کا رسیا ہوتا تو اُس کی خوش کلامی اور دلچسپی سے نہ صرف ہمارے شاعر دیگر ملکوں میں روشناس ہوتے بلکہ اس کی کوشش سے ہمارے گاؤں کی تہذیب بھی اپنے ملک کے عوام میں رواج پاتی۔

روزانہ میں صبح سویرے سیر کو جاتا ہوں۔ اور دوپہر کو واپس آکر اپنی سوانح عمری تحریر کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ اگر میرا مرض دور نہیں ہوا تو — تو جن کی محبت و شفقت کا بارِ گراں میں ڈھو رہا ہوں اس کا کیا بنے گا۔ میں ان کا قرض کیسے چکا سکوں گا۔ میں اپنے بیتے دنوں کی باتیں، افسانے، کہانیاں کیسے قلم بند کر سکوں گا۔ ان ہی خیالات کے زیرِ اثر میں روزانہ کچھ نہ کچھ لکھتا ہوں۔ ماضی کے کھنڈرات میں سے ہیرے کنکر چنتا ہوں، مرجھائے ہوئے پھولوں کی اُور دیکھتا ہوں۔ اور کانٹوں سے کھیلتا ہوں — اس اکیلے کمرے میں بند رہ کر مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے میں ایک بار پھر بچہ بن گیا ہوں — اور اسی احساس کے ساتھ میرا بچپن مجھے اشارہ کرتا ہے، ماں باپ کا پیار آتا ہے اور میرا قلم آہستہ آہستہ صفحے کے صفحے سیاہ کرتا جاتا ہے۔

شام کا سرمئی رنگ چھا جاتا ہے تو بلبل اکیڈمی کی طرف جاتا ہوں۔ یہ بلبل اکیڈمی میرے ڈرامہ "بیدیہ مئے" دیہاتی لڑکی کو اسٹیج کرنا چاہتی ہے۔ بلبل مرحوم نے اپنی زندگی ہی میں اس ڈرامے کو رقص کے روپ میں پیش کرنے کا عزم کیا تھا لیکن ان کی بے وقت موت سے ان کی یہ آرزو بار آور نہ ہو سکی۔ لیکن آج ایک مدت بیت جانے کے بعد ان کی فنکار شریکِ حیات افروزہ بلبل نے ان کی اس تمنا کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اس فنکار خاتون کے بارے میں سوچتا ہوں تو آنکھیں اشکبار بن جاتی ہیں۔ اپنے معاشرے کو خدا حافظ کہہ کر ایک دن انھوں نے عالم شباب میں جس ذہین، طباع اور واقف بلبل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سفرِ حیات شروع کیا تھا آج وہ ان ہی کی یادوں کے چراغ کو روشن کر کے بلبل کے مقاصد کی تکمیل میں مصروف اور منہمک ہیں۔

بلبل کی حسرت ناک موت کے بعد انھوں نے سوچا تھا کہ وہ مشرقی پاکستان کی بلبل اکیڈمی میں رہ کر اپنے فن کا مظاہرہ کریں گی لیکن مقامی منتظمین کے ساتھ اختلاف بڑھ جانے کے بعد ان کا یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ اگر وہ چاہتیں تو ہندوستان جا کر اپنے ناچ کا مظاہرہ کر کے داد و تحسین وصول کرتیں مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا حالانکہ وہاں ان کو اپنے ماں باپ، دوست احباب اور مداحوں کا پیار ملتا۔ محبت ملتی۔ کیا کچھ نہیں ملتا ان کو۔ اس کی بجائے وہ کراچی آ گئیں اور ریگستان میں انھوں نے رہ کر رقص کے مظاہرہ کا مصمم ارادہ کر لیا اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کو اپنے مرحوم شوہر کے وطن پاکستان کے علاوہ کہیں بھی سکون نہیں مل سکتا۔ ان کے فن کی تشنگی اور کہیں نہیں بجھ سکتی۔ یہاں انھوں نے کئی ہمدردوں کے تعاون سے بلبل اکیڈمی قائم کی اور یہیں وہ اپنے کام کو پورے انہماک سے انجام دے رہی ہیں۔ روزانہ لڑکے لڑکیاں ان سے رقص سیکھنے آتے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ "ان لڑکے لڑکیوں کو ناچ کی تعلیم دے کر مجھے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میرے ان شاگردوں کے پاؤں سے جب گھنگروں کی میٹھی اور پرسکون آوازیں فضا میں تحلیل ہوتی ہیں تو ان کے ماں باپ کے دلوں کی تاریں جیسے جھنجھنا اٹھتی ہیں۔ اس ریگستان میں میرے شاگرد دراصل بصرہ کے گلاب ہیں۔ جو ہواؤں کی تال پر ناچتے ہیں۔ اور گیتوں کے چشمے بہاتے ہیں۔

بیگم افروزہ بلبل اپنی اکیڈمی میں غیر ملکی طرز کے ڈانس کا درس نہیں دیتیں۔ حالاں کہ اگر وہ غیر ملکی ڈانس بھی سکھاتیں تو ان کے یہاں دولت کی بارش ہو جاتی ۔۔۔ ان کو پیسوں کے نہ ملنے پر پریشان نہیں ہونا پڑتا۔ ان کا خیال ہے کہ ان کو رقص کی تعلیم دے کر کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ ہمارے ساتھ زیادہ دنوں تک تو نہیں رہتے اور نہ مستقبل میں ہم ان کو اپنے ساتھ لے کر رقص کا ناٹک ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ جب وہ کتھک ناچ کی تعلیم حاصل کر کے اپنے وطن جائیں گے اور پاکستانی ناچ کہہ کر اپنے فن کا مظاہرہ کریں گے تو دیکھنے والوں کو "پاکستانی ناچ" سے نفرت ہو جائے گی۔

بیگم افروزہ بلبل اس اکیڈمی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیتیں ۔۔۔ کیوں کہ وہ اس کو اپنے مرحوم رقاص شوہر کی نشانی سمجھتی ہیں۔ اس اکیڈمی کے لئے وہ اپنا سب کچھ نچھاور کر دیں گی۔ ادھر ادھر اپنے فن کے مظاہرے سے ان کو جو کچھ مل جاتا ہے، وہی ان کی گزر اوقات کا ذریعہ ہے۔ بچوں کو لے کر کسی طرح برا بھلا وہ اپنا دن گزار رہی ہیں۔ سارا کام خود سے کرتی ہیں۔ ان کے یہاں کوئی ملازم نہیں۔ ان کے دو بچے ہیں ۔۔۔ جیسے فردوس بریں کے دو پھول ہوں۔ ان کو دیکھ کر پیار ہی بھر آتا ہے۔ ایک دن کا ذکر ہے، انہوں نے آپ بیتی سنا دی۔ بس کیا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اور پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں۔ کہنے لگیں ۔۔۔ "مجھے اپنی کوئی فکر نہیں لیکن اپنے جنتی شوہر کے اس لڑکے اور لڑکی کا کوئی دکھ بھی برداشت نہیں ہوتا۔" بیگم افروزہ بلبل کا رقص میں نے دیکھا ہے اور مجھے اندازہ ہوا ہے کہ مغربی پاکستان میں بیٹھ کر انھوں نے کتنی خوبصورتی سے دونوں صوبوں کی تہذیب اور ثقافت کو باہم سمو لیا ہے۔ ان کے رقص میں ایک طرف مشرقی پاکستان کی دھان کٹائی کے گیت شامل ہیں تو دوسری طرف مغربی پاکستان کی ماہی گیری کا رقص بھی موجود ہے۔ پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اور بھی ایسے ادارے موجود ہیں۔ لیکن وہ اس خصوصیت کو نہیں پا سکے۔ بیگم افروزہ بلبل کا یہ ادارہ دونوں صوبوں کی تہذیب اور ثقافت کو شیر و شکر نہیں کرتا۔ بلکہ دونوں کو برابر برابر رکھ کر یکساں تمکنت و منزلت بخش رہا ہے۔ لیکن اتنے عظیم کام میں ان کی ہمت افزائی نہ تو اہل وطن ہی کرتے ہیں اور نہ حکومت ہی کرتی ہے۔ جہاں حکومت دونوں صوبوں کو قریب سے قریب تر لانے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر رہی ہے۔ اگر افروزہ بلبل کو بھی حکومت کی طرف سے پنشن کے طور پر مالی امداد ملتی رہے تو مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کی ثقافت و تہذیب اور قریب آ سکتی ہے۔

روزانہ شام کے بعد میں افروزہ بلبل کے پاس آتا ہوں اور "یہ پردیسی" ناٹک کے گانے ان کو سکھاتا ہوں اور یہ بھی بتاتا ہوں کہ ناٹک میں کہاں کہاں اور کس ڈھنگ کے ناچ موزوں ہوں گے۔ ان کی کنسرٹ پارٹی کے اور لوگ بھی اس وقت موجود ہوتے ہیں

ایک دن گلڈ کے دفتر میں قدرت اللہ شہاب صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ شہاب صاحب اردو کے بڑے اچھے افسانہ نگار ہیں۔ سرکاری لحاظ سے بلند مقام پر ہونے کے باوجود وہ زینے طے کر کے نیچے بھی اترتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہم سے اتنے قریب ہیں اور ہمارے اتنے اچھے مونس و ہمدرد بن گئے ہیں۔ دوسروں کا کام کرنے سے وہ کبھی گریز نہیں کرتے۔ ان کے متعارف حلقے میں ایسی ہزاروں مثالیں بکھری ہوئی ہیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے مجھ سے پوچھا: "بہتیرے لوگوں کا خیال ہے کہ گلڈ کے قیام سے کوئی بہت نمایاں کام نہیں ہوا۔ اس بارے میں تمہارا خیال ہے؟" میں نے جواب دیا: "گلڈ کے کام میں تھوڑی بہت بھول چوک ہو سکتی ہے اور پھر یہ تو نیا ادارہ ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے بھول چوک نہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ آج اس انجمن کی بدولت پشاور و افغان کی سرحد سے لے کر ٹکناف کی سرحد تک کے ادیب و شاعر ایک دوسرے کے قریب آئے اور بغلگیر ہوئے، وہ نہ صرف بھائی ہیں بلکہ دوست اور ہمدرد بھی ہیں۔ گلڈ کے قیام سے پہلے ہم ایک دوسرے سے واقف نہ تھے، ہمیں یہ بھی پتہ نہ تھا کہ کون کیا لکھ رہا ہے۔ لیکن پشاور

[illegible] کہ سندھ کی سرحد تک سارے ادیب و شاعر میرے دوست ہیں۔ صرف دوست ہی نہیں بلکہ جب ہم ملتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم ایک ہی خاندان کے افراد ہیں ــــ گلڈ کے جلسے جب بھی کراچی، لاہور اور ڈھاکہ میں ہوئے۔ ہمیں شیر و شکر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔ آج مغربی پاکستان میں میرے دوستوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ اگر میں چاہوں تو غیر معین مدت تک ان کے یہاں مہمان بن کر قیام کر سکتا ہوں۔ مغربی پاکستان گلڈ کے جلسے میں شرکت کے لئے جو ادیب و شاعر مشرقی پاکستان آتے ہیں۔ ہمارے ادیبوں کو ان سے ملنے اور قریب آنے کا موقع ملتا ہے اس طرح ہمارے جو ادیب مغربی پاکستان جاتے ہیں، وہاں کے ادیب بھی ان سے ملتے ہیں اور قریب آتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ تھوڑی مدت میں بہت سے ادیبوں کو مالی امداد بھی دی گئی۔ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے جن ادیبوں کو سلاخوں کے پیچھے رکھا گیا تھا۔ ہم نے حکومت سے ان کی رہائی کے لئے درخواست کی۔ ہماری قرار دادیں منظور کی گئیں۔ ہماری ہی درخواست پر حکومت عنقریب کاپی رائٹ کے آئین میں ترمیم کر رہی ہے۔ ادیبوں کو اُن کی تصانیف سے جو آمدنی ہوتی ہے۔ اس پر سے انکم ٹیکس معاف کرانے کی بھی حکومت سے بات چیت ہو رہی ہے۔ رائٹرز گلڈ نہ ہوتا تو کیا یہ سارا کام عمل میں آتا؟ مشرقی پاکستان میں بنگلا اکیڈمی ہے مغربی پاکستان میں اردو اکیڈمی، پشتو اکیڈمی، پنجابی اکیڈمی وغیرہ جیسے کئی ادارے ہیں۔ لیکن ان اداروں میں ادیبوں کا کوئی خاص مقام نہیں ہے ان اداروں میں بڑے بڑے فن کار اور دانشور بلند بانگ دعوے کرتے ہیں اور بحث و تمحیص میں اُلجھ کر آستینیں بھی چڑھا لیتے ہیں۔ لیکن یہ صورت حال رائٹرز گلڈ میں نہیں ہے، یہاں ادیبوں کو بلند مقام حاصل ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اچھی طرح متعارف ہو گئے ہیں؛ میں مغربی پاکستان کے ادیبوں کی تخلیقات نہیں پڑھ سکتا۔ میری طرح مشرقی پاکستان میں اُردو نہ جاننے والے اور بھی ادیب و شاعر ہیں اسلئے ہمیں اچھے مترجموں کی ایک کھیپ تیار کرنی ہو گی۔ کچھ ناشروں کی کوشش سے پاکستان کے دونوں بازوؤں میں اچھے مترجموں کی ایک کھیپ تیار ہو گئی ہے۔ ان کو یہ کامیابی یکایک حاصل نہیں ہوئی۔ آج اُردو زبان سے بنگلا یا بنگلا سے اُردو میں ترجمہ کرنا اور بھی سہل کام ہے۔ کیوں کہ زبانیں مختلف ہونے کے باوجود ہماری تشبیہات ایک ہی جیسی ہیں۔ اسکے باوجود دونوں زبانوں میں اب تک مترجموں کی کمی ہے۔ اگرچہ وہ ایک باصلاحیت مترجم ہیں لیکن ان کے ساتھ دشواری یہ ہے کہ وہ ترجمہ کا کام شروع تو کر دیتے ہیں مگر کاہلی اور سستی کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکتے۔

برما میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں کہ وہاں ہزاروں لوگ ترجمے کے کام میں شب و روز مصروف ہیں۔ یہ لوگ ادب، فلسفہ سائنس وغیرہ موضوعات پر غیر ملکی کتابوں کو اپنی مادری زبان میں منتقل کر رہے ہیں۔ آج ہمارے یہاں بھی ضرورت اس بات کی ہے کہ اُردو کی کتابوں کو بنگلا میں اور بنگلا کی کتابوں کو اُردو میں منتقل کیا جائے ہو سکتا ہے کہ ان ترجموں کے ذریعہ ہم عظیم ادب سے متعارف نہ ہوں لیکن ہم ان کے دلوں کی دھڑکنیں اور ان کے خیالوں کی رفعتوں سے تو متعارف ہو سکتے ہیں جو ہم سے بہت قریب ہیں۔ ادب کے ذریعہ جس طرح لوگ غیر ممالک سے روشناس ہوتے ہیں۔ اس طرح ہمیں اپنے گھر کی باتوں سے بھی آگاہ ہونا ضروری ہے۔ غیر ممالک کو جاننے کے لئے ہم اُن کا عظیم ادب پڑھیں گے۔ اور اپنے وطن سے باخبر رہنے کے لئے اپنے ادیبوں کی تخلیقات کا مطالعہ کریں گے۔"

یہ سن کر شہاب صاحب نے کہا: "اب ہم اپنے ترجموں کے کام کی رفتار کو اور تیز کر دیں گے۔" اسکے بعد ادارہ مصنفین کے مستقبل کے بارے میں ان سے اور بھی باتیں ہوئیں۔

کراچی آئے ہوئے تقریباً ایک ماہ ہو گیا۔ اب واپس جانے کے لئے دل تڑپ رہا ہے۔ چنانچہ دوستوں کو خدا حافظ کہنے کے لئے

میں انجمن مصنفین کے دفتر آیا ـــــ میرا مدعا سن کر جمیل الدین عالیؔ نے کہا: "تم تو اپنے وطن جا ہی نہیں سکتے۔ تمہیں اب ملتان جانا ہے، وہاں کے ادیب تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں گنٹھیا کا مریض کراچی آکر کچھ تندرست ہوا ہوں۔ ملتان میں تو خاصی سردی ہوگی۔ ممکن ہے وہاں پہنچ کر میرا مرض بڑھ جائے میں نے اپنے شکوک عالیؔ پر ظاہر کئے۔ مگر وہ نہ مانے اور آناً فاناً میری روانگی کا انھوں نے سارا انتظام کر دیا۔ عالیؔ جیسا پاگل شاعر میں نے کم ہی دیکھا ہے ـــــ وہ دوہے بکتے ہیں اور مست رہتے ہیں۔ میں نے ان کی رسیلی اور سحر انگیز آواز میں نہ جانے کتنی بار سنی ہیں ـــــ نہ جانے کتنی راتیں ان کے دوہے سننے میں آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی ہیں۔ ان کے سارے خیالات کے الفاظ تو میرے فہم و ادراک سے باہر ہیں۔ لیکن ان کی مترنم آوازوں کے مدوجزر میں ان کے خیالات و محسوسات کی گہرائی تک ضرور پہنچا ہوں۔ ان کے دو ایک دوہے تو مجھے بہت ہی اچھے لگے ہیں مثلاً

چھوٹے بڑوں کے سنگم کا سب دیکھ لیا انجام
پاٹ بڑھایا جمنا نے پر ہے گنگا کا نام

اس طرح نہ جانے کتنی بار اُن کی زبان سے سنے ہیں اسی لئے تو دوہوں میں مست و بیخود رہنے والے اس شاعر کو میں اتنا چاہتا ہوں ـــــ اور اسی لئے میں اس کی درخواست کو رد نہ کر سکا

دوسرے دن ساڑھے دس بجے میں ملتان آگیا۔ نئے رفیقوں نے اپنا تعارف کرایا اور ہم ٹیڑھے بیکے راستوں سے ہوتے ہوئے ایک جگہ آکر رک گئے۔ سامنے بڑے بڑے حروف میں لکھے ہوئے ایک سائن بورڈ پر نظر گئی۔ یہ رائٹرز گلڈ ملتان کا دفتر ہے ـــــ وہیں گلڈ ہوٹل اور ریستوران بھی ہیں۔ یہاں کے حاجی حمید الدین صاحب نے لاکھ روپے کی یہ عمارت انجمن مصنفین کو دے دی ہے۔ ریستوران اور ہوٹل سے ماہانہ پانچ ہزار روپے آمدنی ہو جاتی ہے۔ یہ روپے مرکزی گلڈ کی تحویل میں جاتے ہیں۔ حاجی صاحب خود اس ہوٹل اور ریستوران کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اس کام کے لئے انھیں صرف دس روپے ماہانہ ملتے ہیں وہ بھی اصولاً۔

ہوٹل پر سکون، صاف ستھرا اور کشادہ ہے۔ اندر صحن میں مختلف قسم کے پھولوں کے کچھ گملے ہوئے ہیں۔ کہیں کہیں بیٹھنے کی جگہ ہے۔ اس سے حاجی صاحب کی خوش ذوقی کا اندازہ ہوتا ہے۔ جمیل الدین عالیؔ مجھے پہلے ہی حاجی صاحب کی فیاضانہ طبیعت کی بات بتا چکے تھے۔ اب میں نے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

ہوٹل پہنچتے ہی حاجی صاحب نے خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا۔ اس کے بعد رسمی تعارف کے بعد میں نے یہاں کے گاؤں دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ایک نئے دوست ریاض انور صاحب فوراً تیار ہوگئے اور یہ کام انھوں نے مشہور ادیب مقصود زاہدی کے ذمہ کر دیا۔ چنانچہ میں اُن کے ساتھ تانگہ میں شہر کے قریبی گاؤں میں پہنچا ـــــ یہ گاؤں نہیں بلکہ اسے شہر کا ایک حصہ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔

ایک جگہ میں نے دیکھا کہ رہٹ کے ذریعہ کنوئیں سے پانی مختلف نالیوں سے ہوتا ہوا آس پاس کے کھیتوں کو سیراب کر رہا ہے۔ اس رہٹ کے استعمال میں ذرا بھی دشواری نہیں۔ اس میں کئی گھڑے لگے ہوئے ہیں جن میں پانی بھرا رہتا ہے۔ جب رہٹ گھومتا ہے

تو کنوئیں کا پانی ایک نالی میں گرنے لگتا ہے۔ میں نے سنا ہے کہ پنجاب کے کاشت کاروں نے کھیتوں کو سیراب کرنے کا یہ طریقہ ایران سے سیکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہاں کے کنوئیں مشرقی پاکستان کے کنوؤں کی طرح گرمیوں میں خشک نہیں ہو جاتے بلکہ اس موسم میں کنوؤں میں پانی اور بھر جاتا ہے۔ پنجاب کے کاشت کار کنوئیں کے پانی سے صرف کھیتوں ہی کو سیراب نہیں کرتے بلکہ درختوں کو بھی سیراب کیا جاتا ہے تاکہ تیز دھوپ سے سوکھ نہ جائیں۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ مشرقی پاکستان کے کاشت کار فصلیں اگانے کے لئے آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چیت اور بیساکھ کے مہینوں میں جب خشک سالی ہوتی ہے۔ تو دیہاتوں میں شرنیاں چڑھائی جاتی ہیں۔ اور بارش لانے والے گیتوں سے آسمان پھٹ پڑنے لگتے ہیں۔ مسجدوں میں دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اور نمازیں پڑھی جاتی ہیں اور جب بادل پھٹ پڑتے ہیں اور جھما جھم بارش شروع ہو جاتی ہے تو فصلیں پانی میں ڈوب جاتی ہیں یا بہہ جاتی ہیں۔ محکمہ زراعت کا کیا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ جگہ جگہ پانی سینچنے کے لئے ٹیوب ویل لگائے؟ ممکن ہے ابتدا میں اس کے استعمال سے اور بھی مسائل پیدا ہوں۔ لیکن بعد میں ان پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ اگر وہ ایک جگہ محکمہ زراعت کی طرف سے اس کا انتظام کر دیا جائے تو کاشت کار خود اس کی طرف مائل ہوں گے۔ مثلاً اول اول جب یہاں کے جولاہوں کو جاپانی کرگھے دیئے گئے تو انھوں نے ان سے دلچسپی نہیں لی۔ لیکن بعد میں جب ان کو معلوم ہوا کہ ان کرگھوں سے کپڑے جلدی اور زیادہ تیار ہوتے ہیں۔ تو وہ خود بخود ادھر مائل ہو گئے۔ آج ڈھاکہ، بوگرہ، فرید پور، پبنہ، میمن سنگھ وغیرہ ضلعوں میں جو جولاہے ہیں ان کو یہ بھی نہیں معلوم کہ دیسی کرگھے کیسے ہوتے ہیں۔ اب خود ہمارے ملک کے بڑھئی ان کے لئے جاپانی کرگھے تیار کر دیتے ہیں۔ لہذا اب ہمارے جولاہے جاپان کے رحم و کرم پر نہیں ہیں۔

چوپال کے چاروں طرف میں نے بہت ساری عورتوں کو کپڑے دھوتے ہوئے دیکھا۔ بعض عورتیں برتن باسن صاف کر رہی تھیں بعض گھڑے بھر رہی تھیں۔ اور بعض مہندی لگے ہوئے پاؤں کو آہستہ آہستہ کپڑے سے خشک کر رہی تھیں ——— اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے دوپٹہ کے پلو پکڑے کھیل رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر یہ نہ شرمائے نہ بھاگے۔ ان عورتوں نے ہرنیوں کی طرح تعجب خیز نظروں سے کچھ دیر تک مجھے دیکھا پھر سب کی سب اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ ان کے رنگ برنگ کے کپڑے دیکھ کر مجھے محسوس ہوا۔ جیسے صبح اور شام کے بادل یہیں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ان کے خوش و خرم چہرے ان ہی بادلوں کے بیچوں بیچ میں بجلی بن کر لہرا رہے ہیں۔ چودہ پندرہ سال کی ایک لڑکی کپڑے پر صابن مل رہی تھی۔ اس کے جسم کا رنگ ہلدی جیسا تھا۔ جب وہ کپڑے کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پٹکتی تو اس کی چوڑیاں بجنے لگتیں اور اس کے نازک اور کومل ہاتھوں کی ضرب سے پیلے چلٹ کپڑے میں ملے ہوئے صابن کا سفید جھاگ پھول کی طرح اس کی مہندی رچے ہوئے دونوں پاؤں کی طرف بہتا ہوا مارے شرم کے کٹ کٹ جاتا تھا۔ میں نے یہاں بیٹھ کر ایک نظم لکھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر سوچا یہ نئی جگہ ہے۔ میں اجنبی ہوں۔ یہاں کے رسم و رواج سے واقف نہیں، نہ جانے اس عالم میں مجھے دیکھ کر لوگ کیا سمجھیں گے چنانچہ یہاں سے میں کھیت کی طرف جا نکلا۔ کھیت میں گوبھی کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ پودے جتنے بڑے تھے۔ گوبھی کے پھول اتنے بڑے نہیں ہوئے تھے۔ ڈھاکے میں جو گوبھی ہوتی ہے۔ اس کے پودے اتنے بڑے نہیں ہوتے۔

اس کے بعد میں ایک مقامی نوجوان صادق مصور کے گھر گیا۔ کئی دن سے وہ بخار میں مبتلا تھے۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے بڑی خندہ پیشانی سے میرا خیر مقدم کیا۔ انھوں نے اپنی بنائی ہوئی کئی تصویریں دکھائیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ ۱۹۶۵ دن پہلے ان کی شادی ہوئی تھی، وہ اپنی دلہن کو ایک اجنبی مہمان کے سامنے لے آئے۔ دلہن کے لجانے شرمیلے چہرے کو دیکھ کر ذرا میرا جی جلا!

میں اسے یاد کر کے اپنی بہن چاندنی اور منی کو پیار کرتا ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بنگالی دوشیزہ میرے سامنے کھڑی ہوئی ہے۔ اسکے ہاتھ میں بادام اور کشمش دیکھے۔ ان چیزوں کو دیکھ کر وہ چائے تیار کرنے لگی۔ وہ اب تک خاموش تھی۔ میں ادھر ادھر کی باتیں پوچھنے لگا۔ اور تب اسکے ہونٹ کھلے۔ وہ میری ٹوٹی پھوٹی اردو سنتی، اور سلیس اردو میں جواب دیتی۔ یہاں سے تیس میل دور اس کا میکہ ہے۔ دوسرے دن وہاں جانا طے پایا۔ دلہن کے دیور نے ایک لوک گیت سنایا۔ اس پر سکون اور معزز خاندان سے رخصت ہونے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن وقت زیادہ ہو گیا تھا اسلئے اٹھنا پڑا۔ میں نے دلہن کو دعائیں دیں شوہر کے کہنے پر اسکی بہو سے مصافحہ کیا۔ دوسرے روز اسکے میکے نہ جا سکا۔ کیونکہ صادق صاحب کا بخار نہیں اترا تھا۔ نہ جانے اتنی دور دراز رہنے والی اپنی اس بہن کو پھر کب دیکھ سکوں گا۔ آج اس کی اور اسکے فنکار شوہر کی باتیں یاد کر کے میرا دل فرط محبت سے بھر آیا ہے

شام کو مقامی روزنامہ اخبار امروز کے دفتر میں چائے پر مدعو تھا۔ وہاں ایک مختصر سا مشاعرہ بھی ہوا۔ مشاعرے میں شرکت کے لئے بہت سے شعرا مدعو تھے۔ سبھوں نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اسکے بعد مجھ سے کچھ سننے کی فرمائش کی گئی۔

تمام شاعروں کی نظموں یا غزلوں میں دو چار اشعار ایسے نکل ہی آتے ہیں جن کا جوں توں ترجمہ کیا جائے تو سامعین انکو سن کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں چنانچہ میں نے بھی منتخب اشعار کے ایک ایک شعر کا ترجمہ کر کے اردو شعرا کی طرح ترنم سے پڑھنا شروع کیا۔ گزشتہ ایک ماہ میں جب بھی فرصت ملی۔ میں لکھتا ہی رہا ہوں۔ ان تحریروں میں میرا جذبۂ دروں شامل ہے۔ چنانچہ ملتان میں میری زبان سے جو کچھ نکلا۔ اس میں میرا ادبی جذبۂ دروں شامل تھا یہی وجہ ہے کہ جب میں نے ترنم سے اپنی چیزیں سنائیں تو سامعین کے دلوں میں بھی وہی جذبہ کارفرما پایا۔ اسکے بعد میں نے جناب اظہر سے رخصت چاہی اور گھر آ گیا۔ لیکن یہاں کے مشہور ادیب جناب مقصود زاہدی نے مجھے پکڑ لیا اور مجبور کرنے لگے۔ کہ میں ان کے ساتھ ان کے دولت کدے پر جاؤں۔ ان کے اندر بے حد خلوص ہے۔ ملتان کے رائٹرز گلڈ نے ان کی کتاب چھاپی ہے۔ مجھے یہاں کی گھریلو زندگی دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ اسلئے زاہدی صاحب کی دعوت میں نے قبول کر لی۔ ٹیڑھی میڑھی سڑکیں طے کر کے شہر کی سرحد نظر آئی۔ یہاں بڑے بڑے اور اونچے اونچے درخت دیکھے۔ ان سے صرف مسافروں کو سایہ ہی نہیں ملتا ہے بلکہ ان میں مختلف رنگوں کے طیور نے اپنا مسکن بھی بنا لیا ہے۔ جن کی شیریں اور سریلی آوازیں یہاں کے لوگوں کے دلوں میں جادو جگاتی ہیں۔ ان ہی درختوں کے بیچوں بیچ ایک پرانا مکان ہے۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے بہت ہی ہوشیاری سے دیا سلائی کی روشنی میں ہم دوسری منزل پر آئے اور پھر وہاں سے برآمدہ طے کر کے ایک دروازہ کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

گیارہ بارہ سال کی ایک بچی ہاتھ میں لالٹین لئے آئی اور اسنے دروازہ کھول دیا۔ زاہدی صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا

— تشریف لائیے:

جان نہ پہچان لیکن اسکے باوجود وہ مجھے اپنے گھر کے اندر لے گئے۔ بھلا ایک اجنبی کے ساتھ اس طرح کون پیش آتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں اس مکان کا پرانا فرد ہوں۔ زاہدی صاحب کی دو لڑکیاں ہیں۔ ایک نویں کلاس میں پڑھتی ہے اور دوسری شاید ساتویں میں۔ دونوں نے مجھے سلام کیا۔

ایک بچی خوبصورت تصویریں بنا لیتی ہے۔ مجھ سے وہ بے حد مانوس ہو گئی، ایک ایک کر کے اسنے اپنی ساری تصویریں دکھا ڈالیں اور ہر بار وہ کہتی گئی "کوئی خاص بات نہیں ان میں"۔ اسکے بعد اسنے گانا سنایا۔ یہاں یعنی اس گھر میں آئے ہوئے زیادہ وقت نہیں ہوا تھا۔

مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے دونوں میری ہی بچیاں ہوں۔ شاید یہ ان کا حسنِ سلوک تھا جس نے مجھے اپنا بنا لیا تھا۔ نادری صاحب نے
ان کو بھی بلا لیا۔ بچی کے کان میں ماں نے کچھ کہا اور بچی نے پھر باپ کے کان میں کچھ کہہ دیا۔ میں تعجب سے دیکھ رہا تھا لیکن نادری صاحب
نے مجھ سے کہا کہ ان کی بیگم صاحبہ مجھ سے کہہ رہی ہیں کہ میں کھانا کھا کر جاؤں۔ میں نے جواب دیا۔ "آج مشکل ہے کیوں کہ اس وقت مجھے کالج
کے پروفیسروں کے مشاعرے میں شرکت کرنی ہے اور پھر وہاں سے حاجی صاحب کے دولت کدے پر جانا ہے کیوں کہ میں وہاں پہلے
سے مدعو ہوں۔"

بچی نے کہا۔ "تو چچا جان پھر کل ضرور آیئے۔ امی مچھلیاں بہت خوب پکاتی ہیں۔" میں نے کہا۔۔۔ "لیکن اس بار تو میں تم لوگوں
کی دعوت قبول نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں یہاں چند روز کے لئے آیا ہوں اور پہلے ہی سے پروگرام طے پا گیا ہے۔"

جب میں نادری صاحب سے رخصت ہو رہا تھا تو دونوں بچیاں بار بار کہہ رہی تھیں۔ "چچا جان پھر تشریف لائے گا۔" میں
یہ سوچتے سوچتے باہر آ گیا کہ میرے لئے اتنی محبت اور ایسی چاہت کیوں۔۔۔!

یہاں کے کالجوں کے اساتذہ نے اپنی چھوٹی سی ادبی انجمن بنا رکھی ہے۔ ہر ہفتہ ان کی نشست ہوتی ہے اور اس میں مختلف موضوعات
پر چیزیں پڑھی جاتی ہیں اور پھر ان پر تبصرہ ہوتا ہے۔ لیکن میری آمد کی وجہ سے انہوں نے اپنا پروگرام منسوخ کر کے مشاعرہ کر دیا۔۔۔
چنانچہ یہاں بھی مجھے کچھ سنانا پڑا۔

دوسرے دن صبح سویرے اٹھ کر حاجی صاحب کی مصنفین کالونی دیکھنے گیا۔ یہ کالونی کافی پھیلی ہوئی ہے اور اس میں الگ
الگ چھوٹے چھوٹے پلاٹ بنا دیئے گئے ہیں۔ حاجی حمید الدین صاحب نے مناسب رقم لے کر یہ پلاٹ مختلف لوگوں میں تقسیم کر دیئے
لیکن ان پلاٹوں کی تقسیم میں حاجی صاحب نے ادیبوں اور معلموں اور ڈاکٹروں کو ترجیح دی ہے۔

کالونی کے بیچوں بیچ ایک حسین عمارت ہے۔ اس میں انگریزی کی بہت بڑی درس گاہ ہوگی۔ کافی روپے خرچ کر کے حاجی صاحب
نے یہ عمارت تعمیر کرائی ہے۔ مسجد کے پاس ہی ایک قبر ہے۔ اس پر نہ کوئی نقش و نگار ہے اور نہ کتبہ۔ معلوم ہوا کہ حاجی صاحب نے
پہلے ہی سے اپنے لئے یہ جگہ منتخب کر لی ہے تاکہ مرنے کے بعد قبر کی کھدائی وغیرہ میں ان کے اعزہ و اقربا کو پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔
آزادی سے پہلے حاجی صاحب یوپی میں تھے۔ لیکن آزادی کے ذرا بعد آپ یہاں منتقل ہو گئے۔ وہاں تجارت اور کاروبار
سے جو پیسہ انھوں نے پس انداز کیا تھا۔ وہ سب یہاں لے آئے اور اب وہی پیسہ کارِ خیر میں خرچ کر رہے ہیں۔ ان کا لڑکا بھی تجارت
کرتا ہے۔ اس کے مستقبل کے بارے میں حاجی صاحب کو ذرا بھی فکر نہیں۔

حاجی صاحب ادیب نہیں مگر یہاں جب بھی کوئی ادبی تقریب ہوتی ہے وہ اس کا سارا انتظام کر دیتے ہیں۔ لیکن شرکت نہیں
فرماتے۔ ادب اور تعلیم سے ان کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ آخر اس شخص کے دل میں اپنے ملک کے ادیبوں کے لئے
ایسی محبت کہاں سے آئی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کا جہاں تک مجھے علم ہے میں نے ایسا عظیم اور ملک کے ادیب پر جان چھڑکنے والا
ایسا شخص کہیں نہیں دیکھا۔ اگر ملتان کے آسمانِ ادب سے کوئی بڑا ادیب طلوع ہوا تو میں سمجھتا ہوں تب ہی حاجی صاحب کی محنت
کامیاب ہوگی۔

حاجی صاحب نے ادب اور ادیبوں کے لئے جو کیا یا کر رہے ہیں اس کی پبلسٹی وہ قطعاً نہیں چاہتے۔ میں نے ان کے بارے

میں جو کچھ اظہار خیال کیا ہے اگر انہیں معلوم ہو گیا تو وہ یقیناً چین نہیں ہوں گے

مضمون کا لفی دیکھ کر ہوٹل واپس آ گیا۔ میرے دل میں جو باتیں ہیں وہ بیان نہیں کر سکتا۔ میرا دل بھر آیا۔ مجھے کے مصنف سے انہوں نے میری آمد و رفت کے لئے ایک ٹیکسی کا انتظام کر رکھا تھا۔ میں اس میں بیٹھ کر کھیت کی طرف چلا گیا۔ ملتان سے تقریباً دس میل کے فاصلہ پر ایک صاحب کے ماموں کا مکان ہے۔ ہم ادھر روانہ ہو گئے۔

وہاں کاشت کاروں کا ایک کنبہ رہتا ہے۔ اس کنبہ میں سات آٹھ افراد ہیں۔ مکان کے کنوئیں سے بیل کی مدد سے پانی کھیتوں کو جاتا ہے ان کھیتوں میں عورتیں بھی کام کرتی ہیں۔ اور مرد۔ اس کنبہ کی تین چار ایکڑ زمین بھی ہے۔ اس کے علاوہ تیس پینتیس ایکڑ مزید زمین پر بھی کاشت کرتے ہیں مگر وہ زمین ان کی اپنی نہیں۔ اگر یہ زمین ان سے چھین لی جائے تو پھر پورا خاندان فاقے کی نذر ہو جائے گا۔

وہاں سے ہوٹل واپس آ گیا۔ سہ پہر کے تین بجے یہاں کے رائٹرز گلڈ نے مجھے چائے پر مدعو کیا تھا۔ حاجی صاحب اس کے انتظام میں مصروف تھے لیکن جب چائے نوشی کا وقت آیا تو وہ نظر نہ آئے۔ اس کے بعد ہم فارغ ہوئے تو رائٹرز گلڈ کے گلڈ ہال میں ادبی نشست کا آغاز ہوا۔ یہاں کے ادیبوں کو اپنے کام میں مستعد پایا۔ دو تین حضرات مجھ پر مضامین لکھ کر لائے تھے۔ کسی کسی نے تو میری نظموں کے ترجمے بھی کر ڈالے تھے۔ گلڈ کی انگریزی کتاب میں میری بنگلا نظم "قبر" کا جو انگریزی ترجمہ شائع ہوا ہے۔ اس کا اردو ترجمہ بھی ایک صاحب کر کے لائے تھے۔ جب وہ قبر کا اردو ترجمہ سنا چکے تو میں نے بنگلہ نظم سنائی۔ قدرت مروی صاحب نے میری زیادہ نظمیں نہیں پڑھی ہیں لیکن میرے اور میری شاعری کے بارے میں ان کا جو تھوڑا بہت مطالعہ ہے۔ اس کی بنیاد پر انہوں نے اتنا دلچسپ مضمون پڑھ کر سنایا تو ہر طرف سے ان کو داد و تحسین ملی۔

اس کے بعد مجھ سے کچھ کہنے کی فرمائش کی گئی۔ اس نشست میں شرکت کے لئے جتنے لوگ تشریف لائے تھے ان میں نصف کو انگریزی نہیں آتی تھی۔ چنانچہ میں نے ٹوٹی پھوٹی اردو اور انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ بیچ بیچ میں لوک گیت بھی سنا دیتا تھا

میں نے کہا۔ آپ کے اس چھوٹے سے شہر میں آکر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میں اپنے گاؤں میں ہوں۔ آپ لوگوں نے جس خلوص، محبت اور پیار کا مظاہرہ کیا ہے میں اس کا اہل نہیں۔ بہرحال میں آپ لوگوں سے اس حد تک متاثر ہوا ہوں کہ آج اپنے دل کی بات بیان کرتے ہوئے بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ آج مجھے اپنے مغربی پاکستان کے بھائیوں سے کچھ کہنے کا موقع ملا ہے۔ اس لئے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند اہم مسائل پر اظہار خیال کروں گا۔

یہاں سے تقریباً ہزار میل کے فاصلے پر مشرقی پاکستان واقع ہے۔ وہاں کے بہت سارے رسم و رواج آپ کے یہاں سے مختلف ہیں۔ اس لئے جب مغربی پاکستان سے ہمارے بھائی مشرقی پاکستان جا کر وہاں کے مختلف رسم و رواج اور طور طریقے دیکھتے ہیں تو ان کے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ یہ اختلاف ہندوؤں کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا وہ چاہتے ہیں کہ اس اختلاف کو ختم کر کے ہم آپ کے قریب آ جائیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ خیال غلط فہمی پر مبنی ہے جب رنگ برنگی ساڑیاں پہن کر ہماری لڑکیاں گھروں کے سرسوں کے کھیتوں سے ہوتی ہوئی دریا ندی کنارے پانی بھرنے جاتی ہیں تب بانسری کے میٹھے سُروں سے نکل کر ہمارے دلوں کی کہانیاں آسمان کی اُور پرواز کرتی ہیں۔ ہم نے ان ساڑیوں میں ملبوس ناریوں کو نہ جانے کتنے گیتوں میں ڈھالا ہے، انہیں کتنے روپ دیئے ہیں۔ وہ ساڑیاں دیکھو، رام، صدف اور صندل پیکر کی طرح ہیں۔ اگر ہم سے کوئی کہے گا کہ ان ساڑیوں کی بجائے ان کو گھاگرا یا شلوار پہنایا جائے تو

ہم [illegible] کشور سے بیگانہ نہیں ہو سکے۔ ہم ان بھائیوں، سروں اور گیتوں کو بھی بھول نہیں سکتے۔ جو ہمیں پدما، جمنا اور میگھنا کی یاد دلاتے
ہیں۔ آج مجھے یہاں آپ کے سندھی، پنجابی اور پشتو لوک گیتوں کو سننے کا جو سنہرا موقع ملا ہے، اُن کے لئے میرے دل کے تار ہلا
دیئے ہیں۔ بیگانگی اور دوری کی وجہ ہی سے انسان انسان کا دوست، رفیق اور ہمدم بنتا ہے۔ ہمارے اندر جو کچھ نہیں ہے
اسے پانے کے لئے ہم دوسروں کا قرب حاصل کرتے ہیں۔ ان کے ساتھ رشتۂ دوستی مضبوط کرتے ہیں۔ صدیوں سے عورتوں اور مردوں
کا ملن ہوتا چلا آرہا ہے۔ وہ بھی اسی بیگانگی اور دوری کا نتیجہ ہے۔

آج جب ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں ہمارے دوست احباب جا کر ہمارے لوک گیتوں کی تعریف کرتے ہیں۔ تو ہمیں محسوس ہوتا ہے
کہ انہوں نے ہمارے دل بھی جیت لئے ہیں۔ شاہ عبداللطیف بھٹائی کے نغمے سن کر ہم جھوم جھوم اُٹھتے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سے جب ہم
سندھی، پنجابی اور پشتو لوک گیت سنتے ہیں تو اس وقت سارا پاکستان ہماری روح میں حلول کر جاتا ہے۔ آج ہم نے رائٹرز گلڈ کی بدولت پاکستان
کے دونوں بازوؤں کے ادب کو منتقل کرنے کا بار اٹھایا ہے۔ ترجمے کا کام جتنا آگے بڑھے گا ہم آپ لوگوں کے اور قریب ہوتے جائیں گے!
بہت رات گئے نشست برخاست ہوئی۔ لیکن کالج کے پروفیسر میرے ساتھ بیٹھ کر رات کے پچھلے پہر تک ادبی موضوعات پر
باتیں کرتے رہے۔

دوسرے دن اکتوبر کی ۱۷ تاریخ تھی، صبح سویرے اُٹھ کر قاسم باغ دیکھنے کے لئے کوٹھا آباد گیا۔ راستے میں ایک پیر صاحب
کے مزار کے پاس گاڑی رکوائی۔ وہاں ایک شخص ہارمونیم پر لوک گیت گا رہا تھا۔ میں بہت دیر تک کھڑا اس کا گیت سنتا رہا۔ میرا شوق دیکھ
کر دوستوں نے اس شخص کو بھی ہارمونیم سمیت گاڑی میں بٹھا لیا اور گاڑی چل پڑی — اس کا نغمہ بھی شروع ہو گیا۔ سڑک کے دونوں
طرف پھیلے ہوئے کھیت تھے اور جا بجا پھلدار اور سایہ دار درخت بھی نظر آئے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے چاروں طرف گیت جنم
لے رہے ہوں۔

کوٹھا آباد پہنچ کر ہم گاڑی سے اُتر گئے۔ شہری بستیوں کی طرح یہاں بھی مٹی کی دیواروں کے مکان ہیں — [illegible] سے ایک ملے ہوئے
ان بستیوں میں سبزہ کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان کی بستیوں اور گھروں میں درخت ہی درخت نظر آئیں گے — جیسے گھنے
جنگل ہوں۔ ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر یہاں کے مکان ایک دوسرے سے اتنے قریب قریب کیوں بنے ہوتے ہیں جب کہ
چاروں طرف کھلے اور کشادہ میدان ہیں۔ بستی سے نکل کر کپاس کے کھیت میں گیا۔ یہاں ہزاروں کی تعداد میں لڑکیاں اور عورتیں
کپاس چن رہی تھیں۔ راستے کے کنارے کنارے انہوں نے اپنے کپڑے رکھ چھوڑے تھے اور ایک تخت کے چاروں طرف جھولے لٹکے
ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ ان جھولوں میں ننھے بچے سو رہے ہیں — مائیں تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان بچوں کو
دودھ پلا جاتی تھیں۔ اور پیار بھی کرتی تھیں۔ کپاس کے کھیت میں جب میں نے دور تک نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ مختلف عمر کی لڑکیاں
قطار اندر قطار روئی جمع کر رہی ہیں — مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے آسمان کے درخشندہ ستارے زمین پر آ کر کھیل رہے ہوں یا پھر رنگ
برنگ کے پنچھی آ کر کھیت میں اپنا رقص پیش کر رہے ہوں۔ آٹھ سال کی عمر سے لیکر ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۲۰، ۳۰، ۴۰، ۵۰ تک لڑکیاں
اور عورتیں کام کر رہی تھیں۔ چہار دیواری کے اندر رہنے والی اور چہرے پر نقاب ڈال کر باہر نکلنے والی یہ عورتیں آج پرندوں کی طرح
کپاس کے کھیت میں چہچہا رہی تھیں۔ ایک طرف جب کام ختم ہو جاتا تو یہ پرندوں کی طرح دوڑ کر دوسری طرف چلی جاتیں۔ وہاں عورتوں سے

میں نے سوال کیا۔ مگر ان کی زبان سے یہ گرسکی نہ ہوئی۔ سامنے کھیتوں میں بیٹھی عورتیں بہت قریب آگئیں اور انہوں نے میرے سوالوں کے جواب دیئے۔ بعض لڑکیاں مجھے پردیسی پا کر تعجب سے گھور رہی تھیں۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔ سرشکستہ ہو گئے جب یہ لڑکیاں رام دھنک کی طرح اپنے خوبصورت جسم کو بل دے کر روئی چن رہی تھیں تب مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمان سے سینکڑوں رام دھنک یہاں آکر بل کھا گئے ہوں۔ کام کرنے والی یہ عورتیں عام طور پر سب کی سب افلاس زدہ ہیں ان میں سے بہتوں کا اپنا کوئی کھیت نہیں۔ زمینداروں کے کھیت سے کپاس چن کر مزدوری کے طور پر انہیں بھی معمولی سا حصہ مل جاتا ہے یہ حسن و جمال تو صرف شہزادیوں ہی کو بھلے لگتے ہیں۔ ایک بار میں نے ایک غریب بادشاہ کی کہانی لکھی تھی۔ جیسے آج بادشاہ کی وہی شہزادیاں یہاں آگئی ہوں جیسے وہ آج کپاس کے کھیت میں پھولوں کی طرح کھل رہی ہوں۔ آخر مغربی پاکستان کے شاعر و ادیب ان پر کہانیاں کب لکھیں گے۔

تھوڑی دیر بعد ساری لڑکیاں اور عورتیں کام ختم کرکے اپنے اپنے گھر چلی گئیں —— ہم بھی وہاں سے نکل کر کچھ دور آگے قاسم باغ میں داخل ہوئے۔ اس باغ میں گھنے اور اونچے اونچے درخت ہیں لیکن ان میں جو پھل آتے ہیں وہ میٹھے نہیں ہوتے۔ مجھے بتایا گیا کہ ان درختوں کو آندھی اور طوفان سے بچانے کے لئے باغ والے بڑی محنت بھی کرتے ہیں۔ لیکن ہم مشرقی پاکستان میں آندھیوں کے ڈر سے پھلوں کے باغ نہیں لگاتے۔ صرف اپنے کھانے کے لئے دو ایک باغ لگا لیتے ہیں۔ ان باغوں کو بھی اکثر آندھیاں تباہ کر جاتی ہیں۔ مغربی پاکستان میں پھلوں کی تجارت کو خوب فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ دن بھر میں تقریباً چھ سات بار درختوں میں نال کے ذریعہ پانی دیا جاتا ہے۔ برسات کے موسم میں امونیم سلفیٹ میں گوبر ملا کر ہر سال ایک ایک درخت کی جڑ میں کھاد ڈالی جاتی ہے۔ پھل والے درختوں کو بڑھنے سے روکا جاتا ہے کیوں کہ یہ زیادہ جگہ لے لیتے ہیں۔

باغ میں داخل ہوا۔ تو سینکڑوں کی تعداد میں موسمی اور مالٹے کے درخت دیکھے۔ اس وقت بے شمار موسمی اور مالٹے پھلے ہوئے تھے۔ جیسے یہ ان درختوں کے گہنے ہوں۔ باغ کے مالک نے مجھے بھی موسمیاں اور مالٹے توڑنے کی اجازت دے دی۔ جی نہیں چاہتا تھا کہ درختوں کے ان گہنوں کو جن سے ان کے حسن میں اضافہ ہو رہا ہے الگ کروں۔ میرے دوستوں نے بہت سے موسمی اور مالٹے توڑے۔ تقریباً دس عدد مالٹے اور موسمی لیسکر میں ڈھاکے آیا اور اپنے بچوں سے یہ کہا کہ یہ درختوں سے توڑ کر لایا ہوں تو انہیں تعجب ہوا۔ ہمارے مشرقی پاکستان میں یہ پھل نہیں ہوتے اس لئے ان بچوں کو جب ان پھلوں کے درختوں کی کہانی سنائی تو ان کو اور حیرت ہوئی۔

اس باغ میں آم کے قلم بھی لگائے گئے ہیں۔ ان چھوٹے چھوٹے درختوں کو دھوپ کی شدت سے محفوظ رکھنے کے لئے چھوٹی چھوٹی شاخوں سے گھیر دیا گیا ہے۔ اس باغ کی سیر کرکے میں پھر ہوٹل آگیا۔ مقصود علی اور ریاض انور بھی مجھ سے رخصت ہو گئے۔ اس سفر کی یاد میرے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

شام کو کتابوں کی ایک دکان کا افتتاح ہونے والا تھا۔ مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے یہاں بڑا اژدہام دیکھا۔ یہاں ادیب و شاعر بھی تھے۔ پروفیسر اور طلبا بھی۔ اس جلسہ کی صدارت مقامی کمشنر کی خوبصورت بیگم نے فرمائی۔ ایک کتاب کی دکان کے افتتاح کے موقع پر ایسا جوش و خروش کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔ اس سے اہل ملتان کے ذوق و شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

چائے پی چکنے کے بعد ہم وہاں سے ڈاکٹر ایک [illegible] کے لئے روانہ ہو گئے۔ یہاں پہنچنے [illegible] ہو جا چکا تھا۔ میجر حسین کے ساتھ میں نے ایک ایک گائے کو دیکھا۔ یہاں بیرون ملک سے اچھی نسل کی چند گائیں لائی گئی ہیں۔ ان میں دو [illegible] زیادہ دودھ دیتی ہیں۔ میں بڑے غور سے ایک ایک گائے کو دیکھ رہا تھا۔ صدیوں پہلے ہم انسان جنگلوں میں جانوروں کے ساتھ ہی زندگی بسر کرتے تھے۔ آج بھی ہم جانور پالتے ہیں اور ان کو پیار کرتے ہیں۔ ہماری یہ عادتیں انہی دنوں کی یادگار ہیں۔ میں بہت دیر تک ان جانوروں کو دیکھنا اور پیار کرنا چاہتا تھا لیکن وقت گزرتا جا رہا تھا۔ ابھی ایک اور پروگرام میں شرکت کرنی تھی۔ میڈیکل کالج کے طلبا میرا انتظار کر رہے تھے۔ چنانچہ میجر حسن صاحب سے میں نے رخصت چاہی۔

میڈیکل کالج کے طلبا نے میرا خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا۔ ان کی اس محفل میں میں نے ذرا بھی اجنبیت محسوس نہیں کی۔ چند طلبا نے اپنی اپنی غزلیں سنائیں۔ مقامی شعرا کے کلام سے بھی محظوظ ہوا۔ ایک طالب علم نے کئی عدد لوک گیت سنائے۔ یہ گیت مجھے اتنے اچھے لگے کہ کئی بار میں نے اُن سے سنانے کی درخواست کی۔

نشست کے اختتام پر مجھے بھی کچھ کہنا پڑا۔ میں نے کہا ــــ تھوڑی ہی دیر بعد میرا ملتان کا یہ سفر ختم ہونے والا ہے کل میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ لیکن اس مختصر سے دوران قیام میں مجھے آپ لوگوں کا جو خلوص ملا ہے اُسے زندگی کی آخری سانس تک نہیں بھولوں گا۔ مشرقی پاکستان آپ لوگ نہیں گئے ہیں۔ میں کیسے اتنا بڑا ملک اپنے سر پر اُٹھا کر لاتا اور آپ لوگوں کو دکھاتا۔ میں ہنومان کی طرح اتنا جوانمرد اور بہادر تو نہیں ہوں۔ لیکن میں آپ لوگوں کی صحبتوں میں مشرقی پاکستان کا ایک گیت رکھ کر جانا چاہتا ہوں۔ اور جب آپ لوگ وہاں جائیں گے تو اس اور لطیف اور حسین گیت سننے کا آپ کو موقع ملے گا۔ اس کے بعد میں نے اپنے ایک گیت "ابابیلیں پانی بھرنے کو آئی ہیں۔ اور اس کی لہروں سے کھیل رہی ہیں" کا انگریزی میں ترجمہ کرکے سنایا۔

محفل برخاست ہوئی تو بیگم ریاض انور نے اپنے ساتھ گھر لے جانے پر اصرار کیا۔ انھوں نے کہا "ایک بار آپ کو میرے غریب خانے تک بھی جانا ہوگا۔ اس وقت میرے بچے سو گئے ہوں گے۔ ان کے لئے دعائیں کرتے جائیے۔ صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوں گے تو میں کہوں گی۔ کوئی تم کو دیکھنے آئے تھے" ان کی اس درخواست کو میں رد نہ کر سکا۔ یہاں آیا تو وہ کچھ کھانے کے لئے مجبور کرنے لگیں؛ میں انکار کرتا رہا اس کے باوجود دو چار پھل کھانے ہی پڑے۔ کشمش اور ذرا اخروٹ کھا کر میں وہاں سے رخصت ہوا۔

دوسرے دن مقامی گورنمنٹ کالج کے پروفیسروں کے ساتھ چائے نوشی کی دعوت تھی۔ یہاں سے رخصت ہو کر میں سیدھا دن کے تقریباً ایک بجے ہوائی اڈہ پہنچ گیا۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود دوست احباب مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچ گئے۔ انور صاحب کے ساتھ صادق صاحب، کالج کے چند نوجوان پروفیسر اور میڈیکل کالج یونین کے صدر بھی موجود تھے۔ حاجی صاحب میرے قریب ہی کھڑے ہو گئے۔ میں نے ان سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا "آپ کو ادب اور ادیبوں سے جو والہانہ محبت ہے اس کا چرچا مشرقی پاکستان جا کر میں ہر ایک سے کروں گا"

دوستوں سے رخصت ہوتے ہوئے میری آنکھیں بھر آئیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھا تو آنکھوں کے پردے پر ایک ایک تصویر ابھر کر آنے لگی ــــ وہ ہنس مکھ اور سدا بہار نوجوان پروفیسر جو پال کنارے ابابیلوں کا سا ہجوم، صادق صاحب کا وہ [illegible] مقصود زاہدی کے گھر کے ایک کونے میں اُن کے وہ [illegible] ــ کیا اس کیفیت میں وہ دیہاتی [illegible]

کی محبت اور ان کا خلوص ـــ سب میرے پاس ایک ایک کر کے آئے اور میرے دل میں نقش چھوڑ گئے۔ نہ جانے زندگی میں ان سے پھر کب ملاقات ہو گی ـــ ان کا پیار، ان کی محبت اور ان کا خلوص تو میری روح میں حلول کر گئے ہیں۔ ان سے راستے بھر کسی نے بات نہ کی ـــ کیوں کہ ان کو میں اپنے خیالوں کی کائنات میں لے آیا ہوں ـــ آج میں سب کا کتنا ممنون ہوں !۔

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) کے انتخابات کے چند مناظر



رائٹرز گلڈ
کے علاقائی
معتمدین



جناب قتیل شفائی (حلقہ مغربی پاکستان)



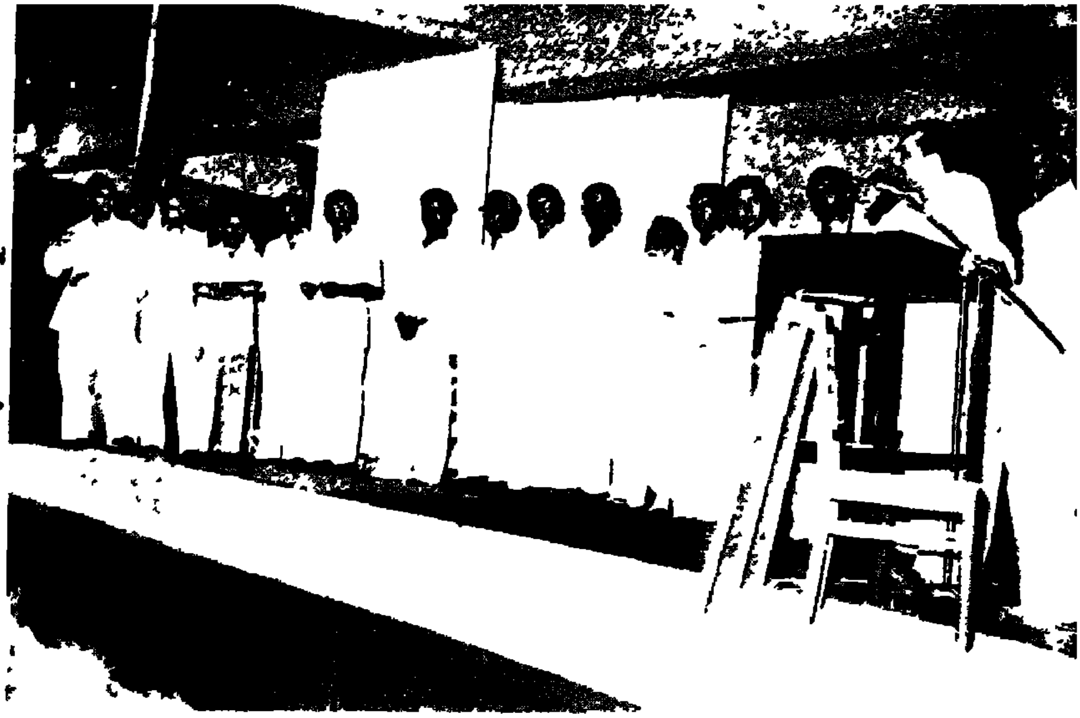
جناب سیر چودھری (حلقہ مشرقی پاکستان)



←

جناب شاہد احمد دہلوی
(حلقہ کراچی)

پاکستان رائٹرز
کے مہمان
ادیب و شعرا
→





...ن میٹرو پول
...یں پاکستان
...ز رکنڈ کے
مقابلہ کا ایک
...ظر ←



انجمن ترقی اردو پاکستان کے کتبخانۂ خاص میں جناب اختر حسین صدر انجمن،
جناب جمیل الدین عالی معتمد انجمن کے ساتھ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکزی)

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) کی کارروائی

مرکزی اجلاس عام منعقدہ ۳۰ مئی سنہ ۶۲ء

اجلاس عام ۱۰ بجے صبح کو مرکزی گلڈ کے دفتر واقع [illegible] میں شروع ہوا۔

حسب ذیل کارروائی عمل میں آئی۔

دفعہ نمبر (۱) چیئرمین کا انتخاب

ڈاکٹر محمد شہید اللہ کو اجلاس کی صدارت کے لئے متفقہ طور پر منتخب کیا گیا۔ کارروائی کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جن ممبروں نے اجلاس میں شرکت کی اُن کے نام منسلکہ فہرست میں درج ہیں:۔

۲ (الف)

مرکزی دفتر کی رپورٹ پر جو پہلے ممبروں کو بھیجی جا چکی تھی غور و خوض کیا گیا۔ مسٹر موسوی صاحب نے تجویز کیا کہ جن ممبروں کے ذمہ چندہ واجب الادا ہے انہیں علاقائی عام اکائیوں وغیرہ ووٹ دینے سے محروم کیا جائے۔ عام اجلاس نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا لیکن یہ مسئلہ مالیاتی کمیٹی کے سپرد کر دیا۔ رپورٹ کا جائزہ لینے کے لئے ایک ذیلی کمیٹی تشکیل کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا

اجلاس عام نے اکاؤنٹس اور بیلنس شیٹ منظور کی۔

۲ (ب) ۲ (س) ۳ اور ۴

مختلف مسائل کا جائزہ لینے کے لئے حسب ذیل ذیلی کمیٹیاں تشکیل کی گئیں۔

تجاویز کی جانچ پڑتال

(۱) حافظ لدھیانوی (لائلپور)
(۲) کمال زاہدی (ڈھاکہ)
(۳) عبدالقادر (ڈھاکہ)
(۴) جسیم الدین (ڈھاکہ)
(۵) منہاج برنا (کنوینر) (کراچی)

دستوری ترمیمات

(۱) متین الدین احمد (ڈھاکہ)
(۲) صلاح الدین احمد (ڈھاکہ)
(۳) ریاض انور (ملتان)
(۴) شیخ ایاز (سکھر)
(۵) جمیل جالبی (کراچی)
(۶) احمد فراز (پشاور)
(۷) سراج الاسلام چودھری (ڈھاکہ)
(۸) شوکت صدیقی (کراچی)
(۹) جمیل الدین عالی (کنوینر)

مالیاتی امور

تمام نئے علاقائی خازن اور مرکزی خزانچی (کنوینر مرکزی خازن)

رپورٹ کی جانچ پڑتال اور قابل کارروائی امور

حسب ذیل افراد پر مشتمل ایک ذیلی کمیٹی تشکیل کی گئی جس کی کنوینر بیگم یوسف جمال حسین تھیں۔

۱۔ احسن احمد اشک (ڈھاکہ)
۲۔ منیر چودھری (ڈھاکہ)
۳۔ ممتاز حسین [illegible] (کراچی)
۴۔ [illegible] (کراچی)
۵۔ قتیل شفائی (لاہور)

حسب ذیل دیگر اضافی ذیلی کمیٹیاں قائم کی گئیں

ذیلی حلقوں اور اپیل کی کمیٹی

۱۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم (لاہور)
۲۔ بنظیر احمد ( )
۳۔ محمد طفیل کنوینر (لاہور)

انہیں مزید ہدایت دی گئی کہ وہ اپیل کے لئے قواعد بنائیں

انتخابات

ڈاکٹر محمد شہید اللہ اور فارغ بخاری کو منتظمین انتخابات اور جمیل الدین عالی کو الیکشن کنٹرولر مقرر کیا گیا۔

۲۔ اس کے بعد سیکریٹری جنرل صاحب نے تمام اراکین کا خیرمقدم کیا اور انہیں بتایا کہ جلسے کے ہر منٹ کا خرچ گلڈ کے ذمہ ۶۰ روپے آرہا ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اجلاس عام کارروائی پر پوری توجہ مرکوز کرے۔ انہوں نے گلڈ کے لئے جمیل الدین عالی کی رضاکارانہ خدمات کو سراہا اور تمام اراکین نے ان کے خیالات کی حمایت کی۔

گذشتہ میقات کے دیگر عہدیداروں کی خدمات کو بھی سراہا گیا۔

۳۔ ذیلی کمیٹی نے ساڑھے چار گھنٹے کام کیا۔ ۱۲ بجے دن سے ۲ بجے دن تک کھانے کا وقفہ رہا۔ اس وقفہ کے دوران بھی ذیلی کمیٹیاں کام کرتی رہیں۔

جہاں کہیں کسی ذیلی کمیٹی نے محسوس کیا کہ اس کی سفارشات کے لئے آئینی ترمیمات ضروری ہیں اس نے وہ ترمیمات ذیلی کمیٹی کو ارسال کردیں۔

دوسرا اجلاس ۲ بجے دن کو شروع ہوا۔ اس اجلاس میں تمام ذیلی کمیٹیوں نے یکے بعد دیگرے اپنی رپورٹیں پیش کیں جن پر اجلاس عام میں اراکین کے کافی غور و خوض کے بعد حسب ذیل نتائج برآمد ہوئے

سالانہ رپورٹ

رپورٹ میں جو پروگرام پیش کیا گیا تھا اسے من وعن منظور کرلیا گیا۔ رپورٹ کے دوسرے حصوں کے سلسلوں میں جو رائے ظاہر کی گئی وہ ضمیمہ (الف) میں شامل ہے۔ رپورٹ کی بالعموم تعریف کی گئی اور اسے جامع اور اچھی رپورٹ قرار دیا گیا

۲ (ب) مالیاتی کمیٹی

مالیاتی کمیٹی کی رپورٹ جو ضمیمہ (ب) کی حیثیت سے منسلک ہے من وعن منظور کرلی گئی۔

۳ (ب) تجاویز کمیٹی

تمام تجاویز جو ضمیمہ (ج) کی حیثیت سے منسلک ہیں متفقہ طور پر منظور کرلی گئیں۔ لاطیبہ کی ایک تجویز مغربی پاکستان علاقائی مجلس عاملہ کے حوالے کردی گئی۔ مشاورتی کمیٹی کے متعلق بیگم یوسف جمال حسین کی پیش کردہ تجویز مرکزی مجلس عاملہ کے پاس غور و خوض اور ضروری کارروائی کرنے کے لئے بھیج دی گئی۔ دفعہ ۴ (۱۷) (س) کے تحت سیکریٹری جنرل کے اقدامات کی تصدیق کی گئی

۴۔ ذیلی علاقوں کیلئے ذیلی کمیٹی

علاقائی مجالس عاملہ میں ڈویژنل نمائندگی کے اصول کو تسلیم نہیں کیا گیا۔ جہاں تک ذیلی علاقائی مجالس کی تشکیل کا تعلق ہے، اس کے لئے اگست ۱۹۶۱ء میں سیکریٹری جنرل کے وضع کردہ قوانین میں ترمیم کی گئی، اور انہیں نافذ کیا گیا

[illegible]

یہ ترمیمی ضمیمہ (د) کی حیثیت سے منسلک ہیں جہاں تک بلوچی زبان کے ادیبوں [illegible] مغربی پاکستان کے سیکریٹری سے درخواست کی گئی کہ [illegible] ایک مقامی [illegible] کی تشکیل کریں اور پھر بلوچی ادیبوں کے مطالبات کا جائزہ لیں۔

۵- ذیلی کمیٹی برائے اپیل

مغربی پاکستان [illegible] کے متعلق مغربی پاکستان کے ایک رکن کی اپیل مسترد کر دی گئی۔ اور اپیلوں کے متعلق ذیلی کمیٹی کی تجاویز کو منظور کیا گیا جو ضمیمہ (س) کی حیثیت سے منسلک ہیں۔

۶- دستوری ترمیمات کی ذیلی کمیٹی

آئینی ترمیمات کو جو ضمیمہ (ش) کی حیثیت سے منسلک ہیں متفقہ طور پر فوری نفاذ کے ساتھ منظور کر لیا گیا۔ مرکزی دفتر کی طرف سے موجودہ مرکزی کمیٹی کے اراکین کے انتخاب میں دوبارہ حصہ لینے کی اہلیت کے متعلق ایک آئینی ترمیم پیش کی گئی جس پر ممبروں کی رائے لی گئی۔ بعض موجودہ ممبروں نے اس ترمیم کی حمایت یا مخالفت میں اپنی رائے نہیں دی۔ ترمیم کی حمایت میں کوئی ووٹ نہیں آیا۔ صدر نے اس تجویز کی حمایت اور مخالفت میں دیئے جانے والے ووٹ گنتی کرنے کا حکم دیا۔ موجودہ ممبروں میں سے ۱۲۵ افراد نے تجویز کی مخالفت میں ووٹ دیئے لہٰذا یہ ترمیم نامنظور ہو گئی۔

موجودہ سیکریٹری جنرل کے دوبارہ انتخاب میں کھڑے ہونے کی اہلیت کے متعلق مرکزی [illegible] ترمیم متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ صدر نے [illegible] یہ اعلان کیا کہ سیکریٹری جنرل کے لئے صرف قدرت اللہ شہاب کا پرچہ نامزدگی داخل ہوا ہے۔ اجلاس عام نے بالاتفاق ملائے قدرت اللہ شہاب کو دوسری میقات کے لئے سیکریٹری جنرل منتخب کیا۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ چونکہ سندھی زبان کے ادیبوں کی نمائندگی کے لئے صرف شیخ ایاز [illegible] کے عائد ہونے کی وجہ سے وہ منتخب نہیں ہو سکتے اس لئے سیکریٹری جنرل کو اجلاس عام کی جانب

[illegible]

سے [illegible] نامزدگی کرنی چاہیئے [illegible] ترمیم کے مطابق اردو زبان میں [illegible] اراکین کی تعداد [illegible] جس کے لئے ایک [illegible] مغربی پاکستان سے شامل کیا جائے گا۔ حسب سابقہ نامزدگی کی بجائے [illegible] سیکریٹری جنرل [illegible] کو اختیار دیا گیا کہ وہ اجلاس عام [illegible] مناسب [illegible] پر مناسب نامزدگی کر دیں۔

[illegible] اجلاس نے اعلان کیا کہ سیکریٹری جنرل ہر قسم کی آئینی تبدیلیاں کرنے اور تنظیمی معاملات کے متعلق ہدایات جاری کرنے کا اہل اور مجاز ہے۔ اور فیصلہ کیا گیا کہ ان ترمیموں کو فی الفور نافذ کیا جائے۔

۷- انتخابات

[illegible] کے ذریعہ انتخابات ہوئے انتخابات میں حصہ لینے والے [illegible] امیدواروں کے نام نامنظور کر دیئے گئے جو موجودہ مجلس عاملہ کے رکن ہیں۔ یہ فیصلہ اجلاس عام کے اس فیصلے پر عمل کے سلسلے میں کیا گیا جس کی رو سے [illegible] لوگوں کے دوبارہ منتخب ہونے کے لئے اہل قرار دیئے جانے کے متعلق ترمیم کی تجویز کو مسترد کیا گیا تھا۔

انتخاب میں حصہ لینے والے [illegible] کے تمام اراکین کے نام اور انتخاب کے اعلان شدہ نتائج ضمیمہ (ص) کے طور پر منسلک ہیں۔

صدر کی اجازت سے دیگر امور

[illegible] ایک تعزیتی قرارداد [illegible] منظور کی گئی۔ تمام ممبر ایک منٹ تک خاموش کھڑے رہے۔ اجلاس عام نے متفقہ طور پر مرکزی سیکریٹری کے [illegible] کے لئے [illegible] کی سفارش کی۔ جسے سیکریٹری جنرل نے منظور کر لیا۔

دستخط (ڈاکٹر محمود حسین الله)

مرکزی اجلاس عام میں شرکت کرنے والے حضرات کی فہرست

۱۔ قدرت اللہ شہاب
۲۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ
۳۔ احسن احمد اشک
۴۔ محمد کلیم الدین
۵۔ کرنل غلام مصطفےٰ
۶۔ ممتاز حسین
۷۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی
۸۔ احمد فراز
۹۔ شیخ ایاز
۱۰۔ بیگم یوسف جمال حسین
۱۱۔ ابوالحسن
۱۲۔ فارغ بخاری
۱۳۔ محمود اختر کیانی
۱۴۔ قتیل شفائی
۱۵۔ حافظ لدھیانوی
۱۶۔ ریاض انور
۱۷۔ محمد محفوظ اللہ
۱۸۔ عسکر ابن شیخ
۱۹۔ عبدالرشید خان
۲۰۔ عبدالقادر
۲۱۔ متین الدین
۲۲۔ سید نذیر احمد
۲۳۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم
۲۴۔ فضل الرحمٰن ممتاز
۲۵۔ ضیاء الحسن موسوی
۲۶۔ محمد طفیل
۲۷۔ شاہد احمد دہلوی
۲۸۔ منیر چودھری
۲۹۔ منہاج برنا
۳۰۔ جمیل جالبی
۳۱۔ رفیق الاسلام
۳۲۔ محبوب جمال زاہدی
۳۳۔ سراج الاسلام چودھری
۳۴۔ مفیض الدین احمد
۳۵۔ چکار ربھاونجی
۳۶۔ مشفق خواجہ
۳۷۔ شوکت صدیقی
۳۸۔ صبا اختر
۳۹۔ انجم اعظمی

وہ شرکا جو ووٹ دینے کے مجاز نہ تھے۔

۱۔ سید وقار عظیم (سابق علاقائی سیکریٹری مغربی پاکستان)
۲۔ طفیل احمد جمالی (" " " کراچی)
۳۔ صلاح الدین محمد (عارضی علاقائی سیکریٹری مشرقی پاکستان)
۴۔ ابن انشا (اعزازی مرکزی خازن)
۵۔ جمیل الدین عالی (اعزازی ایگزیکٹو سیکریٹری)
۶۔ اشرف الزمان خان (اعزازی علاقائی خازن مشرقی پاکستان)

کل = ۴۵

ضمیمہ الف

ایگزیکٹو سیکریٹری کی رپورٹ پر ذیلی کمیٹی کا تبصرہ

کنوینر۔ بیگم یوسف جمال حسین
رپورٹ تیار کردہ۔ منیر چودھری۔

حصہ اوّل

۱۔ رپورٹ میں مغربی پاکستان کے نظر بند قلندر مہمند کے متعلق کچھ مذکور نہیں۔ حالانکہ علاؤالدین الآزاد کے مقدمہ کا بالتفصیل ذکر موجود ہے۔

۲۔ ریڈیو پاکستان نے جن ادیبوں اور فنکاروں پر پابندی عاید کردی ہے ان کی شکایات کے متعلق رپورٹ میں ایک بیان شامل ہونا چاہیے تھا۔

۳۔ ریڈیو پاکستان پر نشریات کے معاوضے میں سرکاری ملازموں کے ساتھ جو فرق برتا جاتا ہے۔ اسے فوراً ختم کیا جائے۔

۴۔ ریڈیو پاکستان فی الوقت گیتوں کے ساتھ اُن کے لکھنے والوں کے نام نشر نہیں کرتا۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے

۵۔ ان ادیبوں کو جو سرکاری ملازم ہیں۔ اپنی نگارشات سے جو آمدنی ہوتی ہے اس پر ۳۳ فیصد ٹیکس کا قاعدہ ختم کر دینا چاہیے۔

حصہ دوم

رپورٹ میں بعض مقامات پر بعض الفاظ اور فقرے ناگوار سے لگتے ہیں۔ بعض جگہ ان سے ایک طرح کی جذباتیت ٹپکتی ہے جو اس قسم کی رپورٹ میں قطعی ناپسندیدہ ہے۔ مثال کے طور پر جس جگہ مغربی پاکستان کی نومنتخب علاقائی عاملہ کی غیر منضبط سرگرمیوں پر نکتہ چینی کی گئی ہے۔ ایک اور واضح مثال وہ صفحہ ہے جس کا عنوان ہے "انتباہ" کمیٹی کی رائے یہ ہے کہ نوٹ کے مندرجات کا لب و لہجہ ایسا ہے جس سے بالکل

مغربی شعبہ اس وقت تک مسٹر قلندر کی رہائی کے متعلق [illegible]

یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ہم حکومت کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ کمیٹی یہ محسوس کرتی ہے کہ اس قسم کی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے اعلان بیان کو بہتر بتایا جا سکتا ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر مالی نے ذیلی کمیٹی پر یہ بات واضح کر دی ہے کہ ممکن ہے کہ انہوں نے غلط الفاظ استعمال کئے ہوں۔ لیکن ان کی نیت میں شبہ نہیں

حصہ سوم

ذیلی کمیٹی نے جو آئینی ترمیمات تجویز کی تھیں۔ وہ آئینی ذیلی کمیٹی کے پاس بھیج دی گئی ہیں۔ جس نے سات افراد پر مشتمل مجلس قائمہ کے متعلق ایک ترمیم اور مشرقی پاکستان سے مرکزی عاملہ میں ایک اور دو ممبر کی متناسب نمائندگی کے لئے متعلق دوسری ترمیم منظور کر لی ہے۔ اور دونوں صوبوں کے لئے دو ایگزیکٹو سیکریٹریوں کے تقرر اور ہر قسم کے جھگڑوں میں ثالثی کے فرائض انجام دینے کے لئے ایک مستقل کمیٹی کے قیام کے متعلق دو تجاویز کو یا تو دوسری قرارداد میں شامل کر لیا گیا ہے۔ یا مسترد کر دیا۔

منیر چودھری
بیگم یوسف جمال حسین
(کنوینر ذیلی کمیٹی)

ضمیمہ ب

مالی امور

مالی امور کی ذیلی کمیٹی نے جو مرکزی خازن اور مشرقی و مغربی علاقائی خازنوں پر مشتمل ہے ماسٹر زگلنڈ کی ملیات نیز اس کے دار الاشاعت کی کارکردگی پر مکمل بحث کی۔

علاقائی خازنوں نے ان انتظامات پر مکمل اطمینان کا اظہار کیا جو مرکز اور علاقوں کے درمیان ہیں جیسا کہ مرکزی خازن نے ان کی وضاحت کی۔ مشرقی پاکستان کے سابق خازن مسٹر اشرف الزماں خان کو بھی حسب ذیل نکتے پر بحث کے دوران شریک کیا گیا۔ کیا علاقوں کو امداد دینے کے طریق کار کے متعلق کوئی شکایت ہے وغیرہ۔ انہوں نے نئے خازنوں کو پوری صورتحال بتلائی اور یقین دہانی کرائی۔ مغربی پاکستان کے سابق خازن مسٹر سید وقار عظیم نے بھی اس بات کی تصدیق کی۔ یہ بات علاقائی خازنوں پر واضح کی گئی کہ امداد حکومت سے بالاقساط ملتی ہے اور بالاقساط علاقوں کو تقسیم کر دی جاتی ہے۔ لیکن کسی علاقہ کو روپے کی کمی کے باعث دشواریوں کا سامنا نہیں ہونے دیا جاتا ہے علاوہ ازیں بعض منصوبوں پر مرکز علاقوں کی طرف سے عمل کر رہا ہے علاقوں کے کھاتے میں ان کے اخراجات کو باقاعدہ درج کیا جاتا ہے۔ علاقائی خازنوں نے اس طریقہ کار سے اتفاق کیا

۲ - یہ محسوس کیا گیا کہ مغربی پاکستان کے حسابات باقاعدہ طریقہ پر رکھے گئے ہیں۔ اس کا آنریری سیکریٹری اکاؤنٹس کے معاملات سے واقف ہے لیکن مشرقی پاکستان کو ایک جزوقتی اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے لہٰذا علاقائی مجلس عاملہ کو اس مسئلہ پر توجہ دینی چاہئے۔

۳ - مشرقی پاکستان کے علاقائی خازن نے یہ بات محسوس کی کہ اس خطے میں اشاعت گھر کے کام کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے یہ کام مشرقی پاکستان کی مجلس عاملہ کے کرنے کا تھا اور مشرقی پاکستان کو یقین دلایا گیا کہ اسے کسی قسم کی مالی دشواریاں نہیں ہوں گی۔

۴ - مغربی پاکستان کے متعلق علاقائی خازن نے وعدہ کیا کہ وہ پرنسز ہوسٹل کے سلسلے میں بقایاجات ادا کرنے کی غرض سے مرکز کے ساتھ مل کر سرمایہ فراہم کرنے کے لئے انتہائی کوشش کریں گے۔

۵ - یہ فیصلہ کیا گیا کہ ذیلی حلقوں کو مرکز جو امداد بھی دے وہ علاقوں کے ذریعہ دے۔ آخر میں علاقائی خازنوں نے مرکز کی طرف سے رہنمائی کا شکریہ ادا کیا۔ اور علاقوں کا خیال رکھنے پر اس کی تعریف کی۔

ضمیمہ ج

ذیلی حلقوں کے لئے قواعد و ضوابط

ذیلی حلقوں کے لئے حسب ذیل قواعد و ضوابط وضع کئے گئے :-

۱- ذیلی حلقہ متعلقہ شہر یا انتظامی یونٹ کے نام سے موسوم ہوگا

۲- صرف سیکرٹری جنرل علاقائی سیکرٹری / سیکرٹری جنرل کے مشورے سے کسی ذیلی علاقہ کی تشکیل یا قیام کے لئے کنوینر مقرر کریں گے۔

۳- (i) جہاں کہیں اراکین کی تعداد ۵۰ یا اس سے زیادہ ہو علاقائی سیکرٹری حسب ذیل عہدیداروں کا اس طریقہ سے انتخاب کرائے گا جو ذیلی علاقائی انتخابات کے لئے آئین میں مذکور ہے

ذیلی علاقائی انتخابات

۱- اعزازی سیکرٹری

۲- " خازن

۳، ۴، ۵- مجلس عاملہ کے تین رکن

(ii) اس مخصوص شہر یا علاقائی مجلس عاملہ کے اراکین ذیلی علاقائی مجلس عاملہ کے اراکین ذیلی علاقائی مجلس عاملہ کے مزید رکن ہوں گے

(iii) یہ انتخابات مرکزی اور علاقائی انتخابات کے بعد ہونگے۔

۴- جہاں ممبروں کی تعداد ۵۰ سے کم ہو، سیکرٹری جنرل علاقائی سیکرٹری جنرل کے صلاح و مشورے سے حسب ذیل عہدیدار نامزد کرے گا۔

۱- اعزازی سیکرٹری

ii- ذیلی علاقائی مجلس عاملہ کے لئے صرف تین ممبر ہونگے جتنے وہ مناسب خیال کرے۔ یہ شرط بھی ہے کہ سیکرٹری جنرل علاقائی سیکرٹری کے مشورے سے عہدیداروں کو بدل سکتا ہے، اگر وہ مستعفی ہوں، ریٹائرڈ ہوں یا ان کا تبادلہ ہو جائے۔ یا دوسرے اسباب تبدیلی کے متقاضی ہوں۔

۵- جہاں ممبروں کی تعداد ۲۵ سے زیادہ ہو یا جہاں مالی حیثیت علاقائی سیکرٹری کے لئے اطمینان بخش ہو ذیلی علاقے کو صرف تسلیم شدہ بینک میں اس طریقے سے اکاؤنٹ کھولنے کا اختیار ہوگا جو آئین میں مرکزی اور علاقائی اکاؤنٹوں کے متعلق مذکور ہے۔

۶- ذیلی علاقائی عاملہ اپنے اراکین کے علاقائی سیکرٹری اور سیکرٹری جنرل کے سامنے ذمہ دار ہوگی۔

۷- ہر ذیلی علاقائی عاملہ جب بھی تشکیل پذیر ہو۔ دفتری کاروبار کے اپنے قواعد وضع کرے گی مثلاً کام کا طریقہ کار اور متعلقہ علاقائی سیکرٹریوں کے توسط سے سیکرٹری جنرل سے منظوری حاصل کرنے کے بعد کام شروع کرے گی۔

۸- ذیلی حلقوں میں دفتری کاروبار کے قواعد وہی ہونگے جو علاقوں کے ہیں لیکن اس میں یہ گنجائش ہے کہ کسی خاص ذیلی حلقہ کی خصوصی ضروریات، دوسری ہنگامی ضروریات کے لئے ذیلی حلقے کے سیکرٹری، خاص صورت حال کے حوالے سے علاقائی سیکرٹری کا مشورہ طلب کریں گے۔

یہ قواعد فوری حیثیت سے نافذ العمل ہوں گے۔

عام قراردادیں

۱- چونکہ مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی علاقائی اجلاس ہائے عام کا کورم دفعہ ۷ (iii) کے مطابق پورا نہیں ہوا

اور چونکہ عام [illegible] کی تعداد جنہوں نے بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ [illegible] علاقائی انتخابات میں عملاً حصہ لیا تھا کورم کے لئے مطلوبہ تعداد سے کہیں زیادہ تھی۔ اور چونکہ سیکرٹری جنرل نے [illegible] کے مفادات کے لئے مذکورہ بالا اہم [illegible] اور

باقاعدہ قرار دیا۔

۲۔ چونکہ ملتان ذیلی حلقہ میں ایک عرصہ سے مقامی عہدیداروں کے مسئلہ پر شدید قسم کے مقامی اختلافات موجود ہیں

اور چونکہ ملتان میں گلڈ متعدد مفادات کی مالک ہے جس کے لئے مرکز کی طرف سے نگرانی سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

اور چونکہ مغربی پاکستان علاقائی عاملہ کے زیر اہتمام ملتان میں جو انتخابات ہوئے تھے انہیں مغربی پاکستان کی جنرل باڈی نے بیلٹ پیپر کھولے جانے سے پہلے ہی منسوخ قرار دیا

اور چونکہ غیر لسانی ذیلی حلقہ وارانہ تنظیموں کے انتخابات اور نامزدگیوں کے لئے کوئی تفصیلی قواعد موجود نہیں ہیں جن سے دھوکے کے امکانات نہ رہیں۔

ایسی صورت حال میں سیکریٹری جنرل نے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو آئین کی مختلف دفعات کے تحت بالخصوص دفعہ ۱۲ (الف) (۱۷) (س) کے تحت حاصل ہیں۔ ایک ذیلی علاقائی عاملہ مقرر کردی ہے جو اس وقت تک کام کرے گی جب تک اس ذیلی حلقے کے انتخابات نہیں ہوجائیں گے۔

۳۔ چونکہ مشرقی پاکستان کے علاقائی سیکریٹری دفتری کاروبار کو چلانے اور بینک سے لین دین کرنے کے لئے کوئی انتظام کئے بغیر ۵ ار اپریل ۶۲ء کو حج کرنے چلے گئے تھے

اور چونکہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ علاقائی عام انتخابات اور علاقائی عام اجلاس اور مرکزی عام اجلاس مئی میں منعقد ہونے تھے جس کے لئے ضروری تھا کہ مشرقی پاکستان میں دفتری کاروبار اور بینک کھاتہ حسب معمول چالو رہے۔

لہٰذا سیکریٹری جنرل نے مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر اپنے ان اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے جو انہیں دفعہ ۱۲ الف (۱۷) (س) کے تحت حاصل ہے اعزازی علاقائی خازن کو علاقائی سیکریٹری کا قائم مقام مقرر کیا۔ اور انہیں بینک سے روپیہ نکالنے اور جمع کرنے کا اختیار بھی دیا۔

۴۔ چونکہ اس قسم کے شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا تھا کہ آئین کی دفعہ ۲ کے پیش نظر ممبروں کی بہت بڑی اکثریت علاقائی انتخابات میں رائے دینے کے حق سے محروم ہو جائے گی۔

اور چونکہ تینوں علاقائی سیکریٹریوں نے سفارش کی تھی کہ مرکزی مجلس عاملہ کی قرارداد کی تعمیل میں ضروری رعایت دی جائے۔

اور چونکہ یہ بات ضروری تصور کی گئی تھی کہ انتخابات میں گلڈ کے وقتاً فوقتاً ممبر بننے والے ادیبوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد کی خواہشات کی عکاسی ہو۔

اور چونکہ علاقوں میں دفتری ریکارڈ کی ابتری کے باعث اور ممبروں کے متنازعہ دعوؤں کی وجہ سے یہ بات ممکن نہیں تھی کہ جلد ہی ان ممبروں کی صحیح تعداد بتائی جا سکے جنہوں نے بقایاجات ادا کر دیئے ہیں۔ اور چونکہ مرکزی اور علاقائی انتخابات گذشتہ انتخابات جو اپریل ۶۲ء میں ہوئے تھے کے دو سال کے اندر ہوں، اور چونکہ مذکورہ بالا صورت حال کے پیش نظر سیکریٹری جنرل نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے جو انہیں آئین کی دفعہ ۱۲ (الف) (۱۷) (س) کے تحت حاصل ہیں اجازت دیدی کہ تمام ممبر بقایاجات ۳۰ر جون ۶۳ء تک ادا کر دیں اور ماسوائے تمام علاقوں کے تمام ممبروں کو ووٹ دینے کا اہل رکھا

لہٰذا اب گلڈ کی مجلس عاملہ جس میں گلڈ کی مجلس عاملہ کے اراکین بھی شامل ہیں۔ سیکریٹری جنرل کے مذکورہ بالا اقدامات کی توثیق و تصدیق کرتا ہے۔

۶۔ پاکستان رائٹرس گلڈ کا یہ اجلاس عام فیض احمد فیض کو لینن انعام ملنے پر انہیں پرجوش مبارکباد دیتا ہے، یہ اجلاس اس انعام کو اردو ادب کے لئے باعث افتخار تصور کرتا ہے۔

۷۔ پاکستان رائٹرس گلڈ کا یہ اجلاس عام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو پرائیڈ آف پرفارمینس ملنے پر انہیں پرجوش مبارکباد دیتا ہے۔

ضمیمہ (ش)

قراردادیں

۱۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ اجلاس عام، افریشائی ادیبوں کی

کانفرنس کے سیکرٹریٹ کی اس غفلت کی مذمت کرتا ہے جس نے قاہرہ میں منعقد ہونے والی حالیہ کانفرنس میں گلڈ کے نام دعوت نامے کے متعلق مراسلات نہیں بھیجے۔ یہ اجلاس محسوس کرتا ہے کہ کوئی افریشیائی اجلاس اس وقت تک نمائندہ اجلاس نہیں کہا جا سکتا جب تک اس میں پاکستان شامل نہ ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ اجلاس مذکورہ تنظیم کو افریشیائی علاقے کے ادیبوں کے درمیان خیر سگالی اور مفاہمت کو فروغ دینے میں گلڈ کے تعاون کا یقین دلاتا ہے۔

۲۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا اجلاس عام سفارش کرتا ہے کہ بین الاقوامی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کرنے والے گلڈ کے وفود ان کانفرنسوں میں اگر سیاسی مباحثے ہوں تو مسئلہ کشمیر اور دیگر قومی مسائل بھی رکھے جائیں۔

۳۔ یہ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مطبوعہ اور تشہیر کردہ منشور اور دستور میں طباعت کی بعض غلطیاں ہیں لہٰذا پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ اجلاس عام مرکزی مجلس عاملہ سے درخواست کرتا ہے کہ وہ زبان کی غلطیوں کو اگر ہوں تو دور کر دے۔

۴۔ چونکہ مغربی پاکستان کے ذیلی حلقہ لاہور نے اپنے دفتر کے اخراجات، تقاریب اور سالانہ اجلاس منعقد کرنے اور دیگر متعلقہ امور کے اخراجات ادا کرنے کے لئے مرکزی گلڈ سے امداد طلب کی ہے لہٰذا یہ اجلاس عام مغربی پاکستان علاقائی کمیٹی سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس مسئلہ پر غور کرے اور ضروری کارروائی عمل میں لائے۔

۵۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ اجلاس عام یہ بات ناپسند کرتا ہے کہ مرکزی مجلس عاملہ ابھی تک حکومت پاکستان سے گلڈ کے ممبروں کے لئے بذریعہ ریل، ہوائی جہاز یا سٹیمر سے سفر کرنے میں اراکین کے لئے مراعات حاصل نہیں کر سکی، لہٰذا یہ اجلاس مرکزی عاملہ کو ہدایت دیتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی مساعی جاری رکھے اور حکومت پاکستان سے درخواست کرتا ہے کہ وہ ملک کے ادیبوں کو جنہیں ادبی یا تعلیمی جلسوں میں شرکت کرنے کے لئے ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا پڑتا ہے۔ وہ مراعات دے جو ملک کے کارکن صحافیوں کو حاصل ہیں۔

۹۔ حالانکہ پاکستان رائٹرز گلڈ کی طرف سے تمام ادیبوں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ جلسہ طے کرتا ہے کہ اس سیشن سے صرف وہ ادیب گلڈ کے رکن بن سکیں گے جن کی کم از کم ایک کتاب شائع ہو چکی ہے۔

(یہ مسئلہ مرکزی کمیٹی کو غور و خوض کرنے اور فیصلہ کرنے کے لئے بھیج دیا گیا)

۱۰۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا یہ اجلاس عام شیر بنگال اے کے فضل الحق کی وفات پر جو ایک مشہور ادیب اور صحافی تھے۔ ڈاکٹر مولوی عبدالحق، اردو کے ادیب اور صحافی حمید نظامی بنگال کے دو مشہور شعراء شیخ حبیب الرحمٰن ساہتیہ رتنا۔ اور پرجیش کمار رائے اور گجراتی کے ادیب سالک پو پاٹیہ کے انتقال پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے یہ اجلاس عام مرحومین کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ اور مرحومین کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہے۔

ضمیمہ (ص)

اردو رپورٹ کا ترجمہ

اپیل

محسن بھوپالی کا مسئلہ

ہم نے تمام کاغذات کا بغور اور مکمل طور پر مطالعہ کیا۔ صورت حال مندرجہ ذیل ہے:-

۱۔ محسن بھوپالی صاحب کو گلڈ کے سیکرٹری نے ان کے چندہ کے بقایاجات کے متعلق جو ۳۰ مارچ ۶۲ء کو ادا ہو جانا چاہئے تھا۔ ورنہ وہ امیدواری کے اہل نہیں تصور کئے جائیں گے ۹ مارچ کو مطلع کیا۔

۲۔ محسن بھوپالی صاحب نے اپنے مذکورہ بالا مکتوب مورخہ ۱۲ اپریل یعنی مرکزی ایگزیکٹو سیکرٹری کو مطلع کیا کہ انہیں محولہ بالا مکتوب ۲۴ مارچ ۶۲ء کو ملا اور انہوں نے اسی دن [illegible] چندہ بذریعہ

حق کار قصدًا منکر دیا۔ انہوں نے شکایت کی کہ اس حقیقت کے باوجود ان کا نام امیدواروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا گیا۔ ان کی مزید شکایت یہ تھی کہ یہ بات تو اصول کے خلاف ہے کہ اگر کوئی شخص بقایاجات ادا نہیں کر سکا ہو تو اس کا نام قلمزد کر دیا جائے۔

۳۔ ایگزیکٹو سیکریٹری نے ان کے مکتوب کے جواب میں تحریر کیا کہ علاقائی سیکریٹری نے جو کچھ کیا ہے وہ ان کی (ایگزیکٹو سیکریٹری) کی ہدایات کے مطابق کیا ہے۔ پھر بھی اس سلسلہ میں مزید چھان بین کی جائے گی۔ اور محسن صاحب کو چھان بین کے نتائج سے مطلع کر دیا جائے گا۔

اولاً ہمیں اس بات پر ضرور افسوس ہے کہ محسن بھوپالی صاحب انتخابات میں شرکت سے محروم رہے۔ لیکن ہماری رائے میں وہ نتائج کے خود ہی ذمہ دار ہیں۔ ان کا یہ الزام کہ انہیں جان بوجھ کر انتخابات سے الگ رکھا گیا، صحیح نہیں۔ اس قسم کی یاددہانیاں دوسرے افراد کو بھی جاری کی گئی تھیں۔ لہٰذا کوئی رکن اس رویے کے خلاف شکایت کرنے میں حق بجانب نہیں۔

اولاً ہر ممبر کا یہ فرض ہے کہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ آیا اس کا حساب صاف ہے یا نہیں۔

انہیں تو دفتر کا شکر گزار ہونا چاہیئے کہ اس نے انہیں یہ اطلاع فراہم کی۔ یہ بات بھی تعجب خیز ہے کہ ۱۹ مارچ ۶۲ء کا بھیجا ہوا مکتوب انہیں ۲۶ مارچ ۶۲ء کو ملا۔ اگرچہ مکتوب اتنی تاخیر سے انہیں ملا تب بھی اس میں بالکل اسی طرح دفتر کا کوئی قصور نہیں جس طرح محسن بھوپالی صاحب کا کوئی قصور نہیں۔

ہماری رائے میں ان کے لئے زیادہ معقول بات یہ تھی کہ وہ فی الفور علاقائی دفتر کو بذریعہ تار مطلع کر دیتے اور یہ بھی بتا دیتے کہ انہوں نے مطلوبہ رقم بذریعہ تار روانہ کر دی ہے۔ اس کے برعکس انہوں نے مرکز کو لکھا اور وہ بھی خاصی ... ہے کہ ان کا یہ صوبائی دفتر ... کوئی مدد نہ کر سکا۔ لہٰذا

اس مسئلہ میں دفتر نے جو کارروائی کی اس میں وہ قطعی حق بجانب ہے۔

آئندہ کے لئے ہمارے مشورہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ تمام اپیلیں براہ راست متعلقہ حلقوں سے کی جائیں اور اس کے بعد مرکز سے رجوع کیا جائے۔

۲۔ ہر فرد کو قانونی کارروائی کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اپنے اس حق کے ساتھ ساتھ انہیں یہ بات ہرگز ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ گلڈ کے رکن ہیں۔ اور اگر ہم گلڈ سے بعض حقوق اور مراعات کے خواہاں ہیں تو ہم پر کچھ فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم کو فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ گلڈ کے متعلق جو شکایت بھی ہو اس کا فیصلہ گلڈ ہی میں ہونا چاہیئے۔

انتخابات کے متعلق شکایات و اپیلیں

آئندہ پیدا ہونے والی شکایات کے متعلق ہماری رائے درج ذیل ہے۔ ایسی تمام شکایات براہ راست انتخابی ٹریبونل کے سامنے پیش کی جائیں۔ ایسے ٹریبونلوں کی تعداد تین ہونی چاہیئے یعنی ایک کراچی میں ایک لاہور میں اور ایک ڈھاکہ میں۔ اگر کوئی ممبر ان ٹریبونلوں کے خلاف اپیل کرنا چاہے تو اسے مرکزی ٹریبونل سے اپیل کرنی چاہیئے۔ ہر ٹریبونل مرکزی اور صوبائی۔ تین ممبروں پر مشتمل ہونا چاہیئے۔

مرکزی ٹریبونل کا صدر خود سیکریٹری جنرل ہوگا اور دوسرے اراکین اس کے نامزد کردہ ہونگے۔

اس صورت سے وہ صوبائی (علاقائی) ثالثی کمیٹیوں کے تینوں ممبروں کو نامزد کریگا۔

یہ ممبران قطعی طور پر مجالس عاملہ کے رکن نہیں ہونگے ہماری تجویز یہ ہے کہ یہ ٹریبونل اپنا فیصلہ فوراً صادر کر دیا کریں

مرکز

گلڈ کے دستور میں ترمیمات

(اراکین توجہ فرمائیں)

سنہ ۱۹۶۰ء کے اجلاس عام نے گلڈ کے دستور میں چند تبدیلیاں کی تھیں جن کی بناء پر ترمیم شدہ دستور شائع کر دیا گیا تھا۔ اب مرکزی اجلاس عام منعقدہ مئی سنہ ۱۹۶۲ء نے پھر چند تبدیلیاں کی ہیں حسب روایت ترمیم شدہ دستور پھر شائع ہو رہا ہے، اس بار اس کا اردو بنگلہ ترجمہ بھی شائع ہوگا، جب تک یہ نئی مطبوعات مکمل ہو کر ہر رکن کو نہ پہنچ جائیں مناسب ہے کہ اراکین کی اطلاع کے لئے چند اہم ترمیمات کا مختصر ذکر کر دیا جائے یہ ترمیمات دستوری طور پر نافذ ہو چکی ہیں۔

رکنیت پہلے رکنیت اس صورت میں منسوخ ہو جاتی تھی جب سالانہ چندہ نہ ادا کیا گیا ہو یا ادائگی کی سہولتیں حاصل نہ کر لی گئی ہوں اب رکنیت منسوخ ہو جانے کی مندرجہ ذیل صورتیں یہ ہیں:۔

۱۔ اگر استعفیٰ دیدیا جائے۔

۲۔ اگر گلڈ سے اخراج کر دیا جائے (حسب ضابطہ)

۳۔ اگر صوبائی عاملہ کے تین چوتھائی رکن متفق ہوں کہ رکن مذکور گلڈ کی رکنیت کا اہل نہیں تھا اور اس فیصلے سے مرکزی عاملہ کی اکثریت بھی اتفاق کرتی ہو۔

۴۔ اگر کوئی رکن بے نظمی کا مرتکب ہو۔ بے نظمی کی تفصیل یہ ہے کہ اگر رکن بذریعہ اشاعت یا دوسرے طریقہ سے گلڈ کے مفادات کو مجروح کرے اور صوبائی عاملہ یا مرکزی عاملہ تین چوتھائی اکثریت سے یہ طے کرے کہ اس نے کسی حرکت سے گلڈ کے مفادات کو مجروح کیا ہے تو سیکریٹری جنرل کی منظوری کے بعد رکنیت منسوخ کر دی جائے گی۔ اس ذیل میں اپیل مرکزی منتظمہ اور مرکزی اجلاس عام کو پیش ہو سکتی ہے۔

۵۔ تاوقتیکہ مرکز چندے کی ادائیگی کی عام سہولتوں کا اعلان نہ کرے، رکنیت چندے کی ادائیگی کے بغیر منسوخ ہو جائے گی۔

مرکزی منتظمہ

مرکزی منتظمہ کا انتخاب بذریعہ ڈاک بھی ہو سکے گا اس کی ایک سات رکنی مجلس قائمہ بھی ہوگی۔

اجلاس عام

صوبہ اور مرکز کا اجلاس عام بغیر جلسہ ہوتے بھی فعّال و مختار قرار دیدیا گیا ہے۔

انتخاب

صوبائی اور مرکزی عاملہ کا انتخاب بین اللسانی اشتراک رائے سے ہوگا۔

سکریٹری جنرل

پہلے سکریٹری جنرل صرف ایک میقات کے لئے منتخب ہو سکتا تھا۔ اب وہ دو مسلسل میقاتوں کے لئے منتخب ہو سکتا ہے ماسوا موجودہ سکریٹری جنرل کے جو اس بار دوسری میقات کے لئے منتخب ہوئے ہیں وہ آئندہ میقات کے لئے منتخب نہیں ہو سکیں گے

۲۔ سکریٹری جنرل کو چند انتظامی اختیارات دئے گئے ہیں، جن کی رو سے تمام اراکین اور چندے داران دستوری طور پر پابند ہیں کہ سکریٹری جنرل کی انتظامی ہدایات اور فیصلوں پر عمل کریں، بصورت عدم تعمیل سکریٹری جنرل رکن یا عہدے دار مذکور کو معطل کر سکتے ہیں اور بعد میں مرکزی عاملہ کی منظوری کے بعد رکن مذکور کو گلڈ سے خارج کر سکتے ہیں۔

۳۔ ہنگامی صورت حال میں سکریٹری جنرل ان تمام اختیارات کا استعمال کر سکتے ہیں جو مرکزی عاملہ اور مرکزی اجلاس عام کو حاصل ہیں اور وہ اختیارات بھی استعمال کر سکتے ہیں جو انہیں دستور کی رو سے حاصل نہیں ہیں، مگر وہ ایسے اختیارات کے تحت کئے جانے والوں فیصلوں کی توثیق مرکزی عاملہ سے بہت جلد کرائیں گے۔

خازن

خازن پہلے منتخب ہوتا تھا، اب یہ ایک آسامی قرار دی گئی ہے، جس کے لئے سکریٹری جنرل اور منتظمہ ایک اعزازی یا تنخواہ دار کارکن چن سکتے ہیں۔

مرکزی سکریٹری

پہلے اس عہدے کے لئے ایگزکٹو سکریٹری ہوتا تھا اب وہ عہدہ دار مرکزی سکریٹری کہلائے گا۔

نصاب مجالس (کورم)

پہلے اجلاس عام کا نصاب ایک چوتھائی رکنیت تھا اب دس فیصدی کر دیا گیا ہے۔

اخراج

سابقہ دفعات کے علاوہ ایک دفعہ اور بڑھا دی گئی ہے وہ یہ ہے۔ اگر تحقیق کے بعد مرکزی عاملہ کی تین چوتھائی اکثریت متفق ہو کہ کسی رکن نے بذریعہ اشاعت کسی دوسرے رکن کے ذاتی (غیر ادبی) وقار یا خاندانی وقار کو مجروح کیا ہے تو وہ سکریٹری جنرل کی منظوری کے بعد رکن مذکور کو گلڈ سے خارج کر سکتی ہے اس فیصلے کی اپیل اجلاس عام کو پیش ہوگی۔

نظم و ضبط

دستور میں ایک تفصیلی دفعہ بڑھا دی گئی ہے جس کی رو سے اراکین کو گلڈ کے سلسلے میں نظم و ضبط کی پابندی کرنی پڑے گی۔

اپیلیں

جملہ انتخابات کے سلسلے میں انتخابی ٹریبونل ہوں گے، اراکین پابند ہیں کہ اپیلیں صرف حسب دستور کریں۔

ترجمہ

مرکزی دفتر کا پیش کردہ دو سالہ پروگرام

جو اجلاس عام نے منظور کیا

درجہ بندی ہماری تجویز ہے کہ آئندہ میقات کے لئے آپ لوگ اپنے حلقوں میں ہماری مدد سے (اگر ضروری ہو) ایک جامع پروگرام تیار کریں جس کی میعاد دو سال سے بڑھا کر تین سال کر دینی چاہئے، اس سفارش کا اصل مقصد یہ ہے کہ اجلاس عام پر خاص رقم صرف ہوتی ہے جس کا اجلاس تین سال میں ایک دفعہ سے زیادہ نہ ہونا چاہئے، منصوبوں اور انتظام و انصرام پر تبادلۂ خیالات کرنے کے لئے مرکزی کمیٹی اور علاقائی کمیٹیاں موجود ہیں، اس اجلاس عام کا خاص مقصد ریویو، انتخابات اور آئینی ترمیمات کرنا ہے جب ہماری مالی حالت بہتر ہو جائے تو اس کا اجلاس بار بار ہو سکتا ہے اس کی بنیاد علاقائی انتخابات کے اضافی اخراجات اور پریشانیاں ہیں، ان تمام چیزوں کو کم از کم ایک سال کے لئے مزید ٹالنا چاہئے، یہ بہت اہم سفارش ہے۔

نوٹ:۔ اس تجویز میں ترمیم کرا کے تمام پروگرام کی میقات دو سالہ کر دی گئی —

پرانے مطالبات ان تمام قراردادوں کو جو پہلے کنونشن اجلاس عام، مرکزی مجلس عاملہ، اور علاقائی مجالس عاملہ نے منظور کی تھیں، لیکن حکومت اور دوسرے اداروں نے ان کو عملی جامہ نہیں پہنایا، منوانے کی کوشش جاری رکھنی چاہئے۔

مالیاتی خود کفالت ہم نے اس مسئلہ پر "مالیات" کے عنوان کے تحت بحث کی ہے، ہماری رائے یہ ہے کہ آپ بھی آئندہ دو سال کے لئے اسے اپنے پروگرام کے ایک جزو کی حیثیت سے اختیار کر لیں، اسے مرکزی مجلس عاملہ نے منظور کر لیا ہے اور ہم تقریباً اس منصوبے کے درمیان پہنچ چکے ہیں، اس منصوبے کو پورے طور سے عملی جامہ پہنانے میں تقریباً دس ماہ لگ جائیں گے، اسی اثناء میں ہماری علاقائی کمیٹیوں کو متعلقہ صوبائی حکومتوں سے ثقافتی اہمیت کے خصوصی منصوبوں کے لئے مالی امداد حاصل کرنے کے لئے سلسلہ جنبانی کرنی چاہئے، ہمیں یقین ہے کہ اگر انہوں نے اپنے مقصد کی صحیح وکالت کی تو انہیں یقیناً کامیابی حاصل ہوگی۔

۲۔ کاپی رائٹ میں تربیت یہ بات محسوس کی گئی ہے کہ ہم کاپی رائٹ کے سلسلے میں خاصی لے دے کرتے ہیں لیکن بسا اوقات ایسی آسان صورت حال کو بھی جس سے آسانی سے نمٹا جا سکتا ہے ہمارے اراکین نہیں سمجھتے کیا نئے قانون سے یقیناً نئی مشکلات پیدا ہوں گی اور اگر انہیں صحیح طور پر نہیں سمجھا گیا تو مصنفوں کی ایک بھاری اکثریت اندھیرے میں رہ جائے گی مرکز کی تجویز ہے کہ وہ کاپی رائٹ کے متعلق اردو اور بنگالی ہدایت نامے شائع کرے لیکن یہ ضروری ہے کہ خطے بھی وسیع پیمانہ پر تربیتی کام انجام دیں، اس مقصد کے لئے انہیں ذیلی علاقائی سمینار

منعقد کرنے چاہئیں اور ضروری توضیحات کے لئے مقرر بھیجنے چاہئیں مرکز بلا معاوضہ بعض مقرر تیار کر سکتا ہے۔

حلقوں کو چاہئے وہ اپنے دائرۂ عمل کے مصنفوں کے کاپی رائٹ حقوق کی دفاع کریں۔

آرڈیننس کے فوری نفاذ کے بعد ہم اسٹینڈرڈ اکٹھی معاہدے شایع کریں گے۔

اس میدان میں فتح اس وقت تک مکمل نہیں ہوگی جب تک بعض مصنفین اس سلسلے میں عدالتی کارروائی کا حوصلہ ظاہر نہ کریں۔

۳۔ ثقافتی سرگرمیاں

اہم شخصیتوں اور موضوعات پر بحث و مباحثہ کرنے کے لئے اہم شہروں میں مستقل ماہوار یا پندرہ روزہ جلسے منعقد ہونے چاہئیں ہمارے پاس دو سلسلے ہیں جن میں ہم تمام روداد زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفیض کرنے کے لئے شایع کریں گے، یہ بات افسوسناک ہے کہ ہم ابھی تک تراجم کے ذریعہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے دو بڑے لسانی حلقوں کو خوش اسلوبی سے مربوط نہیں کر سکے۔ یہ کام اب کیا جا سکتا ہے ہم قلم میں جو اہم کارروائیاں شایع ہوتی ہیں انہیں ترجمہ کرکے پتریکا میں شائع کرنا چاہئے اور پتریکا میں شائع شدہ کارروائیوں کو ہم قلم میں —

مستقل جلسوں کے علاوہ کلاسیکی ادیبوں اور شاعروں کے متعلق بڑے بڑے ثقافتی اجتماعات منعقد کرنے چاہئیں جیسا گذشتہ سال ہوا تھا ایسے اجتماعات میں بین اللسانی تبادلے لازمی طور پر کئے جائیں، اہم موضوعات پر سہ ماہی سمینار منعقد ہونے چاہئیں۔

تفصیلی امور کا جائزہ مرکزی مجلس عاملہ اور علاقائی مجالس عاملہ کو کرنا چاہئے۔

بیمہ بیمہ حسب معمول جاری رہنا چاہئے، اس کے علاوہ اگر آپ زیادہ فوائد کی دوسری پالیسی لینا چاہتے ہوں تو اراکین کی عام رائے شماری کرانے کے بعد مرکز کو کوشش کرنی چاہئے

فلاح و بہبود اس مسئلہ پر ہمارے پاس فوری طور پر قابل عمل کوئی نئی تجویز نہیں ہے کیونکہ جب ممبروں کی سرگرم معاونت کو کسی اسکیم کا ایک حصہ بنا دیا جاتا ہے تو اس کی ناکامی یقینی ہوتی ہے آج سوائے اس معمولی سی اتفاقی امداد کے لئے جو ہم ضرورت مند ممبروں کو دیتے ہیں ہمارے پاس وافر وسائل نہیں ہیں، یہ مسئلہ علاقوں کے سپرد کر دینا چاہئے اور مرکز کی حیثیت آخری فیصلہ کرنے والے ادارے کی ہونی چاہئے اور ایسی بھی کہ وہ اپنے امتیاز تمیزی سے علاقائی سفارش پر یا بغیر اس کے مدد دے۔

فلاحی پروگراموں کے لئے ضروری ہے کہ علاقائی دفاتر بہت زیادہ سرگرم ہوں جو ابھی تک نہیں ہیں، لیکن ہمیں اصولی طور پر نئے آنے والوں سے زیادہ اچھے نتائج کی توقع ہے۔

اشاعت اس منصوبے کو مکمل طور پر یکجا اور مرکزی بنا دینا چاہئے کتابوں کے انتخاب اور ان کی اشاعت جیسی ذمہ داریوں کی تقسیم کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں اس شعبہ میں کوئی ترقی نہیں ہوئی اور مغربی پاکستان میں بھی کام کی رفتار بہت سست رہی جس وقت چھاپے خانے قایم ہو جائیں گے اس وقت تو یہ منصوبہ پورے پروگرام کا ایک جزو بن جائے گا جس کا انتظام و انصرام ایک علیحدہ شعبہ کرے گا، فی الحال مرکز اس کام کو اپنی نگرانی میں جاری رکھنا چاہئے

رسایل جس وقت تک متعلقہ علاقائی منتظمین سکریٹری جنرل کو اس بات کا اطمینان نہ دلا دیں کہ وہ ہم قلم اور پتریکا کو مستعدی سے چلا سکتے ہیں اس وقت تک یہ دونوں رسایل مرکز کے تحت رہنے چاہئیں۔

ان رسایل یا گلڈ کے کسی دوسرے رسالے کا ایک خصوصی پہلو یہ ہونا چاہئے کہ ملک کے اندرونی سیاست میں وہ غیر جانبدار رہے اور کسی گروپ کے ساتھ صف بندی میں شریک نہ ہو، اصولی حیثیت سے ہمارے رسالوں میں تبصرے شائع نہیں ہونے چاہئیں اور نہ ہمارے اداریوں میں ہمعصر ادیبوں پر نکتہ چینی کی اجازت ہونی چاہئے ان کا اصل مقصد ادب کو فروغ دینا اور ادیبوں کے حقوق کا تحفظ کرنا ہے۔

صحافیوں سے تعاون ہمیں باہمی مفادات کے لئے صحافیوں کی متعلقہ یونینوں اور ان کی

فیڈریشن سے سرگرم رابطہ قایم کرنا چاہیے یہ ایک نئی تجویز ہے اور سنجیدگی سے غوروفکر کی مستحق ہے۔

پی-ای-این بین الاقوامی

جیسا کہ مرکزی کمیٹی نے منظور کیا ہے، ہمیں باہمی مفادات کے مسایل پر پی۔ای۔این انٹرنیشنل سے قوی رابطہ قایم کرنا چاہیے

یونیسکو اور یو۔این

ہمیں یونیسکو اور اقوام متحدہ کی دوسری انجمنوں سے تعاون جاری رکھنا چاہیے اور ان سے تعاون حاصل کرنا چاہیے، کانگو کے قحط میں امداد کے لئے یونیسکو کے پروگرام اور اقوام متحدہ کی مساعی میں ہماری شرکت نے ان اداروں میں ہمارے لئے بہت اچھا اثر پیدا کر رکھا ہے

بیرونی ادبی جماعتیں

ہمیں باہمی مفادات کے مسئلہ پر بیرونی ادبی جماعتوں کے ساتھ ان سے سیاسی ہم آہنگی یا اختلافات سے قطع نظر، تعاون جاری رکھنا چاہیے؛ ہمیں اپنی مالی سہولتوں کے مطابق بیرونی ممالک کے وفود کو ملک میں مدعو کرنا اور اپنے وفد بیرونی ممالک میں بھیجنا چاہیے

برادری کو امداد

آپ نے فری میسنس برادرہوڈ کا نام ضرور سنا ہوگا جس کا ضابطہ یہ ہے کہ اپنے اراکین کی ہر شعبۂ حیات میں ہر قسم کی مدد کی جائے، اس رویہ کو یہاں رائج کرنا ایک اعلیٰ نصب العین معلوم ہوتا ہے مگر ہم نے یہاں کسی حد تک اس کا تجربہ کیا ہے اور اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگر بڑے پیمانہ پر اس کو عملی جامہ پہنایا جائے تو یہ نصب العین حاصل ہوسکتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ایسے ادیب کو لے لیجئے جو بے روزگار ہے اسے روزگار فراہم کرنا ہمارے علاقائی سیکریٹری کا فرض نہیں ہے

لیکن وہ اس رکن کی سفارش کسی دوسرے ایسے رکن سے کرسکتا ہے جو فائدہ پہنچا سکے، اگر ان خطوط پر مساعی کی جائیں تو خاصے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، ہمارے موجودہ اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں ہمدردانہ اقدامات رضاکارانہ باہمی امداد کے مقاصد کی تکمیل کرسکتے ہیں اگر آپ اپنا کبھی وقت، اثرات، توانائی اور سرمایہ جو آپ کے پاس ہو اپنے کسی بھائی کے لئے صرف کرسکیں تو اس کے لئے آپ کو فرشتہ ہونا

ضروری نہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہماری بہت سی پریشانیوں کی وجہ ایسا نظام ہے جس میں وسیع تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور ہر شخص کو آزادی ہے کہ وہ اس کی تبدیلی کے لئے اپنا کردار ادا کرے۔

بہرحال نئی تبدیلیاں آنے تک انفرادی سطح پر اور اپنی تنظیمی برادری کے اندر رہتے ہوئے چھوٹی چھوٹی امداد کے لئے کام کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

ذیلی علاقائی تشکیلیں

آئینی گنجائشوں یا دوسرے مستقل قواعد کی عدم موجودگی میں ذیلی علاقائی تشکیلوں کو عملاً نظر انداز کیا گیا تھا، ہماری تجویز یہ ہے کہ یا تو اس وقت یا آئندہ ایک ذیلی کمیٹی کو مختلف ذیلی حلقوں کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے اور ایسے قواعد وضع کرنے اور نافذ کرنے چاہییں جو ان کے انتخابی یا نامزدگی کے طریقہ عمل پر اور گلڈ کے پروگراموں میں ان کی عملی شرکت پر حاوی ہوں، حال ہی میں پشاور اور حیدرآباد کے ذیلی حلقوں نے انتظامی امور میں بہت سے مسائل کھڑے کردیے ہیں ملتان بھی سیاست کا اکھاڑا بنا ہوا ہے، مشرقی پاکستان میں ذیلی حلقوں کو زیادہ سے زیادہ سرگرم بنانے کی ضرورت ہے۔

دوسرے امور

دوسرے امور کو مثلاً اراکین کو بڑے شہروں میں بسانا وغیرہ جس کے لئے وسیع مقامی منصوبہ بندی اور مختلف وسائل کو بروئے کار لانے کی ضرورت ہے مرکزی اور علاقائی مجالس عاملہ پر چھوڑ دینے چاہییں۔

تمام حلقوں میں پروگرام کی تمام تفصیلات تیار کی جائیں نقشے ہر علاقائی (اور مرکزی) دفتر میں آویزاں ہونے چاہییں تاکہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اور حاصل شدہ کامیابی کے متعلق بیک نظر معلومات حاصل ہوسکیں۔

واضح رہے کہ تمام اسکیموں کا ضروری عنصر ایک معقول اور سائنٹفک بجٹ کی تیاری ہے، اس سلسلے میں علاقوں کی مدد کرنے میں ہمیں مسرت ہوگی۔

علاقائی مجلس عاملہ (مشرقی پاکستان) کے اراکین جو ۱۹۶۲-۶۳ء کے لئے منتخب ہوئے

نام	پتہ
بیگم شمس النہار محمود	معرفت بنگالی اکیڈمی۔ ڈھاکہ
جناب ابو الکلام شمس الدین	۱۴۱۔ آغا میسح لین ڈھاکہ
جناب منیر چودھری	دار العافیہ۔ دھان منڈی۔ ڈھاکہ
جناب عسکر ابن شیخ	ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ
جناب سراج الاسلام چودھری	گاؤں اور ڈاکخانہ باری کھالی ضلع ڈھاکہ عظیم پورا سٹیٹ۔ ڈھاکہ
جناب عبد الرشید خان	بنگالی مترجم حکومت مشرقی پاکستان رجسٹرار مطبوعات۔ ڈھاکہ
جناب محبوب جمال زاہدی	رضیہ منزل۔ شانتی نگر۔ ڈھاکہ ۲
جناب محمد رفیق الاسلام	شعبۂ بنگالی، ڈھاکہ یونیورسٹی۔ ڈھاکہ۔ ۲
ڈاکٹر محمد شہید اللہ	۷۹۔ بیگم بازار۔ ڈھاکہ۔
جناب محمد محفوظ اللہ	آغا مسیح لین۔ ڈھاکہ۔ ۲
جناب صلاح الدین محمود	معرفت پریس کلب ڈھاکہ (اردو)

صحیح پتے

ہمارے لاہور مغربی پاکستان رکن نے حال ہی میں مغربی پاکستان کے اراکین کے نام اور پتوں کی فہرست شائع کی ہے اس میں کہیں کہیں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں، لہٰذا ہم اس فہرست کو "ہم قلم" میں گاہے بگاہے شائع کرتے رہیں گے۔
اگر کسی رکن کا پتہ اب بھی غلط شائع ہو تو وہ ازراہ عنایت پاکستان رائٹرز گلڈ، مرکز کو اس کی اطلاع دیں تاکہ آئندہ شماروں میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

(مرکز)

عبدالرحمٰن صاحب صدیقی ۷۔ لارنس روڈ، لاہور۔
آفتاب احمد صاحب ۲۔ مین روڈ، لاہور۔
احسان دانش صاحب ایبک روڈ، انارکلی لاہور۔
اے حمید صاحب ۳۔ ولی اسٹریٹ فلیمنگ روڈ لاہور۔
احمد راہی صاحب سوتی اسٹریٹ گوال منڈی لاہور
(پروفیسر) انجم رومانی صاحب معراج اسٹریٹ فلیمنگ روڈ لاہور۔
عاشق عبدالمتین صاحب چشتیہ ہائی اسکول کرشن نگر، لاہور۔
اشفاق احمد صاحب ۲۷۔ دی مال، لاہور۔
(ڈاکٹر) محمد باقر صاحب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور۔
(ڈاکٹر) فقیر محمد فقیر صاحب ۴۲۔ ماڈل ٹاؤن، لاہور۔
(بیگم) ہاجرہ مسرور صاحبہ ۳۷۔ اے جیل روڈ لاہور۔
(بیگم) حسن نشاط عالمگیر ۲۱۔ گلبرگ، لاہور۔
(ڈاکٹر) عبادت بریلوی صاحب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور
اعجاز حسین صاحب بٹالوی الف۔ ۸۳ ماڈل ٹاؤن، لاہور
(ڈاکٹر) جاوید اقبال صاحب ۳۔ علامہ اقبال روڈ، لاہور۔
(بیگم) خدیجہ مستور صاحبہ کملا راجہ اسٹیٹ بنگلا نمبر ۲۔ اسٹریٹ نمبر ۲ گیتا پارک، لاہور
مرزا ادیب صاحب ایڈیٹر "ادب لطیف" لاہور۔
محمد خلیل الرحمٰن صاحب ۲۔ ڈونگا سنگھ بلڈنگ سنت روڈ، لاہور
حامد علی خان صاحب ۴۴۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔

محمد صفدر میر العظمت کینال بنک لاہور۔
حبیب جالب صاحب معرفت امداد علی صاحب یونیورسٹی پوسٹ آفس لاہور۔
منیر نیازی صاحب ۵۔ اے رسول پارک اچھرہ لاہور
ملک نسیم الظفر صاحب ریڈیو پاکستان لاہور
ناصر کاظمی صاحب نیو بلڈنگ پدھستر روڈ نزد ٹیوب ویل کرشن نگر لاہور
قیوم نظر صاحب گورنمنٹ کالج، لاہور۔
قتیل شفائی صاحب عالمگیر روڈ مصری شاہ لاہور۔
ریحانہ قمر صاحبہ معرفت اے حمید صاحب ۳۔ ولی اسٹریٹ فلیمنگ روڈ لاہور۔
ریاض قادر صاحب ۳۔ ٹمپل روڈ لاہور۔
(پروفیسر) سجاد باقر رضوی صاحب اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور
سجاد رضوی صاحب انفارمیشن افسر پبلک ریلیشن ڈیپارٹمنٹ لاہور
شیر محمد اختر صاحب ۵۰۔ ٹمپل روڈ لاہور۔
شہرت بخاری صاحب ۲۲۔ ہجویری اسٹریٹ شیش محل روڈ لاہور۔
صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم، ۴۰ دیو سماج روڈ، لاہور۔
(پروفیسر) وقار عظیم صاحب ۷۔ ای بلاک سی سمن آباد لاہور۔
ظہیر کاشمیری صاحب ۹۔ بیڈن روڈ لاہور

فیض احمد صاحب فیض ۴۱۔ ایبرسن روڈ لاہور۔
احمد ندیم قاسمی صاحب عقب دیال سنگھ لائبریری نسبت روڈ لاہور
حفیظ جاوید صاحب ۴۷۹۔ سمن آباد لاہور۔
(بانو) قدسیہ صاحبہ معرفت داستان گو ۲۷۔ دی مال لاہور
(ڈاکٹر) صلاح الدین صاحب اکبر (ایم۔بی۔بی۔ایس) ۱۵۰۔ بی گلبرگ
لاہور
سید قاسم محمود صاحب شیش محل کتب گھر شیش محل روڈ لاہور
(بریگیڈیئر) جی۔ایم اثر صاحب سول ملٹری گزٹ۔ دی مال، لاہور
نور بجنوری صاحب معرفت ڈیوک آپٹیکل کمپنی ۱۶، ہسپتال روڈ
لاہور
کرم الٰہی زرین صاحب پوسٹ بکس نمبر ۴۹ بحرین۔
(ڈاکٹر) عبدالسلام خورشید صاحب ۱۰۔ مسلم ٹاؤن کینال سائیڈ
لاہور
سردار محمود صاحب لاہور اکیڈمی ۵ ۔ بیگار روڈ۔ لاہور۔
عزیز اثری صاحب معرفت فیروز سنز دی مال۔ لاہور۔
بشیر منذر صاحب کتب مینار پبلشرز ۱۶۔ ایبک روڈ انارکلی، لاہور۔
سید محسن ہاشمی صاحب معرفت نیرنگ خیال ۷۔ فلیمنگ روڈ، لاہور
ابوظفر نازش رضوی صاحب ۱۳۷۔ ملتان روڈ، لاہور۔
حکیم یوسف حسن صاحب ایڈیٹر نیرنگ خیال ۷۔ فلیمنگ روڈ، لاہور
احمد سعید صاحب ۴۷۔ جے ماڈل ٹاؤن، لاہور
خواجہ عبدالسمیع پال اثر صہبائی صاحب ۲۴۔ غلام نبی کالونی پونچھ
روڈ سمن آباد لاہور
فیروز سائیں صاحب مکان نمبر ۲۱۶۴ شاہی محلہ لاہور۔
ایم اسلم صاحب، بارود خانہ لاہور۔
امجد حسین صاحب، چیف رپورٹر پاکستان ٹائمز لاہور۔
حبیب کیفوی صاحب، ایونسز ہوٹل منٹگمری روڈ۔ لاہور۔
نواز صاحب ۲/۴۳۔ گوورا جن نگر۔ لاہور۔
صلاح الدین صاحب ندیم، مکان نمبر ۳ گووندرام اسٹریٹ نمبر ۶۳
چیمبرلین روڈ۔ لاہور

شہزادہ احمد صاحب، ۱۷۔ بی نسبت روڈ لاہور۔
یونس ادیب صاحب، سانحہ شمس الدین مکان نمبر ۱۱۔ بلاک
اسٹریٹ لاہور۔
عشرت رحمانی صاحب، ۱۸۔ ا ے رتیگن روڈ۔ لاہور۔
غلام حسین۔ ذوالفقار صاحب، اورینٹل کالج لاہور۔
(ڈاکٹر) سید عبداللہ صاحب، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور۔
انور سجاد صاحب، نشیمن چونہ منڈی۔ لاہور۔
غلام علی صاحب چوہدری، متصل احمدیہ بلڈنگ، برانڈرتھ روڈ لاہور
محمد عظیم قریشی صاحب، فیروز پور روڈ لاہور۔
سید امتیاز علی صاحب تاج، ۴۰ ایبٹ روڈ لاہور۔
محمد اختر صاحب، ۴۔اے مین بازار سمن آباد۔ لاہور۔
خلیل صحافی صاحب، ۶۷ ٹمپل روڈ۔ لاہور۔
بشیر احمد ساجد، ایڈمنسٹریٹو آفیسر ویسٹ پنجاب لیبارٹریز فیروز پور
روڈ۔ لاہور
حمید اختر صاحب ۲۵۔ ملتان روڈ۔ لاہور۔
نصیر انور صاحب، ای۔۱۳ نسبت روڈ۔ لاہور۔
ایم۔ آئی (رزم صدیقی) ۵ ٹمپل روڈ لاہور۔
محمد حسین صاحب، بابا عالم سیاہ پوش ۵، فیروز پور روڈ۔ کینال بنک
لاہور
شفیق بانو صاحبہ، ۷۔ سی ماڈل ٹاؤن۔ لاہور۔
یوسف جمال انصاری صاحب، اسلامیہ کالج، سول لائنز۔ لاہور
حکیم عبدالکریم ثمر صاحب، ۶۔ گیلانی اسٹریٹ اچھرہ لاہور۔
عبدالحمید شیخ صاحب۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ دی مال۔ لاہور
سبط حسن صاحب، ۹۲۲ این سمن آباد۔ لاہور۔
رفیع پیرزادہ صاحب، ۲۵۔ بہاولپور روڈ۔ لاہور۔
سراج الدین احمد نظامی صاحب، معرفت سلیم اقبال صاحب مکان نمبر ۱۲۸
تحصیل بازار۔ لاہور
انتظار حسین صاحب، ۱۶۱۔ فیروز پور روڈ لاہور۔
سید ابو یتیم صاحب، ۲۹۔ بی ماڈل ٹاؤن لاہور۔

حفیظ رحمانی صاحب، ۲۱ اے۔ کوئین روڈ لاہور۔
عبدالصمد صارم الازہری صاحب۔ اورینٹل کالج لاہور
صادق حسین صاحب، پرفیکٹ الیکٹرک کمپنی بیڈن روڈ لاہور
شفیق اللہ خان صاحب، شفیق کوٹھی، ۱۹ اے چیمبرلین روڈ لاہور۔
مشرف علی انصاری صاحب، ۲۳۷۔ ڈی بلاک وحدت کالونی لاہور
سید عبدالجلیل مائل نقوی صاحب، جاوید کالج مین بازار اسٹریٹ نمبر ۱
رام گڑھ مغل پورہ لاہور
صوفی عبدالقدیر بیان صاحب، ۴۲ میکلوڈ روڈ لاہور۔
خلیق احمد خلیق صاحب، ۳۰۴۔ این سمن آباد لاہور۔
شیخ محمد اسماعیل صاحب، پانی پتی برانڈرتھ روڈ۔ رام گلی نمبر ۳
مکان نمبر ۱۸۔ لاہور۔
حکیم شیر محمد ناصر صاحب، ایڈیٹر ماہنامہ پنجابی ادب، چاہ چھوارہ
مزنگ لاہور۔
بشیر احمد ڈار صاحب، انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر ۲۔ کلب روڈ لاہور
شاہد حسین رزاقی صاحب، ۱۰۴۱۔ بی ماڈل ٹاؤن لاہور۔
اکمل علیمی صاحب، مکان نمبر ۱۱۵۔ ایچ اندرون دہلی دروازہ لاہور
سید علی مہدی نقوی صاحب خیال امروہی، ۱۹ بیت القیام ۹۷
میکلوڈ روڈ لاہور۔
حبیب اشعر صاحب، دواخانہ حاذق الملک چوک رنگ محل لاہور۔
محمد طفیل صاحب ایڈیٹر نقوش۔ ۱۱۔ ایبک روڈ لاہور۔
شفقت تنویر مرزا صاحب، معرفت سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور۔
خان عارف برنی صاحب، ۱۷۶۴۔ بی بازار سرکاں لاہور۔
یونس جاوید صاحب، نورانی اسٹریٹ اچھرہ لاہور۔
منظور طارق صاحب ۵۷، گلستان کالونی دھرم پورہ لاہور
فروغ احمد صاحب نقی بلڈنگ۔ انارکلی لاہور۔
انور شبنم دل صاحب، ۱۲۴ این سمن آباد لاہور۔
ابن حسن برنی صاحب، ۱۹۔ بی گلبرگ لاہور۔
ٹی سی منظر صاحب، معرفت آر میسے گلوب سینما لاہور کینٹ
محمد منور صاحب، گورنمنٹ کالج لاہور۔

ملک عبداللطیف خان صاحب ڈائرکٹر آف لیبر یونیورسٹی روڈ لاہور۔
علیم اللہ صدیقی صاحب ۱۴۱۔ ڈی بلاک ماڈل ٹاؤن لاہور۔
عبدالشکور احسن صاحب، یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور۔
محمد جعفر صاحب پھلواری ... ۵۔ این سمن آباد لاہور۔
نصیر احمد ناصر صاحب، ۹۷۔ ڈی گلبرگ لاہور
عبدالسلام صاحب ۴۰۔ مزنگ روڈ۔ لاہور۔
صاحبزادہ مرزا صمصام الدین فیروز صاحب، ۲۹۴۔ بی فیروز پور روڈ
گارڈن ٹاؤن۔ لاہور۔
سید عابد علی عابد صاحب، ساگر روڈ صدر بازار لاہور کینٹ۔
عبدالرحیم صاحب شبلی (ایم کام) ۷ جیا رام بلڈنگ کبیر اسٹریٹ
نئی انارکلی لاہور۔
سید اکبر کاظمی صاحب، ۵۲۔ حبیب اسٹریٹ محمدی محلہ دسن پورہ لاہور
محمود اختر کیانی صاحب ۱۱۴ گلبرگ روڈ لاہور۔
(پروفیسر) فیروز الدین رازی صاحب مکان نمبر ۱۵۔ اسٹریٹ نمبر ۹
بیڈن روڈ لاہور۔
(حکیم) محمد حسین عرشی صاحب گیتا بھون (دار القرآن) لسنیت روڈ
لاہور۔
مظہر الحق صاحب مظہر ہاشمی، دفتر پی۔ آئی۔ اے چیرنگ کراس لاہور۔
حامد جلال صاحب، لکشمی مینشن دی مال لاہور۔
محمد افضل خان صاحب۔ پرنسپل اینگلو پنجابی کالج ۴ ٹمپل روڈ لاہور
منظور احمد احمر صاحب۔ مکان نمبر ۸۲۷۔ اندرون لوہاری گیٹ
چوک لوہاری منڈی گلی پھلاں والی لاہور
نوید انجم صاحب معرفت آفتاب احمد تابش صاحب، ڈپٹی اسٹنٹ
پوسٹ آفس ڈھولن ملتان روڈ لاہور۔
سید بقا نقوی صاحب، ۵۵ الف پی اینڈ ٹی کالونی ملتان روڈ
لاہور۔
ابوالطاہر فدا حسین فدا صاحب، ادارہ مہر و ماہ چوک مستی لاہور۔
خورشید احمد انور صاحب، محمد نگر میو روڈ لاہور۔
سید سبط حسن ہوش ترمذی صاحب، ۱۲/۵ رام نگر دیو سماج روڈ لاہور
ایم۔ اے۔ حمید۔ کے۔ سی صاحب۔ مین بازار۔ مزنگ لاہور۔

میر منظور محمود صاحب، ولی عارفی ۲-۲۵ اسٹریٹ موہنی روڈ لاہور
[illegible] صاحب، ۲۱۱ شیڈ روڈ مغل پورہ لاہور۔
وحید قریشی صاحب، ۲۲۹-این سمن آباد، لاہور۔
سکینہ محمود صاحبہ انٹرمیڈیٹ کالج فار ویمن گلبرگ۔ لاہور۔
عمر فیضی صاحب، ۹۔ حالا اسٹریٹ اسلامیہ پارک۔ لاہور۔
(مسز) کے۔ این احمد خاور، ۵۴-اے، گورو تیغ بہادر روڈ کرشن نگر لاہور
سجاد حارث صاحب، اسماعیل کالج بھکر (میانوالی)

شیخ محمد عثمان صاحب لیکچرر گورنمنٹ کالج، لاہور۔
ایس محمد اختر صاحب۔ انکم ٹیکس افیسر۔ لاہور۔
فہمیدہ سعید صاحبہ۔ مکان نمبر ۹۷۔ جہانگیر اسٹریٹ نمبر ۱ کالج روڈ لاہور
راجہ رسالو۔ ۲۲ محمد علی اسٹریٹ شیش محل پارک، شاہ جہاں روڈ لاہور
کلب علی خان فائق رام پوری۔ مکان نمبر ۲ فیروز دین اسٹریٹ ۷ تیغ شیر روڈ ستیا مزنگ لاہور

جینے کا حق

صفحہ ۳۲ سے آگے

میں دبا کر اپنے بچے کے لئے لیجاتی تھی۔ آج اسے کیا ہو گیا —— ؟ اس کی لاش خاک و خون میں لتھڑی ہوئی پڑی تھی —— میری نظر جھاڑی میں چھپے ہوئے اس کے ننھے سے یتیم بچے پر پڑی جس کے لئے وہ بیچاری ہتھیلی پر رکھ کر روٹی کے سوکھے ٹکڑوں کی تلاش میں لوگوں کے مکانوں میں جایا کرتی تھی۔ یتیم بچہ بھوک اور ماں کی غیر متوقع موت سے سہما ہوا بیٹھا تھا —— میرے منہ سے بیساختہ نکلا "بیچارے گلی کے کتے! —— آخر ان کا کیا بنے گا!

میں غمگین انداز میں گھر میں داخل ہوئی، ملازموں سے اس واردات کے متعلق پوچھا، ساری تفتیش کرنے کے بعد میں نے اس موٹے قاتل خانساماں کو فوراً برطرف کر دیا اور اس کی تنخواہ میں سے چند روپے بھی اس کی شقی القلبی کی سزا کے طور پر کاٹ لئے، کیونکہ میرے لئے ہر جاندار جینے کا حق رکھتا ہے، خواہ گلی کا کتا ہی کیوں نہ ہو۔

تہنیت

گلڈ کے مرکزی اجلاس عام منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۶۲ء نے قدرت اللہ شہاب کی مندرجہ ذیل تجویز منظور کی :-

۱۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو صدر مملکت کے عطا کردہ میڈل پرائڈ آف پرفارمنس پر مبارکباد پیش کی جائے۔

۲۔ فیض احمد فیض کو لینن پرائز ملنے پر مبارکباد پیش کی جائے۔

۳۔ پرنسپل ابراہیم خاں، لال میاں، نظیر احمد، سلطان میاں جو مشرقی پاکستان میں گلڈ کے اراکین ہیں ان کو قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہونے پر مبارکباد پیش کی جائے۔

(ادارۂ ہم قلم ان ناموں میں بیگم شمس النساء محمود کا اضافہ کی مسرت حاصل کر رہا ہے بیگم صاحبہ گلڈ کی بنیادی رکن اور نئی مرکزی عاملہ کی منتخب رکن ہیں اور ۸ مئی کو قومی اسمبلی کی رکن منتخب ہوئی ہیں)


بیکو
لوم
خریدیے
کارکردگی میں بے مثال
BECO
پاکستان کی ترقی کے علمبردار
دی بٹالہ انجنیئرنگ کمپنی (پاکستان) لمیٹڈ

پاکستان رائٹرز گلڈ
کے
اپنے اشاعت گھر کی مطبوعات

اردو

ہاجرہ مسرور	"تیسری منزل"	(افسانے)	۵/۵۰ روپے
میرزا ادیب	"فصیل شب"	(ڈرامے)	" ۴/-
یوسف ظفر	"صدا بصحرا"	(مجموعہ کلام)	" ۴/۵۰
انور	"سورج بھی تماشائی"	(افسانے)	" ۵/۵۰
یونس احمر	"لال چادر" (بنگالی افسانہ نگار سید ولی اللہ کے مشہور ناول "لال شالو" کا ترجمہ)		" ۲/۵۰
ڈاکٹر سید علی شاہ	"اردو میں سوانح نگاری"	(تاریخ و تنقید)	" ۷/-

بنگلہ

فرخ احمد	"نوفل و حاتم"	(منظوم ڈرامہ)	" ۲/۵۰
مستفیض الرحمٰن	"آخری نبی"	(نثر)	

انگریزی

پریذنٹنگ پاکستان پوئٹری	(منتخب اردو نظموں کے انگریزی تراجم)		" ۱۰/-

دفتر پاکستان رائٹرز گلڈ اسٹریچن روڈ کراچی

پاکستانی ادب کے ترجمے

ہم نے انگلستان، مغربی جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لئے روابط پیدا کئے ہیں، ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے فی الحال وہاں کے چند کلاسیکی کتابوں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک سے کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔

اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کرتے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں کی طرف توجہ کریں اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں فی الحال ہم انگریزی ترجموں اور طبع زاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کرلیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں۔

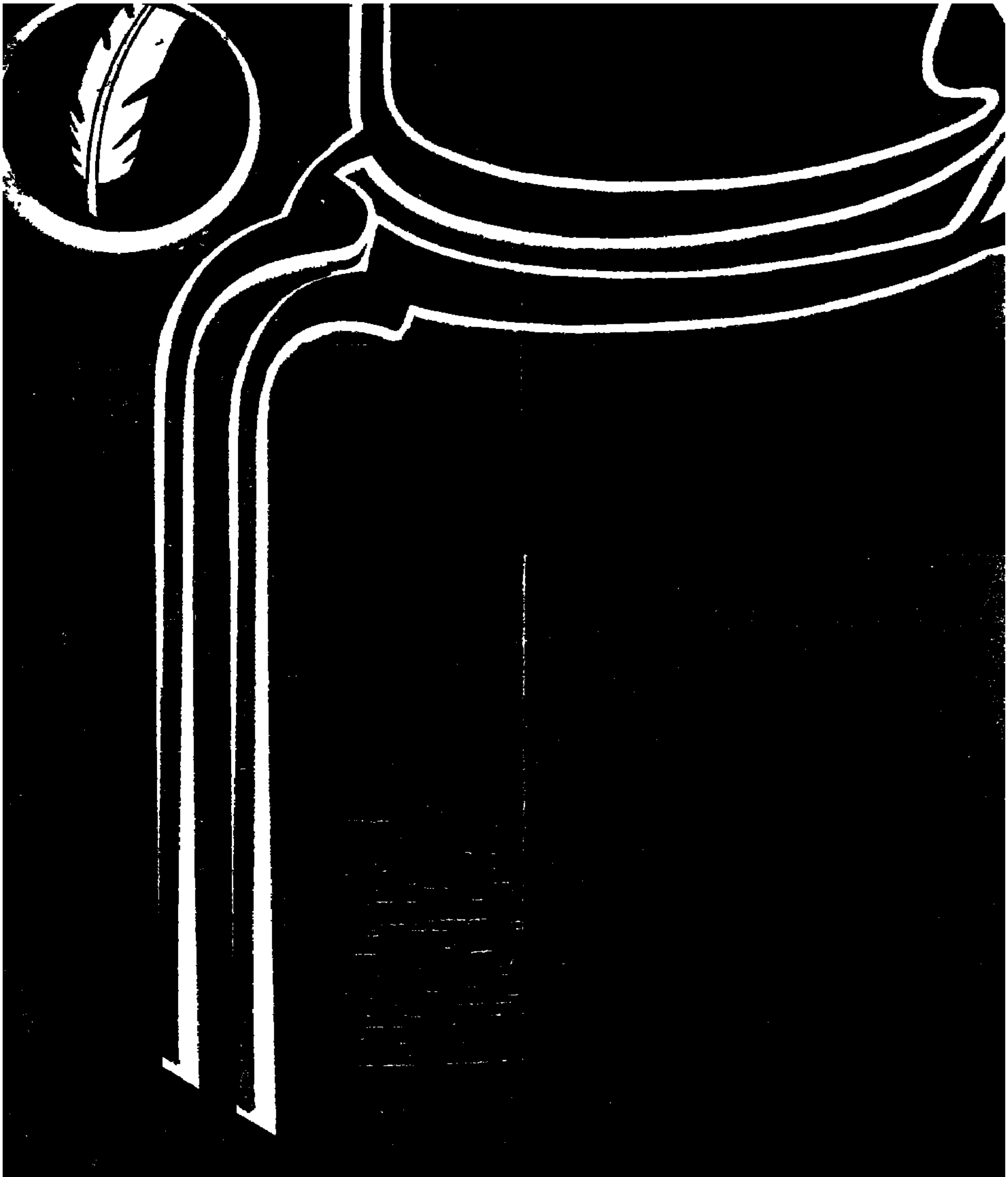
۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال۔ ۲۔ ناول

مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ پہلے ایک سبق یا باب کا ترجمہ کرکے پورے ناول یا کتاب کے خلاصے کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کرلیا جائے گا، واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے، نظم، افسانے اور ڈرامے ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش ہوتے نہیں ہیں اس لئے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کرے گا۔

واضح رہے کہ اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زرین موقعہ کھو دیں گے ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلا معاوضہ ہی پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کرے گا، ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو جزواً پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جاسکتا ہے، ہم چند مترجمین یا ادیبوں کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک دعوت عام دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں مواقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھالیں گے اور ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کی جائے۔

Regd. S No 2410 Monthly Ham Qalam



مصنّفینِ پاکستان (پاکستان رائٹرز گ

حلقۂ کراچی


PIA
باکمال
لوگ
لاجواب
پرواز

ہم قلم

جلد ۲ نمبر ۱۱

جولائی ۱۹۶۲ء

قیمت فی پرچہ دس آنے (۶۲ نئے پیسے)

سالانہ چندہ چھ روپے

(اراکین ادارہ مصنفین پاکستان سے پانچ روپے سالانہ جس میں خاص نمبر بھی شامل ہیں)

اِدارۂ مُصنّفین پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادرِ وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں۔ ہم ان حقوقِ انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوامِ متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جن کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی [illegible] حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کماحقہٗ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

ادارۂ مصنفین پاکستان نے انجمن پریس کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

طابع و ناشر۔ مدیر: جمیل الدین عالی

رائٹرز گلڈ کی مطبوعات

تیسری منزل
(ہاجرہ مسرور)

اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع کرداروں کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ ہاجرہ مسرور کا مشاہدہ بہت وسیع ہے وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی ہیں۔ جس کا اندازہ اس مجموعے کے ہر افسانے سے ہوتا ہے۔ صفحات (۳۷۶) قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

سورج بھی تماشائی
(انور)

"آگ کی آغوش" اور "منزل کی طرف" کے بعد "سورج بھی تماشائی" انور کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے۔ جس میں تقریباً وہ سب افسانے شامل ہیں جو انور نے گذشتہ پانچ چھ برسوں میں لکھے ہیں۔ صفحات (۳۲۴) قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے۔

فصیلِ شب
(میرزا ادیب)

میرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ "فصیلِ شب" تیسرا مجموعہ ہے جس میں نو ڈرامے شامل ہیں۔ جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ میرزا ادیب کا فن روز بروز نہایت عمدگی اور خوبی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ صفحات (۳۰۸) قیمت ۴ روپے۔

اردو میں سوانح نگاری
(ڈاکٹر سید شاہ علی)

ڈاکٹر صاحب علمی و ادبی حلقوں میں کافی معروف ہیں — رسالہ "نگار" اور "اردو" میں جو لوگ ان کے مضامین پڑھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ صفحات (۳۶۵) قیمت ۷ روپے

لال چادر
(سید ولی اللہ۔ مترجم یونس احمر)

عوام کی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں کو باطل اوہام و عقائد کا مرکز بنا دینا کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے ملک میں ایسے کردار جا بجا نظر آتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو "مزار پرستی" کا خوگر بنا دیتے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم سے انہیں بیگانہ رکھتے ہیں۔ "لال چادر" ایک ایسے ہی مزار کی چادر ہے۔ صفحات (۱۷۲) قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے۔

صدا الصحرا
(یوسف ظفر)

جدید شاعروں میں یوسف ظفر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کی شاعری ان تمام صحت مند تحریکوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے۔ جن سے ماضی قریب میں ہمارے ادب کو دوچار ہونا پڑا۔ وہ بنیادی طور پر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ہاں ماضی کی ادبی روایات کے احترام اور جدید رجحانات کو خوش آمدید کہنے کا شعور پایا جاتا ہے۔ "صدا الصحرا" تقریباً اسّی نظموں کا مجموعہ ہے۔ صفحات (۱۹۹) قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے۔

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

حرفِ چند

ادیبوں کی بستی

ادارہ مصنفین حلقہ کراچی کی مجلس عاملہ مستحق مبارک باد ہے کہ اس نے کراچی میں ادیبوں کے رہائشی مسئلے کو حل کرنے کے لئے مصنفین کی ایک ہاؤسنگ سوسائٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کراچی میں رہائشی سہولتوں کی کمی ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ دو لاکھ کی آبادی کے شہر کو جب ۲۰ لاکھ افراد کو پناہ دینی پڑی تو مکانات کی قلت کا مسئلہ، دوسرے تمام مسائل سے بازی لے گیا۔ اگرچہ اس مشکل پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا ہے اور مختلف طبقوں نے اپنی اپنی ہاؤسنگ سوسائٹیاں بنالی ہیں، لیکن ایک طبقہ ابھی تک "دربدری" کی حالت میں ہے اور وہ ہے ادیبوں کا طبقہ۔ اس طبقے کے بہت کم لوگ صاحب استطاعت ہیں۔ اس لئے ادیبوں کے لئے اپنی کوئی علیحدہ بستی بسانا مشکل تھا۔ لیکن اب یہ مشکل آسان ہوتی نظر آرہی ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد رائٹرز ہاؤسنگ سوسائٹی کا قیام عمل میں آجائے گا۔

یہ تجربہ اپنی نوعیت کا انوکھا تجربہ ہوگا۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے دنیا کے کسی ملک میں ایسی کوئی بستی نہیں ہے جو صرف ادیبوں کے لئے ہو۔ کچھ عرصہ ہوا لاہور کے ایک بزرگ ادیب نے حکومت کو ایک اسکیم پیش کی تھی جو اسی قسم کی تھی۔ لیکن وہ اسکیم عملی جامہ نہ پہن سکی۔ اب حلقہ کراچی کی مجلس عاملہ نے اس طرف توجہ کی ہے۔ توقع ہے کہ حکومت اس سلسلہ میں پوری پوری مدد کرے گی۔

اگر ادیبوں کی یہ بستی آباد ہوگئی تو اس سے کئی فوائد حاصل ہوں گے۔ ایک فائدہ تو یہی ہوگا کہ ادیبوں کو نہایت آسان شرائط پر مکان مل جائیں گے لیکن دوسرا اور بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ انہیں باہمی ربط کے زیادہ اور بہتر مواقع حاصل ہوں گے۔ اور اس طرح ادیبوں میں ایک دوسرے کے مسائل سے دلچسپی لینے کا رجحان پیدا ہوگا۔

ہمارے لاہور کے علاقائی دفتر سے اطلاع ملی ہے کہ نئی علاقائی مجلس عاملہ نے بھی ادیبوں کی بستی بسانے کے لئے سنجیدگی سے کوششیں شروع کردی ہیں اور زمین کے لئے درخواست دے دی ہے۔

ادیب اور انکم ٹیکس

گذشتہ سال حکومت نے ادیبوں اور دوسرے غیر پیشہ ور اہلِ فن کاروں کی ایک ہزار روپے تک کی آمدنی پر انکم ٹیکس معاف کر دیا تھا نیز یہ اجازت بھی دے دی تھی کہ وہ اپنی تخلیقات سے حاصل ہونے والی یک مشت آمدنی کو ایک سے زیادہ برسوں میں حاصل ہونے والی آمدنی ظاہر کرسکتے ہیں یعنی کسی مصنف کو اس کی کتاب کی رائلٹی سے جو مخصوص رقم ملتی ہے وہ اس رقم کو اس تمام عرصے کی آمدنی قرار دے سکتا ہے کہ جتنا عرصہ اس نے کتاب کو مکمل کرنے میں صرف کیا۔ اس طرح اس کو انکم ٹیکس کی اور بھی رعایتیں حاصل ہوسکتی ہیں — یہ سب باتیں گذشتہ سال سے تعلق رکھتی تھیں اس سال حکومت نے ادیبوں کو جو رعایت دی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وزیر مالیات نے

نئے سال کا میزانیہ پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں فرمایا ہے کہ اس سال سے ادیبوں کی تخلیقات سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی انکم ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگی۔ یعنی گذشتہ سال حکومت نے ایک ہزار روپے تک کی آمدنی کو انکم ٹیکس سے مستثنیٰ کیا تھا لیکن اب یہ قید بھی اٹھا دی گئی ہے۔ ادیب کو اپنی تخلیقات سے خواہ کتنی ہی آمدنی کیوں نہ ہو، اب اس سے انکم ٹیکس نہیں لیا جائے گا۔ یہ ایک ایسی رعایت ہے جس کی مثال دنیا کے کسی ملک میں نہیں ملتی۔ پاکستان پہلا ملک ہے جس نے تخلیقی فن کاروں کو "زمرۂ اصحاب تجارت" میں شمار نہیں کیا۔ حکومت کا یہ اقدام ہر اعتبار سے قابل مبارک باد ہے۔

ادیبوں کے ساتھ یہ مشفقانہ برتاؤ جہاں ایک طرف ہمارے ادبی ماحول کے لئے فال نیک ہے وہیں اس حقیقت کا بھی غماز ہے کہ اہل قلم کو حکومت کی تمام ہمدردیاں حاصل ہیں۔

ایک ادیب کی ادبی خدمات کا اعتراف

میرزا ادیب ہمارے سربرآوردہ مصنفین میں سے ہیں انہوں نے اپنی تخلیقات کے علاوہ بحیثیت مدیر ادب لطیف بھی ایک سے زیادہ نسلوں کی ادبی تربیت میں حصہ لیا ہے۔ ہمیں یہ سن کر افسوس ہوا کہ وہ مستقل رسالہ ان کی رفاقت کے بعد بمجبوری ادب لطیف سے الگ ہو رہے ہیں۔ میرزا ادیب ہماری برادری میں ناشر زدگی کی ایک زندہ مثال ہیں اور ان کی مشہور و مقبول کتاب صحرا نورد کے خطوط کو ہمیشہ اس امر کی مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ادیب کو کس طرح اپنی ذہنی کاوشیں کوڑیوں کے مول بیچنی پڑتی تھیں۔

اب بھی جب کہ زندگی کے دوسرے شعبوں میں معمولی سے معمولی ذہانت کا کوئی شخص بھی ذرا سی محنت سے لاکھوں کما لیتا ہے، محنت روپے میں کھیل سکتا ہے۔ شاہد احمد دہلوی اور میرزا ادیب جیسے قلم کے مردور جن کی صلاحیتیں مسلم ہیں، بڑی مشکل سے رشتۂ روح و تن برقرار رکھنے کا سامان مہیا کر پاتے ہیں۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ صدر مملکت نے میرزا ادیب کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کا دو سو روپے ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا ہے لیکن ارباب حل و عقد کو مستحق ادیبوں کے لئے کوئی بہتر راستہ سوچنا چاہیے جس سے ہمارے ذہین و فطین اہل قلم بار بار یہ سوچ کر ہمیں اپنی ادبی تخلیقات کی دولت سے مالامال کر سکیں۔

صوبائی حکومتیں اور گلڈ کی امداد

رائٹرز گلڈ (مغربی پاکستان ریجن) کی طرف سے ۸ جولائی کو لاہور میں مغربی پاکستان اسمبلی کے اسپیکر جناب مبین الحق صدیقی کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا گیا۔ اس موقع پر صدیقی صاحب نے رائٹرز گلڈ کی خدمات کو سراہتے ہوئے فرمایا "صوبائی حکومت کو چاہیے کہ وہ جس طرح دوسرے ثقافتی اداروں کو مالی امداد دیتی ہے اسی طرح اسے گلڈ کی علاقائی شاخ کی بھی مدد کرنی چاہیے"۔ صدیقی صاحب نے حکومت مغربی پاکستان کو نہایت معقول اور ممتاز [illegible]۔ مرکزی گلڈ کے مرکزی دفتر کو مرکزی حکومت سے امداد ملتی ہے۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی علاقائی شاخوں کو وہاں کی حکومتیں کوئی امداد نہیں دیتیں۔ اس کے برعکس بہت سے ایسے ادارے ہیں جنہیں مرکز کے علاوہ صوبائی حکومتوں سے بھی امداد ملتی ہے۔ گلڈ ایک ملک گیر ادارہ ہے، اس کا دائرہ کار کسی مخصوص علاقے تک محدود نہیں ہے اس لئے مرکزی حکومت کی طرح صوبائی حکومتوں کو بھی اپنے میزانیوں میں گلڈ کے مقاصد کو پورا کرنے کے لئے امداد کی گنجائش نکالنی چاہیے۔ ہمیں توقع ہے کہ صدیقی صاحب کے مشورے پر صوبائی حکومت پوری توجہ کرے گی۔ اور اسی طرح مشرقی پاکستان کی حکومت بھی گلڈ کی علاقائی شاخ کو نوازے گی۔

ادارہ ہم قلم جناب جمیل الحق صدیقی کو، جو خود بھی اہل قلم ہیں، اس امر کے لئے مبارکباد پیش کرتا ہے کہ انہوں نے صوبائی اسمبلی میں قومی زبان اردو کو اس کا صحیح مقام دلانے کے لیے کامیاب کوششیں کیں۔

ولیم فاکنر
(۱۸۹۷ ۱۹۶۲ء)

۶ جولائی سنہ ۶۲ء کو ولیم فاکنر کی وفات سے عالمی ادب کو جو نقصان پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے۔ بیسویں صدی کے ان مصنفوں میں، جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی فاکنر کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے بعض نقادوں کے نزدیک تو وہ پورے انگریزی (اور امریکی) ادب میں ایک ایسا منفرد ناول نگار ہے جس نے حیات و کائنات کے مسائل پر بڑے حقیقت پسندانہ انداز سے نظر ڈالی۔ تقریباً پچیس ۲۵ کتابوں (جن میں بیشتر ناول اور افسانوی مجموعے ہیں) کے اس مصنف کو اپنی بے پناہ سنجیدگی اور قدرے مشکل پسندی کے باوجود جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ "THE SOUND AND THE FURY" اور "SANCTUARY" جیسے شاہکار ہر دور اور ہر زمانے میں ذوق و شوق سے پڑھے جائیں گے۔ فاکنر نے نوبل پرائز (۱۹۴۹ء) اور پلٹزر پرائز (۱۹۵۵ء) جیسے ادبی اعزازات حاصل کئے۔ ان سے بھی اس کی عظمت کا اندازہ ہوتا ہے۔ رائٹرز گلڈ اس عظیم ادبی نقصان پر اپنے دلی تاسف کا اظہار کرتا ہے۔

قاضی عبدالودود

کچھ اور آوارہ گرد اشعار

طول اشعار کے اختلافات دکھانا منظور نہیں، عموماً شعر کی صرف ایک شکل پیش کی گئی ہے خواہ وہ صحیح ہو یا نہ ہو۔

ہر صبح کو اٹھتا ہے سرے سے بت گرتے ۔۔۔ اللہ کی قدرت کا تماشا نظر آوے
اے ناقۂ لیلیٰ دو قدم راہ غلط کر ۔۔۔ مجنوں ز خود رفتہ کبھی راہ پہ آوے

یہ شعر تذکرۂ قدرت اللہ خاں قاسم میں محتشم علی خاں حشمت کے نام سے ہیں لیکن میر کے ہیں اور ان کی کلیات مطبوعہ میں موجود۔

نکہت گل سے جگایا کسی زنداں کے بیچ ۔۔۔ پھر زنجیر کی جھنکار پڑی کان کے بیچ

محتشم علی خاں حشمت کا مطلع ہے (زبدۃ الشعراء) لیکن تذکرۂ قائم میں محمد علی خاں حشمت کے نام سے درج ہے۔

کہنے کو ادھر ادھر رہ گئے جسم ۔۔۔ تھے تیری طرف جدھر گئے ہم

شاہ گھسیٹا عشق کا مطلع ہے (دیوان عشق و تذکرۂ میر حسن وغیرہ) لیکن قاسم، سرور اور ذکا کے تذکروں میں بنام عسکری، شاگرد شاہ قدرت اللہ قدرت۔

میں کہاں تو کہاں پہ کہتے ہیں ۔۔۔ کہ یہ آپس میں دونوں رہتے ہیں

خواجہ اثر کا شعر ہے (دیوان اثر و تذکرہ میر حسن وغیرہ) لیکن تذکرۂ شورش میں بنام احمد (اس کے حالات ندارد) درج ہے۔ اور مولف تذکرۂ مسرت افزا کا بیان ہے کہ یہ مطلع صاحب میرزا الم، پسر درد سے سنا، چنانچہ اس نے اپنے تذکرے میں انہی کی طرف اسے منسوب کیا ہے۔

ز من قامت آن صنم دیدہ ام ۔۔۔ قیامت بیک حرف کم دیدہ ام

تذکرۂ مسرت افزا کے ترجمۂ سعد اللہ خاں عاشق میں یہ مطلع ضمناً آیا ہے۔ اور بقول صاحب تذکرہ شاہ محمد افضل الہ آبادی کا طبع زاد ہے۔ مصحفی کے ریاض الفصحا میں غلطی سے خود عاشق کے نام درج ہوا ہے۔

اعجاز لب اس کا دمِ عیسیٰ سے نہیں کم ۔۔۔ وہ پنجۂ سیمیں ید بیضا سے نہیں کم
معدوم کو کیونکر کوئی ثابت کرے واللہ ۔۔۔ مضمون کمر یار کا عنقا سے نہیں کم

یہ شعر گلشن بے خار طبع لکھنؤ میں ایک جگہ نظام (عماد الملک) واللہ کے عوض درج ہے، اور دوسری جگہ والہ فیض آبادی کی طرف منسوب ہے۔ دہلوی نسخوں میں صرف بنام والہ نظام کی طرف۔ انتساب کارکنانِ مطبع لکھنؤ کی غلطی ہے۔ تذکرۂ سرور میں بھی صرف والہ کے نام سے ہے۔

کیا خطا سے کھینچے حرکت ہاتھ سے گم ہے ۔۔۔ خامہ بھی میرے ہاتھ میں انگشت ششم ہے

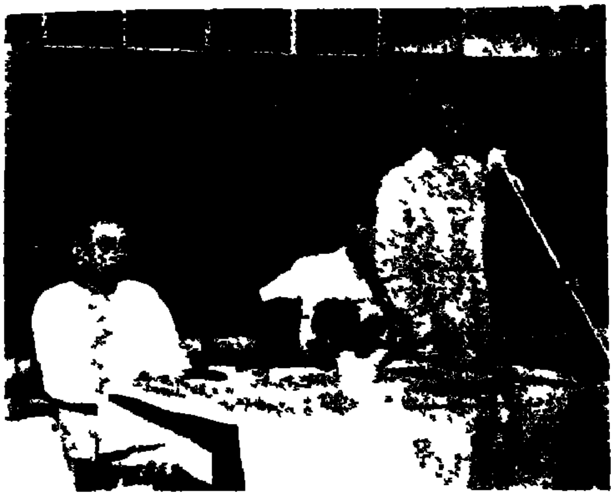
تذکرۂ شورش میں بنام احمد مجہول الاحوال، تذکرۂ میر حسن میں بقا کے نام سے ہے، اور یہی انتساب صحیح ہے۔

قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایک شام



پاکستان رائٹرز گلڈ راولپنڈی ریجن نے قدرت اللہ شہاب کے ساتھ ایک شام منائی۔
تصویر میں شہاب صاحب اپنے فن کے بارے میں اظہار خیال فرما رہے ہیں۔ ان کے
بائیں طرف مختار صدیقی بیٹھے ہیں جنہوں نے اس تقریب کی صدارت کی۔

فیض احمد فیض کے ساتھ ایک شام



جناب شاہد احمد دہلوی ' فیض صاحب کو
خوش آمدید کہہ رہے ہیں ۔



جناب فیض اپنا کلام سنا رہے ہیں



حاضرین جلسہ

چاہو دل سب قبول بھیجا تھا   پر کبھو نہیں تیری کچھ آتا

یہ سجاد کا مطلع ہے (نکات الشعرا) سرور، قاسم، ذکا کے تذکروں میں بنام سبحان شاگرد میر۔ اس تخلص کا کوئی شاعر نہیں گزرا۔ سبحان سجاد کا مصحف ہے۔

جب سے محراب الشریف لائے حسن کا جی چاہے   وہ دہان تنگ ہیں رکھتے ہیں اپنے جی کا جی چاہے

ذکا، سرور اور قاسم کے تذکروں میں بنام شاد، گویا عشق۔ لیکن ان کے دیوان میں نہیں۔ مطلع جوشش کا ہے (دیوان جوشش و تذکرہ شورش)

کیا مزہ جو غیر سے وہ ہم کنار ہے   ہم سے تو اب تلک وہی دار و مدار ہے

تذکرہ میر حسن میں بنام نعیم دہلوی۔ تذکرہ سرور میں بنام مرزا محمد نعمت شاگرد فقیر شریک دفتہ میر و مرزا۔ تذکرہ ذکا میں بھی بنام نعمت (اس تذکرے سے متعلق جو یادداشت میرے پاس ہے اس میں نام شاعر نہیں)

کیا ہوا ہم کبھی جو دنیا میں یہ ناشاد ہے   تو سلامت رہے آباد ہے تری بیداد ہے

تذکرہ میر حسن میں بنام عبدالرسول نثار شاگرد میر۔ تذکرہ سرور میں بنام میر عبداللہ نیاز شاگرد میر۔ یہ شاعر وجود خارجی نہیں رکھتا۔ مطلع نثار کا ہے۔

ہے ان دنوں دل ناداں فرنگ کا گھڑیال   رہے ہے کبھی آپ ہی پکار اٹھتا ہے

تذکرہ میر حسن میں بنام ممتاز شاگرد سودا اور یہ انتساب درست ہے۔ تذکرہ ذکا میں بنام عمدۃ الملک خلف محمد علی خاں ناظم ادکاٹ۔

اپنی ہم بندگی پہ بھولے تھے   پھر جو دیکھا تو واں خدائی ہے

تذکرہ میر حسن میں بنام مشتاق دہلوی مقیم فیض آباد، معلم پیشہ۔ تذکرہ سرور میں بنام عبداللہ خاں مخاطب بہ مشتاق علی خاں متخلص بہ مشتاق شاعر دربار شاہ عالم۔ قول میر حسن مرجح۔

وہ شیخی جو رخ میں ہے ماہ منور میں نہیں   اور چمک دانتوں میں ایسی ہے کہ اختر میں نہیں
وصل گر منظور تھا پرویز کا گھر کھودتا   کوہکن دیوانہ تھا شیریں تو پتھر میں نہیں

تذکرہ سرور میں گویا تخلص کے تین شاعروں کا الگ الگ ذکر ہے۔ حیات اللہ، فقیر محمد خاں، مجہول الاسم۔ لکھنوی شاعر۔ اشعار الاموخر الذکر کے نام سے ہیں۔ صفحہ ۲۲۳۔ لیکن یہ گویا کے دوم کے ہیں اور ان کے مطبوعہ دیوان میں موجود ہیں۔

واسطے جس کے سبھی مجھ کو برا کہتے ہیں   وہ جو سنتا ہے تو کہتا ہے بھلا کہتے ہیں

یہ مطلع گماں، شاگرد فغاں کا ہے (تذکرہ میر حسن) لیکن تذکرہ سرور میں بنام کمال (مجہول الاسم) شاگرد فغاں۔ کمال مصحف گماں ہے، اس تخلص کا کوئی شاعر فغاں کا شاگرد نہ تھا۔

وہ زلف ہے یا قہر کی شب کچھ نہیں معلوم   مکھڑا ہے الٰہی کہ غضب کچھ نہیں معلوم
کھل گیا یہ اب کہ وصل اس کا خیال خام ہے   آج امیدوں کا دل ہی دل میں قتل عام ہے
آپ تو بات میں بگڑتے ہیں   واہ کیا منہ سے پھول جھڑتے ہیں

تذکرہ ہندی (مصحفی) میں بنام مرزا علی لطف (خود ابتدا شاگردی مرزا مقیم سیکنڈی) ہے اپنے کو ریختے میں کسی کا شاگرد تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن جن کے تلمیذ عشرت بہاری نے انہیں سودا کا شاگرد بتایا ہے۔ گلشن ہند کے مولف ہیں۔ تذکرہ سرور میں ان کا ترجمہ ہے، لیکن اس میں تلمذ کا ذکر نہیں۔ ترجمہ عشرت میں سرور نے لطف انہیں سودا کا شاگرد لکھا ہے۔ سرور نے اشعار بالا اسی نام و تخلص کے ایک اور شاعر کی طرف منسوب کیے ہیں۔ جو ان کے قول کے مطابق [illegible] کا شاگرد تھا۔ ناصر کے تذکرے میں بھی یہ اشعار اسی لطف کے نام سے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ لطف وجود خارجی سے محروم ہے اور اشعار لطف اول کے ہیں۔

جو کوئی بلائے ناگہانی مانگے — یا راہ عدم کی کچھ نشانی مانگے
دکھلا دے اسے تو اپنی شمشیر نگاہ — جس کا مارا کبھی نہ پانی مانگے

علی ابراہیم کے تذکرے گلزار ابراہیم میں بنام اولیا موہانی جن سے ان کی واقفیت تھی۔ تذکرۂ مصحفی میں بنام لطف اول، تذکرۂ سرور و ناصر میں بنام لطف ثانی، اور شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان مولفہ طپش دہلوی میں بنام سوز۔ لطف ثانی کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ سوز بھی خارج از بحث ہیں۔ ان کے دیوان کے بکثرت نسخے میری نظر سے گذرے ہیں۔ یا ان سے متعلق معلومات میں نے حاصل کی ہیں یہ رباعی کسی میں نہیں۔ لطف اول کے دیوان میں اگر ہو تو انہیں کی ملک ہے ورنہ اولیا کی طبعزاد سمجھی چاہیئے۔

گل گیر نے کاٹ کر سر شمع — پہچانے سے شب چلی گئی ٹک

تذکرۂ ابن طوفان میں بنام مصحفی، لیکن دواوین مصحفی سے غیر حاضر ہے، عرش پسر میر کا شعر ہے، اور ان کے دیوان مطبوعہ میں ہے۔

ذرا دیکھو تو کس ناز و ادا سے یاد آتا ہے — مسیحا کی سوئی امت کو ٹھوکر سے جگاتا ہے

تذکرۂ ابن طوفان میں بنام مصحفی، لیکن سوز کا مطلع ہے، اور ان کے دیوان کے متعدد نسخوں میں ملتا ہے۔ تذکرۂ خیراتی لعل "بیجگر" میں بھی سوز کے نام سے ہے اور میرا حافظہ دھوکا نہیں دیتا تو طبقات سخن میں اس کی شان نزول بھی درج ہے۔

ڈسا ہو کالے نے جس کو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے — دہان و گیسو کا تیرے مارا نہ منتر سے بولے نہ سر سے کھیلے

تذکرۂ ابن طوفان میں بنام نصیر دہلوی، لیکن ذوق کا مطلع ہے اور ان کے دیوان میں ہے۔ مزید یہ کہ تذکرۂ سرور میں بھی ذوق کے نام سے ہے۔ اور دیوان نصیر (نسخۂ رامپور) اس سے خالی ہے۔

جگہ مطلع کی کھچوا اس نے نقش روئے جاناں کا — کہ تا ہو مطلع خورشید مطلع اپنے دیواں کا

تذکرۂ ابن طوفان میں بنام آتش، لیکن دیوان آتش سے غیر حاضر ہے۔ مطلع خواجہ وزیر کا ہے اور ان کے دیوان میں موجود ہے۔

سنا ہے اس صنم کے بھی کمر ہے — کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

تذکرۂ ابن طوفان میں بنام جرأت، گلشن ہند کے حاشیے میں شبلی کی تحریر اس کی موید، لیکن شعر آبرو کا ہے۔ گلشن ہند اور متعدد تذکروں کے علاوہ دیوان آبرو (نسخۂ پٹنہ) میں موجود ہے۔

اب آباد صیاد اسے آرام جاں اس نامرادی میں — کفن دینا تمہیں بھولے تھے ہم اسباب شادی میں

*میر تقی میر: حیات اور شاعری، مصنفہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ص ۲۷۶ میں شمیم سخن کے حوالے سے جو اواخر مائۂ سیزدہم کی کتاب ہے۔ مرقوم ہے کہ میر کی ایک بیٹی شادی کے چند ہی دن بعد مر گئی تھی۔ میر نے اسی پر یہ شعر کہا تھا۔ یہ شعر کلیات میر میں نہیں اور نہ تذکرۂ مذکورہ سے قدیم تر کتاب میں نظر سے گذرنا یاد آتا ہے۔ اتنا متیقن ہے کہ کسی عمومی تذکرے میں یہ شعر میر یا کسی اور شاعر کے نام سے نہیں ملتا۔ امیر اللغات حصہ ا ص ۵۵ میں بنام نادر درج ہے، لیکن یہ صراحت نہیں کہ اس تخلص کا کون سا شاعر مراد ہے۔ میں نے کلب حسین خاں نادر کے بعض دیوان دیکھے ہیں ان میں یہ مطلع نہیں۔ اگر کوئی صاحب اس معاملے پر مزید روشنی ڈال سکیں تو میں ممنون ہوں گا۔

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے — کہ یاں یک لب تبسم غنچے کو برباد کرتا ہے
اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں — کوئی ان ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

یہ اشعار "مرزا محمد علی فدوی: ان کا عصر، حیات اور شاعری" حصہ ا ص ۲۲۶ میں بنام رکن الدین عشق بحوالہ (تذکرۂ میر حسن) لیکن تذکرۂ میر حسن اور تذکرۂ قائم میں مرتضیٰ قلی بیگ فراق کے نام سے ہیں اور بے شبہ انہیں کے ہیں۔

مرا رنگ رو اس قدر زرد ہے   کریاں زعفراں زار بھی گرد ہے

کتاب مذکور متعلق فدوی صفحہ ۲۴۷ میں بنام خواجہ محمد محسن، محسن برادرزادہ شوروش شاگرد راسخ بحوالہ ریاض الفصحا مصنفہ مصحفی۔ اسی میں شعر سے قبل صرف یہ الفاظ "محمد محسن محسن تخلص" یہ شعر محمد محسن محسن برادرزادہ میر کا ہے (نکات الشعرا)

اس عالم کی تو ہے کیا بات لیکن   خدا مانے پر بھی اک عالم رہے گا
بجلی ہے کیا کڑا چمکتا ہے   بادل میں کیا مچا چمکتا ہے

کتاب متعلق فدوی ص۱۳۶ میں بنام حسرت، لیکن یہ اشعار مشتاق شاگرد جوشش عظیم آبادی کے ہیں (تذکرۂ مسرت افزا)

بگولے کا کبھی صدمہ کبھی صرصر کی زحمت ہے   ہماری خاک یوں اڑتی پھری اے ابرِ رحمت ہے

تذکرۂ سرور میں بنام ناسخ، کتب خانۂ سالار جنگ کی ایک بیاض میں بنام سوز۔ آب حیات میں ایک جگہ (ترجمہ سودا) بنام سودا اور دوسری جگہ (ترجمہ ذوق) بنام میر درد ہے۔ ایک بیاض میں بھی حسن کا ذکر معاصر کے کسی شمارے میں ہے بنام سودا۔ مگر دراصل ثابت عظیم آبادی شاگرد فدوی دہلوی کا ہے۔ (تذکرۂ شورش، تذکرۂ عشقی وغیرہ)

جس وقت تو پسند کرے یہ مکانِ چشم   دو ہیں نکل کھڑے ہوں مری مردمانِ چشم

تذکرۂ مسرت افزا میں یہ شعر بنام نالاں شاگرد فغاں درج ہے اور اس کے بعد مرقوم ہے، "در اشعار ریختہ بہتر ازیں کم شعر بسمع رسیدہ لیکن ہمیں بیت از محمد عابد، دل بایں روشن شنیدہ شدہ، آدے اگر پسند تجھیں یہ مکانِ چشم الخ واللہ اعلم از کیست؟ شاید توارد رو داده باشد یا غلطی ناقل۔ اتفاق تحقیق نیفتادہ۔"

گلشن گفتار مصنفہ حمید اورنگ آبادی ایک بہت ہی مختصر تذکرہ ہے جس کا زمانۂ تحریر مصنف کے قطعۂ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے: مادۂ گلشن نرم گفتار؟ ہے"۔ سے ۱۱۶۵ مستخرج ہوتا ہے اس تذکرے میں کوئی ایسی بات نہیں جس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہو کہ اس کا آغاز ۱۱۶۵ھ سے پیشتر ہوا تھا۔ ڈاکٹر زور نے اپنی کتاب سرگزشت حاتم میں اس تذکرے سے ایک مثنوی کے (جو حمید کے نزدیک حاتم دہلوی کی ہے) ۲۲۔ اشعار نقل کئے ہیں اور اس تذکرے میں ہیں بھی اسی قدر۔ ڈاکٹر زور ص۶۲ میں لکھتے ہیں کہ "اس کے مطالعہ سے ایک تو حاتم کے مذہبی رنگ کا اندازہ ہوتا ہے دوسرے ان کے ابتدائی کلام[1] کا اسلوب بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کی زبان اور ترکیبیں ظاہر کرتی ہیں کہ دہلی میں اردو شاعری کی ابتدا اول اول دلی اورنگ آبادی کی ہو بہو تقلید میں کی گئی تھی"۔ آگے چل کر وہ ص۹۴ تا ص۹۵ میں وہ رقمطراز ہیں کہ: "اردو شعرا کا قدیم ترین تذکرہ ہونے کی حیثیت سے اس (گلشن گفتار) کو یوں بھی اہمیت حاصل ہے مگر ہمیں اس لئے بھی عزیز ہے کہ اس میں حاتم کی ایک مثنوی کا ٹکڑا مل گیا جو آج نہ "دیوان زادہ" میں موجود ہے اور نہ حاتم کے ان دوسرے قدیم دیوانوں[2] میں جو اس وقت تک نظر سے گذرے ہیں۔

گلشن گفتار کے ان اشعار میں سے دو ابیات مثنوی جعفر علی خاں زکی دہلوی کے نام سے ہیں اور ان سے پہلے یہ عبارت ہے۔ "از مثنوی اوست در منقبت گفتہ" اشعار یہ ہیں۔

قضا کے ساج کی صنعت گری دیکھ   نبی کی آل کی بارہ دری دیکھ
نبی کی آل پر جیسے نثار جانا   اسی بارہ پلے سے پار جانا

ص۱۔ یہ کہاں سے معلوم ہوا کہ حاتم کا ابتدائی کلام ہے؟ ۔ ڈاکٹر زور نے سرگزشت حاتم میں دیوان زادہ[2] سے قطع نظر حاتم کے صرف ایک دیوان کے مطالعہ کا ذکر کیا ہے۔ "قدیم دیوان" کی جگہ "قدیم دیوانوں" لکھنے کی وجہ ان سے دریافت کی جاتی ہے۔

مثنوی کا ایک اور شعر بھی نکات الشعرا میں اس تمہید کے ساتھ ہے "در تعریف عشق و ابتدای گوید" مگر یہ گلشن گفتار میں نہیں۔ تذکرۂ میر حسن میں جعفر علی خاں کے متعلق مرقوم ہے "سوای رام راجہ بود بہ او تعلق داشت۔ چنانچہ این مثنوی در عشق او گفتہ مشہور است۔" اس مثنوی کے جو ۵ شعر اس تذکرے میں ہیں ان میں سے دو "قضا نے" اور "نبی الخ" ہیں باقی ۳ ایسے ہے جو گلشن گفتار میں بھی ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں :-

الٰہی شوق سے دل کو جلا دے — برہ کی آگ تن میں یوں لگا دے
جلا جوں شمع طور مجھ ناتواں کو — سر و ابریز کر میرے استخواں کو
فنا کر عشق میں ایسی جان بیتاب — کہ جوں آتش میں کھپ جاتا ہے سیماب
محمد باعث ایجاد امیاں — کہ جس کے واسطے آیا ہے قرآن
اگر بھید حکمت آشنا ہے — اس نسخے میں چودہ پڑیا ہے

گلزار ابراہیم کے نسخۂ پٹنہ میں (جس کا نسخہ شائع کردہ انجمن ترقی اردو ڈاکٹر زور کا مرتب کردہ ہے) جعفر علی خاں کی مثنوی کے ۲۴ اشعار ہیں مگر اس میں مثنوی حقہ کے بھی کچھ اشعار شامل ہو گئے ہیں۔ نکات الشعرا کے دو شعر اور تذکرۂ میر حسن کے شعر ۱ و ۲ کے علاوہ گلشن گفتار کے اشعار ذیل گلزار ابراہیم میں ہیں۔

نہ اب سے تہا تا آرزو ہے — نماز بے خودی کا یہ وضو ہے
پڑے ہیں بد زخم بیتابی کے ناسور — نہ اب تاک دھو مجھ دل کے انگور
سیہ تاک گمس تجا استاں پر — دماغ اپنا چڑھایا آسماں پر

گلزار ابراہیم میں "راجہ رام سہائی" پر عاشق ہونے کا ذکر ہے۔ اور مثنوی کے متعلق مرقوم ہے کہ "اکثر ریاست ایہام گوئی شہرت تمام دارد" مکمل مثنوی ایشیاٹک سوسائٹی کی ایک قدیم بیاض میں ہے۔ اس کا اقرار خود ڈاکٹر زور کو ہے کہ یہ مثنوی حاتم کے کسی دیوان میں نہیں ہے۔ تذکرہ نگار علی ابراہیم اور علی ابراہیم خاں کے اقوال کے پیش نظر یہ وہم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ حاتم کی ہے۔ اگر ڈاکٹر زور کے نزدیک حمید اورنگ آبادی اتنا بڑا محقق ہے کہ اس سے غلطی سرزد ہی نہیں سکتی تو نہیں اس کا یہ قول بھی قبول کرنا چاہیے کہ ولی احمد آباد کا ہے حمید خود اورنگ آبادی ہے۔ اگر ولی اورنگ آبادی ہوتا تو اسے ضرور اس کی خبر ہوتی۔

حامد اللہ افسر

ادب کا مطالعہ

"میں نے کبھی کسی شاعر کے دیوان کا مطالعہ نہیں کیا۔" یہ وہ الفاظ ہیں جو اردو کے ایک مشہور شاعر نے جن کے بہت سے شاگرد بھی ہیں۔ ایک مرتبہ مجھ سے اپنی گفتگو میں دو تین مرتبہ دہرائے، اور جب میں نے اس عجیب و غریب دعوے کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے "مستند اور مشہور شعراء کے دواوین کے مطالعہ سے ایک بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ان شعراء کے نظم کئے ہوئے مضامین سے دامن بچانا مشکل ہو جاتا ہے اور ان کے خیالات ہماری نگارشات میں جگہ پا لیتے ہیں اس طرح کہ ہمیں خبر تک نہیں ہوتی۔"

میں نے عرض کیا کہ "مستند اور مشہور شعراء کے دواوین کے مطالعہ کے بغیر بھی تو شاید یہی صورت پیش آتی رہتی ہے اور ان کے نظم کئے ہوئے مضامین اردو کے اکثر شعراء کے یہاں اور شاید آپ کے یہاں بھی نظم ہوتے رہتے ہیں۔" تو وہ کہنے لگے کہ "دوسرے شاعروں کی بابت تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، ہاں اپنے متعلق عرض کر سکتا ہوں کہ اگر میرے نظم کئے ہوئے مضامین قدیم شعراء کے دواوین میں کبھی کبھی مل جاتے ہیں تو یہ محض "توارد" ہے، قصداً میں نے کبھی ان سے استفادہ نہیں کیا۔"

اس واقعہ سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ صرف یہی نہیں کہ یہ بزرگ (بقول خود) اپنی زبان کے ادب کے مطالعہ اور اس کے بے شمار فائدوں سے محروم تھے بلکہ انھوں نے اس محرومی پر فخر کرنے کا بھی ایک پہلو پیدا کر لیا تھا۔ یہ خصوصیت کچھ انہیں بزرگ تک محدود نہیں ہے بلکہ اپنی زبان کے قدیم اور مستند ادب سے بیگانگی ہماری زبان کے اکثر شاعروں اور ادیبوں کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے، جب ہمارے تخلیقی ادب کے علمبرداروں کا یہ حال ہے تو عوام کے ذوق ادب کی تربیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا،

لیکن خدا کا شکر ہے کہ آزادی کے بعد سے تعلیم کے عام رواج نے اپنی قومی اور ملکی زبانوں سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کی کثیر تعداد ایسی پیدا کر دی ہے جو اپنے ادبی ذوق کے نشو و نما اور تربیت کی خواہش مند ہے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ادب کے مطالعہ کا مقصد کیا ہے اور اس سے کیا فائدے حاصل ہو سکتے ہیں!

ادب کا مطالعہ بشرطیکہ وہ صحیح قسم کے ادب کا مطالعہ ہو اور صحیح طریقے سے کیا جائے مطالعہ کرنے والے کے ذہن کو، اس کی قوت تخیل کو، اور اس کے جذبات کو لطیف اور دلچسپ اور بیش قیمت مواد سے آراستہ کر دیتا ہے، اس طرح ادب کا مطالعہ ایک محرک اور مہیج کا کام کرتا ہے، وہ چیز جو ہم ادب کے مطالعہ سے حاصل کرتے ہیں ہمارے ذہن ہماری قوت تخیل اور ہمارے جذبات کو تر و تازہ اور تیز تر کر دیتی ہے اور ان میں نئی روح پھونک دیتی ہے وہ ہمارے بیداری کے لمحوں اور ہمارے خوابوں کو روشن اور شگفتہ بنا دیتی ہے

مشہور نقاد مسٹر مانیٹگو بیلجین اس موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ادب کے مطالعہ سے زندگی کے رنگ روپ اور مزاج اور طبیعت کے ادراک اور وجدان میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے، زندگی کا براہ راست تجربہ جو ایک فرد واحد حاصل کرتا ہے وہ یہ ہر طور بہت محدود ہوتا ہے، جہاں تک کسی ایک شخص کا تعلق ہے زندگی بہت زیادہ وسیع بہت زیادہ متنوع اور بہت زیادہ پیچ در پیچ ہے، ہم اپنے تجربات کے علاوہ اپنے مطالعہ کے ذریعے بہت اچھی طرح دوسرے لوگوں کے تجربات کا حال معلوم کر سکتے ہیں۔ لوگ جو ہم سے بہت فاصلے پر ہیں یا ہم سے برسہا برس پہلے گزر چکے ہیں، ہمیں مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا سوچتے تھے کیا محسوس کرتے تھے اور کیا آرزوئیں اور امیدیں رکھتے تھے، اس لئے ایک خاص فائدہ ادب کے مطالعہ کا یہ ہے کہ اس سے زندگی کے تجربات اور انسانی خصوصیات کا وجدان اور ادراک وسیع تر اور شدید تر اور تیز تر ہو جاتا ہے، اس کی مدد سے دوسرے لوگوں سے ہمارے تعلقات سہل اور خوشگوار ہو جاتے ہیں، ادب کے مطالعہ سے ہماری بے اطمینانی، بے قناعتی بے چینی ہلکی اور مدھم پڑ جاتی ہے، ان سب باتوں سے ادب کے مطالعہ کی قدر و قیمت اور اہمیت واضح ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بہت ہی کم لوگ ادب سے صحیح معنوں میں فائدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں ہم میں سے زیادہ تر ایسے ہیں جو وقتی دلچسپی کے لئے اور دل بہلانے کے لئے یا کسی الجھن سے توجہ ہٹانے کے لئے کوئی کتاب پڑھتے ہیں یعنی محض وقت گزاری کے لئے پڑھتے ہیں جس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، ان سے وقت کاٹے نہیں کٹتا، وہ کتابیں صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ انہیں یہ معلوم ہو گیا ہے کہ کتابیں پڑھنے سے وقت آسانی سے کے ساتھ کٹ جاتا ہے، اگر ان پر ان کتابوں کا کچھ اثر ہوتا ہے تو وہ لاعلمی اور بے خبری میں ہوتا ہے۔ وہ اثر مفید بھی ہو سکتا ہے اور مضر بھی، آج کل سستے جاسوسی ناولوں کی بھرمار ہے، اس قسم کی کتابیں پڑھنے سے نادانستگی میں مضر اثرات مترتب ہوتے ہیں، جو کچھ انھوں نے پڑھا ہے اس کے متعلق وہ کوئی اظہار خیال نہیں کر سکتے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ جو کتاب انھوں نے پڑھی ہے وہ انہیں پسند ہے یا نا پسند، اور اس طرح اپنی رائے ظاہر کرتے وقت وہ اس اثر کا ذکر کیا کرتے ہیں جو اس کتاب کے پڑھتے وقت ان پر ہوا تھا۔ جب اس کتاب کو وہ ختم کر لیتے ہیں تو وہ اثر بھی ختم ہو جاتا ہے اس کے بعد وہ کوئی دوسری کتاب اٹھا لیتے ہیں جو اس کتاب سے بالکل بے تعلق ہوتی ہے جو انہوں نے ابھی پڑھی تھی، مگر جب ہم فائدہ حاصل کرنے کے لئے کوئی کتاب منتخب کر کے

پڑھتے ہیں تو اس کو آخر تک پڑھ لینے کے بعد بھی وہ کتاب ہمارے لئے ختم نہیں ہو جاتی، اُس کا قائمہ — محسوس فائدہ، جتنا پڑھتے وقت ہوتا ہے۔ اتنا ہی پڑھنے کے بعد باقی رہتا ہے،

اس قسم کا فائدہ کتابوں سے حاصل کرنا منحصر ہے ایک بڑی حد تک خود ہمارے انفرادی تجربات پر اور ان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے زندگی کے وجدان پر، یہ بات بالکل واضح ہے کہ بہت سے لوگوں کو زندگی کا صحیح ادراک اور وقوف نہیں ہوتا۔ وہ نہیں جانتے کہ زندگی میں کیا چیز بیش بہا اور کار آمد اور بامصرف ہے، زندگی کا کچھ عجیب غیر فطری اور انوکھا رُخ اُنہیں دلچسپ معلوم ہوتا ہے جو انہیں ابھارتا ہے، اکساتا ہے اور متحرک اور مشتعل کرتا ہے۔ اس قسم کے مطالعہ کرنے والے ان لوگوں کی طرح ہوتے ہیں جنہیں جانور خانوں یا میلوں ٹھیلوں میں جانے کا خبط ہوتا ہے یا چھوٹے موٹے اخباروں کی حیرت ناک خبریں پڑھ پڑھ کر جھومنے کا سودا ہوتا ہے کٹہروں میں بند جنگلی جانوروں کو منہ پھاڑے ہوئے وہ اس لئے تکتے ہیں کہ انہیں عجیب اور انوکھا سمجھتے ہیں، میلوں کے تماشا گھروں میں جب کسی عورت کے چہرے پر بڑی سی داڑھی دکھائی جاتی ہے یا سیامی جڑواں بچے دکھائے جاتے ہیں تو وہ حیران اور مبہوت رہ جاتے ہیں اور گھنٹوں ان اعجوبہ چیزوں سے نظر ہٹانے کو اُن کا جی نہیں چاہتا، اسی طرح جب چھوٹے موٹے اخبار اپنے خریداروں کی دلچسپی کے لئے اس قسم کی عجیب وغریب خبریں شائع کرتے ہیں۔ جیسے "نواب رام نگر نے ایک ڈومنی سے شادی کر لی"، یا "ایک آدمی نے کتے کو کاٹ لیا" تو وہ اُنہیں بہت مزے لے لے کر پڑھتے ہیں۔

جب تک لوگ اس قسم کی عجیب اور خلاف فطرت باتوں کو زندگی سمجھے جائیں گے اور ان میں دلچسپی لیتے رہیں گے اس وقت تک وہ ادب سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے کیوں کہ یہ فائدہ متعلق ہے ان چیزوں سے جو عجیب اور خلافِ فطرت باتوں کے حدود سے باہر ہیں، یہ فائدہ متعلق ہے خود زندگی سے، زندگی کی متانت اور سنجیدگی سے' یہ ضروری ہے کہ جہاں کہیں ہم متانت اور سنجیدگی اور مفید اور کار آمد اور بامصرف چیزیں پائیں خواہ وہ اصل زندگی میں ہوں یا کتابوں میں ہوں ہمیں ان کی قدر کرنی چاہیئے اور ان کا اعتراف کرنا چاہیئے، ادبی ذوق کے نشوونما کے لئے یہ پہلی چیز ہے جس کی ہمیں مشق کرنی چاہیئے۔ انگلستان کے مشہور ادیب جی، کے، چسٹرٹن کا ایک جملہ ہے "تو ہمُ طبعی) موت بہ نسبت فاقہ کی موت کے زیادہ الم ناک ہے"۔ اس جملے سے عجیب اور غیر فطری بات اور متین اور سنجیدہ بات کا فرق بہت خوبی سے واضح ہو جاتا ہے اور اس سے ہمارے نقطۂ نظر کی پورے طور پر وضاحت ہو جاتی ہے، اگر ہم ادب سے فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس نقطۂ نظر کو اپنا نقطۂ نظر بنانا ہوگا، یہ بھی ضروری ہے کہ ہم ماضی کے ادب کی حقیقت کو محسوس کریں، اس مقصد کے لئے ماضی کے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے، اگر ہم زبانوں کی عمروں پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ہماری زبان ابھی کم عمر ہے اور اس کا مستند اور قدیم ادب نہ زیادہ قدیم ہے اور نہ زیادہ وسیع ہے، پھر بھی وہ کسی بڑی سے بڑی زبان کے مستند ادب سے پیچھے نہیں ہے،

جو کچھ مندرجہ بالا سطور میں عرض کیا گیا ہے اس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ادب کا مطالعہ کرنے اور اس سے فائدہ حاصل کرنے کے لئے حسب ذیل پانچ اصول ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں،

پہلا اُصول یہ ہے کہ ہمیں اپنی زبان کے ماضی کے مستند ادب سے واقف ہونا چاہیئے اور اس کی زندہ اور پائندہ قوت کو محسوس کرنا چاہیئے، اس کے بغیر ادب کے مطالعہ سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ قدیم اور مستند ادب سے واقفیت تاریخ ادب کے مطالعہ سے یا ادبی انتخابات کے مطالعہ سے، یا ادیبوں اور شاعروں کی سوانح عمریوں کے مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتی، اس کے لئے ماضی کے ادب کا مطالعہ ناگزیر ہے

دوسرا اصول یہ ہے کہ ماضی کے مستند ادب کا مطالعہ ہمیں قدر شناسی اور احترام کے جذبے کے ساتھ کرنا چاہیئے، جب ہم کسی ممتاز اور سربرآوردہ آدمی سے ملنے جاتے ہیں تو اس کی ہر بات کو بہت توجہ اور غور سے سنتے ہیں اور اس کے ایک ایک لفظ کو یاد رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، مستند کتابوں کا مطالعہ بھی اسی انداز میں کرنا چاہیئے توجہ اور غور اور احترام کے ساتھ، پس جب ہم کوئی کتاب پڑھنے کے لئے کھولیں تو ہمیں اپنے ذہن میں یہ خیال قائم کرکے اُسے کھولنا چاہیئے کہ ہم اپنے سے بہتر آدمی کے حضور میں آئے ہیں۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ ہمیں کوئی ایسی کتاب نہ پڑھنی چاہیئے جو ہمیں خشک اور بے لطف معلوم ہو اور ہمارے لئے وبالِ جان بن جائے، ظاہر ہے کہ اگر ہم بار بار وہ فائدہ حاصل کرنے کے لئے کچھ پڑھنا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس کا پڑھنا پُر لطف اور مسرت بخش ہونا چاہیئے۔ ادب سے آگاہی اور روابط آسان نہیں ہے جو کتابیں ہمیں پسند ہیں اور جن کو ہم نے پڑھنے کے لئے منتخب کیا ہے ان کو بار بار پڑھنے کی ضرورت ہے، جتنی زیادہ خوبیاں کسی کتاب میں ہوں گی اور جتنا ٹھوس اس کا مواد اور موضوع ہوگا اتنی ہی زیادہ اس کے مطالعہ کے لئے توجہ اور دھیان کی ضرورت ہوگی یعنی اس بات کی ضرورت ہوگی کہ ہمہ تن متوجہ ہو کر اس کا مطالعہ کیا جائے، نتیجہ یہ نکلا کہ ادب سے صحیح معنوں میں روشناس ہونے کے لئے ہمیں خاص طور پر کوشش کرنے اور محنت کرنے کی ضرورت ہے اور کسی کام میں دل لگا کر کوشش اور محنت کرنا اور اسی وقت ممکن ہے جب وہ کام ہمارے لئے مسرت بخش ہو، ایسی کتابوں کا مطالعہ جاری رکھنا جنہیں ہم شوق اور دلچسپی کے ساتھ نہ پڑھ سکیں مفید ثابت نہیں ہو سکتا خواہ وہ کتابیں کتنی ہی مشہور اور ہر دلعزیز کیوں نہ ہوں۔ فرض کرو کوئی خاص کتاب ہمیں کسی خاص وقت بے کیف اور خشک معلوم ہوتی ہے مگر ہمارے لئے اس کا مطالعہ بہ وجوہ ناگزیر ہے تو ہمیں چاہیئے کہ اُسے دوسرے دن پڑھیں اور اگر ممکن ہو تو اتنے عرصہ کے بعد پڑھیں جب ہماری ادبی تاثیر پذیری میں وسعت اور گہرائی پیدا ہو جائے اور ہمارا مطالعہ کا ذوق غیر معمولی ادبی کارناموں کے محاسن کا اندازہ کرنے کے لئے اور قدر شناسی کے لئے تیار ہو جائے، اس وقت جب ہم وہ کتاب پھر پڑھیں گے تو یہ دیکھ کر شاید ہمیں خود تعجب ہوگا کہ وہ بہت دلچسپ معلوم ہونے لگی، یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیئے کہ صرف وہ کتابیں جو ہمیں پُر لطف اور مسرت بخش معلوم ہوتی ہیں ہمیں متاثر کر سکتی ہیں اور ہمیں فائدہ پہنچا سکتی ہیں، اس لئے ہمیں کوئی ایسی کتاب نہ پڑھنی چاہیئے جو خشک اور بے کیف معلوم ہو اور جس کا مطالعہ ہمارے لئے وبالِ جان بن جائے۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ ہمیں اپنے مطالعہ کو باقاعدہ منظم کر لینا چاہیئے۔ کثرت سے لوگ اس طرح کتابیں پڑھتے ہیں کہ ان کا مطالعہ خلط ملط قسم کا اگل پچّو اور بے ترتیب ہوتا ہے، اس طرح بے ربط اور بے اصول مطالعہ ہمیشہ ذہنی الجھن اور انتشار کا سبب بنتا ہے۔ فرض کرو ہم لائبریری سے ایک کتاب علامہ شبلی کی "موازنۂ انیس و دبیر" لائیں اور اسی کے ساتھ ایک دوسری کتاب پروفیسر الیاس برنی کی "معاشیات" بھی لے آئیں۔ ان دونوں کتابوں کو ایک دوسری سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس طرح اندھا دھند بے ترتیبی کے ساتھ کتابیں پڑھنے کی وجہ سے ہم ایک ہی موضوع پر دو یا دو سے زیادہ کتابوں کا موازنہ نہیں کر سکتے اور ایک کو دوسری پر ترجیح نہیں دے سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کتابوں کے متعلق ہماری ذہنی کیفیت اُلجھی اُلجھی سی اور مذبذب سی ہو جاتی ہے۔

مطالعہ کو مربوط اور مسلسل بنانا ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔ اکثر اوقات کسی ادبی کارنامے کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس کے متعلق مزید واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً یہ معلوم کرنا کہ کن حالات میں وہ کارنامہ ظہور میں آیا اور لوگوں پر کس حد تک اور کس طرح وہ اثر انداز ہوا۔ فرض کرو ہم مولانا حالی کے مشہور مسدّس "مد و جزر اسلام" کا مطالعہ کر رہے ہیں تو یہ معلوم کرنا ہمارے لئے مفید ہوگا کہ اس مسدّس کا خیال حالی کو سر سید احمد خان کی تحریک سے پیدا ہوا۔ پھر اس مسدّس کو کما حقہٗ سمجھنے کے لئے ہمیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جس وقت یہ مسدّس ظہور میں آیا اُس وقت مصنف کے وطن ہندوستان کے مسلمانوں اور ساری دنیا کے مسلمانوں کی حالت کیا تھی۔ اس کے علاوہ اس نظم سے لطف اندوز ہونے اور فائدہ حاصل کرنے کے لئے تاریخ اسلام کا مطالعہ بھی ضروری ہے، بغیر اس کے جو اشارے اور حوالے اس نظم میں قدم قدم پر ملتے ہیں وہ سمجھ میں نہیں آ سکتے بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ اگر تاریخ اسلام سے آگاہی نہ ہو تو ساری نظم ناقابل فہم ہو جائے گی۔ پھر مسدّس حالی کے متعلق نقادانِ ادب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان کا مطالعہ بھی ہمیں اس نظم کو سمجھنے میں بڑی مدد دے سکتا ہے۔ یہی ادب کے مطالعہ کی ترتیب و تنظیم ہے۔

پانچواں اور آخری اصول یہ ہے کہ ہمیں اچھے اور بُرے ادب کے فرق سے آگاہ ہونا چاہیئے یعنی ہمیں یہ معلوم کرنے کی تمیز ہونی چاہیئے کہ کون سی کتابیں اچھے اور صحیح قسم کے ادب میں شمار ہونے کے قابل ہیں اور کون سی نہیں ہیں، اس اصول پر جتنا زور دیا جائے کم ہے، ہر تحریر اور ہر تصنیف ادب میں شامل نہیں ہو سکتی، لیکن جو کتابیں ادب میں شامل نہیں ہیں، اُن میں سے بعض ایسی ہو سکتی ہیں جن سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو سکتا ہے اور یہ معلومات بھی ہمارے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہے، لیکن جس قسم کے فائدے کا ذکر ہم نے اس مقالے کے شروع میں کیا ہے وہ ہمیں صرف صحیح قسم کے ادب ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

اچھی اور بُری تصانیف میں تمیز ہمیں کلاسکی اور مستند ادب کے مطالعہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ جو ادب مدت سے لوگوں کو مستفید کرتا اور تفریح بہم پہنچاتا اور مسرت بخشتا چلا آ رہا ہے، وہ یقیناً بہترین ادب ہے اور جس ادب میں اسی قسم کے محاسن پائے جائیں، جیسے کلاسکی اور مستند ادب میں ہیں، وہ صحیح قسم کا اور بہتر قسم کا ادب ہے۔

ان پانچ اصولوں کے مطابق اگر ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اس سے فائدہ حاصل کرنے میں خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے

سید محمد تقی

غالب کی ادبی تخلیقات کا مابعدالطبیعیاتی پس منظر

تمام تخلیقات جن میں شاعری بھی شامل ہے کسی نہ کسی مابعدالطبیعیاتی تصور سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ذہن کے پس منظری خانوں میں کائنات کی نہج سے متعلق کوئی خاص نقطۂ نظر یا انداز فکر موجود رہتا ہے۔ مابعدالطبیعیات کی اصطلاح پہلے پہل ارسطو نے استعمال کی تھی لیکن ارسطو نے مابعدالطبیعیات کو علیات کے مخصوص معنوں سے تعبیر کیا ہے جب کہ یہاں مابعدالطبیعیات سے مراد فرد کا وہ تحت الشعوری پس منظر ہے جو وہ خارجی دنیا سے اپنے ذہنی رشتوں کے سلسلے میں رکھتا ہے۔ انسان کا یہ تحت الشعوری پس منظر شعر و ادب اور فن کی ہر تخلیق سے پہلے موجود رہتا ہے۔ اور فرد کی زندگی کے ہر لمحے میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔ خواب کی حالت میں بھی جب فرد کا ذہن متعین زمانی اور مکانی رشتوں سے تعلق باقی نہیں رکھتا یہ لاشعوری مابعدالطبیعیاتی پس منظر باقی رہتا ہے۔ اور عام حالات میں انسان کے حسیاتی نظام سے منسلک رہتا ہے۔ مابعدالطبیعیاتی پس منظر کی اس ہمہ گیری کے پیش نظر یہ سوال کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کی شاعری کا مابعدالطبیعیاتی پس منظر کیا تھا۔ ایک بڑی طویل فکری بحث کی حیثیت سے سامنے آتا ہے جو ایک طویل مطالعہ کے بغیر اپنا پورا مفہوم پیدا نہیں کر سکتا لیکن اس لمبی بحث کو چھیڑے بغیر جہاں تک مسئلے کے چند سرسری پہلوؤں کا تعلق ہے بعض ایسی اساسیں سامنے لانی ممکن ہیں جو توقع ہے کہ دلچسپ فکری بحثوں کا سبب بن جائیں گی۔

انسانوں کی تاریخ اب تک مختلف انداز اور مختلف درجوں میں بانٹی گئی ہے۔ مارکس کے خیال میں تاریخ کو سمجھنے کا انداز خالص معاشی ہے۔ آگسٹ کامٹ انسانی تہذیب کی تاریخ کو جدا جدا طرز پر مختلف فکری حصوں میں بانٹنے کا مشورہ دیتے ہیں لیکن راقم الحروف کے خیال میں تہذیب کی تاریخ فکری انداز میں منقسم ہونے کی صورت ہی میں اپنا مفہوم پیدا کر سکتی ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ فکر کا ارتقاء معاشی قوتوں کے عمل سے گہرا اثر لیتا ہو اور لازماً اس سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتا بھی ہے۔ لیکن فکر کے ارتقاء کی اپنی تاریخ ایک خاص پہلو رکھتی ہے جو معاشی عناصر کو پس منظری قوتیں ماننے کے باوجود اپنا مفہوم نہیں کھوتا۔ انسان کی ساری تہذیبی تاریخ کا اب اس کے پس منظری فکری انداز کے طور پر جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ کلچر کا بہاؤ دو واضح منزلوں سے ہو کر گزرتا ہے ایک [illegible] سنگ میل ہے جہاں واضح ادوار کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ یہ بات انسانوں نے یونان ہی میں سوچ لی تھی کہ یہ کائنات یا تو سکونیاتی تشریح کی متحمل ہے یا حرکتی تشریح کی۔ پارمنائیڈیس سکونیاتی تشریح کا حامی تھا جب کہ ہیراقلیطس کائنات کی حرکتی تشریح کرنے پہ مصر رہا۔

کائنات اور انسان کے کائنات سے سلوک کے سلسلے میں سکونیاتی ذہنی پس منظر یا حرکتی فکری پس منظر دو جدا جدا دور ہیں جو انسان کی تاریخ میں ایک واضح حد بناتے ہیں۔ یہ دونوں تصور موجود تو شروع ہی سے رہے لیکن سکونیاتی تصور کائنات سرسری طور پر نشاۃ ثانیہ کے عہد تک باقی رہا ہے۔ جب کہ حرکتی تصور نے نشاۃ ثانیہ کے بعد سے نئی زندگی اور نیوٹن کی طبیعیات کی اشاعت سے نئی توانائی حاصل کی۔ زندگی کی موجودہ نہج اور حیات کے علمی، ادبی اور فنی فلسفے نیوٹن کی ڈی سینڈنگ (حرکیات) سے گہرے طور پر متاثر ہوئے ہیں اور یوں آپ کہہ سکتے ہیں کہ نشاۃ ثانیہ کے بعد کا عہد ہیریکلیٹس کا احساس ہے

پہلا دور پارمنائیڈیس کا دور تھا۔ تاریخ گیر حقیقتوں کے لئے کچھ بنانے کا کھیل بڑا خطرناک کھیل ثابت ہوا ہے جو محتاط مفکر کبھی کھیلنے کی غلطی نہیں کرتے۔ لیکن یہاں اگر اس عدم احتیاط کی اجازت دی جا سکے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ ادب اور شعر کی تاریخ بھی تہذیبی رجحانات کے ان دو ادوار سے ہو کر گذری ہے۔ نئے عہد کا ادب حرکیاتی انداز نظر سے اپنے تخیل کے سوتے ملاتا ہے۔ جب کہ نشاۃ ثانیہ سے پہلے کا ادب سکونیاتی طرز فکر سے اپنی تخلیقات کو سنوارتا تھا۔ نشاۃ ثانیہ یوروپی تاریخ کے ایک مخصوص عہد کا نام ہے لیکن یوروپی تاریخ نشاۃ ثانیہ کے عہد میں جس موڑ سے گذری تھی اس قسم کے موڑ دوسرے ملکوں کی تہذیبوں میں بھی آتے اور آرہے ہیں اس لئے نشاۃ ثانیہ کو سنگ میل قرار دینے کی یہ کوشش تاریخ گیر اطلاق رکھتی ہے۔ صرف یوروپی ملکوں تک محدود ہو کر نہیں رہ جاتی۔

ادب کے فکری اور تخلیقی پس منظر کو سمجھنے کا یہ انداز اگر صحیح ہو تو یہ سوال بالکل قدرتی طور پر پیدا ہوگا کہ اردو ادب اپنے پس منظری تخلیقی عناصر میں ان عام تہذیبی رجحانات سے کس موڑ پر آکر گذرا ہے۔ راقم الحروف کے خیال میں اردو میں غالب ماضی کے سکونیاتی اور مستقبل کے حرکیاتی دور کے درمیان سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں ماضی کا مابعد الطبیعاتی پس منظر مرا نہیں ہے۔ لیکن مستقبل کا مابعد الطبیعاتی پس منظر تیزی کے ساتھ ابھرتا معلوم ہوتا ہے۔ اور غالب کا یہی وہ اختصاص ہے جو انہیں دوسرے تخلیق کاروں سے ذرا مختلف درجے پر لانے کا سبب بن گیا ہے۔ غالب کا یہ شعر کہ —

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

کائنات کے سکونیاتی پس منظر سے ابھرا ہے۔ افلاطون نے اپنی جمہوریت کی — کتاب السابع — میں غار اور سایوں کی مشہور مثال سے کائنات کی جو حقیقت بیان کی تھی جسے پلوٹینس نے اینیاڈ میں کافی تفصیل سے اور ایک مکمل نظریے کے طور پر بیان کیا ہے غالب کے اس شعر میں بڑی واضح تشریح کے ساتھ آئی ہے۔ اسی طرح غالب کی مشہور فارسی غزل کا یہ شعر کہ —

خون شد اجزائے زمانے در فشار بے خودی
رفت ایامے کہ من امسال و پارے داشتم

سکونیاتی تصور کائنات ہی کی نمائندگی کرتا ہے۔ امسال و پارے — یعنی زمانے کی اولیت اور ابدیت کے ختم ہو جانے کا خیال مسلمان مفکروں کے دہر کے تصور سے میل کھاتا ہے اس لئے کہ دہر میں بھی نہ ازل باقی رہتا ہے نہ ابد۔ ایران کے میر باقر داماد — دہر — کو زمان کی طرح مرنے والا تسلیم کرتے ہیں اور غالب کے اس شعر میں بھی دہر پیدا ہونے اور مرنے کی خصوصیت رکھتا ہے۔ تاہم اس شعر کے پس منظر میں جو سکون اور عدم حرکت آتی ہے وہ پارمنائیڈیس کے سکونیاتی تصور کائنات کی نمائندگی کرتی ہے۔ لیکن ان جیسے اشعار کے برعکس جب بات اس نقطے پر پہنچتی ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ —
دیکھیں کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

تو وہ حرکتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو جدید عہد کے سائنسی مزاج سے پوری طرح میل کھاتی ہیں۔

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

بڑا معنی خیز مصرع ہے اور لکھنے والے نے پورے شعوری کرب اور فکری گہرائی کے ساتھ یہ مصرع تخلیق کیا ہے تو اس میں سائنسی FATALISM کے اس تصور کی تائید کی گئی ہے جو ایک طرف مسلسل حرکت اور دوسری طرف تعلیل یعنی CAUSATION کے مجموعے سے پیدا ہوتا ہے جو نیوٹن کی دی ہوئی کس اور سائنس کے اساسی جوہر کی حیثیت رکھتی ہے۔ غالب کے کلام میں سائنس کے جدید مزاج سے جو شعر سب سے زیادہ قریب آتا ہے وہ میرے خیال میں ان کا یہ

شعر ہے کہ —

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

نظریے — اتفاق — کو ایک منظم سائنسی نظریے کے طور پر اپنایا ہے۔ اتفاق کا یہ عنصر جو مستقبل میں ان گنت امکانات کو جنم دینے کا سبب بن سکتا ہے۔

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

کے مصرعے میں بڑے سلیقے، بڑی فنکارانہ مہارت کے ساتھ آگیا ہے۔

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

زمان کے غیر یقینی پہلو، کائنات کی خود تخلیقی کے لامحدود امکانات اور اتفاق کے عنصر کی غیر متعین سرگرمیوں کی نمائندگی کرتا ہے جسے کوانٹم تھیوری کے بنانے والوں نے ایک متعین فلسفیانہ اسکول کی شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ زمان کے غیر یقینی پہلو سے جس میں اتفاق کا عنصر اتنا اہم پارٹ ادا کرتا ہے مستقبل کی بابت غیر یقینیت جنم لیتی ہے جو تشکیک یا SCEPITICISM کی بنیاد بن جاتی ہے۔ ذہن کے خلاؤں میں جب تشکیک موجود ہو تو اس قسم کے اشعار کا تخلیق پا جانا بالکل منطقی تقاضے کی حیثیت رکھتا ہے۔

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

بہرحال ان چند سطروں میں مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا وہ یہ تھا کہ غالب کا مابعد الطبیعیاتی پس منظر پارمنائیڈیس کے سکونیاتی تصورِ کائنات اور ہیرقلیطس کے حرکیاتی اندازِ نظر سے پیدا ہوا ہے وہ ماضی کے سکونیاتی تصورِ کائنات کو بھی زندہ رکھتے ہیں اور نئے عہد کے حرکی تصور کو بھی اپنانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی تو یہ دونوں رجحانات ایک ہی شعر میں ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ ان کا یہ شعر کہ —

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے بزمِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

دونوں رجحانات کی نمائندگی کرتا ہے۔ پہلا مصرعہ

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب

کائنات کے حرکی یا سائنسی اندازِ نظر سے ابھرا ہے جب کہ دوسرے مصرعے میں

ہم نے بزمِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

ماضی کے تہذیبی رجحانات کی نمائندگی ہوتی ہے۔ غالب کے یہاں گزرے ہوئے اور آنے والے کی یہ کشمکش پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ایک ان کا ماضی کا ثقافتی ورثہ ہے جسے وہ جھٹلانے پر قادر نہیں ہوسکے جب کہ دوسرا رجحان ان کے جینیئس ذہن کی تخلیق ہے جس نے انہیں اردو ادب کے لیے ایک نئے دور، ایک نئے عہد کا سرخیل بنانے کا اعزاز عطا کیا جو نہ ان سے پہلے کسی کو حاصل ہوا اور نہ ان کے بعد کسی دوسرے کے حاصل کرنے کی توقع قائم کی جاسکتی ہے۔

نشاد عزیز

ادب میں مکرر تابکاری

گذشتہ کی ایک گزشتہ محفل میں مغربی اور مشرقی ادب کے تقابل اور ان کی ایک دوسرے پر فضیلت کے متعلق ایک بحث چھڑی تھی جو وقت کی کمی کے باعث کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی اب اس بحث کو تو ہم دوبارہ نہیں چھیڑیں گے لیکن آپکی اجازت سے آج کے پاکستانی فنون لطیفہ کو صحیح تناظر میں دیکھنے کے لئے ہم لوگ تاریخ ادب کی تاریخ نہیں دنیا کی تاریخ سے استفادہ کریں گے تاکہ یہ تفصیلات خود بخود پورے نقشے میں اپنی جگہ پالیں۔

تاریخ میں اب تک مروج نظریہ یہی رہا ہے ـــ کہ ادب، فن تعمیر، موسیقی، حساب، اقتصادیات جغرافیہ اور دیگر تمام علوم وفنون مطلق اور خود مختار شعبہ ہائے اظہار ہیں۔ ہر ایک کی اپنی الگ الگ تاریخ اور اپنا الگ الگ ارتقاء ہے جو ایک ہی راستے پر ہزاروں سال سے گامزن ہے اور مستقل ترقی پذیر ہے۔ چنانچہ ان شعبوں میں جو ہزار یا چھ سو یا سو سال پہلے ہوا۔ وہ آج کے مقابلے میں ابتدائی تھا جو آج ہو رہا ہے وہ ماضی کے مقابلے میں ترقی یافتہ ہے ـــ اور اسی کا نام ارتقاء ہے۔

میں آپ کے سامنے ایک مختلف نظریہ پیش کرنا چاہتی ہوں۔ جو نیا تو نہیں لیکن مروج بھی نہیں حالانکہ نہ صرف اس نظریہ کو مروج ہونا چاہئے تھا بلکہ دنیا کے ہر مسئلے پر اس کو ایک نئے اور انقلابی زاویئے سے روشنی بھی ڈالنی چاہئے تھی کہ یہ نظریہ بذات خود انقلاب انگیز ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ تاریخ کے جن دھاروں کی تہذیب کے معنی اس مضمون میں مروج معنی سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں تہذیب سے مراد رہنے سہنے گانے ناچنے یا ادب آداب سے ہی نہیں بلکہ ہزار ڈیڑھ ہزار برس کے اس پورے وقفہ سے ہے جس میں ایک یا ایک سے زیادہ قومیں بربریت کے لاانتہا سمندر سے الگ ہو کر قومیت کا درجہ پاتی ہیں اور جاگیرداری، شہنشاہیت، اور روایت وغیرہ کی تمام منازل مع ان سے متعلق جنگوں، حکومت، فنون وعلوم کے حصول کو طے کرکے بالآخر ایک ثقافت کا درجہ پاتی ہیں۔

ایک مخصوص سمت میں سفر کرنے سے یہ نظریہ وجود میں آیا ـــ انہی روؤں کا یہ تقاضا تھا کہ یہ نظریہ مروج نہ ہوا۔

کوئی آرٹ فارم ہیئت فن مطلق اور خود مختار نہیں ہے تمام آرٹ فارمز ایک وسیع تر بلند تر اور زندہ وجود کے مختلف شعبہ اظہار ہیں۔ اور اسی کے تناظر میں صحیح طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔ یہ وسیع تر بلند بلند تر زندہ وجود ایک پوری تہذیب کا پھیلاؤ ہے جو ایک متعین عرصے کے لئے ایک ہزار یا ڈیڑھ ہزار برس کے لئے وجود میں آتی ہے اور ابتدائی منزلوں سے گزر کر عروج پر پہونچ کر زوال پا جاتی ہے۔ اس تاریخ میں

RE-RADIATION ؎

جو انسانی علم کی حدود کے اندر ہے۔ ایسی تہذیبوں کی مثالیں آپ کو آٹھ دس ملیں گی جن میں مصر کی تہذیب، چین کی تہذیب، قدیم ہندوستان کی تہذیب، عرب کی تہذیب، یونانی رومن تہذیب اور مغربی یورپی امریکی تہذیب شامل ہیں۔ ان تہذیبوں کا طلوع نشو ونما، عروج اور زوال اپنی جگہ ایک دلفریب مطالعہ ہے لیکن اس کی وسعت کو اس مختصر مضمون میں قید نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں ہم اس کے فنون لطیفہ سے متعلق حصہ سے بحث کریں گے۔

فن تعمیر کی تاریخ اگر ہم اہرام مصر سے شروع کریں اور اس کو ابتدا سمجھ کر تحقیق کرتے کرتے بالآخر یورپ کے موجودہ کلیساؤں اور جدید فن تعمیر تک پہنچیں تو یہ قابل معافی ہے لیکن اہرام مصر کے مطالعے کے وقت ہمارے پیش نظر مصری تہذیب کی شخصیت نہ ــــ یورپی کلیساؤں کے مطالعہ کے وقت ہمارے پیش نظر مغربی یوروپی تہذیب اور فن تعمیر پر اس کے اثرات ہوں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آنکھ یا ناک کا مطالعہ کرتے وقت اس سے متعلق چہرہ ہمارے پیش نظر نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ چینی یا جاپانی یا حبشی چہرہ ایک خاص طرز کا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک جاپانی چہرے کے حسین ہونے کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اس پر ناک لمبی ہو۔ یا آنکھیں بڑی بڑی اور کھلی ہوں۔ جاپانی چہرے کا حسن اس کے اپنے خدوخال کے اندرونی توازن اور تناسب پر منحصر ہے۔ چنانچہ یوں کبھی بحث نہیں کی جاتی، کہ یوکوتانی کی ناک گریس کیلی سے لمبی ہے یا چھوٹی۔ ان کے پورے سراپا کے مطالعے کے بعد ان کا تقابل روا رکھا جاتا ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص میں اتنا فنی اور جمالیاتی شعور نہ ہو کہ وہ اپنی نسل سے باہر کے لوگوں کا سراپا جانچ کر حسن و قبح کا امتیاز کر سکے۔ لیکن یہ حقیقت مسلم ہے کہ حسن ہر نسل سے مخصوص چہرے میں پایا جاتا ہے البتہ معیار نقطۂ نظر سے بدلتے رہتے ہیں۔

مقصد اس تشبیہ کا یہ ہے کہ ہر تہذیب ایک زندہ جیتے جاگتے اور اپنی مخصوص شخصیت کے حامل انسان کی طرح ہے۔ اس تہذیب کے عرصہ زندگی میں پنپنے والے فنون لطیفہ، ادب، مذہب، سائنس یا سائنس کا فقدان، تاریخ جغرافیہ اس تہذیب کے خدوخال ہیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ہر تہذیب اپنی جگہ مکمل بھرپور اور خوبصورت ہے۔ ہر ایک کی اپنی اپنی خوبیاں اور اپنی اپنی خامیاں ہیں۔ اپنا اپنا انداز اظہار ہے لیکن عروج و کمال پر پہونچ کر انسان کی جوانی کی طرح ہر تہذیب جاذب نظر تازہ اور خوبصورت ہے اور اسی لئے دنیا پر اپنا اتنا پائیدار اثر چھوڑ گئی ہے کہ ہزاروں سال بعد بھی آج کے سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان اگر کسی گزشتہ تہذیب کی روح کو گرفت میں لے آئیں تو اس کے لئے کشش محسوس کرتے ہیں۔ اور نہ سمجھ پائیں تو اس سے متاثر اور متحیر رہتے ہیں۔

ہر ہستی کے خدوخال اس ہستی کی شخصیت کے زیر اثر ہوتے ہیں، اور اس شخصیت کی تفسیر لئے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر تہذیب کا ادب اس تہذیب کی فضا کا حامل ہے اور اس سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ یونانی ادب کو لیجئے۔ یونانی ادب کردار سے زیادہ واقعات کا ادب ہے اس کے برعکس مغربی ادب ایک خاص منزل پر پہونچ کر کردار کا ادب بن جاتا ہے۔ نقاد یہ سمجھتے ہیں کہ یونانی ادب کی ترقی یافتہ صورت مغربی ادب ہے کہ جہاں پہونچ کر یونانی رک گئے۔ وہاں سے آگے مغرب نے ترقی کی حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ یونانی تہذیب کی شخصیت کا ایک خاص عنصر تھا حال اور موجود پر توجہ کا مرکز اور غیر مرئی سے احتراز چنانچہ ان کے ہاں مغرب کی تمام تجریدیں (ABSTRCTIONS) مثلاً حسن جنگ، محبت، عقل مغرب کیلئے غیر مرئی اور غیر جسدی نہیں۔ بلکہ ایتھنا، زیس، منروا، کیوپڈ، وینس کے ناموں کے دیوی دیوتاؤں کی صورت میں مرئی اور جسدی ہیں۔ انکی عمارتیں مستطیل ٹھوس اور غیر پیچیدہ ہیں ان کا فلسفہ، ان کا حساب تمام موجود سے متعلق ہے۔ اور جسد کو چھوڑ کر غیر مرئی دنیا میں زیادہ دور تک پرواز نہیں کرتا۔ چنانچہ اسی طرح ان کا ادب بھی کردار کا نہیں واقعات کا ادب ہے کہ کردار کی پیچیدگی کا کوئی جسد نہیں ہوتا۔ ایاگو کی ذہنی پیچیدگیاں جسم سے زیادہ خیال کی دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور اس لئے یونانی تہذیب کی شخصیت کے لئے اجنبی ہیں۔ واقعات کا البتہ مرئی وجود ہوتا ہے اس لئے کرداری ڈراموں کی یونانی تہذیب میں گنجائش نہیں تھی۔ لیکن واقعات کی ڈرامائی پیچیدگی کی ان کے ہاں گنجائش بلکہ ضرورت تھی۔ یونانی

ذہن اگر یوکلیڈ میں جیومیٹری اور واقعاتی ٹریجڈی اور مکالموں کے فلسفے سے آگے نہیں بڑھا تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ابتدائی اور محدود قابلیت کا مالک تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس حد سے آگے جانا یونانی تہذیب کی شخصیت سے انحراف ہوتا چنانچہ صفر اگرچہ ہندوؤں نے دریافت کر لیا ہوا تھا۔ لیکن یونانی شخصیت سے اجنبی ہونے کے باعث کہ وہ نہیں یعنی غیر موجود کا سمبل تھا۔ یونانیوں نے اُسے رَد کر دیا۔

اگر اس نقطے کو ہم سمجھ لیں۔ تو وہ الجھاؤ دور ہو جائے۔ جس کی بنا پر ہم ایک تہذیب کے ادب فلسفے اور حساب کو دوسری تہذیب کے معیار پر پرکھتے ہیں۔ وجدانی طور پر ہم محسوس کرتے ہیں۔ کہ یونانی ڈرامہ مغربی ڈرامے سے مختلف ہے۔ ہندو فلسفہ مغربی فلسفے سے مختلف ہے۔ داستان مختصر افسانے سے مختلف ہے۔ وجدانی طور پر ہم یونانی ڈرامے ہندو فلسفے فارسی شاعری کی عظمت اور کشش بھی محسوس کرتے ہیں۔ لیکن جونہی ہم مروجہ یعنی مغربی نظریوں کی عینک لگا کر یہ ساری چیزیں پڑھتے ہیں فوراً ان کو مغربی معیار پر پرکھنا شروع کر دیتے ہیں اور یوں وہ ہم کو الجھی ہوئی غیر متوازن اور ابتدائی نظر آنے لگتی ہیں۔

تو مدعا یہ ہے کہ کوئی صنف کوئی آرٹ فارم مطلق اور خود مختار نہیں ہے۔ بلکہ اپنی جنم دینے والی تہذیب کا کوئی نقش ہے۔ ان کی بعض خصوصیات کو تبدیل کر دینے یا جدید سے ہم آہنگ کرنے کی خواہش ایسی ہی ہے جیسی ایک خوبصورت جاپانی چہرے پر پلاسٹک سرجری کی تواں ناک کا نزول یہ زندہ تہذیبیں اپنی زندگی کی حقیقت سے موت کا بھی حکم رکھتی ہیں۔ چنانچہ عروج کی ایک خاص منزل پر پہنچ کر وہ بکھر کر یا تو نیست و نابود ہو جاتی ہیں۔ جیسے ہڑپہ کی تہذیب یا پھر ایک دیو قامت برگد کی طرح صدیوں شاخیں اٹھائے کھوکھلی اور مردہ زمین پر موجود رہتی ہیں۔ جیسے یونانی عجمی، مصری اور ہندو تہذیبیں۔ ان کے فنون لطیفہ اور دیگر تمام علوم و فنون بھی اسی حنوط شدہ حالت میں ساکت و جامد صدیوں اسی طرح موجود رہتے ہیں۔ جب تک کوئی جغرافیائی مجبوریاں مثلاً طوفان زلزلے وغیرہ ان کو ختم نہ کر دیں یا کوئی اور نئی اور زندہ تہذیب آکر ان کو مکرر تابکاری پر مجبور نہ کرے۔

اس ایک خیال ——— مکرر تابکاری ——— کی توضیح کے بعد ہم اپنے موجودہ ادب کی دہلیز پر کھڑے ہونگے جس طرح سورج میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی روشنی اور کرنیں چاند تک منتقل کرے اور جس طرح چاند میں یہ خصوصیت ہے کہ وہ ان کرنوں کو جذب کر کے ان کی روشنی کو دوبارہ تابکاری بخشے اسی طرح بعض تہذیبوں میں پھیلنے، چھا جانے جذب ہونے کی خصوصیت ہوتی ہے ایسی ہی ایک تہذیب مغربی یوروپی امریکی تہذیب ہے۔

اس تہذیب کی شخصیت میں سفر کرنے کی پھیلنے کی، لامحدودیت کی کسک ہے چنانچہ عہد وسطیٰ سے نکلتے ہی یعنی ۱۴۹۲ء کے آس پاس مغربی یوروپ کے باشندوں نے پھیلنا شروع کیا۔ جو براعظم اچھوتے تھے، جیسے آسٹریلیا اور امریکہ وہاں وہ رچ بس گئے جہاں پہلے سے قدیم اور گزشتہ تہذیبوں کے نام لیوا بہت بڑی تعداد میں موجود تھے اور وحشی ریڈ انڈینز کی طرح جھٹکے نہ جا سکتے تھے۔ وہاں انہوں نے اس مکرر تابکاری کے ذریعہ تسلط جمانا شروع کیا۔ مشنری لوگ جان جوکھم میں ڈال کر کانگو کے جنگلوں، چین و تبت کے دور افتادہ سنگلاخ پہاڑوں اور دنیا کی ہر ممکن ناممکن جگہ اپنی دانست میں عیسائیت کا پرچار کر رہے ہیں لیکن دراصل مغربی تہذیب کی اسی مکرر تابکاری کی کسک کا سمبل ہیں۔

آگے زمین سنگلاخ ہے کیونکہ اس زمین میں تحقیق کی بڑی گنجائش ہے لیکن میری دانست میں عربی عجمی تہذیب مغل تہذیب کی شکل میں بہادر شاہ ظفر کے زمانے تک ہندوستان میں موجود رہی۔ اور اس حساب سے عربی عجمی تہذیب کے آخری صادق اور INDIGINOUS شعراء ادباء غالب اور ان کے ہم عصر ہیں کہ ان کے ہاں اس مکرر تابکاری کے کوئی عنصر نہیں ملتے ..... حالانکہ اس زمانے میں ہندوؤں میں مکرر تابکاری شروع ہو چکی تھی اور صدیوں سے منجمد ہندو تہذیب میں سناتن دھرم کے مقابلے میں آریہ سماج کی بنیاد سوامی دیانند نے غالب کے زمانے میں ڈال دی تھی ..... دراصل مغل تہذیب نے اس وقت ابھی پوری طرح دم نہیں توڑا تھا۔ یعنی اس میں خود اپنی جان ہی تھوڑی بہت موجود تھی چنانچہ وہ باہر سے اجنبی زندگی جذب کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں ہندوؤں میں یہ مکرر تابکاری انگریزی تعلیم

کی صورت میں سوکھے ایندھن میں آگ کی طرح پھیلی ـــــ مسلمان اس کے خلاف بچاؤ کرتے رہے ـــــ یہاں تک کہ اس طاقت وسیلے نے ان کو مغلوب کرلیا۔ اور سرسید کی صورت میں مکرر تابکاری کا دور مسلمان ادبا و دانشوروں میں شروع ہوا۔

جو جہاد آزادی کے دوران مکرر تابکاری کا یہ دور ہندوستان میں پورے عروج پر تھا چنانچہ اسی زمانے میں اردو ادب میں بھی ایک زبردست اُبال اٹھا۔ چنانچہ فارسی کے مخصوص سفرنامے، روزنامچے؛ فارسی عربی کی مخصوص شاعری کے انداز اُردو سے رخصت ہوئے۔ اس کی جگہ نثر میں مغربی آرٹ فارمز ناول اور افسانہ اور رپورتاژ درآمد ہوئے، شعر میں غزل قصیدے رباعی کی جگہ آزاد شاعری، مقصدی شاعری اور نظم نے لی۔ فن تعمیر، اقتصادیات، معاشیات، سیاسیات، سائنس سب نے ایک کروٹ بدل کر مغربی لبادہ اوڑھ لیا۔

اب یہ فیصلہ کہ مغرب سے ایک خاص وضع کے آرٹ فارمز درآمد کرکے ہم ان کو مغرب والوں سے بہتر طور پر استعمال کرسکے ہیں یا نہیں۔ مختصر تفصیلات کی بات ہے، ہمارے بہتر افسانہ نگار۔ بہترین ادیب۔ بہترین شاعر مغرب کے درمیانے اور درمیانے سے کچھ اونچے ادبا سے بہت بہتر ہیں لیکن کسی بھی ادبی فنی سرمایے کو پرکھنے کے لئے ان کے شاہکاروں سے رجوع کرنا چاہئے اور یہ حقیقت ہے کہ مغرب کے شاہکاروں کو ہم مات نہیں کرسکے۔ ہمارا پہا تابھی عربی ادب اور فن البتہ صادق اور (INDIGIVOUS) ہونے کی وجہ سے ان کے ادب کا ہم پلہ ہے بشرطیکہ ہم اسے مغربی معیار کی عینک لگا کر نہ پڑھیں۔

جوش ملیح آبادی

رباعیات

جو دن نہ ہو، وہ رات نہیں ہوتی ہے
جو دل کی ہے، وہ بات نہیں ہوتی ہے
ہستی وہ تلاطم ہے کہ اکثر اے جوش
اپنے سے ملاقات نہیں ہوتی ہے

سر گھوم رہا ہے ناؤ کھیتے کھیتے
اپنے کو فریب عشق دیتے دیتے
اُف کارِ جہاں تھک گیا ہوں معبود
دم ٹوٹ چلا ہے سانس لیتے لیتے

نکلی لب گل سے آہ، خوشبو بن کر
سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سر سے گئی دل میں ان کی تصویر لئے
تصویر ٹپکنے لگی آنسو بن کر

گفتار میں کھل رہی ہے بیلے کی کلی
رفتار میں مڑ رہی ہے ساون کی ندی
چہرے پہ سرور و نور آنکھوں میں غرور
سرکار نے کیا آئینہ دیکھا تھا ابھی

فارغ بخاری

جنگل

دُور تا حدِ نظر ایک سکوں ایک جمود
زندگی جیسے کوئی ٹھہرا ہوا چشمہ ہے
یہ گھنی چھاؤں، جنوں خیز مناظر کا جہاں
بیکراں رفعتوں، خوابیدہ نشیبوں کی زمیں

گونگی مخلوق کا یہ شہر عجب شہر ہے جو
اتنا آباد ہے لیکن کوئی آواز نہیں
سرسراتا ہے ہر اک گوشے میں افکار کا بھوت
چارسو گونجتا ہے ایک پراسرار سکوت

خم کاکل کی طرح پھیلے ہوئے رستوں پر
کتنے ہی راہی بھٹکتے ہوئے آئے لیکن
اس کی خاموش نواؤں کو کوئی سن نہ سکا
درد میں ڈوبے ہوئے نغموں پہ سر دھن نہ سکا
ان گنت گوہر نایاب کوئی چن نہ سکا

ظہور نظر

رت جگا

سوچتے سوچتے نیند سپنا ہوئی
جاگتے جاگتے ساری شب کٹ گئی

شب، جسے ساکنانِ دیارِ وفا
بے اماں بھی کہیں، مہرباں بھی کہیں
نیند دستک میں لے کر نگارِ صبا
بند کھڑکی کا در کھٹکھٹاتی رہی
چودھویں رات کے چاند کی چاندنی
چھن کے شیشوں سے کمرے میں آتی رہی
ایک انجان سے درد کا وہم سا
ایک بے نام سی بے کلی کی طرح
دل کے نزدیک محسوس ہوتا رہا
اک حسینہ جسے کل سرِ رہگذر
میں نے دیکھا تھا یوں، جیسے دیکھا نہ تھا
میری آنکھوں میں پھرتی رہی رات بھر

آرزو نے کہا دل کا در کھول دو
دھڑکنوں نے کہا ہم تمہاری نہیں
جستجو نے کہا میرے پر کھول دو
میں کہ حیراں تھا چپ چاپ لیٹا رہا
بند کھڑکی کا در کھٹکھٹاتی رہی
نیند دستک میں لے کر نگارِ صبا
چودھویں رات کے چاند کی چاندنی
جن کو برہا کے مارے ستمگر کہیں
چھن کے شیشوں سے کمرے میں آتی رہی
ایک بہتی ہوئی بے صدا راگنی
میرے احساس میں سرسراتی رہی
جاگتے جاگتے ساری شب کٹ گئی
سوچتا ہوں کہ یہ ناگہاں رت جگا
روز کا سلسلہ تو نہ بن جائے گا

شاذ تمکنت

فسونِ نیاز

یہ دشتِ سینۂ سرو سلماں یہ سوزِ نیم شبی
جہاں بھی چشمۂ ریگِ رواں نظر آیا
چمک اُٹھا ہے مرا داغ داغ تشنہ لبی

گریز پا ہے کہ ہے پا بہ گِل یہ عمرِ وفا
حیات ہے کہ سن و سال کی دہائی ہے
میں وہ کہ جس کو بیاباں سے مشتِ خاک ملی
مرا طریقِ طلب ہے کہ جگ ہنسائی ہے
گُلِ شگفتہ نہ مانگو گُلِ چکیدہ سہی
رسائی ہے کہ یہ احساسِ نارسائی ہے

ہزار شکر مرے پاس کوئی برگ نہ ساز
پکارتا ہے نسب نامۂ جبیں کیا کیا
"حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز"

محبوب خزاں

شاید

بکھر گئے وہ خیالات پھر اندھیرا ہے
ذرا سی دیر کو بجلی کی لہر آئی تھی
دکھائی دینے لگے تھے ادھورے کانپتے چاند
ذرا سی دیر کو جاگا تھا رات کا احساس
پلٹ پلٹ کے نہ دیکھو مجھے نہیں معلوم
یہ وقت کیسے کٹا رات کیسے گذرے گی
جو لوگ مر نہیں جاتے وہ زندہ رہتے ہیں
سُنا تو ہے کہ ستارے ہیں ابر کے اُس پار
تمام عمر پڑی ہے مگر نہیں شاید
گذر چکا ہے وہ سب کچھ جو ہونے والا ہے

شہاب جعفری

زمانہ

تم کو کچھ یاد ہے؟ — اس پیڑ کی چھاؤں کے تلے،
اب جہاں آتی اُداسی ہے کہ ہم تم چُپ ہیں،
سوچ میں گم ہیں کہ ہم کون ہیں، کیا ہیں، جو یہاں
دشت در دشت کڑی دھوپ میں چل کر اب بھی
بے تعلق سے چلے آتے ہیں ہر شام ڈھلے،
کبھی ہم نے ہی بِتائی ہیں مِلن کی صدیاں؟

شوقِ بیداری، ایثار کی، صدیاں، جن میں
کتنی ہی بار تو نکلی ہے خلا سے یہ زمیں
گردشِ رقص میں نغمات کا بدلا موسم
موسمِ نغمہ میں لمحات کی پھوٹی کونپل
نت نئے رنگ کی اِس پیڑ نے بدلی پوشاک،
چشمِ بے خواب کے آئینوں میں اک عکس لئے
ہم نہاں خانۂ دل چھوڑ کے باہر آئے۔
دشتِ احساس سے آگے تھا ابھی اپنا وجود
منزلِ شام پہ ٹھہرے یہ مسافر سلئے۔

اور اب! سوچ رہے ہیں، یہ مِلن کیسا تھا؟
دُکھ سے بھرپور تغیر پہ جمی ہیں نظریں
شاخ سے ٹوٹ کے بِدا غنچے یہ دیتے ہیں صدا
منزلِ قرب سے آگے بھی ہے دشتِ احساس!
ہائے پھر ہمسفری کا یہ چلن کیسا تھا؟

ہم کوئی درد ہیں اس دور کی تنہائی کا
کھو گئی ہے کششِ غم، تو ہیں سہمے سہمے
تنگ دل، بے حس و بدخواہ زمانے کی یہ چھاؤں
وہ سکوں بخش فسوں ہے کہ کسی کو بے دردا
حالِ بے مائگی دل نہیں کہنے دیتی!!

دیوندر ستیارتھی

راجکماری پارل

ریڈیو پر ایک تقریر نشر کی جا رہی تھی: ۔ ۔ ۔ لوک کتھا کوئی ایک رات کی بات نہیں وہ تو صدیوں سے امر ہے وہ تو پارل کی کہانی ہے۔ پارل جو کبھی کبھی شہزادے کی دلہن بن جانے پر بھی ٹھکرا دی جاتی ہے تو کبھی کسی پروانے سے بیاہ کرنے کی چاہ دل میں لئے ہوئے کسی جگنو کی بیاہتا بن جاتی ہے یا کبھی وہ کسی گاؤں کی گلیوں میں کھیلنے والی لڑکی ہے جو سوتیلی ماں کے کھیتوں مروا دی جاتی ہے۔ ۔ ۔

ادھر ننھی پارل ضد کرنے لگی: نانی ایک کہانی:

دن کا وقت ہوتا تو نانی اماں ٹال جاتیں کہ بیچ مسافر رستہ بھول جائیں گے:

ریڈیو چلتے چلتے بند ہو گیا۔ بجلی کی روشنی بھی چلی گئی۔ پارل کی ماں نے دیا جلا کر کھڑکی میں رکھ دیا۔

میں نے کہا: "اور اب مزا آئے گا۔ اب ہماری پارل نانی کی کہانی سنے گی:

نانی اماں نے ضد قائم رکھی کہ وہ تو بجلی کی روشنی ہونے پر ہی کہانی سنائیں گے۔

میں نے کہا: نانی اماں کی کہانی تو دیے کی لو میں ہی بھلی لگتی ہے۔ بجلی کی روشنی میں تو اس کی آنکھیں چندھیا جائیں گی:

ایک چوتھائی صدی سے ایک دو برس اوپر ہوئے جب میں نے اس عورت کو پہلے پہل دیکھا۔ تب وہ ادھیڑ عمر کی تھی۔ میری ساس۔ خیر میری ساس تو وہ اب بھی ہے لیکن تب اس کی پیشانی پر یہ جھریاں نہ تھیں۔ جیسے کھیت میں ہل چلنے سے لکیریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کی پیشانی پر سمے کا ہل جھریاں پیدا کر دیتا ہے۔ ان جھریوں کے پیچھے پارل کی نانی اماں کا تجربہ ہے۔ پارل اسے نہیں سمجھ پاتی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ یہ بڑھیا بھی سمے کے کلاکار کی تعمیر ہے۔ سچ پوچھو تو مجھے ماضی کے کسی شاعر کے اس خیال تک جانا ہو گا۔ خون رگِ معمار کی گردن سے ہے تعمیر ۔ مے خانہ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد" بظاہر میں نے اتنا ہی کہا۔ پل پل بیت رہا ہے سمے۔ وہ سب کی تعمیر کر رہا ہے۔ وہ ہمارے تجربے کو نت نت گہرا کر رہا ہے۔ وہ ہمارے سبھاؤ کو ڈھال رہا ہے وہ اس تعمیر میں گن اور رس کی تقاضی کر رہا ہے:

نانی گم سم بیٹھی تھیں شاید وہ یہی سوچ رہی تھیں کہ دیے کی روشنی بہت کم ہے انہیں بجلی کی روشنی کا انتظار تھا۔

بڑی مشکل سے نانی اماں کے لب کھلے اور انہوں نے کہا: "کونسی کہانی سنو گی پارل؟"

اب پارل کو تو کہانی چاہیے۔ راجہ رانی کی کہانی ہو یا کالے جنگل کی۔

میں نے کہا پارل آج وہی کہانی سنے گی ڈوڈھی جنہ رکھی راجکماری کی کہانی۔

"وہ تو بجلی آنے پر ہی سنا سکتی ہوں:" نانی اماں نے جواب دیا۔

شیامانے زور دے کر کہا: "دیے نے کیا بگاڑ لیا ہے — میرا بس چلے تو دیے کی روشنی میں ہی پارل کو نانی اماں کی کہانی سننے کے لئے تیار کروں:"

نانی اماں نے ہنس کر میری بات پہ پانی پھیر دیا: "میں تو بجلی کا بٹن دباتے سے بھی ڈرتی ہوں پرانا بول منہ سے نکالتی ہوں۔ دیا باتی جلے ۲۴ جا ملے:"

"نانی سناؤ نا کہانی:" پارل نے کہا۔

میں نے کہا: "چین دیش کا ایک سیانا آدمی کہہ گیا ہے کہ اس سنسار میں ندیاں بہت زیادہ ہیں اور پل کم:"

"تم الگ ٹوک رہے ہو" پارل کی نانی نے ڈانٹ پلائی: "تم بیچ میں بولتے رہے تو پارل کہانی سن چکی۔ ویسے کہانی تو ندی کی بھی ہو سکتی ہے اور پل کی بھی:"

میں نے کہا: "آج تو وہی کہانی سنے گی ہماری پارل — اس راجکماری کی کہانی جس کا بیاہ نہ ہو سکا:"

"اس کا تو ٹکٹ لگے گا:" نانی اماں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اب شروع بھی کرو نا وہ کہانی:" پارل کی ماں نے سوئٹر بنتے ہوئے کہا: "کہانی سنانا تو اتنا کٹھن نہیں جتنا سوئٹر بننا:"

"نانی اب سناؤ بھی" پارل نے نانی اماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

دیے کی لو میں نانی اماں کی ناک نہ جانے مجھے کیوں ، اتنی اوپر کو ابھری ہوئی دکھائی دی۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جیسے ان کی کلپنا کی سوئی بہت پہلے سے گھوم گئی ہو۔

پارل نانی اماں کے قریب ہو گئی جیسے وہ کھڑکی سے نظر آ رہے چاند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھنا چاہتی ہو کہ چاند کی ماں اب تک چرخہ کاتتے کاتتے تھک کیوں نہیں گئی۔

نانی اماں کہتی چلی گئیں: "بہت پہلے کی بات ہے۔ بہت دور دیش کی بات ہے۔ وہاں ایک راجہ راج کرتا تھا۔ جس نے راجکمار کا بیاہ ایک چندر مکھی سے کرنا طے کیا۔ روپ ایسا جیسے گلاب کی کلی۔ پتلی پتلی انگلیاں۔ نرم نرم ہاتھ — نین جیسے کنول کے مد بھرے کٹورے۔ من کے بھاؤ نینوں میں جھلکتے رہتے۔ اور راجکمار کو لگتا کہ کہیں دور سے کوئی راگنی سنائی دے رہی ہے۔ ایک دن کیا ہوا۔ جب راجکمار صبح سویرے نیند سے جاگ کر اٹھ بیٹھا تو اس نے دیکھا کہ چندر مکھی کے کمل نینوں میں وہ پہلی سی جوت اُجاگر نہیں ہے۔ وید بلائے گئے۔ سیانے آئے۔ علاج کیا لیکن راجکماری کے کمل نینوں میں جوت لوٹ کر نہ آئی:"

"جوت کہاں چلی گئی نانی:" پارل نے تھاپ لگائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں سے آج نیند غائب ہو چکی ہے۔

"پھر کیا ہوتا تھا" نانی اماں کی جھریوں میں جیسے کوئی جوت جگمگا اٹھی۔

"ہاں تو راجہ نے ڈگی بجانے والے کو بھیج کر گاؤں گاؤں منادی کرائی کہ اگر کسی کو آنکھوں کی جوت جگانے کا گر آتا ہو تو وہ آئے اور یہ کام کر دکھائے اور منہ مانگا انعام پائے:"

"اور یہ خبر سن کر کوئی قلندر راجہ کے دربار میں چلا آیا ہو گا:" میں بھی چپ نہ رہ سکا۔

"تم لوگ بیچ میں بولو گے تو میں کہانی بند کر دوں گی:" نانی اماں نے پھر سے کہانی کی باگ ڈور سنبھالتے ہوئے کہا: "ہاں، تو منادی سن کر کوئی بنسری والا آیا اور وہ راجکماری کے نین دیکھ کر بولا: "یہ تو کوئی روگ نہیں ہے مہاراج — پہلے جوت ہر دم آنکھوں میں آتی ہے اور پھر وہ چلی جاتی ہے جہاں سے وہ آتی ہے یہی سنگیت کا حال ہے۔ وہ بھی جہاں سے آتا ہے وہیں چلا جاتا ہے — خاموشی سے جنم لیتا ہے سنگیت اور خاموشی میں ہی غائب ہو جاتا ہے — سو مہاراج سب تو ایک ہی اپنے ہے — سپنے کا رنگ، پریم کی جوت اور آشا کا سنگیت، یہ سب ملا کر راجکماری ان کمل نینوں میں آ جائے اور پھر اس کا پربھاؤ دیکھے:"

"پھر جوت آ گئی نانی؟" پارل مسکرائی: "اور پھر راجکماری کا بیاہ ہو گیا:"

"واہ میری راجکماری:" نانی اماں نے پارل کا منہ چوم لیا: "آگے سنو۔ بنسری والے نے راجکماری کے قریب ہو کر دوبارہ اس کی آنکھوں میں جھانکنے کا

جتن کیا وہ جواب میں راجکماری کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھل اٹھے ـــ راجکمار نے بنسری والے کا بازو جھنجھوڑ کر کہا۔ تیرا مطلب ہے کہ میں اس سے پریم نہیں کرتا ـــ اور پھر بنسری والے کو باہر نکال دیا گیا۔ پھر منتری بولا ـــــ راجکمار میں تمہارے لئے کوئی اور راجکماری ڈھونڈھ کر لاؤں گا ـــ راجکمار کو یہ بات اچھی نہیں لگی اور منتری کو اپنے عہدے سے الگ ہو کر اگلے وقتوں کے کسی سیانے کی بات یاد آئی کہ سب سے بڑا دکھ ہے جو کسی پریمی کو اپدیش دیتا ہے۔"

"پھر نانی" ـ صوفے پر بیٹھے بیٹھے پارل نے نانی اماں کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

"پھر دربار میں ایک جوتشی آیا اور اس نے سمجھایا ـــ مہاراج راجدھانی کی تلیٹی میں بہنے والی ندی کے اس پار رہتا ہے ایک گیانی ـــ جا کر اس سے تھوڑا سا امرت مانگ لائیے۔ وہ امرت راجکماری کی آنکھوں میں ڈالنے سے پھر وہی جوت لوٹ آئے گی ـــ اور راجکمار نے منتری کو ساتھ لے کر اس گیانی کی تلاش میں نکل پڑا۔"

دیئے کی لو تھرا رہی تھی۔ نانی اماں طول میٹھی تھی جیسے انہیں زندگی کی بلندی کا پوری طرح احساس ہو۔ جیسے ان کا قد پہلے سے اونچا ہو گیا ہو پارل کی ماں کو سوئٹر بننے سے فرصت نہ تھی اور پارل تھی کہ نانی اماں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی تھی۔

نانی اماں کہتی چلی گئیں: "یہ گیانی اور کوئی نہیں تھا وہی پرانا بنسری والا ہی تھا جو اپنی بنسری کے جادو سے راجکماری کی سوئی ہوئی محبت کو جگا کر خود پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اور اب راجکمار کو تو اس بات کا علم نہ تھا۔ راجکمار نے پوچھا، آپ کے ہرنے میں کیا ہے۔ بھگون ـــ اور برہم گیانی نے جواب دیا ـــــ پریم اور آنند ـــ راجکمار بولا ـــ میں تو امرت کی چند بوندیں چاہتا ہوں اپنی ہونے والی رانی کی آنکھوں میں ٹپکانے کے لئے ـــ گیانی بولا ـــ اس امرت کا تو مول دینا ہوگا ـــ راجکمار نے پوچھا کیا مول لوگے؟ ـــ گیانی نے مسکرا کر کہا۔ ایک بوند پریم کے بدلے دینا ہوگا سنگھاسن۔ اور ایک بوند آنند کے بدلے اپنا سارا گھمنڈ۔ راجکمار آگ بگولا ہو گیا ـــ بولا ـــ ارے گیانی! تو اپنے راجکمار کے لئے ذرا سی تیاگ نہیں کر سکتا۔"

کہتے کہتے نانی اماں چپ ہو گئیں پارل نے جھٹ کہا: "آگے چلو نانی"

"راجکمار نے حکم دیا کہ اس سیک منگے گیانی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر جیل میں ڈال دو"

"ہوں" ـ میں نے ہنکارا بھرا۔

پارل میرے قریب آئی۔ جیسے اس نے آج مجھے بھی بچے کے روپ میں دیکھ لیا ہو۔

پارل کی ماں نے ہنس کر کہا: "نانی اماں کی کہانی تو سوا لاکھ کی ایک کہانی ہے۔ جیسے یہ ایک ناؤ ہو اور ان گنت صدیوں کے دھارے میں بہتی ہوئی ہم تک آ پہنچی ہو"

دیئے کی لو میں ماتھے کی جھریوں والی نانی اماں آج روایت اور اُپج کے سنگم پر ایک مورتی کی طرح بیٹھی تھیں۔ میری کلپنا ریڈیو پر سنی ہوئی اس تقریر کی طرف گھوم گئی کہ لوک کتھا کوئی ایک رات کی بات نہیں۔

نانی اماں کی شخصیت میرے تن من پر چھائی ہوئی تھی۔ انہیں بھانت بھانت کی کہانیاں یاد تھیں۔ وہ جب بھی کوئی کہانی سناتیں اس میں نئی تعمیر کا رچ جاتا تھا۔ کہانی کے آنچل کو وہ جتنا چاہتیں لمبا کرتی جاتیں جیسے وہ اپنے چرخے پر سوت کا لمبا تار نکال رہی ہوں۔ کہانی ان کی مٹھی میں دبی ہو، اس کی ہر اک تار ان کا پانی بھرتیں۔ ایک کہانی کی تو سے وہ جیسے تو تو دیئے جلاتی چلی جاتیں۔

مجھے یاد آیا کہ ریڈیو پر نشر کی ہوئی تقریر میں یہ بھی تو کہا گیا تھا کہ لوک کتھا تاریخی اوراق کا درجہ رکھتی ہے۔

پارل کی آنکھوں پر نیند کا بوجھ چھا چلا تھا وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ شاید اس نے سوچا کہ کہانی ختم ہو گئی۔ اس نے دوبارہ اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اب جاگتے رہنا اس کے بس کا روگ نہیں۔

بہت جلد پارل سو گئی۔ اور اس کی ماں ہنس کر بولی: "چلو پارل تو سمندر کی آگ بجھانے چلی گئی۔"

پارل کی نانی اماں نے پوپلے منہ سے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "میں تو آج پوری کہانی سنوں گا۔"

"ارے بیٹا مجھے اب ہلکان نہ کرو۔" پارل کی نانی اماں نے ٹالنا چاہا۔

"چلو سناؤ ماں۔" پارل کی ماں نے مونڈھے پہ بیٹھتے میری سفارش کی۔

"اچھا تو آج تو بھی پارل بن گئی۔" نانی اماں ہنس پڑی۔

میں نے کہا: "تمہاری کہانی کا مول میں ایک کہانی سنا کر چکا دوں گا۔"

"تو پہلے تم سناؤ وہ کہانی۔ پیچھے مکر گئے تو میں کس سے شکایت کروں گی۔"

"تو لو ایک کہانی۔" میں مسکرایا۔

"ہاں۔" نانی نے ہنکارا بھرا۔

میں نے بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ صوفے سے ٹیک لگائی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہنا شروع کیا: "یہ کہانی بہت پرانی ہے۔ کوہ قاف کی کہانی ہے۔ ایک پری کی کہانی۔ بس یہ سمجھ لو کہ سامنے کوہ قاف کی ایک جھیل ہے۔ جھیل کے کنارے چاروں طرف اونچے اونچے پیڑ کھڑے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ گھنے گھنے پیڑ ہیں جن کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں۔ ٹہنیوں نے ایسا جال پھیلایا ہوا ہے کہ ان میں سے سورج کی کرنیں نہیں گزر سکتیں۔ اس جھیل میں ہر سمے تیرتی رہتی ہے ایک ناؤ اور اس ناؤ میں ہر سمے لیٹی رہتی ہے ایک راجکماری۔ اب یہ سمجھ لو کہ اس اندھیارے میں رہتے رہتے راجکماری اوبھ گئی۔"

"پھر کیا ہوا۔" نانی اماں نے ہنکارا بھرا۔

"ہاں اب تو پارل بن گئی۔" پارل کی ماں نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا: "کیا برا ہے اگر نانی اماں پارل بن جائیں۔ نانی اماں کبھی تو کوئی نانی اماں رہی ہونگی۔ اور پھر لوک کتھا کوئی ایک ساعت کی بات نہیں۔ نتھری ستھری لوک کتھا ہے۔ سہل، رواں اور راگنی سی پیاری پیاری۔ شاید پارل کی نانی اماں کوہ قاف کی اس لوک کتھا میں سات پاتال میں اتر کر کوئی نیا مطلب ڈھونڈ لائیں۔"

"ارے بیٹا۔ میں تو ان پڑھ ہوں۔ اب اس بڑھاپے میں کیسے اتروں گی اتنا نیچے سات پاتال میں۔"

"یہ تمہیں کہانی نہیں سنائیں گے۔" پارل کی ماں ہنس پڑی۔ "نانی اماں کو کہانی تو کوئی نانی اماں ہی سنا سکتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے مجھے کوہ قاف کی وہ کہانی نہیں آتی۔" میں تاؤ میں آگیا اور میں نے پارل کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا: "تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں نے تو پارل کا نام ہی ایک لوک کتھا سے لیا ہے۔"

"مجھے پارل نام بالکل ناپسند ہے۔" پارل کی ماں جھنجھلا کر بولیں۔ "تم نے شروع میں بتا دیا ہوتا کہ پارل کے ساتھ وہ منحوس لوک کتھا جڑی ہوئی ہے تو میں ہرگز یہ نام نہ رکھنے دیتی۔ بھلا کوئی بات ہوئی کہ بنگال کی لوک کتھا کی اس لڑکی کا نام پنجاب میں لا کر اتنی پیاری پیاری باتیں کرنے والی لڑکی کے ماتھے باندھ دیا جائے۔"

"وہ کونسی کہانی ہے۔" پارل کی نانی اماں نے پوچھا۔

"اب تم فیصلہ کر لو کہ پہلے کوہ قاف کی کہانی سناؤں یا بنگال کی وہ کہانی جس سے پارل کا نام لیا گیا۔"

"پہلے بنگال کی کہانی سناؤ۔" نانی اماں مسکرائیں۔

"وہ کہانی تو بس اتنی ہی ہے کہ ایک سوتیلی ماں نے اپنی سوت کی اکلوتی بیٹی اور بیٹوں کو مار کر کہیں دور گڑھے میں پھینک دیا تھا۔ وہ لڑکی ایک پھلدار پودا بن گئی جس پر پارل کے سفید پھول کھلتے تھے۔ اور سات بھائی چمپا کے سات پودے بن گئے۔ بنگال میں نانی اماں کے منہ سے اکثر یہ بول نکل جاتا ہے سات بھائی چمپا جاگو رے! — کینو بون پارل ڈاکو رے؟ — مطلب یہ کہ بہن پارل آواز دیتی ہے جاگو سات بھائی چمپا! — اور اس کے جواب میں سات بھائی چمپا پوچھتے ہیں، کیوں بہن پارل تم ہمیں کاہے کو بلا رہی ہو؟ اب پارل نام مجھے اس لئے اچھا لگا کہ لوک کتھا کی وہ لڑکی مر کر بھی امر ہو گئی۔"

"میرا بس چلے تو پارل نام بدل ڈالوں" پارل کی ماں نے سوتی ہوئی پارل کا منہ چوم لیا: "اتنی پیاری بیٹی اور یہ منحوس سا نام" اور اس نے دوبارہ پارل کا منہ چوم لیا۔

نانی اماں ہنس کر بولیں: "سوتے ہوئے کا بھی منہ چوما کیا! نہ چومنے والے کو مزا آئے نہ اس کو لطف حاصل ہو جس کا منہ چوما جائے۔ پارل جاگ رہی ہوتی تو میں اس کا منہ چوم لیتی اور اسے پارل پھول والی کہانی سناتی۔"

پارل کی ماں نے منہ بنا کر کہا: "میں تو کبھی کا یہ نام بدل ڈالتی، مشکل تو یہ ہے کہ وہ کہانی سنا کر انہوں نے پارل کو بھی راضی کر لیا ہے۔ اب اسے کوئی دوسرا نام پسند نہیں۔"

"کہانی کی ایسی ہی بات ہے بیٹی" نانی اماں نے دیئے کی ٹمٹماتی لو کے قریب آنکھیں لے جا کر کہا: "پارل چمپا کا روپ ہے وہ سچائی کتنی بڑی ہے کہانی کی راجکماری مر کر بھی پھلدار پودا بن جاتی ہے۔ اصل بات تو یہی ہے کہ ناک آدمی اپنا روپ پہچان لے۔ ایک کہانی اور دوسری کہانی۔ بیچ میں بہتی ہے جیون گنگا۔ کیوں میں کچھ جھوٹ کہتی ہوں! یہ بیٹا میں تو ان پڑھ ہوں —"

"کبھی ہو میں تو یہ نام بدل کر چھوڑوں گی" پارل کی ماں نے پارل کی آنکھوں پر جھک کر کہا: "کیسے سو رہی ہے جیسے سچ مچ سپنے میں سمندر کی آگ بجھا رہی ہو۔"

"اب وہ کوہ قاف کی کہانی سناؤ۔ بیٹیا" پارل کی نانی اماں مسکرا کر بولیں۔

"ہاں تو گھور اندھیارے میں رہتے تھے کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل اور سچ گئی —"

"راجکماری پارل؟" پارل کی ماں نے چونک کر کہا: "اسے بھی تم نے بنگال کی لوک کتھا والا نام دے ڈالا —"

"اب سنو تو" میں نے زور دے کر کہا: "نام میں کیا رکھا ہے! ہاں تو کوہ قاف کی اس جھیل کی راجکماری نے ٹھنگنے گھنے پیڑوں کی ٹہنیوں پر چہکنے والے پنچھیوں سے کہا — میرے لئے روشنی کی ایک کرن تو لیتے آؤ۔ پنچھیوں نے یہ بات ان سنی کر دی۔ راجکماری پارل دوبارہ اپنی بات سمجھاتے ہوئے بولی روشنی کے بہانے میرے لئے روشنی کی ننھی منی کوئی پیاری سی کرن لیتے آؤ۔ اب کے پھر پارل راجکماری کی التجا گویا پتھر کے ٹکڑے کی طرح جھیل میں ڈوب گئی۔ ایک دن شام ہوتے ہی راجکماری کے پاس پروانوں کی ایک ٹولی آئی۔ راجکماری پارل بولی — تم میں سے جو کوئی بھی میرے لئے روشنی کی کرن لیتا آئے گا میں اسی کے ساتھ بیاہ کروں گی —"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں چپ نہ رہ سکیں۔

"پھر کیا ہونا تھا۔ پروانے چوکھونٹ پھیل گئے اور ہر دیئے پر جل جل کر راکھ ہونے لگے۔"

"ہوں!" پارل کی ماں بھی ہنکارا بھرے بنا نہ رہ سکی۔

"اچھا تو تم بھی اداس ہو رہی ہو؟ — دن مہینے برس بیتتے چلے گئے۔ برس اور صدیاں — نہ جانے کتنے جگ بیت گئے۔ ایک بھی پروانہ راجکماری پارل کی تاریکی کے کسی کونے پر روشنی کی کوئی کرن نہ لا سکا —"

"پھر کیا ہوا؟" نانی اماں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

ایک دن ایک جگنو نہ جانے کہاں سے اس جھیل کے کنارے آپہونچا۔ راجکماری پارل کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے پریم سے بانہیں پھیلاتے ہوئے کہا جگ جگ جیو۔ جم جم آؤ۔ واہ میرے پروانے، آخر تم میرے لئے روشنی کی کرن لیتے آئے۔ لیکن جگنو بیچارہ راجکماری پارل کی بات کیا کچھ سمجھ سکا۔ اب وہ راجکماری پارل کی بانہوں میں تھا۔ راجکماری نے اس کے ساتھ بیاہ کر لیا۔ اور زندگی آرام سے گذرنے لگی۔ ادھر بیچارے پروانوں تک راجکماری اور جگنو کے بیاہ کی خبر کون پہونچاتا۔ پروانہ تو آج بھی دئیے کی لو پر جل کر راکھ ہونے کو تیار رہتا ہے۔ اس کے من میں ایک ہی امنگ ہے کہ وہ کسی طرح دئیے کی لو لے اڑے اور راجکماری کی شرط پوری کر کے اس سے بیاہ کر لے۔"

پارل کی ماں نے سوتی ہوئی پارل کا پھر منہ چوم لیا۔ دئیے کی لو پر پروانے بھسم ہو رہے تھے۔

"یہ کہانی میں نے پہلی بار سنی ہے بیٹیا۔" پارل کی نانی اماں کہتی چلی گئیں۔ "کل میں یہ کہانی پارل کو سناؤں گی۔ اچھا تو اب میری کہانی کی طرف آؤ ۔۔۔ اس گیانی کو بیڑیوں اور ہتھکڑیوں سے جکڑ کر اسی دن جیل میں ڈال دیا گیا۔ اگلے روز جب راجکمار جیل دیکھنے گیا تو دیکھا کہ گیانی کے جسم کے چیتھڑے پڑے ہیں یا پھر ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ اور دیوار پر یہ سندیسہ لکھا تھا ۔۔۔ تیرے ظلم کا میرے پاس یہی جواب ہو سکتا تھا۔ تیرے قانون کے بندھن میں جو چیز آئی تھی اسے چھوڑے جا رہا ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" پارل کی ماں جیسے سچ مچ دوسری پارل بن گئی۔

"پھر کیا ہونا تھا۔" نانی اماں نے کہانی کو آگے بڑھایا۔ "راجکمار کے غصے کا ٹھکانا نہ تھا۔ محل میں لوٹ کر اس نے کہا۔ پتھر پڑیں ان کمل نینوں پر اور پھر راجکمار ایک دوسری چندر مکھی کی تلاش میں کامیاب ہو گیا۔ اب راجکمار کے بیاہ میں دیر نہ تھی اور وہ کمل نینوں والی چندر مکھی راجکماری ۔۔۔" کہتے کہتے پارل کی نانی اماں چپ ہو گئیں۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بڑی بے تابی سے پوچھا۔

پارل کی نانی اماں نے بات کا رخ بدل کر کہا۔ "کوہ قاف کی اس جھیل کی وہ راجکماری پارل تو کبھی نہ روئی ہوگی۔"

"وہ کیوں روتی۔" پارل کی ماں بول پڑی۔ "ارے اس کا تو بیاہ ہو گیا۔ اور پھر سچا سچا بیاہ تو ایک ہی بار ہوتا ہے۔"

"پھر پروانوں کو اس کے بیاہ کی خبر کیوں نہ ملی؟" پارل کی نانی اماں نے جیسے درد کی ٹیس سہتے ہوئے کہا۔ "پروانے بیچارے تو راجکماری پارل کے لئے روشنی کی کرن لے جانے کے جتن میں آج تک جل رہے ہیں۔ جگنو نے پروانوں کو دھوکا دیا۔ اس دھوکے کا راجکماری پارل کو پتہ چل گیا ہوتا تو وہ ضرور پروانوں کے لئے روتے روتے اندھی ہو جاتی۔"

"اسے چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "دونوں کہانیاں الگ الگ ہیں۔"

"میں تو الگ الگ نہیں مانتی۔" پارل کی نانی اماں نے گمبھیر ہو کر کہا۔ "میں تو سوتیلی ماں کے ہاتھوں مر کر پھولدار پودا بن جانے والی لڑکی کی کہانی کو بھی اس کہانی کی ایک کڑی سمجھتی ہوں۔ میری اس کہانی کی کمل نینوں والی چندر مکھی راجکماری اتنا روئی، اتنا روئی کہ راجکمار کے بیاہ سے پہلے ہی اندھی ہو گئی۔"

"ہائے راجکماری اندھی ہو گئی۔" پارل کی ماں سوئی ہوئی پارل پر جھک گئی اور پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "ان کی عقل نہ جانے کہاں چرنے چلی گئی تھی۔ جب انہوں نے اتنی پیاری لڑکی کا نام پارل رکھ دیا۔"

میں نے کہا۔ "جب یہ دیا بجھ جائے گا اور یہ مٹی مٹی میں مل جائے گی اس وقت میں کھل رہا ہوں گا۔ جیسے بنگال کی لوک کتھا میں پارل راجکماری بار بار کھل اٹھتی ہے۔ پارل راجکماری کی انگلی پکڑ کر میں بہت دور تک چلوں گا ۔۔۔ اور میرا تو خیال ہے کہ میں چلتا ہی رہوں گا۔ اور میں تو پارل کی طرح مر مر کر جیوں ۔۔۔"

"اے بیٹیا۔ ایسا بول منہ سے نہیں نکالتے۔" نانی اماں نے دعا کے انداز میں ہاتھ اٹھائے۔ "تم جگ جگ جیو اور میری بیٹی کا سہاگ بنا رہے۔"

اتنے میں بجلی آگئی اور پھر تھوڑی دیر بعد ریڈیو بجنے لگا۔ پارل راجکماری سوتے سوتے بڑبڑا رہی تھی جیسے سندر کی آگ بجھانے کے بعد اب جھیلوں کی راجکماری سے اپنا تعارف کرا رہی ہو۔

ضیاء المحسن موسوی

ایک حمام میں

"تو آپ خانم جیٹ کے شہزادے ہیں!" ہی ہی ہی ۔۔۔۔ مس بیناولالان کے شہابی سینے کے سنہرے اور گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔
"خانم جیٹ ۔۔۔۔۔ ہی ہی ہی ۔۔ ۔ خانم کا جیٹ ۔۔۔۔ ہی ہی ہی ۔"

یہ شوخ و شنگ اور آتشیں لڑکی نواب خاقان الملک کے بیٹے سر اعتبار الامرار کے پوتے اور دار الحضرت کے چچا زاد بھائی نواب جمال الدولہ رونق یار جنگ کے خاندانی خطاب اور موروثی قصر کا مذاق اڑا رہی تھی ۔۔ اگر وہ اس کے رقص اور اس کی اداؤں پر جی جان سے فدا نہ ہو چکے ہوتے اور اس کے وصل کے لئے اپنی دادی لیڈی اعتبار الامرار کی دی ہوئی الماس کی انگوٹھی نک نذر نہ کر چکے ہوتے تو وہ کبھی یہ گستاخی برداشت نہ کرتے۔ پھر اول نشے میں ابھی ان کو یہ احساس تھا کہ یہ "چھوکری" جو لاکھ پری جمال سہی مگر جس کے جسم سے اس کے ہم قوموں کی طرح گندے تیل کی سی بساندآتی ہے، ایک رقاصہ ناچنے والی جسے اپنے پاس "مرلی" کہتے تھے، مرلی وہ ان کے یعنی نواب ابن نواب رونق یار جنگ بہادر کے خاندانی وقار اور شہرۂ آفاق قصر خانم جیٹھ یعنی ایک شاہی خاندان اور شاہی محل اور اس کی عظمت کی ہنسی اڑا رہی ہے ۔۔ مگر پھر انہوں نے سوچا کہ اس نادان غیر ملکی "چھوکری" کو کیا معلوم کہ ہمارا خاندان ہماری وجاہت ہماری روایات اور ہمارا ماضی کیا ہے؟ اسی کے بہت سارے ہم قوم جو ہماری رعایا تھے اور آبکاری کی تجارت سے کروڑوں روپے کمانے کے باوجود زمیں بوس ہو کے ہمارے سامنے قدم بوسی عرض کرتے تھے۔ ہائے مرحوم سلطنت سلیمانیہ۔ اگر آج بھی ممکن ہوتا تو وہ اس چھوکری کو لے جا کے وہ سب کچھ دکھلاتے جو اگرچہ "صنا دید عجم" کا قصہ ہو گیا ہے۔ مگر اس کے آثار تو باقی ہیں۔ نہ معلوم کیا سوچ کے وہ مسکرا دیئے اور انہوں نے اس کے گلابی ہونٹوں پر خاموشی کی مہر لگا دی۔

لڑکی نے ایک ٹھنڈی سانس لی وہ سوچ رہی تھی کہ نواب غالباً اس کے "جوک" کا برا مان گئے ہیں ۔۔ صورت شکل ناک نقشے، ڈیل ڈول رنگ روپ ہر بات سے یہ نواب تو ضرور معلوم ہوتے ہیں ممکن ہے شہزادے بھی ہوں؛ اس نے لے دے کے بس دو ہی شہزادے دیکھے تھے۔ ایک "شاہ توران" اور دوسرے "ہز ہائنس مولا خاں"۔ اگر شہزادے ایسے ہی ہوتے ہیں تو پھر نواب رونق یار جنگ ضرور شہزادے ہوں گے ۔۔۔ باپ رے باپ پھر تو کباڑا ہو گیا۔ اگر شہزادہ خفا ہو گیا تو ؟!

اسے قصوں اور کہانیوں کے وہ شہزادے یاد آگئے جو بات بات پر اپنی تلوار نکال لیا کرتے تھے ۔۔ مگر نواب نے جب پھر اس سے اختلاط شروع کر دیا تو اس کی جان میں جان آئی جیسے کوئی شہزادہ اس کو کالے دیو کے طلسم سے نکال کر اپنے محل لئے جا رہا ہو۔

"جی نہیں اب میں۔" اس نے تھوڑی سی اور پیو کا جواب دیا۔ اب اس میں سوئی ہوئی وہ عورت جاگ اٹھی تھی جو محلوں اور ایوانوں میں اس لئے پہنچائی جاتی ہے کہ وہ ان لبوں پر مسکراہٹ پیدا کر سکے جن کی لرزش سے سر د گردن کے رشتے ٹوٹ جاتے تھے ان آنکھوں میں کیف لائے جن کی سرخی سہاگنوں کے دوش سے

بال اودھنیاں چھین لیتی تھی ان ہاتھوں کو اپنی گردن کا طوق نبانے جن کی آزادی سے "ندوم" جل جاتے تھے اور اس جسم کا بوجھ اٹھانے جس سے دھرتی کانپتی تھی — اورس بینا والا نے سسکتے ہوئے کہا۔

"میری طرح کوئی اور لڑکی بھی آپ پر عاشق ہوئی ہے؟"

"ہی ہے — اب جانے بھی دو اس بات کو۔ اگر میں بتانا شروع کروں گا تو صبح ہو جائے گی — اور پھر کون یقین کرے گا؟"

یہ کہہ کر نواب یوں تن گئے جیسے وہ کئی مرے ہوئے شیروں کی لاش پر بندوق رکھے تصویر کھچوا رہے ہوں اور انگا ہوں میں "آن لُکر" کا وہ صفحہ گھوم رہا ہو جس پر یہ تصویر چھپے گی۔ اورس بینا والا اس فوٹوگرافر کی طرح اپنے مطلب کی بات سوچ رہی تھی جو یہ جانتا ہو کہ یہ شیر تو ملازم شکاریوں کے مارے ہوئے ہیں مگر وہ تصویر لیتے ہوئے ایسی حیرت کا اظہار کرے گویا زندگی میں ایسا پر رعب موقع پھر کبھی نہ آئے گا — اس نے سوچا تو پھر آج کی رات نواب پر مرنے والیوں ہی کی داستان سنی جائے اس طرح وہ ہمدم دواخانے کی عطا کردہ خرمستی برداشت کرنے سے بھی محفوظ رہے گی اور نواب کی انانیت کے لئے اکسیر اعظم بھی فراہم ہو جائے گی۔ الف لیلہ کی شہرزاد "ہزار راتوں کو ایک رات میں سمیٹنے کی کوشش کرتے لگی۔ اورس بینا والا نے اپنا غیر مرئی کیمرا سنبھالا۔

"آپ کو میری قسم سنائیے"

"تم پھر جلو گی تو نہیں؟ ہم سے خفا تو نہیں ہو گی؟"

"جلنے کی کیا بات ہے۔ شہزادے نواب لوگ تو ہوتے ہی ایسے ہیں؟"

"واللہ قسم ہے غوث پاک کی میں بچپن سے شہوت سید ھا سا تھا مگر خدا لعنت کرے میرے کو تمہاری قوم کی چھوکریاں خراب کر ڈالیں۔"

انتہائی جوش اور سرخوشی میں نواب صاحب اپنے خاص عوامی لہجے میں خ کو ق اور ق کو خ بولنے لگے حالانکہ جب سے وہ اس نئی مملکت میں آئے تھے حتی الامکان صاف اردو بولنے کی کوشش کرتے تھے مگر جب انہیں کسی نوکر پر غصہ آتا یا کچھ بیان کرتے کرتے جوش آ جاتا تو پھر وہ خاف اور قے بولنے لگتے۔

نواب صاحب نے متعدد مہ جبینان مملکت سلیمانیہ حسینان بمبئی و کلکتہ دختران کشمیر و پنجاب نازک اندامان اودھ و راجپوتانہ اور عشوہ طرازان لندن و پیرس کا عاشق ہونا خطوط لکھنا اور آخر میں شربت وصال یا زہر پینا ایسی ایسی تفصیل سے بیان کیا کہ اگر کوئی ہوس کی بلندی و پستی ناپنے والا داستان طراز ہوتا تو کئی ناولوں کا مواد جمع کر لیتا۔ رات ڈھلتی رہی اور داستان جوان ہوتی رہی — اور سویرے جب اپنے ڈرائیور اور نواب صاحب کے ملازم خاص کی دستک سے مس بینا والا کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنا سینہ بند باندھتے ہوئے نواب رونق یار جنگ کو دیکھا جو ان پر مرنے والی لڑکیوں کی اصلی اور بازار میں فروخت ہونے والی تصویروں کے البم اور قالین پر بکھرے ہوئے خطوط اور لفافوں پر چت پڑے خراٹے لے رہے تھے اور ان کی ٹانگیں مسہری پر تھیں۔ قابل دید اور بھی بہت کچھ تھا جو "صحبت شب" کے داغ فراق کی غمازی کر رہا تھا۔ مگر وہ اٹھ کے دروازے کے قریب آئی اور تھوڑا سا پٹ کھول کے آہستہ سے بولی۔

"گل زریں! تم ابھی موٹر گھر لے جاؤ، ممی سے کہنا میں نواب صاحب کے جاگنے کے بعد پیسے لے کر گھر آؤں گی۔ اتنے تم فرخ کو کالج چھوڑ کر پھر جلدی ادھر لے آنا۔"

یہ کہہ کے چابیاں لیتی وہ غسل خانے کی طرف بڑھی۔ پہلے اس نے چاہا کہ نواب جو اس بری طرح سو تا پڑا ہے اسے جگا کے پلنگ پر لٹا دے اور اس کے بعد نہانے جائے، مگر پھر ٹھٹک کے وہ حمام کی طرف مڑ گئی . . . کہیں جاگنے کے بعد اس دن کی طرح آج بھی نواب اس کے ساتھ ہی نہانے پر اصرار نہ کرے . . . . . کیسے بے شرم ہوتے ہیں یہ لوگ۔ توبہ ہے — اس دن تو دم ٹوٹ گئی تھی میں . . . !

پانی کی خوشگوار خنکی اور باتھ کرسٹلز کی بھینی بھینی خوشبو سے شب بیداری کی تلخی اور منہ کا کسیلا پن کافور ہو گیا۔ آنکھیں کھل گئیں اور وہ ٹب میں لیٹے لیٹے کھلکھلا کر ہنس دی — شہزادی سکندر بخت کو جو خوشی اس وقت محسوس ہوئی تھی جب وہ اپنے سرتاج کو جھیلی سبتیاری کے چبوترے سے نکال لائی تھی ویسی ہی خوشی مس بینا والا کو اس وقت ہو رہی تھی۔ اس نے کس چال سے رات نواب کو خودستائی اور خودنمائی میں الجھا کے اپنا آنگ بچایا اور پھر پانچ سو روپے تو کھرے کے

رہی ہے۔ استاد شفیق نے جب سے دروے کے نصیحت کی تھی کہ بلو تا چنے گانے کے یہی دن سن ہیں، اسی سے تیری قدر و منزلت ہے گر بیٹر گانے کا شوق ہے تو سیدھے سیدھے سسرال میں جا کے کسی کے بھی پر جا بیٹھ۔ کیسی کیسی کی بات دوسری ہے لیکن روز روز گھر گھر چکی چلے گی تو آواز سپاٹ بانس اور گمن چکر ہو جائے گا" اسی دن سے اس نے کافی پہیز شروع کر دیا تھا۔ ایک وزیر نے تو مشاہرہ لینے کی بھی دھمکی دی تھی مگر وہ نہ مانتا تھی نہ مانی۔ مگر نواب کی دوسری بات تھی۔ دو ہزار تو وہ پروگرام کے تمام سے ہی کو دیتے تھے اور پھر دعوت میں ہمیشہ شہر کے اونچے اونچے لوگوں ملکہ ایک آدھ وزیر کو بھی بلاتے تھے۔ اب کل رات ہی یورپ کے ایک اخبار والے کے ساتھ کئی بڑے افسر اور سیٹھ بھی تھے۔ اور نواب آئے دن تحفے تحائف بھی دیتے ہیں۔ اس نے یہ بھی تو وعدہ کیا ہے کہ جب مملکت خداداد اور کفرستان میں مملکت سلیمانیہ کے بارے میں سمجھوتہ ہو جائے گا اور ان کی شاہی پنشن جو کم از کم پندرہ ہزار ماہوار ہو گی جاری ہو جائے گی تو وہ مجھ سے شادی کر لیں گے۔ فرخ کہتا تھا کہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔ مگر جب ایک دعوت میں نواب کو ایک وزیر سے یہ بات کرتے سنا تو ممی کو یقین آ گیا۔ بولیں بڑا آدمی ہے۔ آج خراب وقت ہے نجوم کب ستاروں کی نحوست دور ہو جائے۔ آنا جانا رہے تو اچھا ہی ہے۔

شمو کی شبنمی اشنان کرنے کے لئے وہ ٹب سے باہر نکلی تو اس کی نظر قد آدم آئینے پر پڑی اور لجاتے ہوئے وہ کھلکھلا کے ہنس دی ——— رات نواب نے جو سب عجیب قصہ سنایا تھا وہ اس کو یاد آ گیا۔ وہ شہزادی صنوبر جوان ہو سانس ہو گئی تھیں کوہ قاف کی رہنے والی پری جمال شہزادی جن کی آنکھوں میں سمندر کی گہرائی تھی ہو سے کہتے ہیں بات کرنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔ جن کی ایک مسکراہٹ پر بڑے بڑے راجے مہاراجے بچھ جاتے تھے، مگر وہ نواب کی نشیلی آنکھوں شہابی رنگ اور ذہین ذوق پر مرتی تھیں۔ ایک دن فون پر کہنے لگیں۔

"نواب آج رات جب ڈنر کے بعد شہزادہ محترم قدر لغیان کے سو بسر لشکے شاعروں کو یاد فرمائیں تو تم رخصت ہو کے پور ٹیکو سے داہنی طرف مڑ کے قصر کے اس حصے کی طرف آ جانا جہاں رنگین فوارہ ہے۔ گیلری میں دائیں کے اسٹیچو کے سامنے جو دروازہ ہے اس پر "ناک کرنا" مجھے تم سے ضروری کام ہے۔

جب وہ وہاں پہنچے تو شہزادی صنوبر کی فرانسیسی خادمہ ان کے انتظار میں ٹہل رہی تھی" بانے ہے۔ اس فرانسیسی قادمہ کا بھی ایک قصہ ہے وہ پھر کبھی سناؤں گا ——

پھر وہ خادمہ ان کو شہزادی کی اس پر اسرار خواب گاہ میں لے گئی جس کی باتیں تمام جاگیرداروں اور نوابوں کی خاص محفلوں میں بڑے ذوق و شوق سے ہوا کرتی تھیں۔ وہ خواب گاہ جس پر پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے تھے۔ جہاں دنیا کے بہترین مصوروں کی بنائی ہوئی قد آدم عریاں تصویریں لگی تھیں جو مملکت خداداد کے بادشاہوں نے خاص ایلچی بھیج کے منگوائی تھیں۔ اور شہزادی نے پرانے محل سے ڈھونڈ ڈھونڈ کے ان کو دوبارہ فریم کرا کے اپنی خواب گاہ کے لئے خریدا تھا جہاں نرم و نازک گدیلے پر لیٹے لیٹے بٹن دباؤ تو گول کمرے کا وہ بالائی حصہ جس پر یہ تصویریں آویزاں تھیں گھومنے لگتا۔ جو تصویر آپ چاہیں نظروں کے سامنے رہے اور اگر آپ چاہیں تو بارہ کی بارہ تصاویر یکے بعد دیگرے نظروں کے سامنے آتی رہیں۔ جہاں ایک گھنٹی کا بٹن دبانے ہی پیچھے کے ایک کمرے سے فلم دکھانے کی ایک مشین چلائی جاتی اور مسہری کے مقابل لٹکتے ہوئے ایک سفید پھرے ہوئے شیشے پر وہ فلمیں نظر آتی تھیں جن کو دیکھنے کے لئے لوگ ترس جاتے ہیں اور مسہری پر لیٹے لیٹے یہ فلمیں اتنی اچھی طرح نظر آتیں کہ بس مزا ہی آ جاتا۔ جہاں خود بخود حرکت کرنے والی بجلی کی ایک میز باہر چلی جاتی اور ٹیلی فون سے جن چیزوں کی فرمائش کی جاتی وہ باورچی خانے میں اس پر چن دی جاتیں اور میز خود بخود واپس آ جاتی نہ کسی نوکر کو اندر آنے کی ضرورت نہ کچھ۔ اور معلوم اس خواب گاہ میں کیا کیا تھا۔ پھر خواب گاہ سے متصل وسیع حمام جس کی چھت فرش دیواریں سب آئینے کی تھیں۔ نہ ٹوٹنے والے اتنے بڑے آئینے بڑے اہتمام سے بلجیم سے منگوائے گئے تھے۔

اور جب شہزادی صنوبر نواب کے ساتھ اس میں نہائی ہیں تو نواب کو پہلے تو بہت شرم آئی ——— جیسے اس دن تم شرما رہی تھیں اور بولیں تھیں کہ لائٹ بجھا دیجئے" پھر چاروں طرف اپنا عکس دیکھ کر ان کو بڑا مزا آیا اور اپنے ساتھ کوہ قاف کی پری کو دیکھ کر تو فٹ سا ہونے لگا۔ شہزادی نے [illegible] کر کے اپنی اور اس فرانسیسی خادمہ کو بھی بلا لیا اور وہ بھی ساتھ نہانے لگیں۔

بیسویں صدی کی الف لیلہ پر مس عینو لانے سوچا یہ نواب یہ شہزادے کتنے بے شرم ہوتے ہیں؛ اول تو یہ سب گپ ہو گی اور اگر سچ ہے تو زریں گل

نصیب ہی کہتے ہیں کہ بے محنت کی دولت اللہ کی لعنت ہے ۔ جب جنرو نہیں گل کی تاسیر [illegible] کیسا
ہو گیا ہے کالج میں اس کے خیالات خراب ہو گئے ہیں ۔ اس دولت نردالی کی نعمت ہے [illegible]
کتنا بھی یہ بے حیائی نہیں کر سکتی [illegible] کہ حاضر کرو [illegible]
[illegible] ہم کبھی [illegible]

[illegible] شکل کے [illegible] حاضر [illegible] حلہ [illegible]
[illegible] سماعت رہے تھے [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible] پھر نہ لگانا [illegible]
[illegible] اپنی گاڑی واپس کر دی ہے آپ گاڑی [illegible]
[illegible]
[illegible] نوکری کی [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] جیسے [illegible]
[illegible] جیسے [illegible] گھر سے [illegible] نکلی تھی [illegible] کہ وہ [illegible] حاضر [illegible]
[illegible]

گیارہ بجے [illegible] نواب [illegible] کی میز [illegible] کچہری کے [illegible] رکھا ہے [illegible] خادم نے [illegible]
[illegible]

[illegible] نواب صاحب [illegible]
[illegible] دستخط [illegible]
[illegible] جلدی میں غلطی ہو گئی ہو مگر اس غلطی [illegible]
[illegible]

بہت اچھا نواب صاحب [illegible] بھی [illegible] نواب [illegible] کان میں [illegible]
[illegible] جیسے کوئی پاؤں پنج [illegible] دل [illegible] کچہری کا [illegible] ہاتھ [illegible]
[illegible]
[illegible] شہر [illegible]

مسعود مفتی

اصحابِ کہف

[illegible]

[illegible] صاحب [illegible]

[illegible] کھیل رہے ہیں۔"

[illegible] دور [illegible] سوتی ہیں۔"

بہت سے کھمبیں ہے۔

[illegible] صرف مرلیتی صاحب کا دفتر کھلا [illegible]

بیرا بیٹھا ہے۔ کہ صاحب [illegible] ابھی آتا ہی ہو گا۔ بیرے نے جماہی لے کر پورا منہ کھول دیا۔

ہم میز کے قریب پہنچے۔

"السلام علیکم" [illegible] سمجھ [illegible]

"ڈیٹا؟" حصار میں سے کوئی بولا۔

"فور کلب!" کوئی تلملایا
"فور سپیڈ!"
"نائینو نو ٹرمپ"
"ڈبل"
"رے دوبی، قریشی صاحب نے پتہ پھینکا۔ اسلم صاحب اپنے پتے میز پر بکھیرنے لگے۔
"ارے! ہار گئے"
"ول ڈن پارٹنر"
"ٹیرفیک ہینڈ"
"میری چال ہے؟ تو یہ لیجئے"
سب نے پتے پھینکے۔ مرزا جی نے مسکراتے ہوئے فاتحانہ انداز میں سرہلایا۔ اور رڈمی سے چال چلی۔ دوسری سرہی۔ انہوں نے جیت لی۔ پھر چلے تو تیسری بھی لے لی۔ چوتھی بھی۔ لیکن پانچویں ہار گئے۔ ذرا بے بسی سے انہوں نے اپنے پارٹنر کی طرف دیکھا اور پھر ہماری طرف دیکھ کر بولے۔
"وعلیکم السلام"
"مزاج اچھے ہیں مرزا صاحب" اتنی لمبی رکھائی کے بعد عربی بھیا کو جب سلام کا جواب ملا تو وہ خفت دور کرنے کو ذرا زیادہ ہی با اخلاق بن گئے۔
"ستیاناس ... ستیاناس" انہوں نے نعرہ لگایا۔ "ستیاناس کر ڈالا۔ بھلا یہ بھی کوئی پتہ تھا کھیلنے والا — ڈائمنڈ چلے ہوتے"
اور عربی بھیا دبک کر چپ ہو گئے۔ ہم نے سکور دیکھنے کی خاطر سکور بک اٹھائی۔ لیکن وہ ختم ہو چکی تھی۔ اور اسکے آخری گتے پر بھی سکور درج تھا۔ ادھر ادھر دیکھا تو کوئی اور نظر نہ آئی۔ اتنے میں ایک ہینڈ ختم ہوا تو اسلم صاحب سکور لکھنے کے لئے پنسل سنبھالنے لگے۔ ایک ورق پر دو چار سطور لکھی ہوئی تھیں اور اس سے نیچے خالی جگہ پر انہوں نے سکور لکھ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اتنے میں پتے پھر سے بٹنے لگے۔
"کیا سکور ہے؟" کہتے ہوئے ہم نے کاغذ اٹھا لیا۔ سکور پڑھ چکے تو اس کے بعد قدرتی طور پر اوپر لکھی ہوئی سطور پر نظر پڑی۔ اور ہم چونکے .... وہ مسز اسلم کی طرف سے اسلم صاحب کے نام پیغام تھا۔
"کل شام ورائٹی شو میں سیٹیں بک کرائی تھیں لیکن آپ
کلب سے لوٹے ہی نہیں۔ اور وہ ضائع چلی گئیں۔ آج بلقیس کی شادی
ہے۔ میں وہیں جا رہی ہوں۔ آپ بھی لنچ تک ضرور پہنچ جائیں
ورنہ وہ لوگ ناراض ہو جائیں گے —— تاکید ہے"۔
نیچے اسی روز کی تاریخ تھی۔ اسلم صاحب کے بڑھے ہوئے شیو اور الجھے ہوئے بالوں سے صاف عیاں تھا کہ تین روز سے کلب سے باہر نہیں گئے۔ انہوں نے اس رقعے سے زیادہ سے زیادہ ہمدردی یہ دکھائی تھی کہ اس پر سکور نوٹ فرما رہے تھے۔ ہم نے وہ کاغذ چپکے سے عربی بھیا کو تھما دیا۔

[illegible] والے کمرے میں فون کی گھنٹی پکار پکار اٹھی۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اٹھا

"ہیلو! ہیلو! ... جی ... ٹھیک ہے .... ہاں جی بیٹھے ہیں ..... ہولڈ کریں میں ابھی فون ادھر لے جاتا ہوں۔"

بیرا دروازہ کھول کر فون کی تار سنبھالتا ہوا اندر داخل ہوا

"ڈاکٹر صاحب ۔ آپ کا فون ہے"

"لاؤ بھائی لاؤ .... یہ لیجئے بنا ۔ کوئین سپیڈ کی" انہوں نے پتہ پھینکا اور سر پتوں پر جھکائے انہوں نے فون پکڑنا چاہا۔

"اور ... اف .... ہائے" وہ بے اختیار اچھلے ۔ پتے چھوٹ کر دور جا پڑے

کیا ہوا؟ سب نے چونک کر دیکھا۔

ہوا وہی تھا جو ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا سر تو پتوں پر جھکا تھا۔ اور ادھر دیکھے بغیر ہاتھ بیرے کی طرف بڑھا رہے تھے۔ جوان کو دیکھنے کی بجائے تار سنبھالنے میں مصروف تھا۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہو بیت کی وجہ سے جمائی بھی لے رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی انگلیاں انجانے میں ٹیلیفون پکڑنے کی بجائے اسی کے منہ میں گھسی چلی گئیں بیرے نے معذرت کے طور پر جمائی توڑ کر فوراً منہ بند کیا تو دانتوں نے اپنی عملداری میں ڈاکٹر صاحب کو دست درازی کرتے دیکھ کر فوراً جکڑ لیا جمائی کا فیل از وقت توڑنا ویسے بھی منہ کے لئے ہنگامی صورتِ حال کے نافذ ہونے کا اعلان ہوتا ہے اس لئے دانت ہمیشہ سپرنگ کی طرح کھٹ سے بند ہوتے ہیں چنانچہ انگلی کا درد ڈاکٹر صاحب کے منہ سے نعرہ بن کر نکلا

"اندھے ہو گئے؟ دیکھتے نہیں؟"

"یہ کیا موقع تھا منہ چباڑنے کا" قریشی صاحب نے بھی ڈاکٹر صاحب کے پارٹنر ہونے کی وجہ سے ذرا شدت سے تبصرہ کیا حالانکہ وہ اس وقت صرف ڈمی پارٹنر تھے۔

"ہیلو! جی .. ہاں جی ... تو اب کیا حالت ہے مریضہ کی ... اچھا! اچھا! ... (انہوں نے ڈمی سے چال چلی اور اسلم صاحب کو اشارہ کیا کہ وہ پتہ پھینکیں) ... اچھا تو کل شام لائے تھے آپ ... ہاں جی میں اس وقت گھر پہ نہ تھا۔ ایک ضروری مریض دیکھنے گیا تھا ... ہاں کافی دیر لگ گئی تھی ... اچھا تو کیا بارش تھی۔ میرا مطلب ہے بارش تو تھی کیا اس سے سردی لگ گئی ہے ... . ہاں ممکن ہے۔ آپ فکر نہ کریں ..... ہاں ہاں دیکھ لیں گے۔ آپ فی الحال وہی دوائی پلائیں .....

ارے نہیں! آپ نہیں آئیے گا میں ابھی ابھی ذرا سیالکوٹ جا رہا ہوں۔ کل شام لوٹوں گا۔ اسی وقت مجھے حالت بتایئے ... اچھا .....

ہاں جی (مرزا جی نے پان کا پتہ پھینکا تو ڈاکٹر صاحب بے اختیار بولے) یہ ہارٹ کیسے ہے .. .... ہیلو! ہیلو! جی ... نہیں تشویش کی کوئی بات نہیں میں نے تو ہارٹ کے بارہ میں ویسے ہی پوچھ لیا تھا .... تو وہ ٹھیک ہے نا .... بس فکر نہ کریں ......"

اور ڈاکٹر صاحب نے فون پٹخ دیا "میں آپ سے ہارٹ کا پوچھ رہا ہوں اور انہوں نے مریضہ کا ہارٹ سمجھ لیا ....

... میں نے پھینکنا ہے پتہ ... چلئے جی کل شام تک تو نجات ملی ...... یہ لیجئے جیک"

پتہ پھینک کر ڈاکٹر صاحب عرفی بھیا سے پوچھنے لگے۔

"کل شام بارش ہوئی تھی کیا؟ ہم تو تین روز سے اندر ہی بیٹھے ہیں"

"بارش تو ہلکا سا لفظ ہے ۔ وہ تو طوفان تھا"

"اچھا!" سب کھیلنے والے چونکے،

"کوئی نقصان تو نہیں ہوا" مرزا جی نے تشویش سے پوچھا

"ہمارے گھروں میں تو نہیں ہوا۔ آپ گھر جائیں گے تو پتہ چلے گا" عرفی بے زاری سے بولے

"چلو یار پتہ پھینکو" اسلم صاحب بولے "کوئی نقصان ہوا ہوتا تو اب تک گھر سے پچاس قاصد آ چکے ہوتے۔ کوئی نہیں آیا تو سب ٹھیک ہی ہوگا ...... اچھا تو ٹرمپ کیا ہے؟"

تھوڑی دیر بعد ہم باہر نکل آئے۔ لاؤنج میں بیٹھ کر بیرے سے کافی منگوائی۔ پینے لگے تو عرفی بھیا بولے "وہ بات ٹھیک ہی ہوگی"

"کونسی بات؟"

"وہی!! ـــــ اصحابِ کہف آجکل اصحابِ تاش بن گئے ہیں۔"

یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا جب ہم نے برج کھیلنے والے دیکھے تھے۔ اس سے پہلے بھی اکثر دیکھے تھے۔ اور اکثر حیران ہوتے تھے کہ اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی بقائمی و ہوش و حواس کیا کرنے لگتے ہیں ہم نے تاش بنانے والوں سے پوچھا۔ تاش کھیلنے والوں سے پوچھا۔ تاش دیکھنے والوں سے پوچھا۔ تاش چرانے والوں سے پوچھا۔ سبھی کہتے ہیں کہ یہ کھیل ہے۔ اب ہم مانیں تو کیسے مانیں نہ تو اس کھیل میں پسینا آتا ہے۔ نہ سانس پھولتا ہے۔ نہ کوئی کبھی فاؤل کرتا ہے۔ اور نہ اس میں ہار جیت ہوتی ہے۔ کھیلنے والے محض ہمیں بے وقوف بنانے کو کہہ دیتے ہیں کہ اس میں ہار جیت ہوتی ہے۔ اور اگر ہم اپنی فطری بھلمنساہت سے ان پہ اعتبار کر لیں تو اور بات ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہمیں آج تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ کون ہارا اور کون جیتا۔ جب یہ نام نہاد کھیل ختم ہوتا ہے تو یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کوئی سیٹیاں بجائے کسی کو کندھوں پر اٹھایا جائے۔ اور اس کا مقابل شرم سے سر جھکا کر چلے یا اپنی ہار کے بارہ میں تاویلیں گھڑے۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ خاتمے پر بھی ایک دوسرے کو پیسے دیتے ہیں۔ غصہ آئے تو سب کو اکٹھا آتا ہے خوش ہوں تو بھی اکٹھے۔ ہر ایک اپنے پارٹنر کو اتنا ہی برا بھلا کہتا ہے جتنا کہ اسی کا پارٹنر اسے کہہ چکا ہے یا مستقبل قریب میں کہنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اور پھر کھیل تو دماغی شگفتگی کے لئے ہوتا ہے۔ تاکہ تھکاوٹ کے بعد ذرا سستانے کا موقع ملے۔ اور یہاں دماغ سوزی کی یہ حالت کہ گویا مسیح ایم اے کا امتحان ہے۔ اور ابھی کتاب پہلی دفعہ دیکھنے کو ملی ہے۔ یقین جانئے اگر برج کھیلنے والے اِس سے آدھی توجہ بھی علم پر دیں تو پی۔ ایچ ڈی کی ڈگریاں ان کے گھر کی لونڈیاں بن جائیں بچپن میں ہمیں جو آدمی گنجا نظر آتا تھا۔ ہم کہتے تھے یہ پروفیسر ہے۔ دماغ سوزی سے بال جھڑ گئے ہیں۔ لیکن اب پتہ چلا کہ ان گنجوں میں اکثریت برج کے کھلاڑیوں کی ہوتی ہے ـــ غالباً اسی وجہ سے عورتیں برج کھیلنے سے احتراز کرتی ہیں۔

ویسے برج کھیلنا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ ایں سعادت بزور بازو نیست۔ اِسے نہ تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے اور نہ ہر شخص کھیل سکتا ہے بلکہ کھلاڑی کے لئے از حد ضروری ہے کہ اس میں دو خصوصیات یا تو پیدائشی طور پر ہوں۔ اور یا پرانے زمانے کے شاگردی کے معیار کے مطابق برج کھیلنے والوں کی چلمیں بھر بھر کر اخذ کر لی ہوں۔ اُن کے بغیر وہ کبھی برج کا اچھا کھلاڑی نہیں بن سکتا ـــــ اچھا تو دور کی بات ہے۔ وہ سرے سے کھلاڑی ہی نہیں بن سکتا۔

پہلی خصوصیت تو اِس کھیل میں یقین محکم اور عمل پیہم ہے۔ کھلاڑی کا عقیدہ ہونا چاہیئے کہ زلیستن برائے برج است نہ کہ برج برائے زلیستن۔ اور یہ کہ جو آدمی برج نہیں کھیلتا وہ قطعاً فالتو آدمی ہے۔ جس کی پیدائش محض کسی تخلیقی حادثے کا نتیجہ تھی۔ اور اب اُس کی زندگی صرف برج کھیلنے والوں کی چشم پوشی کی وجہ سے ہے ویسے تو اس بات کے ثبوت میں ہم آپ کو اتنے واقعات پیش کر سکتے ہیں کہ اگر ان کی داستان مرتب کی جائے تو طلسم ہوش ربا اور الف لیلہ جیسی طویل داستانیں

مشغلہ ہی کا ایک باب ہوں گی۔ لیکن تازہ ترین ثبوت، ہماری دل شکنی میں تبدیلی تھی۔ پہلے روز ایک صاحب ملے جو بلیئرڈ کے دلدادہ ہیں سے شہر کا تعارف کروا رہے تھے اور بار بار زور دے رہے تھے کہ میں کلب ضرور آیا کروں۔ ہم نے بھی کلب میں شوق ظاہر کیا تو کہنے لگے۔ شام کو جب میرا دل چاہے میں انہیں فون کرلوں۔ اور وہ مجھے کلب لے چلیں گے۔

جب اٹھ کر چلنے لگے تو پھر بولے "دیکھئے شام کو بھول نہ جائیے گا۔ ضرور کلب چلیں گے میں اس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک آپ کا فون نہ آئے گا۔ کیونکہ مجھے آپ کے بغیر مزہ نہ آئے گا"

"ضرور ضرور" ہم نے یقین دلایا "مجھے خود بڑا شوق ہے۔ اچھا خدا حافظ"

دروازے سے نکلنے لگے تو پھر مڑ کر پکارے

"تو شام کا پروگرام پکا ہے"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" ہم نے دل ہی دل میں ان کی مہمان نوازی کے ممنون ہوتے ہوئے کہا

شام میں نہا چکا تو انہیں فون کیا وہ نکھر کر بولے

"ہیلو!۔ ہلو! میں تو فون کے انتظار میں پاس ہی بیٹھا تھا۔ بس ابھی گاڑی لے کر آتا ہوں۔ ادھر سے ہی نکل چلیں گے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" ہم نے پوچھا "لیکن اگر ٹینس کا ارادہ ہے تو وہی کپڑے پہن لوں ..."

ان کی خاموشی سے ہم نے پھر پوچھا

"وہاں ٹینس تو ہوتی ہے نا؟"

"ٹینس؟؟؟ ..... ہا آں!! میرا خیال ہے ہوتی ہے ...... ایک طرف نیلے پردے تو لٹکے ہوتے ہیں ...... لیکن میں نے کہا آپ اس کا فکر نہ کریں۔ دوسرے کپڑے ہی پہنیں۔ وہاں تو برج جمے گی"

"برج تو میں نے کبھی نہیں کھیلی" ہم نے معذرت چاہی۔

"ارے!!!" وہ چلائے "برج نہیں کھیلتے آپ؟ میرا خیال تھا آپ کھیلتے ہیں"

"جی نہیں میں نہیں کھیلتا"

"...... لیکن...... مجھے تو یقین تھا کہ آپ کھیلتے ہیں" ان کی آواز بڑی ڈھیلی تھی۔

"جی آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے"

"اوہو .... میں تو سمجھا تھا آپ کھیلتے ہیں" ٹیلیفون کے ریسور سے بھی مایوسی ٹپکنے لگی "اچھا اچھا" تو آپ........ پھر تیار ہوں ...... ڈرائیور گاڑی ورکشاپ لے گیا ہے ابھی آتا ہی ہوگا...... ...... مجھے ڈر ہے کوئی زیادہ نقص نہ ہو........ دیکھئے جیسے ہی وہ واپس آئے گا۔ میں آپ کو فون کردوں گا"

گھنٹے بعد ٹیلیفون آیا کہ گاڑی میں نقص زیادہ تھا اس لئے آج شام تو کلب نہیں جا سکیں گے۔ اور انہوں نے فوراً فون رکھ دیا ریسور رکھتے ہی ہمیں کسی بات کے پوچھنے کا خیال آیا اور ہم نے فوراً رنگ کیا تو پتہ چلا کہ وہ تو گھنٹہ بھر پہلے کلب جا چکے ہیں وہاں ہی سے ہمیں فون کیا تھا۔

"کیوں گاڑی ٹھیک ہو گئی تھی کیا؟"

"وہ تو ٹھیک ہی تھی" غالباً ان کی اہلیہ بول رہی تھیں "اس میں تو کوئی خرابی نہ تھی ...... آپ کون صاحب بول رہے ہیں"

"جی میں ورکشاپ کا مستری بول رہا ہوں" کہہ کر ہم نے فون پٹخ دیا۔

وہ شام انتہائی بوریت میں گزری۔ اگلی شام ہم پھر ان کا انتظار کرتے رہے۔ کیونکہ ہمارا خیال تھا کہ ایک شام کا بھولا اگر دوسری شام گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہنا چاہیئے۔ لیکن ان کا نشان بھی نہ ملا۔ اور وہ شام بھی بے زاری سے گزری۔ اگلی شام ہم خود ہی کلب کو چل دیئے۔

وہاں پہنچے تو دیکھا کہ بڑی عمدہ کلب تھی۔ بہترین ٹینس کورٹ۔ بلیرڈ روم۔ لاؤنج۔ بار۔ تیرنے کا تالاب۔ سکوائش کورٹ وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ ہم ادھر ادھر کمروں میں گھومنے لگے کہ شاید کوئی شناسا نظر آجائے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھولا تو تین آدمیوں پہ نظر پڑی جو میز کے گرد بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک صاحب نے جیسے ہی ہمیں دیکھا "ارے آپ کہاں؟" کا نعرہ لگاتے بھاگے چلے آئے۔

"جی میرا یہاں تبادلہ ہوگیا ہے" ہم نے انہیں پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"واہ واہ ... یہ تو بہت عمدہ ہوا۔" انہوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہمارے کندھے کی چولیں ڈھیلی کر دیں۔

"آئیے آئیے ان سے ملئے۔ یہ بخاری صاحب ہیں۔ اور یہ ملک صاحب ہیں" ...... بیٹھئے ...... بیٹھئے"

"ہاؤ ڈو یو ڈو"

"ہاؤ ڈو یو ڈو"

"بیرا آآ" وہی صاحب چلائے "چائے لاؤ"

پھر گھنٹی پر اتنے زور سے ہاتھ مارا کہ ساری کلب گونج اٹھی۔ اور اس سارے ہنگامے میں ہمارا تعارف کرانا بھول ہی گئے۔ حالانکہ ہم بھی موقع کے انتظار میں تھے تاکہ وہ اپنی سابقہ واقفیت کا اندازہ دیں تو ہم پہچان سکیں۔ لیکن جب یہ موقع ہی نکل گیا تو ہم سوچنے لگے کہ یہ کون ہیں۔ بظاہر اُن سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے اور اندر سے دماغ قلابازیاں لگا رہا تھا کہ ان کو کہاں دیکھا ہے؟ کالج میں؟ یونیورسٹی میں؟ کسی ریلوے کے سفر میں؟ ملازمت کے گذشتہ چند ماہ میں؟ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔ بہر حال اُن پر ظاہر کیئے بغیر کہ پہچانا نہیں ہم ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے۔ اور وہ ہم پر نثار ہوتے رہے۔ اتنی دیر میں میزوں کی بناوٹ اور کمرے کی ترتیب سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ کارڈ روم ہے۔ اِس لئے تاش کی گڈی نظر آنے سے پہلے پہلے ہم فرار ہونا چاہتے تھے۔ لیکن وہ صاحب اِس طرح چپکے جا رہے تھے کہ مفر کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ کہنے لگے۔

"اچھا چائے تو آتی ہی رہے گی۔ اتنی دیر میں ہو جائے ایک ربر"

اور نہ معلوم کہاں سے تاش نکال کر پھینٹنے لگے۔ اُن کی ہر پھینٹ کے ساتھ ہماری سٹی گم ہونے لگی۔

"معاف کیجئے گا۔ میں تو برج جانتا نہیں"

"ہی ہی ہی" وہ صاحب ہنسنے لگے "بے فکر رہیئے ہم لوگ اتنے اناڑی نہیں کہ آپ کھیلنا پسند نہ کریں"

"استغفر اللہ" ہم نے محجوب ہوکر "میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے برج کبھی نہیں کھیلا"

"اجی کیوں بناتے ہیں میں تو اس روز ملتان میں آپ کا کھیل دیکھ کر قائل ہو گیا تھا .... کیا گیم تھی صاحب مزہ آگیا"

غالباً آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے میں تو ساری عمر میں کبھی ملتان گیا ہی نہیں۔"

وہ آخری چار پتے میرے آگے ڈالتے ڈالتے رک گئے اور بولے۔

"تو کیا آپ ڈپٹی ڈائریکٹر، نیشنل سیرنٹنڈری نہیں ہیں؟"

"جی، نیشنل تو میں کبھی بھی نہ تھا [illegible] سپرنٹنڈ بھی بنا نہیں"

وہ حیرت زدہ ہو کر ہماری طرف دیکھنے لگے۔ تبھی ان کے ہاتھ سے گر پڑے

"تو پھر آپ کون ہیں؟"

میں بہر حال وہ نہیں ہوں جسے آپ [illegible]

انہوں نے سخت مایوسی سے [illegible] دیکھا [illegible] سے ہاتھ [illegible] سختی سے پیٹنے لگے۔ ان کے [illegible]

پرنس احمق [illegible] بیٹھ گیا [illegible]

ابھی [illegible] پھر [illegible] آ [illegible] دلی [illegible]

باقی سب سے تو پوچھ لیا کہ کتنا دودھ [illegible] سن [illegible] پائی ہیں [illegible] سے زیادہ ہیں اور دودھ جتنا بچ سب [illegible]

دیا پھر ایک چسکی لگا کر مجبوری سے [illegible] "آؤ [illegible] شطرنج ہی کھیلتے ہیں"

چنانچہ وہ عورت [illegible] شطرنج کھیلنے لگے [illegible] دو [illegible] دفعہ ہم نے کسی چال پر اپنے زنی کی تو تیوں نے ہماری طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے کوئی [illegible] دیکھتا ہے ہم [illegible] دلی [illegible] کی بات کی تو انہوں نے [illegible] بیٹھے ہوئے معذرت چاہی۔ تو پھر کبھی ملنے کا بھی اشتیاق [illegible] والا تھا۔

[illegible] تو وہ آنکھ

ملائے بغیر [illegible] حالانکہ ہمارا [illegible] نہیں کھیلنے۔

دوسری خصوصیت جس کے بغیر [illegible] کھلاڑی بننا ناممکن ہے یہ ہے کہ آپ کی یادداشت بہت ہی اچھی ہو۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ آپ بالکل ابتدا [illegible] شطرنج کھیلنے کے دوران میں آپ یہ یاد رکھ سکیں کہ کون کون سے پٹ نکل گئے ہیں۔ بلکہ [illegible] وقت [illegible] شطرنج نہیں کھیل رہے ہو گے [illegible] آپ کا ذہن جتنا اچھا کام کرے گا۔ [illegible] اس بات کو ہم [illegible] ہوائی پر محمول کریں۔ اس لئے ثبوت میں ایک واقعہ پیش کرتے ہیں۔

[illegible] یقیناً [illegible] پر تو ٹھیک وقت [illegible] پنج لائن پر بڑی بے قاعدہ ہوتی ہیں۔ ہم پنج لائن پر ہم نے جب بھی سفر کیا [illegible] اس لئے ہم اس کا بدلہ یوں لیا کرتے ہیں کہ جب مین لائن پر سفر کرنا ہو تو ہم لیٹ ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ہوئے جب لاہور کے اسٹیشن میں داخل ہوئے تو وہ وقت تھا جب [illegible] چلنے شروع ہوتے ہیں۔ [illegible] کے لئے جھگڑتے ہیں اور گارڈ آخری دفعہ سبز جھنڈی کو گھٹنوں تک [illegible] کر کھینچتی ہوئی [illegible] سے نظر آخری ڈبہ [illegible] اس لئے ہم اس کے دروازے کے رخ [illegible] ہم چڑھنے ہی والے تھے (گاڑی چل [illegible] ایک لحظہ پلیٹ فارم [illegible] کھڑے ہوئے صاحب سے باتیں کرتے ہوئے [illegible] ڈبے میں داخل ہو سکتے تھے۔

"ہلو اشرف"..... کب واپس آ رہے ہو؟"
"اگلے ہفتے کی شام کو"
"اچھا تو میں انتظار کروں گا" گاڑی کی رفتار بڑھنے پر انہوں نے بھی بھاگنا شروع کیا۔
"میں اتوار کے ساتھ ایک آدھ چھٹی بھی لیتا آؤں گا۔ تم پارٹنر تیار رکھنا"
"بس تو ٹھیک ہے۔ برج کا مزہ بھی آئے گا۔ اُس روز دیکھوں گا تمہارے پاس کیسے اچھے پتے جا سکتے ہیں"
اب وہ باقاعدہ دوڑ رہے تھے۔ اور ہم کبھی اُن کی ایک بغل میں سے اور کبھی دوسری میں سے راستہ بنانے کی کوشش کرتے ان کے بالکل پیچھے پیچھے بھاگ رہے تھے۔
"ارے ہم تو ہنڈرڈ آنرز والے کھلاڑی ہیں" اوپر والے صاحب میری حالت زار پر توجہ فرمائے بغیر منہ اٹھا کر قہقہہ لگا کر بدحواسی میں اچانک ہمیں پتہ چلا کہ پلیٹ فارم ختم ہونے والا ہے اور ہم آخری کوشش کرتے ہوئے انہیں دھکا دیکر لپک کر چڑھ گئے۔ وہ صاحب لڑھک کر گاڑی کے نیچے گرنے کو تھے کہ اوپر والے صاحب نے برج دوستی نبھاتے ہوئے بازو پکڑ کر اوپر کھینچ لیا۔ عین اُسی وقت پلیٹ فارم ختم ہو گیا۔
"ارے مجھے تو نہیں جانا ...... میری بیوی تو سٹیشن کے باہر کار میں بیٹھی میرا انتظار کر رہی ہے" وہ چلائے۔
"کوئی بات نہیں۔ وہ وہاں بور نہیں ہوں گی۔ آپ کی کار میں برج کھیلنے کا انتظام تو یقیناً ہوگا" ہم نے سانس درست کرتے ہوئے چڑ کر کہا۔
"بھئی عجب آدمی ہیں آپ بھی۔ مجھے کیوں گھسیٹ لیا"
"عجیب میں ہوں کہ آپ ہیں۔ اگر آپ نے گاڑی پر نہیں چڑھنا تھا تو اِس طرح میرے ساتھ نتھی کیوں ہو گئے کہ یا تو دونوں چڑھ جاتے یا دونوں رہ جاتے...... آپ چڑھ گئے تو کوئی بات نہیں بیوی ہی تو انتظار کر رہی ہے۔ لیکن اگر میں رہ جاتا تو مصیبت آجاتی۔ میں ڈیوٹی پر جا رہا ہوں اور میرا افسر انتظار کر رہا ہے"
"کوئی بات کیسے نہیں" انہوں نے لیے جھنجھلا کر کہا جیسے بیوی کے عتاب کے مقابلے افسر کا عتاب معمولی سی چیز ہے "یہ تیز گام تو منٹگمری سے پہلے نہیں ٹھہرے گی"
"تو کوئی بات نہیں۔ آپ مزے سے برج کے متعلق وہاں تک باتیں کریں" کہتے ہوئے ہم موضوع ختم کرنے کو ٹائیلٹ میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب باہر نکلے تو واقعی برج کی باتیں کر رہے تھے اور گاڑی والے واقعہ پر رضا بر تقدیر تھے۔
"میرا ہینڈ بہت سٹرانگ تھا۔ بھلا میں کیسے پٹ سکتا تھا؟"
"پٹ تو سکتے تھے اگر میرا پارٹنر غلطی نہ کرتا"
"کونسی بھلا؟ وہ تو برج جتنا جانتا ہے۔ اُس کے مطابق ٹھیک کھیل رہا تھا"
"ٹھیک کیسے؟ اسے اس وقت سپیڈ کی کوئین چلنا چاہئے تھی۔ اور وہ چل دیا ڈائمنڈ کا ایس۔ ساری گیم کا ہی ستیاناس ہو گیا تھا"
"سپیڈ کی کوئین چھوڑ کوئین کا باپ بھی آجاتا تھا تو کوئی فرق نہ تھا۔ کیونکہ میں سپیڈ میں کٹ تھا"
"کٹ تھے تو کیا ہوا۔ تمہارے پاس ٹرمپ کا ایک ہی تو پتہ تھا اور وہ تم نے میرے کنگ کے لئے رکھا تھا"

[illegible] پاس کیا ثبوت ہے کہ میں اسے روکے رکھتا"

"تمہیں روکنا چاہیے تھا۔ کیونکہ ڈمی میں سپیڈ تھا ہی نہیں۔ وہاں تو اس وقت ڈائمنڈ کے چار چھ اور ڈگی تھے۔ کلب کا [illegible]۔ اور ہارٹ کا تین اور دس تھے۔ اب اس سے تم کیا کھیل سکتے تھے"

"اور میرے باقی پتوں کا تو تمہیں علم ہی نہیں۔ ہارٹس کا ایس۔ کوئین۔ ڈائمنڈ کا کنگ اور کلب کا دس اور جیک تھے۔"

"تو پھر تم جب یہ تو دے ہو بھلا اس سے پہلی سر میں دکی چلنے میں کیا تک تھی۔ سیدھی طرح جیک چلتے۔ تم تو بڑی غلطی کر گئے۔"

"[illegible] غلطی کیسے طریقے سے کھیلا جائے تو بھلا برج میں کہیں غلطی ہو سکتی ہے۔ میری دراصل سکیم دوسری تھی۔ تم اسے سمجھ نہیں سکے۔

تو بھلا وہ برج کیا کھیلے گا جو دوسرے کی سکیم نہ سمجھ سکے۔ وہ تو سراسر تمہاری غلطی تھی"

"نہیں پارٹنر غلطی نہ تھی ...... اچھا یہ بتاؤ کہ میں اس سے پہلے والے ربر کی تیسری گیم میں جو چوکی چلا تھا تم تو اسے بھی [illegible]"

"ہاں وہ بالکل ٹھیک تھی۔ تمہیں اس وقت ایس کھیلنا چاہیئے تھا"

"اور آخری ربر میں تم نے جو ایس کھیلا تھا بالکل اسی حالت میں ۔۔۔ تو مات کھا گئے تھے نا؟"

"وہ تو اس لئے کہ میرے پارٹنر نے ٹھیک سے سپورٹ نہیں کیا۔ میں نے تو ہارٹس بڑ کیا تو اس نے فور ڈائمنڈ کہہ ڈالا۔ [illegible] وہ ڈائمنڈ میں سٹرانگ ہوگا۔ چنانچہ میں نے فور نو ٹرمپ کیا تو وہ میری بڈ ہی نہ سمجھا اور فائیو سپیڈ کہہ ڈالا۔ اب میں کیا کرتا"

ہم بیٹھے سنتے رہے اور وہ یہی باتیں کرتے رہے۔ آخری ربر کی باتیں۔ اس سے پہلے ربر کی باتیں۔ دوسرے ربر کی تیسری گیم کی باتیں۔ پہلے ربر کی دوسری گیم کے تیسرے ہینڈ کی باتیں۔ اور ہم بیٹھے حیران ہوتے رہے کہ ان لوگوں کی یادداشت کس غضب کی ہے۔ کہ ایک ایک پتہ یاد ہے۔ تاش کے باون پتے ہوتے ہیں اور یہ شاید کوئی سو ہینڈ کھیلے ہوں گے اس لئے نہیں باون سو پتے اپنی اصل پوزیشن میں یاد ہیں۔ ہم ششدر تھے۔

[illegible] آیا تو بیوی والے صاحب ساز کھلاڑی سے پر زور وعدہ لیتے ہوئے اتر گئے۔ اور گاڑی چل دی۔ ہم اپنے ہم سفر سے باتیں کرتے رہے تھوڑی دیر بعد انہوں نے زور سے جمائی لی۔ اور بولے "بڑی نیند آ رہی ہے۔ کل رات بہت کم سویا ہوں"

"ہاں آپ تو برج کھیلتے رہے ہوں گے"

"برج ؟ نہیں تو ..... میں تو مہینہ بھر سے برج نہیں کھیلا"

"اور یہ جو آپ باتیں کر رہے تھے یہ کل رات کی نہیں تھیں" ہم نے اور بھی حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ تو کافی عرصہ پہلے کی ہیں۔ ان صاحب نے ہماری دعوت کی تھی۔ تو وہاں برج کی محفل جمی تھی۔ اب کیا ہے ؟..... [illegible] مہینہ ہے نا ...... تو اگست جولائی ... جون .... ہاں غالباً اپریل کے مہینے میں ان کے ساتھ کھیلا تھا"

[illegible] اور اسی قسم کے اور کئی واقعے ایسے ہیں۔ جن سے برج کھیلنے والوں کی حیرت انگیز یادداشت کے متعلق ہم انکشاف [illegible] جانتے ہیں وہ صرف یہ کہ برج کے کھلاڑی صرف دو تین سال پرانی چالیں یاد رکھتے ہیں بلکہ ہم نے تو اکثر بوڑھے [illegible] بڑی روانی سے بات چیت کرتے دیکھا ہے سائیکالوجی کی ماڈرن تھیوری یہ کہتی ہے کہ انسان

کا عمل بعد پیدائش کے بچہ سے شروع نہیں ہوتا۔ بلکہ بچہ جو نو ماہ ماں کے پیٹ میں گزارتا ہے [illegible]
بنیادی خاکے بن رہے ہوتے ہیں۔ اور ماحول کے واقعات جنم سے پہلے بھی اس کی شخصیت پر اثر انداز ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمیں
بالکل تعجب نہ ہوگا۔ اگر کسی روز کوئی صاحب برج کے ان پنڈت کا ذکر شروع کر دیں۔ جب ان کی والدہ محترمہ ان کی پیدائش
سے دو چار ماہ قبل برج کھیل رہی تھیں یا دیکھ رہی تھیں۔ واضح رہے کہ یادداشت کے بارہ میں یہ بات ہم صرف برج کے کھلاڑیوں
کے متعلق کر رہے ہیں۔ برج کھیلنے والوں کی یادداشت کو ہم کسی اور میدان میں اس لئے نہیں پرکھ سکتے کہ ہم نے کسی برج کھیلنے والے کو
برج کے علاوہ کسی اور موضوع پر بات چیت کرتے ہوئے تو سنا نہیں اور دیکھا ہے۔

احباب کا اصرار ہے کہ برج ضرور کھیلو۔ بڑی سوشل گیم ہے۔ جو نہیں کھیلتا۔ وہ سوسائٹی میں نکو سمجھا جاتا ہے۔ ہم نہیں مانتے اور بار کہتے ہیں کہ بھائی ہم ابھی اتنے سوشل نہیں بنے کہ ہر چیز کو بطور فیشن اس لئے اندھا دھند کرنا شروع کر دیں کہ باقی لوگ کرتے ہیں۔ خواہ وہ اپنی طبیعت کے مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن وہ مانتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں سوسائٹی کا تقاضا ہے کہ برج ضرور کھیلو۔ اب یہ کمبخت سوسائٹی بھی عورت کے مزاج کی طرح ہے۔ لاکھ خوش کرو ہوتی ہی نہیں۔ آخر اس کی کون کون سی ادا ہم مانتے جائیں۔ پہلے سوسائٹی نے ہم سے کہا کہ کھلی پتلونیں پہنو تو ہم نے پائنچے اتنے بڑھا لئے کہ ہماری پرانی پتلونوں سے جاٹ دھوتیاں بنانے لگے۔ پھر سوسائٹی نے کہا اب پتلونیں تنگ پہنو تو ہم نے اتنی تنگ کر دیں کہ کمر کے نیچے کا گداز حصہ جوڑا ہونے کی صورت بیٹھنے میں آسانی ہوتی ہے بالکل [illegible] رہ گیا۔ پھر سوسائٹی نے کہا سویٹر کا گلا اتنا اونچا رکھو کہ کالر اس میں چھپ جائے۔ ہم نے سر تسلیم اس حد تک خم کیا کہ گردن [illegible] کی رگڑ سے چھل چھل گئی۔ پھر سوسائٹی نے کہا کہ تنگ ٹو کے اٹالین جوتے پہنو۔ اب مسلسل استعمال کے بعد یہ حالت ہے کہ جوتے اتارتے ہیں تو اندر سے پاؤں کے بجائے گاجر نکلتی ہے۔ اور اب سوسائٹی یہ کہتی ہے کہ برج کھیلو یعنی وہ سب کچھ کرو جو ہم گزشتہ صفحات میں عرض کر چکے ہیں۔ اب سوسائٹی نادان کو کون سمجھائے کہ اگر ہم نے برج کھیلنا شروع کر دیا تو سوسائٹی کی باقی باتیں ماننے کے لئے فرصت کس کافر کے پاس ہوگی ع "وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا" اکثر جی میں آتا ہے۔ اس سوسائٹی سے دو دو ہاتھ کریں بس مناسب گھڑی کا انتظار ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔

دیویندر اسّر

میں، وینس اور دو ہاتھ

شام کے سائے دھیرے دھیرے بڑھنے لگے۔ سورج سامنے مکان کے عقب میں چھپ گیا ہے۔ مکان کا سایا گلی میں پھیل گیا ہے۔ درختوں کے سائے باغ کی دیوار پر اور دیوار [illegible] سامنے مکانوں کی دہلیز پر سو جاتی۔ لمبی سڑک پارک کے کنارے کے کیچڑ کا سایا پانی کے کنارے کے سائے سے ہم کنار ہو کر سو چکا ہے۔ ڈوبتا سورج تھوڑی دیر کے لئے پھر [illegible] بادلوں کی اوٹ سے ہو کر ان کے بیچ دھیرے دھیرے جھانکنے لگا۔ ان کے اردگرد لال روشنی کے شعلے بکھرنے لگے اور سفید بادل سرخی مائل ہو گئے۔ [illegible] تیز تیز اندھیرا اترتا تھا۔ دھیرے دھیرے روشنی سمٹنے لگی۔ اندھیرا بڑھنے لگا۔ ہوا کا جھونکا زیادہ تیز اور سرد ہو گیا تھا۔ میں کرسی اٹھا کر اندر آ گیا۔ میرے [illegible] کے بلب روشن ہو چکے تھے۔

میں نے کمرے میں روشنی کی اور بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ سامنے کارنس پر وینس کا بت پڑا تھا۔ میرے سرہانے میز پر [illegible] کتاب اور گلاس میں مرجھائے ہوئے پھول پڑے تھے۔ [illegible] والی دیوار پر امرتا شیرگل کی سیلف پورٹریٹ تھی۔ میں نے اسٹوو پر چائے کی کیتلی رکھ دی۔ اس گم سم خاموش تنہائی میں اسٹوو کی آواز زندگی کا عجیب احساس دیتی ہے۔ اگر باہر بارش ہو رہی ہو اور کمرے میں اسٹوو جل رہا ہو تو ایک [illegible]۔ ایک ہم سفر کے ہونے کی خوشی ہوتی ہے۔ جب تک اسٹوو جلتا رہتا ہے۔ میں اس کی آواز میں گم سم کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا ہوں۔ شاعری، فلسفہ، آرٹ، پیار کی کچھ بھولی بسری یادیں اور کچھ نئے پرانے سپنے۔ لیکن جونہی اسٹوو بجھتا ہے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کی حرارت، گرمی اور روشنی ایک دم مر گئی ہو اور میں وینس کا ٹوٹا ہوا بت ہوں یا [illegible] یا مرجھائے پھولوں کی بکھری ہوئی پتیاں ہوں۔

جانے بیٹھے بیٹھے مجھے اسی طرح کے عجیب خیال آتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی مریض ہوں۔ شاید ابنارمل ہوں یا کوئی عظیم فلسفی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر خدا بچے کو عورت کے بطن کے بجائے انسان کے ذہن میں پرورش پانے دے اور پیدا ہونے سے پہلے اس سے پوچھے کہ کیا وہ پیدا ہونا چاہتا ہے تو اس دنیا میں کسی بچے کا ظہور نہیں ہو سکتا۔

میں تھک سا گیا ہوں۔ میں نے روشنی بجھا دی۔ چاہتا ہوں سو جاؤں۔ سو نہیں سکتا اور اتنی سکت نہیں کہ رات بھر جاگتا رہوں۔ سونے اور جاگنے کی اس کشمکش میں کب آنکھ لگتی ہے، کب کھلتی ہے، ایک معمہ ہے جسے کوئی نہ سمجھ پائے۔ اس اندھیرے میں دو ہاتھ بڑھتے ہیں اور وینس کے بت کو اپنی نرم نرم انگلیوں میں تھام لیتے ہیں۔ [illegible] کمرے میں [illegible] لگتی ہیں جیسے پتھر پر ہتھوڑے سے چھینی ماری جا رہی ہے۔ اندھیرے میں ہاتھ حرکت کرتے رہتے ہیں اور ٹک ٹک کی آوازیں ابھرتی رہتی ہیں۔ [illegible] کمرے میں روشنی کا اجالا پھوٹتا ہے۔ وینس مسکرا رہی ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ ثابت و سالم ہیں۔ وہ جھک کر فضا میں لٹکے ہوئے ہاتھوں کو [illegible] چاروں طرف دھواں ہی دھواں، اندھیرا ہی اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ چھت کی کڑیاں [illegible]

[illegible] کے نیچے۔ گلے، چیخیں، قہقہے اور کتوں کی آوازوں میں گھر سسک سسک کر دم توڑ رہے ہیں۔ یہ مُردوں کی بستی ہے۔ یہاں ہر چیز سیاہ ہے۔ زمین سیاہ ہے آسمان سیاہ ہے، تارے سیاہ ہیں، چاند سیاہ ہے، بجلی کے بلب سیاہ ہیں، چہرے سیاہ ہیں، روحیں سیاہ ہیں، راستے، منزل، لوگ، قافلے سب سیاہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر کہیں روشنی ہے تو اس الاؤ کی ہے جس کے گرد مردہ روحیں ناچ رہی ہیں۔ یہ روشنی، یہ الاؤ، سیاہ۔ اچانک میرے کندھے پر کسی نے نرمی سے چھوا۔

"فکر مت کرو دوست۔ اس عالمِ فانی میں کوئی شے ایسی نہیں جس کی قسمت میں فنا ہونا نہ لکھا ہو" اندھیرے میں آواز ابھری۔

"تم کوئی فلسفی معلوم ہوتے ہو" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں آرٹسٹ ہوں۔ دنیا میں صرف تین آرٹسٹ ہوئے ہیں۔ خدا۔ عورت ۔۔۔ اور میں"

"خدا نے عورت کی تخلیق کی، عورت نے مجھے جنم دیا اور میں نے خدا کو ۔۔۔" آواز تھوڑی دیر کے لئے رکی "جانتے ہو جس الاؤ کے نیچے ہم پڑے ہیں یہ تہذیب کے کھنڈر ہیں اور جس الاؤ کے گرد بھوت ناچ رہے ہیں اس میں سنہری الفاظ سیاہ لوہے میں ڈھل رہے ہیں اور یہ ناچتے ہوئے بھوت ان لوگوں کے ہیں جو کل ہم پر ہنسے تھے اور اس کے بجھانے والے دن کو مرے جا رہے ہیں"

آواز کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ میرے شانے کو کسی نے جھنجھوڑا "اٹھو دوست۔ کب تک یوں مردہ پڑے رہو گے" آواز نے مجھے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔ میں نے سہارا دینے والے ہاتھوں کو دیکھا جو ہاتھ میرے کمرے میں دیوتا کے بت کو مار ڈالا کرتے تھے، انہیں ہاتھوں نے مجھے کھڑے ہونے کی قوت عطا کر دی تھی۔

"لو اسے کندھے پر اٹھاؤ اور میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ اس منزل تک جہاں تمہیں صلیب پر چڑھنا ہے"

ان دو ہاتھوں نے میرے کندھے پر صلیب رکھ دی اور میں پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ میں مسلسل چل رہا ہوں۔ مجھے چلتے چلتے ہزاروں صدیاں بیت گئی ہیں۔ میں اس صلیب کی پتوار کے سہارے دریاؤں کے سینے چیر کر اس پار پہنچا ہوں جہاں لوگ کہتے ہیں آرزوؤں کا شہر ہے اور اسی صلیب کے سہارے میں جلتے ریگزاروں کو پار کر کے دوسری جانب پہنچا ہوں، جہاں لوگ کہتے ہیں روشنیوں کا شہر ہے لیکن نہ کوئی آرزو پوری ہوئی اور نہ کوئی روشنی نظر آئی بلکہ میرے کندھے پر صلیب کا نشان گہرا ہوتا چلا گیا۔

"اے سدا بہار پھول! کہاں جا رہے ہو تم" میرے کانوں میں کسی نے کہا۔

مجھے سدا بہار پھول کس نے کہا۔ میں چونکا۔ ایک تتلی میرے چہرے کے پاس اڑ رہی تھی۔ اس کے پروں کا سرخ رنگ سیاہ پڑ چکا تھا۔ اس کے پروں میں گلاب کے پھول کا کانٹا چبھا ہوا تھا۔

"تم کون ہو" میں نے پوچھا۔

"تمہاری آرزو۔ میں تو صدیوں سے تمہارے ساتھ چل رہی ہوں" وہ تھوڑی دیر کے لئے رکی "لیکن میں ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی۔ میرے پروں میں قوسِ قزح کے رنگ تھے اور میری پرواز ستاروں تک تھی ۔۔۔ لیکن ۔۔۔"

تتلی میرے کندھے پر رکھی صلیب پر بیٹھ گئی۔ شکستہ آرزو باتیں کرنے لگی۔ جب اندھیرا بہت گہرا ہو گیا تو میں رک گیا۔

"اندھیری رات کے مسافر چلتے چلو"

میں نے سوالیہ نشان سے آواز کی جانب دیکھا۔

"میں رات ہوں بیٹا۔ تیرا نصیب۔ میری اوڑھنی میں تارے ٹنکے ہیں۔ اور میرے ماتھے پر چاند جھومر ہے۔ لیکن پھر بھی میں رو رہی ہوں۔ یہ آنسو ان شکستہ دل لوگوں کے ہیں جو رات بھر میرے دامن میں چھپ کر روتے ہیں۔ لوگ ان آنسوؤں کو شبنم کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے یہ رات کو برستے ہیں اور دن کے اجالے میں مر جاتے ہیں"

[illegible] صلیب [illegible] لیکن [illegible]
میں نے ادھر ادھر دیکھا میرے چاروں طرف دیواریں تھیں۔ اونچی اونچی دیواریں جن میں کوئی دروازہ نہ تھا نہ کوئی کھڑکی۔ نہ روشندان۔ میں نے باہر نکلنے کی بہت کوشش کی۔ لیکن ناکام رہا۔ مجھے اب معلوم ہوا کہ میں ایک ایسا جہاں ہوں جس کا ہر پل بند کر دیا گیا ہے۔ میں کبھی ایک دیوار سے ٹکرا جاتا۔ کبھی دوسری سے۔ لیکن وہ دیواریں ٹس سے مس نہیں ہوتی تھیں صلیب کے بوجھ تلے میں ہار گیا۔ اٹھا، سنبھلا پھر گر گیا [illegible] صلیب پر سیاہ الفاظ جیسے چمگادڑوں کی طرح اڑنے لگے۔

[illegible] میں ایک لمبی سرنگ میں چل رہا ہوں لیکن وہیں کا وہیں بت بنا ہوا ہوں۔ وہ تاریک راستہ سانپ کی مانند میرے جسم پر لپٹا ہوا تھا موت کو اتنے قریب پا کر میں چیخ اٹھا لیکن یہ چیخ مرنے والے آدمی کی نہیں لگتا ہے بچے کی تھی۔ زندگی جیسے میری پسلی میں اتر کر سو رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کوئی ہے جو اس بچے کو میری نظروں سے دور کسی دیس میں لے جائے۔ لیکن نہ میری کڑیاں ٹوٹتی ہیں اور نہ جیل کا دروازہ کھلتا ہے۔ میرا رواں رواں سسک رہا ہے جنگلی لہریں اونچی ہوتی چلی جا رہی ہیں اور میں سیل میں پہنچے جانے کے لئے کشتی کا انتظار کر رہا ہوں۔

اس اندھیرے میں جہاں نہ ہوا ہے نہ روشنی۔ نہ راستہ نہ منزل۔ میں نے ایک بچے کو جنم دیا ہے جس کے کندھے پر صلیب ہے۔ میں نے جنم سے ہی اپنے کندھے پر صلیب لئے بستی بستی، نگر نگر گھوم رہا ہوں تاکہ جب بھی کسی کو ضرورت پڑے وہ اسے زمین میں گاڑ دے اور مجھے سولی پر چڑھا دے۔ اب میری کوئی آرزو نہیں۔ مجھے سولی پر چڑھنے کا غم نہیں۔ اے خدا مجھے اتنی قوت عطا کر کہ میں یہ صلیب اٹھائے اٹھائے اس منزل تک لے جا سکوں جہاں مجھے اس سے ہم کنار ہونا ہے۔

میں صلیب لئے چل رہا ہوں۔ میرے پیچھے پیچھے مردہ روحیں، بھوت پریت جن کے ہاتھوں میں سنگین لگی بندوقیں اور اجنبی چہرے گاتے بجاتے چلے آ رہے ہیں۔ اس بے پناہ ہجوم میں میں تنہا چل رہا ہوں۔ آوازیں آ رہی ہیں۔ اسے زمین میں گاڑ دو۔ اسے سولی پر لٹکا دو۔ اور سولی پر تتلی کے پر، مور کے پنکھ، سسکتی بلبل، ادھ جلی کتاب، رات کے آنسو، ٹوٹتے پھول، ہزار سال قطروں سے بچے تک [illegible] میرے ہاتھوں اور میرے پاؤں پھاڑی جانے لگیں۔ اچانک زور کا دھماکا ہوا۔ جیسے قیامت کا شور ہو۔ چاروں طرف دھواں ہی دھواں پھیل گیا۔ جب دھواں کچھ کم ہوا تو میں نے دیکھا کہ مردہ روحیں بھوت پریت جن کے ہاتھ میں سنگین لگی بندوقیں اجنبی چہرے سب شکستہ پڑے ہیں۔ مردوں کی اس بستی میں صرف میں زندہ ہوں۔ کیونکہ میں ہی سولی پر لٹکا ہوا ہوں۔ میرے جسم سے خون بہہ رہا ہے۔ میں درد سے چیخا۔ جب آنکھ کھلی تو سارا جسم شدت خوف سے کانپ رہا تھا۔ میں پسینے سے تر بتر تھا سانس زور زور سے چل رہا تھا جیسے سارا بدن دوزخ کی آگ میں جل رہا ہو۔ کمرے میں اندھیرا تھا باہر ہلکی ہلکی سپیدی نمودار ہو رہی تھی۔ میز پر تازہ پھول گلاس میں پڑے ہوئے تھے، اور سامنے کارنس پر وینس کا بت بدستور موجود تھا۔ پڑوسی کے مکان سے آواز آ رہی تھی۔

بھری میں تو پریم دیوانی   میرو درد نہ جانے کوئی

"رات بھر جاگتے ہوئے اسٹوو پر ہاتھ پڑا رہا۔ کچھ معلوم ہی نہیں ہوا" بیوی نے کہا۔

"جلتے ہوئے اسٹوو پر ـــ"

میں نے اپنا ہاتھ دیکھا اس پر گہرا سیاہ نشان تھا۔ لیکن میری حیرانی کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ یہ ہاتھ وہی تھا جس نے رات کے اندھیرے میں وینس کے بت کو اٹھایا تھا جنہوں نے مجھے ملبے کے ڈھیر سے نکالا تھا۔ میں نے بے اختیار اپنے ہاتھوں کو چوم لیا۔

پڑوس سے بدستور آواز آ رہی تھی

"سولی اوپر سیج ہماری کیسے سونا ہوئے
بھری میں تو پریم دیوانی، میرو درد نہ جانے کوئے"

○

وہ ادا بھی قہر کی تھی ادا مزہ درد کا جو چکھا گئی!
الم و نشاطِ فراق کا مرے منہ کو خون لگا گئی!
تب و تابِ جاں مری رات کو شبِ ناؤ نوش بنا گئی
کبھی جامِ اشک چھلک اُٹھا، کبھی آہ نغمے لُٹا گئی!
رخِ سیم رنگ کی چاندنی کبھی اک جھلک جو دکھا گئی
مرے دل کا درد ٹھہر گیا! مرے غم کو نیند سی آ گئی!
کبھی بے کلی نے کرم کیا کہ تھپک تھپک کے سُلا دیا
کبھی بے خودی بڑھی اس قدر کہ شبوں کی نیند اُڑا گئی
وہ نہ جانے کس کی تھی آرزو، وہ نہ جانے کیسی تھی آرزو
جو مجھے بھی خون رُلا گئی، جو لہو میں خود بھی نہا گئی!
وہ مرا جنونِ شگفتہ رُو، وہ کسی کے ناز شگفتہ خُو
یہ شگفتگی بھی عجیب تھی کہ ہنسا ہنسا کے رُلا گئی!
وہ ہزار دشمنِ دل سہی، وہ ہزار دشمنِ جاں سہی
میں نصیبِ عشق کو کیا کروں یہی دشمنی مجھے بھا گئی!
غمِ آرزو ہی کی دین تھی وہ رجائیت وہ نشاطیت
مری یاسیت پہ جو چھا گئی، مرے درد میں جو سما گئی!
میں شہیدِ جورِ فلک نہیں، میں قتیلِ دورِ زماں نہیں
میں خود اپنی آگ میں جل بُجھا، نظر اپنی ہی مجھے کھا گئی!
نہ تلاشِ مرہمِ زخمِ دل، نہ دوائے درد کی جستجو!
نہ وہ کاوشیں، نہ وہ کاہشیں مرے سر سے اب تو ہوا گئی
مجھے اخترؔ اب یہ خبر نہیں، مجھے کس نے دل سے بُھلا دیا
کسی خود پسند کی یاد کیا! مرے دل سے یاد خدا گئی!

سلام مچھلی شہری

○

گلوں کے دل کا حسین غم بنا دیا کس نے
مرے ہر اشک کو شبنم بنا دیا کس نے

یہ آئینہ ہے، یہ تم ہو، یہ میں ہوں، اب یہ بتاؤ
تمہیں جواب دو عالم بنا دیا کس نے

ہمارے دل کی کہانی تو اک حقیقت تھی
اسے فسانۂ مبہم بنا دیا کس نے

طلوعِ صبح نے بخشی تھی جو خوشی دل کو
قریبِ شام اسے غم بنا دیا کس نے

تمہارے سلمیٰ ستارہ بھرے ڈوپٹے کو
وہ ہم نہیں ہیں تو پرچم بنا دیا کس نے

چلو سلامؔ کے اشعار کچھ نہیں لیکن
تمہیں حسینۂ عالم بنا دیا کس نے

کہیں داستاں کسی کی تو سناؤ کوئی [illegible] کرو
[illegible] [illegible] [illegible] سحر کرو
یہ شب الم [illegible] [illegible]
کبھی سوز دل سے [illegible] کوئی [illegible] کرو
الجھو شب زدوں کو شمر کرو کہ نئی سحر کا سلام لیں
وہ نئی سحر کا سلام لیں الجھو شب زدوں کو خبر کرو
[illegible] [illegible] وہاں [illegible]
[illegible] ہوا ور [illegible] وہاں [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
وہ نقاب اٹھا کے [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
وہ شراب کوئی شراب ہے [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
کبھی [illegible] دل [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] فراز دار تک آ گیا - [illegible]
کوئی بات زلف دراز کی - غم [illegible]
کوئی ذکر دار و رسن کرو کوئی [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
[illegible] [illegible] [illegible]
غم عشق [illegible] سب بات ہے کوئی [illegible]
[illegible] کام کی چیز ہے [illegible]

[illegible]

غمِ دوراں نے بھی سیکھے غمِ یاراں کے چلن
وہی سوچی ہوئی چالیں وہی بے ساختہ پن
وہی اقرار میں انکار کے لاکھوں پہلو
وہی ہونٹوں پہ تبسم وہی ابرو پہ شکن
کس کو دیکھا ہے کہ پندارِ نظر کے باوصف
ایک لمحے کے لئے رک گئی دل کی دھڑکن
کون سی فصل میں اس بار ملے ہیں تجھ سے
کہ نہ اندیشۂ آب نہ فکرِ دامن
اب تو چبھتی ہے ہوا برف کے میدانوں کی
ان دنوں جسم کے احساس سے جلتا تھا بدن
ایسی سونی تو کبھی شامِ غریباں بھی نہ تھی
دل بجھے جاتے ہیں اے تیرگیٔ صبحِ وطن

مجید شاہد

وحشت [illegible] دل و نظر میں آئی ہے
سوئے چمن لباسِ بہاراں میں آئی ہے

یوں ہنس دیئے وہ جیسے چٹک کر کوئی کلی
بے اختیار عالمِ امکاں میں آئی ہے

بابِ قفس کھلے نہ کھلے پھر بھی فصلِ گل
آئی تو ہے اگرچہ گلستاں میں آئی ہے

کیسا جنوں کہ اپنے تعاقب میں تشنگی
نکلی ہے شہر سے تو بیاباں میں آئی ہے

کشتی جو تھی شکستہ و محروم بادباں
کس تمکنت سے حلقۂ طوفاں میں آئی ہے

جس بزم تک نظر کی رسائی محال تھی
اب خود ہی بکھر کے دیدۂ حیراں میں آئی ہے

خائف ہے اپنے آپ سے شاہد ہر آرزو
ہر سانس چوٹ کھا کے رگِ جاں میں آئی ہے

گجراتی: شفیق دلی والا
ترجمہ: عادل منصوری

یہ نیناں

یہ نیناں کچھ کام نہ آئے
دو دیپوں نے ہر دم جل کر اندھیارے پھیلائے
یہ نیناں کچھ کام نہ آئے

دُنیا کے رنگوں میں ڈھب سے بھر نہ سکے خود رنگ
جگت دیکھ کے مجھ کو بھی کھینچا ہے اپنے سنگ
آگے رو کر اُلٹے رستے بیری کو دکھلائے
یہ نیناں کچھ کام نہ آئے

دیکھے دُور کے اُجیارے پر من کی جیوت نہ دیکھی
دوارے دوارے بھٹکے لیکن گھر نہ بسایا کوئی
سائل بن کر ہاتھ نگاہوں کے گھر گھر پھیلائے
یہ نیناں کچھ کام نہ آئے

شاہ لطیف
ترجمہ ایاز

قافی ورہ

وائی

(سُر سوہنی سے)

کھینچ رہی ہے پریت پیا کی کوئی نہ مجھ کو روکے
اپنے ہی من کو سمجھائے اپنے آپ کو ٹوکے
کوئی نہ مجھکو روکے

چڑھی ہوئی یہ چنچل ندیا، اور یہ آدھی رات
پریتم ہے اُس پار میں کیسے چھوڑوں اس کا ہات
یہ لہروں کے جھوکے
کوئی نہ مجھکو روکے

پریت کی اگنی سلگ رہی ہے، دھواں سا ہے اُس پار
گھڑے میں میری آگ بسی ہے لے چل اسے منجدھار
کوئی نہ مجھکو ٹوکے
کوئی نہ مجھکو روکے

تخلیقی سرگرمیاں

آنگن
خدیجہ مستور کا نیا ناول۔ قیمت آٹھ روپے
۔کتاب نما عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور

رشکِ وفا
احمد ندیم قاسمی کا تازہ مجموعہ کلام جس میں ۱۹۵۱ء سے اب تک کی
نظمیں غزلیں شامل ہیں۔
۔کتاب نما عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور

منٹو کے خطوط
سعادت حسن منٹو کے خطوط کا مجموعہ (بنام احمد ندیم قاسمی)
قیمت :۔ دو روپے
۔کتاب نما عقب دیال سنگھ لائبریری۔ نسبت روڈ۔ لاہور

جولیس سیزر
شیکسپیر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ از سید فیضی قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے
مکتبہ کارواں کچہری روڈ لاہور۔

گنجینۂ گوہر
شخصی خاکوں کا مجموعہ از۔ شاہد احمد دہلوی۔ قیمت :۔ چھ روپے
۔ مکتبہ نیا دور کراچی ۶۸ء

مجاہدِ اندلس
عربی مصنف علی الجارم بک کے ناول کا ترجمہ از۔ محمد زکریا مائل
قیمت :۔ پانچ روپے
۔ مکتبہ اسلوب۔ کراچی ۶۸ء

لسانی مسائل
اردو زبان کے مختلف پہلوؤں پر بحث از۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری۔
قیمت چھ روپے۔ مکتبہ اسلوب۔ کراچی ۶۸ء

تذکرہ صوفیائے پنجاب
از :۔ مولانا اعجاز الحق قدوسی
قیمت :۔ پندرہ روپے
سلمان اکیڈمی۔ کراچی۔

چاندنی کے سائے
مجموعہ کلام از :۔ قمر ہاشمی
قیمت :۔ ۴ روپے ۵۰ پیسے
۔ادبیات پاکستان کراچی ۶۸ء

دشتِ جنوں
مجموعۂ غزلیات از شاعر لکھنوی قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے
ادبیات پاکستان۔ کراچی ۶۸ء

ایک رات
ناول از :۔ افضل صدیقی۔ قیمت ۱۲ روپے ۵۰ پیسے
۔ادبیات پاکستان۔ کراچی ۶۸ء

رہگذر
ناول از :۔ عارف حجازی۔ قیمت ۱۰ روپے
۔ ادبیات پاکستان کراچی ۶۸ء

شکستِ شب
از : حسن بخت۔ مجموعۂ کلام صفحات ۱۲۸
قیمت :۔ ۳ روپے پچھتر پیسے
مکتبہ المتاز ملا گاندھی سکوئر گوالمنڈی لاہور

امام الہند (تعمیر افکار)
مولانا ابوالکلام آزاد کی سوانح عمری
از :۔ ابو سلمان الہندی
قیمت :۔ چھ روپے
مکتبۂ اسلوب۔ کراچی ۶۸ء

سندھ میں اردو
(زیر طبع)، از۔ وفا راشدی
مکتبہ ادب کوٹری

اردو مقالات
از قاضی عارف برنی۔ تعلیمی مقالات اور تقریروں کا مجموعہ (زیر طبع)
اردو مرکز گنپت روڈ۔ لاہور

پاکستانی ادب کے ترجمے

ہم نے انگلستان، مغربی جرمنی، ہالینڈ، اٹلی، سوئٹزرلینڈ، فرانس اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مختلف اداروں سے گلڈ کے لیے روابط پیدا کر لیے ہیں۔ ان ممالک کے ناشرین اور ادیبوں کی انجمنوں نے پاکستانی ادب سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا ہے فی الحال وہاں کے چند کلاسیکی کتابوں کے پڑھنے والے پاکستانی ادب کے بارے میں کچھ نہیں جانتے جس کی وجہ یہ تھی کہ خود ہمارے ملک کی کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی تھی اور دوسرا یہ کہ ہمارے ادب کے تراجم انگریزی میں موجود نہیں ہیں۔

اب جو ہم نے یہ روابط پیدا کر لیے ہیں، یہ ضروری ہے کہ ہم اپنی بہترین تخلیقات کے ترجموں کی طرف توجہ کریں اور اس کے علاوہ پاکستانی ادب اور ثقافت سے متعلق انگریزی میں لکھی ہوئی طبع زاد کتابوں اور مضامین کو بھی متعلقہ اداروں تک پہنچائیں فی الحال امریکہ ترجموں اور طبعزاد مواد سے اپنی زبانوں میں خود ترجمہ کر لیں گے۔

گلڈ سب مترجمین کو دعوت دیتا ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر اپنے انتخابات کا ترجمہ نمونتاً ہمیں بھیجیں۔

۱۔ پاکستانی ثقافت۔ پس منظر اور حال۔ ۲۔ ناول

مترجم کے لیے ضروری ہے کہ پہلے ایک سبق یا باب کا ترجمہ پورے ناول یا کتاب کے خلاصے کے ساتھ گلڈ کو بھیجے اور معاوضے کی شرائط بھی لکھ دے اگر وہ قابل قبول ہوئیں تو معاہدہ کر لیا جائیگا، واضح رہے کہ بیرونی انجمنوں نے زیادہ تر ناولوں اور ثقافتی موضوعات کی فرمائش کی ہے، نظم، افسانے اور ڈرامے ان ممالک میں تجارتی طور پر منفعت بخش سودے نہیں ہیں اس لیے گلڈ خود ان کے تراجم برائے اشاعت مرتب کریگا۔

واضح رہے کہ اس پروگرام کے سلسلے میں مترجمین اور ادیبوں کا ضروری تعاون حاصل نہ ہوا تو ہم ایک زرین موقع کھو دیں گے ابھی ہمارا تعلق ان ناشرین اور انجمنوں سے تازہ ہے اور ضروری ہے کہ ہم اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں، اس پروگرام میں دیگر فوائد کے علاوہ ادیب اور مترجم کا مالی فائدہ بھی ہے گلڈ اپنی خدمات بلا معاوضہ پیش کرتا ہے اور ڈاک کے اخراجات بھی برداشت کریگا ناولوں اور ثقافتی کتابوں کے مترجمین کو جزوقتاً پیشگی معاوضہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے، ہم چند مترجمین یا ادیبوں کا انتخاب کرنے کے بجائے ایک عام دعوت دے رہے ہیں تاکہ سب کو یکساں موقع ملیں اگر اس پیشکش کا جواب خاطر خواہ نہ ملا تو پھر ہم از خود انتخاب اور ترجمے کی ذمہ داری سنبھال لیں گے۔ ادیبوں اور مترجمین کے لئے گلڈ کا رکن ہونا ضروری نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مزید خط و کتابت مرکزی دفتر سے کیجائے۔

آدم جی ادبی انعام کے قواعد

۱ ـــــ آدم جی ادبی انعام ـ خانوادہ آدم جی کی طرف سے ادارۂ مصنفین پاکستان (مرکز) تقسیم کرتا ہے۔

۲ ـــــ اردو اور بنگالی کی بہترین ادبی کتب (مطبوعہ) پر دس دس ہزار روپے کے انعامات دیے جاتے ہیں۔

۳ ـــــ اگر دس ہزار روپے کا انعام ایک کی بجائے دو کتابوں کو دینے کا فیصلہ کیا جائے تو یہ ملحوظ رکھا جائے گا کہ ایک کتاب نثر کی ہو اور ایک نظم کی۔ انعام نثر کی دو کتابوں یا شاعری کے دو مجموعوں میں تقسیم نہیں کیا جائے گا۔

۴ ـــــ انعام کے لئے صرف طبع زاد کتابوں پر غور کیا جائے گا۔ دوسری زبانوں کی کتابوں سے ماخوذ یا ترجمہ کی ہوئی کتابوں پر انعام کے لئے غور نہیں کیا جائے گا۔ طبع زاد کتابوں میں شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ، غیر افسانوی نثر، اعلیٰ تنقید، سفرنامے اور سوانح عمریاں شامل ہیں۔

۵ ـــــ کتاب کے مصنف کا پاکستانی شہریت کے قانون کی رو سے پاکستان کا شہری ہونا لازمی ہے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ کا رکن ہونے کی قید نہیں۔ مرحوم مصنفین کی کتابیں بھی شامل کی جا سکتی ہیں۔ بشرطیکہ سال متعلقہ میں پہلی بار شائع ہوئی ہوں۔

۶ ـــــ صرف انہی کتابوں پر غور کیا جائے گا جن کے پہلے ایڈیشن پاکستان میں سال متعلقہ میں اگست سے لے کر جولائی تک کے عرصہ میں شائع ہوئے ہوں۔

۷ ـــــ جو کتابیں گزشتہ سال انعام کے لئے پیش کی جا چکی ہیں، ان پر دوبارہ غور نہیں کیا جائے گا۔

۸ ـــــ انعام کے لئے داخل کی جانے والی ہر کتاب کے پانچ نسخے ہر سال ۳۱ جولائی تک بذریعہ جسٹری یا ذاتی طور پر گلڈ کے مرکزی دفتر میں پہونچانے ضروری ہیں۔ بنگالی کتابیں ڈھاکہ کے علاقائی دفتر میں بھی جا سکتی ہیں۔ ان کتابوں کے ساتھ کوئی فیس کی پابندی نہیں۔

۹ ـــــ جو کتب مذکورہ شرائط پر پوری اترتی ہوں انہیں پاکستان کا کوئی بھی شہری انعام کے لئے بھیج سکتا ہے۔ لیکن مصنف کی طرف سے انعام قبول کرنے کی تحریری رضامندی کا حصول ضروری ہے۔ اس مقصد کے لئے [illegible] ہے

مرکزی یا کسی بھی علاقائی دفتر سے منگوائے جا سکتے ہیں۔

۱۰ــــــ اگر انعام کے اعلان سے پہلے کسی مصنف کا انتقال ہو جائے تو انعام کی رقم اس کے قانونی وارثوں کو دی جائے گی۔

۱۱ــــــ جج صاحبان، ججوں کی مجلس کے رکن معتمد، سیکریٹری جنرل پاکستان رائٹرز گلڈ اور ان کے خاندانوں کے افراد یا انعام حاصل کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

۱۲ــــــ ججوں کی ہر مجلس میں پانچ جج ہوں گے۔ مستقل اراکین یہ ہیں۔

(۱) ڈاکٹر محمد شہید اللہ۔ چیئرمین۔

(۲) جمیل الدین عالی۔ رکن معتمد برائے اردو اور بنگالی مجالس۔

الف۔ ہر مجلس کے بقیہ چار اراکین میں سے تین کی نامزدگی پاکستان گلڈ کے سیکریٹری جنرل اور ایک کی نامزدگی خانوادۂ آدمجی کی طرف سے کی جائے گی۔

ب۔ ججوں کے فرائض، انعام کی تقسیم اور انعام سے متعلق دیگر امور کے سلسلے میں ناگہانی ضروریات کے تحت گلڈ ایسے اقدامات کرے گا جو اس کے نزدیک ضروری ہوں۔ اس ضمن میں گلڈ کو کسی بھی ایسے فرد سے جو انعام سے کسی طریقے پر بھی وابستہ ہو، پہلے سے رجوع کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

۱۳ــــــ انعام کے لئے کتابیں داخل کرنے کے لئے چھپے ہوئے فارم گلڈ کے مرکزی یا علاقائی دفاتر سے منگوائے جا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ فارم منگوانے والا سادہ لفافہ بھیجے۔ جس پر اس کا پتہ ہو اور ڈاک کے ٹکٹ چسپاں ہوں۔ چھپے ہوئے فارموں کی ٹائپ شدہ نقول بھی اس مقصد کے لئے کارآمد ہو سکتی ہیں۔

سالِ رواں کیلئے کتابیں بھیجنے کی آخری تاریخ

۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء

(آٹھ بجے شام تک)

صرف انہیں کتابوں پر غور کیا جائے گا جو یکم اگست ۱۹۶۱ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۶۲ء تک کے عرصے کے دوران شائع ہوئی ہوں۔

اردو کتابیں بھجوانے کا پتہ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مرکز) اسٹریچن روڈ۔ کراچی ۱

بنگالی کتابیں بھجوانے کا پتہ

پاکستان رائٹرز گلڈ (مشرقی پاکستان) بردوان ہاؤس۔ ڈھاکہ۔

خبرنامہ
ادارۂ مصنفین پاکستان

ادیبوں اور مصنفوں کو انتباہ

پاکستان رائٹرز گلڈ نے ادیبوں اور مصنفوں کو متنبہ کیا ہے کہ وہ نئے کاپی رائٹ قانون کا گہری توجہ سے جائزہ لئے بغیر ناشروں سے کوئی سمجھوتہ نہ کریں۔ رائٹرز گلڈ کے مرکزی سیکریٹری مسٹر جمیل الدین عالی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ نئے قانون کے تحت تصانیف کے تمام حقوق ادیبوں اور مصنفوں کو دے کر ناشروں کی لوٹ کھسوٹ کے مواقع ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر بعض ناشر ضرورت مند ادیبوں اور مصنفوں کی تصانیف کے حقوق حاصل کرنے کے لئے پچھلی تاریخوں سے معاہدے کر رہے ہیں اور معاہدوں کے متن کی عبارت ایسی ہے جس سے ادیبوں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے

مسٹر جمیل الدین عالی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ ہمارے پاس باور کرنے کے لئے معقول وجوہ موجود ہیں کہ کاپی رائٹ حقوق سے ناجائز فائدہ اٹھانے کے عادی لوگ آرڈی ننس کی دفعات کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کاپی رائٹ حقوق کی منتقلی کی زیادہ سے زیادہ مدت دس سال مقرر کی ہے جس کے بعد متعلقہ تصنیف کے حقوق اشاعت خود بخود مصنف کو واپس مل جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور دفعہ کے مفہوم کے بارے میں بھی غلط فہمی پھیلائی جا رہی ہے جس کے مطابق مصنفوں کو مستقل طور پر کاپی رائٹ حقوق کا مالک بنا دیا گیا ہے گلڈ کے مرکزی سیکریٹری نے کہا ہے کہ قانون کی جس اہم دفعہ سے ادیبوں اور مصنفوں کی بھاری اکثریت کو فائدہ پہنچتا ہے اس کی اہم بات یہ ہے کہ اب تک جتنی بھی کتابیں شائع کی گئی ہیں ان کے بنیادی کاپی رائٹ حقوق متعلقہ مصنفوں کو واپس منتقل ہو گئے ہیں۔ آپ نے کہا کہ تمام ادیبوں اور مصنفوں کو اس پہلو کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ اب چونکہ تمام تصانیف کے حقوق مصنفوں اور ان کے ورثا کو حاصل ہو گئے ہیں انہیں اس قانون کی روشنی میں ہی متعلقہ افراد سے معاملے کرنا چاہیے۔ انہوں نے بتایا کہ کاپی رائٹ آرڈی ننس کی تشریح کے متعلق ادیبوں اور مصنفوں کی رہنمائی کے لئے رائٹرز گلڈ کی طرف سے ایک خاص کتابچہ مرتب کیا جا رہا ہے جو مفت تقسیم کی جائے گی۔ البتہ اس کتابچہ کی اشاعت تک ضروری مشورہ گلڈ کے دفتر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان ٹائمز کے اداریئے کے خلاف احتجاج

پاکستان رائٹرز گلڈ (مشرقی پاکستان) نے لاہور کے اخبار پاکستان ٹائمز کے ۵ مئی ۱۹۶۲ء کے اداریہ کے خلاف احتجاج کیا ہے جس میں ندا الاسلام

کی شہرت و مقبولیت کا سبب اقبال کے کلام کا بنگالی زبان میں ترجمہ ہونا بتایا گیا ہے۔ نیز ڈھاکہ یونیورسٹی کے اہل علم کے بیانات میں کہا گیا ہے کہ وہ ابھی تک گلڈ کے دیباچہ میں مشرقی پاکستان گلڈ شاخ کے اجلاس منعقدہ ۱۶ جون ۱۹۶۲ء میں ایک قرارداد منظور کی ہے جس میں مذکورہ بالا تحریر کا متنازعہ بیانات واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ قرارداد میں یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کی غلط بیانیاں ملک کے دونوں بازوؤں کے عوام میں بدگمانی پھیلانے کا موجب بن سکتی ہیں۔

بنگالی اکیڈمی کے انعامات

بنگالی اکیڈمی ڈھاکہ نے ادارہ مصنفین کے حسب ذیل اراکین کو ادبی انعامات دیئے ہیں۔

(۱) مرکزی اراکین عاملہ:۔ (۱) بیگم صوفیہ کمال (شاعری) (۲) شوکت عثمان (افسانہ نگاری)

ب۔ علاقائی رکن عاملہ:۔ (۱) منیر چودھری (ڈرامہ)

ج۔ عام اراکین:۔ (۱) ابوالفضل (فکشن) (۲) بندے علی میاں (بچوں کا ادب)

جمیل الدین عالی کی ہارورڈ سیمنار میں شرکت

انجمن ترقی اردو کے اعزازی معتمد اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے مرکزی معتمد جناب جمیل الدین عالی یکم جولائی ۱۹۶۲ء کو امریکہ روانہ ہو گئے جہاں وہ ہارورڈ یونیورسٹی کے بین الاقوامی سیمنار میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے شرکت کریں گے۔ توقع ہے کہ عالی صاحب اگست کے آخر تک واپس آجائیں گے۔

ایک ہزار روپے......

گلڈ مرکز نے حکومت پاکستان کے جاری کردہ جو انعامی بونڈ خرید رکھے ہیں ان میں سے ایک بونڈ پر جولائی ۱۹۶۲ء کو قرعہ اندازی میں ایک ہزار روپے کا انعام نکلا ہے۔

گلڈ (مغربی پاکستان ریجن) کی طرف سے رسالے کا اجراء

رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان ریجن نے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس کی ادارت کے فرائض قتیل شفائی اور میرزا ادیب انجام دیں گے۔ اس رسالے کا نام زیر غور ہے۔ "قلم کار" یا "تحریر" میں سے کوئی نام منتخب کیا جائے گا۔

اسپیکر مغربی پاکستان کے اعزاز میں عصرانہ

لاہور۔ پاکستان رائٹرز گلڈ مغربی پاکستان کی طرف سے ۸ جولائی کو گلڈ کے دفتر واقع پرنسز ہوٹل میں صوبائی اسمبلی کے اسپیکر جناب مبین الحق صدیقی کے اعزاز میں چائے کی دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب میں ادیبوں، شاعروں اور ادب دوست حضرات کی ایک خاصی تعداد نے حصہ لیا۔ دعوت کے اختتام پر رائٹرز گلڈ کی صوبائی شاخ کے سیکریٹری جناب قتیل شفائی نے اسپیکر کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ صوبائی اسمبلی میں اردو زبان میں تقریریں کرنے کا جو گیر رجحان دکھایا گیا ہے اس کی ادیبوں کے دلوں میں خاص طور سے بڑی عزت ہے اور اس سلسلے میں اپنے جذبات کے اظہار کے لئے گلڈ نے صدیقی صاحب

کو تشریف لانے کی تکلیف دی ہے۔

جناب قتیل شفائی کے جواب میں اسپیکر مسٹر مبین الحق صدیقی نے اپنی تقریر میں بتایا کہ ان کے دل میں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور مسلمی کام کرنے والوں کا بڑا احترام ہے۔ ہماری قوم کو مردہ پرستی کے رجحان سے پیچھا چھڑا کر اپنی تہذیب اور کلچر کو سنوارنے والے ان افراد کی قدر ان کی زندگی ہی میں کرنی چاہیے اور انہیں تخلیق فن کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ اس ضمن میں انہوں نے کہا کہ صوبائی حکومت کو بھی گرانٹ کی صورت میں ان کی امداد کرنی چاہیے۔ جب حکومت آرٹ کونسل، مجلس ترقی ادب اور ایسے ہی دوسرے اداروں کو مالی امداد دے سکتی ہے تو اس کے بجٹ میں اتنی گنجائش بھی ہونی چاہیے کہ وہ ادیبوں اور شاعروں کے اس نمائندہ ادارے کی بھی امداد کر سکے۔ اس لئے کہ جس طرح ایک فوجی یا ایک پٹواری افسر ہمارے معاشرے کا ایک اہم فرد ہے اسی طرح ایک شاعر اور ادیب بھی قومی تعمیر میں نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے اور اس سلسلہ میں اس کی عملی ہمت افزائی ہونی چاہیے۔

صدیقی صاحب نے اردو زبان کے سلسلے میں کہا کہ اردو ہماری مادری زبان ہے۔ ہر بیٹے کا فرض ہے کہ وہ اپنی ماں کی خدمت کرے اور اگر وہ یہ خدمت انجام دیتا ہے تو کسی پر احسان نہیں دھرتا، اپنا فرض پورا کرتا ہے۔ اس لئے اردو کے سلسلے میں میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا فرض تھا کوئی احسان نہیں تھا۔

میاں افتخار الدین، ڈاکٹر محمد اشرف، مرزا محمد سعید کی وفات پر اظہار تعزیت

ادارۂ مصنفین پاکستان (حلقہ کراچی) کی مجلس عاملہ نے ۲۷ جون ۱۹۶۲ء کے اجلاس میں حسب ذیل قراردادیں منظور کیں۔ (۱) ادارۂ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کی مجلس عاملہ کا یہ جلسہ میاں افتخار الدین کی وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ میاں صاحب کی وفات سے ملک ایک با اصول سیاست داں، ایک بے باک مقرر اور ایک ممتاز محب وطن سے محروم ہو گیا ہے۔ انہوں نے صحافت کے میدان میں پاکستان ٹائمز، امروز اور لیل و نہار جیسے اخبارات و رسائل نکال کر ملک میں صحافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا اہل وطن اسے ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ یہ جلسہ میاں صاحب کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے اور دست بدعا ہے کہ خدا انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(۲) ڈاکٹر محمد اشرف کی وفات پر ادارۂ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کا یہ جلسہ شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرحوم اردو کے صف اول کے ادیب تھے اراکین جلسہ مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں خدا سے دست بدعا ہیں کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

(۳) ادارۂ مصنفین پاکستان حلقہ کراچی کا یہ جلسہ مرزا محمد سعید دہلوی کی وفات حسرت آیات پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ مرزا صاحب کی وفات سے اردو ادب کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ ان کی ذات ہماری تہذیبی و ثقافتی قدروں کی علامت تھی۔ ادارۂ مصنفین پاکستان کے اراکین کو مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی ہے اور وہ دعا کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

فیض احمد فیض کے ساتھ ایک شام

پاکستان رائٹرز گلڈ اور پاکستان آرٹ کونسل کے اشتراک سے ۱۴ جولائی ۱۹۶۲ء کو پاکستان آرٹ کونسل کے ہال میں پاکستان کے مشہور شاعر جناب فیض احمد فیض کے ساتھ ایک شام منائی گئی۔ حاضرین کی تعداد تین سو سے زیادہ تھی جس میں کراچی شہر کے معززین، مقامی شعراء اور فیض صاحب کے مداحین نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ جلسہ کی صدارت ادارۂ مصنفین شاخ کراچی کے اعزازی سیکریٹری جناب شاہد احمد دہلوی نے کی۔ سب سے پہلے طفیل احمد جمالی نے فیض صاحب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔ نیز انہوں نے فیض کی شاعری اور ان کے فن کے مختلف

بیان کیا ہے کہ مشرقی جرمنی کے لیڈر ال شاہ احمد ولی نے فیض کو لینن پیس پرائز ملنے پر ہدیہ تہنیت و تبریک پیش کیا اور کہا کہ یہ بہت بڑے ملک سے پاکستان کے ایک نامور ادیب اور شاعر کو اپنے ملک کے سب سے بڑے اعزاز سے نوازا گیا ہے۔ یہ صرف فیض کے لئے بلکہ پاکستان کے تمام شاعروں ادیبوں اور دانشوروں کے لئے بڑے فخر کی بات ہے۔ انہوں نے اس بات کی شکایت کی کہ ملک میں ادیبوں اور شاعروں کے لئے بڑی سرد مہری کا سلوک کیا جاتا ہے۔ فیض صاحب کو جو پاکستان کے اتنے بڑے شاعر ہیں ایک بڑا ملک پوری قدردانی کے ساتھ انعام دے رہا ہے لیکن خود ان کے ملک میں ان کی کوئی قدر نہیں کی گئی ہے۔ آخر میں انہوں نے فیض صاحب کو اس اعزاز کے لئے مستحق قرار دیتے ہوئے رائٹرز گلڈ اور تمام ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے مبارکباد پیش کی۔ اس کے بعد فیض صاحب نے ایک مختصر تقریر میں حاضرین کو بتایا کہ یہ انعام نہ صرف میرے لئے بلکہ تمام ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کے لئے یکساں عزت کا باعث ہے۔ میں تو ایک ذریعہ بن گیا ہوں۔ حاضرین کی خواہش پر انہوں نے اپنے کلام پیش کیا۔ اس موقع پر ریڈیو پاکستان کا ایک خوش گلو آرٹسٹ مہدی حسن بھی موجود تھا جس نے فیض کی کئی مشہور غزلیں گا کر سنائیں جن سے حاضرین بے حد محظوظ ہوئے۔

آخر میں حاضرین نے فیض صاحب سے بعض سوالات کئے۔ ایک صاحب نے یہ سوال کیا کہ "بہت روز سے میری آرزو تھی کہ آپ سے ایک بات معلوم کی جائے۔ خوش قسمتی سے آج یہ موقع آگیا ہے۔ چونکہ آپ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت بڑے نقاد بھی ہیں اس لئے بحیثیت نقاد ہمیں بتائیں کہ آپ کی سب سے بہتر نظم کونسی ہے" فیض صاحب نے "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے" کو اپنی پسندیدہ نظم بتایا۔ حاضرین کے اصرار پر انہیں یہ نظم سنانی بھی پڑی۔ جلسے کے آخر میں طفیل احمد جمالی جو اسٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہے تھے کہا کہ ہم سب دست بدعا ہیں کہ آپ کا سفر ماسکو بخیر و خوبی انجام پائے اور آپ کے امن و امان کا پیغام گھر گھر پہنچے۔

اجتماع مصنفین

گلڈ سکھر سب ریجن کے زیر اہتمام ماہ نومبر ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتے میں وسیع پیمانے پر اجتماع مصنفین کا انعقاد کیا جا رہا ہے۔ مجوزہ اجتماع میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے تقریباً پچاس مشہور و معروف اہل قلم کی شرکت متوقع ہے۔ اجتماع کا نظام العمل مقالاتی نشست، مجلس مذاکرہ، بین اللسانی مشاعرہ اور دیگر ایسی نشستوں پر مشتمل ہوگا جن میں افسانے اور منظوم ڈرامے وغیرہ پیش کئے جائیں گے۔ موضوع مذاکرہ — "ادب، ادیب اور قومی ذمہ داریاں" ہوگا۔

رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کے ادبی جلسے

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کا پندرہ روزہ تنقیدی اجلاس ۱۴ جون ۱۹۶۲ء ۶ بجے شام زیر صدارت محمد ظہیر ایڈووکیٹ منعقد ہوا۔ پروگرام کے مطابق آثم فردوسی نے اپنی غزل تنقید کے لئے پیش کی۔ مجموعی تاثر کے متعلق اسلم عارف نے کہا "یوں معلوم ہوتا ہے جیسے صاحب غزل نے مضمون کی بجائے قوافی پر زیادہ توجہ دی ہے، اس روایتی غزل کا کوئی شعر ایسا نہیں جو اپنا گہرا اثر چھوڑے۔" چوہدری اکبر لاہوری کی رائے تھی کہ غزل ایک موڈ کی حامل تھی۔ کرب و الم کا تسلسل ہر شعر میں جاری تھا۔ آثم مرزا نے کہا "اس لحاظ سے غزل کو کامیاب کہا جا سکتا ہے" اسلم عارف نے کہا "غزل اور نظم میں فرق ہوتا ہے بطور غزل اس میں کوئی ندرت نہیں"۔ صاحب صدر کے خیال میں اعتراض درست نہ تھا۔ اسلم عارف نے جواب دیا کہ غزل کی بجائے اسے نظم کیوں نہ سمجھ لیا جائے۔ چوہدری اکبر لاہوری نے کہا "جو غزل ایک موڈ کی حامل ہو اسے نظم کیسے کہہ سکتے ہیں۔ نظم میں واقعہ کا تسلسل ہوتا ہے اور غزل میں مزاج کا تسلسل پایا جاتا ہے۔"

پروگرام کا دوسرا حصہ مذاکرہ تھا۔ عنوان تھا۔ اسیر ہنسی کی شاعری کے اثرات اور محرکات تھے۔ اسلم عارف۔ اس مذاکرہ میں مندرجہ ذیل احباب نے حصہ لیا۔ اسلم عارف۔ چوہدری اکبر لاہوری۔ شیخ ارشد ایڈووکیٹ۔ محمد ظہیر۔ تاب اسلم۔ بشیر محمد بھٹی اور انجم مرزا۔

۳۰ جون ۱۹۶۲ء

پاکستان رائٹرز گلڈ سب ریجن سیالکوٹ کا پندرہ روزہ ادبی اجلاس ۳۰ جون ۶۲ء کو زیر صدارت جناب صادق چغتائی منعقد ہوا۔ یہ پروگرام تھا "علامہ سید عشقی الہاشمی کے ساتھ ایک شام" کارروائی کا آغاز محسن نقوی نے کلام پاک کی تلاوت سے کیا۔ پھر عشقی صاحب کی لکھی ہوئی نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سنائی۔ اس کے بعد صاحب صدر نے عشقی صاحب کو دعوت دی کہ وہ اپنی ادبی زندگی کے آغاز، ارتقائی منازل اور منتخب اشعار سے سامعین کو مستفید فرمائیں۔ عشقی صاحب کا گھریلو ماحول علم و فضل کا گہوارہ تھا۔ بچپن ہی میں وہ شعر کہنے لگے تھے۔ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک وہ طبیہ کالج دہلی میں طب کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ وہاں انہیں انتہائی اچھا اور شعر گوئی کے لئے موزوں ماحول میسر آیا۔ دہلی کی ادبی محافل میں وہ اکثر شرکت فرماتے تھے۔ چار سال کے قیام دہلی میں انہیں شعر کو پرکھنے اور تمام اسرار و رموز سے آگاہی حاصل ہو گئی۔ وہیں پہ انہوں نے مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی سے شاگردی کا شرف حاصل کیا۔ ۱۹۲۲ء میں جب وہ تعلیم سے فارغ ہو کر واپس سیالکوٹ تشریف لائے تو کچھ با ذوق حضرات کی مساعی جمیلہ کی بدولت ایک ادبی انجمن بزم فروغ اردو کی داغ بیل رکھی جا چکی تھی۔ عشقی صاحب کو اس انجمن کا صدر منتخب کر لیا گیا۔ عشقی صاحب نے اپنی ادبی لگن سے نئی پود کو بے حد متاثر کیا تھا اور ان کی پر خلوص جد و جہد کی بدولت ادبی حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا۔ کثرت مطالعہ اور معاشی تفکرات کے حملے کی وجہ سے ان کی بینائی جاتی رہی۔ یہ حادثہ اگرچہ معاشی ابتریوں کا پیش خیمہ تھا۔ مگر عشقی صاحب کے ادبی ذوق میں اس پر بھی کوئی فرق نہ پڑا۔ اور لوگ ان سے شاعری کے سلسلے میں فیض حاصل کرتے رہے۔ اب بھی ان کی ذات اردو ادب کی سربلندی کی روشن علامت ہے۔

عشقی صاحب نے ۱۹۱۹ء سے پہلے کی لکھی ہوئی غزلوں کے منتخب اشعار سنائے۔ پروگرام کے مطابق مشتاق احمد، ڈاکٹر نذیر بیگ قمر، اور باقر رضوی نے عشقی صاحب کی مرصع اور انفرادیت کی حامل غزلیں ترنم سے سنائیں جن سے سامعین بے حد محظوظ ہوئے۔ تاب اسلم نے اپنا مقالہ "ایک غزل گو شاعر" اور انجم مرزا نے اپنا مضمون "سیالکوٹ کا ایک نمائندہ شاعر" کے عنوان سے پڑھے۔ صاحب صدر چغتائی صاحب نے عقیدت کے پھول جذبات آفریں اشعار کی صورت میں عشقی صاحب کی خدمت میں پیش کئے۔

سب سے آخر میں ایک غیر طرحی مشاعرہ منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل شعراء نے حصہ لیا۔

آفتاب شکوہ۔ چوہدری اکبر لاہوری۔ ڈاکٹر نذیر بیگ قمر۔ محمد ظہیر۔ مسرور صابری۔ باقر رضوی۔ کلیم حیدر آبادی۔ شکیل آزاد۔ انجم فریدی۔ اکبر ملک۔ صادق چغتائی۔ تاب اسلم۔ عشقی الہاشمی اور حبیب کیفوی۔

اطرافِ عالم

انڈیا آفس لائبریری پر بھارت و پاکستان کی ملکیت کا دعویٰ مسترد

معلوم ہوا ہے کہ حکومت برطانیہ نے بھارت اور پاکستان کا یہ دعویٰ کہ انڈیا آفس لائبریری ان کی ملکیت ہے اور ان کے درمیان تقسیم کی جانی چاہیئے، منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے تاہم اس نے لائبریری کی ملکیت کے سوال کا فیصلہ کرانے کے لئے اسے کسی عدالت میں پیش کرنے پر

رضا مندی ظاہر کی ہے اور صورت سے برطانیہ کی پریوی کونسل کے سامنے پیش کرنے کی تجویز بتائی ہے حکومت پاکستان لائبریری کی ملکیت کے سوال کا فیصلہ کرانے کے لئے برطانیہ کی تجویز کا مطالعہ کر رہی ہے جو وہ غالباً اسے تسلیم کر لے گی۔ امید ہے بھارتی حکومت بھی اس تجویز سے متفق ہو جائے گی۔ پاکستان اور بھارت نے آزادی کے کچھ عرصہ بعد انڈیا آفس لائبریری پر ملکیت کا دعویٰ کیا تھا۔ اس سوال پر گذشتہ کئی مواقع پر مذاکرات ہو چکے تھے تاہم خود پاکستان اور بھارت میں ابھی لائبریری کی تقسیم پر معاہدہ ہونا باقی ہے۔ اس بارے میں ان کے درمیان اختلاف چل رہا تھا کہ چونکہ حکومت برطانیہ بھی اس اختلاف میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ حکومت برطانیہ نے پاکستان اور بھارت کو بتایا کہ وہ ایک ایسی چیز کو تقسیم کرانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ان کی ملکیت نہیں ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ بھارت اور پاکستان لائبریری کی ملکیت پر ایک مشترکہ موقف اختیار کرنے کے لئے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جب لائبریری کی ملکیت کے سوال کا فیصلہ ہو جائے گا تو پاکستان اور بھارت اسے آپس میں تقسیم کرنے کے لئے کوئی فارمولا وضع کر لیں گے۔

تمغۂ بابائے اردو اور وظیفہ بابائے اردو

تمغہ بابائے اردو کے نام سے انجمن ترقی اردو نے ایک انعام جاری کیا ہے جو پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے ان طالب علموں کو دیا جائے گا جو ایم اے اردو کے امتحان میں اول بدرجہ اول آئیں گے۔ یہ تمغہ حاصل کرنے والے ہر طالب کو مبلغ پانچ سو روپے نقد بھی پیش کئے جائیں گے۔ اس فیصلے کا اطلاق سال رواں سے ہو گا یعنی حالیہ امتحانات کے نتائج بھی اس میں شامل ہوں گے۔ انجمن نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ پاکستان کی تمام یونیورسٹیوں کے ایک ایک طالب علم کو جو انجمن کے مقرر کردہ موضوع پر پی ایچ ڈی کرے گا اسے وظیفہ بابائے اردو کے نام سے دو سال کی مدت تک ۱۵۰ روپے ماہوار دیئے جائیں گے۔

شاعر اور موت کا احساس!

پیرس ۱۸ جون کو لیبیا کا شاعر جارج گیتیاں گذشتہ جمعہ کو ایئر فرانس کے بوئنگ ۷۰۷ کے حادثہ میں ہلاک ہو گیا۔ اس حادثہ میں دیگر ۱۱۳ مسافر بھی ہلاک ہوئے تھے گیتیاں کو اس امر کا قوی یقین تھا کہ وہ بوگوٹا سے روانہ ہونے کے بعد مر جائے گا۔ اور کبھی واپس نہیں آ سکے گا۔ اس نے اپنی مطلقہ بیوی سے فرمائش کی تھی کہ وہ آخری بار اسے جہاز پر رخصت کرے اور اس کے بچوں کو ایک مرتبہ دکھا دے۔ شاعر گیتیاں کے کمرے میں رکھے ہوئے صندوقوں اور بنڈلوں پر متعلقہ عزیزوں اور دوستوں کے نام تحریر ہیں۔ اس کی آخری کتاب جو شائع ہوئی ہے اس کا نام ہے "کیا مجھے کچھ عرصے زندہ رہنا چاہیئے" اور آخری نظم جو اس نے کہی تھی اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسے اپنی موت کا یقین تھا۔ اس نظم میں اس نے کہا ہے کہ "میں مایوس نہیں ہوتا۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں . . . . اور جو دن گذر جاتا ہے میں اسے اپنی حیات کا آخری دن سمجھتا ہوں"

"مغربی پاکستان کے لوگ بنگالی اور مشرقی پاکستان کے لوگ اردو سیکھیں" ۔ مولوی تمیز الدین کا مشورہ

راولپنڈی ۱۸ جون جوبلی ہال میں مشرقی پاکستان ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام کل رات قاضی نذر الاسلام کی ۶۳ ویں سالگرہ منائی گئی۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے قومی اسمبلی کے اسپیکر مولوی تمیز الدین نے کہا کہ ملک کے عوام کو دونوں زبانوں بنگالی اور اردو سے واقف ہونا چاہیئے انہوں نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کو اردو اور مغربی پاکستان کے لوگوں کو بنگالی سیکھنی چاہیئے انہوں نے کہا زبان ملک کے دونوں حصوں کے لوگوں کے درمیان بڑی رکاوٹ ہے ان کی رائے تھی کہ یہ دونوں زبانیں ان لوگوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔

اردو اور مغربی پاکستان کی علاقائی زبانوں کی ساخت کا جائزہ

پنجاب یونیورسٹی کا شعبہ لسانیات جو فورڈ فاؤنڈیشن، برٹش کونسل اور پنجاب یونیورسٹی کے اشتراک سے اردو اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں کی ساخت اور گرامر کا جائزہ لے رہا ہے اب انگریزی زبان کی تحقیق پر بھی کام کی رفتار کو تیز کر رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن کے ایک افسر نے حال ہی میں شعبے کے کام کا معائنہ کیا ہے۔ اور امید ہے کہ ستمبر تک اس بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا کہ شعبے کی صورت اور طریق کار کیا ہوگا۔

شعبہ لسانیات کے ایک ممبر ڈاکٹر عبدالرحمن بارکر نے بتایا کہ اس شعبے نے گزشتہ چار سال کے دوران اردو کے علاوہ دیگر علاقائی زبانوں مثلاً پنجابی، بلوچی اور پشتو کی ساخت، گرامر اور صوتیات پر بہت کام کیا ہے۔ خصوصاً اردو کے بنیادی الفاظ کا جائزہ لے کر روزمرہ استعمال میں آنے والے الفاظ کی فہرست مرتب کی گئی ہے تاکہ اردو زبان کی تدریس کے وقت ان الفاظ پر زیادہ زور دیا جائے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ فورڈ فاؤنڈیشن کی طرف سے اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ انگریزی زبان کی تحقیق پر کام کی رفتار کو تیز کیا جائے تاکہ درسگاہوں میں انگریزی زبان کی تدریس کو بہتر بنایا جائے۔ لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی مشکل یہ حائل ہے کیونکہ اس وقت اس شعبے میں صرف ڈاکٹر بارکر کام کر رہے ہیں اور ڈاکٹر بارکر کو بھی جو کہ مانٹریال کی میک گل یونیورسٹی میں شعبہ علوم اسلامی کے پروفیسر ہیں واپس بلایا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا ہے کہ وہ اپنا کام ختم کر چکے ہیں۔ اگر وہ واپس چلے گئے یا شعبے میں کوئی تبدیلی آئی تو کام کی رفتار پر اثر نہیں پڑے گا۔

اردو پریس سروس لمیٹڈ کا قیام

مغربی پاکستان میں ایک نئی نیوز ایجنسی اردو پریس سروس لمیٹڈ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔ یہ نیوز ایجنسی خبروں کے علاوہ فیچر بھی مہیا کیا کرے گی۔ یہ اردو اخبارات کی ضروریات کے پیش نظر قائم کی گئی ہے اور اردو اخبارات کو اردو زبان ہی میں خبریں اور فیچر مہیا کرے گی۔ اس خبر رساں ایجنسی کا صدر دفتر لاہور میں ہوگا لیکن اس کے ذیلی دفاتر مغربی اور مشرقی پاکستان کے اہم شہروں میں قائم ہوں گے۔ اس ایجنسی کے ایک ترجمان نے بتایا ہے کہ ایجنسی اگلے سال کے وسط تک اردو زبان کے ٹیلی پرنٹر استعمال کر سکے گی۔

زرعی یونیورسٹی نے اردو میں کئی لازمی کورس رائج کر دیئے

زرعی یونیورسٹی اردو تحریر و تقریر، اردو اصطلاحات اور اردو میں رپورٹیں تیار کرنے کے لازمی کورس رائج کر کے ملک کے باقی تمام فنی اور پیشہ ورانہ تعلیمی اداروں پر سبقت لے گئی ہے۔ یونیورسٹی کو امید ہے کہ وہ آئندہ چند سال کے عرصہ میں ملک کو بڑی تعداد میں ایسے زرعی سائنسدان مہیا کر سکے گی جو سائنس کا مضمون اپنی قومی زبان میں پڑھانے کے اہل ہوں گے۔ اردو کو لازمی قرار دینے کا فیصلہ یونیورسٹی کی تعلیمی کونسل نے اپنے خاص اجلاس میں کیا ہے جس کی صدارت وائس چانسلر [illegible] نے کی۔

اردو مجلس حیدرآباد کا ادبی جلسہ

حیدرآباد دکن، اردو مجلس کا ماہانہ ادبی اجلاس ۲۷ جون کو اردو ہال میں ڈاکٹر مسعود حسین خاں صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اردو مجلس کے مستقل صدر رائے جانکی پرشاد نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کیا اور تہنیتی تقریر فرمائی۔ محمد ادریس احمد اور محترمہ رشید موسوی لیکچرار اردو ویمنس کالج نے علی الترتیب "اردو مرثیہ اور انیس" اور "جنوبی ہند کے مرثیے" کے عنوان سے گراں قدر مقالات سنائے۔ محفل شعر و سخن میں شعراء نے حصہ لیا۔ صدارتی تقریر کرتے ہوئے ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے کہا کہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد جو تہذیب اردو کا گہوارہ ہمیشہ سے رہا ہے۔ اردو کے مشہور اور

مسائل کے قیام میں حیدرآباد کا بڑا حصہ رہا ہے۔ اور تحقیقات کا اعتماد وفقدان و مناقشہ ہے (اتنا شاید اب سندھ کے کسی حصے میں بھی نہیں ہے : محمد منظور احمد ممتاز اردو اور اردو مجلس کے شکریہ پر یہ ادبی جلسہ برخاست ہوا (ع . ر)۔

بزم امروز کراچی کی طرف سے فیض کو مبارکباد

بزم امروز پاکستان (حلقہ کراچی) کی جنرل باڈی میٹنگ میں ۱۰ رجون کو ایک قرارداد کے ذریعہ پاکستان کے مشہور شاعر فیض احمد فیض کو امن کا لینن پرائز حاصل کرنے پر مبارکباد دی گئی۔ قرارداد میں کہا گیا ہے کہ فیض احمد فیض کی شاعری انسان کی امن پسندی و وطن پرستی کے اعتراف کے طور پر روس نے انہیں جو لینن پرائز دینے کا اعلان کیا ہے بزم امروز کا یہ اجلاس اس پر مسرت اور فخر کا اظہار کرتا ہے اور انعام ملنے کی اطلاع پر فیض صاحب کے اس بیان کو قدر کی نظر سے دیکھتا ہے کہ "یہ انعام میرے لئے اسی وجہ سے باعث افتخار ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں اور ایک پاکستانی کی حیثیت سے مجھے یہ انعام دیا گیا ہے"۔

شیکسپیر یا شیخ زبیر؟

عراقی مصنف ڈاکٹر صفا خلوصی نے دعویٰ کیا ہے کہ مشہور انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیر عربی النسل تھا وہ عراق کا رہنے والا تھا اور اس نے اپنے ڈراموں کا مواد عربی ناولوں اور خصوصاً الف لیلہ سے حاصل کیا۔ ڈاکٹر صفا نے اپنے دعوے کو ایک مقالے کی صورت میں لندن یونیورسٹی کو پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے پیش کیا ہے۔ مقالے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بعض عرب شیوخ اب بھی شیکسپیر کو "شیخ زبیر" کہتے ہیں۔

دو ممتاز ادیبوں کو نقد انعام

لاہور ۲۰ جون۔ پنجاب یونیورسٹی نے اردو کے دو ممتاز ادیبوں سید وقار عظیم اور ڈاکٹر ایم ایس ناموس کو دو بہتر کتابیں تصنیف کرنے پر فی کس ڈھائی سو روپے نقد انعام دیا ہے مذکورہ اردو ادیبوں نے جو کتابیں تصنیف کی ہیں ان کے نام "داستان سے افسانے تک" اور "گلگت اور شنا ہادیاں" ہیں یہ دو کتابیں اعلیٰ ترین معیار کی تصانیف قرار دی گئی ہیں۔

پاکستان رائٹرز گلڈ۔ سب ریجن سکھر
کے اشاعتی پروگرام کے تحت
شائع ہونے والی تیسری کتاب

SUKKUR PAST AND PRESENT

سکھر کی ثقافتی تاریخ
تصنیف : .... شیخ عبدالرزاق راز

انجمن ترقی اردو کی نئی مطبوعات

۱۔ قاموس الکتب (جلد اول) مذہبیات سے متعلق مطبوعہ اور غیر مطبوعہ اردو کتابوں کی مکمل فہرست۔ صفحات (۱۴۰۰)
سائز ۲۰×۳۰/۸ قیمت چالیس روپے۔

۲۔ داستان زبان اردو ڈاکٹر شوکت سبزواری۔ قیمت پانچ روپے

۳۔ جیتا جاگتا اندلس کے فلسفی ابن طفیل کی تصنیف "حی بن یقظان" کا ترجمہ از ڈاکٹر محمد یوسف،
قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

۴۔ مثنوی نصرتی (ملک الشعرا بیجاپور) بابائے اردو۔ قیمت پانچ روپے

۵۔ اردو تنقید کا ارتقاء ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ قیمت سات روپے

۶۔ مسر دا تجسم مارٹن ڈیوڈسن کی کتاب کا ترجمہ از نثار الحق صدیقی۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے

۷۔ خیالات عزیز عزیز مرزا کے مضامین کا مجموعہ۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

۸۔ رتن ناتھ سرشار کی ناول نگاری۔ ڈاکٹر لطیف حسین ادیب قیمت چھ روپے پچاس پیسے

۹۔ قدیم اردو بابائے اردو۔ قیمت پانچ روپے پچاس پیسے۔

۱۰۔ مضامین سلیم (تین جلدوں میں) وحید الدین سلیم کے نایاب مضامین کا مجموعہ مرتبہ مولوی محمد اسمٰعیل
پانی پتی۔ مکمل سیٹ کی قیمت بارہ روپے پچاس پیسے۔

۱۱۔ رومیو جولیٹ شیکسپیر کے ڈرامے کا منظوم ترجمہ از عزیز احمد۔ قیمت پانچ روپے۔

۱۲۔ فاؤسٹ گوئٹے کے شاہکار کا منظوم ترجمہ از مولوی عبد القیوم باقی مرحوم۔ قیمت پانچ روپے

۱۳۔ داس کیپٹال (حصہ اول) کارل مارکس کی عہد آفریں کتاب کا ترجمہ از سید محمد تقی۔ قیمت سات روپے پچاس پیسے)

۱۴۔ فن شاعری بوطیقا از ارسطو کا ترجمہ مع حواشی از عزیز احمد۔ قیمت دو روپے پچاس پیسے۔

(ملنے کا پتہ)

اردو اکیڈیمی سندھ بہادر شاہ مارکیٹ بندر روڈ
کراچی



درندگی کے دور میں
خونخوار آئین زندگی!

گھنے تاریک جنگل۔ اونچے پتھریلے پہاڑ۔ انوکھے جانور، دیوہیکل چرندے، خونخوار درندے، خوفناک پرندے، خون آلود ناخن، لہو بھرے جبڑے، موت نما پنجے۔ غیر ذوی العقول، تنازع للبقا، پیچ، چنگھاڑ، لڑائیاں۔

قیامتیں، تغیر ماحول [illegible] کے جاندار، تغیر ناپذیر۔ حیوانات و نباتات کی ہلاکت، تحلیل و تجزیہ۔ خاک کے ڈھیر، خاک پر ڈھیر۔ تہ بہ تہ۔ بے پناہ فشار، دوزخ کی گرمی..... تیل کی تولید۔

انسان کا ورود، [illegible] نشوونما، ذہنی ترقی۔ زیر زمین ذخیرے۔ ذخیروں کے سوتے۔ ترقی کے سرچشمے۔ انسان کی کوشش، ترقی کے چشمے ابل پڑے ... تیل کا زمانہ۔ تمدن تیز تر قدم۔ صنعت جدید طریقۂ زراعت۔ خوشحالی۔ یہ سب تیل ہی کا عطیہ ہے۔

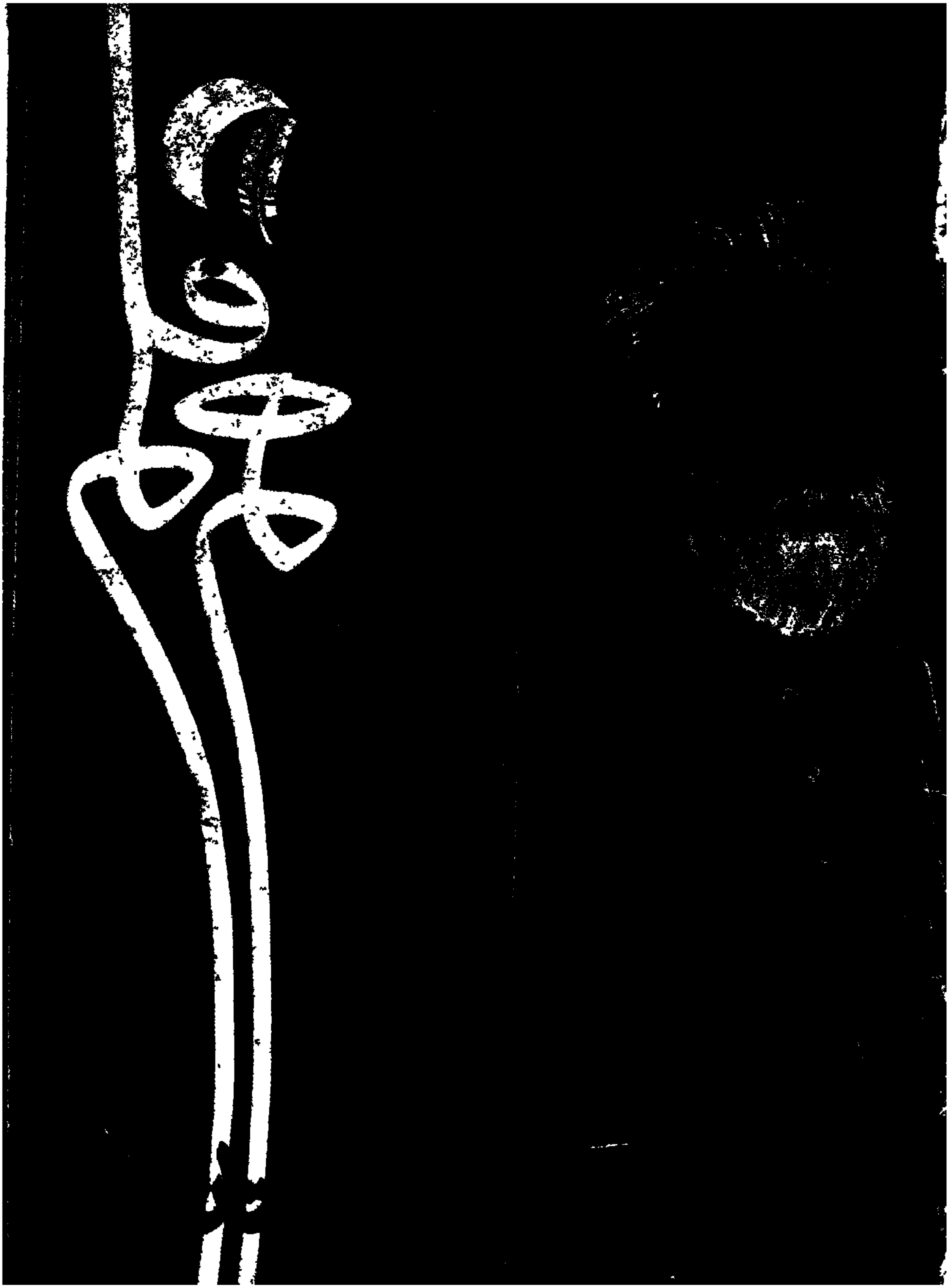
برما شیل کا آپکی زندگی سے گہرا تعلق ہے

آدمجی

پارچہ جات

آخری انتخاب

PRESTIGE




PIA
باکمال
لوگ
لاجواب
پرواز

ماہنامہ

ہم قلم

جلد ۲ — نمبر ۱۲

خصوصی شمارہ بابائے اردو کی یاد میں

اگست ۶۲ء

قیمت فی پرچہ — ۶۲ پیسے
موجودہ شمارے کی قیمت ایک روپیہ

〃 سالانہ — چھ روپے
قیمت سالانہ اراکین ادارہ مصنفین سے پانچ روپے

اِدارۂ مُصنّفینِ پاکستان

(پاکستان رائٹرز گلڈ)

اسٹریچن روڈ۔ کراچی

ہمارا منشور

ہم پاکستان کی جملہ زبانوں کے ادیب خود کو مادر وطن کی ترقی، عظمت، بین الاقوامی امن کے آدرش اور انسانیت کی ترقی کے لئے وقف کرتے ہیں، ہم ان حقوق انسانی پر ایمان رکھتے ہیں۔ جن کی تشریح اقوام متحدہ کے منشور میں کی گئی ہے۔ بحیثیت ادیب کے ہم اپنے خیالات کے اظہار اور ترسیل کی آزادی کے لئے بنیادی حقوق کے حامی ہیں جس کے بغیر تخلیقی ادب بے مقصد ہوتا ہے۔ ہمیں اپنی ان عظیم روایات پر جو ہمیں ماضی سے ملی ہیں، پورا فخر ہے۔ ہم ان کے تحفظ اور ان کو مزید فروغ دینے کا عہد کرتے ہیں۔ ہم اپنے مقدس فرض سے جو صداقت کی عکاسی، حب وطن کی قدروں کی نشوونما، بین الاقوامی اخوت اور تعاون کے فروغ اور انسانی تعلقات کے قیام سے متعلق ہے، کما حقہ آگاہ ہیں تاکہ انسانیت زیادہ سے زیادہ راحت، طمانیت اور وقار کے ساتھ اپنا وجود باقی رکھ سکے۔

ادیب ہونے کی حیثیت سے فرداً فرداً اور اجتماعی طور پر ہم ایک ایسے خوش حال اور صحت مند معاشرے کی ترقی کے لئے اپنی ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں جس میں سب کیلئے آزادانہ اور مساوی مواقع فراہم ہوں، اور جہاں دولت و اقتدار، انسانی قدروں اور روحانی تصورات کے تابع ہوں۔ اسی لئے ہم علم و سائنس کی ترقی کو دنیا میں امن اور خوش حالی کے فروغ کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

(پاکستان رائٹرز گلڈ کے تاسیسی اجلاس میں بتاریخ ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء منظور ہوا)

فہرست

رائٹرز گلڈ کی مطبوعات

تیسری منزل
(راجہ مسعود)

اس مجموعے میں پندرہ افسانے شامل ہیں جن میں زندگی کے مختلف پہلوؤں اور متنوع کرداروں کو بڑی خوش اسلوبی سے اجاگر کیا گیا ہے۔ راجہ مسعود کا مشاہدہ بہت وسیع ہے وہ انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتے ہیں جس کا اندازہ اس مجموعے کے ہر افسانے سے ہوتا ہے۔ صفحات ۲۰۷ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

سورج بھی تماشائی
(انور)

آگ کی آغوش میں اور منزل کی طرف کے بعد سورج بھی تماشائی انور کا تازہ ترین افسانوی مجموعہ ہے جس میں تقریباً وہ سب افسانے شامل ہیں جو انور نے گزشتہ پانچ چھ برسوں میں لکھے ہیں۔
صفحات ۲۴۴ قیمت ۵ روپے ۵۰ پیسے

فصیلِ شب
(مرزا ادیب)

مرزا ادیب کے ڈراموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ''فصیلِ شب'' تیسرا مجموعہ ہے جس میں نو ڈرامے شامل ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا ادیب کا فن روز بروز نہایت عمدگی اور خوبی سے ارتقائی منازل طے کر رہا ہے۔ صفحات ۲۰۸ قیمت ۴ روپے ۔

اُردو میں سوانح نگاری
(ڈاکٹر سید شاہ علی)

ڈاکٹر صاحب علمی و ادبی حلقوں میں خاصے معروف ہیں ——— رسالہ ''نگار'' اور ''اردو'' میں جو لوگ ان کے مضامین پڑھ چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب کا مطالعہ وسیع ہے جس موضوع پر وہ قلم اٹھاتے ہیں اس کا پورا پورا حق ادا کرتے ہیں زیرِ نظر کتاب دراصل ان کا تحقیقی مقالہ ہے جس پر انہیں لکھنؤ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی تھی۔ صفحات ۵۰۲ قیمت ۱۰ روپے

لال چادر
(سید ولی اللہ۔ مترجم یونس احمر)

عوام کی سادگی اور معصومیت سے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں کو باطل اوہام و عقائد کا مرکز بنا دینا کوئی نئی بات نہیں ہمارے ملک میں ایسے کردار جابجا نظر آتے ہیں جو ذاتی مفاد کی خاطر عوام کو مزار پرستی کا خوگر بنا دیتے ہیں اور مذہب کی صحیح تعلیم سے انہیں بیگانہ رکھتے ہیں ''لال چادر'' ایک ایسے ہی مزار کا چادر ہے۔ صفحات ۱۴۴ قیمت دو روپے ۵۰ پیسے

صدا الصحرا
(یوسف ظفر)

جدید شاعروں میں یوسف ظفر کا نام بڑی اہمیت رکھتا ہے ان کی شاعری ان تمام صحت مند تجربوں اور رجحانات کی نمائندگی کرتی ہے جن سے ماضی قریب میں ہمارے ادب کو دو چار ہونا پڑا وہ بنیادی طور پر شاعروں کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جن کے ہاں ماضی کی اعلیٰ روایات کے احترام اور رجحانات کو خوش آمدید کہنے کا شعور پایا جاتا ہے صدا الصحرا تقریباً اسی نظموں کا مجموعہ ہے۔ صفحات ۱۹۹ قیمت ۴ روپے ۵۰ پیسے

گلڈ اشاعت گھر۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

حرفِ چند

۱۶ر اگست

آج کے دن ایک ایسے فرد کی پہلی برسی منائی جا رہی ہے جس کی ساری زندگی ایک خاص مقصد کی لگن میں گذری۔ ہمارے معاشرے میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی فرد نے زندگی کی تمام رعنائیوں اور مسرتوں کو ٹھکرا کر ایک مخصوص مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنے روز و شب کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا ہو۔ بابائے اردو کی ذاتِ گرامی اس روشِ حیات کو اپنانے کی ایک زندہ اور روشن مثال ہے۔ انہوں نے اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور تحفظ کا جو کام آج سے تقریباً نصف صدی قبل شروع کیا تھا اسے آخری وقت تک انجام دیتے رہے اور اس طرح انہوں نے ایک عظیم ثقافتی رہنما کا وہ مقام حاصل کیا جہاں وہ تنہا نظر آتے ہیں، اور جہاں ان کا کوئی حریف نہیں۔

سنہ ۱۹۱۲ء میں مولوی صاحب انجمن ترقی اردو کے معتمد منتخب ہوئے۔ انجمن پہلے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک شعبہ تھی۔ لیکن مولوی صاحب نے اسے ایک باضابطہ ادارہ بنا دیا۔ اس انجمن نے مولوی صاحب کی رہنمائی میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت اور تحفظ کے لئے جو کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انجمن نے ادبی اور سیاسی دونوں محاذوں پر لسانی جنگیں لڑیں۔ جہاں ایک طرف انجمن کی طرف سے بہت سے شعرا کے دواوین، تذکرے اور دوسری زبانوں کی امہاتِ کتب کے تراجم شائع کئے گئے وہیں دوسری طرف ملک میں اردو زبان کے خلاف جو سازشیں ہو رہی تھیں ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا گیا۔ اس طرح پورے ملک میں اردو زبان کی اہمیت تسلیم کروائی گئی۔

بابائے اردو کے ذہنی رجحانات کی تشکیل میں سرسید اور مولانا حالی کی شخصیتوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ انہوں نے سرسید سے سوچنے کا اور حالی سے بات کہنے کا طرز سیکھا۔ یہی وجہ ہے ان کی تحریروں میں جہاں سرسید کی عقلیت پسندی جھلکتی ہے وہیں حالی کے سادہ و پُر کار اسلوب کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ سرسید اور حالی کے علاوہ مولانا شبلی سے بھی بابائے اردو نے بہت کچھ سیکھا، مولانا شبلی ایم اے او کالج علیگڑھ میں بابائے اردو کے استاد تھے ان کے ادبی و علمی مذاق کو نکھارنے میں مولانا شبلی کی صحبتوں نے بھی بہت حصہ لیا ہے۔

بابائے اردو کے ادبی عطیات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز اسی زمانے سے ہو چکا تھا جب کہ وہ ایم اے او کالج کے طالب علم تھے۔ "انسٹی ٹیوٹ گزٹ علیگڑھ" اور رسالہ "حسن" سے انہوں نے اپنی مضمون نگاری کا آغاز کیا ________ حیدرآباد کے قیام کے دوران انہوں نے "دکن ریویو" اور "افسر" وغیرہ میں بہت سے مضامین لکھے پھر اپنا رسالہ "اردو" سنہ ۱۹۲۱ء سے نکالنا شروع کیا۔ بابائے اردو کے مقالات

کی تعداد تین سو کے لگ بھگ ہے۔ مضامین کے دو مجموعے "سر سید کے حالات و افکار" اور "قدیم اردو" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ باقی مضامین ابھی کتابی شکل میں پیش نہیں ہوئے۔ ان مضامین سے بابائے اردو کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

بحیثیت ایک نقاد کے بابائے اردو مولانا حالی کے پیرو ہیں۔ وہ ادب کو زندگی کا عکاس سمجھتے ہیں اور اسے قومی ترقی و تنزل کا آئینہ گردانتے ہیں۔ وہ ادب کو جدید اور قدیم کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔ حالی کے بعد اگر کسی نے اردو تنقید کو آگے بڑھایا ہے تو وہ بابائے اردو ہی کی ذات ہے۔ انہوں نے تنقید کے نظری اور عملی پہلوؤں پر بہت کچھ لکھا ہے جو ہمارے ادب کا وقیع حصہ ہے۔

محقق کی حیثیت سے بھی بابائے اردو ایک بلند حیثیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے بے شمار ادبی نوادر کو قعر گمنامی سے نکال کر شائع کیا اور ان کی قدر و قیمت سے اہل دنیا کو آگاہ کیا۔ بہت سی قدیم کتابوں کو عالمانہ انداز سے مرتب کیا اور انہیں دست برد زمانہ سے بچا لیا۔ قدیم اردو یعنی دکنی ادب پر انہوں نے جو تحقیقی کام کیا ہے اس کی وجہ سے اردو زبان اور ادب کو بے شمار فائدے پہنچے ہیں۔ قدیم دکنی مصنفوں کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کو جس انداز سے انہوں نے متعارف کروایا ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے۔

مقدمہ نگاری کی حیثیت سے بابائے اردو کو منفرد مقام حاصل ہے۔ ہمارے سارے ادب میں کوئی ایسا ادیب نہیں ہے جس نے مقدمہ نگاری کو ایک باقاعدہ فن بنا دیا ہو۔ بابائے اردو نے ادب اور دیگر علوم سے متعلق تقریباً ساٹھ ستر کتابوں پر مقدمے لکھے، جن سے ان کے تبحر علمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہر مقدمے میں بابائے اردو نے متعلقہ کتاب کے موضوع پر ایسی بحث کی ہے جس سے خود کتاب کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ ان کے مقدمے مصنف یا کتاب کی مدح و ستائش تک محدود نہیں ہوتے بلکہ ان میں ایسی معلومات ملتی ہیں جو اصل کتاب پر اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ مقدمات اردو کے تنقیدی و تحقیقی ادب کا ناقابل فراموش حصہ ہیں۔

بابائے اردو کے خطبات بھی علمی اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں۔ ان خطبات میں انہوں نے اپنے عہد کی لسانی کشمکش کی تمام تفصیلات کو جمع کر دیا ہے۔ گذشتہ نصف صدی میں اردو زبان کو جن مخالفتوں اور جن مسائل سے دوچار ہونا پڑا ان کی ساری روداد ان خطبات میں موجود ہے۔ ان میں اردو زبان کے ارتقاء اور نشوونما سے متعلق جا بجا بحث کی گئی ہے نیز آئندہ کی ترقی کے بارے میں جامع اور قابل عمل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ اردو زبان کی تاریخ اور ماضی قریب میں اسے پیش آنے والے مسائل کی تفصیلات اتنی وضاحت کے ساتھ کسی دوسری جگہ نہیں ملتیں۔ زبان کے ساتھ ساتھ ہماری ثقافتی زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی ان خطبات میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان خطبات میں بابائے اردو نے اپنے عہد کی ثقافتی تاریخ کو محفوظ کر دیا ہے۔

شخصی خاکہ نگاری کا دامن بھی بابائے اردو کی فتوحات سے خالی نہیں۔ انہوں نے اس صنف ادب سے جو کام لیا ہے اس کی پہلے سے کوئی مثال موجود نہیں اور ان کے بعد بھی جن ادیبوں نے اس صنف کی طرف توجہ کی انہوں نے دراصل بابائے اردو کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ بابائے اردو کے شخصی خاکے "چند ہم عصر" کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب اردو کی معدودے چند مقبول ترین کتابوں میں سے ہے۔ اس میں بابائے اردو نے اپنے چند ایسے ہم عصروں کے شخصی خاکے لکھے ہیں جن سے انہیں قریبی تعلق رہا۔ ہم عصروں کے انتخاب میں انہوں نے شہرت یا امارت کو معیار نہیں بنایا بلکہ انسانیت کو پیش نظر رکھا ہے اور صرف انہیں لوگوں کے بارے میں لکھا ہے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے۔ "چند ہم عصر" میں جہاں سر سید، مولانا حالی، مولانا محمد علی جوہر، محسن الملک، وحید الدین سلیم اور مولوی ذکاء اللہ جیسے مشاہیر کا تذکرہ ہے وہیں نام دیو اور نور خاں جیسے گمنام افراد کا ذکر بھی ہے۔ اول الذکر ایک مالی تھا اور

تالی اندکر ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن مولوی صاحب کو ان عام اور غیر معروف افراد میں بھی عظمت کی جھلک نظر آئی اور ان کی سیرت نگاری کرکے انہیں زندۂ جاوید کردیا۔

مولوی صاحب کے ادبی خطبات کا ذکر طویل بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ انہوں نے زبان و ادب کے علاوہ تاریخ و فلسفہ جیسے خشک موضوعات پر بھی بہت کچھ لکھا ہے۔ ان کے خوش رفتار قلم کی زد میں جو موضوع بھی آیا اسے انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ انہوں نے خشک سے خشک موضوع کو بھی بڑے باغ و بہار انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کی اردو درجہ استناد رکھتی ہے اور ان کا اسلوب اردو کے بہترین اسالیب میں سے ہے۔

بابائے اردو شاعر نہیں تھے۔ شاعرانہ مزاج ضرور رکھتے۔ کبھی کبھی تفریح طبع کے لئے شعر بھی کہہ لیتے تھے ان کے اشعار کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

نہ عشق بتاں ہے نہ فکر معیشت\
مگر جاگتے رات کٹتی ہے ساری

یہ شعر صرف بابائے اردو ہی کہہ سکتے تھے، وہ نہ کبھی بتوں کے عشق میں مبتلا ہوئے نہ انہیں فکر معیشت نے ستایا ـــ اس کے باوجود بھی ان کی زندگی شب بیداریوں کی ایک طویل داستان ہے ـــــ ایک ایسی داستان جو سبق آموز بھی ہے اور ولولہ انگیز بھی!!!

"ہم قلم" کا زیر نظر شمارہ بابائے اردو کی یاد میں شائع کیا جا رہا ہے۔ رائٹرز گلڈ سے ان کا بہت گہرا تعلق تھا۔ وہ ہمارے ملک کے سب سے معمر ادیب تھے۔ لیکن انہوں نے ادیبوں کی اس ملک گیر تحریک سے جوانوں کے سے جوش و جذبہ کے ساتھ دلچسپی لی۔ گلڈ کے بنیادی اراکین میں سرفہرست انہیں کا نام نامی درج ہے۔ ہماری خواہش تھی کہ اس خصوصی شمارے کو جو ان کی ذات سے منسوب ہے' ان کے شایان شان بنایا جاتا' لیکن وقت کی تنگی کے باعث ہم کچھ زیادہ اہتمام نہیں کر سکے۔ بہر حال بہت کم وقت میں جو کچھ ہو سکا وہ حاضر ہے۔

اس شمارے میں چند تحریریں خاص طور پر قابل توجہ ہیں۔ بابائے اردو کے چھوٹے بھائی شیخ احمد حسن صاحب کے مضمون سے بعض ایسے حالات و واقعات پر روشنی پڑتی ہے جن سے عام طور پر واقفیت نہیں ہے۔ بابائے اردو کی چند قدیم تحریریں بھی شائع کی جا رہی ہیں، جن سے ان کے ابتدائی اسلوب نگارش کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ بابائے اردو کا ایک غیر مطبوعہ اور طویل مضمون بھی اس شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے، جو اردو زبان و ادب سے متعلق ہے۔ اس میں نہایت اختصار اور جامعیت کے ساتھ بابائے اردو نے اردو زبان و ادب کی پوری تاریخ بیان کر دی ہے۔

بابائے اردو کا ایک شعر

دلوں پہ قبضہ خیالات پر حکومت ہے\
اب اس سے بڑھ کے تمہیں اختیار کیا ہوگا

شیخ احمد حسن بہادر بابائے اردو

ابدی بھائی

میں مرحوم ریاست بھوپال کا ایک ریٹائرڈ انجینیئر ہوں۔ اور عملی طور پر میری تمام زندگی محکمہ تعمیرات کی ملازمت میں بسر ہوئی ہے، جہاں مضمون نگاری یا ادبی دلچسپیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اپنے محترم کرنل عطاالرحیم صاحب پرنسپل آرٹس کالج کے پیہم اور پرخلوص اصرار پر اپنی یادداشت کے مطابق بھائی عبدالحق صاحب مرحوم کے متعلق کچھ حالات ذیل میں قلم بند کر رہا ہوں۔ ناظرین میری تحریر میں ادبی خوبیاں اور حسن مضمون کی جستجو نہ فرمائیں۔ اس سے قبل کہ میں بھائی صاحب مرحوم سے اپنے تعلق نیز خود ان کے حالات کے بارے میں اپنے ذاتی علم اور یادداشت کی بنا پر کچھ عرض کروں میں مناسب سمجھتا ہوں کہ خود بھائی عبدالحق صاحب مرحوم کے مضمون "آہ! عبدالرحمن صدیقی" سے کچھ اقتباسات پیش کروں۔ یہ مضمون عبدالرحمن صدیقی مرحوم کی وفات پر لکھا گیا تھا لیکن میری ایماندارانہ رائے ہے اور کوئی بھی غیر جانبدار شخص اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ بھائی صاحب نے جو کچھ صدیقی صاحب کے لیے لکھا ہے وہ خود ان کی زندگی پر حرف بحرف صادق آتا ہے۔ اور مندرجہ ذیل اقتباسات خود بابائے اردو کی شخصیت کی صحیح عکاسی کرتے ہیں۔

"وہ راست گوئی، اخلاقی جرأت، بے باکی اور آزادی میں نیک نام نہیں بدنام تھا۔ وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوا اور جس بات کو وہ صحیح سمجھتا تھا ـــــ اسے وہ بڑے سے بڑے شخص کے منہ پر یا بھری مجلس میں کہنے میں باک نہیں کرتا تھا۔ وہ اگر ذرا بھی زمانہ سازی اور مصلحت کوشی سے کام لیتا تو اس سے بھی بہت اونچے رتبہ پر پہنچ جاتا۔ مگر ہماری نظر میں وہ ان نام کے بڑے لوگوں سے کہیں بڑا تھا جو زمانہ سازی، چاپلوسی، منافقت اور سازش سے بڑے بڑے مناصب پر پہنچتے ہیں۔"

"وہ جس طرح دوستی میں پکا تھا اسی طرح نفرت میں بھی شدید تھا۔ یہ نفرت کسی ذاتی بنا پر نہ تھی بلکہ جو لوگ بے اصول ہوتے ہیں یا ذاتی فائدے کے لئے ایمان بیچنے کے لئے تیار ہو جاتے یا قوم سے غداری کرتے ان سے نفرت ہی نہیں اسے سخت عداوت ہو جاتی۔ وہ ایسے لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا تھا جو بدتمیز یا گندے ہوتے، چونکہ وہ خود صاف گو تھا اس لئے غیبت کو پسند نہیں کرتا تھا خصوصاً اپنے کسی دوست کے خلاف ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں کرتا تھا۔ وہ ناراض ہو جاتا [illegible] تھا لیکن یہ عارضی صورت ہوتی، کچھ دنوں کے بعد یہ کدورت دل سے محو ہو جاتی اور ویسے ہی خلوص و محبت سے ملتا جیسے پہلے ملا کرتا تھا۔"

---

* [illegible] اشاعت کے لئے عنایت فرمایا۔

[illegible] ساتھ [illegible] بچوں کے لیے [illegible] کا حق ادا کیا ۔

میرے دو بڑے بھائی تھے۔ ایک حقی بھائی شیخ ضیاء الحق مرحوم جرنلسٹ، دوسرے بڑے بھائی، جن کے متعلق علم تھا کہ یہ غلط [illegible] حقیقت [illegible] ڈاکٹر عبدالحق صاحب جنہوں نے اپنی محنت کی بدولت جو انہیں [illegible] سے [illegible] شہرت کے مالک ہو کر رہے گئے

ہمارے خاندان میں نام حسن یا حسین پر رکھے جاتے ہیں لیکن جیسا کہ میں نے اپنے گھر میں سنا تھا والد صاحب (شیخ علی حسین صاحب مرحوم) کے پیر و مرشد نے ان سے فرمایا کہ اپنے لڑکوں کا نام "حق" پر رکھنا۔ لہٰذا پہلی دو نرینہ اولادوں کا نام حق پر رکھا گیا۔ اب اسے محض حسن اتفاق کہئے یا پیر صاحب موصوف کی کرامت کہ ہمارے خاندانی ناموں میں لفظ "حق" کا شامل ہونا بڑا ہی مبارک ثابت ہوا۔

میرے دونوں بڑے بھائیوں کی پیدائش ہاپوڑ کی ہے اور جیسا کہ اکثر لکھا گیا ہے کہ بھائی عبدالحق صاحب مرحوم سرآوہ جو ہاپوڑ سے ملحق واقع ہے، میں پیدا ہوئے تھے صحیح نہیں۔ یہ بات ہمارے خاندانی رسم و رواج کے خلاف تھی کہ زچگی کا انتظام مائیکہ میں ہو۔ اس غلط فہمی کی وجہ شاید یہ ہو کہ والدہ مرحومہ اپنے ماں باپ کی واحد لڑکی اور اپنے بھائیوں کی ایک ہی بہن تھیں۔ ہمارے نانا اور ماموں ان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور ان کا قیام اکثر سرآوہ میں رہتا تھا لیکن جہاں تک بھائی صاحب مرحوم کی پیدائش کا تعلق ہے ان کا مولد ہاپوڑ ہی ہے۔

ہم لوگ زمانہ قدیم سے ہاپوڑ کے ہی رہنے والے ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد ہندو تھے۔ اور کائستھ برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کے سپرد سلطنت مغلیہ میں ہمیشہ محکمہ مال کی اہم خدمات رہیں۔ ہم لوگ عہد شاہجہانی میں مشرف بہ اسلام ہوئے لیکن خدمات مذکورہ زیر حکومت کی عطا کردہ معافیاں بدستور قائم رہیں اور یہ معافیاں انگریزی حکومت نے بھی بحال رکھیں۔ میں ہی خاندان کا وہ آخری فرد ہوں جس نے بہ منظوری گورنمنٹ ۱۹۵۰ء میں اپنی خاندانی معافی کو ختم کیا۔

والدہ صاحبہ مرحومہ اکثر بڑے بھائی کا تذکرہ بڑی خوشی اور فخر سے کرتی تھیں۔ وہ فرمایا کرتی تھیں کہ بچپن سے ہی اس کی عادتیں ایسی تھیں کہ نہ آوارہ گردی کرتا اور نہ کھیل کود میں شریک ہوتا تھا زیادہ تر میرے ساتھ رہتا تھا۔ میں نماز پڑھتی تھی تو میرے پاس چوکی پر کھڑا ہو کر نماز کی نقل کیا کرتا تھا۔ اس کو پڑھنے کا بے حد شوق تھا اور ابتدائی تعلیم کے زمانہ میں بھی سب سے الگ بیٹھ کر اپنا زیادہ وقت پڑھنے میں گزارتا تھا۔

والدہ مرحومہ بے حد عبادت گزار اور پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔ ظاہری حالت کچھ بھی ہو لیکن بھائی عبدالحق صاحب مرحوم کے دل میں خدا اور مذہب کا بے حد احترام تھا اور وہ ہندوستانی مسلمانوں کی فلاح و بہبود نیز ترقی کے لئے بھی اردو زبان کا تحفظ بہت ضروری سمجھتے تھے، کیونکہ یہی وہ زبان ہے جس کے ذریعہ برعظیم ہند و پاک میں اسلام کی تبلیغ و اشاعت بمقابلہ کسی اور زبان کے بہتر طریقے پر کی جا سکتی ہے۔ میرے اس بیان کی تائید میں منجملہ دیگر واقعات کے وہ واقعہ بہت اہمیت رکھتا ہے جو مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے بابائے اردو کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں ان کی رحلت پر اپنے اخبار صدق میں بیان فرمایا ہے اور ہفتہ وار شہاب لاہور نے بھی ایک معترض کے جواب میں اس کو نقل کیا ہے۔

انسان کے گفتار و کردار اس کے دلی جذبات کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور خصوصاً محفوظ یا پرائیویٹ مجلس کی گفتگو جہاں پروپیگنڈے اور شہرت کے مواقع نہیں ہوتے انسان کے فطری رجحان کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

مرحوم ریاست حیدرآباد دکن کے ضلع پربھنی میں ایک جگہ ہنگولی ہے۔ بہ زمانہ صدر مہتمم تعلیمات بھائی صاحب ہنگولی تشریف لے گئے اور ڈاک بنگلے میں قیام کیا۔ اسی مقام پر بھائی صاحب کے [illegible] کے ساتھ [illegible] ایک صاحب بھی تعینات تھے۔ انہوں نے اپنی لڑکی کی [illegible] اور [illegible] گفتگو میں بھائی صاحب سے کہا کہ میری لڑکی کو سامنے [illegible] ایک عجیب سی شکل دکھائی دیتی ہے۔ جب دیکھ کر وہ خوفزدہ ہو جاتی ہے [illegible] تو بھائی صاحب نے اس بات کو مذاق میں ٹالا اور لڑکی کو سمجھانے لگے کہ کیا وہم [illegible] لیکن جب لڑکی [illegible] بھائی صاحب نے لڑکی سے کہا کہ "بیٹی! تم [illegible] درود شریف کا ورد کرتی رہا کرو۔"

[illegible] زیادہ قیام ہو سکتا [illegible]

[illegible] کا [illegible] تھا۔ نیز [illegible] کی [illegible] ہو گئے تھے۔

نواب عماد الملک مولوی سید حسین بلگرامی جو [illegible] تھے [illegible] ایک [illegible] کہ [illegible] کے [illegible] تھے [illegible] ہو [illegible] نواب عماد الملک بھی [illegible] باتوں باتوں میں مسئلہ ازدواج پر [illegible] اسلام [illegible] بہت [illegible] ہے۔ نواب صاحب نے [illegible] صحیح نہیں ہے۔ اسلام نے اس معاملے میں [illegible] کی [illegible] ہے کہ آدمی ایک سے زیادہ بیویاں نہیں رکھ سکتا۔

بھائی صاحب نے اپنی کتاب "چند ہم عصر" میں نواب عماد الملک کے ذکر میں اس واقعہ کو مندرجہ بالا الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ واقعہ تو خود بھائی صاحب سے متعلق ہے [illegible] کتاب مذکور میں ان کی ذاتی رائے کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس سے بھائی عبدالحق صاحب مرحوم کے اس بیان کی تائید ضرور ہوتی ہے جو [illegible] نے اپنے [illegible] بزرگ سے سلسلۂ مسئلہ ازدواج شائع کر دیا تھا۔

میں وثوق سے [illegible] حالات میں برادر مرحوم نے اس مسئلے پر اپنی رائے کا اظہار کیا ان کے پیش نظر اکثر احباب غلط فہمی کا شکار ہو سکتے ہیں [illegible] اس بیان کو مصلحت [illegible] مبنی قرار دے سکتے ہیں ______ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر کیا جا چکا ہے وہ کسی [illegible] کی [illegible] نہیں کرتے تھے۔

نواب عماد الملک پر یہ مضمون تقریباً چالیس برس قبل لکھا گیا ہے اور یہ واقعہ اس سے بھی زیادہ پرانا ہے۔ بھائی صاحب کا اس واقعہ کو اہمیت دینا [illegible] اہم ملاقات کے ساتھ [illegible] اس بات پر ایک [illegible] کرتا ہے کہ مسئلہ ازدواج کا یہ پہلو ان کے دماغ میں عرصہ دراز سے موجود تھا [illegible] ان خیالات سے متاثر تھے لیکن چونکہ وہ خود کو مذہبی معاملات میں دخل دینے کا اہل نہیں سمجھتے تھے لہٰذا انہوں نے عام حالات میں کبھی ایسے مسائل [illegible] تبادلہ خیال نہیں کیا۔ لیکن جب ضرورت [illegible] اپنے خیال کے مطابق کسی بات کو صحیح اور درست سمجھتے ہوئے مناسب وقت پر اپنی زبان کو بند رکھنا بھی انہیں پسند نہ تھا۔

پنجاب پر [illegible] کا تسلط ہونے کے بعد سلسلۂ بندوبست [illegible] تجربہ کار [illegible] کو طلب کیا گیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ضلع میرٹھ سے [illegible] شیخ امتیاز علی صاحب کمشنر کے پیشکار مقرر ہوئے، نیاز علی صاحب کا تقرر تحصیلداری پر ہوا اور تیسرے بھائی امراؤ علی صاحب [illegible] کئے گئے۔ ان تینوں بھائیوں نے اپنے چھوٹے بھائی محمد صادق صاحب کو بھی پنجاب بلا لیا۔ یہ سب بھائی اضلاع فیروز پور [illegible] ملازمتوں میں تعینات [illegible] انہوں نے اپنی بہن (ہماری والدہ) کو بھی اپنے پاس بلا لیا [illegible] والد صاحب بھی پنجاب چلے گئے [illegible] صاحب کے [illegible] ان کا تقرر [illegible] ہو گیا۔

بھائی عبدالحق صاحب کی تعلیم [illegible] تک پنجاب میں ہوئی [illegible] شائع ہوا تھا اس پر مقدمہ لکھتے [illegible] سلسلۂ [illegible] ہمارا خاندان [illegible] پنجاب [illegible]

[illegible]

[illegible] میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

بات یہاں تک نہ ... کے ہاتھ نواب محسن الملک نے ... [illegible] ... جہاں محسن الملک ... [illegible] ... جب نواب وقار الملک ... [illegible] ... تشریف لائے تو بھائی صاحب کو دیکھا۔ قرآن کے متعلق ... معلوم ہونے پر کہ ... نواب محسن الملک کے بھتیجے ہوتے ہیں۔ بی اے پاس اور اچھے ادیب ہیں ... [illegible] ... خوش ہوئے ... انہوں نے مدرسہ آصفیہ قائم کیا ہے اس کی ہیڈ ماسٹری کے لئے مناسب شخص کی تلاش میں تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ ... [illegible] ... مطابق ہو گئے۔ لہٰذا بھائی صاحب کا تقرر بعہدہ ہیڈ ماسٹر آصفیہ اسکول ہو گیا اور یہیں سے بھائی صاحب کی حیدرآبادی زندگی کی ابتدا ہوئی، جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش چالیس سال گزارے اور یہی ان کی زندگی کا سب سے قیمتی حصہ ہے۔

[illegible] میں راقم الحروف کو بغرض تعلیم اپنے پاس حیدرآباد بلا لیا اور مدرسہ آصفیہ میں داخل کرا دیا۔ فرصت کے اوقات میں خود بھی پڑھاتے ... [illegible] سال تک میں ان کے پاس رہا لیکن میرا رجحان ٹیکنیکل تعلیم (ڈرائنگ وغیرہ) کی طرف دیکھتے ہوئے نواب افسر الملک سے اس کا تذکرہ کیا۔ ممدوح نے فرمایا کہ میجر اسٹیکس پرنسپل رڑکی کالج میرا دوست ہے میں احمد حسن کے پاس اس کو بھیجے دیتا ہوں جہاں لیاقت اور اہلیت کے مطابق اس کا داخلہ ہو جائے گا۔ [illegible] میں رڑکی بھیج دیا گیا۔ اور میجر اسٹیکس پرنسپل تھامسن سول انجینئرنگ کالج رڑکی نے امتحانِ مقابلہ سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے میرا داخلہ کر لیا یہاں سے [illegible] میں میں نے ڈپلوما حاصل کیا۔ زمانۂ تعلیم میں بحیثیت واحد سرپرست بھائی صاحب مرحوم ہی میرے جملہ مصارف اٹھاتے رہے صرف یہی نہیں بلکہ گھر کے اخراجات اور بہن بھائیوں نیز والدین کی ذمہ داری بھی انہیں کے کندھوں پر رہی۔

میں نے [illegible] میں ریاست بھوپال کی ملازمت اختیار کی لیکن بعض وجوہ سے [illegible] میں عارضی طور پر اس ملازمت کو ترک کر کے مجھے پھر حیدرآباد جانا پڑا، جہاں میرا تقرر محکمہ آرائش و اصلاح بلدہ میں ہو گیا۔ یہ شعبہ دریائے موسیٰ کی عظیم تباہ کن طغیانی کے بعد حیدرآباد شہر کی ترقی اور اصلاح کے نئے محکمہ کاربائے عامہ کے تحت قائم کیا گیا تھا۔ اس بار، چار سال دوبارہ بھوپال آنے تک، میں حیدرآباد میں بھائی صاحب کے پاس رہا اور مجھے ان کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا۔

زمانۂ تعلیم علیگڑھ میں جب بھائی صاحب تعطیلات میں گھر آتے تو بہن بھائیوں کے شور و غل اور کھیل کود سے محفوظ رہنے کے لئے سید محمد حسن صاحب مرحوم رئیس ... [illegible] ... کے مکان (جو ہمارے آبائی مکان سے ملحق تھا) کی دوسری منزل میں ایک کمرہ بھائی صاحب کے مطالعہ کے لئے مخصوص کر دیا جاتا تھا جہاں وہ دن بھر مطالعہ میں مصروف رہتے اور صرف صبح و شام چہل قدمی کے لئے باہر نکلتے تھے۔ البتہ شام کی تفریح کے بعد گھر میں بہن بھائیوں کے پاس رہتے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب میں بچہ تھا اور بھائی صاحب کالج کے طالب علم۔ اس کے بعد جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں ان کے زمانۂ ملازمت میں ... [illegible] ... کافی طویل عرصہ تک ان کے ساتھ حیدرآباد میں ... مقیم رہا۔ جو خاموشی اور سنجیدگی بڑے ہونے کے بعد ان میں دیکھی وہی لڑکپن میں بھی موجود تھی۔ مطالعہ کے علاوہ ... [illegible] ... بھائی صاحب مرحوم کو فضول تفریح اوقات میں حصہ لیتے نہیں دیکھا ... [illegible]

[illegible]

ہم نے ان کے چند روزہ قیام حیدرآباد میں دیکھا کہ ان کا گھر ایک مستقل مہمان خانہ تھا جہاں اطراف ریاست کے طلبہ، غریب و امیر اور اکثر رشتہ دار مہینوں پڑے رہتے تھے۔ ان کو مہمانداری اور دوستی کرنے میں خاص لطف آتا تھا۔ لوگ اپنے اپنے کام سے آتے تھے۔ سبحانی صاحب نے کبھی کسی کے ساتھ ہمدردی کرنے، سفارش کرنے اور ہر ممکن مدد دینے سے گریز نہیں کیا جس کے نتیجے میں کئی لوگ بڑے بڑے عہدوں تک پہنچ گئے۔ ہر ایک اپنے اغراض و مقاصد حاصل کرتا تھا اور اکثر یہ ہوتا تھا سبحانی صاحب کے کبھی کوئی ذاتی اغراض اور مقاصد نہیں رہے، وہ اس سے بے نیاز تھے۔

ہم نے خود دیکھا ہے کہ بلا تفریق مذہب و ملت ہر ایک کی امداد کرتے تھے۔ دامے، درمے، قدمے، سخنے۔ غرض کہ ہر طرح انہوں نے ضرورت مند طلباء اور بیواؤں کی امداد کی اور جو کچھ دوسروں کے لئے کر سکتے تھے، اس سے کبھی گریز نہیں کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ ابتدا ہی سے ان کی عادت تھی اور یہ عادت آخر وقت تک قائم رہی کہ وہ کبھی کسی سے اپنی ضرورت اور تکلیف بیان نہیں کرتے تھے۔ ان کی صحت ہمیشہ بہت اچھی رہی لیکن اگر کبھی بیمار ہوتے تو کوشش کرتے کہ دوسروں پر اس کا اظہار نہ ہونے پائے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تکلیف اور بیماری اس قدر شدت اختیار کر جائے کہ اس کو چھپانا اور پوشیدہ رکھنا ناممکن ہو جائے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں بہ زمانہ قیام دہلی انہیں شدید بخار آیا۔ لیکن اس حالت میں بھی بغیر کسی سے کہے ہوئے ضرورت کے لئے اٹھتے بیٹھتے اور باتھ روم تک جاتے رہے۔ ایک دن رات کو بخار کی حالت میں باتھ روم گئے اور وہاں لڑکھڑا کر گر پڑے۔ سر میں پانی کے نل کی ضرب سے کئی انچ گہرا زخم آیا۔ اس صدمے سے بے ہوش ہو گئے اور حالت بہت نازک ہو گئی۔ میرا بڑا لڑکا محمود ان دنوں مرکز؟ کالج دہلی میں پڑھتا تھا۔ اس کو انجانی؟ پنڈت کیفی نے فوراً بلایا اور پھر مجھے بھی بلایا گیا۔ ظاہر ہے یہ بات دوسروں سے چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اخبارات نے خبر شائع کر دی۔ جب حالت کچھ بہتر اصلاح ہوئی اور ایک دوست عیادت کے لئے تشریف لائے تو انہوں نے شکایت کی کہ مولوی صاحب اگر اخبار میری نظر سے نہ گزرتا تو مجھے آپ کی اس خطرناک علالت کا پتہ بھی نہ چلتا۔ اس وقت تو خاموش ہو رہے لیکن بعد میں محمود پر برہم ہوئے اور بہت ناخوش ہوئے کہ اخبار تک یہ خبر کیوں پہنچائی گئی حالانکہ محمود کا خبر کی اشاعت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آخری زمانے میں لوگ چلنے میں انہیں سہارا دینے کی کوشش کرتے تھے۔ مجبور ہوتے ہوئے بھی انہیں یہ سہارا لینا ناگوار گزرتا تھا۔ وہ دوسروں پر کسی حالت میں بھی اپنی جسمانی کمزوری کو ظاہر کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔

زمانہ ملازمت ریاست حیدرآباد میں جب وہ صدر مہتمم تعلیمات ضلع اورنگ آباد تھے تو ان کا قیام مقبرہ رابعہ درانی میں تھا جہاں رہائش کے لئے ایک چھوٹا سا بنگلہ ان کے قبضہ میں تھا اور دفتر کی عمارت بھی مقبرے کے احاطے میں تھی۔ مقبرے کا وسیع اور خوشنما باغ بھی ان کے فطری رجحان کے پیش نظر سبحانی صاحب کی زیر نگرانی دے دیا گیا تھا اور یہیں وہ نام دیو مالی کام کرتا تھا جس کا ذکر انہوں نے اپنے بڑے بڑے اور مشہور ہم عصروں کے ساتھ کیا ہے۔ اسی زمانہ کا ایک واقعہ مجھے یاد آ گیا جو ان کی طبیعت، مزاج اور حسن فطرت سے لگاؤ اور احترام پر روشنی ڈالتا ہے اور بذات خود دلچسپ بھی ہے۔

سبحانی صاحب کے اسسٹنٹ ایک دفعہ پیشی کر رہے تھے، جب کاغذات کی پیشی ختم ہو گئی تو موصوف اپنے کمرۂ اجلاس کو واپس جاتے ہوئے [illegible] کے میدان سے گزرے جہاں بڑے بڑے خوشنما اور نفیس گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ انہوں نے ایک پھول توڑ کر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ سبحانی صاحب اپنی جگہ بیٹھے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ فوراً ہی چپراسی سے کہا کہ جعفری صاحب (ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولز) کو بلا کر لاؤ۔ چونکہ جعفری صاحب اسی وقت پیشی کر کے گئے تھے انہیں دوبارہ طلبی پر کچھ تعجب ہوا۔ لیکن جب وہ سبحانی صاحب کے پاس پہنچے تو انہیں دیکھتے ہی سبحانی صاحب نے فرمایا کہ "جناب آج آپ کی چوری پکڑی گئی"۔ اس پر جعفری صاحب بہت متعجب ہوئے اور کچھ پریشان بھی۔ سبحانی صاحب نے ان سے جیب میں ہاتھ ڈالنے کو کہا۔ اتفاق سے وہ جیب خالی تھی۔ سبحانی صاحب نے کہا دوسری جیب میں دیکھیے۔ جب انہوں نے دوسری جیب میں ہاتھ ڈالا تو ہری شاخ سے توڑا ہوا پھول برآمد ہوا۔ سبحانی صاحب نے فرمایا کہ آپ نے نفاست [illegible] کیا اور یہ شعر پڑھا:

ہے پھول کی عزت ڈالی سے ٹوٹا تو گلے کا ہار ہوا!
کیا اچھا ہے ایسے سینوں کی جو کے کٹیں بازاروں میں

جعفری صاحب نے فوراً ہی یہ شعر [illegible] لکھ لیا اور [illegible] کے [illegible] ہیں

اور ہم آپس میں ان باتوں کو دہراتے ہیں تو ایک عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے جس کو محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن الفاظ میں بیان کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔

میرے قیام حیدرآباد کے علاوہ وہ میرے پاس بھوپال بھی برابر تشریف لاتے رہے اور یہاں میں نے ان کی بے نیازی، خودداری اور وضعداری کے جو نمونے دیکھے ان کی مثال ملنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ ۱۹۳۹ء میں جب میرا قیام بسلسلۂ ملازمت ریاست بھوپال میں تھا بھائی صاحب نے موسم گرما بھوپال میں گذارا۔ ان دنوں وہ لغت (جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامے میں برباد ہو گئی) کا کام کر رہے تھے اور گورنمنٹ بھوپال نے ان کی مصروفیات اور کام کے پیش نظر ایک بنگلہ ان کے اور ان کے دفتر کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔ لیکن وہ تمام تر فرصت کا وقت میری سرکاری رہائش گاہ پر ہی گذارتے، کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھاتے اور میرے لڑکوں سے دلچسپ اور پر لطف گفتگو کرتے رہتے۔ اسی زمانہ میں وہ محمود اور مولانا محوی لکھنوی کے ساتھ ریاست بھوپال کے خوشنما پہاڑی مقامات دیکھنے گئے اور اجنٹہ کی بھی سیر کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ان کی شہرت ہندوستان کے ہر کونے تک پہونچ چکی تھی اور اردو کے محافظ و مجاہد کی حیثیت سے ہر جگہ ان کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ اس وقت ان کی عمر بھی ۷۰ سال کے قریب پہونچ چکی تھی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود غرور، انانیت، بے پرواہی یا احساس برتری ان کے کسی بھی عمل یا فعل سے ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ زندگی کے معمولات میں کوئی فرق اور کام نیز اردو کی خدمت میں کوتاہی کا کہیں شائبہ تک بھی نہ تھا۔ ایسی استواری اور وضعداری فی زمانہ اگر مفقود نہیں تو نایاب ضرور ہے اور یہی اصل بیان ہے۔

سیہور میں بابائے اردو کے ایک کلاس فیلو خان بہادر سید شوکت علی مرحوم رہا کرتے تھے، جب بھائی صاحب اور دیوان صاحب مرحوم تنہا بیٹھتے اور آپس میں مصروف گفتگو ہوتے تو اس وقت کالج کے طلبا اور ان دو بزرگ ہستیوں میں کوئی فرق نہ معلوم ہوتا تھا۔

خان بہادر مرحوم بظاہر بے حد کفایت شعار معلوم ہوتے تھے لیکن قومی اور خیر کے کاموں میں بہت فیاض تھے۔ خان بہادر صاحب نے بھائی صاحب کی دعوت کی اور آموں کا خاص اہتمام کیا، کیونکہ بھائی صاحب بھی آموں کے بید رسیا تھے۔ بھوپال کا مشہور اور نایاب آم "دتیہ" بھی فراہم کیا گیا۔ دعوت کے بعد بھائی صاحب نے اپنے دوست اور میزبان خان بہادر صاحب سے فرمایا کہ "بھئی کھانے کے بعد جو دکھشنا دی جاتی ہے وہ کہاں ہے"۔ مطلب انجمن کے لئے چندہ تھا۔ بعد میں جب بھائی صاحب اپنی قیام گاہ پر تنہا تھے دیوان شوکت علی صاحب ان سے ملنے گئے اور ایک بند لفافہ بھائی صاحب کو نہایت خاموشی سے دے کر چلے آئے۔ اس لفافہ میں تین سو روپے کے نوٹ تھے۔ کچھ دن بعد سیہور سے روانہ ہونے سے قبل بھائی صاحب مرحوم نے نہایت اچھے کلمات کے ساتھ اس عطیہ کا ذکر ہم لوگوں سے کیا۔

بھائی صاحب کی بے لوث خدمات اور بے مثل ایثار و قربانی نے خود بخود شہرت اور دنیاوی عزت کو ان کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ ورنہ وہ قطعاً نام و نمود کے خواہاں نہیں تھے۔ خاموش رہنا اور خاموشی سے اپنا کام کئے جانا ان کا اصول زندگی تھا۔

وہ دنیاوی معاملات اور جھمیلوں کے اعتبار سے ایک کامیاب انسان نہیں تھے اور اس لحاظ سے انہیں ہوشیار اور سمجھدار آدمی کہا جا سکتا ہے، لیکن جو کام وہ کر گئے اور جس طرح اپنے خاص مشن کے علاوہ خدا کے سینکڑوں بندوں کی امداد اور دستگیری زندگی بھر کرتے رہے ان پر ہر سمجھداری اور ہوشیاری کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

"ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ہوشیار نہ تھا"

ڈاکٹر سید عبداللہ

عبدالحق کا اسلوبِ تحریر

عبدالحق کے اسلوب بیان میں دبستان سرسید کے رنگ تحریر کا حسین ترین روپ نظر آتا ہے۔ کیونکہ انہوں نے سرسید کے نظریہ اسلوب کی سب سے زیادہ پیروی کی ہے اور اس میں سب سے زیادہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اور شاید یہی وہ شخص ہیں جن کے کردار اور ذہنی ساخت کی تشکیل میں سرسید کے قول و فعل نے سب سے زیادہ حصہ لیا ہے اور ان کو اس قابل بنایا ہے کہ وہ اس خواب کی تعبیر کر سکیں جو سرسید نے معیاری انشاء پردازی کے متعلق دیکھا تھا۔

عبدالحق نے زندگی میں بڑے بڑے کام انجام دیئے ہیں۔ چنانچہ علمی تعلیمی ادبی ہر قسم کی خدمات سے ان کے کارناموں کی فہرست پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک کارنامہ قابل توجہ اور قابل ذکر ہے۔ اور ہر ایک ادبی خدمت اپنی جگہ لائق صد ہزار ستائش۔ مگر بہت کم لوگوں نے یہ سوچا ہے کہ ان کا اہم ترین ادبی کارنامہ ان کا صاف ستھرا اور نکھرا ہوا اسلوب بیان ہے جس میں عام مگر فصیح بول چال اور تجربات یوں شیر و شکر ہو گئے ہیں کہ ہم ان کی تحریروں کو حقیقی سادگی اور فطرت کا نمونہ کہہ سکتے ہیں اور ایسی سادگی ہے جو سرسید کے دبستان کے کسی دوسرے فرد کے یہاں نہیں ملتی۔ دوسرے الفاظ میں سرسید نے انشا میں جس سادگی کی دعوت دی تھی اس کی تکمیل اگر کسی نے کی تو عبدالحق نے کی ــــ اور اگر شاعری کی طرح نثر پر سہل ممتنع کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ تو ہم بلا تکلف کہہ سکتے ہیں کہ عبدالحق کا اسلوب ایک نثری سہل ممتنع ہے ــــ اور اس معاملے میں حالی، شبلی، نذیر احمد بلکہ کوئی بھی دوسرا ادیب ان کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔

عبدالحق کے متعلق یہ کہنا غلط نہیں کہ انہوں نے سادگی کو ایک آرٹ بنایا ہے اور یہ آرٹ کسی دوسرے انشاء پرداز کے یہاں نہیں ملتا۔ اور یہ آرٹ ان کی ہر چیز کی تحریر میں پایا جاتا ہے۔ کانفرنسوں کے خطبات ہوں، ریڈیو کی تقاریر ہوں، اخبارات کے مضامین ہوں، کتابوں کے مقدمات اور تحقیقی مضامین ہوں، سب میں یکساں شان کے ساتھ ان کا یہ آرٹ دلوں کو لبھاتا اور روحوں کو تازگی و شگفتگی بخشتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلوب سرسید کی سادگی اور اسلوب عبدالحق کی سادگی میں کیا فرق ہے۔ یہ مسلم ہے کہ سرسید احمد خاں کی تحریریں سادہ ہونے کے باوجود اکثر ناہموار ہوتی ہیں۔ یہ وہ سادگی ہے جس کے لئے میں کرخت سادگی کی ترکیب تجویز کرتا ہوں۔ سرسید زبان و بیان سے بے پروا تھے ناہموار جملے اور بعض اوقات انگریزی کے الفاظ بے ضرورت زبان قلم پر آ جاتے تھے۔ اور ان کی عبارت میں کہیں کہیں غیر معتدل جوش اور تلقین کی کرختگی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کا سبب ان کے مخصوص حالات کی وجہ سے تھا۔ ان کے برعکس عبدالحق کی تحریر نیز سرسید احمد خاں کے جوش و خروش کی بجائے تغزل کا رس گھلا ہوا ہوتا ہے [illegible] سے مراد یہ ہے جو قدرے خشک ہے اور ان کی تحریر کو بعض اوقات بے لذت بنا دیتا ہے۔ اس کے برعکس عبدالحق کی تحریر [illegible] ان کی [illegible] کا لطف انگیز عنصر ہے۔ کیونکہ سکون منطق و ضبط کا نتیجہ نہیں۔ ان کے یہاں [illegible] اور غیر ضروری [illegible] ہے۔ جو [illegible] ان کا ہر [illegible] سے ابھرتا ہے۔ یہ تسلیم شدہ ہے کہ عبدالحق کا فن [illegible] کی جذباتی گرفت سے کم [illegible] نہیں۔ ان کے [illegible]

[illegible]

ایک یادگار تحریر

ایک فلمی گیت کی ٹیپ ہے "انسان بنو"۔ آدمی ارتقا کی بے شمار منزلیں طے کر لی ہیں اور اب جو اُسے میسر ہو گیا ہے کیا اس کا جائزہ لیتے بیٹھ رہ گیا ہے۔ اس پر بھی وہ حقیقی انسانیت سے دور ہے۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے اسے ابھی اور بے شمار منزلیں طے کرنی ہوں گی۔ اپنے قدیم ترین مورثوں سے ورثے میں جو کچھ ملا تھا اس میں کا ایک حصہ ابھی باقی ہے کہ انسانیت اس کے نیچے دب کے رہ گئی ہے۔ کیڑے مکوڑوں مویشی بہائم اور درندوں کے عادات و خصائل دلوں کی تہ میں سے چھپے پڑے ہیں کہ وقت پر یکبارگی چشمے کی طرح پھوٹ نکلتے ہیں۔ چونکہ اس کو عقل بھی ملی ہوئی ہے اس لیے وہ انتقام، خونخواری اور غارت گری وغیرہ میں اپنے قدیم ہم جنسوں سے بازی لے جاتا ہے۔

دنیا میں کیسے کیسے عالم و فاضل، عالی مرتبت ادیب و شاعر، حکیم و فلسفی، بہادر سپہ سالار، نامور فاتح اور جلیل القدر سلاطین گزرے ہیں کہ ان کے کارناموں کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے لیکن ان میں کتنے ہیں جو حُسنِ انسانیت سے آراستہ ہیں؟

آج کل دنیا کی حالت پر نظر ڈالیے۔ دنیا کو چھوڑیے اپنے ملک کو دیکھیے۔ خود غرضی، بے باکی، حُبِ جاہ و منصب، انتقام، لوٹ کھسوٹ، خیانت، بددیانتی، جعلسازی، رشوت، غداری کیا ہے جو یہاں نہیں۔ ذاتی مفاد ملک و قوم کے مفاد پر مقدم ہے۔ اپنی ذات سب کچھ باقی سب ہیچ۔ یہ انتہائی پستی ہے اکثر قومیں اور سلطنتیں اسی پستی کی نذر ہو گئیں۔

فلمی گیت کہتا ہے "انسان بنو"
مرزا غالب فرماتے ہیں، "آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"
حالی کہتے ہیں "فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ"

کیا یہ فی الحقیقت ایسی نایاب شے ہے؟ کیا ہمارے مدرسوں کالجوں یونیورسٹیوں میں کہیں انسان گری نہیں سکھائی جاتی؟ کیا دستور ساز اسمبلی، کابینہ، پارلیمان میں اس کے حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ہے؟ اگر انسانوں کے یہ ادارے انسانیت سکھانے سے قاصر ہیں تو اس کے حصول کی کیا صورت ہے؟ غور کرنے کی بات ہے!

(۱۰ر اکتوبر ۱۹۵۴ء)

بابائے اردو کی تاریخ پیدائش

اردو کی تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی
ہیں دن مہینہ اور سال سب میں اختلاف رائے ہے کسی نے یہ تاریخ ۲۰ اپریل
ء لکھی ہے اور کسی نے ۱۸۷۲ء لیکن یہ دونوں تاریخیں صحیح نہیں ہیں۔
ہے ایک ایسی دستاویز دستیاب ہوگئی ہے جو اس سلسلہ میں حرف آخر کی حیثیت
رکھتی ہے۔ ذیل میں ایک فارم کا عکس شائع کیا جارہا ہے جس کی خانہ پوری
بابائے اردو نے اپنے قلم سے کی ہے اور تاریخ پیدائش ۲۰ اگست ۱۸۷۰ء لکھی ہے۔

FORM OF APPLICATION FOR AN ARMS LICENSE.

1. Name of applicant. Abdul Haq
2. Father's Name. Ali Hasan
3. Home Address. Hapur
4. Present Address. 1, Daryaganj, Delhi
5. Date of birth and age. 20th Aug 1870
6. Nature of employment and pay Retired Education Service, Hyd[illegible]
7. Income Tax ~~and/or Land Revenue~~ (Score out what does not apply) paid during the Last Year

   Kind of weapon required

9. Purpose for which required Self protection & Shikar
10. Has applicant an arms license at present? If so, give details
11. Was applicant ever refused a license? If so, give details.
12. Has any license ever been cancelled? If so, give details
13. If applicant has never had a license, how has need now arisen
14. Any claims for special consideration.

I declare that the above particulars are true.

Signature. Abdul Haq

Date 6 May. 1947

[illegible] حالی [illegible]
ایسی نثر کا اتالیق قرار دیا ہے۔ مگر میری رائے میں یہ درست ہے کہ عبدالحق کی نثر حالی کی نثر کے مقابلے میں زیادہ سہل ہے۔ [illegible]
مقالہ کہا ہے مگر عبدالحق حالی کے مقلد نہیں [illegible] حالی کے بیان میں [illegible] ۔ [illegible] مگر عبدالحق کی [illegible]
اور صاف گوئی ہے۔ [illegible] حالی کے یہاں [illegible] حالی کے یہاں بھی نہیں اور ان کی نثر میں تاثیر بھی ہے۔ مگر ان کی تحریر [illegible]
ہوا ہے اور [illegible] پڑھنے والے کا دل [illegible] ہو جاتا ہے مگر عبدالحق کا خلوص اور سچائی ایسی ہے کہ ان کی سخت سے سخت بات بھی بھلی معلوم ہوتی ہے [illegible]
کو پڑھ کر دل کو خوشی اور دماغ کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عبدالحق نے نثر کو نثر ہی رکھا ہے [illegible] نثر نگاروں کی طرح شاعرانہ وسائل سے بہت کم کام لیا ہے۔ ہمارے بہت سے انشا پرداز ایسے ہیں جو نثر میں شاعری کرنے لگے ہیں۔ مگر عبدالحق کی نثر مکمل طور پر نثر ہے وہ شبلی کی طرح انہوں نے استعارات کا سہارا ڈھونڈا ہے نہ آزاد کی طرح رنگین [illegible] سے [illegible] ہے نہ تشبیہوں سے [illegible] عبارت کو سجایا ہے [illegible] تخیل کے شاعرانہ اسلوب [illegible] سے عموماً اجتناب کیا ہے [illegible] اپنی نثر میں قوت پیدا کرتے ہیں البتہ خطبات میں یہ نظر آتا ہے کہ ضرب الامثال یا برمحل لطائف و حکایات سے مخاطبوں کو محظوظ بھی کیا ہے اور ان کو موضوع کی طرف متوجہ بھی کیا ہے۔ ان کے خطبات کی تمہیدیں بالعموم عمدہ ہوتی ہیں جہاں انہیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ ان کے استدلال نے فضا میں خشکی کی کیفیت پیدا کر دی ہے [illegible] اپنی زندگی کے کسی تعجب انگیز تجربے کو واقعہ کی صورت دے کر یا کسی ضرب المثل سے کہانی بنا کر ماحول میں دلکشی اور انبساط کی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں ان کی تمہیدیں ان کے سارے مضمون کو بھینی بھینی خوشبو سے معطر کر دیتی ہیں۔

عبدالحق کی تحریروں میں صاف گوئی کا عنصر نمایاں ہے مگر ان کے طنزیہ نشتر اس صاف گوئی کے باوجود سیدھی سادھی باتوں کے اندر [illegible] شگفتہ انداز میں ابھرتے ہیں۔ عبدالحق کی نثر قول و فعل کے تضاد پر بہت پڑتی ہے اسی لئے ان کی طنزیات کا نشانہ [illegible] فریب کارانہ اور ریاکارانہ استدلال ہے۔ وہ فریب استدلال کے سخت مخالف ہیں مگر ان کی مخالفت میں بھی دلکشی کی ادا پائی جاتی ہے۔ چنانچہ قول و فعل کے جو تضادات انہیں اخبار میں نظر آتے ہیں ان پر ان کے یہ نشتر آہستہ آہستہ چلتے ہیں اور بڑا مزہ دیتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ عبدالحق کو طنز سے زیادہ اپنی دلیل پر اعتماد ہوتا ہے اور وہ طنز یا تعریض کے مقابلے میں صاف صاف بات کہنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

خطبات عبدالحق بڑا مقبول مجموعہ ہے۔ ان سب خطبات کا لب لباب یہ ہے کہ قومی زبان زندگی اور تہذیب کا ایک لازمی جزو ہے۔ وہ زبان کی تاریخ اور زبان کی ——— قومی و ثقافتی اہمیت پر بار بار زور دیتے ہیں۔ اور ہر مرتبہ نیا پہلو، نیا انداز، تازہ پیش کرتے ہیں۔ ان کا ہر خطبہ کسی علمی مطالعہ [illegible] کسی فصیح و خوش بیان وکیل کا تیار کیا ہوا عرضی دعویٰ یا جواب دعویٰ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے خطبات اس لحاظ سے ایک نصف صدی کے سیاسی اور لسانی [illegible] ہندوستان کی ایک دلچسپ داستان بھی ہیں اور خود عبدالحق کی سیرت، شخصیت اور ان کی طویل جدوجہد کی ایک سرگزشت بھی۔ ان سب باتوں کی وجہ سے عبدالحق کے خطبات اور تقاریر کو بڑی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ ان میں کمال سادگی بھی ہے اور وسعت نظر اور ہمہ گیری بھی۔ اور وہ سب کچھ بھی ہے جو عبدالحق کی [illegible] میں بڑی [illegible] نظر آتا ہے ——— بات کی برجستگی اور دلیل کی پختگی ان کی شخصیت کا وصف خاص ہے اور یہ چیز ان کی تحریروں میں بھی ہے اگرچہ ان کی شخصیت کے بے شمار اوصاف اور بھی ہیں جو اس مضمون میں واضح نہیں ہو سکتے۔

خطبوں اور تقریروں کے علاوہ عبدالحق کی تحریر کا ایک رنگ وہ بھی ہے جو ان کے تحقیقی مقالات میں ہے۔ یہ مسلم ہے کہ تحقیقی طرز تحریر زیادہ [illegible] معین اور قطعی اور زیادہ متعین ہوتا ہے اس میں حوالے کی پابندی لازمی ہے اس میں انشا پردازی کے مواقع نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ اور سائنسی قسم کا [illegible] ناگزیر ہے اسی لئے عام [illegible] مضامین [illegible] عبدالحق کی تحقیقی تحریروں میں بھی دلچسپی کی کمی نہیں۔ [illegible] مضامین کی طرح ان [illegible] کی منطقی ترتیب [illegible] عبارت کو روانی اور دلچسپ بناتی ہے [illegible] مضامین بھی [illegible] بالکل ایک [illegible]

[illegible]

... بعد کہتے کہ تاریخی ... بیان کو ... فہرست ... تفاصیل سے بوجھل نہیں ہونے دیتے چنانچہ واقعاتی تفصیلیں بھی کہانی کا مزہ دیتی ہیں۔

مقدمات عبدالحق کی اردو ادب میں یہ خاص اہمیت ہے کہ اس سے مقدمہ نگاری کا ایک اسلوب خاص ایجاد ہوا ہے۔ اگرچہ ہماری زبان میں مقدمے طول اور اختصار کی کمی نہیں مگر مقدمہ نگاری کو ایک خاص فن بنانے والے حضرت عبدالحق ہیں۔ بعض لوگ مقدمہ نگاری کو آسان چیز سمجھتے ہیں مگر یہ ان کی بھول ہے۔ تبصرے اور مقالے کے مقابلے میں مقدمہ نگاری کی ذمہ داریاں اور دشواریاں بہت زیادہ ہیں جن پر عموماً غور نہیں کیا جاتا۔ مقدمہ دراصل تبصرے سے طویل اور مقالے سے مختصر جسم کا ایک مضمون ہوتا ہے۔ جو لوگ مقدمے کی ضخامت اور اس کی ہیئت کا خیال نہیں رکھتے وہ عموماً مقدمے کو یا بے حد تشنہ یا بے حد خشک بنا دیتے ہیں۔ مقدمہ نگاری میں تنقید جیسی خشک چیز بھی دلچسپ ہو کر سامنے آنی چاہیے ورنہ کتاب کا تعارف ناکام رہے گا۔ اسی طرح مقدمہ تبصرہ بھی نہیں ہوتا۔ تبصرے میں جزئیاتی تفصیل قدرے طویل تر ہوتی ہے۔ اور اس کے مطالعے کے لئے قدرے طویل وقت کی گنجائش ہے۔ مقدمہ کو جزئیاتی تفصیل سے گرانبار نہ ہونا چاہیے مولوی عبدالحق نے ان سب باتوں کو مدنظر رکھا ہے اور اس معاملے میں بہت کم لوگ ان کے درجے تک پہنچ سکے ہیں۔

عبدالحق کے مقدمات تاریخ ادب اردو کے بعض اہم اختلافی مسائل میں قول فیصل کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے مقدمات کے تنقیدی حصے میں ادب کو اس کے اپنے مخصوص مزاج اور ماحول کے مطابق جانچا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ نئے انداز تنقید کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ انہوں نے عقلی اور تاثراتی انداز نظر کو یکساں طور سے برقرار رکھا ہے مگر ان کی غایت صحیح واقعہ کی تلاش اور کتاب کے حسن کا تجزیہ ہے۔

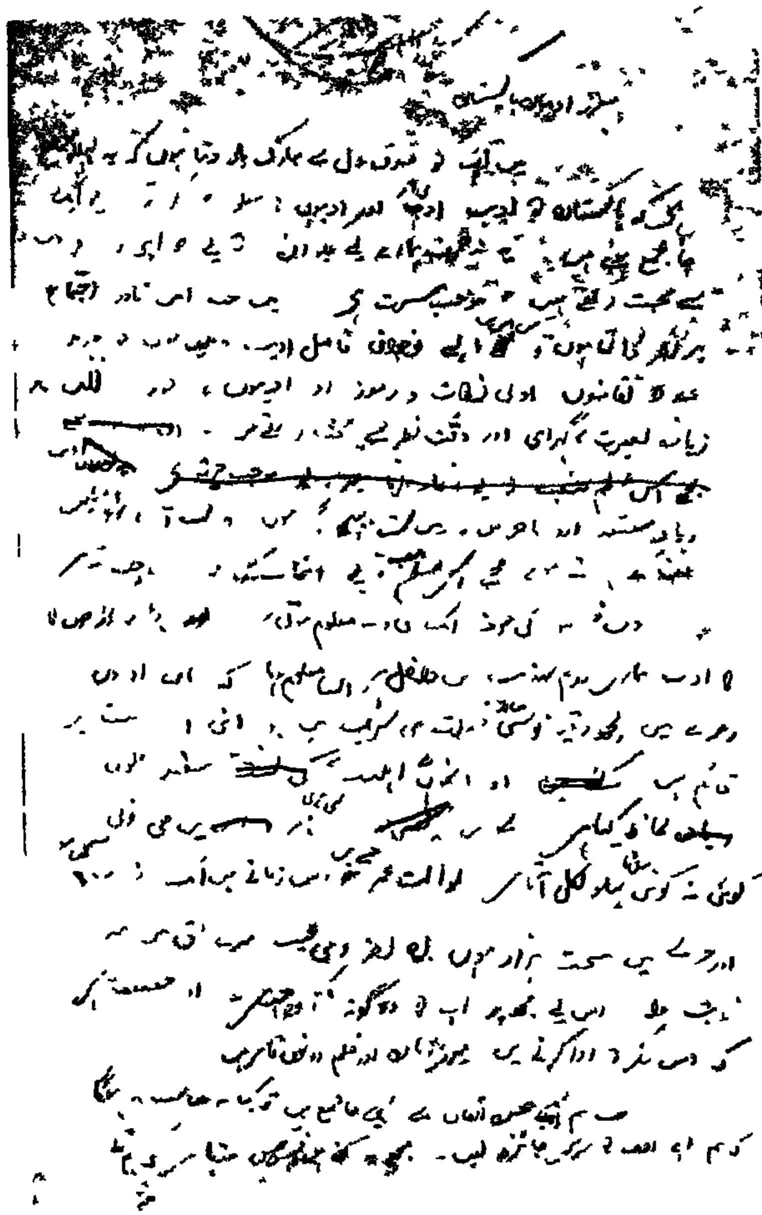
یہ ہیں چند خدوخال مولوی عبدالحق کے اسلوب تحریر کے جن کی ترتیب میں میں نے صرف اشاروں سے کام لیا ہے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی بھرپور زندگی کی مصروفیتوں کے اندر رہ کر بھی کتنا وقیع اور جاندار سرمایۂ ادب پیدا کیا ہے اور یہ دیکھ کر اور بھی حیرت ہوتی ہے کہ ان کی تحقیق کتنی صائب اور ان کی تنقید کتنی برمحل ہوتی ہے۔ اور ان سب سے زیادہ ان کی تحریر کتنی رواں اور الجھنوں سے پاک ہے ظاہر ہے کہ یہ سب اوصاف لامثال لگن اور غیر معمولی جانفشانی اور عشق کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتے۔ اسلوب میں حالی کا انداز انہیں بہت پسند آیا ہے مگر جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں وہ حالی مزاج ہیں ان کے مقلد نہیں اور یہی ان کا طرۂ امتیاز ہے اور ان کی یہی انفرادیت ان کو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گی۔

O

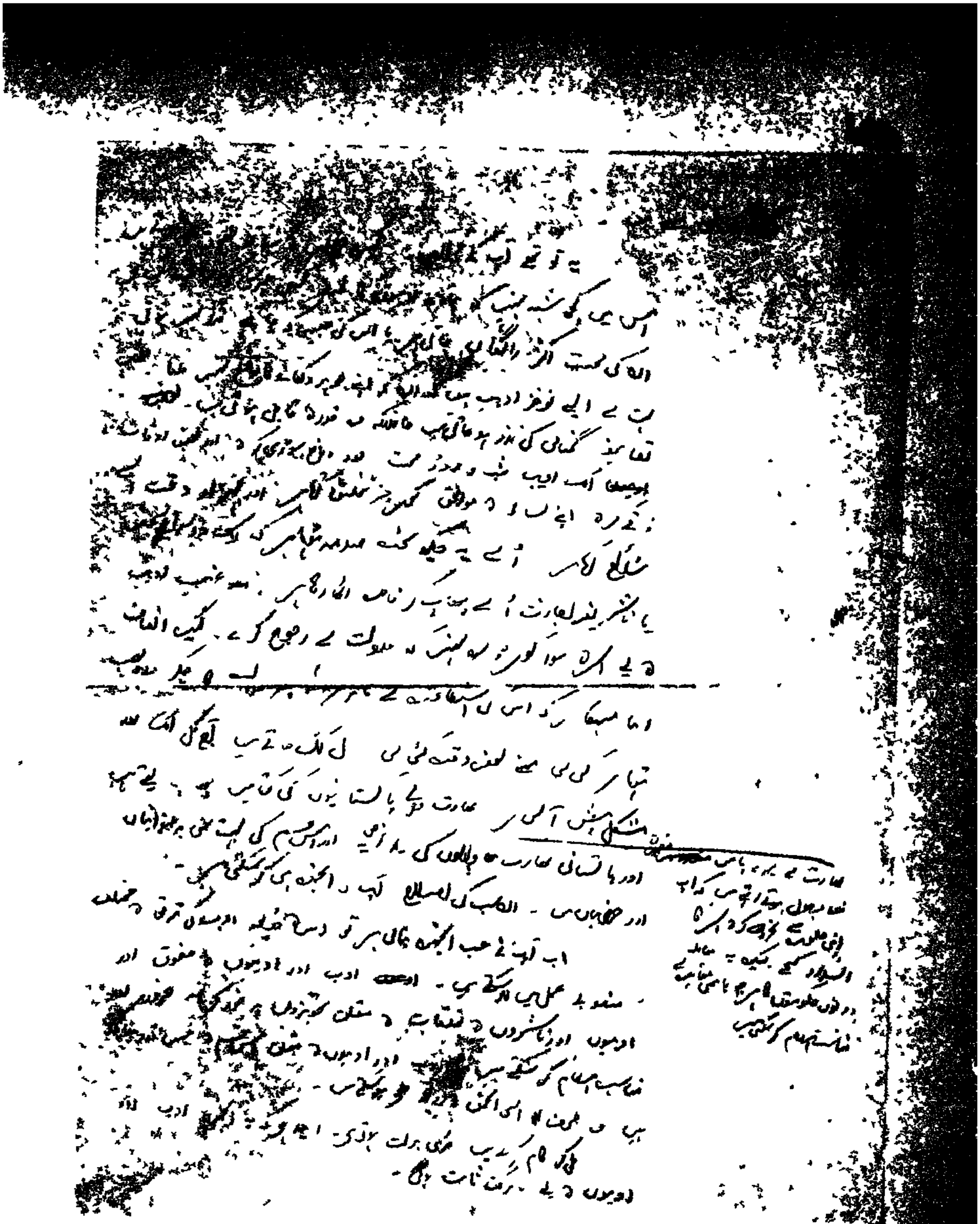
علم ادب اسی قدر وسیع ہے جس قدر حیات انسانی۔ اور اس کا اثر زندگی کے ہر شعبے پر پڑتا ہے۔ وہ نہ صرف انسان کی ذہنی، معاشرتی، سیاسی ترقی میں مدد دیتا اور نظریں، وسعت، دماغ میں روشنی، دلوں میں حرکت اور خیالات میں تغیر پیدا کرتا ہے۔ بلکہ قوموں کے بنانے میں ایک قوی آلہ ہے قومیت کے لئے ہم خیالی شرط ہے اور ہم خیالی کے لئے ہم زبانی لازم۔ گویا یک زبانی قومیت کا شیرازہ ہے جو اسے منتشر ہونے سے بچائے رکھتا ہے۔

(بابائے اردو مقدمات حصہ دوم ص ۲۰۴)

O



۳۱ - جنوری ۹۵۹ء کو ادیبوں کے کنونشن میں بابائے اردو نے جو خطبۂ صدارت پڑھا تھا اس کے مسودے کا پہلا صفحہ



خطبہٴ صدارت کا آخری صفحہ

چند ہم عصر

آدمی کے لئے آدمی کی پرکھ سے زیادہ دشوار کام شاید کوئی نہیں۔ کہ وہ جتنا باہر سے نظر آتا ہے اس سے زیادہ اندر چھپا رہتا ہے۔ اس کے اس چھپے ہوئے حصے کو دیکھ سکنے اور اس کا پورا بھید جاننے کے لئے دیکھنے والے کو ظاہری نظر سے کہیں زیادہ دل کی آنکھ اور بصیرت سے کام لینا پڑتا ہے اور یہ بصیرت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی۔ آدمی نے زندگی میں جو کچھ دیکھا ہے، یا اس کے ظاہر و باطن کا جو مشاہدہ کیا ہے اس کا ذکر اس کی عادت ہے۔ اس عادت نے طرح طرح کی صورتیں اختیار کی ہیں۔ اور تحریر میں یہی عادت ادب کی گوناگوں اصناف کی تخلیق کا باعث بنی ہے۔ ان ہی اصناف میں سے ایک سیرت نگاری ہے جس کے ذریعہ ادیب ان شخصیتوں کی شخصیت کی تصویریں الفاظ میں کھینچتا ہے۔ جنہیں اس نے دیکھا بھالا اور جانا پہچانا ہے اور اس طرح کھینچتا ہے کہ ظاہر اور باطن دونوں کے رنگ ابھر کر شخصیت کے مکمل نقش کو یوں اجاگر کر دیں کہ اس کا صحیح عکس آنکھوں میں پھر جائے اور پورا نقش دل میں بیٹھ جائے جس شخص کی سیرت اور شخصیت کا ذکر اور بیان ہو رہا ہے وہ اسی طرح ہماری نظر کے سامنے آجائے اور ہمارے دل میں گھر کر لے جیسے ہم نے اسے خود دیکھا بھالا، سمجھا بوجھا اور پرکھا ہے۔ "آدمی خواہ نیکیوں کا پتلا ہی کیوں نہ ہو، فرشتہ نہیں ہو سکتا، اس لئے سیرت نگاری کا کمال یہ ہے کہ اس کی نظر اوصاف کے ساتھ ساتھ ان کمزوریوں پر بھی ہو جو انسان کو فرشتہ ہونے سے بچاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ سیرت کشی اور سیرت نگاری کسی کی بھی ہو، ایسی ہونی چاہیئے کہ ہم اس شخص کو بغیر جانے بھی پوری طرح جان سکیں اور اس کے لئے سب سے پہلی اور سب سے ضروری شرط یہ ہے کہ سیرت نگار اس شخص سے پوری طرح واقف ہو جس سے دوسروں کو واقف کرانا چاہتا ہے۔ اور کام کی دشواری کا آغاز یہیں سے ہوتا ہے۔

دشواری کی بنا صرف یہی بات نہیں کہ سیرت کشی کے لئے شخصیت کا مکمل علم اور وقوف ضروری ہے۔ اور اس کا حاصل کرنا بڑا دشوار ہے بلکہ بعض اور باتیں بھی ہیں جو سیرت کشی کے کام کو دشوار اور نازک بناتی ہیں۔ ان میں ایک بڑی بات یہ ہے کہ سیرت نگار جب تک اپنے موضوع یعنی وہ شخص جس کی سیرت لکھنی مقصود ہے، اسے جذباتی تعلق نہ پیدا کر سکے اور جب تک اس کی زندگی کے حالات اور سیرت کے مختلف پہلوؤں کو شخصی انداز میں نہ دیکھے، شخصیت اور سیرت کے لطیف نقش نہیں ابھر سکتے لیکن جذباتی تعلق اور شخصی انداز نظر تعریف میں جانبداری پیدا ہو جانے کا بڑا خطرہ ہے اور یہی کام کا وہ پہلو ہے جسے میں نے دشوار اور نازک کہا ہے۔

مولوی عبدالحق نے اپنے بہت سے ہم عصروں کی سیرتیں لکھی ہیں۔ یہ سیرتیں "چند ہم عصر" کے نام سے کتابی صورت میں چھپ چکی ہیں۔ کتاب میں کل ۲۴ سیرتوں کا ذکر ہے۔ ان میں سے ایک (یعنی دفتر میر غالب مرزا حیرت) مولوی صاحب کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ باقی ۲۳ سیرتیں جن میں سے کچھ مختصر ہیں اور کچھ طویل، لیکن یہ سب کی سب مولوی صاحب کے معاصرین کی ہیں اور ایسے معاصرین کی جنہیں مولوی صاحب نے قریب سے دیکھا ہے۔ اور جن کے ساتھ کسی نہ کسی بنا پر ان کا جذباتی تعلق ہے جس کا انہیں ذکر کر چکا ہوں مولوی صاحب کی [illegible] سیرتیں [illegible]

کی طرف رخ کرتا ہے تو وہ ایک مسلک خود اپنے تعارف ادبی میں قدم رکھتا ہے۔ اسی بنا پر وہ تحقیق کی اس وادی کی دشواریوں کا ذکر انہوں نے سر سید احمد خاں کی سیرت میں کیا ہے۔ سر سید احمد خاں کی سیرت ان الفاظ سے شروع ہوتی ہے۔

"تصویر جس قدر بڑی اور شاندار اور نفیس ہوتی ہے اسی قدر اسے پیچھے ہٹ کر دیکھنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس کے خدوخال واضح طور پر نمایاں ہو سکیں اور صناع کے کمال اور تصویر کے حسن و قبح کا صحیح اندازہ ہو سکے۔ یہی حال بڑے لوگوں کا ہے جنہوں نے دنیا میں کسی نہ کسی حیثیت سے کارنمایاں کئے ہیں۔ ہم عصر بے لاگ رائے دینے سے قاصر رہتے ہیں ان میں موافق بھی ہوتے ہیں اور مخالف بھی (وہ آدمی ہی کیا جس نے کچھ مخالف پیدا نہ کئے) موافق مخالف دونوں مبالغہ کرتے ہیں۔ ان میں مخلص بھی ہوتے ہیں اور ریاکار بھی۔ خود غرض بھی ہوتے ہیں اور بے نفس بھی۔ رائے کے جانچنے کے بہت کچھ دیکھنی پڑتی ہے۔ ہم عصر کیسا ہی بے لاگ ہو اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک مدت کے بعد جب یہ مخالفتوں اور حمایتوں کا گرد و غبار چھٹ جاتا ہے۔ تو اصل حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

سر سید ہماری قوم کے بہت بڑے مصلح گزرے ہیں۔ ان کی وفات کو اس وقت پچاس سال سے اوپر ہوتے ہیں ..... اب نہ وہ عقیدت مند ہی رہے جو ان کی ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہتے تھے اور نہ وہ مخالف، جو ان کے ہر کام کو ریاکاری، خوشامد اور اسلام دشمنی پر محمول کرتے تھے۔ اس لئے بے لاگ مورخ کے لئے موقع ہے کہ وہ اس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں۔ لیکن چونکہ مجھے کئی سال تک ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے۔ اس لئے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انہیں کیا پایا اور وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔"

مولوی صاحب نے اس عبارت میں سیرت نگاری کی جس دقت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم عصر کے لئے بے لاگ رائے دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ اپنے زمانے کے حالات و خیالات اور الجھنوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ لیکن اس کے ساتھ انہوں نے ضمناً کچھ باتیں ایسی بھی کہہ دی ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے نزدیک سیرت کشی اور سیرت نگاری کے شرائط کیا ہیں۔ عبارت کے آخری ٹکڑے کے جو اجزا مختلف حیثیتوں سے ان کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہیں، یہ ہیں۔

۱۔ بے لاگ مورخ کے لئے موقع ہے کہ وہ اس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھ کر ان کی زندگی اور ان کے کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائے۔

۲۔ یہ بڑی محنت اور فرصت کا کام ہے اور شاید میں اس کا اہل بھی نہیں۔

۳۔ لیکن چونکہ کئی سال ان کو پاس سے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا ہے اس لئے صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ میں نے انہیں کیا پایا وہ کس کردار اور سیرت کے انسان تھے۔

ان جملوں میں کئی چھوٹی چھوٹی لیکن اہم باتیں موجود ہیں۔

(الف) مورخ کو بے لاگ ہونا چاہیئے۔

(ب) اسے اس عہد کی تاریخ اور ماحول کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔

(ج) زندگی اور کاموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھانی چاہیئے۔

(ج) [illegible]

(ق) انہیں کئی سال تک ان کے پاس رہنے دیکھنے اور ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملا۔

(د) جو کچھ دکھانا مقصود ہے کہ میں نے نہیں کیا یا پایا۔ یعنی ان کو ملنے میں ذاتی دلچسپی ہے۔)

مولوی صاحب کی لکھی ہوئی سیرتوں کا مطالعہ اور ان کا تجزیہ کرنے کے بعد جو باتیں واضح طور پر پڑھنے والے کے سامنے آتی اور اسے متاثر کرتی ہیں، وہ یہی ہیں کہ مولوی صاحب نے ان ۲۴ سیرتوں میں اشخاص اور افراد کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بے لاگ انداز میں کہا ہے۔ اپنی ذاتی پسند اور ناپسندیدگی کو حق اور سچ کا پردہ نہیں بننے دیا۔ جس شخص کے متعلق کچھ کہا اس سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد کہا۔ مشاہدے نے جو کچھ دکھایا اسے مطالعے سے تقویت پہنچائی۔ عہد کی تاریخ اور ماحول کو شخصیت اور سیرت کا آئینہ دار بنایا۔ مواد کی فراہمی میں جستجو اور کاوش سے کام لیا۔ اور اس مشاہدے، مطالعے اور تجزیئے کے بعد اشخاص اور افراد کی زندگی اور کارناموں کی صحیح تصویر کھینچ کر دکھائی۔

مولوی صاحب نے سیرتوں کے مشاہدے، مطالعے، اور تجزیئے میں اچھائی اور برائی دونوں پر نظر رکھی ہے اور سیرت کے نقش کو مکمل اور شخصیت کی تصویر کو صحیح بنانے کے لئے دونوں پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔ ذاتی لگاؤ یا شخصیت کی عظمت سے متاثر ہوئے بغیر برائیوں کے ذکر میں بھی اسی بے تکلفی، بیباکی اور صفائی سے کام لیا ہے جیسے اوصاف کے بیان میں، اور یوں ان کی سیرتوں میں گو خوبیوں کا رنگ غالب ہے اور یہ خوبیاں ممدوح کو ہماری نظر میں محبوب بھی بناتی ہیں لیکن ہم یہ کہیں محسوس نہیں کرتے کہ مولوی صاحب کی مدح و ثنا قصیدہ بن گئی ہو۔ برخلاف یہ ضرور ہوتا ہے کہ ہم بڑے سے بڑے آدمی کا حال پڑھ کر بھی اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ آدمی خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، وہ بہرحال آدمی ہے اس لئے خطا و قصور بغیر اس کی شخصیت ادھوری رہتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ انہیں خطاؤں اور خامیوں سے محبوبی کی شان ابھرتی اور اجاگر ہوتی ہے۔

حیدرآباد کے جلسے تعزیت سید محمود مرحوم پر جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ بھی تھے:۔

"اس عزیز کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے:

دستور دنیا میں نہ کہیں خالص نیکی پائی جاتی ہے اور نہ خالص بدی، اسی طرح انسان بے عیب ہوا ہے نہ ہوگا . . . ."

عزیز مرزا مرحوم کی خوبیوں کا ذکر کرتے کرتے یہ جملہ لکھا ہے:۔

". . . . . لیکن آخر میں حیدرآباد کی زندگی نے ایک خفیف سا نقص خوشامد پسندی کا پیدا کر دیا تھا مگر بے عیب ذات خدا کی ہے . . . . "

مولوی سید علی مرحوم کے متعلق لکھتے ہیں:۔

". . . . . لیکن جب ان کے کام پر نظر ڈالی جاتی ہے تو افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان کے علم کے مقابلے میں ان کا عمل بہت ہی کم تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ طبعاً جفاکش اور علمی کام کی طرف کم راغب تھے۔ دوسرے دکن کی آب و ہوا اور خاص کر یہاں کے حالات اس وقت کچھ ایسے تھے کہ آدمی کتنا بھی ہو تو کچھ نہ کر سکے . . . . . "

اور آگے چل کر کہتے ہیں:۔

[illegible]

[illegible] باتیں کر [illegible] جن کی [illegible]

..... [illegible]

[illegible] نے ان کے وقت [illegible]

[illegible] اس قدر اطمینان نصیب [illegible]

[illegible] اور اہل تھے:

[illegible] زندگی پر تبصرہ کرکے اپنی بات کا رخ ایک اہم اخلاقی نکتے کی طرف موڑتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انسان اگر ٹھنڈے دل سے اپنی زندگی کے واقعات پر نظر ڈالے تو اسے معلوم ہوگا کہ وہ مقاصد جن کے لئے وہ مدت تک سرگرداں و حیران رہا، وہ آرزوئیں جن کے خاطر کھانا پینا اور سونا حرام ہو گیا اور وہ کوششیں جن کے لئے اس نے اپنی جان تک کھپادی، پانی کے بلبلے سے زیادہ ناپائیدار اور مکڑی کے جالے سے زیادہ بودی تھیں، اور کچھ انہیں کاموں کو بقا حاصل ہے جن پر بہت کم وقت صرف ہوا اور شاید ضمنی طور پہ کئے گئے تھے۔"

خواجہ غلام الثقلین کے مختصر حالات میں ان کے اوصاف کا ذکر اور کارناموں کا بے لوث جائزہ ہے۔ اس میں یہ جملہ آتا ہے۔

"لیکن افسوس کہ کچھ تو ان کے تلون کی وجہ سے اور زیادہ تر کانفرنس کی بے اعتنائی اور مالی دقتوں کی وجہ سے انہیں اس پیشے کو خیرباد کہہ دینا پڑا۔"

حکیم امتیاز الدین کی وفات پر ایک خط میں ان کا ذکر کیا ہے جو مشکل سے دو صفحوں کا ہے۔ اس کے شروع میں دو جملے آتے ہیں:-

"اگرچہ طبیعت کا کمزور اور لاابالی تھا مگر دوستی کا سچا اور وضع کا پکا..... اس میں ہر بات انتہائی تھی۔ محبت تھی تو انتہا درجے کی، عداوت تھی تو انتہا درجے کی۔ میانہ روی سے وہ بالکل آشنا نہ تھا۔"

مولانا وحید الدین سلیم سے مولوی صاحب کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان کے انتقال پر انہوں نے لکھا تھا۔

"مولانا سلیم کے انتقال سے اردو ادب کی صف میں ایک ایسی جگہ خالی ہو گئی ہے جس کا پر کرنا آسان نہیں..... ان جیسا ادیب سارے ملک میں کوئی نظر نہیں آتا۔"

لیکن ان کی بعض کمزوریوں کی طرف اس طرح اشارہ کرتے ہیں۔

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے... جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے...! اور جو جی چاہتا کر گزرتے تھے... باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔"

سر سید [illegible] سب سے بڑے مصلح [illegible] ہندوستان کے مسلمانوں میں ان [illegible] لیکن ان کی [illegible] سے کام نہیں لیتے۔ نواب محسن الملک کے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سرسید نے [illegible] کر دی ہے۔

• اس [illegible] بے [illegible]

[illegible] ہیں کہ آج تک اس سے نجات نہیں ملی :

مولوی صاحب نے ان مختلف عظیم اور متعدد شخصیتوں کی زندگیوں کا مطالعہ کرکے ان کی سیرت کی ایک واضح، سچی اور مکمل تصویر بنانے کی کوشش کی ہے ظاہر ہے کہ اس صورت میں اچھائیوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ان کی کمزوریوں کا ذکر بھی ضروری تھا۔ جو ہر انسان میں ہوتی ہیں۔ لیکن مولوی صاحب نے ان کمزوریوں کا ذکر جس سادگی سے کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کمزوری کو انسانی فطرت کا ایک لازمی حصہ جانتے ہیں اور اس لئے یہ ہرگز نہیں سمجھتے کہ کسی کی ایک یا چند کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وجہ سے اس کے تمام اوصاف پر پردہ پڑ جاتا ہے یا ان کارناموں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے جو اس شخص نے دوسروں کے لئے انجام دیئے۔ یہ صحیح ہے کہ سیرت نگار کی حق بینی اور راست بازی کا تقاضا ہے کہ وہ شخصیت کے اچھے پہلوؤں کے ساتھ برے پہلوؤں کو بھی نمایاں کرے لیکن بحیثیت سیرت نگار کے اس کا منصب یہ بتانا بھی ہے کہ اس نیک شخص کی نیکی کے راستے میں کیا کیا چیزیں حائل تھیں کہ وہ اگر یوں حائل نہ ہوتیں تو اس سے بھی بڑے کام کر تا جیسے اس نے کئے۔ یہ بات سیرت نگار میں مشاہدے اور مطالعے کے علاوہ تجزیہ کرنے کی عادت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ مولوی صاحب کی سیرت نگاری کے فن کا سب سے بڑا وصف تجزیہ کر کے صحیح نتائج اخذ کرنے کی یہی عادت ہے اور اس عادت نے ان کی سیرت نگاری کو ادبی فن میں کئی خوبیاں اختیار کی ہیں۔

ان میں سے ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ بڑی خوبصورتی سے کسی شخص کے اوصاف کو یوں ایک ہی جگہ جمع کر دیتے ہیں کہ چند جملوں میں شخصیت کا نقش ابھرتا اور اس کے مختلف پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں چند مثالوں سے ان کے اسلوب سیرت نگاری کی اس خصوصیت کا اندازہ کیجئے۔

• وہ ایک پارسا صفت، درویش منش، صوفی مشرب اور بالغ نظر حکیم تھا.... . وہ اپنے اخلاق فیاضی اور بے تکلفی کی وجہ سے ادنیٰ اور اعلیٰ ہر طبقہ اور ہر ملت کے لوگوں میں مقبول تھا۔ (سید محمود)

• غرض مولوی صاحب مرحوم ایک کم سخن، خاموش طبع، فلاسفر مزاج، کوہ وقار، عالی خیال شخص تھے : (مولوی چراغ علی)

• ایک صائب الرائے، معتدل مزاج، بے لاگ اور باخلوص کام کرنے والے کا شخص بہا [illegible] ہے۔ (خواجہ غلام الثقلین)

• ان کا ذہن ایسا رسا، ان کی طبیعت ایسی حاضر، ان کے اوسان ایسے بجا اور [illegible] پر ایسا عبور تھا کہ پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو باتوں باتوں میں سلجھا دیتے تھے : (محسن الملک)

• ان کی اخلاقی جرأت، آزادیٔ خیال، انصاف پسندی، بے تعصبی، فیاضی اور ہمدردی کے [illegible] سب قائل تھے : (سرسید)

• سرسید کی کامیابی کا راز ان کے شوق میں تھا [illegible] سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ [illegible] [illegible] [illegible] ہو ہے

[illegible] کام کی اصل غرض حق شناسی، دیانت، صداقت، وفاداری، انصاف، ہمدردی، ایثار، انسان کا اصلی جوہر یہی ہیں۔ ان سب میں ایثار کا درجہ سب سے اعلیٰ ہے۔ یعنی ذاتی اغراض پر قومی مفاد کو ترجیح دینا، اپنے مصیبت زدہ کو، درد کو اپنا دکھ درد سمجھے، انتہا یہ کہ اپنے آپ کو بھول جائے۔ انسانیت اسی سے عبارت ہے۔"

(سرسید)

مولوی صاحب اپنے موصوف اور ممدوح، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ موضوع کی صفات کبھی کبھی تو یکجا کر دیتے ہیں اور کبھی ایک صفت کا ذکر کرتے اور اس کی تائید میں واقعات بیان کرتے ہیں جو ایک قسم کی دلیل کا کام دیتے اور ان کو مؤثر اور جاندار بنا دیتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کئی چیزیں مل جل کر حصہ لیتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"آدمی کو کچھ تو ورثے میں باپ دادا سے ملتا ہے، کچھ تعلیم و تربیت اور ماحول سے اور کچھ اپنی سعی اور ارادے سے۔"

ایک دوسری جگہ یہی بات یوں کہی ہے۔

"اخلاق کچھ تو انسان کو فطری طور پر ورثۃً ملتے ہیں اور کچھ تعلیم اور صالح ماحول اور صحبت سے میسر آتے ہیں۔"

مولوی صاحب جب ماحول کہتے ہیں تو ان کے ذہن میں کسی شخص کی گھریلو زندگی سے لے کر اس کے عہد کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کے تمام پہلو ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک پہلو کبھی بالواسطہ اور کبھی براہ راست اشخاص کی سیرت کی تشکیل و تعمیر اور ان کے سوچنے اور کام کرنے کے انداز پر اثر ڈالتا ہے اور یہ اثر اکثر صورتوں میں مستقل اور مستحکم ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب نے جب کسی کی سیرت کی مصوری کا ارادہ کیا ہے تو اس کی سیرت اور شخصیت کے نقش کو ابھارنے کے لئے ان میں سے ہر چیز سے حسب ضرورت کام لیا ہے۔ مثال کے طور پر جب انہوں نے مولوی چراغ علی، سید علی بلگرامی، مولانا حالی، سر راس مسعود، اور سر سید جیسی شخصیتوں کی سیرت کشی پر قلم اٹھایا ہے تو بڑی وضاحت سے پہلے غدر کے بعد کے مسلمانوں کے سیاسی، قومی اور معاشرتی زندگی کے اہم رجحانات بیان کئے ہیں اور پھر ان رجحانات کو سیرت شناسی کا آئینہ بنایا ہے۔ اسی طرح جہاں کہیں ضرورت محسوس کی ہے (مثلاً سید علی بلگرامی، مولانا محمد علی، سر سید) وہاں خاندانی حالات کی تفصیلات درج کی ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ یہ کہ شخصی اوصاف کو نمایاں کرنے کے لئے انہوں نے عموماً ایسے واقعات سے مدد لی ہے جو ان کے اپنے مشاہدے میں آئے تھے۔ ان واقعات کے مطالعے کے بعد جو بات پڑھنے والا ہر جگہ محسوس کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مولوی صاحب نے واقعات کے انتخاب میں بڑی دقت نظر، باریک بینی اور نفاست ذوق سے کام لیا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ واقعات سیرت نگاری کے مقصد میں ممد ثابت ہونے کے علاوہ پڑھنے والے کے ذہن کے لئے انبساط کا سرمایہ مہیا کرتے ہیں۔ واقعات کے بیان میں دو چیزیں باقی دوسری چیزوں پر غالب ہوتی ہیں ایک ان کا رنگ صداقت، اور دوسری ان کی شگفتگی جو بیان کی سلاست اور قدرت سے پیدا ہوتی ہے۔ ان واقعات میں سے بعض کی نوعیت محض لطیفوں کی ہوتی ہے اور وہ اسی لئے مؤثر ہوتے ہیں کہ ان میں لطیفے کی ظرافت اور نزاکت موجود ہے، لیکن جو بات اس لطیفہ پن سے بھی زیادہ اہم ہے وہ یہ کہ لطیفہ سچائی کے نقش کو اتنا نمایاں کرتا ہے کہ شاید کوئی اور چیز نہ کر سکتی۔ اس طرح کے دو لطیفے سن لیجئے۔

"مولوی سید علی بلگرامی اپنے ایک دوست کو تمدن ہند کا وہ باب سنا رہے تھے جس میں دراوڑی قوم کا ذکر تھا۔ یہ سن کر دوست نے سوال کیا کہ یہ قوم ابھی باقی ہے؟ اتفاق سے اس وقت ایک مولوی صاحب ملنے آئے تھے۔ وہ پاس ہی بیٹھے تھے۔ مرحوم نے اشارے سے بتایا کہ یہ حضرت اسی قوم کی یادگار ہیں۔"

"ایسا ہی لطیفہ ہے کہ ایک باورچی نواب صاحب کا نام سن کر حاضر ہوا۔ نواب صاحب نے پوچھا کیا کیا پکانا جانتے ہو؟ کہنے لگا چپاتی اور قورمہ۔ نواب صاحب نے کہا بس؟ اس نے جواب دیا: اصل کھانا تو یہی ہے باقی سب نوابوں کے نخرے ہیں۔"

اس طرح کے لطیفوں کا مقصد صرف تفریح نہیں ہوتا بلکہ ان کا مقصد سیرت کی کسی پہلو کی وضاحت ہوتی ہے۔ لیکن لطیفے ابھی مولوی صاحب یہ لطیفے بیان میں لطف اور سیرت کشی کی فضا میں حق و صداقت کا رنگ بھر دیتے ہیں۔ ان لطیفوں کا اور ان کے علاوہ ان واقعات کا جو سیرتوں کی وضاحت کے سلسلے میں بیان کئے جاتے ہیں ایک اہم معاشرتی و تہذیبی پہلو یہ ہے کہ ان سے ایک خاص عہد اور بعد عہد سلطانی کی تہذیبی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، کی معاشرتی اور علمی زندگی کی تصویریں ہماری نظر کے سامنے آجاتی ہیں۔ مولوی صاحب نے جن متعدد شخصیتوں کا ذکر کیا ہے وہ سب عہد کے لحاظ کی سیاسی، معاشرتی، تہذیبی، علمی اور ادبی زندگی کی عمارت میں ایک ستون کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اور تہذیبی انحطاط کے ایک نازک دور میں ان کے عمل اور کردار سے تہذیب کو ایک نئی زندگی ملی تھی۔ یہ سب شخصیتیں جن زندگی کی قدروں کے گہوارے اور پاسبان ہیں، خود مولوی صاحب بھی انہیں قدروں کی قوتوں کے پروردہ ہیں۔ اس لئے جب ان کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی جیتی جاگتی تصویر بنا دیتے ہیں اور یوں سیرتوں کا یہ مجموعہ ہماری تاریخ کے ایک اہم عہد کی تہذیبی زندگی کا آئینہ بھی بن جاتا ہے۔

سر راس مسعود کے حال میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سنہ ۱۹۰۴ء کے سالانہ جلسے کا نقشہ اس طرح پیش کیا ہے:۔

"اس زمانے میں کانفرنس کا رنگ ہی کچھ اور تھا اور لوگ بڑے شوق اور رغبت سے آ آکر شریک ہوتے تھے یوں تو ہر صوبے کے لوگ ہوتے تھے لیکن پنجاب اور یو۔ پی والے کثرت سے نظر آتے تھے۔ شوق اور رغبت کی وجہ تھی ایک تو سر سید اس وقت زندہ اور سلامت موجود تھے۔ ان کی تقریریں اور باتیں سننا تو ایک طرف، ان کی زیارت کر لینا ہی بڑی بات تھی۔ ان کا بھاری بھرکم جثہ، پر رعب چہرہ، ان کی شان اور ان کا وقار ایسا تھا کہ وہ حقیقت وہ زیارت کے قابل تھے۔ جب وہ ہال میں آتے تھے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جہاز آ رہا ہے۔ دوسرے مولانا حالی کی دل ہلا دینے والی نظمیں، مولانا شبلی کے عالمانہ مضامین، مولانا نذیر احمد کی دھواں دھار اور پرلطف تقریریں روز روز کہاں سننے میں آتی ہیں۔ یہ موقع نصیبوں سے مل جاتا تھا۔ کبھی کبھی نواب محسن الملک بھی آنکلتے تھے۔ اور اپنی خوش بیانی سے سب کو چھا جاتے تھے۔ مولوی نذیر احمد کا لکچر سر سید آخری دن رکھتے تھے تاکہ لوگ جانے نہ پائیں اور واقعی لوگ اس کے انتظار میں برابر جمے رہتے تھے۔ ان کے لکچر کے دن سننے والوں کا ایسا ہجوم لگ جاتا تھا کہ تل رکھنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں بہت سے ذی علم، باوضع اور نامور لوگوں سے ملنے کا موقع مل جاتا، جو یوں برسوں نصیب نہ ہوتا۔ غرض یہ بڑی پرلطف صحبت ہوتی تھی اور شرفا کا بڑا اچھا مجمع ہوتا تھا۔"

مولوی عبدالحق کو تو جانے ایسی کتنی پرلطف صحبتیں دیکھنے اور ان میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے۔ انہوں نے سیرتوں کے ذریعہ ان کی یاد تازہ بھی کی ہے اور اسے آئندہ کے مورخ کے لئے محفوظ بھی کیا ہے۔

یہ سیرتیں مولوی عبدالحق کے صحیح مشاہدے اور گہرے تجزیے کا عکس ہونے کے علاوہ ان کی فکری بصیرت، تنقیدی نکتہ سنجی اور نکتہ آفرینی کا مجموعہ بھی ہیں۔ مولوی صاحب سیرتوں کا ذکر کرتے ہوئے جب افراد کے احوال پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں اسی ماحول میں بہت سی ایسی باتیں نظر آتی ہیں، جو انسان کے لئے نصیحت کا آئینہ اور عبرت کا مرقع ہیں۔ مولوی صاحب نے ایسی چیزوں کو دیکھ کر زندگی کے گوناگوں پہلوؤں کے متعلق اپنی ذاتی رائیں قائم کی ہیں۔ ان رایوں میں ہر جگہ مشاہدے، تجربے اور فکر کا رنگ شامل ہوتا ہے اور اسی رنگ کو مولوی صاحب کی انفرادیت اور زیادہ تیکھا اور روشن کرتی ہے۔ چنانچہ جب سننے والا واقعات کے ضمن میں یہ چلتے ہوئے فقرے سنتا ہے تو اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ انہیں حرز جاں بنائے۔ ایسی چند مثالیں سن لیجیے:۔

[illegible]
[illegible] ہے لیکن [illegible]
[illegible]
[illegible] (سید محمود)

کسی ملک یا کسی قوم میں اعلیٰ سے اعلیٰ قابلیت کا ہونا ممکن ہے لیکن اگر وہ تعصب یا کسی اور سبب سے ایک دوسرے کو [illegible] اور مختلف [illegible] صرف اپنے [illegible] مسائل [illegible] سے حل کرنے کی کوشش کریں گے تو اس کی ترقی [illegible] بہت سست ہوگی۔ (مولوی چراغ علی)

بیرونی امداد بڑی کارآمد اور مفید چیز ہے، بشرطیکہ وہ ملک میں ترقی اور جوش اور ہمت ہو، لیکن اگر کوئی چاہے کہ ہم کچھ نہ کریں اور ہمارے لئے سب کچھ ہو جائے تو محض خیال خام ہے۔ (مولوی چراغ علی)

کم ہیں جو محض اپنی لیاقت، محنت اور خلوص کے ساتھ کام کر کے عزت اور بڑائی حاصل کرتے ہیں۔ یہ بڑائی پائیدار ہوتی ہے۔" (خواجہ غلام الثقلین)

اقتدار کا سنبھالنا بہت مشکل کام ہے اس میں ایک آن بان اور خودداری ہوتی ہے جو بہادری اور انسانیت کا اصل جوہر ہے۔ ہر کوئی اس کی قدر نہیں کر سکتا۔ اس لئے شریف روتا اور ذلیل ہنستا ہے۔ یہ جتنا پھیلتا ہے وہ اتنا ہی سکڑتا ہے۔ (گدڑی کا لال)

سچ ہے انسان کی برائیاں ہی اس کی تباہی کا باعث نہیں ہوتیں بعض وقت اس کی خوبیاں بھی اسے لے ڈوبتی ہیں۔ (گدڑی کا لال)

انسان جب ہر طرف سے مایوس ہو جاتا ہے تو مذہب کی پناہ ڈھونڈتا ہے۔ (محسن الملک)

بے تعصبی کا وصف انہی لوگوں میں پایا جاتا ہے جن کی طبیعت میں انصاف ہوتا ہے۔ (حالی)

شہرت وہ بلا ہے کہ جہاں یہ آئی ہے کچھ نہ کچھ شامت بھی لاتی ہے۔ (حالی)

سچائی، نیکی، حسن کسی کی میراث نہیں۔ یہ خوبیاں تنگ قسمت والوں میں بھی ویسی ہی ہوتی ہیں جیسی

کام اسی وقت ہوتا ہے جب اس میں لذت آنے لگے، ... کام نہیں بیگار ہے۔ (نام دیو، مالی)

عام طور پر انسان فطرتاً کاہل اور کام چور واقع ہوا ہے۔ آدم علیہ السلام میں کچھ سرد ہو گئی ہے۔ (نام دیو، مالی)

نیکی اس وقت تک نیکی ہے، جب تک آدمی کو یہ نہ معلوم ہو کہ وہ کوئی نیک کام کر رہا ہے، جہاں اس نے یہ سمجھنا شروع کیا، نیکی، نیکی نہیں رہتی۔ (نام دیو، مالی)

درجہ کمال تک نہ کبھی کوئی پہنچا ہے نہ پہنچ سکتا ہے۔ لیکن وہاں تک پہنچنے کی کوشش ہی میں انسان، انسان بنتا ہے۔ (نام دیو، مالی)

ان سیرتوں میں پڑھنے والے کے لئے فائدے کی ایک بہت بڑی بات یہ ہے کہ مولوی صاحب نے ہر سیرت سے کوئی نہ کوئی اخلاقی نتیجہ اخذ کیا ہے اور یہ نتیجہ قاری کے لئے ہمیشہ یاد رکھنے والا سبق ہے۔

"شہرت، دولت اور حکومت جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے۔" (سید محمود)

اس عزیز کی زندگی ہمارے لئے ایک بیش بہا سبق اور حیرت ناک عبرت ہے۔ (سید محمود)

اپنے ہمارے آپ کو بڑے ہونا خدا کی بڑی نعمت اور بڑے پن کی علامت ہے۔ جو دوسروں کا سہارا تکتا رہتا ہے وہ خود کبھی نہیں بڑھتا اور جو بڑھتا ہے تو جتنا پاتا ہے اس سے زیادہ کھوتا ہے۔ . . . ان کی زندگی ایک سبق ہے ان لوگوں کے لئے جو دنیا میں بڑھنا اور کچھ کرنا چاہتے ہیں اور ان کے کارنامے نوجوانانِ ملک کے لئے دلیل راہ کا کام دیں گے۔ (مولوی چراغ علی)

جو لوگ یہاں کامیابی اور عزت کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں انہیں مولوی چراغ علی مرحوم کی مثال پیش نظر رکھنی چاہیئے اور یاد رکھنا چاہیئے کہ زمین خود میں غلہ دانی کا نتیجہ سوائے ندامت کے اور کچھ نہیں ... مولوی چراغ علی مرحوم کی طرح اس ... زمین میں تخم ریزی کی کوشش کرنی چاہیئے جس کے نتائج آپ تک ... اور جس کی وجہ سے ان کا نام ہمیشہ عزت و حرمت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ (مولوی چراغ علی)

... انسان نہیں رہتا۔ لیکن ... کے اعمال رہ جاتے ہیں، جو کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے ... ہے

ہر کمال اور اور بے پایاں حسن کی کہانی ہے ...... انسان کا نام اس کے کام سے ہے۔ آج ہم نام مرحوم کو کیونکر جانتے ہیں کیا ان کی اخلاق اور کمالات اور جاہ و فرمعت کی وجہ سے؟ ہرگز نہیں۔ یہ سب تو فانی چیزیں ہیں، قطعاً ان کے کیریکٹر اور کام کی وجہ سے اور ہم کیا یاد کرتے ہیں۔ ان کا نام اور ان کا کیریکٹر خود ہمیں ان کی یاد دلا رہا ہے۔ (مولوی چراغ علی)

انسان کی زندگی بہت تھوڑی ہے۔ بہت مشکل ہے کہ وہ اس چند روزہ حیات میں تحصیل بھی کرے، پایۂ تکمیل کو بھی پہنچے اور پھر ایسے کام بھی کرے جنہیں بقائے دوام ہو اور خلق خدا کو ان سے فائدہ پہنچے۔ وقت ایک نعمت ہے اور خدا کی دوسری نعمتوں کی طرح انسان وقت پر اس کی بھی قدر نہیں کرتا، اور قدر اس وقت ہوتی ہے جب کہ وہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ انسان دنیا میں نہیں رہتا، مگر اس کے اعمال رہ جاتے ہیں، لیکن کتنے اعمال ایسے ہیں جنہیں بقا ہو، جو قدر اور وقعت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہوں اور لوگوں کے دلوں پر قبضہ رکھتے ہوں۔ (سید علی بلگرامی)

غریبوں میں بھی بہت سے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی زندگی ہمارے لیے سبق آموز ہو سکتی ہے۔ انسان کا بہترین مطالعہ انسان ہے اور انسان ہونے میں امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ہے۔ (نور خاں)

بچے اکثر پا جاتے ہیں۔ اور یہی حال ان کے دوسرے جاننے والوں اور دوستوں کا ہے اور یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ وہ کیسا اچھا آدمی تھا۔ قومیں ایسے ہی لوگوں سے بنتی ہیں۔ کاش ہم میں بہت سے نور خاں ہوتے۔ (نور خاں)

یہ اخلاقی نتیجے مولوی صاحب نے بالکل ایسے نکالے ہیں جیسے ہر وہ شخص نکالتا ہے جسے اپنی رائے پر اعتماد اور اپنے خیال پر بھروسہ ہوتا ہے۔ ان نتیجوں میں ہر جگہ ایک شخصی اور انفرادی رنگ ہے۔ اس شخصی اور انفرادی رنگ میں جذبے کی جو ہلکی سی جھلک ہر جگہ موجود ہے اسی نے ان نتیجوں کو ہر قاری کے لیے ایسا بنا دیا ہے جیسے وہ اس کے دل کی بات ہو۔ ان کی تاثیر میں ایک ہمیشہ باقی رہنے والی کسک ہے اور یہ کسک مصنف کے خلوص کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، یہ خلوص مولوی صاحب کے سیرت نگاری کے فن اور اس کے ہر پہلو پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ چنانچہ اشخاص اور افراد کی زندگی پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے جب انہوں نے ان افراد اور اشخاص کے ماحول کا پس منظر پیش کیا ہے تو اس میں ضمنی طور پر زندگی کے بعض اجتماعی پہلوؤں، بعض اداروں اور بعض گروہوں کا ایسا ذکر آگیا ہے جس سے ان کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کے تبصروں کے دو ایک نمونے دیکھیے۔

ایک جگہ ریاستوں کے متعلق اپنے خیال کا اظہار یوں کرتے ہیں۔

"ریاستوں میں لوگ کیا کام کاج اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا آسان نہیں۔ وہاں سازشوں، ترغیبوں اور پیچیدگیوں کا ایسا جال بچھا ہوتا ہے کہ بڑے بڑے تیز نظر اور ہوشمند بھی پھنسے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر کچھ کرنا ہے تو دانستہ یا نادانستہ، بالواسطہ یا بلا واسطہ، پھنسنا ہی پڑتا ہے۔"

ہوا تعلق ہی وہ فضا ہوتی ہے جو ایک مخصوص دہری ہوتی ہے۔ ۔ ۔ خود مختار ریاستیں ہیں ایک عجیب چیز ہوتا ہے کہ ان میں سازشوں کی بڑی گنجائش ہوتی ہے ہر شخص کی خواہ وہ کتنا ہی کم حیثیت ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح "مرکز" کو خوش کر لیا جائے، جس سے "ہیا" مالش اسی کا راج۔ اس سعی میں رقابت شروع ہوتی ہے اور رقابت سے طرح طرح کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ چلتا ہے اس کشمکش میں کذب و افترا، چغلی، مخبری، غرض کوئی ایسی کمینہ حرکت نہیں ہوتی جو حریف ایک دوسرے کے خلاف کام میں نہ لاتے ہوں یہ ایک عجیب اسرار ہے جس کا سلسلہ شاخ در شاخ دور دور تک پہنچتا ہے اور عجیب رنگ میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔

شخصی سلطنتیں سازش کا گھر ہوتی ہیں۔ یہ جنس یہاں خوب پھلتی پھولتی ہے۔

ریاستوں سے آگے بڑھ کر حکومتوں کے عام انداز پر یوں مختصر طور پر تبصرہ کیا ہے۔

"قصر حکومت کے راستے ایسے پیچ در پیچ اور اس میں اتنی بھول بھلیاں ہیں کہ ان میں داخل ہو کر نکل آنا بڑے شاطر کا کام ہے۔"

زوال یافتہ قوموں کا حال کیا ہے۔

"زوال یافتہ قوموں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنوں میں سے کسی کی ناموری اور کامیابی کو نہیں دیکھ سکتے وہ بڑھتے ہوئے کو گرانا اور اٹھتے ہوئے کو بٹھانا چاہتے ہیں۔ اس میں انہیں خوشی ہوتی ہے۔ کبڑی بڑھیا کی طرح اوروں کو بھی کبڑا دیکھنے سے ان کا کلیجہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ ان کے خیال میں شاید مساوات کا یہی تقاضا ہے"

ایک جگہ انگریزوں کی ذہنی کیفیت کا ذکر بڑے چلتے ہوئے انداز میں لیکن بے لوث یقین اور اعتماد کے ساتھ یوں کیا ہے۔

"سلطنت انہوں نے مسلمانوں سے لی تھی۔ مسلمانوں سے بدگمان تھے اور بدگمان رہے۔ انہوں نے ابتدا ہی سے مکر و فریب، جعل سازی، اندرونی سازشوں اور حکمتوں سے اپنا تسلط بڑھایا اور خاص کر اسلامی حکومتوں سے جو معاندانہ برتاؤ کیا اس نے مسلمانوں کے دل میں ان کی طرف سے نفرت پیدا کر دی۔"

افراد، اشخاص، جماعتوں اور اداروں کے متعلق مولوی صاحب نے ان مضامین میں جو رائیں ظاہر کی ہیں، ظاہر ہے کہ وہ ان کی نجی اور شخصی رائیں ہیں اور نجی اور شخصی رایوں کے اظہار میں ہمیشہ جذبے کے رنگ کی جھلک کا نمایاں ہونا فطری ہے۔ اظہار رائے میں جذبے کا یہ رنگ اکثر بڑا معتدل اور متوازن رہا ہے مولوی صاحب نے اسے بڑی خوبی سے سنجیدہ فکر میں سمویا اور ایک ایسا نکھرا ہوا اور واضح رنگ پیدا کیا ہے جو کسی کی نظر میں نہیں چبھتا۔ جذبے کی لہر کے باوجود غیر جانبدارانہ بے تعلقی اور غیر جانبداری ان رایوں کی ایسی خصوصیت ہے جس کی وجہ سے ان میں وزن اور وقار پیدا ہو جاتا ہے ان رایوں میں یہ احساس و فکر کا یہ ملا جلا بلکہ سمویا ہوا رنگ مولوی صاحب کی شخصیت اور مزاج کی بعض خصوصیتوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔ اظہار حقیقت میں راست بازی اور بے ریائی کا یہ احساس، حق گوئی میں جرأت اور بے خوفی، افراد کی شخصیتوں کی مصوری اور عکاسی کے لئے ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے واقف ہونے اور ان واقفیت کی خاطر مطالعہ، تحقیق، تجسس اور معتبر اور مستند وسائل سے معلومات کی فراہمی کی کوشش، فراہم شدہ مواد کا تجزیہ کرنے اور نتائج تک پہنچنے کے لئے استدلال کرنے

خصوصاً حالی [illegible] کے ساتھ [illegible] تقاضوں کو [illegible] شگفتہ [illegible] کی اپنی خصوصیتیں ہیں۔ ان خصوصیتوں [illegible] اوقات [illegible] کے متعلق [illegible] لوگوں کی سیرتوں کا [illegible] نقش [illegible] مزاج کے ان عناصر کو [illegible] ان عناصر کا بڑا دخل ہے لیکن جہاں تک ان سیرتوں کی تاثیر اور دلکشی کا تعلق ہے ان کا ایک اہم اور بعض حیثیتوں سے نمایاں پہلو ان کا وہ اسلوب ہے جس میں یہ سیرتیں لکھی گئی ہیں۔

[illegible] ان سیرتوں کی بنیاد حقیقتوں اور صداقتوں پر ہے اور صداقتوں کے اس ذکر سے پڑھنے والا طرح طرح کے خوش گوار تاثر قبول کرتا ہے۔ لیکن دیکھنے کی چیز اصل میں یہ ہے کہ یہ خوش گوار تاثر جہاں ایک طرف موضوع کی اہمیت اور سچائی کا پیدا کیا ہوا ہے وہاں ان کی تخلیق میں اس اسلوب کو بھی بڑا دخل ہے جس میں یہ حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ یوں مولوی صاحب نے صداقت اور سادگی بیان میں لازم و ملزوم کا رشتہ قائم کیا ہے اور واقعہ نگاروں سے کہیں بڑھ کر سیرت نگار کو یہ سبق سکھایا ہے کہ تکلف، تصنع اور عبارت آرائی سچ اور اس کی تاثیر کے دشمن ہیں۔ بات سیدھی، صاف، سلیس اور مروجہ الفاظ میں کہی جائے تو سب سے زیادہ اثر کرتی ہے۔ لیکن سادگی بیان لکھنے والا اس لئے اختیار نہیں کرتا کہ بیان کا یہ طرز آسان نہیں ہے۔ اسے اختیار کرنے کا سبب اس کے نزدیک یہ ہے کہ اس کے فنی مقصد میں پوری کامیابی اسی راہ پر چل کر ہوتی ہے۔

سادگی بیان کے متعلق مولوی صاحب کے جو خیالات ہیں ان کا اظہار سر سید کی سیرت میں ایک جگہ ان الفاظ میں ہوا ہے۔

"سادگی و پرکاری کمال صناعی ہے۔ اس میں ادب بھی شامل ہے۔ سادہ زبان لکھنا آسان نہیں۔ سادہ زبان لکھنے کے یہ معنی نہیں کہ آسان لفظ جمع کر دیئے جائیں۔ ایسی تحریر سپاٹ اور بے مزہ ہوگی۔ سلاست کے ساتھ لطف بیان اور اثر بھی ہونا چاہیئے۔ یہ صرف باکمال ادیب کا کام ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر پوری قدرت ہو اور اسی کے ساتھ موضوع تحریر پر بھی کافی وسیع اور گہری نظر ہو۔ اسی لئے کسی فن یا علم کی ابتدائی آسان کتابیں ایسا ہی شخص لکھ سکتا ہے جسے اپنے فن یا علم پر کافی عبور ہو۔ وہ اپنے خیالات کو سادہ الفاظ میں ایسے دلنشیں طرز بیان کے ذریعہ عام فہم مثالیں دے کر ادا کرتا ہے کہ مضمون قابل فہم اور دلکش ہو جاتا ہے جن کا علم ادھورا ہوتا ہے وہ کبھی اپنے خیالات صفائی اور خوبی سے ادا نہیں کر سکتے تحریر اور تقریر کا مقصد یہ ہے کہ لوگ اسے سمجھیں، اس کا اثر قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اگر یہ نہیں تو تحریر یا تقریر محض بیکار اور تضیع اوقات ہے۔ . . . اثر رنگین عبارت، مقفیٰ مسجع، جملوں، تشبیہوں اور استعاروں کے ایچ پیچ سے نہیں پیدا ہوتا۔"

اسلوب کی سادگی کے متعلق مولوی صاحب نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ سب کے سب ان کے اسلوب پر صادق آتے ہیں۔ اس عبارت کا [illegible] اس سے کئی واضح نتیجے نکلتے ہیں۔

[illegible] ادیب کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ موضوع تحریر سے مکمل واقفیت حاصل کرے۔

[illegible] تحریر اور تقریر کا فنی مقصد یہ ہے کہ لوگ اس [illegible] بات کو سمجھیں، اس سے اثر قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔

[illegible] مقفیٰ و مسجع و پیچ در پیچ مثالوں سے پیدا نہیں ہوتی۔

[illegible] ہے

اور سادہ اور سلیس اسلوب ہی میں پرخلوص طور پر "کمال شناسی" کا حق ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ لطف بیان اور طرز ادا ... مقصد ہے یہ سلیقہ ادیب اور اس جگہ یوں کہنا چاہیے کہ بحیثیت سیرت نگار کے خواجہ صاحب نے اپنے کام کی پہلی شرط جس خوبی سے پوری کی ہے اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس شرط کو بالکمال و تمام پورا کرنے کے سبب سے بیان و اظہار کی طرف سے جو جو مسائل پیدا ہوتے ہیں تو انہوں نے رنگینی بیان کے سبب یہ تعلق اختیار کر کے سادگی اور سلاست کے ساتھ وہ رشتہ جوڑنا چاہا جیسا کہ ہمارے علم میں ہے کہ یہ رشتہ جوڑ کر وہ یا شاید اس مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں کہ جو کچھ کہا اسے فلسفہ صرف سمجھیں بلکہ اس سے اثر قبول کریں اور لطف اٹھائیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سادگی اور سلاست نے پرکاری اور مقبول موزونیت کے "کمال شناسی" کے یہ تقاضے کس کس طرح پورے کئے ہیں۔

بات بغیر کسی تکلف اور تصنع کے انتہائی سادگی سے کہہ دی جائے تو وہ کتنی موثر ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اس کے اندازے کے لئے چند مثالیں ملاحظہ کیجئے۔ مولانا وحیدالدین کے ذکر میں لکھتے ہیں۔

"مولانا بڑے زندہ دل اور ظریف الطبع تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات ظرافت میں حد سے تجاوز کر جاتے تھے مگر بڑی سادہ طبیعت کے آدمی تھے۔ مصلحت، سلیقے، اور صفائی کا خانہ ان کے دامن پر نہ تھا جو جی میں آتا کہہ بیٹھتے تھے جو جی میں آتا کر گزرتے تھے۔ جہاں کسی نے غلطی کی فوراً ٹوک دیتے تھے کبھی نہ سوچا کہ اس کا محل وقوع بھی ہے یا نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ ان کی طبیعت سے واقف نہ تھے ان کی باتوں سے اکثر ناراض ہو جاتے ہیں۔ جس طرح باوجود زبردست اخبار نویس ہونے کے سیاسیت کا ذوق نہ تھا اسی طرح باوجود زبردست عالم فاضل ہونے کے مذہب سے بیگانہ تھے۔ یہ ذاتی چیز ہے اسے علم و فضل سے کوئی واسطہ نہیں۔"

اچھے برے ہر قوم میں ہوتے ہیں۔ شریف افسر خاں صاحب کی سچائی، دیانت اور جفاکشی کی بہت قدر کرتے تھے اور ان کو اپنی اردلی میں رکھتے۔ مگر بعض ایسے بھی تھے جن کے سر میں خناس سمایا ہوا تھا۔

(گدڑی کا لال)

مرحوم ہماری تہذیب کا بے مثال نمونہ تھے۔ شرافت اور نیک نفسی ان پر ختم تھی۔ چہرے سے شرافت، ہمدردی اور شفقت ٹپکتی تھی اور دل کو ان کی طرف کشش ہوتی تھی۔

(حالی)

مسلم یونیورسٹی کی وائس چانسلری بڑی مشقت طلب، ٹیڑھی اور کٹھن خدمت تھی، جو اچھے بھلے آدمی کو دیوانہ بنا دے اور بڑے بڑوں کو ناک چنے چبوا دے۔ "اس میں ہاتھ ڈالنا گویا بالقصد بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سید احمد خاں کی روح نے مسعود کے دل پر القا کیا کہ بھڑوں کی سیج کو چھوڑ کر کانٹوں بھری گدی قبول کر لی۔

(راس مسعود)

وہ مردوں سے کام لینا خوب جانتے تھے۔ یہ سلیقہ میں نے یا تو نواب محسن الملک میں دیکھا یا مسعود میں، ان کے مددگار یا اہل کار خوشی خوشی کام کرتے تھے جیسے کوئی اپنا کام کرتا ہے۔ کام کرنے والوں کی قدر بھی

کرتے تھے۔ اور انہیں فائدہ پہنچانے کی تاک میں رہتے تھے۔ وہ غضب کے مستقل مزاج تھے جس کام کو ہاتھ میں لیتے تھے مشکل
کے کام نکالنے اور فائدہ پہنچانے میں بڑے دلیر تھے۔ ڈانٹ ڈپٹ کر، خوشامد سے، چاپلوسی سے، غرض ہر طرح
کام نکال لیتے تھے۔ اس طرح انہوں نے سیکڑوں آدمیوں کو فائدہ پہنچایا۔ اپنا کام نکال لینے کا انہیں خوب ڈھب
یاد تھا۔ ایک تو ان کی ذاتی وجاہت، دوسرے وہ خوش تقریر ایسے تھے کہ جو کہا وہ منوا لیا۔ اسی وجہ سے انہیں
حیدرآباد اور علیگڑھ میں غیر معمولی کامیابی ہوئی۔ (سر راس مسعود)

چند ہم عصر کی سیرتوں میں سے کوئی سیرت اٹھا کر پڑھ لیجئے۔ اور اس کا جو حصہ جی چاہے پڑھ لیجئے، معلوم ہوتا ہے کہ سیرت نگار نے بڑی سے بڑی بات، اہم سے اہم حقیقت اور گہرے سے گہرا نکتہ عام بول چال کی زبان میں بڑی سلاست اور روانی سے کہہ دیا ہے اور کہا ایسے چنچے تلے انداز میں ہے کہ جو بات جن لفظوں میں کہی گئی ہے وہی اس کے لئے سب سے زیادہ موزوں معلوم ہوتے ہیں۔ یہی چیز وہ قادر الکلامی ہے جس کی طرف مولوی صاحب نے خود اشارہ کیا اور جسے موثر بیان کا لازمہ بتایا ہے۔ بیان کی اسی تاثیر اور قادر الکلامی کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ بات سادہ اور آسان لفظوں میں کہی جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ اس میں محاورے اس بے تکلفی سے استعمال ہوتے ہیں جیسے اسی موقع کے لئے وضع ہوئے ہیں جہاں ان سے کام لیا گیا ہے۔ چھوٹی سی عبارت میں پے بہ پے کئی محاورے آتے ہیں اور بات میں ذرا بھی تکلف نہیں پیدا ہوتا۔ یہی الفاظ، ترکیبیں اور محاورے ہیں کہ جب کوئی دوسرا استعمال کرتا ہے تو ان میں ایک فرسودگی سی محسوس ہوتی ہے اور یہی ہیں کہ جب مولوی صاحب استعمال کرتے ہیں تو ان میں جان پڑ جاتی ہے اور پڑھنے اور سننے والے کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب تک ہم اس لفظ، اس ترکیب اور اس محاورے کے صحیح مفہوم اور مصرف سے نا آشنا تھے، اوپر کی مثالوں میں سے ہر ایک کی یہی کیفیت ہے۔ بعض ٹکڑے اور دیکھئے۔

"بڑے بڑے ماہرین فن اور اساتذہ ان کے فیصلوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں اور حیرت کرتے ہیں کہ
ہندوستان کی تیرہ خاک میں بھی ایسے ایسے قابل جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ (سید محمود)

وہ انگریزی کا بہت بڑا ادیب، زبردست انشا پرداز اور اعلیٰ درجہ کا مقرر تھا۔ لیکن جب لکھنے اور بولنے
پر آجاتا تو اعتدال اور تناسب دونوں نظروں سے اوجھل ہو جاتے تھے اور انمول جواہر پاروں کے ساتھ کنکر اور
روڑے بھی بے تکلف چلے آتے تھے۔ وہ آزادی کا دلدادہ اور جبر و استبداد کا دشمن تھا۔ لیکن اگر کبھی اس
کے ہاتھ میں اقتدار آتا تو بہت بڑا جابر اور مستبد ہوتا۔ وہ محبت و مروت کا پتلا تھا اور دوستوں پر جان نثار
کرنے کو تیار رہتا تھا۔ لیکن بعض اوقات ذرا سی بات پر اس قدر آگ بگولا ہو جاتا تھا کہ دوستی اور محبت
طاق پر دھری رہ جاتی تھی۔ (مولانا محمد علی)

ان عبارتوں کو پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ لفظ، ترکیبیں اور محاورے ان کے تابع فرمان اور حلقہ بگوش ہیں۔ جس لفظ، ترکیب اور محاورے کو جب چاہیں اور جہاں چاہیں طلب کر لیں، وہ دست بستہ حاضر ہوتا اور بات کہنے کی وہ خدمت انجام دیتا ہے جس سے سادگی اور تاثیر ہم معنی بنتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان کی عبارت میں متین، باوقار، پرشکوہ فارسی اور عربی لفظوں کے شانہ بہ شانہ ایسے لفظ بھی آراستہ و صف بستہ نظر آتے ہیں جنہیں [illegible] کے لفظ سمجھ کر قابل اعتنا نہیں گردانتے۔ لپ جھپ، مشغول، [illegible]

ڈے جانا، مہاجن، [illegible]، پیچال، [illegible]، [illegible] وغیرہ۔ ان کے بعد فارسی [illegible]
میں بے تکلفی اور روانی سے اور لطف [illegible] کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں:

لفظوں کی قدر و قیمت اور معنوی اہمیت کا مولوی صاحب کو جو صحیح اندازہ ہے اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ ہندی کی ٹھیٹھ اور عمدہ [illegible] کو فارسی اور عربی کی مذہبی ترکیبوں میں ملا کر اس طرح استعمال کرتے ہیں کہ دونوں ایک ہی ٹکسال کے سکے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک جملہ مولوی چراغ علی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"تحقیق و تفتیش کی چیٹک تھی، وہ جس مضمون کا خیال کرتے اس کی تہہ تک پہونچتے اور اس کے ماخذ و ماعلیہ کے سراغ میں پتے پتے اور ڈالی ڈالی پھرتے اور پتال تک کی خبر لاتے:"

اردو کے اس کمال کو کہ وہ ہر زبان کے لفظ کی غیریت اور بیگانگی کو مٹا کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہے، ہمارے بہت کم ادیبوں نے سمجھا اور پرکھا ہے۔ مولوی صاحب کی عبارت کی اہمیت اس بات میں بھی ہے کہ انہوں نے اردو کی اس خصوصیت سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بہت سے غیر معروف اور بعض اوقات غیر مانوس لفظوں کو برت کر ان کی معنوی قدر و قیمت واضح اور متعین کی ہے۔

مولوی صاحب کی عبارتوں کے متعلق عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے (اور یہ بات سرسید اور حالی کے متعلق بھی کہی گئی ہے) کہ ان کی سادگی مؤثر ہونے کے باوجود ادبی چاشنی اور شگفتگی سے عاری ہے معلوم نہیں اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اس لئے کہ بات سلیس اور سادہ ہو کر بھی مؤثر اور دل نشین ہے تو اس سے بڑھ کر ادبیت اور کیا ہوگی۔ لیکن ہماری زبان میں انشا پردازی اور رنگینی بیان سے کام لینے کا اتنا رواج ہے کہ پڑھنے والا ہر جگہ اس کی تلاش کرتا ہے اور جب نہیں ملتی تو شکایت کرتا ہے۔ یہی شکایت سرسید اور حالی کی عبارتوں کی طرح لوگوں کو (ایک خاص طرح کے لوگوں کو) مولوی صاحب کی عبارتوں کے مطالعے کے بعد بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مولوی صاحب نے جہاں کہیں اور انشا پردازی کے روایتی اسلوب کا راستہ اختیار کیا ہے وہاں بھی طرح طرح کے گل بوٹے کھلائے ہیں۔ دو چار مثالوں سے ان کے اسلوب کی اس خصوصیت کا اندازہ بھی کیجئے۔

"شہرت، دولت اور حکومت، جن سے ایک عالم میں ہیجان اور انقلاب برپا ہے اور جن کی آگ تقریباً ہر سینے میں مشتعل ہے، وہ ان کی آنچ سے بالکل محفوظ تھے۔"

"یہ شیر بیشۂ عزلت کہا کرتا تھا "کیا حاصل ہے شہرت سے"۔"

"تاروں بھری رات کو جب ہم نیلگوں آسمان پر نظر ڈالتے ہیں جس کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں تو کیا ہمارے دل و دماغ پر کوئی عمدہ اثر نہیں پڑتا؛ جب ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہو کر اس کی وسیع سطح اور بے چین موجوں کو دیکھتے ہیں تو کیا اس سے قلب پر عجیب و غریب کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ (سید محمود)"

"ان میں پارس پتھر کی خاصیت تھی، کوئی ہو، کہیں کا ہو، اسے چھوا نہیں اور کندن ہوا نہیں۔"

اس طرح کی ادبیت [illegible] بناوٹ و شگفتگی سے پیدا ہوتی ہے اور یہی [illegible] شگفتگی ہے کہ کبھی کبھی تو [illegible] اسلوب اختیار

[illegible] ہے اپنے ایجاز اور اختصار کے باوجود ایک دیرپا اثر کی حامل ہوتی ہے۔ [illegible]

"سرکاری دفتروں سے وابستہ تھے جہاں انہوں نے کوئی امتحان نہیں دیا سوائے ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ ڈگریاں تو خریدی جاتی ہیں ہمارے ملک میں سیکڑوں ہیں۔" (سید محمود)

"وہ اپنے فلسفہ اور خیالات میں خواہ وہ دیوانہ کیوں نہ ہوں، مگن ہیں۔"

"مطالعہ سے بے حد شغف تھا گویا یہی ان کا اوڑھنا بچھونا تھا...... انتہا ہے کہ بیت الخلاء میں بھی کتابیں رہتی تھیں اور وہاں بھی پڑھنے سے نہیں چوکتے تھے۔" (مولوی چراغ علی)

"مصلحت وقت اور زمانہ شناسی ان کے نصیب میں نہ تھی اور کبھی بدنصیبی سے انہوں نے اس کوچے میں قدم رکھا تو پہلے ہی قدم پر لغزش کھائی۔ اس چیز کے لئے کچھ تو فطری مناسبت ہونی چاہیئے اور کچھ صحبت اور تجربہ، ان میں سے ان کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔" (مولانا وحید الدین سلیم)

"دوسرے روز مقبرے میں گئے۔ باغ کا رجسٹر منگوا لیا اور نور خاں کے نام پر اس زور سے قلم کھینچا کہ اگر لفظوں میں جان ہوتی تو وہ بلبلا اٹھتے۔" (گدڑی کا لال)

ریاستوں کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں۔

"یہ تو ہوئی ایک مصیبت اور اندرونی۔ اب دوسری مصیبت کا حال سنئے جو بیرونی ہے۔ والی ریاست اپنے علاقے کا حاکم با اختیار ہے، سیاہ و سفید کا مالک ہے، لیکن اس کے ساتھ ایک ایسی پخ لگی ہوتی ہے جس کے سامنے سارے اختیارات دھرے رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب شخص ہوتا ہے نہ صاحب اختیار ہے، نہ صاحب جاہ و منصب، نہ غیر معمولی قابلیت اور ذہانت رکھتا ہے، لیکن سب کچھ سمجھا جاتا ہے اور سب کچھ کر گزرتا ہے — یہ ریزیڈنٹ بہادر ہیں۔ راج پاٹ تو "حضور" کا ہے لیکن اس کنکوے کی ڈور "صاحب عالی شان بہادر" کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔" (محسن الملک)

"بسم اللہ پڑھانے کے لئے جھنجھانے سے ایک وقیانوسی مولوی (امیر فرقت) بلائے گئے تھے۔" (راس مسعود)

"میر صاحب باتیں مزے مزے کی اور ہنر ہنر کر کرتے تھے۔ جلدی ان کے مزاج میں نہ تھی امتحان کا اس وقت [illegible] وقت ان کی فرصت [illegible]

حیات ظاہرا اس جستجو فال حکمت علمی تحقیق سے کبھی واسطہ نہیں پڑا: (میرن صاحب)

انھارھویں صدی میں ہندوستان کو ایک نئی قوم اور ایک نئی تہذیب سے سابقہ پڑا۔ یوں تو یورپ سے سب سے پہلے پرتگالی آئے اس کے بعد ولندیزی اور فرانسیسی۔ لیکن اس کا کوئی زیادہ اثر ملک پر نہیں ہوا۔ پرتگالی ہندوستان میں دو مقصد لے کر آئے تھے۔ مسالوں کی تجارت سے روپیہ کمانے اور عیسائی مذہب پھیلانے۔ ان دونوں مقصدوں کے حصول میں انھوں نے بڑے ظلم و جبر اور سفاکی سے کام لیا۔ ان کی یادگار اب ان کے کچھ لفظ اور کچھ دیسی عیسائی اور کچھ دوغلے مردوزن باقی رہ گئے ہیں: (سید حسین بلگرامی)

سیرت نگاری کے اسلوب میں بنیادی طور پر سادگی بیان سے مدد لینا، اس سادگی اظہار میں لفظوں اور محاوروں کو ان کی صوتی اور معنوی اہمیت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے استعمال کرنا غیر معروف اور غیر مانوس لفظوں سے مفہوم کے نئے رخ اور گوشے پیدا کرنا، سادگی کو تکلف اور تصنع سے محفوظ رکھتے ہوئے بھی اس میں ادبی شان پیدا کرنا، مزاح کی چاشنی سے تنقید و تبصرے کو دل نشین اور قابل قبول بنانا مولوی صاحب کے طرز کی چند خصوصیات ہیں۔ یہ خصوصیات بدیہی طور پر مصنف کی شخصیت اور اس کے مزاج کا پرتو ہیں۔ مزاج کا یہی عکس اور پرتو ہے جس نے مولوی صاحب کی سیرت نگاری میں متانت اور وقار کی شان پیدا کی ہے اور سیرتوں کے بیان کو پسندیدہ اخلاق اور اعلےٰ اور ارفع انسانیت کی قدروں کو ابھارنے اور اجاگر کرنے کا وسیلہ بھی بنایا ہے۔ سیرت نگار کے ذہنی خلوص اور دیانت داری، اس کی حق پسندی اور حق گوئی اور ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ اس کی چشم بینا اور دل دانا کی رہنمائی کی بدولت یہ سیرتیں شخصیتوں کا مرقع بننے کے علاوہ ایک خاص عہد کی سیاسی، معاشرتی اور اس سے بھی بڑھ کر علمی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ بنی ہیں — ایک ایسا آئینہ جس میں موضوع اور بیان دونوں کے مکمل امتزاج نے چمک پیدا کی ہے، ایک ایسی تصویر جس میں موضوع اور بیان دونوں پر مصنف کی شخصیت کے مختلف عناصر کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔

○

ترقی کا رستہ بہت دشوار گزار، تنگ اور کٹھن ہے۔ یہاں قدم قدم پر مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بڑے صبر اور استقلال اور بہت پتّا مارنے کا کام ہے۔ باوجود ان اوصاف کے وہ (ترقی) حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ آزادی نہ ہو۔ ترقی سرزمین آزادی میں پھول پھل سکتی ہے۔ ادیب کو اگر آزادی نہیں تو اس کی حالت مفلوج کی سی ہے۔ ادیب کو حق حاصل ہے اور اسے آزادی ہونی چاہیے کہ جو چاہے لکھے لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو بھونڈے پن سے لکھے بھونڈے پن کے لفظ میں ادب کے ظاہر اور باطن دونوں کی قباحتیں آجاتی ہیں۔ اگر اس سے بچنا ممکن ہے تو وہ ادب قابل مبارکباد ہے۔

(بابائے اردو خطبات ص ۶۷)

○

ڈاکٹر شوکت سبزواری

دل کو باتیں جو اُن کی یاد آئیں

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق سے میرا روحانی تعلق کسی قدر پرانا ہے۔ جب سے میں نے ہوش کی آنکھ کھولی ان کا نام کان میں پڑا اور ان کی پاکیزہ تحریریں نظر سے گزریں۔ میں شروع ہی سے ان کی تحریریں مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ ان میں مجھے وہی لطف آتا تھا جو ایک ناپختہ ذہن کو قصے کہانیوں اور داستانوں میں آتا ہے۔ غالباً ۱۹۳۹ء کا زمانہ ہوگا کہ میری نظر سے ان کا وہ مشہور مقالہ گزرا جو اردو ہندی ہندوستانی نزاع کے سلسلے میں لکھا گیا تھا اور جسے ملک کے قریب قریب تمام معیاری رسائل اور اخبارات نے شائع کیا۔ مولوی صاحب کے اس مقالے نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کا ایک جملہ جو مولوی صاحب کے قلم اعجاز رقم ہی سے تراوش ہو سکتا تھا آج تک میرے ذہن میں نقش ہے۔ گاندھی جی کو اصرار تھا کہ ملک کی زبان اور اس کا نام "ہندی یا ہندوستانی" ہو۔ مولوی صاحب نے اس عجیب و غریب نام پر اعتراض کیا کہ ہندی کہیے یا ہندوستانی۔ ہندی یا ہندوستانی کیا نام ہوا؟ گاندھی جی نے اس کی یہ وجہ بتائی کہ موجودہ بول چال کی زبان ہندی ہے جسے ہندی ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ زبان آئندہ ہندوستانی کی شکل اختیار کرے گی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ آنے والے روپ کو سامنے رکھ کر اسے ہندی یا ہندوستانی کہا جائے۔ اس پر بحث کرتے ہوئے مولوی صاحب نے لکھا "گویا یہ زبان کا نام نہ ہوا آئندہ کا پروگرام ہوا"۔ میں نے مولوی صاحب کے اس جملے کو بار بار پڑھا اور ہر بار اس کی جامعیت، معنویت اور حسن ترتیب سے حظ حاصل کیا۔

یہ واقعہ ہے کہ مولوی صاحب کی تحریک "اردو لکھو اردو پڑھو" کے بعد ہی میں نے اپنی زبان اردو سے دلچسپی لینی شروع کی جو مولوی صاحب کے دلکش اور دلگداز انداز تحریر کے زیر اثر پختہ، گہری اور دیرپا ہوتی چلی گئی۔ غائبانہ تعارف یا تاثر کا یہ سلسلہ خاصا طویل ہے۔ پاکستان کے قیام سے پہلے میں مولوی صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل نہ کر سکا اگرچہ میرے دو ایک مقالے ان کے مشہور رسالے "اردو" میں شائع ہو چکے تھے اور مولوی صاحب نے انہیں پسند بھی فرمایا تھا۔ یہ شرف مجھے پاکستان میں یا یوں کہئے کہ مشرقی پاکستان میں ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ حاصل ہوا۔ مولوی صاحب غالباً جامعہ اردو کے سلسلے میں طوفانی دورے کرتے ہوئے ڈھاکے پہنچے اور جناب فضل احمد کریم صاحب فضلی کے یہاں، جو اس زمانہ میں وزارت تعلیمات میں معتمد تھے، فروکش ہوئے۔ فضلی صاحب نے مولوی صاحب کی صدارت میں ایک ادبی مباحثہ ڈھاکے کے ایک بڑے سینما ہال میں منعقد کیا۔ بحث کا عنوان تھا "جدید ترقی پسند شاعری، شاعری نہیں صحافت ہے"۔ حصہ لینے والوں میں فضلی صاحب کے علاوہ ڈاکٹر شادانی، جناب واحد بخش قادری، عزیز مکرم مختار زمن قابل ذکر ہیں۔ ہر چند ان سوالوں میں میں پانچواں تھا لیکن بحث کا آغاز مجھے کرنا تھا اس لئے اس کا اختتام بھی مجھے ہی کرنا پڑا۔ مولوی صاحب کے سامنے اپنی شعلہ بیانی اور طلاقت لسانی کے جوہر دکھانے کا یہ اچھا موقع ہاتھ آیا۔ شاید اس لئے میں نے غیر معمولی جوش کے ساتھ بڑی سرعت سے کام لے کر کسی قدر جلدی جلدی تقریر شروع کی۔ میں مولوی صاحب کے خیالات کی ترجمانی کر رہا تھا اس لئے مولوی صاحب چاہتے تھے کہ میری تقریر موثر ہو۔ میں سارے مجمع پر چھا جاؤں تاکہ ووٹ شماری کے وقت مجمع میرے حق میں رائے دے۔ مولوی صاحب بار بار میری طرف دیکھتے اور نظروں ہی نظروں میں کچھ کہتے تھے میں ان کی آنکھوں کا پیغام نہ پڑھ سکا تو مجبور ہو کر انہوں نے فرمایا: "ذرا رک رک کر اطمینان سے آہستہ آہستہ تقریر کرو۔ تمہارا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔"

[illegible]

[illegible] ہو چکا ہے [illegible]

صاحب نے جواب میں لکھا کہ اس کتاب کو میں شائع کرنا چاہتا تھا ایک دینی اشاعتی ادارے نے لکھا بھی لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا [illegible] عرصے میں کراچی آیا تو کتاب کے کچھ اجزا ساتھ لایا۔ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کتب خانہ خاص میں تشریف فرما تھے۔ دیکھتے ہی مسرت سے کھل گئے اور فرمانے لگے۔ "اچھا تم کب آئے"؟ اور جب انہیں معلوم ہوا کہ کراچی آئے دو دن ہو چکے ہیں اور قیام ایک عزیز کے یہاں ہے تو شکایت کرنے لگے کہ دو دن بعد ملنے آئے ہو۔ میرے پاس قیام کیوں نہیں کیا۔ میرے عذر کرنے پر فرمایا: "اچھا یہ بات ہے۔ خیر عذر مسموع و معقول۔ لیکن تاخیر سے ملنے کی سزا ضرور کچھ نہ کچھ ہونی چاہیئے۔ اب کھانا تم میرے ساتھ کھاؤ گے۔" میں نے عرض کیا: مولوی صاحب! آپ شفقت فرماتے ہیں یہ آپ کا کرم ہے لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قیام عزیز کے یہاں ہو اور کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں۔ کیا انہیں شکایت نہ ہو گی۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا: "اچھا دیکھا جائے گا۔ کل شام کا کھانا تو میرے ساتھ کھاؤ۔"

کتاب کے اجزا دیکھ کر فرمایا۔ "ٹائپ اچھا ہے۔ کاغذ بھی بہتر ہے۔ مجھے فکر تھی کہ ڈھاکے میں اچھی طباعت نہ ہو سکے گی۔ تعجب ہے کہ ڈھاکے میں اتنے اچھے حروف مل جاتے ہیں۔ طباعت و تصحیح کا اہتمام بھی خوب ہے۔"

کھانے کی میز پر مولوی صاحب کے علاوہ ایک نوجوان بھی تھا جسے میں اس وقت نہیں جانتا تھا۔ مولوی صاحب حسب عادت مختلف لذیذ کھانوں سے تواضع کے ساتھ ساتھ لطائف و ظرافت سے ضیافت طبع کا سامان بھی فراہم کرتے جاتے۔ کبھی کبھی نوجوان بھی لب کشائی کرتا۔ میری توجہ تمام تر مولوی صاحب کی طرف تھی۔ ایک موقع پر اس نوجوان نے مولانا عبدالماجد دریابادی پر کوئی اعتراض کیا۔ اسے میں برداشت نہ کر سکا۔ ناشناسائی و نا آشنائی کے باوجود میں نے کسی قدر ترشی سے جواب دیا۔ نوجوان بد مزہ ہو کر خاموش ہو گیا۔ مولوی صاحب ہنسنے لگے اور میرے تند و تیز جواب سے دیر تک لطف لیتے رہے۔

اس کے بعد مولوی صاحب سے ایک ملاقات اور ہوئی۔ ایران جانے کے خیال سے چند روز کے لئے میں کراچی میں ٹھہرا۔ اسی اثنا میں ڈھاکے سے اطلاع ملی کہ فلاں تاریخ کو کراچی یونیورسٹی میں ایک بورڈ کے سامنے مجھے پیش ہونا ہے۔ مولوی صاحب اس بورڈ کے ایک اہم رکن تھے۔ مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو فرمانے لگے۔ "بہت اچھا ہوا تم آگئے"۔ اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، کچھ دیر بعد اٹھ کر میں چلا آیا۔ اگلے روز وائس چانسلر کے دفتر گیا تو یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ مولوی صاحب موجود نہیں۔ یہاں سے فارغ ہو کر پھر حاضری دی تو دیکھا مولوی صاحب مجسم معذرت ہیں۔ فرمانے لگے، میرے پاؤں میں تکلیف تھی اس لئے نہ جا سکا۔ خیال تھا کہ تم ضرور منتخب ہو جاؤ گے۔ میں نے [illegible] سے آگاہ کیا تو افسوس کرنے لگے۔ یہ منظر آج تک چشم تصور کے سامنے ہے۔ مولوی صاحب بار بار افسوس فرماتے اور یہ جملے دہراتے تھے۔ "تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ مجھے بھی ہوتا میں ضرور جاتا۔"

ان واقعات کا میرے دل پر گہرا اثر ہے اور ہونا چاہیئے اس لئے کہ جہاں ان سے مولوی صاحب کے تعلق اور خلوص کا پتہ چلتا ہے جو انہیں مجھ سے تھا، ان سے مولوی صاحب کے کردار کا ایک پہلو بھی نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔ مولوی صاحب بہت ہی رقیق القلب اور ذکی الحس انسان تھے دل کی گہرائیوں کے گوشوں کی نرمی کا تقاضا تھا کہ جس سے ملیں اسے دل میں جگہ دیں۔ اور ٹوٹ کر اس سے محبت کریں۔ ان کی محبت سچے کندن کی طرح خالص اور بے کھوٹ تھی جس میں کم سے کم ذاتی غرض کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ ان کے بارے میں میری یہ رائے ان کے چند واقعات پر مبنی نہیں۔ مولوی صاحب کی رفاقت میں پورے تین سال گذارے۔ خلوت و جلوت میں بہت قریب سے دیکھنے اور پرکھنے کے بعد میں نے یہ رائے قائم کی ہے۔

مولوی صاحب چاہتے تھے کہ میں ڈھاکے سے کراچی آجاؤں اور انجمن کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار انہوں نے اپنے خط میں کیا ہے جو انہوں نے مجھے لکھا۔ ایک تحریر کا مجھ پر بہت گہرا اثر ہوا۔ انہوں نے [illegible] کی [illegible] اعانت کے سلسلے میں کوئی خط لکھا تھا جو کسی وجہ سے ضائع ہو گیا۔ اور مجھ تک نہ پہنچ سکا۔ انتظار کے بعد دوسرا خط لکھا جس میں [illegible] کی شکایت کے بعد لکھا تھا [illegible] کوئی پاس نہیں [illegible] نہیں لکھا تھا [illegible] مقالات اور تحریرات کا [illegible]

...لکیں کہ کام ملا... معلومات اور تاریخی مباحث کو پڑھا کرتا تھا۔ اب "اردو کی بارش" ہے سیری زندگی ہے۔ اگر تو تو نے کل مددین کی بے اعتنائی کی شکایت کرتا ہوں اور تو سیٹھا آواز شاہی زندہ درہوں گا۔

وہ گیا وہ شوخ سے سنگ جاکر

ہائے عالم مری تنہائی کا

میں نے ایک مفصل مقالہ لکھ کر مولوی صاحب کو بھیج دیا۔ اور اس کے بعد برابر حسب استطاعت "اردو" کی خدمت کرتا رہا۔ [illegible] کے آغاز میں ترقی اردو بورڈ نے مجھے طلب کیا۔ بعض وجوہ سے میں آنا نہیں چاہتا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا یہ اچھا موقع ہے۔ تم چلے آؤ۔ ساتھ مل کر کام کریں گے۔ میں نے لکھا یونیورسٹی نے مجھے چھ ماہ کی رخصت دی ہے۔ مولوی صاحب نے جواب دیا۔ وہاں کچھ کرم فرما معلوم ہوتے ہیں، تم چلے آؤ۔ میں کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کردوں گا۔

ان حالات میں مجھے مولوی صاحب کی رفاقت حاصل ہوئی اور انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی سیرت و کردار کے مطالعہ کا موقع ملا۔ لیکن افسوس ہے کہ تین سال سے زیادہ رفاقت کا یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ مولوی صاحب داغ مفارقت دے کر رفیق اعلیٰ سے جا ملے، اور اپنی کچھ یادیں اور ان کے نقش چھوڑ گئے جن سے میں ان کی صحبت و رفاقت تازہ کرلیا کرتا ہوں۔ تین سال کی ان یادوں کا ذکر آئندہ کسی فرصت میں کروں گا۔

دل کو باتیں جوان کی یاد آئیں

کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

پروفیسر حمید احمد خاں

بابائے اردو اسلامیہ کالج لاہور میں

فروری ۱۹۵۹ء میں اردو کانفرنس کی صدارت کیلئے جب مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ لاہور تشریف لانے والے تھے، میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں ایک خط لکھا کہ قیام لاہور کے دوران میں اسلامیہ کالج کی "بزم فروغ اردو" کو ایک سپاسنامہ پیش کرنے کی عزت بخشیں۔ مولوی صاحب نے تامل فرماتے ہوئے مجھے جواباً لکھا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مولوی صاحب کے گرامی نامے کی نقل ذیل میں دی جاتی ہے۔

بابائے اردو کا مکتوب گرامی

کل پاکستان انجمن ترقی اردو
اردو روڈ۔ کراچی

مورخہ ۱۹-۲-۵۹ء

عزیز مکرم سلمہٗ۔ آپ کا خط ابھی ملا۔ اس سے پہلے آپ کے خط کا جواب لکھ چکا ہوں۔ پہونچ گیا ہوگا۔ انشاء اللہ ۲۰ فروری کو شاہین گاڑی سے پونے بارہ بجے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔

آپ نے یہ سپاسنامہ کی پخ کیسی لگادی۔ میں اس قابل نہیں رہا۔ سپاسنامے وزیروں اور لیڈروں کے لئے ہوتے ہیں۔ میں اب ایک غریب مہاجر ہوں، جو کچھ کیا تھا ... اس پر پانی پھر گیا اور یہاں آکر جو کرنا چاہتا تھا وہ کر نہ سکا۔ بلکہ میرے ساتھیوں نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ میں کچھ کر سکوں۔ اب سپاسنامہ کس بات کا۔ حرمان و محرومی کا۔ یہ ہنسی کی بات ہوگی۔ آپ میرے دل کے داغ کیوں تازہ کرتے ہیں۔ اور سپاسنامہ پیش کرکے مجھے کیوں شرماتے ہیں۔ اردو کا حشر جو بھارت میں ہوا اور ہو رہا ہے وہ آپ نے دیکھ لیا اور یہاں جو ہو رہا ہے وہ بھی آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ زمانہ سپاسناموں کا نہیں کچھ کر گذرنے کا ہے۔ آپ اسے موقوف ہی رکھئے تو اچھا ہے۔ میں اسی کو سب سے بڑا سپاسنامہ سمجھوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرا منشا سمجھ گئے ہونگے اور اصرار نہ فرمائینگے

خیر طلب عبدالحق

لیکن جب لاہور مولوی صاحب قبلہ کے قدوم سے شرف اندوز ہوا تو میں نے دوبارہ یہی درخواست پیش کرنے کی جسارت کی۔ اس مرتبہ مولوی صاحب میرے کہنے سے اور میرے رفقائے کالج کے طلباء کے خلوص سے مجبور ہو کر ۲۰ فروری ۱۹۵۹ء کی شام کو اسلامیہ کالج تشریف لائے۔ یہاں کالج کے اساتذہ اور طلباء بہ تعداد کثیر مولوی صاحب کی پیشوائی کے لئے دو رویہ کھڑے تھے۔ بابائے اردو ان کا سلام قبول کرتے ہوئے کالج کے بڑے چمن میں، جہاں شامیانے کے نیچے جلسے کا انتظام کیا گیا تھا رونق افروز ہوئے۔ سب سے پہلے کالج کے اساتذہ میں سے تین صاحبوں نے بابائے اردو کی خدمت میں فرداً فرداً منظوم خراج عقیدت پیش کیا پھر میں نے مولوی صاحب قبلہ کی اجازت سے حسب ذیل سپاسنامہ گوش گذار کرنے کی سعادت حاصل کی۔

سپاس نامہ

بخدمت بابرکت جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ

ہم کارکنان و منتظمین انجمن اردو سراپا سپاس ہیں کہ آپ نے ہماری دعوت کو شرف پذیرائی بخشا۔ آپ کی تشریف آوری صرف اس درسگاہ اور خاندان اردو کی اس انجمن ہی کے لئے باعث تشکر نہیں بلکہ لاہور اور مغربی پاکستان کے تمام ہی خوا ہان اردو کے لئے موجب فخر و مباہات ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کالج کی تقریب میں آپ جیسا قابلِ احترام اور محسن اردو کا محسن اعظم ہمارے درمیان موجود ہے جس نے اپنی زندگی زبان و ادب کی مخلصانہ خدمت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس مبارک موقع پر ہم آپ کی خدمت میں جن جذبات محبت و عقیدت کو پیش کش کی سعادت حاصل کر رہے ہیں وہ صرف ہمارے ہی دلوں میں موجزن نہیں اردو سے تعلق رکھنے والے تمام افراد کے قلوب اس میں ہمارے شریک ہیں۔

آپ کی تشریف آوری پر ہمارا یہ اظہار سپاس کوئی رسمی چیز نہیں، ہماری نظروں میں آپ کا خیر مقدم ایک فرد کا نہیں بلکہ عظیم الشان ادارے اور ایک زندہ روایت کا خیر مقدم ہے گذشتہ نصف صدی کے طویل عرصے میں آپ کی ذات گرامی کو اردو کی تعمیر و ترقی، تحقیق و تنقید اور تحفظ و بقا کی پیہم جدوجہد میں جو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے اور جس طرح تعلیم و تدریس، تصنیف و تالیف، مجادلہ و مجاہدہ اور اپنے رفقائے کار کی تربیت و قیادت کے ذریعہ سے آپ ہماری محبوب قومی زبان کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں وہ تاریخ اردو کا ایک درخشاں باب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کی علمی زندگی کی روداد زبان اردو کا گذشتہ نصف صدی سے زائد عرصے کی تعلیمی اور تحقیقی تحریکوں کی مبسوط تاریخ ہے۔ انجمن ترقی اردو، سررشتہ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ اور پھر جامعہ عثمانیہ کی تاسیس و تشکیل میں آپ کا حصہ اتنا وقیع اور اہم ہے کہ ان اداروں کی گراں بہا علمی خدمات کا اعتراف درحقیقت آپ کی خدمات کا اعتراف ہے۔ مستقبل کا مورخ جب بیسویں صدی کے نصف اول میں اردو کے لسانیاتی، تحقیقی اور تنقیدی سرمائے کا جائزہ لے گا تو اسے آپ کے عظیم الشان کارناموں کی صحیح عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔

تاریخ زبان کے بارے میں آپ کے انکشافات، قواعد زبان کی تدوین اور لغت اردو کی تالیف، مطالعہ لسانیات کی راہ میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں اور آنے والی نسلیں اپنی علمی و ادبی عمارتوں کی تعمیر آپ کی قائم کی ہوئی بنیادوں ہی پر کریں گی۔ ان میں سے ہر ایک کام اپنی وسعت، وزن، اور اہمیت کے اعتبار سے محققین کی ایک منظم جماعت کی مسلسل کاوش اور عرق ریزی کا طالب تھا جسے آپ نے اپنی ان تھک کوششوں سے تکمیل تک پہونچا کر حیرت انگیز وسعت نظر، قوت عمل اور عزم و استقلال کا زندۂ جاوید نمونہ پیش کیا ہے۔ قدیم ادب کے شاہکاروں، منفرد کے دواوین و انتخابات اور بیش قیمت مسودوں اور تذکروں کو آپ نے جس دقت نظر اور حسن ذوق کے ساتھ پیش کیا ہے اس کی بدولت اردو کو ترتیب و تدوین کتب کا ایک ایسا بلند معیار مل گیا ہے جس سے وہ پہلے ناآشنا تھی۔ اس طرح آپ نے بے شمار نوادر کو دست برد روزگار سے محفوظ کر کے مستقبل کے لئے تحقیق کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔

جناب والا! علمی اور تحقیقی کام کے ساتھ ساتھ آپ کے ادیبانہ کمالات کو بھی آپ کی عظمت کے شواہد میں ایک امتیازی شان حاصل ہے۔ تنقید و تبصرہ میں آپ نے جس سلجھے ہوئے علمی انداز کی طرح ڈالی ہے آج وہ ہمارے ادب میں ایک نصب العین کی حیثیت حاصل کر چکا ہے اس علمی انداز سے موجودہ ادیب اور ناقد بھی فیض یاب ہو رہے ہیں مگر یقین ہے کہ آنے والے زمانوں کے ادیب اور ناقد اور زیادہ مستفید ہوں گے۔ سیرت نگاری اور شخصیت کی تصویر کشی کے جو نمونے آپ نے پیش کئے ہیں وہ اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ اگر آپ تخلیقی ادب پر زیادہ توجہ مبذول کرتے تو ادبی شاہکاروں کا ایک گرانقدر سرمایہ اردو کے ہاتھ آ جاتا۔ آپ کے مقدمات کی جامعیت اور نکتہ رسی نے اردو ادب کو "مقدمہ بازی" کے ایک نئے پر لطف مفہوم سے روشناس کیا اور حقیقت یہ ہے کہ اس ضمنی اور ذیلی مشغلے کو مستقل تصنیف کا درجہ دے دیا آپ ہی کا حصہ تھا صحافت کو ترویج علوم کا ذریعہ بنانے کی جو کوشش آپ نے بہ زیر ادارت رسائل "اردو"، "سائنس" اور "معاشیات" وغیرہ نے جو کام کیا ہے اس کی مثالیں ترقی یافتہ ممالک میں بھی کمیاب ہیں۔

... تحقیقی ... [illegible] ... آپ کی ناقابلِ فراموش خدمات ... نیز آپ ہمیشہ روشن خیالی کی ... [illegible]
اسلوب سے علمی، عقلی اور استدلالی انداز میں نگارش کی طرف موڑنے میں آپ کی کوشش، ذاتی مثال اور اثر نے جو حصہ لیا ہے اس کے لئے ... [illegible]
ہے کہ سائنس کی معلومات کو اردو میں منتقل کرنے کا کام اس خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا ہے۔ وضع اصطلاحات، ... اصول اصطلاحات کے ... [illegible]
آپ کا کام صرف مضامین اور کتابوں تک محدود نہ رہا۔ بلکہ اردو کی مؤلفہ زبان کے لئے بھی قابلِ تقلید نمونہ ثابت ہوا۔

جنابِ والا!

آپ کی پرخلوص اور با مقصد زندگی قوم و ملک کے لئے ہمیشہ مشعلِ راہ بنی رہے گی۔ اس وسیع اور متنوع علمی اور تحقیقی کام کے باوجود جس بے پناہ جذبے اور آہنی عزم کے ساتھ آپ اُردو کی حمایت اور تحفظ کے لئے ہمیشہ سینہ سپر رہے ہیں اس کی داستان سے ہماری آنے والی نسلیں درسِ بصیرت حاصل کرتی رہیں گی۔ قیامِ پاکستان سے قبل اور اس کے بعد بھی ابتلا و آزمائش کے ہر دور میں ہر محاذ پر آپ اردو دشمن طاقتوں سے نبرد آزما رہے ہیں اور اس جہاد میں آپ نے جو قربانیاں کیں اور جس عزم و ثبات کے ساتھ آپ نے مخالف سیاسی طاقتوں اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کیا، اس کی مثال ہماری جنگِ آزادی کے اکابر کی سرفروشانہ جدوجہد کے سوا اور کہیں نہیں ملتی۔

انکسار کا وہ خاص رنگ جو صرف حقیقی عظمت کو نصیب ہوتا ہے، سچ کی وہ لگن جو فقط روشن ضمیر انسان کے حصے میں آتی ہے، حق گوئی و بے باکی کا وہ شعلۂ جوالہ جو جذبۂ ایمان کا سب سے بڑا عطیہ ہے، خدمتِ ملک و قوم کے لئے دل کی وہ تڑپ جو زندگی بھی ہے اور زندگی کا مفہوم بھی، اسے ہم نے آپ کی ذاتِ گرامی میں جلوہ گر پایا ہے۔ یہی وہ طاقت ہے جو آخر کار سب مشکلات پر غالب آئے گی۔ ابھی صبحِ صادق کا اثر آشکار نہیں ہوا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اردو کا جس شمع کو آپ نے رات بھر اندھیروں سے بچایا ہے وہ ضرور پاکستان کے افق پر آفتاب بن کر طلوع ہوگی۔

ہم ہیں
آپ کے عقیدت مند
ارکان و کارکنان بزم فروغ اردو

جب یہ سپاسنامہ پیش ہوا تو صورت یہ تھی کہ پورے جلسے پر ایک رقت کا سماں چھایا ہوا تھا۔ خود سپاسنامہ پیش کرنے والے کا یہ حال ہوا کہ سپاسنامے کے آخری حصے پڑھتے ہوئے اسے اپنی آواز پر قابو نہ تھا۔ بابائے اردو بھی اس صورتِ حال سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ سپاسنامہ سماعت فرمانے کے بعد جب انہوں نے اپنے ارشادات کی ابتدا کی تو ان کی آواز گلوگیر تھی۔ دو مرتبہ یوں ہوا کہ بابائے اردو کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ایک لرزش کے عالم میں بمشکل سامعین کے کانوں تک پہنچے جو کوئی اس موقع پر موجود تھا اسے یہ کیفیت ہمیشہ یاد رہے گی۔ بابائے اردو کے ارشادات پر اس ناقابلِ فراموش جلسے کی روداد ختم ہوتی ہے۔

جوابی تقریر

(بابائے اردو جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب مدظلہ کی طرف)

حضرات!

آپ نے اپنے سپاس نامے میں جسے میں اپنے لئے سرفراز نامہ سمجھتا ہوں جو کچھ کہا ہے وہ مجھے ایک خواب کا سا عالم نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا

ایسا شخص تھا جس نے اپنی زبان کے لئے کچھ کام کیا تھا۔ وہ اب شاید نہیں رہا۔ جو کلمات آپ نے اس سپاسنامے میں اس شخص کے لئے فرمائے ہیں وہ مجھ جیسے منسوب کئے ہیں۔ وہ حقیقت میں اگر میں نے کہا ایک خواب کا سا سماں معلوم ہوتا ہے میں اس کے شکریہ کے لئے موزوں الفاظ بھی نہیں رکھتا۔ اس میں وہ جذبات صحیح طور سے ادا ہو سکیں۔ آپ نے اپنے سپاسنامے میں ایسے الفاظ میں میرا ذکر کیا جو محبت آمیز ہونے کے علاوہ مبالغہ آمیز بھی ہیں۔ حیران ہوں کہ اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔ انگریز جب سے اس ملک میں آیا ہے شکریہ کا لفظ بے معنی ہو گیا۔ انگریز بات بات میں "تھینک یو" (Thank you) کہہ دیتا ہے۔ نوکر پانی کا گلاس پیش کرے تو "تھینکس" (Thanks) گلاس واپس ہو تو "تھینکس" (Thanks) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لفظ کسی مشین سے نکل رہا ہے جس میں دلی جذبات کو کوئی دخل نہیں۔ پہلے شکریہ کا لفظ ہماری زبان میں نہیں تھا۔ پچھلی صدی کے آخر میں انگریزی زبان کے اثر سے ہماری زبان میں آیا۔ بیورلی نکلس جس نے Verdict of India لکھی ہے۔ ہندوستان کی سیاحت کے دوران میں جگہ جگہ پوچھتا تھا کہ "تھینکس" (Thanks) کے لئے تمہارے یہاں کیا لفظ ہے؟ کسی نے جواب دیا "عنایت" کسی نے کہا "مہربانی"۔ پرنس اعظم جاہ سے جب پوچھا تو انہوں نے بتایا "شکریہ"۔ دوسرے لوگوں نے بھی تائید کی۔ اس نے کہا یہ بڑا اچھا لفظ ہے غالباً شکریہ شکر یا Sugar سے نکلا ہے۔ جبھی تو اس لفظ میں بڑی مٹھاس ہے۔ غرض میرے جذبات ان رسمی الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتے اس لئے میں شکریہ ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ اس کی بجائے میں آپ کے لئے ایک دعا کرتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ جوان رہیں میری طرح کبھی بوڑھے نہ ہوں۔ اس دعا کو کوئی معمولی یا ناممکن بات نہ سمجھیں۔ ہمیشہ جوان رہنا ممکن ہے۔ بیشک جوانی لوٹ کر نہیں آتی۔ لیکن وہ قائم رہ سکتی ہے۔ جوانی کو قائم رکھنے کے لئے زندگی میں کوئی بلند مقصد ہونا چاہیے۔ مقصد سے زندگی بنتی بھی ہے، بڑھتی بھی ہے اور قائم بھی رہتی ہے۔ آپ بار بار مجھے بڈھا اور پیر کہتے ہیں۔ میں ابھی دو سال پہلے تک بڈھا نہیں تھا۔ جوانی چوڑے چکلے سینے، گٹھے ہوئے تنے اور بھاری ڈیل ڈول سے نہیں بنتی اور بڑھاپا سفید بالوں اور کبڑی کمر سے نہیں آتا۔ جوانی ہمت اور عزم سے ہوتی ہے۔ جوان وہ ہے جس کا عزم جوان ہو۔ میں دو سال پہلے جوان تھا۔ لوگ مجھے تیس سال سے بڈھا بڈھا کہتے آ رہے ہیں۔ میں نے اپنے کو کبھی بوڑھا نہیں ہونے دیا۔ لیکن اس دو سال کے عرصہ میں بعض غدار اور دول فطرت ساتھیوں نے مجھ پر ایسے ایسے مظالم کئے کہ میں بڈھا ہو گیا۔ انہوں نے انجمن کو تباہ کرنے کی، میرے رفیقوں اور ہمدردوں کو مجھ سے الگ کرنے کی کوشش تاکہ مجھے ختم کر دیں۔ لیکن مجھے پھر ختم نہ کر سکے۔ انہوں نے سوچا کہ اس کا کام اس سے چھین لیا جائے تو یہ مر جائے گا۔ میں پھر بھی نہ مرا۔ میں اپنی جوانی کو پھر واپس لاؤں گا۔ میں مرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ اور اس وقت تک نہیں مروں گا جب تک اردو یونیورسٹی قائم نہ کر لوں۔ آپ اگر چاہتے ہیں کہ اس کام کی تکمیل ہو جس کے لئے میری تعریف کی گئی ہے تو آپ کو اس کام میں میری مدد کرنی چاہیئے۔ پھر آپ دیکھیں گے کہ میں دوبارہ جوان اور آپ ہی جیسا گبرو جوان ہو جاؤں گا۔

جب میں بھارت سے پاکستان آ رہا تھا تو ایک امریکن پادری نے مجھے ایک کتاب بھیجی تھی (اور اب تو ہماری ہر چیز امریکہ ہی سے آتی ہے) اس کتاب کا پہلا ہی جملہ یہ تھا کہ انسان کی زندگی ستر برس کے بعد شروع ہوتی ہے میں اس وقت اناسی سال کا تھا اور اب نواسی کا ہوں۔ میری زندگی شروع ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ میں اپنے ان نوجوان دوستوں سے جنہوں نے میری اتنی تعریفیں کی ہیں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس کام میں میری مدد کریں۔ میں نے جو یہ تجویز اپنے خطبے میں پیش کی ہے سوچ سمجھ کر پیش کی ہے۔ اس کے پیچھے ایک سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ میں اسے ضرور پورا کر کے رہوں گا۔ اس کو قائم کرنے میں آپ میری مدد کریں۔ آپ کے سامنے انجمن حمایت اسلام کی مثال موجود ہے جو ابتدا میں چھوٹی چھوٹی آنا جمع کر کے قائم کی گئی تھی اور اب وہ ایک عظیم الشان ادارہ ہے جس کی نظیر پاکستان میں کہیں نہیں ملتی۔ اس کے ابتدائی کارکن اور بانی حاجی شمس الدین وغیرہ کو میں نے اپنی آنکھوں سے مزدوروں کی طرح کام کرتے دیکھا ہے اگر اس طرح چھوٹی چھوٹی آنا جمع کر کے اتنا بڑا ادارہ بن سکتا ہے تو کیا آج جب ہماری اپنی حکومت ہے اور مسلمانوں میں صاحب ثروت لکھ پتی اور کروڑ پتی موجود ہیں ایک یونیورسٹی بھی قائم نہیں کی جا سکتی؟ اگر آپ چاہیں تو ایک کیا کئی یونیورسٹیاں بن سکتی ہیں۔ آپ مجھے بار بار "بڈھا بڈھا" کہہ کر خطاب کرتے ہیں۔ میں پھر جوان بنوں گا اور دوسرے بڈھوں کو بھی جوان کر دوں گا۔

جب دلی میں ہنگامہ برپا تھا، مسلمان کٹ رہے تھے اور گلی کوچوں میں لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ میں اس وقت حیدر آباد میں تھا۔ مرزا اسمٰعیل نے اردو ہندی قضیے کی بنا پر انجمن کی امداد بند کر دی تھی میں اس کے اجراء کے لئے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے واپس ہونے لگا تو بھوپال کے اسٹیشن پر شعیب قریشی آ کر مجھ سے ملے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ "تم کہاں جا رہے ہو؛ دلی میں تو قیامت برپا ہے"۔ میں نے کہا "اخبار والے یونہی اڑاتے ہیں"۔ کہنے لگے "ہرگز نہ جاؤ۔ یہ خبریں بالکل سچ ہیں۔ وہاں جا کر کوئی مسلمان زندہ نہیں بچ سکتا"۔ میں نے کہا "جو کچھ بھی ہو میں تو جاؤں گا"۔ کہنے لگے "اگر نہ مانے تو میں نواب صاحب سے کہہ کر وارنٹ جاری کراؤں گا اور تمہیں گرفتار کر لوں گا"۔ میں وہاں رک گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دلی میں حالات واقعی بہت خراب ہیں۔ انجمن کا دفتر بھی جلا دیا گیا، اور سب کچھ تباہ ہو گیا۔ میرے ساتھ ٹرین میں کچھ نوجوان حیدر آبادی طلبا تھے جو مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور علی گڑھ جا رہے تھے۔ وہ سب کے سب قتل کر دیئے گئے افسوس کہ میں بچ گیا۔ میں شعیب قریشی کو کبھی معاف نہ کروں گا کہ انہوں نے مجھے روک لیا۔ میں اگر مر گیا ہوتا تو مجھ جیسا گنہگار شہادت کا درجہ تو نہ پا سکتا لیکن وہ ذلت و رسوائی تو نصیب نہ ہوتی جو یہاں آ کر ہوئی۔

اسی دوران میں، سر تیج بہادر سپرو کو دیکھنے الٰہ آباد بھی گیا۔ وہ ہماری انجمن کے صدر تھے اور اس زمانے میں بستر علالت ملک بستر مرگ پر تھے ہاتھ پاؤں بھی نہیں ہلا سکتے تھے صرف زبان کام دیتی تھی۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ آج کل اردو کا نام لینا جرم ہے اور حالات نے ثابت کر دیا کہ اردو کا نام لینا واقعی جرم تھا۔ اردو کی حالت بھارت میں جو کچھ ہے آپ کو معلوم ہے "تحریک" کے ایڈیٹر گوپال متل صاحب جو اردو کے بڑے حامی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ چوتھائی صدی یعنی پچیس برس میں بھارت میں اردو کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ میں ہندوستان میں رہ کر اردو کی خدمت کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے کام نہیں کرنے دیا گیا۔ ابوالکلام آزاد نے مجھ سے کہا "تم یہاں کام نہیں کر سکتے، پاکستان چلے جاؤ"۔ میں نے کہا "میں دنیا میں ہر جگہ کام کر سکتا ہوں، جہاں اردو پیدا ہوئی اور جہاں کی وہ زبان ہے وہاں اس کے لئے کام کیوں نہ کروں میں ضرور کام کروں گا"۔ اس پر انہوں نے کہا "یہاں کے حالات ٹھیک نہیں۔ اگر تم نہیں جاؤ گے تو تمہارے گھر میں چرس یا افیون رکھ کر تمہیں گرفتار کر لیا جائے گا"۔ میں نے سوچا چلو پاکستان ہمارا ملک ہے وہاں اردو کے لئے آزادی سے کام کریں گے۔ یہاں آ کر میں نے از سر نو انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اردو کالج بنایا۔ مگر اب معلوم ہوتا ہے کہ اگر بھارت میں اردو کا مستقبل تاریک ہے تو پاکستان میں بھی دھندلا ہے، روشن نہیں۔

اس لئے ہمیں اردو کی حفاظت اور بقا کی خاطر کام کرنے اور زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔ میں اپنے نوجوان دوستوں سے پھر کہتا ہوں کہ اگر انہیں پاکستان کی ترقی اور بقا منظور ہے تو اردو کے فروغ کے لئے دل و جان سے کوشش کریں۔ اردو کو آپ معمولی زبان نہ سمجھیں اس میں ہماری ثقافت، مذہب اور قومی روایات کا سرمایہ محفوظ ہے بقیہ وہ سب زبانیں جو مسلمانوں کی کہی جاتی ہیں بت پرستوں اور کافروں کی بنائی ہوئی ہیں۔ یہ اصل اسلامی زبان ہے اور ہمارے بزرگوں کی بدولت وجود میں آئی۔ افسوس ہم نے اس زبان کی کوئی قدر نہیں کی۔ خیر اب بھی وقت ہے کہ ہم اس کی حفاظت کو اپنا پہلا فرض سمجھیں ہر زمانے میں حالات کے مطابق نیکی کی صورت بدل جاتی ہے۔ وبا کے زمانے میں بیماروں کی خدمت کرنا اور تیمارداری کرنا سب سے بڑا ثواب ہے، قحط کے زمانے میں بھوکوں کو کھانا کھلانا نماز سے بڑھ کر عبادت ہے۔ اس ابتلا کے دور میں جب کہ اردو پر ہر طرف سے حملہ ہو رہا ہے اور اس کا وجود خطرے میں ہے، اردو کی خدمت کرنا اور اسے فروغ دینا ایک عبادت ہے۔ میں آپ سے، یعنی ارکان بزم فروغ اردو سے کہتا ہوں کہ آپ اس کام میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ آپ نے یہ بزم فروغ اردو فروغ اردو کے لئے قائم کی ہے، اور اردو یونیورسٹی میں فروغ اردو کے لئے زیادہ موقع ملے گا۔ ایک جرمن فلسفی نے دنیا کے کئی ملکوں کی سیاحت کی اور اپنی سیاحت کے حالات میں ایک کتاب "The Diary of A Philosopher" کے نام سے لکھی ہے وہ ہندوستان بھی آیا تھا۔ جب وہ جاپان گیا تو ٹوکیو یونیورسٹی میں جاپانی طلبا سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ تم اور جس چیز کو چاہو بھول جاؤ لیکن اپنی قومی زبان کو کبھی نہ بھولنا۔ میں وہی الفاظ آپ تک پہنچاتا ہوں اور ان میں اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ صرف نہ بھولنا کافی نہیں بلکہ جہاں بھی ہو اور جس حالت میں بھی ہو اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے اپنی بساط بھر کوشش کرتے رہنا۔ آخر میں میں پھر آپ کے لئے دعا کرتا ہوں کہ خدا آپ کو ہمیشہ جوان رکھے اور آپ کی ہمت اور ارادوں میں برکت عطا فرمائے۔

بابائے اردو کی لغت نگاری

بابائے اردو نے زندگی بھر اردو زبان کے لئے بہت کچھ کیا ہے، اس سلسلے میں انہوں نے ان گنت معرکہ آرائیوں میں حصہ لیا۔ کامیابی بھی حاصل ہوئی اور ناکامی کا منہ بھی دیکھنا پڑا لیکن انہوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور کامیابی اور ناکامی سے بے نیاز ہو کر اپنا کام پوری تندہی سے جاری رکھا۔ کامیابیوں کی طرح ان کی ناکامیوں کی روداد بھی خاصی طویل ہے جس میں "اردو لغت کبیر" کی تکمیل کا منصوبہ سر فہرست ہے۔ ابتدا ہی سے انھیں اردو کی ایک لغت کے تیار کرنے کا خیال تھا جو ہر اعتبار سے جامع اور مثالی ہو۔ ۱۹۳۰ء میں اس خیال کی عملی تشکیل کا وقت آیا جب کہ حیدر آباد دکن کی حکومت نے مولوی صاحب مرحوم کو اس مقصد کے لئے ایک ہزار روپے ماہوار دس سال تک کے لئے کی امداد کی۔ مولوی صاحب نے اہل علم کی ایک پوری جماعت کو ساتھ لے کر اس کام کا آغاز کیا۔ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی، سید ہاشمی فرید آبادی۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی اور مولوی احتشام الدین دہلوی وغیرہ نے اس لغت کی تیاری میں قابل قدر کام انجام دیا۔

۱۹۴۷ء تک اس لغت پر خاصا کام ہو گیا اور ابتدائی اجزا حیدر آباد کے سرکاری مطبع میں چھپ بھی گئے۔ لیکن ۱۹۴۷ء کی المناک حوادث کی آندھی نے اس لغت کے ایک ایک ورق کو اڑا دیا۔

پاکستان آنے کے بعد بابائے اردو نے اس کام کی طرف دوبارہ توجہ کی انجمن ترقی اردو کی سالانہ روداد برائے یکم اپریل ۱۹۵۵ء تا ۳۱ مارچ ۱۹۵۶ء میں بابائے اردو لکھتے ہیں :۔

> اردو زبان میں لغات کی کمی نہیں۔ ابتدا میں اہل یورپ خاص کر انگریزوں نے بہت سی اردو انگریزی اور انگریزی اردو لغات لکھیں۔ اس کے بعد خود اہل زبان نے بھی اپنی لغات تالیف کیں۔ ان میں بعض ضخیم اور بہت قابل قدر ہیں۔ ان کے مؤلفین نے بہت محنت اور شوق سے اس مشکل کام کو انجام دیا ہے۔ لیکن یہ کتابیں کئی اعتبار سے ناقص ہیں۔ مثلاً الفاظ کی تعریف بیان نہیں کی جاتی مترادف لکھ دیئے جاتے ہیں۔ الفاظ کی اصل کی تحقیق بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہماری زبان کے ہزار ہا الفاظ ایسے ہیں جو ان لغات میں درج نہیں ہوتے۔ یہ بحث بہت طویل ہے اور اس رپورٹ میں اس کی گنجائش نہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایک جامع لغات لکھنے کا ارادہ ایک مدت سے تھا۔ اور اس کے لئے سامان جمع کرتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں ایسی جامع لغات کی تالیف ایک شخص کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اور لائق مددگاروں کی بھی۔ ایک عرصہ کے بعد حسن اتفاق سے مجھے یہ موقع دوران ملازمت حیدر آباد دکن میں مل گیا تھا۔ میں نے سابق حکومت نظام سے جو علم و ادب کی بہت بڑی سرپرست تھی، درخواست کی۔ حکومت نے میری درخواست کو شرف قبول بخشا اور ضروری مصارف اور عملے کی تنخواہ کے لئے معقول سالانہ امداد منظور کی یہ کام ایک خاص اہتمام اور اصول کے تحت شروع ہوا جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ غرض پندرہ سال شب و روز کی محنت کے بعد کتاب کا بڑا حصہ تیار ہو چکا تھا۔ اور اس کی نظر ثانی کی جا رہی تھی اور باقی حصہ معرض تکمیل میں تھا کہ اتنے میں دہلی میں جو ہولناک فسادات

ے سے انجمن بھی نہ بچی۔ اس کا سارا سامان اور کتب خانے ایک حصہ تباہ و برباد ہو گیا۔ اور لغت کا سرمایہ بھی تلف کر دیا گیا۔

انجمن یہاں بے سر و سامانی کی حالت میں آئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے ہمت نہ ہاری اور از سر نو انجمن کے کام کا آغاز کیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب انجمن کا کام چل نکلا تو پرانے شوق نے پھر گدگدی کی اور پھر لغات کا کام لے بیٹھا لیکن انجمن کے کام کا اسقدر بار ہے کہ اس کیلئے فرصت ملنی دشوار ہے۔ اور سرمایہ اور سامان کی کمی دوسری بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سے کام کی رفتار بہت سست رہی یعنی اس وقت تک ابتدائی دو حرفوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگر اس میں کچھ اور اضافہ ہو گیا اور سرمائے نے بھی مساعدت کی تو اشاعت کی فکر کی جائے گی۔"

اسی طرح مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام مکتوب مورخہ ۱۹ر فروری ۱۹۵۰ء میں لکھتے ہیں :۔

"سالہا سال کی محنت دلی میں آزادی کی نذر ہو گئی تھی۔ اس کا صدمہ ایسا تھا کہ بھلائے نہ بھلا سکا۔ جب یہاں قدم جمی طرح جم گئے تو میں نے پھر کام شروع کر دیا۔ تنہا تھا، کوئی مددگار نہ تھا۔ اتنی مقدرت نہ تھی کہ مدد کے لئے کسی کو ملازم رکھ لیتا انجمن کی مالی حالت بھی تقیم تھی۔ کئی سال تک دن رات کام کرتا رہا۔ ا۔ ب۔ بھ مکمل کئے جو تخمیناً دو ہزار صفحات پر ہیں۔"

ا۔ ب اور بھ کا مکمل مسودہ اور بقیہ حروف سے متعلق مواد کارڈوں کی شکل میں محفوظ ہے۔ مسودہ خود بابائے اردو کے قلم سے ہے۔ ذیل میں اس کے دو صفحات بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

بھ (مث) ابجد کا تیسرا حرف - یہ حرف خالص ہندی ہے۔

بھابر (بھابڑ) (مث) ۱- ایک قسم کی گھاس جس سے رسیاں بنائی جاتی ہیں - ۲- ہلکی سیاہ مٹی کی زمین [ہ]

بھابی
بھابھی } (مث) بھائی کی بیوی ، بھاوج - [ہ : بھائی بھی - س: بھراتری ددھو भ्रातृवधू]

بھاپ (مث) ۱- وہ گرم گرم بخارے جو کسی مرطوب شے سے گرمی

کی حرارت سے ~~نکلتی~~ اٹھیں - ۲- گرم ہوا جو گرم چیز سے
یا آدمی کے منہ سے نکلتی ہے - ۳- گرم ہو جو تازہ پکی ہوئی
چیز سے نکلے، دھواں - [ہ: بھاپ - س: واشپ
(مصادر: اٹھنا، نکلنا) وا شپ]

— بھرنا (ف م) - پرندوں کا اپنے بچوں کو دانہ بھرنے سے پہلے
روز تک صرف اپنے منہ کی ہوا اُن کے منہ میں
دو تین
پھونکنا

بھات (مذ) ۱- اُبلے ہوئے چاول، خشکا - ۲- ایک رسم
کا نام جو شادی بیاہ کی تقریب میں ادا کی جاتی ہے اور جس میں
ننھیال والوں (نانا ماموں) کی طرف سے دلہن والوں کو
مونگ چاول گُڑ کی بھیلی، پوشاک اور کچھ نقدی پیش کرتے ہیں۔
۳- میٹھے چاول جو ہندو سیتلا پر چڑھاتے ہیں - ۴-
چمڑا پکا کرنے کے مسالے کا محلول جو تیاری پر لگایا جاتا ہے -
[ہ: بھات - س: بھکت ۱۰]

بھاتی (مذ) ۱- شادی کا بھات لانے والے - ۲ (مث)
ننھیال والے شادی میں جو کچھ لاتے ہیں اُس کا عوض لیں

سے تو شمار تہیا لینے بھالی کہتے ہیں ۔ جس کا عوض ہوتا ہے
کہلاتی ہے [ف۔ دیکھو بات]

بھاٹ (مذ) ۱۔ ہندوؤں کی ایک قوم کا نام جو نسب نامے یاد رکھتی ہے۔ ۲۔ بخشش کرنے والا، خوشامدی ۔ ۳: انگریزی قوال گویا تو انگریزوں کے بھاٹ ہیں (نذیر احمد) [س: بھٹ]

بھاٹا (مذ) ۱۔ سمندر کے پانی کا اُتار، جزر ۔ یہ لفظ جوار کے ساتھ آتا ہے جو اس کی ضد ہے ۔ یعنی جوار بھاٹا
۲۔ سیلابی زمین یعنی مد و جزر [ف]

بھاجی (مث) ۱۔ پکا ہوا ساگ پات یا ترکاری ۔ ۲۔ وہ کھانا جو کسی تقریب میں برادری میں تقسیم ہوتا ہے ۔ ۳۔ حصہ، بخرا، کھانے پینے کی چیز کا حصہ (مصدر: بانٹنا) ۔ [ماده: بھاجی تقسیم کرنا]
بھاجی سا ۔ س: [کمت بھاجی ہے س: بھاجیت
بھجیجہ، کھوتا
— دار (مذ) حصے دار، جیسے اشتراکی معاشرے میں برابر کا حصہ دار ۔

بھادوں (مذ) ہندی سال کا چھٹا مہینہ (نصف اگست سے نصف ستمبر تک) ۔ [~~[illegible]~~ ۔ س: بھادر ۔ بھدر]

— کی بھرن (مث) بھادوں کے مہینے کی بھاری بارش جس سے کھیت اور تالاب بھر جاتے ہیں [ ] سے

کہوں کیا حال چشم خوں فشاں کا
بھرن بھادوں کی ساون کی جھڑی ہے (خالہ)

— ڈونگرے (مذ) بھادوں کے مہینے کی ہلکی بارش، ہمیشہ سا برس کر نکل جانا۔

بھار (مذ) (عوام) بوجھ، وزن [س: بھار]

بھارت (مث) ۱۔ سنسکرت کی مشہور رزمیہ نظم جس میں جودھشٹر کی جنگ کا حال ہے۔ ۲۔ ملک کا نام، انڈیا۔ یہ نام ملک کا اس لیے پڑ گیا کہ یہ علاقہ دشینت کے بیٹے بھارت کے حصے میں آیا تھا [س۔]

بھارجا (مث) ۱۔ راگنی کا نام۔ ۲ (پوربی) (جمع کی حالت میں) خوشامد، پیروی، ساتھی۔ ۳: وہ تو بیچارے کچھ کہتے نہیں، ان کے بھارجے ناک میں کیے ڈالتے ہیں (نور اللغات۔ ۳۔ (جناز؟) غصہ، خفگی، بات بات پر روٹھنا بدمزاجی کا بھارجے بگڑ گئے ہیں (نور) لوازم۔ ۲: [ی ۔۔۔ ۱۰ بھارجا۔ س: بھاریا]

ایک اہم دستاویز

بابائے آردو اور بابو راجندر پرشاد سابق صدر جمہوریہ ہند کا مشترکہ

Joint statement

e had an opportunity, on the occasion of the meeting of Urdu Committee at Patna on 28.1.37 to discuss the problems n Hindustani language with each other and with other friends. We were anxious to remove the nderstandings which have been unfortunately created nection with the Urdu-Hindi-Hindustani controversy. We are glad to be able to say that, as a result of cussions ranging over various aspects of this problem found ourselves in substantial agreement about main raised.

باقی دوسری طرف

language of [illegible] should be written [illegible] in the Nagari characters, which should be recognised for official and educational purposes. By Hindustani we [illegible] the largest common factor of the languages spoken [illegible] India and we believe that common usage should [illegible] criterion for the selection and inclusion of words in it [illegible]
We are further of opinion that the fullest opportunities [illegible] be vouchsafed both to Urdu and Hindi as literary [illegible]
We suggest that an attempt should be made to com[illegible] through the cooperation of Urdu and Hindi scholars, a [illegible] basic vocabulary of Hindustani words.
In order to devise practical measures for the compilation [illegible] such a vocabulary as well as for settling various other [illegible] problems like the selection of technical terms we [illegible] that a small representative committee, consisting of influential [illegible] persons of Urdu and Hindi who believe in the desirability [illegible] need of bringing the two languages nearer and of pro[illegible] the development of the Hindustani language and thus creating good will amongst the speakers of [illegible] languages — should be convened at an early date.

Abdul Haq

Rajendra Prasad

ایک تاریخی دستاویز

۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی کی سینیٹ میں "ہندوستانی" کو میٹرک تک ذریعہ تعلیم بنانے کی تحریک پیش کی گئی۔ انگریزی کی بجائے کسی ملکی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانا ایک اچھی بات تھی، لیکن "ہندوستانی" سے کون سی زبان مراد لی جائے؟ مذکورہ تحریک میں اس کی کوئی وضاحت نہ تھی، جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ ہندی کو آگے بڑھانا مقصود تھا۔ اہل اردو کے لئے اس موقع پر خاموش رہنا مشکل تھا۔ لہٰذا ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کو انجمن ترقی اردو کی صوبائی شاخ نے پٹنہ میں ایک خاص اجلاس منعقد کیا جس میں خاص خاص "اہل اردو" شریک ہوئے۔ جلسے کی صدارت سید سلیمان ندوی نے کی۔ اس جلسے میں بابو راجندر پرشاد سابق صدر ہند نے بھی شرکت کی اور شرکائے اجلاس سے "ہندوستانی" کی تعریف کے بارے میں گفتگو کی۔ آخر بالاتفاق روداد [illegible] بابو راجندر پرشاد کی طرف سے [illegible] ایک بیان شائع کیا گیا جس کا عکس اسی شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔ یہ بیان بابو راجندر پرشاد کے قلم سے ہے اس بیان کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

"بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء کے زمانے میں ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ "اردو"، "ہندی"، "ہندوستانی" کے مناقشے میں جو افسوسناک غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، انہیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سلسلے میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں۔

چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہیئے اور یہ اردو رسم الخط اور دیوناگری دونوں میں تحریر ہو اور اسے دفتری اور تعلیمی اغراض کے لئے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہیئے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے۔ اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے قبول و انتخاب کا معیار بھی یہی عام استعمال ہونا چاہیئے۔ مزید برآں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبان ترقی کرنے کے پورے مواقع دیئے جانے چاہئیں۔

ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندوستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر سا کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہو جانا چاہیئے جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں تاکہ اس طرح ان دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔

(دستخط) عبدالحق

(د) راجندر پرشاد

مورخہ ۲۸ اگست ۱۹۳۶ء

محمد اکبرالدین صدیقی

بابائے اردو اور رسالہ افسر

قومی زبان کے عبدالحق نمبر کے مطالعے کے دوران ایک چیز نے تفکر میں ڈال دیا کہ رشید احمد صدیقی نے رسالہ افسر کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کو بابائے اردو نے جاری کیا۔ عابد رضا بیدار نے بھی بیگم حیدری کے ہماری زبان میں لکھا کہ بابائے اردو نے افسر جاری کیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ادارہ ادبیات اردو کے کتب خانہ میں افسر کی پہلی جلد موجود ہے اس کا سرورق اس طرح لکھا ہے۔

کرپٹ کا نشان

افسر

جلد (۱) — بابت ماہ اپریل ۱۸۹۷ء — نمبر (۱)

مرتبہ

عالی جناب نواب میجر افسرالدولہ بہادر کمانڈر امپیریل سروس ٹروپ د گولکنڈہ بریگیڈ دا ایڈیکانگ اعلیٰ حضرت بندگان عالی حضور پرنور والی ریاست حیدرآباد۔ دکن۔

مطبوعہ۔ مطبع معلم شفیق واقع گوشہ محل، حیدرآباد۔ دکن

اور اس کی پشت پر دستورالعمل رسالہ افسر کے ذیل میں پانچواں فقرہ ہے۔

(۵) خریداری کی نسبت درخواست یا تو براہ راست نواب میجر افسرالدولہ بہادر یا نواب ممتاز یار جنگ بہادر کپتان فوج صرف خاص یا خادم الملک محب حسین معتمد دفتر رسالہ مذکور سے کی جا سکتی ہے۔

اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ افسر کا اجراء افسرالدولہ کے ایما پر ہوا اور رسالہ کا کاروبار محب حسین انجام دیتے تھے۔ محب حسین حیدرآباد کی ذی علم، روشن خیال، وسیع القلب، اور حامی ترقی نسواں شخصیت تھے وہ اس سے قبل معلم، معلم شفیق پرچے نکال چکے تھے۔ اپنا ایک مطبع معلم شفیق کے نام سے قائم کر چکے تھے۔ معلم نسواں نامی ایک پرچہ بھی نکالا اخبار شرر کے قریبی دوستوں میں تھے اس لئے کہ تاسیس کی پشت پر فقرہ (۵) کی جو عبارت درج ہوئی ہے اس کے بعد دلگداز کا اشتہار دیا ہے۔ ادارہ کے کتب خانہ میں یہ جلد ان کے صاحبزادے صادق حسین صاحب نے داخل کی ہے۔ اس میں اپریل ۱۸۹۷ء سے دسمبر ۱۸۹۷ء تک کے پرچے شامل ہیں۔ پہلے پرچہ پر تو بحیثیت مرتب افسرالدولہ کا نام ہے۔ دوسرے اور تیسرے پر کسی کا نہیں۔ چوتھے اور پانچویں شمارے پر بہ سرپرستی افسرالدولہ لکھا گیا ہے۔ اور مطبع کا نام مطبع معلم نسواں واقع گوشہ محل لکھا ہے۔ مطبع وہی ہے صرف نام بدلا ہے۔ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں … ماہنامہ معلم شفیق بھی تھا اور ایک معلم نسواں بھی۔ چھٹے شمارے پر جو ستمبر ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا، سرپرستی افسرالدولہ کے ساتھ ساتھ باہتمام نواب ممتاز یار جنگ کپتان فوج صرف خاص وغیرہ اور پھر اس کے نیچے مرتبہ خادم قوم محب حسین مترجم …

تحریر ہیں اس طرح پانچ پرچوں کی اشاعت کے بعد چھٹے پرچے پردہ ظاہر ہو رہے ہیں۔ اس کے بعد تینوں پرچوں پر یہی نامیں کا تسلسل قائم ہے اور ۱۸۹۵ء پر ختم ہو جاتا ہے اس میں صرف ایسے مضامین شائع ہوتے تھے جن کا عام دلچسپی سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ خالص علمی حضرات کے لئے یہ پرچہ شائع ہوتا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۸۹۰ء اور سنہ ۱۸۹۹ء کی جلدیں دستیاب نہ ہو سکیں۔ البتہ سنہ ۱۹۰۰ء کی مکمل جلد ادارہ کے کتب خانہ میں موجود ہے اور اس کے جنوری کے پرچے کا سرورق اس طرح لکھا ہے۔

انچہ دانی بشمار انچہ ندانی بشنو

افسر

جلد (۴) یکم جنوری سنہ ۱۹۰۰ء نمبر (۱)

ایڈیٹر عبدالحق بی۔ اے

مضامین	صفحہ	مصنف
حکمت ظاہری و باطنی (نظم)	۱	حقائق آگاہ جناب سید منظیر شاہ صاحب قادری چشتی (اس کے صلے میں ایک اشرفی نذر کی گئی)
دارالعلوم اسلامی	۱۱	عالی جناب نواب عماد الملک بہادر مولوی سید حسین صاحب بلگرامی بی۔ اے ڈائرکٹر انسٹرکشن۔ حیدرآباد
	۳۱	
سگنلنگ کا استعمال Signalling	۳۹	جناب مولوی محب حسین صاحب ایڈیٹر معلم نسواں

مطبوعہ حیدرآباد پریس متصل پل چادر گھاٹ، بازار عیسیٰ میاں، حیدرآباد

دوسرا فقرہ ہے کہ اس رسالے میں ہر قسم کے علمی اخلاقی، تاریخی، فلسفی، اور تمدنی و قومی مضامین درج ہوں گے، عمدہ کتابوں پر ریویو بھی لکھے جائیں گے۔

تیسرا فقرہ نہایت اہم ہے۔ (۳) ہر ماہ سب سے عمدہ مضمون کے لئے ایک اشرفی نذر کی جائے گی۔

چوتھا فقرہ ہے۔ قیمت سالانہ (للعہ) روپے جب تک قیمت پیشگی نہ آئے گی رسالہ جاری نہیں ہو سکتا۔

پانچواں فقرہ۔ مہربانی سے حضرات نامہ نگار اپنے مضامین صاف و خوشخط لکھا کر بھیجیں۔

چھٹا فقرہ۔ اس رسالہ کے متعلق تمام خط و کتابت ایڈیٹر سے ہونی چاہیے۔

نون سلطانی کلب۔ ملک پیٹھ } عبدالحق بی اے
حیدرآباد۔ دکن } ایڈیٹر

بابائے اردو نے حضرت بے نظیر کی نظم سے پہلے یہ نوٹ تحریر فرمایا ہے۔

"اس بے مثل نظم کے مصنف حقائق آگاہ فضیلت دستگاہ جناب سید بے نظیر شاہ ہیں، جنہوں نے اردو نظم میں ایک خاص رنگ پیدا کیا ہے۔ ان کی مثنوی کی ایک جلد طبع ہو چکی ہے۔ اور باقی جلدیں اور نیز بے شمار اشعار ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں۔ ان کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اردو نظم کو کس کمال رتبہ تک پہنچایا ہے چنانچہ یہ نظم جو ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے خود اس امر کی شاہد ہے اس میں فلسفہ، تصوف، سائنس اور شریعت کے مسائل پہلو بہ پہلو موجود ہیں اور کس خوبی اور لطافت سے ان پر بحث کی ہے۔ اس قسم کے دقیق اور سائنٹفک مسائل کو اردو میں اب تک کسی نے نظم نہیں کیا اور باوجود اس کے شاعری کے پہلو کو ہاتھ سے جانے

[illegible] صاحب [illegible] نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے۔ یہ نظم حضرت نے خاص ہماری استدعا سے اس رسالے کے لئے لکھی ہے چنانچہ ہم نے ایک [illegible] ان کی زندگی میں چھاپنا چاہا مگر اس وجہ سے منظور نہ فرمایا کہ یہ رسالہ کا اول انعام ہے اور اس کا رد کرنا مناسب نہیں۔ ہم حضرت [illegible] صاحب کے تہ دل سے ممنون ہیں اور اس بے نظیر نظم کو فائدہ عام کے لئے شائع کرتے ہیں۔

اسی جلد میں مارچ [illegible] کے شمارے میں بابائے اردو کا ایک مضمون "ہلال اور تارا" ہے جو حاجی محمد اسمٰعیل خاں صاحب کے مضمون کے جواب میں لکھا گیا۔ ہم قارئین کی دلچسپی کے لئے پیش ہے۔ مخفی مبادکہ معارف جنوری [illegible] میں جاری ہوا اور اس وقت حاجی محمد اسمٰعیل خاں اور مولانا وحید الدین سلیم اس کے مدیر تھے۔

ہلال اور تارا

عبدالحق بی اے، منقول از "افسر" جلد ۴ نمبر ۳ مارچ [illegible]

ایڈیٹر معارف نے ایک مضمون بعنوان "ہلال اور تارا" لکھا ہے، عنوان مضمون کے دیکھنے سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ غالباً اس پر علمی یا تاریخی لحاظ سے نظر ڈالی ہوگی لیکن مضمون کے پڑھنے سے ہمیں مایوسی ہوئی اور وہ مایوسی اس وجہ سے نہیں کہ اس پر کوئی محققانہ بحث نہیں کی گئی بلکہ اس لئے کہ اس کے غلط معنی سمجھے گئے اور بے وجہ غلط نتائج نکالے گئے۔

حاجی صاحب نہایت دل سوزی کے ساتھ مسلمانان ہند کو نصیحت فرماتے ہیں کہ وہ ہلال اور تارے کے نشان کو بالکل ترک کر دیں کیونکہ اس سے ان کی وفاداری سلطنت موجودہ میں فرق آتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیالات زیادہ تر سلطان روم کی طرف مائل ہیں۔ اس کے بعد وہ اس امر کے ثبوت میں کہ گورنمنٹ برطانیہ کی اطاعت اور وفاداری مسلمانوں پر فرض ہے۔ احادیث اور آیات قرآنی نقل فرماتے ہیں۔ اور بار بار نصیحت کرتے ہیں۔

لیکن اگر حاجی صاحب موصوف اس کو تاریخی نظر سے دیکھتے اور کسی قدر تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا فرماتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ آج کل ہلال اور تارے کو ترکی سلطنت سے کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ ہلال اور تارا عام طور پر تمام ممالک میں ترقی اور اقبال مندی کی نشانی سمجھا جاتا ہے اول اول یہ نشان یونانیوں کا تھا اس کے بعد ترکوں نے اختیار کیا۔ لیکن آج کل عام ہو گیا ہے۔ چنانچہ ماسکو اور نیز روس کے دوسرے مقامات میں چرچوں (گرجاؤں) کے اوپر اکثر یہ نشان نظر آتا ہے، تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ گرجا ترکی ہیں یا روس کی رعایا کے خیالات زیادہ تر سلطان روم کی طرف مائل ہیں اور وہ اپنے بادشاہ کے سچے خیر خواہ اور مطیع نہیں ہیں کس قدر نازیبا اور قابل مضحکہ ہوگا۔

انگلستان میں یہ نائٹ ہڈ کا بھی نشان تھا۔ اور چارلس اول (والی نیپلز) نے ۱۲۶۸ء میں اسے قائم کیا اور بعد ازاں رینی ڈیوک آف انجو نے دوبارہ [illegible] میں رواج دیا۔

[illegible] میں جنگ ابوقیر کے بعد سلطان سلیم ثالث نے نیلسن کو شکریہ میں ایک ہلال بھیجا جس میں ہیرے اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ کسی خاص خطاب کا نشان نہ تھا۔ اور نہ اس سے یہ مقصد تھا لیکن نیلسن نے اسے اپنے کوٹ پر لگایا اور وہ اپنے آپ کو نائٹ آف کریسنٹ (ہلال کا نائٹ) کہنے لگا۔ سلطان سلیم اس بات سے بہت خوش ہوا کہ میرے تحفے کی اس قدر قدر کی گئی اور اس لئے سنہ ۱۸۰۱ء میں انہوں نے ایک خاص آرڈر آف کریسنٹ (خطاب ہلال) قرار دیا۔ لیکن یہ نشان ہمیشہ عیسائیوں یا دیگر مذاہب کے لوگوں کو دیا جاتا ہے جب کہ وہ عثمانی سلطنت کی کوئی خاص خدمت کرتے ہیں۔

بعض مؤرخوں نے ہلال اور تارے کے نشان کو صلیبی لڑائیوں یا مورز آف اسپین (مسلمانان ہسپانیہ) سے منسوب کیا ہے۔ مگر یہ ایک سخت تاریخی غلطی ہے اور عدم واقفیت اور تحقیق پر مبنی ہے۔

اس تحقیق سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہلال اور تارے کو آج کل سلطنت سے کوئی ایسی خصوصیت نہیں [illegible] سلطنت

زمانہ سے ساتھ [illegible] استعمال کیا جاتا ہے [illegible] ہلال [illegible]
چنانچہ مثلاً کریسنٹ (ہلال) خوش نمائی اور شائستگی کے مترادف آتا ہے۔ رائل کریسنٹ ایک قسم کی [illegible] ہے جو مثل [illegible]
لہٰذا یہ خیال محض غلط ہے کہ مسلمان اس نشان کو اس لئے استعمال کرتے ہیں کہ وہ سلطنت عثمانی کو اپنی سلطنت یا سلطان کو اپنا بادشاہ خیال کرتے ہیں بلکہ صرف اسی طور پر استعمال کرتے ہیں جیسے کہ روس کے چرچوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یا مثلاً حیدرآباد میں سرکاری چیزوں اور گاڑیوں پر ہلال اور تارے کا نشان بنا ہوا ہے تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ریاست حیدرآباد کو سلطنت ترکی سے کسی قسم کا تعلق ہے اور مسلمانوں ہی پر کیا موقوف ہے بلکہ بعض ہنود بھی اس نشان کو استعمال کرتے ہیں۔ تو ایسی صورت میں حاجی صاحب موصوف کا خواہ مخواہ بدگمانی کرنا یا مسلمانوں کے خیالات کو اس طرف رجوع کرنا محض لاحاصل ہی نہیں بلکہ ان کو تکلیف پہونچانا ہے۔ مسلمان اپنے بادشاہ اور گورنمنٹ کے سچے خیرخواہ اور وفادار رہے ہیں اور اس میں کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں۔

ہر زندہ شے کے لئے نشوونما اور تغیر لازم ہے۔ یہ قانون قدرت ہے۔ لیکن اگر اس قانون کے ساتھ انسانی سعی شریک نہ ہوگی تو بہت جلد وہ ترقی رک جائے گی۔ نشوونما کی ترقی کے لئے انسانی سعی لازم ہے جو چیزیں ہمیں بچپن میں بہت عزیز تھیں وہ بڑے ہو کر بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں۔ بچپن میں جو کتابیں ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے بڑے ہو کر ان میں وہ دلکشی نہیں رہتی۔ یہی حال ادب کا ہے۔ زمانہ گذشتہ کا ہمارا ادب اور اس کا اکثر حصہ ویسا کارگر اور پر اثر نہیں رہا جیسا کہ اس وقت تھا۔ وہ اس زمانے کے اقتضا کے مطابق تھا اور اب زمانہ کا اقتضا کچھ اور ہے . . . . عمر کے ساتھ انسان کا ذوق بھی بدلتا رہتا ہے اس لئے ہمیں صرف اپنے اسلاف کی پونجی ہی پر قانع نہیں رہنا چاہیئے بلکہ ہمیں خود بھی اپنے زمانے کے حالات کی رو سے ترقی اور اصلاح میں (جہاں تک زبان کی ساخت اجازت دے) لگاتار اور بے دریغ کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے لئے گذشتہ زمانے میں بہت کچھ ہے، لیکن سب کچھ نہیں۔ بیشک گذرا ہوا زمانہ قابل احترام ہے لیکن آئندہ زمانہ اس سے بھی زیادہ احترام کے قابل ہے جس شخص کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف رہتی ہے اور آگے نہیں دیکھتا کبھی دنیا میں سرسبز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اصلاح کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہئے۔ جو چیزیں فرسودہ اور بیکار ہو گئی ہیں ان کے بے تامل ترک کر دینے میں اور جو کارآمد اور مفید ہیں ان کے اختیار کرنے میں کبھی نہیں چوکنا چاہئے۔

([illegible])

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

بابائے اردو کی اردو

اردو اور بابائے اردو آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح اردو ادب کی تاریخ بغیر بابائے اردو کے مکمل نہیں کی جا سکتی ٹھیک اسی طرح بابائے اردو کی تاریخ بغیر اردو کے مکمل نہیں۔ اردو ان کی آنکھوں کا تارا اور وہ خود اردو کی زندگی کا سہارا ہیں۔ وہ بچے تھے تو اردو کے گہوارے میں پلے، جوان ہوئے تو اردو سے عشق کیا اور بڑے بوڑھے ہوئے تو اردو ان کی پروردہ قرار پائی۔ اردو ادب کے وہ ثقافتی اور نفسیاتی اثرات ہی تو ہیں جن کی وجہ سے بابائے اردو کی ذات میں شرافت و محبت کے اعلیٰ جوہر موجود ہیں اور اخلاقی جہات ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

انہوں نے کم و بیش ساٹھ سال اردو کی خدمت کی ہے اور زبان و ادب کے بہت سے گوشے روشن کئے ہیں۔ اس خصوص میں ان کا ایک ایک لفظ سند کی حیثیت رکھتا ہے اور حرفِ آخر کی مہر ثبت کرتا ہے۔ اردو کا مؤرخ ان کے آگے کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتا اور کسی ادیب کا چراغ ان کے آگے نہیں جلتا۔ وہ اردو کی بقا تک جیتے رہیں گے اور اردو ادب کا سہارا لینے والے ہمیشہ ان کی بدولت اپنی ادبی زندگی حاصل کریں گے۔ چنانچہ مناسب ہے کہ زبان و ادب کے متعلق ان کے اقوال و بیانات کا ایک جامع انتخاب بھی کر لیا جائے جو مشعلِ راہ کا کام دے سکے اور اس سے ہمارے ادبا کے بہت سے رجحانات اور عقائد کی اصلاح بھی ہو سکے۔ فی الحال اس انتخاب کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے:-

(الف) اردو زبان کا مسئلہ اور (ب) اردو ادب۔ نشو و نما اور ارتقاء ——— انتخابات اور اقتباسات کے بعد مضمون کا آخری حصہ لغتِ بابائے اردو کا تجزیہ ہے، جس میں تنقید و تبصرہ ہوگا۔ خدا کرے کہ یہ ناچیز سعی مشکور ہو۔

(الف) اردو زبان کا مسئلہ

بمبئی اردو کانفرنس ۱۹۴۰ء کے خطبے میں فرماتے ہیں کہ:

"شاہ عالم ثانی نے جب احاطۂ بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کے حوالے کی تو معاہدے کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ دفتروں اور عدالتوں کی زبان بدستور فارسی ہی رہے گی۔ بہادر شاہ ظفر جو مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ تھے ان کا کاروبار بھی فارسی میں تھا۔ ان کا درباری اخبار "سراج الاخبار" بھی فارسی میں شائع ہوتا تھا۔ مرزا غالب سے اپنے خاندان کی تاریخ بھی فارسی میں لکھوائی تھی، اس زبان (اردو) کو بادشاہوں سے کوئی تعلق نہ تھا۔"

اسی واقعے کی تفصیل، اردو کانفرنس دیناج پور (۷ مارچ ۱۹۴۲ء) کے خطبے میں یوں ہے:-

"جب شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں بنگال کی دیوانی ایسٹ انڈیا کمپنی کی تفویض کی گئی تو منجملہ دیگر شرائط کے ایک شرط یہ بھی تھی کہ فارسی کی جگہ۔۔۔

خطبات (صفحہ ۴۰۸) میں ہے کہ ۱۸۳۷ء سے اردو سرکاری زبان قرار پائی اور (صفحہ ۳۲۷) میں ہے کہ ۱۸۴۹ء میں جب کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد میں انگریزی اثر اور تسلط پنجاب میں ہوا تو سارے اردو یہاں کی سرکاری زبان ہوگئی۔

نے بہار اور تمام صوبوں کے دفتروں اور عدالتوں میں جہاں پہلے فارسی تھی اردو کا رواج ہو گیا تو حکومت بنگال نے اردو کی طرف ... مشرقی اور ... صرف بنگال ہی تک محدود نہ رہی بلکہ بہار میں بھی (جو اس وقت احاطہ بنگال میں شامل تھا) اردو کی جگہ ہندی کر دی۔ لیکن اردو ... کی صلاحیت کی بدولت اس کی بہر دلعزیزی پھر بھی باقی رہی۔

بنگال کے لفٹننٹ گورنر مسٹر جارج کیمبل نے ۱۸۷۱ء میں اردو کے خلاف زہر اگلا اور اسے سرکاری زبان نہ رہنے دیا۔ مولانا اسی خطبے میں آگے چل کر فرماتے ہیں کہ مسٹر جارج کیمبل نے اردو کو بنگال اور بہار سے خارج کر کے چھوڑا۔ یہ پہلی ضرب تھی جو اردو پر لگائی گئی اور اس وقت سے لے اب تک اس پر برابر مخالفتوں کی بوچھاڑ رہی ہے اور کوئی کوشش اور سازش ایسی نہیں جو اس کے خلاف نہ کی گئی ہو۔

سر سید نے تعلیمی سروے میں فرمایا ہے کہ تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندے کی فلاح کا خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان خیال پیدا ہوا ہے اور ہمیشہ میری یہ خواہش تھی کہ دونوں مل کر دونوں کی فلاح میں کوشش کریں۔ مگر جب سے ہندوؤں صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شاہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ اسوقت سے مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر کام نہیں کر سکتے میں نہایت دوستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے اس کی ابتداء اسی سے ہوئی۔" سر سید کا یہ قول عبدالحق صاحب نے علی گڑھ کالج کانفرنس میں ۲۸ اپریل ۱۹۳۶ء اور ۱۲ فروری ۱۹۴۱ء کو نقل کیا ہے۔ مؤخر الذکر موقعہ پر یہ بھی فرمایا ہے کہ دراصل ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں اردو ہندی کی بحث میں شدت شروع ہوئی۔ الہ آباد میں ہندی کی حمایت میں ایک صدر مجلس قائم ہوئی اور مختلف مقامات میں اس کی شاخیں بنائی گئیں۔ اس صدر مجلس کے سکریٹری (بابو سرودا پرشاد سنڈیال) اور سر سید میں اسی تنازعے کے متعلق مراسلت ہوئی۔ اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، بنارس گزٹ، رسالہ جلسہ تہذیب (لکھنؤ) نور الابصار وغیرہ اخبارات میں دونوں طرف سے بڑے گرم مضامین نکلے۔ ادھر یہ بحث ہو رہی تھی کہ بہار میں حکومت بنگال نے زبردستی اردو کی جگہ ہندی رائج کر دی۔ . . . . . الغرض ۱۸۶۷ء میں جب سر سید کو یہ معلوم ہوا کہ عدالتوں اور دفتروں میں دیوناگری جاری کرنے کے لئے ایک درخواست، ہندوؤں کے دستخطوں کیلئے گشت کرائی جا رہی ہے تو انہوں نے ۹ دسمبر ۱۸۶۷ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور اردو کی حفاظت کیلئے ایک صدر مجلس (الہ آباد) میں قائم کی گئی جس کے سر سید سکریٹری قرار پائے اور اس کی شاخیں دوسرے اضلاع میں قائم کی گئیں۔ سر سید نے ایک پرزور اور مدلل سرکلر جاری کیا جس میں ان نقصانات کو مفصل طور پر بیان کیا جو اس تبدیلی سے پہنچیں گے۔ ۱۸۸۲ء میں جب حکومت ہند کے مقرر کردہ مشہور ایجوکیشن کمیشن کا دورہ بغرض تحقیقات، ملک میں ہوا تو یہ جنون شدت سے اچھلا اور اضلاع شمال و مغرب اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان کی بڑی زور سے مخالفت کی اور دونوں صوبوں کی بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر پیش ہوئے۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر نے جو اس کمیشن کے صدر تھے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کے جواب میں کہا کہ روزانہ ڈاک میں ہمارے پاس بے شمار دستخطوں کے ساتھ ہندی کی حمایت میں میموریل وصول ہو رہے۔ صرف ایک درخواست پر جو کل ہی وصول ہوئی تین ہزار دو سو ستاسی اشخاص کے دستخط ثبت ہیں۔" کمیشن میں بھی معاملہ پہنچایا گیا۔ لیکن سر سید نے اس بنا پر کہ یہ معاملہ اب تعلیمی نہیں رہا سیاسی ہو گیا ہے اس ناگوار بحث کو کمیشن میں نہ آنے دیا۔

یہ آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ مارچ ۱۹۰۰ء میں یکایک بھڑک اٹھی۔ اشتعال کا باعث سر انٹنی میکڈانل ہوئے جو اس صوبے میں لفٹننٹ گورنر ہو کر آئے تھے۔ اس سے پہلے صوبہ بہار میں کمشنر رہے تھے۔ اس سے اس آگ پر بہت تیل چھڑکا۔ ان کے آنے سے ہندی کے طرفداروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ معززین اور سر برآوردہ ہندوؤں نے پھر ایک میموریل لفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا۔ مولانا حالی لکھتے ہیں کہ اگرچہ سر سید پر اس زمانے میں ہجوم رنج و الم کے سبب ایسا سکتہ کا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انہوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو بطور ... سر سید کی وفات سے ... پہلے شائع ہوا ... مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لئے قائم

مزید تفصیل خطبات ... ۱۹۴۴ء صفحہ ۲۰۳ میں دیکھیں۔

[illegible] ہندی [illegible] ......

[illegible] کا ایک [illegible] گورنمنٹ کے زیر [illegible] میں [illegible] ہندی [illegible] کے [illegible] سرکاری [illegible] حاصل ہوسکتا...... چنانچہ گورنمنٹ کے روبرو پیش [illegible] میں [illegible] جاری کرنے کا [illegible] کردیا... وائسرائے کرزن نے اپنے احکام میں حرف کا [illegible] زبان کا [illegible] دیا [illegible] گیا [illegible] نے [illegible] کر رکھ دیا

اس پر مسلمانوں میں بڑا [illegible] نواب محسن الملک بہادر نے ان احکام کی ناانصافی کی طرف گورنمنٹ کی توجہ دلانے کی غرض سے ایک [illegible] کے [illegible] تعلیم یافتہ [illegible] کو [illegible] ۱۷–۱۸ اگست [illegible] کو بمقام لکھنؤ [illegible] جوش و خروش سے ہوا۔ دیکن نواب محسن الملک کو [illegible] دھمکی دی گئی کہ نواب صاحب کو یہ تحریک چھوڑ دینی [illegible] کوششوں پر [illegible] یہ واقعہ نہایت عبرت انگیز ہے۔ یہ اردو کی بہت بڑی شکست ہوئی۔ اس وقت سے یہ زبان جسے اب ہندی کہا جاتا ہے۔ ترقی کرتی چلی گئی۔ [illegible] جب ہندی [illegible] کے ذکل قائم کئے تو اس کا زور اور بڑھا اور اس مذہبی جنون سے ہندی کی اشاعت کا خوب فائدہ اٹھایا [illegible] ہندو ریاستوں میں اس وقت تک دفتروں اور عدالتوں کی زبان اردو تھی وہاں اردو کو [illegible] ہندی کو جاری [illegible] ایک [illegible] وقت سے [illegible] تھا اس کا جو حشر ہوا وہ آپ نے دیکھ لیا۔ ایک پنڈت رام چندر شرما نامی نے [illegible] رکھا...... یہ [illegible] بہت [illegible] اور جس طرح راج کوٹ کے معاملے میں وائسرائے دھمکی میں آ گئے تھے اسی طرح جے پور کے وزیر اعظم بھی دھمکی میں آ گئے۔ سر [illegible] کو دیوناگری جاری کرنے میں دو سال لگ گئے تھے مگر جے پور کے وزیر با تدبیر نے چند ہی روز میں حکم ناطق نافذ کر دیا اور بے گناہ اردو کے قتل کا فتویٰ سر مرزا اسمٰعیل کے دست مبارک سے لکھا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

علی گڑھ کانفرنس (۱۲ فروری [illegible]) میں فرمایا:— آپ کو معلوم ہے کہ نومبر ۱۸۳۷ء میں حکومت نے ایک بجٹ پیش کیا جس کی رو سے دفتروں اور عدالتوں کی زبان فارسی سے اردو کر دی گئی۔ جب تک فارسی رہی کسی نے زبان کی شکایت نہ کی اور جب اردو ہوئی تو بھی کوئی شکایت پیش نہ ہوئی۔ ہندی اردو کی تاریخ [illegible] سے شروع ہوتی ہے جب بنارس کے بعض معزز ہندوؤں نے [illegible] کی سرکردگی میں [illegible] سرکاری دفتروں میں [illegible] اور فارسی خط کے موقوف کرنے اور اس کے بجائے ہندی بھاشا رائج کرنے کی کوشش کی۔ مولانا حالی حیات جاوید میں لکھتے ہیں کہ [illegible] سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہو گیا اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔)

اس سے پہلے اسی خطبے میں کہا تھا کہ [illegible] کے بعد کمپنی بہادر برخاست ہو گئی۔ انگریزی راج آیا۔ حالات نے پلٹا کھایا۔ جیسا کہ [illegible] ہم سے...... یہ ہندوستان کی [illegible] انگریزی [illegible] کی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریریں اور تحریریں، انگریزی [illegible] ہندو [illegible] کے [illegible] کر ہندو اس سے زیادہ متاثر ہوئے۔ قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی [illegible] چنانچہ جیسے [illegible] [illegible] خیال [illegible] قائم ہو [illegible] [illegible] ایک [illegible] [illegible] ...... [illegible] یاد رکھئے اردو زبان [illegible]

[illegible] : ...... آپ کو [illegible] معلوم ہوگا کہ [illegible] [illegible] کا [illegible] کسی دوسری [illegible] [illegible]

دفتروں عدالتوں اور مدرسوں سے اردو کو خارج کرنے کی کوششیں شروع کیں، سر سید احمد خاں نے اردو کی حمایت میں اس مخالفت کا مقابلہ کیا اور مرتے دم تک اردو کی حفاظت اور حمایت میں سرگرم رہے اور تب سے ہندوؤں کی کوششیں اس وقت سے برابر جاری ہیں اور آج تک مسلسل اردو دشمنی برتتے رہے۔ اور مختلف صورتوں اور ترکیبوں سے اس آگ کو سلگاتے رہے اور دو قومی نظریہ قائم کرنے کے جذبات کو بھڑکاتے رہے۔ دو قومی نظریے کے بانی ہندو تھے ذکر تا کا اعظم یا [illegible]

۳۔ اپریل کو احمد آباد میں کل گجرات اردو کانفرنس کے خطبہ صدارت میں فرماتے ہیں:۔

یوں تو اردو کی مخالفت اسی برس سے مسلسل ہوتی چلی آ رہی ہے۔۔۔۔ مگر اب اس پر ایسا برا وقت آیا ہے جو پہلے کبھی نہیں آیا تھا کیونکہ اس وقت حکومت میں ان کا عمل دخل ہے جو سالہا سال سے اس کی مخالفت کرتے آئے ہیں ۔۔۔۔ اس میدان کے سب سے پہلے شہسوار آنجہانی سردار پٹیل ہیں جنھوں نے ریڈیو میں وہ زبان چلائی جو سوائے ریڈیو کے اور کہیں سننے میں نہیں آتی۔

ہر صوبہ پہلی کی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ پنڈت شکلا (روی شنکر) وزیر اعظم سی پی نے سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس صوبے کی زبان ہندی ہوگی۔ ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے ان کا ساتھ دیا اور ہندی ذریعہ تعلیم قرار پائی۔ میں نے اسی وقت لکھا تھا کہ گاندھی جی کو کانگرس نے ایک مدت کے غور و فکر اور مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس ملک کی زبان ہندوستانی ہونا چاہئے۔۔۔۔ لہٰذا آپ مہربانی فرما کر سی پی کے وزیر اعظم اور ناگ پور یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو ہدایت فرمایئے کہ وہ ہندی کی بجائے ہندوستانی کو رواج دیں۔ اس کے بعد یوپی کی حکومت نے اعلان کیا کہ ہندی حکومت کی دفتری اور عدالتی زبان ہوگی اور رسم خط ناگری ہوگا اور صوبے کے تمام سرکاری اور نیم سرکاری ملازموں کو جو ہندی نہیں جانتے ہدایت کی گئی کہ ہندی زبان اور ناگری رسم خط فوری جاری کر دیا جائے اور ان سرکاری ملازموں کو جو ہندی نہیں جانتے ہدایت کی گئی کہ وہ تین مہینے کے اندر ہندی سیکھ لیں اور آئندہ کوئی شخص جو ہندی نہیں جانتا ملازمت کا حقدار نہ ہوگا۔

اسی خطبے میں کچھ پہلے مولانا فرماتے ہیں کہ میں کم و بیش ۵۰ سال سے جیسی کچھ بن پڑی، بُری بھلی اردو کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ خود یہ سمجھتا رہا کہ میں اردو زبان کی قدر و قیمت اور اہمیت کو سمجھتا ہوں لیکن آج میں آپ کے سامنے نہایت صاف دلی سے اس امر کا اعتراف کر رہا ہوں کہ میں بھی اب تک اس کی قدر و منزلت کو نہیں سمجھا۔ اور سمجھا تو کب؟ جب پنڈت روی شنکر شکلا سابق وزیر اعظم حکومت سی پی نے مسلمانوں کو خطاب کر کے کہا کہ ہم تمہاری وفاداری کے زبانی دعووں کو نہیں مانتے اپنی وفاداری کا عملی ثبوت دو اور اس کی پہلی شرط یہ ہے کہ اردو زبان کو قطعاً ترک کر دو۔ اگرچہ زبان کے مسئلے کا فیصلہ مجلس آئین ساز پر رکھا گیا تھا لیکن ان صوبوں نے ان فیصلوں کا مطلق انتظار نہ کیا اور بڑی چالاکی اور عجلت سے ہندی کے حق کا احکام جاری کر دیئے۔

اورنگ آباد (دکن) سے ۱۹۴۹ء میں جو تقریر نشر کی تھی اس میں ہے:۔ اردو پر کئی نازک دور گزر چکے ہیں۔ اب اس نئے عہد میں پہلے سے بھی سخت وقت آیا ہے۔۔۔۔ سب سے اول پہل کی عزت صوبہ متوسط (سی پی) کو حاصل ہوئی۔ وہاں کے وزیر اعظم نے صاف صاف کہہ دیا کہ صوبہ کی زبان ہندی ہوگی۔ مدارس اور کالجوں میں ذریعہ تعلیم ہندی ہوگا۔ دفتروں اور عدالتوں میں بھی ہندی رہے گی۔ جو مدارس ہندی اس کی تعمیل نہیں کریں گے ان کو امداد نہیں دی جائیگی۔ اس کے بعد یوپی نے بھی پیروی کی اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں پر ہوا اور انتہا یہ ہے کہ کانگرس پارٹی نے اپنے جلسے میں کثرت رائے سے یہ قرار داد منظور کر دی کہ اس ملک کی زبان ہندی ناگری ہوگی۔

۱۲ اپریل ۱۹۵۰ء کو لاہور میں فرمایا:۔

سواٹھے کانگرس نے یہ قرار داد منظور کی تھی کہ ہندوستان کی زبان ہندوستانی ہوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ہو یا فارسی حروف میں۔

[illegible] سنا جاتا تھا۔ کانگرس کی ڈھائی سالہ حکومت میں شکلا نے ودیا مندر اسکیم تیار کی تھی اور ہندی کی ترویج کی سازش کی تھی۔

نیمہ متعلق ہے اور اس دورانیہ میں پیش تھا۔ جو اس قسم کی کانگریس پیسے تو تمہ پر جس میں لاتی ہے۔ لیکن ان صاحبوں کے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا جن کا منشا کچھ اور تھا۔ . . . . ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا یعنی ہندی ساہتیہ سمیلن کا سالانہ اجلاس اندور میں منعقد ہوا جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی۔ (ہندی یعنی ہندوستانی کے چند نمونے دیکر گاندھی کی زبان کے متعلق مولانا فرماتے ہیں کہ:-) . . . . ممکن ہو کہ مہاتما گاندھی جو توجیہ و تاویل کے فن کے استاد کامل ہیں جو لفظ چاہو دیا کے کچھ اور معنی پیدا کرلیں۔ ورنہ بحالت موجودہ، ہندی یا ہندوستانی کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں ہو سکتا۔"

"انھوں (گاندھی) نے ہندی کا پرچار مدراس سے شروع کیا۔ ایک تو اس لئے کہ ہندی وہاں سرے سے ہے ہی نہیں اور اگر اس خطے کو رام کرلیا تو دوسرے علاقے خود بخود ہم نوا ہو جائیں گے۔ دوسرے اس لئے کہ یہ کاروائی شمالی ہند والوں کی نظر سے اوجھل رہے گی جو ایسے معاملوں میں بحث و تکرار اور جھگڑوں کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں۔"[۱]

"ملک پر اس بزرگوار کے بہت احسانات ہیں۔ اس نے سیاسیات، معاشرت، اقتصادیات میں بڑا انقلاب کر دیا۔ قدامت نے جو عام قسم کا دماغ خلط کیا ہے اس کا ذہن رسا اس کی تنقید دور بھی اور اس کا ارادہ اٹل ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی فکر کا انداز گو بظاہر صاف اور سیدھا ہے لیکن بباطن پیچ در پیچ ہے، وہ اتفاق آیا وجانے کا عزم کرتا ہے تو چلتے چلتے نفاق فکر کی راہ پر جا نکلتا ہے۔ وہ دل کا طالب ہے لیکن داخل ہوتا ہے نفس کے دروازے سے۔ وہ نیکی کا آرزو مند ہے لیکن وہاں تک پہنچتا ہے پھوٹ کے توسل سے۔ میں کسی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہتا۔ دلوں کا جاننے والا خدا ہے۔ جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جب کبھی ایسا موقعہ آیا کہ سالہا سال کی گتھیاں اور پیچیدہ مسائل فریقین نے باہمی مشورے اور مصالحت سے سلجھا لئے اور یہ امید بندھ گئی کہ اب نفاق کی گھٹا چھٹنے والی ہے اور آفتاب اتحاد افق سے طلوع ہونے والا ہے تو عین وقت پر اس مقدس ہستی نے سر ہلا کر برسوں کی محنت خاک میں ملا دی۔ پیر بہتر اسرار ما را ہزار جتن کئے نہ مانا تھا نہ مانا۔ ہمارے ملک میں تین ہٹیں مشہور ہیں۔ راج ہٹ۔ تریا ہٹ اور بالک ہٹ لیکن حضرات ایک ایک چوتھی ہٹ اور بھی ہے اور وہ ہے لیڈر ہٹ۔ وہ لیڈر ہٹ ہی کیا جو دوسرے کی مان جائے مرزا داغ نے اپنے خاص انداز میں ایک بہت ہی پر لطف اور صاف ستھرا شعر کہا ہے۔ کہا تو ہے اپنے محبوب کی شان میں لیکن صادق آتا ہے ہمارے ملک کے سب سے محبوب ڈکٹیٹر لیڈر پر سے

ذرا سی تو بس کسر ہے تم میں ۔۔ کہا نہیں مانتے کسی کا۔

مشکل یہ آ پڑی ہے کہ وہ ہر مسئلے کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہی رخ نظر آتا ہے دوسرا رخ نہ دیکھتا ہے نہ اسکی اسے پرواہ ہے۔ . . . "[۲]

بہار میں ۱۹۳۶ء میں فرمایا:-

"انڈین نیشنل کانگریس نے بہت معقول فیصلہ کیا تھا کہ ملک کی زبان ہندوستانی ہے خواہ رسم خط کچھ بھی ہو۔ لیکن تعجب ہے کہ جس بے کس مدبرانہ دماغ نے یہ تجویز سوچی تھی اور جنھوں نے اس پر اصرار کیا تھا سب سے پہلے اب وہی اس سے انحراف کر رہے ہیں۔ مہاتما گاندھی کی جدت پسند طبیعت نے ایک نیا لفظ ہندی ہندوستانی وضع کرکے گویا جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کی کوشش کی ہے۔ جب مہاتما جی سے دریافت کیا گیا کہ اس جدید مرکب لفظ سے آپ کا کیا مراد ہے تو فرمایا کہ" ہندی جو آئندہ چل کر ہندوستانی ہو جائے گی"۔ تو یہ زبان نہ ہوئی آئندہ کا پروگرام ہوا۔"

انگریزی کا مقصد

بلوچستان کے سالانہ جلسہ منعقدہ ۲۴ جولائی ۱۹۳۷ء کے خطبے میں انگریزی اور انگریزی تعلیم کے مقاصد بیان کئے ہیں:-

"باشبہ یہ ہے کہ انگریزی حکومت میں ہماری تعلیم کا جو ڈول ڈالا گیا ہے اس کا مقصد یہی تعلیم کبھی نہ تھا بلکہ اس کی تہ میں

۱۔ خطبات صفحہ ۳۰۳۔ ۲۔ ایضاً صفحہ ۳۴۴ - ۳۴۲ ہیں۔ اس کے مقابلہ پر بابائے اردو نے اردو کی ترقی کے لئے مختلف تجاویز و ذرائع صفحہ ۳۴۴ - ۳۹۲ - ۴۰۱ - ۴۳۱ پر پیش کئے ہیں۔

زیادہ [illegible]

زبان اور [illegible]

انتہائی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم ایک ایسی جماعت پیدا کریں جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان ترجمانی کا کام دے۔ یہ لوگ خون اور رنگ میں ہندوستانی ہوں لیکن مذاق، خیالات اور ذہنیت میں انگریز ہوں گے۔" ... کمپنی کے حکام بظاہر مذہب کے معاملے میں غیر جانبداری کا دعویٰ کرتے تھے۔ وہ کھلے دل سے مشنریوں کے قائل تھے۔ چنانچہ میکالے نے اپنی یادداشت کے دوسرے سال (۱۸۳۶ء) اپنے والد کو خط میں لکھا کہ اگر تعلیم کی یہ رفتار جاری رہی تو تیس سال کے بعد بنگال کے شریف گھرانوں میں ایک شخص بھی بت پرست نہیں رہے گا۔

ایک اور بات انگریزی تعلیم کی محرک ہوئی وہ یہ تھی کہ دفتروں میں انگریزی داں کلرکوں اور اسی قسم کے چھوٹے ملازموں کی ضرورت تھی۔ انگریزی تنخواہ پر کام لینے میں انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانی بہت سستے ملنے لگے۔ اس میں سرکار کی کفایت مد نظر تھی۔

لاہور کے خطبے میں (۱۹۳۵ء) فرمایا: "ہمارے اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریزوں کی طرح سوچتے اور فکر کرتے، انگریزوں کی طرح پڑھتے اور لکھتے، انگریزوں کی طرح اٹھتے اور بیٹھتے۔ یہاں تک کہ انگریزوں کی طرح ہنستے اور روتے تھے اور خفا ہوتے تھے تو ایک دوسرے کو انگریزی میں گالیاں دیتے تھے۔ خیر سے اس زمانے میں بھی ایسے لوگ اب بھی ملتے ہیں۔ انگریز کیسا خوش قسمت اور خوش اقبال تھا کہ اسے ایسے نیک اور وفادار بندے ملے۔"

میں ایک بار سر سکندر حیات خان مرحوم کے عہد وزارت میں یہاں (لاہور) آیا اور وزیر تعلیم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے درخواست کی کہ یونیورسٹی میں جہاں تو کم از کم میٹریکولیشن کی جماعتوں کو اردو کا ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس سے یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے درجوں میں بھی اردو ذریعہ تعلیم ہو جائے گی۔ یہ سننا تھا کہ ان پر ایک جلالی کیفیت طاری ہو گئی۔ فرمانے لگے کہ اردو یا ہماری کوئی اور زبان ہرگز ذریعہ تعلیم نہیں ہو سکتی۔ کوئی زبان انگریزی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ اس زمانے میں ایسی باتیں کرتے ہیں جب کہ لوگ کوٹ پتلون پہنتے اور پاٹ پر بیٹھتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ اگر میرا بس چلے تو گھر سے لے کر اس کونے تک انگریزی ہی انگریزی کر دوں۔

۲۹، ۳۰ مارچ ۱۹۴۳ء کے خطبے میں فرمایا کہ "ترقی کی یہ رو جو اس وقت ہم پنجاب میں دیکھتے ہیں اس کے سرچشمے کا اگر سراغ تلاش کیا جائے تو انجمن پنجاب میں ملے گا جو ۱۸۶۵ء میں اپنے ایک جلسہ میں علوم مشرقی کی تعلیم کا از سر نو جاری کرنا اور دیسی زبانوں کے ذریعے سے ملک میں علوم مفیدہ کی اشاعت تھا۔ ... انجمن پنجاب نے ۱۸۶۵ء میں اپنے ایک جلسے میں مشرقی زبانوں کی تعلیم کے لئے ایک یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز کی۔ ... انجمن کا منشا یہ تھا کہ مشرقی زبانوں یعنی عربی و سنسکرت۔ فارسی کی تعلیم سے اردو ہندی کو تقویت پہنچائی جائے اور ان کے ذریعے سے علوم و فنون کی انگریزی کتابوں کے ترجمے اپنی زبان میں کرائے اور ان کی اشاعت ملک میں کرے اسی زمانے میں ہماری قوم کے عالی دماغ مصلح سر سید احمد خان نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جس کے وہ بانی اور آنریری لائف سکریٹری تھے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک عرضداشت پیش کی ... ان دونوں تجویزوں کا حشر ایک ہی ہوا۔ وہی شبہات اور اعتراضات پیش آئے جو اب بھی کبھی کبھی بعض انگریزی تعلیم یافتہ اور خاص کر وہ اصحاب جن کے ہاتھوں میں نظام تعلیم ہے کر رہے ہیں۔ یعنی ابھی ہماری زبان میں اتنی سکت نہیں کہ جدید تعلیم کا بار اٹھا سکے۔"

اس میں زیادہ سوچ بچار کی ضرورت نہیں خصوصاً جب کہ ہماری رہنمائی کے لئے روشن مثالیں موجود ہیں ایک ہوا سو برس پہلے کی (دہلی کالج) اور ایک زمانہ حال کی (جامعہ عثمانیہ)۔

اردو نے ہر مسلم تحریک کی مدد کی۔ وہابی تحریک کو اس نے مدد دی۔ سر سید کے مشن کو اس نے پھیلایا۔ خلافت کا پیغام اس نے گھر گھر پہنچایا لیگ کی آواز اس نے [illegible] [illegible] اور قوت سے اس نے تنظیم کر کے کام کیا اور مسلمانوں کو

ملاحظہ، مسلم لیگ [illegible] اصطلاحات کی [illegible] کی تفصیل [illegible] ملاحظہ فرمائیں۔

[illegible]

(ب) اردو زبان کی پیدائش اور نشو و نما۔

[illegible] فرمایا:۔

حضرات، اردو کی پیدائش اور اس کی تاریخ کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی تاریخ [illegible] ہوتے تھے [illegible] آ [illegible] ہو رہا تھا۔ پھر [illegible] کا دھیان تھا۔ ملک میں اس سرے سے اس سرے تک [illegible] انتشار اور بے ترتیبی پھیلی ہوئی تھی آپس کی پھوٹ نے سارے کام درہم برہم کر رکھے تھے۔ کوئی ایک ملک تھا اور نہ کوئی نظام۔ ایسے وقت میں [illegible] ترتیبی اور [illegible] کر دینے کا احساس قائم کیا۔ نئے قواعد اور نئے آئین نافذ کئے۔ ایک ملک، ایک زبان اور ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی۔ [illegible] اصل ہندوستانی تہذیب اور یہی زبان مکمل ہندوستانی زبان ہے۔ کیونکہ اس میں ہندو مسلمان دونوں کا رنگ روپ موجود ہے۔

بمبرہ اردو آل انڈیا کانفرنس (دسمبر ۱۹۳۷ء میں) فرمایا:۔

[illegible] کی طرح فاتح کی حیثیت سے آئے۔ ان کی تعداد اہل ملک کے مقابلے میں کم تھی۔ وہ فارسی بولتے تھے اور اہل ملک [illegible] (ہندی) یا کچھ (پراکرتیں)۔ ان حالات میں جیسا کہ دستور ہے کاروباری، ملکی اور معاشرتی ضرورت سے مسلمان بول چال میں ہندی الفاظ استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ہندو فارسی الفاظ۔ کچھ عرصے تک تو مسلمانوں کا تعلق اپنے اصل ملک سے رہا لیکن رفتہ رفتہ یہ تعلق کم ہو گیا اور وہ [illegible] کے ہو گئے۔ [illegible] کے استقلال کے ساتھ اس زبان کو بھی استقلال ہو گیا۔ اگرچہ سرکاری درباری زبان فارسی تھی اور مسلمانوں کی علمی زبان بھی [illegible] نوکر چاکروں، بیوی بچوں اور ملک کے دوسرے لوگوں سے، جو اس زمانے میں [illegible] واقف نہ تھے۔ انھیں ٹوٹی پھوٹی ہندی ہی میں باتیں کرنی پڑتی تھیں [illegible] ادھر اہل ملک کی بڑی تعداد ایسی تھی جن کا تعلق دفاتر اور دربار اور امرا وغیرہ سے تھا اور بہت سے ایسے تھے جو حلقۂ اسلام میں آ گئے تھے۔ وہ سب فارسی جانتے اور بولتے تھے۔ لیکن اصل زبان ان سب کی ہندی ہی تھی۔ اس لئے اس مخلوط زبان کو بہت زیادہ تقویت پہنچی اور دن بہ دن فروغ ہوتا گیا۔

اسی خطبے میں آگے چل کر کہتے ہیں کہ جب اردو نے اپنی جگہ بنالی اور بول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو ابتدا جیسی کہ اکثر زبانوں کی ہوتی ہے شعر و نظم سے ہوئی اور اس وقت الفاظ ہی نہیں بلکہ فارسی ترکیبیں، انداز بیان، تشبیہات و استعارات اور تلمیحات یہاں تک کہ [illegible] اس میں منتقل ہو گئیں۔ اس زمانے میں ہمارے اکثر شعرا فارسی، اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اس میں ہندو [illegible] شریک تھے۔ رفتہ رفتہ فارسی کا زور کم ہو گیا اور اردو کو فروغ ہونا شروع ہوا۔ مگر اس کی ساخت اور ہیئت وہی ہی جو [illegible] تھی۔

[illegible] صدارتی [illegible] (مارچ ۱۹۴۱ء میں) فرمایا:۔

یہ بات پایۂ تحقیق کو پہنچ گئی ہے کہ اردو ادب کا نشو و نما سب سے پہلے گجرات میں ہوا۔ یہاں پانسو سال سے [illegible] زبان کا [illegible] [illegible] آدم [illegible] سے [illegible] [illegible] [illegible] ہندوستانی کا لفظ ہمارے کسی مستند شاعر یا ادیب [illegible] [illegible] تقریر [illegible] ۱۹۳۶ء کی تھی۔

[illegible]

[illegible] ... حیدر بخش حیدری [illegible] کو اردو [illegible] ... میں ترجمہ کیا۔ ڈاکٹر [illegible] اپنی تصانیف میں ہندوستانی اور اردو دونوں لفظ اس ایک زبان کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ گارسان دتاسی کا بھی یہی حال ہے لیکن وہ زیادہ تر ہندوستانی لفظ استعمال کرتا ہے ۔۔۔۔"

یہ لفظ (ہندی) اس زبان کے لئے قدیم دکنی اور گجراتی اردو میں بھی انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ وہ معذرت کے طور پر اکثر اپنی تصانیف میں یہ لکھتے ہیں کہ چونکہ لوگ فارسی اور عربی سے بہرہ نہیں رکھتے ان کے لئے سمجھنے یہ کتاب ہندی میں لکھی ہے۔ یا یہ کہ یہ کتاب فارسی میں تھی عام لوگوں کی خاطر ہندی میں ترجمہ کی۔ یہ لفظ مصحفی کے زمانے تک انہی معنوں میں استعمال ہوتا رہا۔ مصحفی اپنے دو تذکروں کو تذکرہ ہندی یا ہندی گویاں کے نام سے یاد کرتا ہے ۔۔۔۔۔ جب اس بولی کو خود زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی اور اس نے ذرا اول چال سے نکل کر ادب میں قدم رکھا تو یہ لفظ خود بہ خود متروک ہو گیا اس کے ساتھ ساتھ ریختہ کا لفظ استعمال ہونے لگا۔ یہ لفظ اس وقت استعمال ہوا جب اس میں ادبی شان پیدا ہو چلی تھی۔ لیکن زیادہ تر شعر و سخن اور ادبی کلام کے لئے استعمال ہوتا تھا۔۔۔ لیکن جب یہ زبان عام ہو گئی تو یہ لفظ خود بخود خارج ہو گیا۔ [illegible] اختیار ہوئی مدت میں پرانے فیشن کے انگریز اسے مورز (Moors) کہتے تھے جس طرح احاطہ مدراس اور دکن کے بعض مقامات پر عوام اسے ترکانی [illegible] کرتے ہیں۔ لیکن یہ نام غلط فہمی پر مبنی ہے۔ اور اس لئے اب بالکل متروک ہیں۔ گول کنڈہ کا اردو شاعر اور ادیب وجہی نے اپنی کتاب سب رس میں جو [illegible] کی تصنیف ہے اسے زبان ہندوستان کہا ہے ۔۔۔۔ اردو کا لفظ بعد میں آیا۔ میر تقی میر اپنے تذکرے میں "زبان اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد دہلی" لکھتے ہیں اس کے بعد زبان اردو کہنے لگے۔ رفتہ رفتہ زبان کا لفظ اڑ گیا اور خود اردو زبان کے معنوں میں آنے لگا۔ مصحفی اور انشاء کے زمانے میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔ قرار دہلوی (مشاعرہ [illegible]) ان پہلے چند حضرات میں سے ہیں جنہوں نے اردو کا لفظ زبان کے معنوں میں استعمال کیا ۔۔۔۔ ۲

[illegible] اردو کانفرنس میں دسمبر [illegible] کو خطبہ دیا تھا۔ اس میں ہے۔

...... ادب کی راہ ہمیشہ صاف اور سیدھی نہیں ہوتی۔ اس میں بہت سے پیچ و خم ہوتے ہیں۔ اسی لئے اس کے جانچنے کے لئے ہر کونے کھدرے پر نظر ڈالنی چاہئے۔ چنانچہ اس زمانے میں بعض ایسی خصوصیات نظر آتی ہیں جو پہلے نہیں تھیں اور تھیں بھی تو بہت کم۔ مثلاً چھوٹے افسانے لکھنے کا آج کل عام رواج ہے۔ ہے تو اس وقت ہمارے [illegible] پر ہم چند کے جن کے بعض افسانے درحقیقت بے نظیر ہیں۔ کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس میں وہ مہارت ہو۔ لیکن ان کے لکھنے والے بہت ہو چلے ہیں جن سے توقع ہے کہ آگے چل کر نام پیدا کریں گے۔ دوسری چیز ادبی تنقید ہے جس کی ابتداء مولوی حالی نے کی ادباب اس فن پر تصنیف لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جن میں سے بعض اپنی زبان کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ زیادہ تر مغربی تعلیم کا اثر ہے اور کم و بیش مغربی تعلیم کا اثر ہے۔ ۔۔۔۔ شعر و سخن میں بھی اردو زبان کسی سے پیچھے نہیں۔ اگرچہ اس وقت حالی سا کوئی انقلابی شاعر پیدا نہیں ہوا سوائے ایک شخص کے جسے حقیقت میں اردو شاعری میں جان ڈال دی تھی اور جس نے اپنی قوت کلام اور زور بیان سے زبان میں ایک نئی تازگی اور نیا جوش پیدا کر دیا تھا لیکن اس بدبختی کا کیا علاج کہ اقبال اردو سے روٹھ گئے ہیں ۔۔۔

ا۔ خطبات [illegible]

۲۔ [illegible]

[illegible]

ذیلی ہند ـــ جب تک [illegible] ہندی کی جو [illegible] کے معتبرین خصوصاً [illegible] ، ظاہرا [illegible] لفظ [illegible] ہو جاتے تھے اور جنہیں اہل [illegible] اس طرح سے اپنے کلام میں استعمال کئے ہیں کہ [illegible] معلوم ہوتے ہیں ـــ جب یہ زبان دوسرے صوبوں اور علاقوں میں پہنچی تو وہ اس سے محروم ہو گئی اور خصوصاً انگریزی حکومت کے اثر سے جب [illegible] آنے شروع ہوئے تو انہوں نے بجائے فارسی عربی الفاظ کا استعمال شروع کیا۔ پھر اکثر مترجمین نے جو انگریزی تعلیم یافتہ تھے اور اپنی زبان پر پوری قدرت نہ رکھتے تھے ، فارسی عربی الفاظ کے سوا انگریزی الفاظ کا بھی اضافہ کیا۔ میں اس میں مسلمانوں کو بھی بری الذمہ نہیں سمجھتا [illegible] ہندی [illegible] کی طرح [illegible] تو یہ الفاظ تقریباً نہ ہونے باقی رہے ۔ [1]

" مرزا غالب کا شعر ہے :۔ آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

مرزا غالب کی مشکل پسندی مشہور ہے اور جب اس کی شکایت بہت بڑھ چکی تو انہوں نے یہ عذر کیا۔ یہ عذر تو ایک لطیفہ ہے۔ لیکن عام طور پر یہ اثر ہوا کہ وہ پیچ پیچ آسان کہنے لگے اور آسان بھی ایسا کہ اس کا جواب نہیں۔ ان کی شہرت اور مقبولیت اسی آسان کلام پر ہے " [2]

لکھنؤ کی زبان ... جدت پسندی کے شوق میں لکھنؤ کے شاعروں اور ادیبوں نے ایسے مشکل اور ثقیل فارسی عربی کے لفظ اپنے کلام میں داخل کرنے شروع کر دیے تھے کہ عام فہم تو کیا ، خاص فہم بھی نہیں ـــ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اردو کے بہت سے ٹھیٹھ لفظ اور بول چال کے عام فہم محاورے عامیانہ قرار دے کر متروک کر دیے گئے ـــ یہ معیار شرافت و ثقافت سمجھا جاتا تھا۔ تحریر ہی میں نہیں ، بات چیت میں بھی یہی شان پیدا ہو گئی تھی۔ اپنی علمیت جتانے کے لئے یہ لوگ عجیب طرح کی زبان بولنے لگے تھے۔ ایک زمانے میں یہاں (حیدرآباد ۔ دکن) کی ہائی کورٹ میں لکھنؤ کے ایک صاحب عالم ، میر مجلس تھے۔ ایک دن میں یونہی ان سے ملنے گیا۔ مزاج پوچھا تو فرمایا ، " صداع پر اضطراب نوازل ہے "۔ آپ سمجھے کیا کہا ؟ نزلہ جس کی بزبان سبک ، فصیح اور عام فہم ہوتی ہے ، وہ بھی اس کی زد سے نہ بچی اور اس میں بھی وہاں کے شاعروں نے ایسے ثقیل اور نامانوس عربی فارسی لفظ مروج کر دیے جن کی وہ کسی طرح متحمل نہیں ہو سکتی ۔ " [1]

" ... البتہ اردو پر ایک ایسا تاریک زمانہ آیا تھا کہ ہمارے شاعروں نے اکثر ہندی لفظوں کو متروک قرار دیا اور ان کی بجائے عربی فارسی کے لفظ بھرنے شروع کئے اور یہی نہیں بلکہ بعض عربی فارسی الفاظ جو بہ تغیر ہیئت یا بہ تغیر تلفظ اردو میں داخل ہو گئے تھے ، انہیں بھی غلط قرار دے کر اصل صورت میں پیش کیا اور اس کا نام اصلاح زبان رکھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تکلف اور تصنع ہمارے ادب پر چھا گئے تھے۔ اشعار میں ضلع جگت ہو گئی تھی۔ سخن وروں نے لفظوں کو کھیل بنا لیا تھا۔ شاعر کا مقصد کچھ کہنا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ اس کا کام [illegible] کی رعایت سے لفظوں کو جما دینا ، ان میں صنائع بدائع کا رنگ بھر دینا ، قافیہ ردیف کھپا دینا اور محاوروں کا نباہ و بنا رہ گیا تھا۔ اس میلان کی وجہ سے ہماری شاعری رنگ برنگ الفاظ کا ایک ڈھانچہ تھی جس پر طرح طرح کی نقاشی کی ہوتی تھی۔ لیکن اس میں جان نہ تھی اور ہماری زبان ایک ایسی زبان ہو گئی تھی کہ اسے بہت کم انسان بولتے تھے۔ غرض اس رنگ نے ہمارے ادب کو بے جان ، بے لطف اور بے اثر بنا دیا تھا لیکن یہ دور تاریکی [illegible] اس کو ختم کرنے میں سب سے پہلا کام سر سید احمد خاں نے کیا۔ اس کی تحریروں نے ہمارے ادب میں نئی جان ڈال دی۔ [illegible] زبان اگرچہ سیدھی سادی تھی۔ لیکن اس میں فصاحت و اثر موجود تھی۔ اس نے علمی و سنجیدہ مضامین [illegible]

[illegible] ۔ [illegible]

[illegible]

اردو زبان و ادب کا مرکز دہلی تھا، گذشتہ صدی کے آغاز سے فروغ ہوا ہے۔ اس میں چارٹری یا قاعدہ تحریکیں عمل میں آئیں... فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (۲) دہلی کالج (۳) سائنٹفک سوسائٹی، علی گڈھ اور (۴) اورینٹل کالج، لاہور .... ۱۸ار فروری ۱۹۴۱ء کو فرمایا۔

علی گڈھ کا دبستان

یہ مقام (علی گڈھ) جہاں آپ جلوہ فرما ہیں اردو کا گہوارہ اور اتارا رہا ہے، اسی کالج کی کالفرنس کے سالانہ جلسوں میں ہماری زبان کے نامور ادیب، مورخ، مصنف، شاعر تکلیف فرماتے اور اپنے کلام سے اہل کانفرنس کو محظوظ کرتے تھے۔ لوگ دور دور سے کھنچے چلے آتے تھے اور بڑے شوق سے ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ قطع نظر دوسرے فوائد کے ان بزرگوں کو دیکھنا، ان کی باتیں سننا، اُن سے ملنا ہی اپنی بڑی خوش قسمتی اور اپنی زندگی کا بڑا کارنامہ سمجھتے تھے۔ اور ان باتوں کا تذکرہ آج بھی ہم اپنی صحبتوں میں بڑے فخر سے کرتے ہیں۔ حالی، شبلی، نذیر احمد کے جوہر یہیں کھلے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اردو کی بنیادیں مستحکم کیں۔ سید احمد خاں ان سب کے سردار تھے۔ سید کے احسانات سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ گونا گوں ہیں۔ لیکن ان کا سب سے بڑا احسان اردو زبان پر ہے۔ اسی نے زبان کو پستی سے نکالا۔ انداز بیان میں سادگی کے ساتھ قوت پیدا کی۔ سنجیدہ مضامین لکھنے کا ڈول ڈالا۔ سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد ڈالی۔ جدید علوم و فنون کے ترجمے انگریزی سے کرائے۔ خود کتابیں لکھیں اور دوسروں سے لکھوائیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی و علی گڈھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ جاری کر کے اپنے انداز تحریر، بے لاگ تنقید اور روشن خیالی سے اخبار نویسی کا پایہ بڑھایا۔ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اردو ادب میں انقلاب پیدا کیا۔ نئی طرز کو رواج دیا۔ ان بزرگوں کی سعی و عمل سے علی گڈھ اردو ادب اور روشن خیالی کا ایسا مرکز ہو گیا تھا جس کی فضیلت اور برتری سب نے تسلیم کی ہے۔ یہ اردو ادب کے فروغ اور اوج کا زمانہ تھا اور اردو ادب کی تاریخ میں اس کا ذکر ہمیشہ احترام سے کیا جائے گا۔ .... سید کے زمانے میں کالج میں ادبیت کا رنگ نظر آتا تھا۔ اول تو وہ خود ایک اعلیٰ نمونہ تھے۔ دوسرے بعض اہلِ کمال اور ادیب کالج میں آتے اور قیام فرماتے۔ طلبہ ان کی صحبت سے فیض حاصل کرتے اس کے علاوہ بعض پروفیسر مثلاً پروفیسر آرنلڈ، مولانا شبلی، مولوی کرامت حسین اس پایے کے تھے کہ ان کی تعلیم، گفتگو اور صحبت، صحیح علمی اور ادبی ذوق کی ضامن تھی۔ ظاہر ہے کہ سب ادیب اور عالم نہیں ہو سکتے۔ لیکن جن میں کچھ صلاحیت اور مادہ تھا وہ اس سے مستفید ہوئے اور کچھ کیا بھی۔ حالانکہ اس زمانے میں کالج کے نصابِ تعلیم میں اردو داخل نہ تھی۔ .. [2]

عورتوں کی زبان

اردو زبان کی ایک اور خصوصیت بھی ہے جس پر بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ وہ عورتوں کی زبان ہے۔ یوں تو دنیا میں اور بھی زبانیں ہیں جن میں مردوں عورتوں کی بول چال میں کچھ کچھ فرق ہے لیکن اردو زبان میں یہ امتیاز بہت نمایاں اور گہرا ہے۔ اردو نے جس خطے میں جنم لیا، یا جہاں جہاں اس نے زیادہ رواج پایا وہاں پردہ کی رسم رہی ہے۔ اسی وجہ سے مردوں اور عورتوں کی معاشرت میں بہت کچھ فرق پیدا ہو گیا۔ عورتوں کے الفاظ اور محاورے اور ان کا طرزِ بیان اور بول چال بھی بہت کچھ الگ ہو گئی۔ عورتوں کی نظر بڑی تیز ہوتی ہے، وہ انسانوں یا چیزوں میں بعض ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں بالکل باریکیاں دیکھ لیتی ہیں، جن پر مردوں کی نظر نہیں پڑتی۔ پردے میں رہنے کی وجہ سے ان کا سارا وقت امور خانہ داری، بال بچوں کی پرورش اور نگہداشت، شادی بیاہ، رسم و رواج کی پابندی اور ان کے متعلق جتنے معاملات ہیں .... [illegible]

[1] خطبات عبدالحق صفحہ ۳۱۲ [2] خطبات عبدالحق صفحہ ۲۸۔ یہ خطبہ ۔۔۔ [illegible] ۔ [3] خطبات صفحہ ۲۵۱-۲۵۲

[illegible]

[illegible] خصوصیت کے لحاظ سے جو طرح طرح کے الفاظ، محاورے اور تشبیہیں [illegible] وہ بڑی [illegible] سکتی ہیں۔ [illegible] عورتوں نے [illegible] ہی پر [illegible] خاص طور پر قابل قدر ہیں۔ [illegible] تشبیہ اور استعارے کے رنگ میں [illegible] بیان کر جاتی ہیں۔ [illegible] فارسی کے [illegible] ادا نہیں ہوتا۔ وہ انہیں بہ جہ سندل بانتی ہیں۔ بعض الفاظ ان کے معنی [illegible] بدل جاتے ہیں اور وہ خالص اردو کے [illegible] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ریختی گو شعراء کا بڑا احسان ہے (اگرچہ ان میں سے بعض نے بہت کچھ فحش بھی بکا ہے) کہ انھوں نے اس [illegible] دیا اور اس زمانے میں نذیر احمد، حالی، سید احمد دہلوی، راشد الخیری اور بعض اصحاب کی بدولت صنف نازک کی [illegible] بہت حصہ ہمارا مشترک سرمایہ ہو گیا ہے۔"

اردو کانفرنس بمبئی ۱۹۴۵ء میں فرمایا :-

اردو اسٹیج پیسلی جی فرام جی اردو اسٹیج کے بانی ہیں۔ وہ صرف اردو شاعری کے قدردان ہی نہ تھے، خود بھی اردو کے شاعر تھے۔ [illegible] تخلص کرتے تھے۔ اور نواب علی نفیس سے اصلاح لیتے تھے۔ انھوں نے اوریجنل تھیٹریکل کمپنی کے نام سے ایک تھیٹر قائم کیا [illegible] جو تیس چالیس سے کم نہ ہوں گے اردو زبان میں تھے۔ [illegible] بعد [illegible] وکٹوریہ تھیٹریکل کمپنی اور [illegible] الفریڈ اور [illegible] پارسی تھیٹریکل کمپنیاں بنیں جو پارسیوں کی ہمت اور جدت کی رہین منت تھی۔ ان کمپنیوں میں بعض بڑے پایہ کے منشی اور شاعر تھے۔ طالب، احسن، بے تاب، حشر کے نام ڈرامہ نویس کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ یہ کمپنیاں تمام بڑے بڑے شہروں میں جاتی تھیں، وہاں عجیب رونق اور چہل پہل ہو جاتی تھی۔ جب کوئی [illegible] ایکٹر آتا تھا خلقت تماشا دیکھنے کے لیے ٹوٹ پڑتی تھی [illegible] بے حال ہو جاتے تھے۔ جوں جوں ان ایکٹروں کو ترقی ہوتی گئی، ان کے ڈرامے بھی زبان کے اعتبار سے بہتر ہوتے گئے۔ آج کل ان کی جگہ فلموں نے لے لی ہے اور ان کا بھی یہی حال ہے۔ فلم کے مرکز تو بمبئی کے سوا اور مقامات بھی ہیں۔ لیکن اردو [illegible] اور فروغ کا فخر بمبئی ہی کو حاصل ہے۔ ان تھیٹروں کی بدولت سیکڑوں ڈرامے لکھے گئے اور اردو کی آواز گھر گھر پہنچ گئی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب [illegible] برس قبل میں بمبئی آیا اور ایک تھیٹر میں گیا تو عجیب نظارہ دیکھا۔ جوں ہی ایک ایکٹرس نے اردو غزل شروع کی نیچے درجوں کے سارے تماشائیوں نے بے تکلف اس کے ساتھ گانا شروع کر دیا ۔ ۔ ۔ ۔ پارسیوں نے صرف تھیٹروں کے ذریعے اردو نہیں پھیلائی، بعض ان میں اردو کے اہل قلم بھی ہوئے ہیں۔ ۱۸۹۳ء میں [illegible] سہراب جی نے ہندوستانی انگریزی میں اردو محاورات اور بول چال پر ایک کتاب [illegible] ہے۔ حال میں انجمن ترقی اردو نے دستور بہرام جی کا اردو دیوان شائع کیا ہے۔"

۱۹۴۵ء میں بمبئی کانفرنس میں فرمایا :-

اردو کے بعض اخبار " [illegible] سال پہلے بمبئی سے [illegible] اردو اخبار نکلتے تھے۔ جن میں کشف الاخبار، روضۃ الاخبار [illegible] کے نام اب تک ملتے ہیں۔ ایک اخبار [illegible] کا بھی تھا [illegible] ۱۸۸۸ء میں یہاں آیا تو اس وقت بھی جاری تھا [illegible]

[illegible]

[illegible]

"حق یہ ہے کہ اہل پنجاب نے اُردو کو شی اور اُردو نوازی کا جو ثبوت دیا ہے وہ برِ عظیم پاک و ہند کا کوئی صوبہ نہیں دے سکتا ... اُردو کے اخبار اور رسالے یہاں سے نکلتے ہیں کہیں اور سے نہیں نکلتے۔ یہ کمیت ہی میں نہیں۔ کیفیت میں بھی دوسروں [illegible] پر سبقت لے گئے ہیں۔ سر شیخ عبدالقادر، مولوی ظفر علی خاں، حسرت، میاں بشیر، حمید نظامی جیسے اخبار نویس اور کہاں ہیں ... نوائے وقت کے بعض مضامین پڑھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ قطع نظر معلومات کے ان کی زبان و بیان کی صفائی اور قوت کو دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اُردو زبان ان کی نہیں ہے۔ یہ تو اس وقت کی باتیں ہیں اس سے بہت پہلے بھی پنجاب کے اُردو اخبار کوہِ نور، پنجابی اخبار، اخبارِ عام اور ان کے بعد رفیقِ ہند، وکیل، وطن، پیسہ اخبار وغیرہ وغیرہ اپنے اپنے زمانے میں بہت مقبول اور بااثر رہے ہیں۔ اس وقت یہاں بہت سے نئے ادیب اور شاعر اور انشاء پرداز ایسے ہیں کہ جن کے کلام اور افکار کو پڑھ کر مسرت ہوتی ہے۔ ان میں جدت اور تازگی ہے اور یہ ہونہار نوجوان آئندہ اُردو ادب میں نام پیدا کریں گے۔ علاوہ عام ادبی رسالوں کے مثلاً ہمایوں، ادبی دنیا وغیرہ جو یادش بخیر، مرحوم مخزن کی ذریات ہیں، علمی رسالوں کی طرف بھی توجہ ہو رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں رسالہ نفسیات اور نفسیات پر چند کتابیں میری نظر سے گزریں جو بعض نوجوانوں نے لاہور سے شائع کی ہیں۔ ان میں علمی مطالب مناسب، سادہ اور سادہ زبان میں بیان کئے ہیں[1]۔"

(ج) بابائے اُردو کی نثر

بابائے اُردو کی نثر کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی ہے۔ انھوں نے بار ہا اس سادگی کا ذکر کیا ہے کہ اس کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ باغ و بہار کے مقدمہ میں فرماتے ہیں :۔ سادہ زبان لکھنا سخت مشکل ہے۔ سادگی بعض وقت عامیانہ یا بے مزہ ہو جاتی ہے۔ سادگی کے ساتھ فصاحت اور لطف بیان کو قائم رکھنا بڑا کمال ہے۔" خطبات میں متعدد مقامات پر سادگی اور لفظ کی قوت کا ذکر ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ۔ لفظ ایک بڑی قوت ہے اور اس کا برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس گُر سے واقف نہیں اور لفظ کے صحیح اور برمحل استعمال کو نہیں جانتا، اس کا بیان اکثر ناقص، ادھورا اور بے جان ہوتا ہے۔ یہ دو چیزیں ہیں۔ ایک ادب کا ظاہر یعنی زبان اور دوسرے، ادب کا باطن یعنی خیال۔ اگرچہ ان کو الگ الگ بیان کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں۔ یہ لازم و ملزوم ہیں۔ انھی کے میل سے اسلوب بیان یعنی اسٹائل بنتا ہے[2]۔"

ایک جگہ اس طرح مشورہ دیتے ہیں :۔

"زیادہ زور اس بات پر دینا چاہئے کہ بیان سادہ اور سہل ہو۔ رہا لفظ تو اس کا پرکھنے والا ادیب ہی ہو سکتا ہے۔ وہ ہر لفظ کی نبض پہچانتا ہے اور خوب سمجھتا ہے کہ کونسا لفظ کہاں آنا چاہئے۔ اس میں موقع اور محل کو پہچاننا بڑی بات ہے۔ یہ انشاء پردازی کا بڑا گر ہے۔ لفظ میں ایک جادو ہوتا ہے جو بے محل استعمال سے پھیکا پڑ جاتا ہے اور اچھا خاصا لفظ بے جان اور بے اثر ہو جاتا ہے ...... اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہماری آواز زیادہ سے زیادہ اشخاص تک پہنچے تو ہمیں ایسی زبان میں لکھنا یا بولنا چاہئے جسے زیادہ سے زیادہ اشخاص سمجھ سکیں۔ اور اگر ساتھ ہی آپ یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی تحریر و تقریر میں اثر اور دلکشی بھی ہو تو اس کے لئے بڑی محنت، مشق اور مطالعے کی ضرورت ہے، ورنہ نری سادہ زبان زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتی[3]۔"

ایک اور جگہ یوں ارشاد ہے :۔

---

[1] خطبات۔ صفحہ ۳۴۵ خطبات (صفحہ ۱۰۹-۲۰) میں اخباروں کی زبان پر اظہارِ خیال کے ساتھ ہی اس کے لئے مشورے بھی دیئے۔

[2] خطبات۔ صفحہ ۱۷ [3] ایضاً صفحہ ۲۵۴

"محض لفاظی کا آسان ہونا کافی نہیں اس میں جان، اثر اور لطف بھی ہونا چاہئے اور یہ ہر ایک کا کام نہیں بلکہ بات [illegible] ایسے ہی [illegible] کمال اہل ادبی [illegible] کر سکتے ہیں۔ ورنہ ایسی تحریر سے کیا فائدہ جو سپاٹ، بے مزہ اور بھدّی ہو۔"[1]

اس لئے سرسید کی تحریر کی قدر کرتے ہیں اور صحیح طور پر سمجھتے ہیں کہ:

"سرسید کی سادہ و شستہ نثر مشہور ہے۔ مجھے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ کمال سے بےتکلف لکھتے تھے۔ ان کے خیالات بھی زبان میں [illegible] پاتا ہوں جو شعر کی ما اور صاف تحریر بھی ہم نے اور انھوں نے پر رکھا یا سنجیدہ اور علمی مضامین پر بھی انھوں نے [illegible] آسان زبان میں لکھے ہیں اور بعض اوقات انھیں سادہ الفاظ اور فقروں کے صحیح استعمال نے وہ قوت اور دلکشی پیدا کر دی ہے کہ جو [illegible] سے الفاظ اور جملوں سے ممکن نہیں۔ جس زمانے میں مولانا شبلی حیدرآباد میں مقیم تھے میں ایک روز ان سے ملنے گیا۔ دیکھا کہ برآمدے میں ٹہل رہے ہیں۔ (اس زمانے میں وہ علم الکلام لکھ رہے تھے) میں نے پوچھا مولانا کس فکر میں ہیں؟ فرمایا، الہام و وحی کے موضوع پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ سرسید نے بھی اس پر لکھا ہے۔ لکھا کیا ہے، مسئلے کو پانی کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ کیا پیرایہ اختیار کروں۔"[2]

بابائے اردو کے پیش نظر سرسید کی زبان تھی لیکن ان کا انداز بیان شہادت دیتا ہے کہ وہ مولانا حالی سے زیادہ متاثر ہیں اور یہ چیز بجائے خود سرسید سے اثر پذیری کی نشان دہی کرتی ہے۔ مولانا حالی کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"لفظ کا صحیح اور برمحل استعمال جس سے کلام میں جان پڑ جائے اور لفظ خود بول اٹھے کہ لکھنے والے کے دل میں کیا چیز کھٹک رہی ہے، ادب کا بڑا کمال ہے اور کوئی حالی سے سیکھے۔ دلوں میں گھر کر لینے کے جو گر ادب میں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔"[3]

اس سے پہلے اسی مضمون میں مولانا حالی کے متعلق بابا نے لکھا ہے:

"مولانا کی سیرت میں دو ممتاز خصوصیتیں تھیں۔ ایک سادگی اور دوسری درد دل۔ اور یہی شان ان کے کلام میں ہے۔ ان کی سیرت اور ان کا کلام ایک ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ ایک دوسرے کا عکس ہیں۔"

مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ ٹھیک یہی دو خصوصیتیں خود بابائے اردو میں ہیں اور یہی شان ان کے کلام میں بھی ہے۔ ان کی کوئی عبارت، کوئی مضمون اور کوئی تقریر ان دو خصوصیتوں سے خالی نہیں اور یہی ان کا سب سے بڑا کمال بھی ہے۔

سرسید اور مولانا حالی کی نثر میں ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ ہندی کے عام اور سبک الفاظ جو بول چال میں بلاتکلف آتے ہیں زیادہ سے زیادہ استعمال کرتے تھے۔ "چند ہم عصر" میں حالی کے ذکر میں ہے کہ "ایک بار جب اردو لغت کی ترتیب کا ذکر ان کے سامنے آیا تو فرمانے لگے کہ اردو لغات میں ہندی کے وہ الفاظ جو عام بول چال میں آتے ہیں یا جو ہماری زبان میں کھپ سکتے ہیں بلاتکلف کثرت سے داخل کرنے چاہئیں۔ خود اپنی نظم و نثر میں وہ ہندی الفاظ ایسی خوبصورتی سے لکھ جاتے تھے کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ اسی موقع کے لئے وضع ہوئے تھے۔ انھوں نے بہت سے ایسے ہندی الفاظ اردو ادب میں داخل کئے جو ہماری نظر سے اوجھل تھے اور جن کا آج تک کبھی کسی اردو ادیب یا شاعر نے تو کیا ہندی ادیبوں اور شاعروں نے بھی استعمال نہیں کیا تھا۔"[4]

بابائے اردو کا عمل بھی اسی پر ہے۔ چنانچہ ان کی تمام تحریروں میں ہندی اور عام بول چال کے الفاظ بھی بکثرت پائے جاتے ہیں کچھ نمونے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

---

[1] خطبات۔ صفحہ ۱۰۹ [2] صفحہ ۱۲۵ میں ہے کہ "اس سے قبل ہماری زبان میں قوم کا لفظ ذات کے معنوں میں آتا تھا۔ سرسید نے اس لفظ کا مفہوم بدل دیا اور پہلی بار لفظ قوم کو نیشن کے معنوں میں استعمال کیا۔" [3] خطبات صفحہ ۵۲۳۔
[4] چند ہم عصر (حالی)۔ لفظ کی قوت کے لئے ایک اور عمدہ بیان خطبات (صفحہ ۵۲۶) میں بھی ہے۔

(۱) باغ و بہار کے مقدمہ میں ہے۔ "شمالی ہند کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب، زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔ اگرچہ زبان نے بہت کچھ پلٹا کھایا ہے۔ اس وقت اور اس وقت کی زبان میں بہت بڑا بل ہے۔ تاہم باغ و بہار اب بھی ویسی ہی دلچسپ اور پڑھنے کے قابل ہے جیسے پہلی تھی۔"

(۲) کلیات ولی (مرتبہ مولانا احسن مارہروی) کے شروع میں التماس کے ذیل میں ہے:-

"جن صاحبوں کو کبھی قلمی نسخوں سے سابقہ پڑا ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ قلمی نسخوں کی صحت اور مقابلہ میں کیسی کچھ کھکھیڑ اٹھانی پڑتی ہے .... کم سواد کاتبوں ہی نے نہیں، بلکہ ذہین کاتبوں نے بھی کتابوں کا وہ ستیاناس کیا ہے کہ صحت کی بحث ان کی بدولت رہتی دنیا تک رہے گی .... اگرچہ اس تصحیح و ترتیب، ترمیم و اضافہ میں بہت کچھ کھٹراگ کرنا پڑا اور طوالت بھی بہت زیادہ ہوگئی ہے۔ تاہم مجھے امید ہے کہ یہ محنت رائگاں نہ جائے گی۔"

(۳) سب رس کے مقدمے میں ایسے جملے آتے ہیں:-

"فتاحی سے ایسی چوک نہیں ہوئی"

"یہ بڑے مزے کا قصہ ہے اور کون ہے جو اس کوچے سے ناآشنا ہے اور جس نے اس معرکے میں چوٹ نہ کھائی ہو"

"آخر یہ چوری کب تک چھپتی۔ رقیب کی ایک بیٹی تھی جس کا نام غیر تھا، حسن کے پاس رہتی تھی۔ ظاہر میں دوست، پر دل میں کھوٹ تھا"

(۴) مضامین محمد علی کے مقدمہ میں ہے "مختلف ممالک کے سامانوں کی جانچ پڑتال کی۔ ایک دستی یعنی نوٹ بک ہر وقت ان کی جیب میں رہتی تھی، جہاں کوئی کام کی چیز نظر پڑی فوراً ٹانک لی" ---- "مولانا ظفر علی خاں رسی تڑا کر بھاگے تھے۔ پھر اسی تھان پر آگئے" ----

"مولانا محمد علی نے کیسے کیسے جتن کئے کہ وہ ان کے پاس دلّی میں رہیں اور ہمدرد کے کام میں ان کا ہاتھ بٹائیں، مگر وہ کسی طرح ہتّے نہ چڑھے"

(۵) صرف ایک کتاب خطبات میں سے بکثرت ایسے نمونے تلاش کئے جا سکتے ہیں:-

"اس کے جانچنے کے لئے ہر کونے کھدرے پر نظر دوڑانی چاہئے" (صفحہ ۱۴)

" ------ ایک مدت تک اٹکل پچّو کام کرتی رہی" (صفحہ ۳۷)

"اس (سیاسی) رنگ کو اور گہرا کرنے کے لئے اکثر مذہب کی پٹ دی جاتی ہے" (صفحہ ۵۴)

"رسم الخط کا مسئلہ آج کل بہت زیر بحث ہے اور خاصا بکھیڑوں کا چھتّا بن گیا ہے" (صفحہ ۴۱)

"بہت پتّا مارنے کا کام ہے" (صفحہ ۶۷)

"صدیوں انتظار کرنے اور سالہا سال کی مصیبت اور کھکھیڑ اٹھانے سے حاصل ہوئے" (صفحہ ۸۳)

"جب لفظ ہماری زبان میں آگیا اور رچ بس گیا تو وہ غیر زبان کا نہیں رہتا ..... دوسری زبان میں مل جانے سے نہ اس کی پہلی سی صورت اور چہرہ مہرہ رہتا ہے اور نہ سیرت و خصلت" (صفحہ ۱۱۰)

"ہندی کی بھونڈی بولیوں کو ملا کر جھاڑ جھنکاڑ چھانٹا" (صفحہ ۲۴۳)

"حالات نے پلٹا کھایا" (صفحہ ۱۰۹) "زمانے نے پلٹا کھایا" (صفحہ ۲۹۱)

"یہ مقام جہاں آپ جلوہ فرما ہیں اردو کا گہوارہ اور اتارا رہا ہے" (صفحہ ۲۵۱)

"لیکن جب انھیں اس کی سن گن معلوم ہوئی" (صفحہ ۳۶۴)

"اس وقت سے دونوں میں ایسا بَل پڑا ہے کہ اب تک نہیں نکلا" (صفحہ ۲۶۹)

"یہ آگ جو اندر ہی اندر سلگ رہی تھی مارچ ۱۹۵۸ء میں یکایک بھڑک اٹھی" (صفحہ ۲۷۱)

"وہ جو ذرا سا کسر لگا رہ گیا تھا ظالم نے وہ بھی کاٹ کر یکسو کر دیا" (صفحہ ۲۷۲)

"ہنگامہ مچانے والوں کی حمایت میں زمین آسمان ایک کر دیا" (صفحہ ۲۷۴)

"وہ اس میں ایسی اُلجھی نہیں رہی" (صفحہ ۴۰۶)

"یہ خدا لگتی بات تھی۔ لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کہاں سنائی دیتی ہے۔ گاندھی جی لکیر پیٹتے رہ گئے اور سانپ کبھی کا نکل چکا تھا" (صفحہ ۴۱۹)

"ساری قمیصیں نکالیں اور ایک ایک کے پرزے پرزے نکال ڈالے" (صفحہ ۴۱۲)

"یہ کام کرنے کے لچھن نہیں، ٹالنے کی باتیں ہیں" (صفحہ ۴۳۰)

"اس میں چپّا مارنا پڑتا ہے" (صفحہ ۴۳۷)

"تنے کی چھال اُتار لینے سے درخت ٹھنٹھ ہو کے رہ جاتا ہے" (صفحہ ۴۸۰)

"ہم اُردو والوں کو بڑا خطرہ ہے" (صفحہ ۴۵۴)

"غلامی کا جُوا اُتار پھینکنے کا خیال خوب ہے" (صفحہ ۴۷۹)

"...... تو کیا ان کی شان میں بٹّہ پڑ جاتے ؟" (صفحہ ۵۲۴)

مذکورۂ بالا اقتباسات میں ہندی کے ٹھیٹھ بول بھی ہیں اور عام بول چال کے الفاظ و محاورات بھی ہیں۔ کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو صرف ادبار کی زبان پر ہیں۔ لیکن سادگی ان سب میں ہے اور اس سادگی میں وہ زور اور قوت ہے کہ ان کے مُرادفات اور مترادفات میں بمشکل نظر آئے گی۔ برسوں کی محنت، مطالعے اور مشاق سے یہ چیز ضرور حاصل ہو سکتی ہے لیکن وہ جو مولانا حالی کی سادگی کے ساتھ "دردِ دل" والا جذبہ کار فرما ہوا کرتا تھا۔ ٹھیک وہی جذبہ بابائے اردو کی تقریر و تحریر میں موجود ہے اور "از دل خیزد بر دل ریزد" کے مصداق، اس کلام کی اثر انگیزی میں کوئی کلام نہیں۔ دیکھئے حسب ذیل اقوال اور خیالات میں کس قدر اخلاص اور کس درجہ اثر ہے؟"

"جب کوئی وار کارگر نہیں ہوتا، تو مذہب اور سیاسیات کی آڑ لی جاتی ہے" (صفحہ ۵۵)

"زندگی مسلسل ہے۔ اسی طرح ادب بھی مسلسل ہے" (صفحہ ۶۸)

"ہر پرانی چیز بُری نہیں اور ہر نئی چیز اچھی نہیں" (صفحہ ۶۹)

"دنیا میں سب سے بڑا معلم وہ ہے جس کی آواز تمام بنی نوع انسان تک پہنچ سکتی ہے" (صفحہ ۱۲۳)

"جس طرح درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے، انسان اپنے اعمال سے جانا جاتا ہے" (صفحہ ۲۴۶)

"سکوت و سکون، بے عملی و بے اعتنائی، انسانوں اور قوموں کے سب سے بڑے دشمن ہیں" (صفحہ ۲۷۷)

"زبان کی سب سے بڑی چھوٹ ہے" (صفحہ ۲۴۹)

"جب ایک قوم کسی دوسری قوم کو فتح کر لیتی یا اس پر غالب آجاتی ہے تو سب سے پہلے وہ مفتوح یا مغلوب قوم کی زبان پر حملہ کرتی اور اس کے مٹانے کی کوشش کرتی ہے" (صفحہ ۳۴۳)[1]

"حسن تدبیر اور حسن عمل، آئی بلا کو ٹالنے کے لئے دو ہتھیار ہیں" (صفحہ ۳۸۱)

---

[1] یہ قول بظاہر ایک عیسائی سے نقل کیا گیا ہے لیکن الفاظ تو عبدالحق صاحب ہی کے ہیں۔

"ہم سب جاہلیت میں ایک سے ہیں۔" (صفحہ ۳۲۲)

"مصیبت بعض خاص حالات میں نعمت ثابت ہوتی ہے۔" (صفحہ ۳۴۸)

"کام وہ اکسیر ہے جو بڈھے کو بھی جوان بنائے رکھتی ہے۔" (صفحہ ۳۲۸)

"جو لوگ اور قومیں سختی برداشت کرنے اور دل لگا کر مسلسل کام کرنے سے جی چراتی ہیں، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔" (صفحہ ۳۲۹)

"جب کسی کے اخلاق گر جاتے ہیں تو اس کے اثر سے جسمانی اور دماغی قویٰ بھی زوال پذیر ہو جاتے ہیں۔" (صفحہ ۳۲۹)

"غلطی وہی کرتا ہے جو کرتا بھی ہے، جو کچھ کرتا ہی نہیں وہ غلطی کیا کرے گا؟" (صفحہ ۳۳۴)

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ سب انسان نیک ہیں سوائے کاہل کے۔" (صفحہ ۳۳۴)

بابائے اُردو کو اگر کبھی نہ دیکھا ہو اور نہ کبھی اُن سے ملاقات ہوئی ہو، تب بھی اِن اقوال، خیالات اور رجحانات کے مطالعے سے فوراً اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ بوڑھے ہونے کے باوجود جوان بلکہ نوجوان ہیں اور ان کی سب سے بڑی قوت اور توانائی محض اخلاق اور مسلسل کوشش ہے، وہ ہمیشہ محنت کرتے ہیں، ہمیشہ کام کرتے ہیں۔ مصیبت کو نعمت سمجھتے ہیں۔ سختی کو برداشت کرنے کے نہ صرف عادی ہیں لیکن اس کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ غلطی اور چوک ہو جانا عار نہیں سمجھتے۔ زبان و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ حق گوئی اور بے باکی ان کا شیوہ ہے۔ اور بقول اقبال کے ۔ ع دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اس اعلیٰ کردار کی شہادت ان واقعات سے بھی ملتی ہے ۔

(۱) تقسیم ہند کے بعد ۱۸ اپریل ۱۹۴۸ء کو سردار پٹیل کے شہر احمد آباد میں انجمن ترقی اُردو کی (احمد آباد والی شاخ کی) طرف سے کل گجرات اُردو کانفرنس میں فرمایا ۔

"ایسے وقت میں جب کہ حکومت کے ڈر سے اس کے خلاف اجتماعی طور پر آزادی سے اظہار رائے کرتے ہوئے لوگ بچتے اور گھبراتے آپ نے جرأت سے کام لے کر پہل کی ہے۔ میں آپکی اس ہمت، اخلاقی جرأت اور اصول پرستی پر آپ کو سچے دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔"

بابائے اُردو، گجرات کے لوگوں کو مبارک باد دے رہے ہیں لیکن حقیقت میں مبارک باد کے مستحق تو صرف وہی تھے۔ کیونکہ وہی تو سب کچھ کہنے والے تھے اور کہا بھی ایسا کہ حکومت کے دانت کھٹے کر دئے۔ فرماتے ہیں ۔

"اس وقت حکومت میں ان کا عمل دخل ہے، جو سالہا سال سے اس کی مخالفت کرتے آئے ہیں۔ انھوں نے تہیہ کر لیا ہے کہ ہندوستان سے اردو کا نام و نشان مٹا دیا جائے۔ ابھی ملک کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی کہ ان محبانِ وطن نے سب سے پہلے اردو کے گلے پر چھری پھیرنی شروع کی۔ گویا حکومت و سیاست میں سب سے مقدم اور اہم یہی ایک مسئلہ رہ گیا تھا۔ اس میدان کے سب سے من چلے شہسوار آپ کے مردم خیز خطے کے سردار (پٹیل) ہیں۔"

یہ تو پٹیل کی تعریف ہے۔ اب گاندھی جی کی شان میں قصیدہ سنئے ۔

"مشکل یہ آپڑی ہے کہ وہ (گاندھی) ہر مسئلے کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے جس سے ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ وہ دوسرا رُخ نہ دیکھتا ہے اور نہ اس کی اُسے پروا ہے۔ اگر کوئی شخص کانا ہو اور وہ ایک آنکھ سے دیکھے تو وہ قابلِ الزام نہیں۔ لیکن جس کی اچھی خاصی دو آنکھیں ہوں اور وہ ایک ہی آنکھ سے دیکھے تو وہ بلاشبہ قابلِ الزام ہے۔"[1]

پاکستان کے وزیرِ اعظم کے متعلق ۱۹۵۱ء میں کہتے ہیں ۔

---

[1] خطبات۔ صفحہ ۲۲۲۔

"ڈھونڈ کر ایک ایسے شخص کو وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر لا بٹھایا جسے تدبّر سے کچھ واسطہ نہ تھا۔ اس نے چند روز نظام کی طرح چام کے دام چلائے اور اپنے منصب کو بٹا لگا کر اپنے آقا کے ساتھ بساطِ سیاست سے پٹے ہوئے مہرے کی طرح روپوش ہو گیا۔ اس وزیرِ بے تدبیر نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا اور پھوٹ کا بیج بو دیا۔" اسی ضمن میں آگے چل کر کہتے ہیں "جمہوریت کا زمانہ ہے۔ کامیابی و ناکامی کا مدار تعداد پر ہے۔ جدھر زیادہ ہاتھ اٹھ گئے وہی جیت گیا۔ جہاں دماغ نہیں ہوتا اخلاقی جرأت نہیں ہوتی۔ جہاں ذاتی یا پارٹی کا مفاد مدِنظر ہوتا ہے، جہاں شہرت یا ہر دل عزیزی کی چاہت ہوتی ہے۔ جہاں جذبات سے زیادہ اور عقل و دانش سے کم بحث ہوتی ہے، جہاں خود اعتمادی اور قوتِ ایمانی کا فقدان ہوتا ہے وہاں تعداد ہی غالب ہوتی ہے[1]۔"

"پاکستان میں اردو کا المیہ" کے آخر میں فرماتے ہیں کہ "ہم بہی خواہانِ اردو کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ (اردو) یونی ورسٹی اپنی نظیر آپ ہوگی۔ یہ قومی زبان اور قومی تہذیب و روایات کو زندہ رکھے گی اور فروغ دے گی۔ اس کا سنگِ بنیاد ایک ایسے شخص کا دستِ مبارک رکھے گا جس کے آنے کا انتظار ہے۔" اور اسی کتابچے کے "عرضِ حال" میں ہے کہ "حکومت پودنوں کے ہاتھ میں ہے۔ انسان کی تلاش ہے۔ اس کی آمد کا انتظار ہے۔" یہ ہے اس بابائے اردو کے قلم کی بے باکی جسے ماہانہ وظیفہ دے کر حکومت نے خوش کرنا چاہا تھا۔

زبان کی سلاست، قوت اور برجستگی کے لئے "دردِ دل" اور اخلاص کی ضرورت ہے۔ جہاں یہ چیز ہوگی، کامیابی قدم چومے گی اور ہر موضوع ایک شاہکار بن جائے گا۔ دیکھئے ایک اصطلاحی بحث میں بھی کس قدر زورِ بیان پایا جاتا ہے: "رجعت اور ترقی اضافی چیزیں ہیں۔ کائنات کا ہر ذرّہ حرکت میں ہے اور ہر چیز پر تغیّر کا عمل جاری ہے۔ رجعت یا ترقی، ہر زمانے کے حالات اور ماحول کے اعتبار سے ہوتی ہے۔ یہ خیال کہ ہر چیز جس کا تعلق گزشتہ زمانے سے ہے سراسر رجعت سے آلودہ ہے، صحیح نہیں۔ محض اس بنا پر کہ ہم آگے بڑھ گئے ہیں۔ گزشتہ سے اپنا تعلق قطع نہیں کرنا چاہئے۔ ایسا کرنا اپنی جڑیں کاٹنا ہے[2]۔"

یہی "دردِ دل" عقل و عشق کی بحث میں بھی دیکھئے۔ فرماتے ہیں کہ "عقل و عشق کی لڑائی ایک عجیب داستان ہے، یہ جاپان اور جرمن جنگ سے بھی کہیں زیادہ ہولناک ہے۔ یہ عالمگیر جنگ ہے جو ہر آن، ہر ساعت اور ہر مقام پر برپا ہے اور ابتدائے آفرینش سے اب تک قائم ہے۔ اور رہتی دنیا تک قائم رہے گی۔ انسان نہ صرف عقل ہی عقل ہے اور نہ جذبات ہی جذبات۔ اگر وہ محض عقل ہی ہوتا تو ایک اچھی خاصی مشین ہوتا اور اگر جذبات ہی جذبات ہوتا تو بلاشبہ مجنوں ہو جاتا۔ کاش وہ کچھ ہوتا، ایک ہوتا۔ لیکن مشکل یہ آپڑی ہے کہ اس میں دونوں صفتیں موجود ہیں۔ عقل اسے ایک طرف کھینچتی ہے اور عشق دوسری طرف۔ اور دونوں کے رستے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہیں .... جب توفیق یاوری کرتی ہے تو ایسے نازک وقت پر ہمت سامنے آتی ہے اور التوائے جنگ کا ڈول ڈال کر لڑاکوؤں کو سمجھانا بجھانا شروع کرتی ہے۔ عشق پر معمولی پند و نصائح کا اثر کیا ہو سکتا ہے۔ اس لئے وہ اسے اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے ایسا لبھاتی ہے کہ وہ صلح پر راضی ہو جاتا ہے۔ اس صلح میں راہِ مستقیم ہے۔ اس رستے کے چلنے والوں میں کبھی کبھی کامل نظر نظر آجاتے ہیں[3]۔" بظاہر یہ بحث سب رس کے تمثیلی قصے سے متعلق ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی بحث میں ایک بہت بڑی حقیقت کی پردہ کشائی ہے۔ سچ ہے کہ صرف علم ادب کی تحصیل ایک ادیب کے لئے کافی نہیں۔ اس کے لئے علم، ذکاوت، محنت، مشق، تربیت، جرأت، بصیرت اور سب سے زیادہ اخلاص اور "دردِ دل" کی ضرورت ہے۔ یہ سب چیزیں بابائے اردو کی ذات میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

---

[1] پاکستان میں اردو کا المیہ صفحہ ،،۔ [2] خطبات صفحہ ۷۹۔ [3] مقدمہ سب رس۔

تحسین سروری

عبدالحق طالب علم کے دو مضامین

مولوی عبدالحق صاحب (مرحوم) ہاپڑ ضلع میرٹھ میں ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ہاپڑ اور سرادے میں حاصل کی۔ اس کے بعد وہ اپنے والد شیخ علی حسن صاحب کے پاس فیروز پور (پنجاب) چلے گئے (یہاں علی حسن صاحب بہ سلسلۂ ملازمت مقیم تھے) اور یہیں سے مولوی صاحب نے اردو مڈل کامیاب کیا۔ اس کے بعد تعلیم جاری رکھنے کی غرض سے ۱۸۸۸ء میں علی گڑھ چلے گئے اور وہاں چھ سال رہ کر ۱۸۹۴ء میں (۲۴) سال کی عمر میں بی اے کا امتحان دے کر کامیاب ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں مولوی صاحب کے مضامین انگریزی ادبیات اور فلسفہ و ریاضی تھے۔ کہتے ہیں کہ ریاضی میں سر ضیاءالدین کے حریف سمجھے جاتے تھے۔

مولوی عبدالحق صاحب بڑے خوش قسمت تھے کہ ابتدائی زمانہ ہی میں انہیں سرسید، حالی، نذیر احمد، نواب وقارالملک، مولوی سید حسین، اعتمادالملک اور جسٹس سید محمود جیسے نامور اور یگانۂ روزگار اشخاص کی قربت حاصل رہی اور ان کی علمی و عملی سرگرمیوں میں ان کے مددگار کی حیثیت سے حصہ لینے کے مواقع ملے۔ غالباً یہ سب اسی فیض تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہیں علی گڑھ کے زمانہ قیام سے مضمون نگاری کا شوق ہوا۔ اگر تلاش و جستجو جاری رہی تو امید ہے کہ مولوی صاحب کے زمانہ طالب علمی کے مضامین اس وقت کے اخبارات و جرائد میں دستیاب ہوں گے۔ فی الحال ان کے اسی زمانے کے دو مضامین تھوڑی سی تفصیل کے بعد آئندہ صفحات میں پیش کرتا ہوں۔

مولوی صاحب عثمانیہ کالج اورنگ آباد (دکن) کے جب پرنسپل تھے، اس وقت "نورس" نام کا ایک کالج میگزین جاری ہوا۔ "نورس" نے باوجود اس کے کہ وہ ریاست حیدرآباد کے ایک صوبے کے کالج کا ترجمان تھا اردو زبان و ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ سب سے پہلے اس نے "عبدالحق نمبر" نکالا اور اسی طرح کئی اشاعتوں میں مولوی صاحب کی علمی خدمات کو اجاگر کرتا رہا۔

اسی "نورس" کے دو شمارے میرے پاس ہیں جن میں عبدالحق صاحب کے دو مضامین "گندم" اور "مذاق" شامل ہیں۔ ان میں پہلا مضمون اخبار سرمور گزٹ کے شمارہ ۲۵ اپریل ۱۸۹۲ء سے نقل کیا گیا ہے جب کہ مولوی صاحب انٹر میں پڑھتے ہوں گے۔ دوسرا مضمون "مذاق" اخبار محمڈن نیشنل میگزین کے یکم ستمبر ۱۸۹۳ء کی اشاعت سے لیا گیا ہے۔ مولوی صاحب نے یہ مضمون اس وقت لکھا تھا جب کہ وہ بی اے کے طالب علم تھے۔

چونکہ "نورس" کے یہ شمارے بھی تیس سال قبل (۱۹۳۲ء) کے ہیں اور اس وقت نایاب ہیں، اس لئے ان کو دوبارہ شائع کر کے محفوظ کر لینا ہی مناسب ہوگا۔

جو اصحاب مولوی صاحب کی عالمانہ شان، ان کے دل نشیں اسلوب، اور ان کے اعلیٰ تنقیدی و تحقیقی رنگ کے گرویدہ ہیں، شاید انہیں

یہ مضامین کچھ عجلت سے لکھے گئے ہیں، لیکن جب ایک [illegible] کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین ہوں گے تو ان میں [illegible]
ایک خاص لطف حاصل ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ اندازہ بھی ہوگا کہ ان مضامین کے لکھنے والے کا اگر ساتھ دیا گیا تو ایک دن وہ ایک
ایسا جوہر قابل ثابت ہوگا جس پر پوری قوم فخر کرے گی۔

ان معروضات کے بعد میں عبدالحق صاحب کے مذکورہ مضامین پیش کرتا ہوں۔

گندم

دنیا کی پیدائش یا یوں کہیئے کہ انسان کی پیدائش سے گندم کو ایک بڑا گہرا تعلق ہے۔ خواہ یہ تعلق بنیادی ہی کیوں نہ ہو مگر یہ نہ کسی کے مٹانے مٹ سکتا ہے اور نہ کسی کے کہے کم ہو سکتا ہے۔ بالفرض اگر اس پرانی روایت کو یقین کرنے والا کوئی نہ رہے۔ تو بھی ہماری تحریروں میں سیکڑوں استعارے پائے جائیں گے اور ہمارے شعراء کی تو بات ہی نہ پوچھیے، دیوانوں کے دیوان ہی اس سے پُر ہیں۔ اس گندم نے ان پر ایسا جادو کیا ہے کہ سیکڑوں نئی ترکیبیں، نرالی تراشیں اور اچھوتے مضامین اس سے پیدا ہو گئے ہیں۔ گندم نما یا گندم گوں حسن کی توصیف تو کوئی ان ہی چلبلے دلوں سے پوچھے اور کیوں نہ ہو، چیز ہی ایسی ہے، بابا آدم تک کے منہ میں تو پانی بھر آیا۔ گندم کے سینہ چاک ہونے کو ذوق نے خوب نبھایا ہے ~

گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت میں
انساں کو کیوں نہ ہوئے محبت وطن کے ساتھ

آدم کا بہشت سے نکلنا ~

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے تھے لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

وغیرہ وغیرہ ایسے سیکڑوں مضامین ہیں۔

انسان کا یہ بڑا تعلق کسی کے توڑے ٹوٹ نہیں سکتا۔ گھر گھر حضرت آدم کی اس کرتوت کا ذکر ہوتا ہے۔ بچے بچے کی زبان پر یہ روایت ہے۔ گو بڑے ہو کے ہم نہ مانیں مگر مشکل یہ ہے کہ ہم اسے بھلا نہیں سکتے۔

عیسائیوں نے اس نافرمانی کو جو حضرت آدم سے سرزد ہوئی ایسے مستحکم طور سے پکڑ لیا ہے کہ خدا ہی ہے جو ان سے پیچھا چھڑائے۔ وہ انسان کا پہلا گناہ ان کی تعلیم کا اصل اصول قرار پا گیا ہے۔ اس گناہ کو یہ عیسائی (حضرت عیسیٰ کی تعلیم کے مطابق نہیں بلکہ سینٹ پال کی تعلیم کے بموجب) ایک موروثی گناہ سمجھتے ہیں جس سے کوئی بشر نہیں بچ سکتا۔ اس کا علاج مرض کی دوا ان کے خیال میں صرف ایک ہی ہے۔ یعنی مسیح پر ایمان لانا وغیرہ۔ اگر یہ ٹھیک ہے تو کسی نے خوب کہا ہے ~

آدم نے کھا کے دانۂ گندم بہشت میں
اپنی تو کیا ہماری بھی مٹی خراب کی

غرض ایسے ایسے خیالات ہیں جو اہل مذہب نے اپنی تسلی کے لئے گھڑ لئے ہیں۔ شاعروں کی نازک ترکیبیں اور مذہبی پیچیدہ بحثیں چھوڑ کے ہم اس کا کچھ تاریخی حال لکھنا چاہتے ہیں۔

[illegible] قسم [illegible] کے حصے [illegible] ہندوستان [illegible]

ہے یہ شبہ ایک [illegible] زمانے سے ہم تک پہنچا ہے [illegible] زمانے سے جن کا نام [illegible] ہونے [illegible] دم [illegible]

پر جل کے خاک ہو جاتے ہیں۔

پھر بھی جہاں تک پتہ چلتا ہے مشہور ہے کہ سب سے پہلے اس کی کاشت اہل مصر کرتے تھے۔ اور اس کی شہادت مصر کے ایک عظیم الشان مینار کی ایک اینٹ سے ملتی ہے جس کے اندر اس عالم گیر اناج کا ایک دانہ رکھا ہوا تھا۔ اور اس اینٹ پر ۳۳۵۹ قبل مسیح لکھا ہوا تھا یعنی اس کی کاشت مسیح سے دو ہزار سات سو برس پہلے ہوتی تھی۔ عام گیہوں کی تین قسمیں سوئٹزرلینڈ، اطالیہ اور ہنگری میں پتھر کے زمانے کی مشہور و معروف جنگ کے وقت پائی جاتی تھیں۔ (اب ۔۔ ۱۵ برس قبل مسیح)

مصری کہتے ہیں یہ اناج ہمیں آئی سس سے پہنچا ہے مگر یونانی اسے سیرس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں گیہوں کے ملک بہ ملک تقسیم ہونے کی بابت ایک بہت پرانی روایت مشہور ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سیرس نے اپنے عزیز دوست ٹریپٹولیمس کو کھیتی باڑی کرنی سکھائی تیز روٹی پکانے کی بھی ترکیب بتائی۔ پھر اسے اپنی گاڑی عنایت کی جو ایک آسمانی گاڑی خیال کی جاتی تھی جس میں بیٹھ کر وہ تمام اقوام میں صرف اناج تقسیم کرنے کی غرض سے مفید عام سفر کیا کرتا تھا۔

پرانی یادگاروں اور قدیم کتبوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں گیہوں گڈریوں کے حملے سے پہلے پائے جاتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ اس کی مختلف قسمیں مختلف ملکوں میں پائی جانے لگیں۔ عام گیہوں کی بے شمار قسمیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ کرنل لی کوٹر باشندہ جرمنی نے ایک سو پچاس مختلف قسم کے گیہوں کی کاشت کی ہے مسٹر دامدان ایک فرنچ جینٹلمین کی بابت ذکر کرتے ہیں اس نے ۳۲۲ مختلف قسمیں گیہوں کی جمع کی تھیں اور فرانس کی ایک سوداگروں کی کمپنی نے آزمائش کے طور پر اس سے دگنے قسم کے گیہوں پیرس کے قریب بوئے تھے۔

گندم کے نام بہت پرانی زبانوں میں پائے جاتے ہیں اور وہ اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ اناج زمانہ قدیم سے ایشیا، یورپ اور افریقہ کے متعدد حصوں میں بویا جاتا ہے اور شاید اس قدامت ہی کی وجہ سے اس اناج کو حضرت آدم کے کھانے کے لئے موزوں قرار دیا ہے۔ جہاں تک تحقیق سے معلوم ہوا ہے، کسی ملک یا دنیا کے کسی حصہ میں گیہوں قدرتاً پیدا نہیں ہوتے۔ بہتیرے شاعروں، سیاحوں اور مورخوں نے ایسا لکھا ہے مگر ہمیں اس کے تسلیم کرنے میں تامل ہی نہیں بلکہ سخت اعتراض ہے۔

مثلاً اڈیسی (ہومر کی مشہور تصنیف) میں لکھا ہوا ہے کہ جزیرہ سسلی میں گیہوں بغیر انسانی مدد یا محنت کے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اندھا شاعر بھلا انہیں خود کیا دیکھ سکتا تھا۔ اور علم نباتات کے ایک بھاری مسئلہ کا فیصلہ ایک ایسے مصنف کی ضعیف شہادت پر نہیں کر سکتے کہ خود جس کی بابت اب تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ آیا ہومر فی الحقیقت کوئی شخص تھا بھی یا یوں ہی ایک فرضی نام ہے۔ ڈائیوڈورس ایک ایسی ہی اور روایت لکھتا ہے کہ آئسی رس نے فلسطین میں گیہوں اور جو کثرت سے اگے ہوئے دیکھے۔ یہ اور ایسی ہی اور روایتیں گیہوں کے قدرتی طور پر پیدا ہونے کی بابت ہرگز ہرگز قابل اعتبار نہیں ہو سکتیں جبکہ ہم صاف دیکھتے ہیں کہ اس میں یہ مادہ ہی نہیں رکھا گیا کہ یہ سینہ چاک دانہ بغیر انسانی محنت، کاشت، سینکڑوں دقتوں اور طرح طرح کی خاطر تواضع کے زمین سے سر باہر نکالنے کی تکلیف گوارا کر سکے۔

اگر گیہوں خود رو ہونے لگیں تو عیسائیوں کی بڑی کم بختی آئے۔ کیونکہ انجیل میں یہ سزا جو خدا نے آدم کی نافرمانی پر دی تھی کہ "تو سخت محنت سے زمین میں سے اپنی روزی پیدا کرے گا جب تک کہ تو پھر زمین میں دفن نہ ہو جائے"۔ دنیا کے ایک بڑے حصے کے لئے بالکل غلط ثابت ہو جائے پھر تاویلیں کرتے کچھ نہ بن پڑے۔ مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ بڑی چین سے گذرے اور انسان اس دنیا کو آفتاب اور شکم دوزخ کے دھندے سے آزاد ہو جائے۔

قحط کے دنوں میں اس کی کچھ قدر معلوم ہوتی ہے جب کہ اس کا ایک دانہ جان سے زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ بہتیرے غریب ہیں کہ اس کی خاطر ترپ ترپ کر جان دے دیتے ہیں۔ بہتیرے انہیں چند دانوں کے پھیر میں آ کر عمر بھر کے لئے غلام بن جاتے ہیں اور آزادی کا جوہر قیمتی چیز ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں۔ غرض ان دنوں جس کے پاس یہ ہوتے ہیں اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ جس کے گھر میں اس کے چند دانے بھی نظر آتے ہیں۔ اس گھر کا پایا آدم ہی اور ہو جاتا ہے۔

خدا کی قدرت ہے نہ معلوم اس میں کیا خوبی رکھی گئی ہے کہ ہر روز اسے کھاتے ہیں مگر طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ ورنہ ایک ہی چیز اگر دو وقت کھانی کھائی جائے تو چند روز میں طبیعت اکتا جاتی ہے۔ مگر نہیں اکتاتی تو اس سے۔ اس کے چاولوں نے ہمیں کچھ ایسا مسخر کر لیا ہے کہ اس سے منہ موڑتے بنتی ہی نہیں۔ اس کی مقناطیسی قوت نے کچھ ایسا کھینچا ہوا ہے کہ اس سے جدا ہونے کی کوئی توقع ہی نہیں۔ بے شک ہم اسے کھاتے ہیں مگر دراصل یہ ہمیں کھائے جاتا ہے ہم اسے کھا کر تندرست اور بے فکر ہو جاتے ہیں مگر حقیقت میں یہ انگلیوں پر نچا رہا ہے۔

راقم عبدالحق
(علی گڑھ کالج)

مذاق

یہ ایک ایسا لفظ ہے کہ ہم ہر روز ہر ایک شخص کی زبان سے سنتے ہیں۔ صرف سنتے ہی نہیں بلکہ عملی طور سے استعمال کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ایسے بہت کم ہیں جو اس کا صحیح استعمال جانتے ہیں یا اسے صحیح طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یوں مذاق کرنے کو بچہ سے لے کر بڑھے تک کون ہے جو نہیں کرتا۔ لیکن ہم اپنے روزمرہ کے تجربوں سے لیتے ہیں کہ فیصدی مشکل سے چند ایسے شخص ہوتے ہیں جن کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں اس میں کچھ مذاق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر ایک کی یہ بڑی خواہش ہے کہ میں مذاق کرنا سیکھ جاؤں۔ کیونکہ مذاق ایک ایسی چیز ہے جو دوسروں کے دلوں کو لبھا لینے والی ہے مگر طبیعت موزوں نہ ہونے کی وجہ سے اکثر لوگوں کی قسمت میں ناکامیابی لکھی ہوتی ہے۔ مگر وہ اس عمدہ خواہش کو زبردستی پورا کرنے کے لئے خواہ مخواہ مذاق کے نام کو بدنام کرتے ہیں۔ اور غلطی سے ایسا بڑا راستہ اختیار کر لیتے ہیں جسے مذاق سے ذرا بھی تعلق نہیں ہوتا اور رفتہ رفتہ ان میں ایک ایسی بری عادت پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ہرگز اس قابل نہیں رہتے کہ کسی مہذب سوسائٹی میں شریک ہو سکیں اور بات چیت کر سکیں۔ سوائے اس کے کہ یا تو بول کے اپنی ذلت کرائیں، اوروں کو تکلیف دیں۔ یا یہ کہ منہ میں گھنگنیاں ڈال کے چپ بیٹھے رہیں مگر مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ نچلے بھی نہیں بیٹھ سکتے۔

وہ بے ہودہ چیز جسے وہ غلطی سے مذاق سمجھتے ہیں تمسخر یا مسخرا پن ہے جو بعض اوقات اس قدر ناپاک اور گندہ ہوتا ہے کہ مہذب کان ان الفاظ کو سننا ہرگز گوارا نہیں کر سکتے۔ بازاری گفتگو کبھی مذاق نہیں ہو سکتی۔ ایسے تمسخر کا اثر نہایت برا ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ اس سے بھی برا۔ اس کے کرنے والے ہمیشہ پچھتاتے ہیں اور تھوڑی سی دیر ہنسی نکالنے کی خاطر بعض وقت انہیں عمر بھر تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ دو پکے دوست انہیں بے ہودہ الفاظ کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جاتے ہیں اور برسوں کی کمائی خاک میں ملا دیتے ہیں۔ اور وجہ یہ ہے ان کا مذاق جس پر انہیں فخر و ناز ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ مذاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو چونکہ ان کی طبیعت یہ قابلیت نہیں رکھتی یا ان کی طبیعتیں اس درجہ کی پست ہوتی ہیں کہ بجائے اس کے کہ اس اعلیٰ جوہر کو اختیار کریں بہک کر ایک ایسے راستے پر جا پڑتے ہیں جو انہیں ایک ایسی پستی، حقارت، تنفر اور کمینہ پن کے مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں کوئی نیک طینت اور قابل شخص جانا پسند نہیں کرتا۔ پست طبیعتیں ہمیشہ پستی کی طرف مائل ہوتی ہیں اور

پانی کی طرح ہمیشہ نشیب کی طرف جاتی ہے جس طرح جب وہ طبیعتیں مذاق سے خندہ بے ہیں اور اعلیٰ خوبی کو حاصل نہیں کر سکتیں ان کا رجحان بد تمیزی کی طرف ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ ایک ایسے تنگ دائرے میں گر جاتے ہیں کہ جہاں تہذیب و شائستگی کی شعاع تک نہیں پہنچ سکتی تمسخر بڑھ جاتا ہے کہ ایسی باتوں کی انہیں اس قدر خواہش ہوتی ہے کہ کوئی نہ یاد سنے وہ اپنی چیخ چیخ سے باز نہیں آتے۔ اس فضول جھک جھک اور بک بک سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ اپنے ہونٹ سی دیں تاکہ اگر وہ بولنا بھی چاہیں تو نہ بول سکیں۔ اس سے اگر کچھ اور نہیں تو اتنا فائدہ تو ضرور ہے کہ بولنے سے جو خیال جو ان کی نسبت اوروں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے اس کی مضرت سے بچے رہیں۔ اور سننے والوں کے دلوں کو جو تکلیف ہوگی اور اشتعال پیدا ہوگا اس سے خود بھی بچیں اور اوروں کو بھی بچائیں۔ اور اگر کسی خدا کے بندے کو ایک چپ چاپ صورت دیکھ کر حسن ظن پیدا ہو جائے تو اور بھی بہتر مگر یہ توقع تو یہ ہو نہیں سکتا

مذاق کرتے وقت اس بات کا بڑا خیال رکھنا چاہیے کہ ہماری زبان سے بھولے سے بھی کوئی ایسا لفظ نہ نکلے جس سے کسی پر ذاتی حملہ مقصود ہو ورنہ وہ مذاق نہیں رہے گا بلکہ انتقام اور بدلہ ہو جائے گا۔ اور کسی کے خیالات کا خون کرنا یا کسی کے دل کو دکھانا وہ بڑا عیب ہے کہ جس کا کفارہ میرے خیال میں کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ انتقام بھی نہ سمجھا جائے تو اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ طبیعت کی حد درجہ کی پستی اور رذالت ہوگی۔

گر صد ہزار لعل و گہر میدہی چہ سود
دل را شکستہ نہ کہ گوہر شکستہ

اس خیال کے ساتھ ہماری آنکھوں کے سامنے سید انشاء اللہ خاں کی تصویر کھنچ جاتی ہے جن کی طبیعت کی جولانی، تیزی و طراری اور چلبلاپن ایسا نہیں تھا جو کسی کو نہ معلوم ہو۔ ایک وقت کا ذکر ہے کہ نواب سعادت علی خاں یہ کہہ رہے تھے کہ فلاں فلاں نجیب الطرفین ہیں تو انہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہم بھی تو نجیب الطرفین ہیں۔ سید انشاء اللہ جھٹ بول اٹھے۔ بلکہ "انجب" یہ کہنا تھا کہ نواب کے تیور بدل گئے۔ اس ایک لفظ نے وہ قہر ڈھایا کہ انہیں اپنی زندگی کے باقی دن کاٹنے دو بھر ہو گئے۔ وہی سید انشاء اللہ جو کبھی نواب کی طبیعت کے مالک تھے اس دن سے اپنی طبیعت کے بھی مالک نہ رہے۔ وہی سید انشاء اللہ جو نواب کے اتنے سر چڑھے تھے ایسے نظروں سے گرے کہ ان کی تمام زندگی تلخ ہو گئی اور اپنی عمر کے دن جو کاٹے بھی تو اس ذلت اور مصیبت سے کہ خدا کسی دشمن کو بھی نصیب نہ کرے۔ یہ ہے ایسے مذاق کا انجام اور یہ ہے ایسے مذاق کا اثر۔

ہم نہیں سمجھتے کہ اس سے عمدہ اور کون انجام ان لوگوں کے لئے ہو سکتا ہے ایسی طبیعتیں ایسے ہی انجام کے قابل ہیں۔ مشہور ہے جیسی روح ویسے فرشتے۔ وہ دوست جو ایسے مذاق کی داد دیتے ہیں خود خوش ہوتے ہیں ان کی طبیعت کی تعریف کرتے ہیں اور ایک طرح سے انہیں جرأت دلاتے ہیں اور ایسے بے ہودہ مذاق کرنے کی ترغیب دیتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہی مذاق کسی دن ان کے حق میں زہر قاتل ثابت ہوگا۔ اور اسی منہ کو جس سے آج واہ واہ اور مرحبا مرحبا! کی آواز نکلتی ہے، مجبوراً بند کرنا پڑے گا۔ اور پھر سوائے اس کے کہ وہ اپنی ان حرکات پر نادم ہوں اور کچھ نہیں کر سکیں گے۔

مگر اس سے بھی بڑھ کر ایک اور عام نقص مذاق میں پایا جاتا ہے۔ جسے میں عیب ہی نہیں سمجھتا بلکہ بڑا گناہ سمجھتا ہوں اور وہ مذہبی حملہ ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس کی پروا کرتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ وہ اسے برا نہیں سمجھتے۔ ہم نے مانا کہ انہی کا مذہب سچا ہی مگر اس کے کیا معنی کہ دوسرے مذہب کو برا بھلا کہا جائے۔ جب وہی الفاظ ان کے مذہب کی نسبت کہے جاتے ہیں تو انہیں کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ کتنی بڑی خود غرضی اور ناانصافی ہے کہ وہ تو اوروں کو جو چاہیں کہہ لیں، مگر انہیں کوئی کچھ نہ کہے۔ افسوس جنہیں اپنا اس قدر خیال ہے وہ دوسروں کی طبیعت کا ذرا بھی اندازہ نہ کر سکیں۔ اس بات کو ہمیشہ مد نظر رکھنا چاہیے کہ دوسرے مذہب کو برا کہنے سے اپنا مذہب کبھی سچا نہیں ہو سکتا۔

ایسے مذاق بہت برے مذاق ہوتے ہیں جن کے کرنے والے غالباً رذیل، چھچھورے اور اوباش طبیعتوں کے ہوتے ہیں ان کا مذاق ان کی طبیعت کا اداپن ظاہر کرتا ہے یا ان کی طبیعت کا اوچھا پن انہیں ایسے مذاق کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

ایک عام پسند مشغلہ لوگوں کا تخیل مذاق کسی کو بنانا ہے اور تمسخر کی ایک نہایت ہی ناقابل برداشت شکل ہے۔ بعض لوگ اس میں بڑا کمال رکھتے ہیں اور اچھا مذاق سمجھا جاتا ہے جو دوستوں [illegible] نے میں بڑے مشاق ہوں اور وہ کبھی اپنی اس کامیابی کو فتح کابل سے کچھ کم نہیں سمجھتے۔ بنانے کے معنی خواہ مخواہ کسی کو ذلیل کرنا ہے قیاس ہے [illegible] ہو سکتا ہے کہ یہ کتنا بڑا عیب ہے۔

یہ اکثر کہا جاتا ہے اور ہم نے اپنے کانوں سنا ہے کہ مذاق غیر محدود ہے۔ مگر یہ ایسی بڑی غلطی اور دھوکہ ہے کہ ذرا سے سوچنے کے بعد بھی اس کی تمام قلعی کھل جاتی ہے۔ اس کے کہنے والے وہی شخص ہیں جو اپنے عیب کو چھپانا چاہتے ہیں، جو اپنے نقصوں کو اوروں کی نظروں میں ہنر دکھانا چاہتے ہیں۔ یہ دنیا میں جو دھکے کھاتی ہیں شکار کھیلتے ہیں اور اس دلچسپ اور غیر مدلل اور بے بنیاد فقرے سے دوسروں کو بہلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مذاق کبھی غیر محدود نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ حدود جو مذاق کو گھیرے ہوئے ہیں توڑ دی جائیں تو پھر بھانڈوں کی نقلوں اور مہذب مذاق میں کچھ فرق نہیں رہنے کا۔ سب سے بڑی حد جس نے اسے گھیر رکھا ہے تہذیب ہے اور جس نے اس سے ذرا بھی قدم باہر رکھا وہ مذاق کے حدود سے بالکل باہر نکل جاتا ہے اور اس کے الفاظ پوچ اور پھر گفتگو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ میں نے یہاں تہذیب کا لفظ لکھا ہے جس میں بہت سی گنجائش ہو سکتی ہے اور وہ لوگ جو مذاق کو غیر محدود بتاتے ہیں اپنا مطلب آسانی سے نکال سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا گول مول لفظ ہے جس کا صرف لکھ دینا ہی کافی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کسی قدر اس کی تشریح نہ کر دی جائے اس کی تعریف (Definition) اور صحیح مفہوم کا بتانا ذرا مشکل کام ہے۔ مگر اس موقع پر میں اس قدر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ مذاق یا گفتگو کرتے وقت ہمیں اپنے مخاطب لوگوں کی تہذیب کا خیال رکھنا چاہیئے۔ تہذیب (مینرز یا اطوار کے لحاظ سے) تمام دنیا میں ایک سی نہیں ہوتی۔ قریباً ہر ایک ملک اور ہر ایک قوم کی تہذیب میں بہت سی باتوں کا اختلاف ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ جس بات کو ہم تہذیب سمجھتے ہیں دوسری قوم کے لوگ اسے سخت معیوب خیال کرتے ہوں۔ اور حقیقت میں ہمیں اس بات پر بڑی توجہ کرنی چاہیئے کہ ہماری تمام گفتگو اور ہمارا تمام مذاق اور ہماری تمام حرکات ایسی پسندیدہ، عمدہ طرز میں ہونی چاہئیں کہ کسی کو ذرا بھی ناگوار نہ گذرے۔ اور یہی تمام گڈ مینرز (خوش آیند اطوار) اور تہذیب و شائستگی کی علت غائی۔ اس لئے مذاق کو غیر محدود کہنا بڑی خوفناک غلطی ہے جس سے بچنے کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے۔

ہم اپنے خاص دوستوں سے خاص خاص موقعوں پر ہر طرح کا مذاق کرتے ہیں۔ مگر اگر وہ مذاق ہم عام لوگوں یا عام دوستوں سے کریں گے تو وہ اسے ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ بے تکلف دوست ان باتوں کو برا نہیں سمجھتے۔ مگر عام لوگ ایسے الفاظ سنتے ہی فوراً ناک بھوں چڑھانے لگیں گے اس لئے مناسب یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی طبیعت اور اپنے تعلق کا اندازہ کر کے مذاق کرنا چاہیئے۔

میرے دل میں یہ بارہا خیال آیا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ عموماً لوگ اس کثرت سے بے ہودہ مذاق اور تمسخر کرتے ہیں، باوجودیکہ وہ خود سمجھتے ہیں کہ یہ تمام ناپسندیدہ اور بیہودہ حرکات ہیں۔ مجھے جو غور کرنے سے معلوم ہوا اور جسے میں ٹھیک بھی سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ تمام کوشش، ساری تکلیف صرف طبیعت کے بہلانے اور دل خوش کرنے کے لئے کی جاتی ہے۔ مگر کس قدر نادان ہیں وہ انسان جو دانت نکالنے اپنے دونوں ہونٹوں میں ایک انگشت جگہ خالی کر دینے اور ٹھیں ٹھیں کرنے کو اصلی خوشی سمجھتے ہیں۔ انسان کا اس دنیا میں بڑا مدعا یہ ہے کہ کسی طرح یہ دن خوشی خوشی کٹ جائیں اور رنج والم یاس تک نہ پھٹکے۔ اس بڑے مقصد کے حاصل کرنے کے لئے ہر ایک نے اپنی استطاعت کے موافق طرح طرح کے طریقے نکالے ہیں۔ مگر کوتاہ نظر اور جلد فیصلہ کرنے والی طبیعتوں نے یہاں بھی غلطی کی اور ظاہری خوشی کو اصلی خوشی سمجھ بیٹھے۔ کسی کو قہقہہ مارتے ہوئے دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ یہ شخص خوش ہے سخت غلطی ہے۔ سچی خوشی انسان کو اس وقت نصیب ہوتی ہے جب کہ وہ اپنا فرض کما حقہ ادا کر لیتا ہے اور یہ وہ اعلیٰ خوشی ہے جس کے سامنے دنیا کی ہزاروں اور لاکھوں خوشیاں ہیچ ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مذاق سے ایک قسم کی خوشی ہوتی ہے مگر اچھا مذاق وہی ہے جس سے دلی مسرت ہو۔ بیہودہ مذاق میں سوا اس کے کہ ہم منہ پھاڑ کے قہقہہ ماریں اور کچھ نہیں ہوتا اس سے [illegible] ہوتا ہے اور نہ یہ خوشی دیر پا ہوتی ہے اور نہ یہ خوشی ہماری [illegible]۔ بلکہ طبیعتوں کو راحت دینے میں کچھ مددگار ہوتی ہے۔

[illegible]

ہیں جو بے ہودہ حرکات کو مذاق کہتے ہیں۔ ایسے مذاق [illegible] کا ملک سے [illegible] کچھ تعلق نہیں۔

ہیں ان لوگوں کو جو بیجا مذاق کرتے ہیں ہرگز برا نہیں کہتا بلکہ قابل افسوس سمجھتا ہوں کیونکہ یہ وہ اعلیٰ جوہر اور عمدہ خوبی ہے جو قدرت نے صرف ان لوگوں کی قسمت میں لکھی ہے جن کی طبیعت نیک اور جن کے دل صاف ہیں اور ہی لوگ اس غرض کو عمدہ طور سے ادا بھی کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور کے واسطے مذاق کے لئے بھی لیاقت ہونی چاہیے۔

اب قدرتاً دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مذاق کیا ہے؟ مگر اس تشریح کے بعد اس کا جواب دینا کچھ مشکل نہیں۔ ہم اس کی تعریف اس طرح کرینگے مذاق کلام یا گفتگو کا وہ مختصر اور لطیف حصہ ہے جس سے تمام سننے والے محظوظ ہو جائیں۔

مذاق وہ دل پسند اور پیارے الفاظ ہیں جو کسی کو ناگوار نہ گذریں بلکہ طبیعت خوش کر دیں۔ دل کو راحت دیں اور کانوں کو بھلے معلوم ہوں۔ جب میں کوئی زہر بھری طنز، دل دکھانے والا کنایہ، ذاتی حملہ، فحش الفاظ، اور بے ہودہ تمسخر نہ ہو۔ اور یہ ہے مہذب مذاق۔

مگر یہ تعریف سن کر شاید بعض صاحب گھبرائیں کہ پھر باقی ہی کیا رہا۔ ٹھیک ہے، ہمارا جواب ہے بابا بسیار۔ سچ پوچھو تو مذاق کے واسطے بھی اس قدر وسیع میدان پڑا ہے کہ قابل طبیعتوں کو ذرا بھی شکایت کا موقع نہیں۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ایسی طبیعتیں نہیں۔

یوں زبان چلنے کو تو سب کی چلتی ہے، مگر مبارک ہے وہ زبان جس سے ایسے نفیس اور پاکیزہ الفاظ نکلتے ہیں جو روتی صورتوں کو ہنسا دینے والے پژمردہ طبیعتوں کو شگفتہ کر دینے والے اور اداس اور مغموم دلوں کو شاد اور خرم کر دینے والے ہوں۔

الراقم۔ عبدالحق

طالب علم محمڈن کالج علی گڑھ

O

ملک کی شاعری اس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے۔ جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اس کی جھلک اس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے۔

(بابائے اردو مقدمات دوم ص ۳۶)

O

شاعری خود ایک بڑا کمال ہے۔ اور ایسا بڑا کمال کہ اگر کسی شخص میں صحیح طور سے موجود ہو تو اس کے سامنے دوسرے کسب و کمال ہیچ ہیں۔

(بابائے اردو مقدمات دوم ص ۱۲۹)

۶۲ سال پہلے کی چند تحریریں

اوپر کی آمدنی

اس میں شک نہیں آمدنیاں طرح طرح اور قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً جائداد یا جاگیر کی آمدنی، تجارت یا زراعت کی آمدنی، ملازمت کی آمدنی، محنت مزدوری کی کمائی۔ یہ سب بجا اور درست۔ لیکن اوپر کی آمدنی اس کے کیا معنے۔ اوپر سے یوں تو بہت سی چیزیں نازل ہوتی ہیں لیکن آمدنی کا اوپر سے آنا سمجھ میں نہیں آتا لیکن یاد رہنا اس کے جب کبھی کچھ مدت کے بعد آپ کسی دوست یا عزیز سے ملیں گے تو مزاج پرسی کے بعد پہلے تنخواہ اور پھر اوپر کی آمدنی پوچھی جائے گی۔

ہمارے ایک دوست جو ان خیالات کو سخت ناپسند کرتے ہیں نوکر ہونے کے بعد جب عزیز و اقارب اور دوست آشناؤں سے ملے تو بار بار اوپر کی آمدنی پوچھی جاتی تھی۔ یہ سخت پریشان تھے۔ ایک دفعہ چند احباب اور عزیز بیٹھے تھے ان میں سے ایک نے تنخواہ پوچھی اور اس کے فوراً بعد یہ سوال ہوا کہ "اوپر سے بھی کچھ پڑتا ہے"۔ انہوں نے جل کر جواب دیا کہ "جی ہاں اوپر سے کبھی دس پانچ پڑ جاتے ہیں"۔ یہ فقرہ انہوں نے کچھ ایسے لہجے اور متانت اور ہاتھ کی خفیف حرکت سے ادا کیا کہ سب بے اختیار ہنس پڑے۔

اس قسم کے سوالات اس بے تکلفی اور دلچسپی کے ساتھ پوچھنا نہایت شرم کی بات ہے۔ اور پوچھنے والوں اور اس سوسائٹی کے اخلاق کا پتا اندازہ ہوتا ہے۔ مگر بڑا غضب یہ ہے کہ اسے عیب کی بات نہیں سمجھتے۔ بلکہ اسے مثل مزاج پرسی، خیر و عافیت وغیرہ کے معمولی آداب میں داخل کر لیا ہے اور قیامت یہ ہے کہ اگر اسے برا کہا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ اسے برا سمجھیں یا کم سے کم اس پر غور کریں کہ آیا درحقیقت اس میں کچھ برائی ہے یا نہیں، الٹی اس کی حمایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے۔ نوکری کے ساتھ اوپر کی آمدنی بھی نہ ہوئی تو وہ نوکری کیا۔ یہ بھی ایک حق سعی و خدمت ہے۔" جب برائی یہاں تک پہنچ جائے تو پھر اس کی اصلاح بہت دشوار ہے۔

نئے تعلیم یافتہ لوگ کیسے ہی ہوں لیکن ان میں یہ بری عادت کم پائی جاتی ہے۔ اکثر پرانے لوگ کچھ ایسے سیدھے سادے اور بھولے ہوتے ہیں کہ اسے کچھ عیب ہی نہیں سمجھتے۔ مصلے پر بیٹھے ہیں، ایک ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے، دوسرا ہاتھ اہل مقدمہ کی طرف بڑھا ہوا ہے۔ دست غیب کی طرح ہاتھ میں کچھ آ گیا اور جیب مقدس کے تہ خانے میں۔ اب معلوم ہوا کہ یہ ہے اوپر کی آمدنی۔ مگر بڑے غضب اور ستم ظریفی کی بات تو یہ ہے کہ ایک نئی نسل جو تعلیم یافتہ تھی اسی طرح

٭ یہ تحریریں بابائے اردو کے رفیق قدیم منشی محمد علی صاحب (حیدرآباد دکن) کی عنایت سے دستیاب ہوئی ہیں۔ اس کے لیے ہم منشی صاحب کے ممنون ہیں۔ (ادارہ)

[illegible] تسبیح [illegible] اور حق [illegible] [illegible]
بڑھاتے ہو مساتھ ہی پیسا [illegible] کو [illegible] تیرے لگا کر بیٹھ۔ تقریں طعون تو مجھے کیوں گمراہ کر رہا ہے۔ تو مجھے کیوں گناہ میں سبحہ [illegible]
میں گھسیٹتا ہے۔ اے مردود شیطان۔ تو مجھے کیوں دوزخ کی آنچ میں جلاتا ہے۔ جا دور ہو دفع ہو منہ کالا کر ــــ یہ کہتے جاتے ہیں اور زار و قطار روتے جاتے ہیں۔ آنسو ہیں کہ برف سی سفید داڑھی میں سے ہو ہو کر تسبیح کے دانوں کی طرح مصلے پر گر گر پڑتے ہیں مگر ہاتھ ہے کہ اپنا اپنا کام کئے جاتا ہے۔ بہر حال [illegible]
بزرگ ہیں ہم سے بڑے۔ ممکن ہے اس میں کوئی بھید اور مصلحت ہو۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

نئے ہوں یا پرانے کسی کو یہ لت نہ پڑے ورنہ یہ وہ بری چیز ہے کہ یہاں ایک دفعہ اس کی چاٹ لگی پھر چھٹنا دشوار ہے ع۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

برٹش گورنمنٹ نے ان چند سالوں میں اس کی طرف خاص توجہ کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے چند نہایت معزز اور قابل دیسی اعلیٰ عہدیدار سخت ذلت کے ساتھ نکالے گئے اور جگ ہنسائی الگ ہوئی۔

بعض عیب ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ چھپ جاتے ہیں یا کوئی تاویل ہو سکتی ہے۔ مگر یہ کم بخت کچھ ایسا ہے کہ ہزار پردے میں لو اور پھر کھل کے رہے۔
اور پھر سو عیبوں کا ایک عیب۔ ناانصافی اس میں، ظلم اس میں، حق تلفی اس میں، بے حیائی اور بے غیرتی اس میں۔ ذلت، بدنامی اور رسوائی اس میں
اس پر بھی اگر کوئی خواہش کرے تو اسے کیا کہنا چاہیے۔ وہ بلاشبہ ننگ انسانیت ہے۔ کیونکہ وہ برے جذبات اور ناپاک خواہشات اور ہوس کا
بندہ ہے ــــ اور وہ جب تک نفسانیت میں پھنسا رہے گا کبھی اعلیٰ درجہ انسانیت تک نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ دنیا میں جس طرح ہر
ایک چیز کو ترقی ہوتی ہے اسی طرح انسان کی حالت بھی۔ گو انسان خود اپنی موجودہ حالت کو بتدریج اور نامعلوم کس قدر انتہا عرصے کے بعد پہنچا ہے۔ لیکن
اس کا فرض ہے کہ اس سے بھی آگے اور ترقی کرے، کیونکہ اگر وہ اسی حالت پر قائم رہے گا۔ تو در حقیقت وہ انسان کی صورت میں رہ کر بہائم میں مل جائے گا۔
انسان کی سب سے ذلیل ترین صفت ہے نفسانیت۔ اور اعلیٰ سے اعلیٰ صفت ہے ایثار۔ تو جو شخص اپنی نفسانیت کو دبا تا ہے اور جہاں تک ممکن
ہو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتا ہے وہ بلاشبہ انسانیت کے اعلیٰ رتبے پر ہے۔ ملک اور قوم کی محبت، اپنے فرائض کو نیک نیتی سے ادا کرنا، اپنے
فضول اغراض پر دوسروں کے فوائد کو مقدم رکھنا انسانیت کی اصلی صفتیں اور دنیا کی سچی ترقی و شائستگی کے بہترین اصول ہیں۔ قوموں کے زوال کا
ایک بڑا سبب یہی ہے کہ جب افراد قوم میں نفسانیت کا دور ہو جاتا ہے اور ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اپنا پیٹ بھرے خواہ کیسی ہی ناانصافی اور
حق تلفی ہوتی ہو۔ تو اس وقت سمجھ لینا چاہیئے کہ

یہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی

اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ خود بھی ڈوب جاتے ہیں۔

یاد رکھنا چاہیئے کہ ہر ایک کام جو ہم کرتے ہیں خواہ برا ہو یا بھلا اس کا اثر ضرور ہوتا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ ہمارے ایک کے کرنے سے کیا ہوتا ہے۔
بالکل کوتاہ اندیشی ہے ہمارے چھوٹے سے چھوٹے کام بھی اثر رکھتے ہیں خواہ وہ کیسے ہی خفیف اور محدود کیوں نہ ہوں۔ اور یہی چھوٹے چھوٹے کام اور خفیف
اثر ایک دن رفتہ رفتہ بڑھ کر اور قابل و قعت نظر آئیں گے اور انہیں سے ایک روز قومی خصائص قائم ہوں گی۔ وہ شاندار خوبیاں جنھیں دیکھ کر ہمیں حیرت
ہوتی ہے اگر اسی کا سراغ لگایا جائے تو پتہ ملے یہی چھوٹے چھوٹے کام اور خفیف اثر نکلیں گے۔ دریا میں ایک پتھر پھینکو اول چھوٹے چھوٹے دائرے بنتے ہیں اور
پھر بڑے بڑے اور رفتہ رفتہ اس کا اثر بہت دور دریا کے کنارے تک پہنچتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے ذرا ذرا سے افعال کا اثر دور دور تک پہنچتا ہے

[illegible] ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر یہ تجویز ہو کہ حسب قاعدہ سابق لوگوں کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ آپس میں کھلے بندوں ایک دوسرے سے ملیں تو [illegible] ہو جاتی کی کیونکہ ہر ایک کو آزادی حاصل ہو گی۔ اور اس سے لاکھوں لوگوں کی اصلاح ہو جائے گی۔ [illegible] اس قسم کا نزول خود بخود بند ہو جائے گا۔ اور اس سے بجائے بداخلاقی انسانی نسل کی اصلاح ہو رہی ہے جس نے اخلاق اور سوسائٹی کو سمجھ اور عزت سے کام لینے سے ہو جائے گی۔ کیا یہ شرف انسانیت نہیں ہے؟

(منقول از رسالہ افسر جلد ۳ نمبر ۲ بابت ۱۹۱۲ء)

سنہ ہجری

یہ سنہ اس دردناک واقعہ کی یادگار ہے جب کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ کے ظلم و ستم اور طرح طرح کی اذیتوں کی وجہ سے اپنے وطن مالوف کو الوداع کہنا پڑا۔ یہ سنہ کئی لحاظ سے عجیب ہے اور اس لئے یہ بحث بہت دلچسپ ہے لیکن ہم یہاں اس کا بہ تفصیل ذکر کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس بات کا سراغ لگانا چاہتے ہیں کہ کیونکر صرف تبدیلی مقام کی وجہ سے یہ عظیم الشان یادگار ہو گئی۔ ہجرت کے صحیح تاریخی واقعہ اور سنہ ہجری میں جو فرق ہے اس میں اکثر لوگ تمیز نہیں کرتے۔ اس میں دو باتیں خاص کر یاد رکھنے کے قابل ہیں۔ اول آنحضرت نے یہ سنہ قائم نہیں کیا۔ دوم یہ سنہ تاریخ ہجرت سے شروع نہیں ہوتا۔ سخت تعجب کی بات ہے کہ انگریزی کی سب سے بڑی اور مستند انسائیکلوپیڈیا میں بھی یہی غلطی ہوتی ہے۔ چنانچہ اس میں لکھا ہے کہ "اسلامی سنہ آنحضرت کی ہجرت مکہ کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے جو جمعرات کی رات ۱۵ر جولائی ۶۲۲ء کو واقع ہوئی۔"

اس میں شک نہیں کہ اسلامی سنہ واقعہ ہجرت کی رو سے قائم ہوا اور اسی پر اس کا نام بھی رکھا گیا۔ لیکن یہ کہنا کہ یہ ہجرت کی تاریخ سے شروع ہوتا ہے غیر صحیح ہے۔ تمام محقق مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہ سنہ جس کا نام آنحضرت کی ہجرت مکہ پر رکھا گیا ہے اس سال عربی کی پہلی تاریخ سے شروع ہوا جس سال میں کہ ہجرت واقع ہوئی۔ اس تدبیر کے بانی حضرت عمرؓ تھے اور انہوں نے اس تاریخی غیر مطابقت کو اس لئے گوارا کیا کہ عربی مہینوں کے شمار میں خلل واقع نہ ہو۔

آنحضرت نے نہ یہ سنہ قائم کیا ہے اور نہ اس امر کی کوئی شہادت موجود ہے کہ انہیں کبھی اس قسم کا خیال ہوا۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ واقعہ اسلامی تاریخ اور پیغمبر خدا کی زندگی میں نہایت اہم اور دردانگیز واقعہ ہے۔ اور اس کا اثر خود اور ان کے صحابہ کے دلوں پر بہت ہوا۔ چنانچہ بعض احادیث کی رو سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت بعض واقعات کے متعلق یہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ہجرت سے پہلے واقع ہوا یا نہیں۔ بعینہ جیسے ہم لوگ اپنے خانگی اور دیگر معاملات کا پتہ غدر کے زمانہ سے دیتے ہیں کہ فلاں امر غدر کے پہلے واقع ہوا یا غدر کے اتنے سال بعد۔ یہ ایک [illegible] ہے کہ بعض واقعات کی تاریخ کا تعین کسی عظیم الشان واقعہ کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ لیکن آنحضرت کے ایسا کرنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آپ کا منشاء ایک اسلامی سنہ قائم کرنے کا تھا یا نہیں۔ مگر غالباً اسی بنا پر کہ آنحضرت صلعم بعض اوقات واقعات کی تاریخ بتانے کے لئے ہجرت کا حوالہ دیتے تھے ——

—— حضرت عمرؓ کو اسلامی سنہ ہجرت سے قائم کرنے کا خیال ہوا۔ اس لئے کہ حضرت عمرؓ کی اسلامی سنہ قائم کرنے کی فوری ضرورت کیونکر واقع ہوئی۔ یہ واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ ایک بار قرض کا ایک مقدمہ پیش ہوا۔ دائن کے پاس مدیون کی لکھی ہوئی دستاویز تھی جس میں اس نے وعدہ کیا تھا کہ فلاں روز فلاں مہینہ قرض ادا کر دوں گا۔ جب وہ تاریخ گذر گئی تو دائن نے خلیفہ دوم کے سامنے دعویٰ کیا۔ مدیون نے اس [illegible] لیکن جس تاریخ پر ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے وہ تاریخ ابھی نہیں گذری [illegible] سال آئندہ [illegible] پچھلے سال میں گذر گیا اور چونکہ اس دستاویز میں تاریخ [illegible] اس کا

تصفیہ کرنا باقی تھا کہ [illegible] حضرت عمرؓ نے [illegible] ہجری [illegible]
سے تمام دستاویزات وغیرہ میں دن، ماہ، سال درج ہونا چاہیے جب کہ یہ [illegible] اس سال کی نسبت یہ طے پایا کہ آنحضرت [illegible]
شمار آنحضرت کی ہجرت مکہ سے قرار پائے اور اس وجہ سے اس کا نام سنہ ہجری قرار دیا گیا۔

یہ سنہ ۱۶ جولائی ۶۲۲ء سے شروع ہوا اور اس وقت سے حضرت عمرؓ کا یہ فیصلہ جو ہجرت کے سترہویں سال میں ہوا، تمام دنیائے اسلام میں رائج ہو گیا۔ آنحضرت نے مکہ سے یکم ربیع الاول کو ہجرت فرمائی۔ لیکن سنہ ہجری دو ماہ پہلے یعنی محرم کی یکم تاریخ سے لیا گیا چونکہ یہ عربی سال کا پہلا مہینہ تھا اور خلیفہ حضرت عمرؓ نہیں چاہتے تھے کہ اس میں کسی قسم کا تغیر کیا جائے۔ لہٰذا یہ سنہ تاریخ ہجرت سے شروع نہیں کیا گیا اگرچہ اس میں سنہ کا نام اور چرچا اسی واقعہ سے ہوئی۔ اس سنہ کے قائم کرنے سے پیشتر اہل عرب میں سال کا شمار جنگ اصحاب فیل سے ہوتا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ سنہ اسلامی آنحضرتؐ کی پیدائش یا وفات یا آغاز رسالت سے قائم نہیں کیا گیا۔ بعض عیسائی مورخین یہ کہتے ہیں کہ چونکہ اس زمانہ میں عرب کے عیسائیوں میں ایک سنہ ۵۲۳ء میں بنام "سنہ شہدا" اس واقعہ کی یادگار میں قائم کیا تھا جب ذونواس بادشاہ نے عیسائیوں پر نہایت سخت ظلم و ستم کئے۔ اور چونکہ ہجرت کا واقعہ بھی اسی قسم کا تھا لہٰذا حضرت عمرؓ کو یہ دیکھ کر ہجرت سے سنہ اسلامی قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر ہماری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ یہ قدیم رسم ہے کہ جب ملک میں کوئی اہم یا عظیم الشان واقعہ ہوتا ہے تو عموماً لوگ مختلف واقعات کی تاریخ کا اندازہ اسی واقعہ سے کرتے ہیں۔ اس کی بین مثال ہندوستان کا غدر ہے کہ آپ کسی شخص سے عمر پوچھئے تو اکثر چھٹتے ہی یہ کہتا ہے کہ میں غدر میں اتنے سال کا تھا۔ یا مثلاً فلاں شخص کا غدر سے اتنے سال پہلے انتقال ہوا یا فلاں واقعہ غدر سے اتنے دنوں بعد واقع ہوا۔ تو چونکہ ہجرت کا واقعہ اس وقت کے اہل اسلام کے لئے نہایت عظیم الشان، اہم اور انقلاب خیز تھا اور جو اسلامی تاریخ اور آنحضرتؐ کی لائف میں ہمیشہ اسی نظر سے دیکھا جائے گا اور چونکہ غالباً اس وقت اہل اسلام اور خود آنحضرت صلعم اپنے بعض خانگی اور دیگر امور کی تاریخ کا اندازہ واقعہ ہجرت سے کرتے تھے۔ لہٰذا خواہ مخواہ طبعی طور پر حضرت عمرؓ نے سنہ اسلامی ہجرت سے موسوم کیا۔

لیکن اس سنہ کے متعلق قریباً تمام مورخین کا اختلاف اول تو ہفتہ کے اس روز میں اختلاف ہے جب کہ ہجرت واقع ہوئی۔ بقول ابن اسحاق اور واقدی کے قول کے بموجب آنحضرتؐ مدینہ میں پیر کے روز پہنچے۔ لیکن پھر معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس سال ۱۲ ربیع الاول کو پیر کا دن نہ تھا۔ دوسرے مورخین کا خیال ہے کہ ہجرت جمعہ کے روز ہوئی۔ ابن قلبی لکھتا ہے کہ مہاجرین جبل الثور سے پیر کے دن یکم ربیع الاول کو روانہ ہوئے اور مدینہ جمعہ ۱۲ ربیع الاول کو پہنچے۔ اس مصنف کا قول غالباً صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سال یکم اور آٹھویں ربیع الاول کو پیر تھا۔ مہینہ کی تاریخ میں بھی اختلاف تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ہجرت پہلی ربیع الاول کو بعض ۳ ربیع الاول بعض ۲ اور ۸، اور بعض ۹ ربیع الاول کو بتلاتے ہیں۔ واقدی کے بموجب بعض کا خیال ہے کہ پیغمبر خدا مدینہ ۱۲ ربیع الاول کو پہنچے۔ لیکن اس میں کسی کو اختلاف نہیں کہ ہجرت کا مہینہ ربیع الاول کا تھا اور دوسرا ضروری امر اس بحث میں یہ ہے کہ مدینہ پہنچنے کی تاریخ کونسی ہے۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ عربی اور یورپین مورخ اس پر متفق ہیں کہ آنحضرتؐ نے مکہ سے ہجرت شروع ربیع الاول میں کی۔ صرف یوم ہجرت میں اختلاف ہے۔

(منقول از رسالہ افسر جلد ۲ نمبر ۲ بابت [illegible])

اب ہمدرد کی ضرورت نہیں رہی

[illegible]

[illegible] ہے کہ انہوں نے ایک ایسی حیرت انگیز تحقیق کی ہے۔ اس سے پیشتر پروفیسر لوب نے یہ دریافت کیا تھا کہ بعض سمندری [illegible] کے ایسے انڈے جس میں [illegible] بار آور ہو سکتے ہیں اگر میگ نی سی ام کا سالٹ (نمک) اس سمندری پانی میں ملا دیا جائے جو ان کے آس پاس ہوتا ہے۔ اس بنا پر پروفیسر لوب نے اپنی تحقیقات کو جاری رکھا اور اس میں انہیں کامیابی بھی ہوئی۔ اس تجربے کے لئے انہوں نے سی ارچن (ایک حیوانی جانور) کے انڈے لئے جن میں نر کا لگاؤ نہ تھا۔ ان انڈوں کو انہوں نے ایسے پانی میں رکھا جس میں مختلف قسم کے نمک حل کئے گئے تھے۔ اور کیل سی ام سوڈی ام اور پوٹے سی ام کا استعمال کیا گیا تھا۔ جب انہوں نے انڈے کیل سی ام کے پانی میں ڈالے تو کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ جب پوٹے سی ام استعمال کیا گیا تو کسی قدر ترقی ہوئی اور سوڈی ام کے استعمال کرنے سے اور تغیر پیدا ہوا۔ لیکن میگ نی سی ام کے استعمال سے یہ صورت صرف دو گھنٹے میں پیدا ہو گئی۔ اور ۲۴ گھنٹے کے اندر جب اسے معتدل سمندری پانی میں رکھا گیا تو پوری حرکت اور قوت حیوانی کا ظہور رہا۔ ان تجربوں میں کامل کامیابی ہوئی اور میگ نی سی ام کلورائڈ نشوونما حیوانی کے لئے نہایت مفید ثابت ہوا۔

اس امر پر پورا یقین نہ کر کے کہ جو انڈے اس تجربے کے لئے لئے گئے ہیں وہ نر کے لگاؤ سے بالکل بے تعلق ہیں، پروفیسر لوب نے ہر قسم کے انڈوں کو جو استعمال کئے گئے تھے سمندری پانی میں ڈالدیا لیکن قدرتی طور پر ان میں آثار نمو بالکل نمایاں ہوئے اور کسی قسم کا تغیر اس بارے میں پیدا نہ ہوا۔

جب پروفیسر موصوف کو کیمیاوی طور پر انڈوں میں نشوونما قائم کرنے میں کامیابی ہو گئی تو انہوں نے اس بات کا تجربہ کرنا شروع کیا کہ کیا وجہ ہے کہ نر کے تعلق سے بار آور ہوئے بغیر یہ انڈے سمندر کے پانی میں نشوونما نہیں پا سکتے۔ اس تجربے سے انہیں صاف طور پر ثابت ہو گیا کہ نر کا مادہ آپ انڈوں میں بار آوری کے لئے صرف وہ چیز پہونچاتا ہے جس سے سمندری پانی کے وہ اجزا زائل ہو جاتے ہیں جو نشوونما کے مانع ہیں۔

پروفیسر لوب کہتے ہیں کہ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ سی ارچن کے انڈے اس طور پر نشوونما پائیں ۔۔۔ اس مقام کے ماہرین سائنس جہاں پروفیسر لوب تجربہ کر رہے ہیں مارے خوشی کے پھولے نہیں سماتے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب حیات کی کیمیاوی تھیوری (قیاس) کامل طور پر قائم ہو گیا۔ تو اس سے دنیا میں ایک حیرت انگیز انقلاب عظیم پیدا ہو جائے گا جو ڈارون کے وقت سے اب تک کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ در حقیقت یہ خیال عملی طور پر ثابت ہو گیا۔ تو دنیا کو ششدر و حیران کرنے کے لئے اس سے بڑے جادو معجزے کی ضرورت نہیں ۔۔۔ اس کی رو سے مرد جو دنیا کا بادشاہ اور اشرف المخلوقات بنا بیٹھا ہے ایسا فضول اور لا یعنی ثابت ہوگا کہ اس کی میگ نی سی ام کلورائڈ کے سامنے کچھ ہستی نہیں رہے گی۔ جو لوگ حقوق نسواں کے حامی ہیں ان کے لئے یہ امر ان کی بڑی سے بڑی خواہش اور اعلیٰ سے اعلیٰ توقع سے بھی کہیں بڑھ کر ہے جس کا انہیں شان و گمان بھی نہ تھا۔ مگر اب انہیں یہ خیال رہے کہ دنیا میں اب ان کا کہیں ٹھکانا نہ رہا۔ کیونکہ دنیا اب ایک ایسی بہشت بن جائے گی جس میں بیچارے آدم کا کہیں پتہ نہ ہوگا۔ لیکن صرف اتنا اندیشہ ہے کہ ایسی صورت میں عورتیں گھبرائیں گی تو نہیں۔

(منقول از رسالہ "افسر" جلد ۲ نمبر ۶ بابت سنہ ۱۹۱۰ء)

اردو اخبارات کے ایڈیٹروں کو نیک صلاح

عام طور پر شکایت ہے کہ اردو اخبارات کی پوری وقعت نہیں ہوتی اور اہل ملک بجائے اس کے کہ اپنے ہم وطنوں سے ہمدردی کریں اور اردو اخبار خریدیں زیادہ تر انگریزی اخبارات کو خریدتے اور پڑھتے ہیں۔ یہ شکایت ایک لحاظ سے بجا ہے اور ایک لحاظ سے بیجا۔ بجا اس لئے کہ در حقیقت ملک کے قابل لوگ اردو اخباروں کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں۔ اور اس قابل نہیں سمجھتے کہ ان پر اپنا قیمتی وقت صرف کریں۔ بیجا اس لئے کہ اکثر اخبار خود اس قدر بے وقعت کم [illegible] اور [illegible] ہوتے ہیں کہ کوئی شخص اخباروں کے فرائض اور خوبی کو سمجھتا ہے ہرگز اپنا وقت اور روپیہ ان پر صرف نہ کرے گا۔ اس لئے ہم چند نیک مشورے

دیتے ہیں اور ہمیں امید ہے جو اخبارات ان پر عمل کریں گے وہ ملک میں ضرور اپنی وقعت اور عظمت قائم کر لیں گے۔

(۱) سب سے اول اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ جب کبھی انہیں اپنے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت ہو، تو ہمیشہ "ہم" لکھیں۔ کیونکہ "ہم" کے لفظ میں خود ایک شان اور عظمت ہے۔ اور جب کبھی زیادہ زور دینے کی ضرورت پڑے تو بجائے قلم سے بھی لکھ سکتے ہیں۔ اخبار ملک کا وکیل ہے اور اس لیے "میں" کرنا زیب نہیں دیتا۔ "ہم" کے لفظ سے فوراً پڑھنے والے کو یہ معلوم ہوگا کہ اس کی آواز پبلک کی آواز ہے اور یہ اخبار درحقیقت بڑا معزز اخبار ہے۔

(۲) ایک کتا کہیں عین راستے میں بیٹھا تھا۔ ایک راہ چلتے نے پوچھا میاں کتے تم یہاں کیوں پڑے ہو۔ کتے نے جواب دیا کہ میں برے اور بھلے کو پرکھتا ہوں۔ مسافر نے پوچھا یہ کیونکر۔ کتے نے جواب دیا کہ بھلا آدمی تو چپ چاپ گذر جاتا ہے۔ مگر شریر چلتے چلتے ٹھکرا دیتا ہے۔ اینٹ پتھر اٹھا مارتا ہے اور نہیں تو چلتے جاتے دھکا ہی دیتا ہے۔ ــ اسی اصول پر ایڈیٹروں کو بھی کاربند ہونا چاہیئے۔ برے اور بھلے کا معیار یہ ہے کہ اچھا وہ جو ہمارا اخبار خریدے اور جو نہ خریدے اس کی بھلائی مشتبہ ہے۔

(۳) جتنے مشہور اور نامور امرا اور رؤسا ہیں اخبار فوراً ان کے نام جاری کر دینا چاہیئے کیونکہ یہی لوگ ہیں جن سے بہت بڑی اعانت کی امید ہو سکتی ہے۔ اب خیال کرنے کی جگہ ہے کہ بیچارا ایڈیٹر خون جگر کھا کھا کر اپنا عیش تلخ کر کے بہتر وقت اپنا اخبار تیار کرتا ہے۔ عمدہ عمدہ مضامین لکھتا ہے۔ نئی نئی خبریں سناتا ہے، اور یہ حضرات ہیں کہ اخبار لیتے جاتے ہیں اور پیسہ کا نام نہیں۔ مجبوراً تقاضا کرنا چاہیئے مگر اخبار کا فوراً بند کر دینا مناسب نہیں کیونکہ دنیا بامید قائم۔ اگر باوجود تقاضوں کے بھی وصول نہ ہو، تو غصہ کو ضبط کرنا چاہیئے۔ اور کسی موقع کی تاک میں رہنا چاہیئے اور موقع نکال لینا ایڈیٹر کے لئے کون بڑی بات ہے۔ اور جب ایک دفعہ موقع مل جائے تو پھر کسر نکال رکھنا چاہیئے۔ پھر وہ آپ کے مرید ہیں۔ اور دم بھر میں سارا بقایا وصول ہو جائے گا۔ عہدیداروں کے لئے یہ تدبیر اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے اخبار کی وقعت ہی نہیں بلکہ رعب بھی قائم ہو جاتا ہے۔ لیکن تاکہ کوئی نا انصافی نہ کہے، ان لوگوں کی تعریف بھی کرنی چاہیئے جو اخبار کی اعانت کرتے ہیں۔ اور خوشی خوشی خریدتے ہیں۔

(۴) جب کسی امیر یا رئیس کے ہاں کوئی بڑا جلسہ دربار میں ہونے والا ہو ــ تو ضرور پہونچو۔ اور تمام حالات تفصیل کے ساتھ لکھو۔ اس میں اخبار کی شہرت اور فائدہ دونوں ہیں۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو لوکل اخبار وغیرہ کی تاک میں رہو ــ جب پہونچیں فوراً مضمون اڑا کر اپنے لفظوں میں ادا کرو اور چند باتیں اپنی بھی اضافہ کر دو جو ایسے موقعوں پر اکثر واقع ہوتی ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ شروع میں یہ ضرور لکھو کہ ہمارے اسپیشل نامہ نگار نے ہمیں اطلاع دی ہے کہ .... الخ اس سے اخبار کی بڑی وقعت ہوتی ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔ مگر یہ کیا ضرور ہے کہ سچ ہمیشہ مفید ہو۔

(منقول از رسالہ "افسر" جلد ۱ نمبر ۸ بابت ۱۹۱۰ء)

ادب میں نیا پرانا کوئی چیز نہیں، جس ادب میں تازگی، جدت، اور گہرائی ہے، خواہ وہ دو ہزار برس پہلے کا کیوں نہ ہو، نیا ہے۔ اور وہ ادب جس میں یہ خوبی نہیں، خواہ وہ آج ہی کا لکھا ہوا کیوں نہ ہو، پرانا ہے۔

(بابائے اردو ادبی تبصرے ص ۸۵-۸۶)

[illegible]

اردو زبان اور ادب

مسلمانوں کی آمد نے برعظیم پاک و ہند کو بے شمار برکات سے مالا مال کیا۔ جن سے اہل ملک کی زندگی اور خیالات میں نیا انقلاب پیدا ہو گیا لیکن ہزار سالہ اسلامی حکومت کا سب سے اہم اور عظیم الشان کارنامہ وہ عام اور مقبول زبان ہے جو اس برعظیم کو جس میں بیسیوں زبانیں اور سینکڑوں بولیاں مروج ہیں گزشتہ ہزار ہا سال سے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی۔

مسلمانوں کی پہلی آمد سندھ میں ہوئی جب کہ محمد قاسم نے پہلی صدی کے اواخر (۹۳ھ، ۷۱۱ء) میں اس علاقہ کو فتح کیا۔ مسلمانوں کا تسلط اس علاقہ میں مدت دراز تک رہا۔ سندھ پر اسلام اور اسلامی تہذیب کا حیرت انگیز اثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت پائی جاتی ہے اور سندھی زبان میں عربی الفاظ کثرت سے اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ غیر نہیں معلوم ہوتے۔

دوسری صدی ہجری میں ہندوستان کی ایک دوسری سمت یعنی جنوب میں عرب مسلمان تاجر کی حیثیت سے پہنچے اور ملیبار کی تجارت کلیتاً ان کے ہاتھ میں آ گئی۔ [illegible] ان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز تھا۔ یہاں مسلمان بلا شرکت غیرے زمانہ دراز تک بحری تجارت کے مالک رہے۔ ان کی سب سے بڑی یادگار موپلا قوم اب بھی لاکھوں کی تعداد میں موجود ہے۔ عرب تاجروں نے نومسلموں کو عربی سکھائی اور خود ملیالم سیکھی۔ جسے وہ عربی خط میں لکھتے تھے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ملیالم زبان میں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ جنوبی ہند کا یہ تعلق تجارتی تھا۔

سندھ کے بعد کوئی تین سو برس گذرنے پر شمالی ہند میں مسلمانوں کا دوسرا سیاسی تعلق سلطان محمود غزنوی کی فتوحات سے ہوا۔

اس دور کو ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ گو سلطان محمود کے حملوں کے بعد محمود اور اس کے جانشینوں کے عہد میں پنجاب کی حیثیت ایک صوبہ کی سی رہی تاہم اس ملک والوں سے فاتحوں کے تعلقات رفتہ رفتہ بڑھتے گئے چنانچہ ہندوؤں کی خاص فوج غزنی میں متعین تھی۔ ہندی فوج کا کمانڈر سوندھی رائے تھا اور جب وہ لڑائی میں مارا گیا تو محمود نے اس ممتاز عہدے پر تلک کا تقرر کیا۔

پنجاب میں غزنی حکومت تخمیناً پونے دو سو برس تک رہی۔ اس عرصہ میں ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلقات خاصے وسیع ہو گئے۔ اکثر ہندوؤں نے فارسی پڑھی اور مسلمانوں نے ہندی۔ محمود کے زمانے میں غزنی میں متعدد ترجمان تھے جن میں سے تلک اور بہرام کے نام تاریخوں میں آتے ہیں اس زمانے کے بعض نامور اور مستند شعراء کے کلام میں بعض ہندی الفاظ داخل ہو گئے۔ خواجہ مسعود سلیمان کی نسبت محمد عوفی مصنف لب الالباب نے لکھا ہے کہ عربی فارسی کے علاوہ ان کا تیسرا دیوان ہندی میں بھی تھا۔ (تذکرہ لب الالباب ج ۲۔ باب ۱۰) امیر خسروؒ نے بھی اس کی تصدیق کی ہے (دیباچہ غرۃ الکمال) لیکن ان کے ہندی کلام کا اب تک کہیں پتہ نہیں لگا۔ یہ کونسی ہندی تھی اور کس قسم کی زبان تھی، اس کا مطلق علم نہیں۔ محمود کی وفات کے کچھ عرصے بعد غزنوی حکومت کی وہ شان [illegible] اس نے حکومت کو کمزور کر دیا۔ آخر ۵۸۳ھ م ۱۱۸۶ء میں علاء الدین کے بھتیجے معز الدین بن سام نے جو محمد غوری کے نام سے مشہور ہے محمود کے آخری جانشین کو تخت سے اتار دیا اور لاہور پر قبضہ کر لیا۔ غزنوی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

اگرچہ محمد غوری نے ہندوستان میں [illegible] علاقے فتح کئے اور مفتوحہ علاقوں میں [illegible] کی مگر [illegible] جانشینوں کی [illegible] کوئی
غزنی میں تھا اور محمود کی طرح اسے بھی ہندوستان میں رہ کر سلطنت قائم کرنے کا خیال کبھی نہ آیا۔ سلطان ترائن کی فتح کے بعد دہلی [illegible]
تمام معاملات اور معرکے اپنے معتمد جرنیل اور نائب قطب الدین ایبک کے حوالے کر دیئے۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۶۰۲ھ م ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک
جو زر خرید غلام تھا ہندوستان کے مفتوحہ علاقہ کا فرمانروا قرار پایا۔ ہندوستان میں اب پہلی بار ایک مستقل اسلامی حکومت قائم ہوئی جس کا پہلا سلطان
قطب الدین تھا جو خاندان غلامان کا بانی ہوا۔

اب ہندوستان میں ایک نئی قوم آتی ہے اور یہیں بس جاتی ہے۔ اس کا مذہب اور اس کی تہذیب، اس کی زبان اور رسم و رواج اور عادات و خصائل ان لوگوں سے جدا ہیں جو پہلے سے آباد ہیں۔ اب یہ دونوں ایک ہی ملک کے باشندے اور ایک ہی حکومت کی رعایا ہو جاتے ہیں۔ وہ تعلقات جو پہلے عارضی اور ادھورے تھے اب مستقل اور پختہ ہو گئے۔ کاروباری، ملکی، معاشرتی، اور ضروریات زندگی نے انہیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا اور قربت کی بدولت ایک کی تہذیب و زبان کا اثر دوسرے کی تہذیب و زبان پر تیزی سے پڑنے لگا۔

مسلمان جس وقت یہاں آئے تو اس ملک کی جسے ہندوستان کہتے تھے عجیب کیفیت تھی جس طرح ملک مختلف رجواڑوں میں بٹا ہوا تھا اور ہر علاقے کی حکومت الگ تھی اسی طرح ہر علاقے کی زبان بھی جدا تھی۔ یہاں ان بولیوں اور ان کی اصل کا سرسری ذکر کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کی آمد کے وقت رائج تھیں۔

آریاؤں کا اصل وطن کہاں تھا، اس کے متعلق مختلف اور متضاد نظریات ہیں اور اب تک قطعی طور پر اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ لیکن قرین یقین ہے کہ جو آریہ ایران میں آ بسے تھے ان میں کا ایک گروہ مشرق کی جانب کوچ کرتا ہوا وسط ایشیا سے برعظیم پاک و ہند میں داخل ہوا۔ یہاں آ کر ان کو یہاں کے دیسی باشندوں یعنی دراوڑی قوم سے سابقہ پڑا۔ یہ آریہ غیر متمدن تھے اور ان کی حالت خانہ بدوشوں کی سی تھی۔ ان کے مقابلے میں دراوڑی زیادہ ترقی یافتہ اور متمدن تھے۔ آریہ جسمانی لحاظ سے قوی تھے۔ انہوں نے دراوڑوں کو ان کے زرخیز علاقوں سے مار بھگایا اور جو باقی بچے انہیں غلام بنایا۔ چنانچہ ان بہادر شریف آریاؤں کی یادگار دھتکارے ہوئے اور اچھوت ہیں جو اس برعظیم میں اب تک اپنے کرموں کی سزا بھگت رہے ہیں۔

جب دو ایسی قومیں آپس میں ملتی ہیں جن میں ایک متمدن اور دوسری غیر متمدن ہو تو تہذیب اس ملاپ سے پیدا ہوتی ہے اس پر غالب اثر متمدن قوم کا ہوتا ہے۔ خواہ مفتوح ہی کیوں نہ ہو، بنابریں دراوڑی تہذیب کا اثر آریاؤں کی زندگی کے ہر شعبے پر پڑا۔ حتیٰ کہ وہ دراوڑوں کے بعض دیوتاؤں کو بھی پوجنے لگے۔ زبان کو انسانی تہذیب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ان دو قوموں کی یکجائی سے جن کی بولیاں مختلف تھیں ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازم تھا۔ متمدن قوم کی بولی کا اثر غالب ہوتا ہے۔ آریاؤں اور دراوڑوں کے میل جول سے جو بولی وجود میں آئی اس میں لامحالہ دراوڑی الفاظ کی بہتات تھی، کیونکہ متمدن قوم کی زبان میں الفاظ کا ذخیرہ زیادہ ہوتا ہے اور اس میں اشیا، خیالات و جذبات کے اظہار کے لئے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ غیر متمدن بولی پر غالب آ جاتی ہے۔ دراوڑی بولی کا اثر صرف الفاظ ہی تک محدود نہ رہا۔ اصوات بھی اس سے متاثر ہوئیں۔ لسانیات کا یہ گوشہ ابھی تحقیق کی روشنی سے محروم ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اسی پراکرت سے وہ زبان نکلی جو سنسکرت کہلاتی ہے۔ نیز یہی بولی ان قدیم پراکرتوں اور بولیوں کی ماں ہے جو اس برعظیم میں بولی جاتی ہیں۔ اور اس کا اثر ہے کہ اس زبان نے جو آریا ایران سے بولتے آئے تھے۔ ہند آریائی۔ شکل اختیار کی۔

پراکرت کے معنی فطری، غیر مصنوعی کے ہیں، اس کے مقابلے میں سنسکرت سے مراد شستہ مصنوعی زبان ہے۔ سنسکرت برہمنوں کے تشدد اور نحویوں کے اصول و ضوابط کے قیود اور جکڑ بند سے بانجھ ہو کر رہ گئی یہ عام بول چال کی زبان نہ ہونے پائی۔ برہمنوں اور اہل علم کے طبقے میں محدود رہی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ [illegible] کو جو عوام کی بولیاں تھیں خاطر خواہ فروغ ہوا۔ اور ان پراکرتوں سے دوسری بولیاں نکلیں اور پھولی پھلیں۔ ان ہی بولیوں میں سے ماگدھی اور اردھ ماگدھی ہیں۔ جو مہاتما بدھ اور جین مذہب کے حامیوں نے اپنے مذہبی عقائد کی تلقین کے لئے اختیار کیں۔ ان ہی بولیوں نے بعد میں کسی قدر تغیر سے پالی اور جینی اردھ [illegible]

[illegible] جب ویدانی بولی سنسکرت کی طرح ضبط اور مقرری بن جانے کے بعد [illegible] ہو گئیں اور بول چال کی زبانیں [illegible] تو اس [illegible] کی بول چال کی بولی اپ بھرنشا (بگڑی ہوئی زبان) نے ان کی جگہ لے لی۔

بارھویں صدی میں متعدد اپ بھرنشائیں تھیں۔ سورسینی (شورسینی) دلیں۔ مختصر اپ بھرنشا دہلی علاقہ کی بولیوں کی ماں ہے۔ ان میں سے ایک اس علاقے میں بولی جاتی تھی جو ستلج کے ساحل سے دہلی تک اور روہیلکھنڈ کے مغربی ساحل تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک (یعنی برج بھاشا) آگرہ اور متھرا کے علاقے میں اور ایک بندیلکھنڈ کے علاقے میں۔ مشرق کی جانب دوسری بولیاں مروج تھیں۔ مثلاً میتھلی، ماگدھی، بھوج پوری وغیرہ، اور آگے بنگالی آسامی اڑیا۔ مغرب کی جانب راجستانی اور گجراتی۔ جنوب کی طرف مرہٹی اور شمال مغرب میں پنجابی۔ بارھویں صدی عیسوی میں اس حصہ ملک میں یہ سب بول چال کی بولیاں تھیں۔ ان بولیوں کا سنسکرت سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا بجز اس کے کہ ان میں سنسکرت کے بہت سے الفاظ کچھ اصلی صورت میں اور زیادہ تر مسخ حالت میں ضرور پائے جاتے ہیں۔

دلی، میرٹھ اور آس پاس کے مقامات میں جو بولی مروج تھی وہ دہی تھی جسے امیر خسرو دہلی کہتے ہیں۔ (مثنوی نہ سپہر) ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں اس کو اسی نام سے موسوم کیا ہے۔ یہ عوام کی بولی تھی اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اسے اس زمانے میں کھڑی بولی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب دہلی میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی اور سلطنت کو استقلال ہوا تو یہی بولی تھی جو وہاں بولی جاتی تھی۔ ابتدا میں اس پر آس پاس کی بولیوں پنجابی، ہریانی وغیرہ کا بھی اثر پڑا۔

مسلمان جو ہندوستان میں آئے ان کی مذہبی اور علمی زبان عربی تھی۔ اس کا بول چال سے تعلق تھا نہ روزمرہ کی ضروریات سے۔ ترکی امرا اور شاہی خاندان والوں تک محدود تھی۔ دفتری، کاروباری، درباری، تہذیبی اور عام تعلیمی زبان فارسی تھی۔ جب اس کی آمد [illegible] تو اس پیوند سے ایک نئی مخلوط بولی وجود میں آئی۔ ابتدا میں یہ ہندی یا ہندوی کہلائی۔ بعد میں دوسری بولیوں سے امتیاز کے لئے اسے ریختہ کا نیا نام دیا گیا۔ اس سے مراد ملی جلی زبان کے ہیں۔ ابتدا میں ریختہ صرف کلام منظوم کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ بعد میں عام زبان کے لئے استعمال ہونے لگا۔ ہندوستانی (یعنی زبان ہندوستان) بھی اسی کا دوسرا نام ہے یہی بولی رفتہ رفتہ اس رتبے کو پہنچی جسے ہم "اردو" کہتے ہیں اور جو اب مقبول عام نام ہے۔ عالمگیر کے عہد سے قبل یہ نام زبان کے لئے کسی تحریر میں نظر نہیں آتا۔

وہ زبان جس کے لئے زمین پنجاب کے میدانوں میں تیار ہوئی اور جس نے دلی میں خاص حالات میں ایک نئی بولی کا روپ دھارا۔ وہ صوفیوں، درویشوں اور سلطنت دہلی کے لشکروں کی بدولت، گجرات، دکن، پنجاب اور دوسرے علاقوں میں پہنچی اور بڑی تیزی سے پھیلتی چلی گئی۔

درویشوں کا تکیہ سب کے لئے کھلا ہوتا ہے۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ اس کے پاس آتے اور اس کی زیارت و صحبت کو موجب برکت سمجھتے ہیں۔ عام و خاص میں کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف زیادہ جھکتے ہیں اس لئے انہوں نے اپنے اصول و عقائد کی تلقین کے لئے جہاں اور ڈھنگ اختیار کئے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ جہاں جائیں اس خطے کی زبان سیکھیں تاکہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ ہمارے اس بیان کی تصدیق فاضل شارح المرغوبی (تصنیف ملک محمد جائسی) کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ وہ کتاب کے خاتمے پر لکھتے ہیں۔

"[illegible] گمان نکند کہ اولیاء اللہ بغیر از زبان عربی تکلم نہ کردہ۔ زیرا کہ جملہ اولیاء اللہ در ملک عرب مخصوص نہ بودہ۔ پس ہر ملک کہ [illegible] زبان آں ملک را بکار بردہ اند۔ و گمان نکند کہ ہیچ اولیاء اللہ بہ زبان ہندی تکلم نہ کردہ۔ زیرا کہ اول از جمیع اولیاء اللہ قطب الاقطاب خواجہ بزرگ معین الحق والملۃ والدین قدس سرہ بدیں زبان سخن فرمودہ۔ بعد ازاں خواجہ [illegible] قدس سرہ۔ و حضرت خواجہ گنج شکر بزبان ہندی و [illegible] اشعار نظم فرمودہ .... ہم چناں [illegible]"

[illegible]

کہ ہندی زبان ... حضرت شیخ فرید الدین شکر گنج قدس سرہٗ (ولادت ۵۶۹ھ م ۱۱۷۳ء - وفات ۶۶۴ھ م ۱۲۶۵ء) کے ایک [illegible]
مولانا سید مبارک معروف بہ میر خورد جو سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء کے مرید و مصاحب خاص تھے اپنی تالیف سیر الاولیاء میں لکھتے ہیں
کہ جب حضرت نے شیخ جمال الدین کے چھوٹے بیٹے کو اپنی بیعت سے مشرف کیا اور رخصت کے وقت خلافت نامہ، مصلیٰ اور عصا عنایت فرمایا تو
(شیخ جمال الدین کی خادمہ) نے کہا "خوجا بالا ہے" تو آپ نے ہندی زبان ہی میں فرمایا: "پونوں کا چاند بھی بالا ہے" یعنی بدر بھی پہلی رات کو چھوٹا ہوتا ہے۔

شیخ بہاؤالدین باجن (۷۹۰ھ م ۱۳۸۸ء تا ۹۱۲ھ م ۱۵۰۶ء) نے اپنی تصنیف "خزائن رحمت" میں حضرت شکر گنج کے یہ دو قول نقل فرمائے ہیں۔ جو ہماری رائے میں مستند معلوم ہوتے ہیں۔

۱۔ راول دیول بہی نہ جائے   سچا ٹا بہتا رو کھا کھائے
ہم دولشنہہ رہے رہیت   پانی، لوریں اور میت

۲۔ حسس کا سائیں جاگتا سو کیوں سوئے داس

جمعات شاہی میں جو حضرت قطب عالم (۷۹۰ھ م ۱۳۸۸ء تا ۸۵۰ھ م ۱۴۴۶ء) حضرت شاہ عالم کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، حضرت خواجہ شکر گنج کا یہ منظوم قول نقل کیا ہے۔

اسا کیری بہی سوریت   جادان تاے کی جادان میت

یوں بہت سے منظوم اقوال آپ کے نام سے مشہور ہیں لیکن ان کی کوئی باوثوق سند نہیں۔ ان میں سے بعض ایسے ہیں جو ان کے ہم نام بابا فرید کے ہیں۔

شیخ بوعلی قلندر (وفات ۷۲۴ھ م ۱۳۲۳ء) کا امیر خسرو سے یہ کہنا "ترکا کچھ سمجھدا ہے" ثابت کرتا ہے کہ یہ بزرگ مقامی زبان سے واقف تھے۔

اسلامی ہند کے صاحب کمال شاعر و ادیب امیر خسرو (۶۵۱ھ م ۱۲۵۳ء تا ۷۲۵ھ م ۱۳۲۴ء) پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنے کلام میں ہندی الفاظ اور جملے بے تکلف استعمال کیے ہیں ان کی نسبت عام طور پر یہ یقین ہے کہ ان کا کلام ہندی میں بھی تھا اور بعض تذکروں نے بھی اس کا ذکر کیا ہے خود امیر نے بھی اپنے دیوان غرۃ الکمال میں صاف طور پر لکھا ہے کہ میں نے ہندی نظم بھی کہی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ ان کا ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا ریختہ قسم کے بعض قطعے یا ایک آدھ غزل اور کچھ پہیلیاں، چیستانیں۔ کہہ مکرنیاں، انملیاں، دو سخنے یا دوہے جو ان سے منسوب ہیں ان کی صحت کا اس وقت کوئی معتبر ذریعہ نہیں۔ ان میں سے ممکن ہے بعض ان کے ہوں۔ لیکن صدہا سال سے لوگوں کی زبان پر رہنے سے ان کے الفاظ اور زبان میں بہت کچھ تغیر ہو گیا ہے۔ سب سے قدیم حوالہ ملا وجہی کی تصنیف "سب رس" (۱۰۴۵ھ) میں ملتا ہے۔ اس میں ان کا یہ دوہا نقل کیا ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساقی تیرا چاؤ   مجھ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ

(سب رس مطبوعہ انجمن ترقی اردو ص ۱۴۳)

ان کی فارسی مثنویوں میں ہندی الفاظ اور جملے بڑی بے تکلفی سے استعمال ہوئے ہیں مثلاً تغلق نامے میں "ہے ہے تیر لاء" خالص دہلوی زبان ہے۔

شیخ عزیز الدین ... سلطان الاولیا شیخ نظام الدین کے مرید و خلیفہ تھے۔ حضرت شیخ باجن اپنی تصنیف ... میں لکھتے ہیں کہ شیخ عزیز الدین شہر (دلی) سے سرکی لاتے اور چھپر بنا کر گھر بنا لیتے۔ جب یہ سرکی پرانی ہو جاتی یا آندھی میں اڑ جاتی تو دوسری سرکی لے آتے۔ دوستوں نے جب یہ کہا کہ آپ مستقل گھر کیوں نہیں بنا لیتے تو فرمایا۔

آئے تھے سیاہی بن بجارے　　کیا گھر کرتے ہیں بنجارے

شیخ بہاءالدین باجن نے اپنی تصنیف خزائن رحمت میں اپنے مرشد شیخ رحمت اللہ کے ملفوظات حالات و اشارات اور اقوال شامل کئے ہیں۔ اس میں جا بجا اپنے اشعار اردو میں بھی لکھے ہیں۔ کچھ یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ساجن دو عالم اس کی قبر سے　　کھاوے حلال اور سیاح لیوے

قل ھو اللہ کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

ناں وہ جنیا نہ وہ جایا　　ناں اُس مائی باپ کہلایا

ناں اُس کوئی گود چڑھایا　　باجن سب ان آپ بنایا

ہر گٹ جانا ہو کہیں ڈیٹھا آپ لکھایا

مسجد مسجد بانگا دیویں بت خانے تیرا شور　　مے خانے بیچ تر رنگ کوئے ایسا تیرا شور

باجن جس وہ کرے کرم　　باپ بھی ہووے پوے دھرم

یہ فقی کیا کس ملتی ہے　　جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

ان مثالوں سے ظاہر ہوگا کہ جو زبان امیر خسرو کے وقت یا ان کے قریب کے زمانے میں دلی میں بولی جاتی تھی وہ اس زبان سے جسے ہم اردو کہتے ہیں کس قدر قریب تھی۔ بعض جملے تو بالکل آج کل کی سی زبان میں ہیں۔

صوفیوں اور درویشوں کے علاوہ دوسرا گروہ جس نے اس زبان کے پھیلانے اور دور دراز علاقوں میں پہنچانے میں مدد دی وہ سلطنت کی فوجیں تھیں صوفیوں کا مقصد اس زبان کی اشاعت نہ تھا انہوں نے یہ زبان اس لئے اختیار کی کہ یہی ایک ایسی زبان تھی جس کے ذریعہ وہ ملک کے ہر حصے میں وہ اپنے اصول و عقائد کی تلقین کر سکتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس ضمن میں زبان کی بھی اشاعت ہو گئی۔ یہی صورت سلاطین دہلی کی فتوحات سے ظہور پذیر ہوئی۔ ان سلاطین میں سب سے پہلے ۶۹۴ھ م ۱۲۹۴ء میں علاؤ الدین نے دکن پر لشکر کشی کی اور دیوگری تک جا پہنچا۔ اور ۶۹۶ھ م ۱۲۹۶ء میں گجرات پر قبضہ کر لیا اور اپنی طرف سے صوبیدار مقرر کر دیا۔

علاؤ الدین کے بعد ۷۲۷ھ م ۱۳۲۷ء میں محمد تغلق نے دلی شہر کی آبادی کو دیوگری (دولت آباد) میں لے جا کر بسا دیا۔ اور تخمیناً دو لاکھ دلی والے دولت آباد میں آباد ہو گئے۔ ان کے ساتھ ان کی زبان بھی جا پہنچی جس کے آثار اب بھی دولت آباد و خلد آباد میں پائے جاتے ہیں۔ اس حیرت انگیز واقعے نے اس زبان کی تاریخ میں ایک نیا باب کھول دیا۔

اس زبان کو دکن میں ایک جداگانہ اور خاص حیثیت حاصل ہو گئی ایک تو یہ کہ شروع ہی سے فارسی حروف و رسم خط میں لکھی جانے لگی۔

[illegible] کو اس سے اتفاق [illegible] زبان [illegible]

[illegible] کو جو زبان جس سلسلہ میں جنم لیا، دکن میں جاکر اس نے [illegible] ترقی حاصل کی [illegible]
[illegible] استاد منزل [illegible] لوگ۔ اس سے کام لینے لگے تھے۔ اس عہد کی پہلی کتاب معراج العاشقین سمجھی جاتی ہے جو حضرت سید [illegible] حسینی الدہلوی سے منسوب ہے۔ یہ شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے مرید تھے اور خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے لقب سے مشہور ہیں۔ معراج العاشقین [illegible] میں حیدرآباد دکن سے شائع کی تھی۔ مجھے اس وقت بھی یہ یقین نہ تھا کہ یہ خواجہ بندہ نواز کی تصنیف ہے۔ خواجہ بندہ نواز صاحب کی تصانیف کثیر ہیں۔ ان کی سب کتابیں فارسی یا عربی زبان میں ہیں۔ میں نے ان کی اکثر تصانیف اس خاص نظر سے بالاستیعاب دیکھی ہیں۔ کہیں کوئی ہندی لفظ یا جملہ نظر نہ پڑا۔ علاوہ معراج العاشقین کے مجھے اور بھی کئی رسالے مثلاً تلاوت الوجود، رسالہ سہ بارہ، شکار نامہ، تمثیل نامہ وغیرہ ملے جو قدیم اردو میں ہیں اور خواجہ صاحب سے منسوب ہیں۔ اخبار الاخیار تصنیف شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور جوامع الکلم تالیف سید حسین المعروف بہ سید محمد اکبر حسینی فرزند اکبر خواجہ بندہ نواز ہیں جس میں حضرت کے ملفوظات، حالات وغیرہ تفصیل سے درج ہیں نیز دیگر کتابوں میں جس میں حضرت کا تذکرہ ہے کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں پایا جاتا کہ دکنی یا قدیم اردو میں بھی ان کی کوئی تصنیف ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ ان کے فارسی عربی رسالوں کے ترجمے ہیں جو ان کے نام سے منسوب کردیئے گئے ہیں۔ اس قسم کی بدعت ہماری زبانوں میں ہوتی آئی ہے۔

ان کا منظوم کلام بھی بعض بیاضوں میں پایا جاتا ہے۔ شہباز کا لفظ بھی ان کے نام کے ساتھ آیا ہے۔ اس لئے بعض منظوم اقوال جن میں شہباز بطور تخلص استعمال ہوا ہے ان ہی کا کلام سمجھا جاتا ہے۔ ان میں سے بعض میں نے اپنی کتاب "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" میں نقل کئے ہیں۔ سب سے قدیم حوالہ ان کے بعض منظوم کلام کا ایک پرانی مستند بیاض میں ملا جس میں میاں جی شمس العشاق اور ان کے بیٹے پوتے اور بعض مریدوں کا کلام بڑی احتیاط سے جمع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سن کتابت ۱۰۱۱ھ ہے۔ اس میں ان کی ایک غزل بھی ہے جس کے مقطع میں "شہباز حسینی" آیا ہے اس سے یہ خواجہ کا کلام سمجھ لیا گیا۔ لیکن اس نام کے دو اور بزرگ گزرے ہیں۔ ایک ملک شرف الدین شہباز گجراتی (متوفی ۹۴۳ھ) اور دوسرے بیجاپور کے شہباز حسینی (متوفی ۱۱۰۸ھ) اس لئے حتمی طور سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ خواجہ بندہ نواز کا کلام ہے۔ زبان بھی اس کی بہت پرانی نہیں۔ البتہ اسی بیاض میں مقام "ابھنگ" میں تین مصرعوں کا ایک مثلث ان کے نام سے درج ہے جو یہ ہے۔

حضرت خواجہ نصیر الدین جب جیو میں آئے   جیو کا گھونگھٹ کھول کر مکھ پاؤ دکھائے
آ کھے سید محمد حسینی پیو کا سکھ کہیا نہ جائے

اس نظم میں ان کے اپنے پیر و مرشد کا نام بھی ہے اور اس کے ساتھ اپنا پورا نام ہے۔ اس لئے یہ قیاس کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ خواجہ صاحب کا کلام ہے جوامع الکلم میں خود خواجہ صاحب کی زبانی ان کی متعدد غزلیں منقول ہیں۔ ان غزلوں میں وہ اپنا تخلص محمد یا ابوالفتح یا ابوالفتح لکھتے ہیں اس وقت تک ہم نے قدیم زبان کی بول چال کے یا منظوم اقوال پیش کئے ہیں۔ کسی مستقل کتاب کا ذکر نہیں آیا۔ مستقل کتابیں ایک مدت کے بعد تحریر میں آئیں۔ اگر معراج العاشقین سے قطع نظر کی جائے تو دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب فخر الدین نظامی کی مثنوی "کدم راؤ پدم راؤ" ہے۔ مصنف کا نام فخر الدین نظامی ہے جس کا اظہار اس نے اس نظم میں کئی جگہ کیا ہے۔ صحیح سن تصنیف معلوم نہ ہو سکا۔ لیکن اس قدر یقینی ہے کہ یہ کتاب سلطان علاؤ الدین شاہ بہمنی ابن احمد شاہ ولی کی وفات کے بعد لکھی گئی ہے۔ نعت کے بعد ایک عنوان ہے "مدح سلطان علاؤ الدین بہمنی نور اللہ مرقدہ" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت سلطان علاؤ الدین کو مرے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ سلطان علاؤ الدین بن احمد شاہ ۸۳۸ھ میں تخت نشین ہوا اور ۸۶۲ھ میں انتقال کر گیا۔ اس کا فرزند اور جانشین ہمایوں شاہ ظالم ۸۶۵ھ میں فوت ہو گیا۔ ہمایوں کا جانشین اس کا فرزند نظام شاہ ہوا۔ اس کا دو سال بعد ۸۶۷ھ میں انتقال ہو گیا۔ مدح سلطان کے یہ اشعار قابل غور ہیں۔

دھنیں تاج کا کون راجا بھنگ — کہ دتے شاہ کا شاہ اور بھنگ

سلطان علاؤ الدین کی اولاد اور اس کے جانشینوں میں کسی کا نام احمد شاہ نہ تھا۔ بعض صاحبوں نے یہیں سے پتا لگایا ہے کہ جو سکے [illegible] سے منسوب ہوتے ہیں ان پر احمد شاہ کا نام ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو یہ مثنوی انہیں شہنشاہ کی تصنیف ہوئی ہے۔ بہر حال اس میں مشتبہ نہیں کہ سلطان علاؤ الدین [illegible] کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کے عہد میں لکھی گئی ہے۔

اس مثنوی کی زبان میں ہندی کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ عربی فارسی لفظ کہیں کہیں آجاتے ہیں کیونکہ اس کا کوئی دوسرا نسخہ کسی جگہ نہیں اس لئے چند اشعار بطور نمونہ کے لکھے جاتے ہیں۔

حمد۔ گسائیں تہیں ایک دو جگ ادھار — بردیو نہ جگ تہیں دینہار

جہاں کچھ نکو ہی تہاں ہے تہیں
اکاس اکھے پاتال دھرتی نہیں

نعت محمد تیں ایک ساجا گسائیں امر — سری دوی تین جگ قرار دگر
اہو لک مکت سیس سنسار کا — کرے کام سردھار کرتار کا

لیکن اسی زبان کے ساتھ ساتھ بعض مصرعے یا شعر ایسے صاف ہیں کہ وہ آج کل کی سی زبان کے معلوم ہوتے ہیں، مثلاً

سیانا کھرات بدھ ونت تول — تجھے آکھوں اور کس کوں کہوں

گنواوے کہیں اور ڈھونڈے کہیں — نہ پاوے کہیں ڈھونڈے بن کہیں

نظامی کہنہار جس یار ہوئے — سنہار سن لفظ گفتار ہوئے

نہ باسی دھرول نہ تواسی دھرول

(آج کل کی زبان میں "باسی تباسی" کہتے ہیں ۔۔۔")

جہاں تک موجودہ تحقیقات کی دسترس ہے، اس سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ اگرچہ دکنی اردو کی سب سے قدیم کتاب نظامی کی مثنوی ہے، لیکن اس میں شک نہیں کہ اس زبان کو مستقل طور پر ادبی صورت میں پیش کرنے کی فضیلت گجرات کو حاصل ہے۔ اور یہ فضیلت اسے صوفیائے کرام کی بدولت نصیب ہوئی۔

مسلمان سلاطین میں سب سے پہلے علاؤ الدین خلجی نے دکن پر حملہ کیا اور ۶۹۶ھ میں گجرات پر تسلط کر لیا۔ اس وقت سے اس علاقے کے صوبیدار دہلی کی سلطنت کی طرف سے مقرر ہو کر آتے رہے۔ صوبیدار کے ساتھ لاؤ لشکر، مختلف پیشہ ور، اہل حرفہ، ملازمین، مصاحبین وغیرہ کی ایک کثیر جماعت ہوتی تھی۔ ان کے لواحقین اور اہل و عیال بھی ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ [illegible] دہلی کی زبان بھی اپنے ساتھ لاتے [illegible] اس علاقے میں [illegible] کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔

[illegible] دہلی کی حکومت میں ضعف پیدا ہوا، اور صوبیدار ظفر خاں [illegible] قائم کر لی

[illegible]

لیکن ان کے ہم عصروں میں بعض ایسے بزرگ ہیں جن کی مستقل تصانیف اس زبان میں پائی جاتی ہیں۔

ان میں ایک قاضی محمود دریائی ہیں جن کا مسکن [illegible] گجرات کے [illegible] ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ قلمی صورت میں موجود ہے۔ زبان [illegible] ہے مقامی رنگ صاف ظاہر ہے۔ گجراتی اور فارسی عربی الفاظ بھی کہیں کہیں استعمال کئے ہیں۔ کلام کا طرز بھی ہندی ہے چونکہ سماع کا خاص ذوق تھا اس لئے ہر نظم کی ابتداء میں اس راگ یا راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ ان کا مشرب عشق و محبت ہے اور سارا کلام اسی رنگ میں [illegible] ان کا کلام (زبان کی اجنبیت کی وجہ سے) مشکل ہے، آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا۔ نمونے کے طور پر دو چار شعر لکھے جاتے ہیں اس سے ان کی زبان اور طرز کلام کا اندازہ ہوگا۔

نینوں کاجل مکھ تنبولا ناک موتی گل ہار   سیس نماؤں نیہا پاؤں اپنے پیر کروں جوہار

(یعنی آنکھوں میں کاجل منہ میں پان ناک میں موتی گلے میں ہار۔ اس سج دھج سے میں سر کو جھکاؤں، محبت کروں اور پیر کو آداب کروں)

کوئی مایا مرم نہ بوجھے رے   بات من کی کس نہ سوجھے رے

(مایا = اللہ کا ـــ مرم = بھید)

"دکھ جیو کا کس کہوں اللہ۔ دکھ بھریا سب کوئی رے نردکھی جگ میں کو نہیں، میں پرتی پھر پھر سو جوئی رے"

(یعنی اے اللہ میں اپنے جی کا دکھ کس سے کہوں، سب کوئی دکھ بھرے ہیں۔ میں نے دنیا جہان میں پھر پھر کے دیکھ لیا، کوئی ایسا نہ ملا جو دکھی نہ ہو) ان کی ولادت ۸۷۰ھ اور وفات ۹۴۱ھ میں ہوئی۔

ایک دوسرے بزرگ شاہ علی جیو گام دھنی ہیں جن کا مولد و منشا گجرات ہے۔ گجرات کے کامل درویشوں اور عارفوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے پائے کے شاعر ہیں اور ان کا کلام توحید اور وحدت الوجود سے بھرا ہوا ہے۔ اگرچہ وحدت وجود کے مسئلے کو معمولی باتوں اور تمثیلوں میں بیان کرتے ہیں، مگر ان کے بیان اور الفاظ میں پریم کا رس گھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ وہ عاشق ہیں اور خدا معشوق ہے۔ طرز کلام بہت کچھ [illegible] کا سا ہے اور عورت کی طرف سے خطاب ہے۔ زبان سادہ ہے لیکن چونکہ پرانی ہے اور غیر مانوس الفاظ استعمال کئے ہیں اس لئے کہیں کہیں سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔ ان کے کلام کا مجموعہ "جواہر الاسرار" کے نام سے موسوم ہے۔

تم ری پیا کو دیکھو جیا   ہو جیوں پہ سنتو سائیں ایسا

موتے تمہیں ہونا ان وہ ایسا

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہے۔ [illegible] ہے۔

[illegible] صاحب [illegible] تھے [illegible] ۱۰۷۲ھ تک واقع ہوا۔

تصوف پر ان کی کتابوں میں سب سے مشہور اور مقبول کتاب "خوب ترنگ" ہے جس کا سن تصنیف ۱۰۸۶ھ بتایا جاتا ہے۔ یہ خالص تصوف کی کتاب ہے۔ میاں خوب محمد عالم اور سالک ہیں تصوف کی اصطلاحات و نکات کے ماہر اور بہت اچھے ناظم ہیں۔ انہوں نے اس کتاب کی شرح "امواج خوبی" کے نام سے لکھی ہے۔ علاوہ خوب ترنگ کے ان کا ایک منظوم رسالہ "بھاؤ بھید" مثالیہ بیان کا کام ہو چکا ہے۔

یہ صوفی شعرا جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ہندی میں لکھنے کی معذرت کرتے ہیں اور اپنی زبان کو "گجری یا گجری" کہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دلی سے جو زبان جنوب کی طرف گئی اس کی دو شاخیں ہو گئیں۔ دکن میں گئی تو دکنی لہجہ اور الفاظ کے دخیل ہونے سے دکنی کہلائی اور گجرات میں پہنچی تو وہاں کی مقامی خصوصیت کی وجہ سے گجری یا گجراتی کہی جانے لگی۔ زبان درحقیقت ایک ہی ہے۔ بعض مقامی الفاظ اور محاورات کی وجہ سے یہ فرق ہو گئی۔ آخر میں یہ فرق مٹ گیا اور دونوں علاقوں کی زبان دکنی ہی کہلائی۔

دکنی زبان کا دوسرا بڑا مرکز بیجاپور تھا۔ جہاں عادل شاہی سلاطین کی زیر سرپرستی اس زبان کو فروغ ہوا۔ اس زمانے کے ایک صوفی بزرگ برہان الدین عرف میراں جی شمس العشاق ہیں جو مکہ میں پیدا ہوئے جیسا کہ انہوں نے خود اپنے حالات میں لکھا ہے اور بحکم پیر (کمال الدین بیابانی) سہنکار (علاقہ احمد آباد) میں جا کر مقیم ہوئے، بعد ازاں کچھ عرصے بعد وہاں سے منتقل ہو کر انہوں نے بیجاپور میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ان کے نظم و نثر میں کئی رسالے ہیں۔ ایک منظوم رسالے کا نام "خوش نامہ" ہے اس میں وہ تصوف اور معرفت کی باتیں ایک لڑکی "خوشی" نامی سے لڑکیوں کے حالات کی مناسبت سے بیان کرتے ہیں۔ مثلاً یہ دنیا اس کی سسرال ہے اور عالم آخرت اس کا میکا ہے۔ اسی طرح تمام نسوانی مناسبات مثلاً زیور پہننا، مہندی لگانا، چرخا کاتنا وغیرہ کا استعمال کرتے ہیں

[illegible] دو سو شعر ہیں۔ ایک دوسری نظم "خوش نغز" ہے جس میں خوشی سوال کرتی ہے اور میراں جی جواب دیتے ہیں۔ ایک اور منظوم رسالہ "شہادت الحقیقت" [illegible] تصوف کے معرفی مسائل پر ہے۔ اس میں وہ ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں اور معذرت کرتے ہیں۔ میراں جی [illegible] شمس العشاق سے نکلتا ہے۔ چنانچہ بعد میں وہ اسی لقب سے مشہور ہوئے۔ ان کی مزید تاریخ [illegible] ہے جو ان [illegible] رحلت پر کہا ہے۔ یہ رشید ان کے بیٹے برہان الدین جانم ہیں جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ بعض مرثیے کے شعر نقل کیے جاتے ہیں جن میں ان کی وفات کا سن، تاریخ اور دن مذکور ہے۔

تاریخ حضرت سال نو ۔۔۔ اور سن پیا نگے یہی دو
رو دین مدت وفا شو ۔۔۔ ہے کچھ حسکم اللہ ہی کا
اول سوال اول سال ہے ۔۔۔ ملبہ کول شوال ہے
رحلت کئے اس حال ہے ۔۔۔ ہے کچھ حسکم اللہ کا
تاریخ بیست و پنج بد ۔۔۔ [illegible]
وہ حال حاصل کی خود ۔۔۔ ہے کچھ حسکم اللہ ہی کا
شب [illegible] کیا ۔۔۔ [illegible]
[illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

اتی بات ضرور ہے کہ [illegible]

[illegible]

میرانجی شمس العشاق کے مقابلے میں یہ آسان اور سادہ ہے۔ بعض مقامات پر سادگی کے ساتھ کلام میں لطافت بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً

بن عشق بدھ کر شوخ نہیں
اور بن بدھ عشق کر لیچ نہیں

علاوہ مثنویوں اور دوسری منظومات کے شاہ صاحب نے بہت سے خیال اور دوہے بھی لکھے ہیں جن کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے اور ہر دوہے کے ساتھ راگ راگنی کا نام بھی لکھ دیا ہے۔ خاندان چشتیہ کے بزرگ موسیقی کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ روحانی ذوق پیدا کرنے اور روحانی تربیت [illegible] کرنے میں اسے بہت ممد خیال کرتے ہیں۔

ان کی اکثر نظموں کی بحریں ہندی ہیں اور زبان پر بھی ہندی رنگ غالب ہے البتہ ہندی الفاظ و اصطلاحات کے ساتھ کہیں کہیں فارسی اور عربی الفاظ و اصطلاحیں بھی پائی جاتی ہیں۔ نیز وہ اپنی نظموں میں ہندو مسلم دونوں روایات و تلمیحات سے کام لیتے ہیں یا گویا ایک دوہے میں [illegible] کی تلمیح ہے تو دوسرے میں سری کرشن جی کے قصے کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ برہان اپنی زبان کو گجری کہتے ہیں۔ ("یہ سب گجری کیا بیان")

عبدل (عبد الغنی): یہ بھی اسی زمانے کا شاعر ہے اس کی تصنیف ابراہیم نامہ ہے جو اس نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے حالات میں [illegible] پر تصنیف کیا۔ (۱۰۱۲ھ)

حسن شوقی: اسی عہد کا ایک مشہور شاعر حسن شوقی ہے۔ مجھے اس کی دو مثنویاں دستیاب ہوئی ہیں ایک "فتح نامہ نظام شاہ" یا "ظفر نامہ نظام شاہ"۔ یہ رزمیہ مثنوی ہے۔ اس میں تالی کوٹ کی مشہور جنگ کا حال بیان کیا گیا ہے۔ یہ جنگ ۹۷۲ھ م ۱۵۶۴ء میں ہوئی تھی۔ اس میں دکن کے فرمانرواؤں یعنی علی عادل شاہ، ابراہیم قطب شاہ، نظام شاہ اور برید شاہ نے متحد ہو کر وجے نگر کے راجہ رام راج پر لشکر کشی کی اور اسے مقام تالی کوٹ پر شکست دی۔ دوسری مثنوی جس کا نام "میزبانی سلطان محمد عادل شاہ" سلطان کی شادی سے متعلق ہے۔ اس میں [illegible] اور جشن کی رسوم اور میزبانی اور جہاں کی شان و شوکت کا ذکر ہے۔ ان مثنویوں کی زبان قدیم دکنی اردو ہے مگر نسبتاً سہل ہے۔ بیان میں روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ شوقی کی غزلیں بھی ملی ہیں۔ ان میں بعض مسلسل اور مرصع ہیں۔ اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو ولی اور اس کے عہد کے اساتذہ کی غزلوں کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں۔

سلطان ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد میں قدیم دکنی اردو کا خاصا رواج ہو گیا تھا اور سرکاری دفاتر میں بھی پہنچ گئی تھی۔ بادشاہ خود بھی شاعر اور موسیقی کا بڑا ماہر تھا۔ اسی بنا پر اس نے "جگت گرو" کا لقب پایا۔ اس کی مشہور کتاب "نورس" فن موسیقی پر ہے جس پر ظہوری نے دیباچہ لکھا ہے جو "سہ نثر ظہوری" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کتاب کی زبان ہندی ہے کہیں کہیں دکنی اردو کے [illegible] بھی ہیں۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے انتقال کے بعد محمد عادل شاہ تخت پر بیٹھا (۱۰۳۷ھ) [illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] علی عادل شاہ کے [illegible] ملک الشعرا [illegible] اس کی تین مثنویاں یادگار ہیں: ایک "گلشن عشق" جو شعرائے دکن میں سب سے پہلا تصنیف ہے (۱۰۶۸ھ)، یہ منوہر و مدمالتی کے عشق کی [illegible] دوسری [illegible] علی عادل شاہ کی جنگی مہمات کا بیان ہے [illegible] اس میں تاریخی واقعات کی تفصیل، مناظر قدرت کی کیفیت، رزم و بزم کی داستان [illegible] کمال فصاحت و بلاغت اور صناعی سے کھینچا ہے۔ نصرتی کی یہ مثنوی نہ صرف قدیم دکنی اردو میں بلکہ تمام اردو ادب میں اپنی نظیر نہیں رکھتی (سن تصنیف ۱۰۷۶ھ)

نصرتی کے قصائد بھی بہت پر شکوہ ہیں، اور بیان، علو مضامین اور شوکت لفظی میں بے مثل ہیں۔ تیسری مثنوی "تاریخ اسکندری" ہے جو اس [illegible] علی عادل شاہ کے جانشین اور عادل شاہی سلطنت کے آخری بادشاہ سکندر عادل شاہ (۱۰۸۳ تا ۱۰۹۷ھ) کی اس لڑائی کا بیان ہے جو [illegible] سے ہوئی تھی۔ یہ مختصر نظم کی تصنیف ہے۔

شاہ امین الدین اعلیٰ نے اپنے والد حضرت برہان الدین جانم اور اپنے دادا میراں جی شمس العشاق کی پیروی میں متعدد نظم و نثر کے رسالے تصوف کے مسائل پر لکھے۔ ان کی زبان نسبتاً آسان ہے۔

اس عہد کا ایک بڑا شاعر سید میراں ہاشمی گزرا ہے جو مادرزاد اندھا تھا۔ اس کی مثنوی "یوسف زلیخا" بہت مشہور ہے۔ اس نے [illegible] ریختی کا رنگ پایا جاتا ہے۔ اس طرز کلام کا لکھنے والا یہ پہلا شخص ہے۔

دکنی اردو کا تیسرا مرکز گولکنڈہ قطب شاہیوں کا دارالحکومت تھا۔ قطب شاہی بادشاہ علم و ہنر کے بہت قدردان تھے۔ خاص کر اس خاندان کا [illegible] سلطان محمد قلی (۹۸۸ھ ۱۵۸۰ء تا ۱۰۲۰ھ م ۱۶۱۱ء) کے عہد میں ملک نے خوش حالی میں اچھی ترقی کی اور علم و فن اور شعر و [illegible] بادشاہ خود بڑا اچھا شاعر تھا۔ اس کا کلیات بہت ضخیم ہے۔ وہ بہت پر گو اور قادر الکلام شاعر ہے۔ غزل کے علاوہ اس [illegible] مرثیے وغیرہ بھی لکھے ہیں۔ متعدد قصیدے اور مثنویاں، مناظر قدرت، تہوار، رسوم [illegible] موسم، میوے اور [illegible] باغات [illegible] کلام بہت قدیم ہے لیکن اگر زبان کی قدامت سے قطع نظر کی جائے تو اس کے کلام میں وہ سب خوبیاں موجود ہیں [illegible] اس کا مختصر کلیات (مرتبہ ۱۰۲۵ھ) [illegible] بیان پایا جاتا ہے۔

[illegible] سلطان محمد قطب شاہ بھی (۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ) [illegible] کلیات مرتب کیا [illegible] شاعر تھا [illegible]
[illegible] جانشین عبداللہ قطب شاہ بھی شاعر تھا اور اس کا دیوان بھی موجود ہے۔

[illegible] قطب مشتری (۱۰۱۸ھ) ہے۔ یہ [illegible]

[illegible]

اور [illegible]

[illegible]

ان سب [illegible]

اس کے [illegible]

جیسا کہ خود اس نے بیان کیا ہے جامع [illegible] ہے

بانان جو تھی تخت ساں	جب [illegible] بہرت سال
نو سو بھئے اسکے نو	یوں کہہ کہیا اشرف تو

اگرچہ یہ مثنوی دکنی اردو کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتی ہے اور بہت قدیم ہے لیکن اس کی زبان سادہ اور سہل ہے اور دوسری دکنی کتابوں کی طرح جو بعد کی اور جیسا بعد کی ہیں مشکل اور سخت نہیں ہے۔ اس میں شعیت دکنی الفاظ اور محاورے اور ہندی اور سنسکرت کے مشکل الفاظ نہیں ہیں۔

بہمنی شاہی حکومت کا بانی قاسم برید تھا اس نے اپنا دارالحکومت بیدر قرار دیا جو بہمنی سلطنت کا بھی دارالخلافہ تھا۔ اس کے فرزند امیر برید کے عہد میں ایک شاعر شہاب الدین قریشی گذرا ہے۔ اس کی کتاب "بھوگ بل" کوک شاستر کا ترجمہ ہے۔ امیر برید کے نام منقول ہے۔

اپنے شہر بیدر بیچ تخت گاہ	کہ تھا امیر شاہ سا بادشاہ

کتاب کے آخر میں سن تصنیف بھی بیان کر دیا ہے۔

ہزار تیوس ستے سال جب	کیا میں مرتب سو خوش حال سب

گجرات و دکن میں اردو کی ترویج و فروغ کا یہ تذکرہ شہنشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے عہد تک پہونچتا ہے۔ ایک سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات صاف معلوم ہوئی کہ بتدریج ہندی کے غریب نامانوس اور نامانوس الفاظ کم ہوتے گئے اور عربی فارسی الفاظ بڑھتے گئے حتیٰ کہ ولی دکنی دکنی کے کلام میں ہندی فارسی الفاظ کا مناسب توازن نظر آتا ہے۔ یہ ہونا لازم تھا کیونکہ اردو شاعری کے تمام اصناف فارسی کے مرہون منت ہیں اوزان کے ادا کرنے میں بھی فارسی کی تقلید کی گئی ہے۔ اسی لئے اب تک اردو شاعری پر فارسی شاعری کا رنگ چھایا رہا۔ عہد عالمگیر کے آخر زمانہ میں اردو کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ ولی دکنی کا انتقال شہنشاہ عالمگیر کی وفات کے ایک سال بعد ۱۱۱۹ھ میں ہوتا ہے۔ اس سے چند سال پہلے (۱۱۱۲ء) میں وہ دلی آیا تو اہل ذوق اس کا کلام سن کر بہت محظوظ ہوئے اور وہ رنگ ایسا مقبول ہوا کہ وہاں کے موزوں طبع حضرات نے اسی انداز میں غزل گوئی شروع کر دی۔ اس سے قبل شمالی ہند میں کوئی غزل گو شاعر نہیں پایا جاتا۔ ولی کو بھی دلی کی زبان سے فیض پہونچا۔ ولی غزل کا شاعر ہے اور اس کی زبان میں جو کرختگی اور ناہمواری تھی وہ دلی کی زبان میں نہیں۔ اس کی زبان میں جو اسلاست اور بیان میں ندرت اور [illegible] پائی جاتی ہے اس نے [illegible] کے انگاڑ نے اس کے کلام میں وہ مستقل پیدا کر دی ہے۔ اس نے فارسی اور ہندی الفاظ کا مناسب تناسب قائم رکھا ہے۔ ولی کا ہر [illegible] اگرچہ بہت بلند پایہ نہیں لیکن کا [illegible] پستی کی طرف بھی نہیں جاتا۔

دکن میں ولی کے ہم عصر اور بھی کئی شاعر تھے۔ ان میں صرف چند قابل ذکر ہیں۔ گجراتی معنف یوسف زلیخا (۱۱۰۸ھ) قاضی محمد بحری جن کی مثنوی "من لگن" دکن میں بہت مقبول ہوئی اور بار بار طبع ہوئی۔ ان کا کلیات بھی ہے جس میں غزلوں کے علاوہ [illegible] کلام بہت پایہ کا ہے۔ وجیہ الدین وجدی جن کی مثنوی "پنچھی باچا" (۱۱۳۱ھ) ترجمہ منطق الطیر بہت مشہور ہے۔

[illegible] شاہ (۱۱۳۱ھ تا ۱۱۹۹ھ) [illegible]

دلی [illegible] متوفی ۱۱۹۸ھ [illegible]

[illegible]

[illegible] ان کا طرز بیان ایک صاف روان اور تجربہ اور تاثیر سے خالی نہیں۔ ان کا [illegible] وقت [illegible]
[illegible] معرفت کی [illegible] جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ [illegible] میر درد کے [illegible] تھے جب دلی [illegible] پہ آفات نازل ہوئیں اور شعر و سخن کا کوئی سرپرست نہ رہا تو شعرائے عظام دلی کو خیرباد کہنے پر مجبور ہوئے۔ مگر خواجہ صاحب کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔

[illegible] اردو کے کمال کا [illegible] میر تقی میر (۱۱۳۵ھ م ۱۷۲۲ء تا ۱۲۲۵ھ م ۱۸۱۰ء) کا دور ہے۔ میر کی شاعری میں ان کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ ان کے والد ایک گوشہ نشین متوکل درویش تھے۔ ان کی تمام عمر کا بڑا حصہ شب و روز درویشوں کی صحبت میں گذرا۔ دس گیارہ برس کی عمر میں یتیم ہوگئے اور تلاش معاش میں گھر چھوڑنا پڑا۔ ناصر شاہ کے حملے کے بعد احمد شاہ درانی کے حملوں، مرہٹوں اور جاٹوں کی غارت گری نے اس [illegible] وقت ملک میں [illegible] ان تمام واقعات کا اثر ان کے دل پر بہت گہرا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں حرمان و یاس، درد و الم اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام عاشقانہ ہے۔ اور جذبات کے اظہار میں خلوص پایا جاتا ہے۔ اور زبان میں خاص گھلاوٹ اور شیرینی، سادگی اور موسیقیت ہے۔ یہ خوبیاں کسی اور شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ غزل کے بادشاہ ہیں۔ اردو کا کوئی شاعر اس میں ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ [illegible] شعرائے انہیں استاد مانا ہے۔ ان کی بعض مثنویاں بھی بڑے پائے کی ہیں۔ وہ بہت بلند سیرت کے شخص تھے خودداری اور بے نیازی [illegible] اور اسی وضع سے ساری عمر نبھا دی۔ جب شاہ عالم کے زمانہ میں شعر و سخن کی پہلی سی قدر اور سرپرستی نہ رہی تو دلی کی ساری [illegible] میر صاحب بھی نواب آصف الدولہ کی طلب پر لکھنؤ چلے گئے۔

[illegible] ان کے ہم عصر سودا (۱۱۲۵ھ م ۱۷۲۲ء تا ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۰ء) کو وہ مرتبہ حاصل نہیں۔ ان کے دیوان میں بھول کے ساتھ کانٹے بھی [illegible] [illegible] صاحب [illegible] تھے۔ اپنے مزاج پر قابو نہیں رکھتے تھے اور اکثر اوقات خواہ مخواہ جھگڑے مول لیتے تھے۔ اور طویل طویل ہجویں کہتے تھے لیکن [illegible] کہ ان [illegible] اچھا ہے وہ بہت قادر الکلام شاعر تھے اور ان کا شمار اردو کے اول درجے کے باکمال اساتذہ میں ہے اور [illegible] ان کے قصائد کا جواب نہیں رکھتے۔ ان کے کلام میں شکوہ بیان میں قدرت اور وسعت تقریباً یائی جاتی ہے۔ وہ ہر صنف سخن پر قادر تھے۔
میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ھ م ۱۷۸۶ء) اپنے زمانے کے رسوم و عادات کے مصور ہیں۔ وہ ہر چیز کو صحیح طور سے اور اصل رنگ میں دکھاتے ہیں۔ [illegible] ان کی مشہور مثنوی سحر البیان ہے [illegible] انسانی جذبات و مناظر کا بیان موجود ہے۔ حسن بیان اور لطف زبان [illegible] مثنوی بہت مقبول ہوئی اور اس کا جواب نہیں دکھائی دیتا [illegible] ہے۔
مصحفی (متوفی ۱۲۴۰ھ م ۱۸۲۵ء) بہت پرگو شاعر اور بہت مشاق شاعر تھے۔ [illegible] ان کا کلام [illegible] [illegible] میں صفائی اور روانی [illegible] ہوئے [illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے۔ [illegible] اس ادب میں ایک [illegible]

[illegible] زندگی کا گہرا [illegible] ہے اس کی [illegible]

بڑی بہت مقبولیت ہے۔ اگرچہ اس کے [illegible] ادب کو ایک طرح سے نقصان پہنچا کیونکہ اس نے [illegible]

پیدا کی ہے۔ اس کا [illegible] جانب ہے [illegible] اس کی کتابت [illegible] ہے اور اس کا کلام [illegible]

اس کی کتاب [illegible] شاہد ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جو ایک اہل زبان نے [illegible] اور لسانیات پر لکھی ہے۔ اگر وہ [illegible]

اپنی ہستی کو نہ کھو دیتا تو ہوا کی فکر کا ہوتا اور شاید بعض صورتوں میں وہ اردو کے حق میں بے نظیر کام کرتا۔

نظیر (متوفی ۱۸۳۰ء م ۱۲۴۶ھ) اردو ادب کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اس کے ساتھ بہت نا انصافی کی گئی ہے۔ چنانچہ مشاعروں اور تذکرہ نویسوں نے اسے سرے سے شاعر ہی نہیں سمجھا۔ اس کی قدر سب سے پہلے یورپ والوں نے کی۔ لیکن انہوں نے بھی اس کے مقلدوں نے اسے اس قدر بڑھایا جس کا شاید وہ مستحق نہ تھا۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اردو ادب میں وہ اپنی وضع کا ایک ہی شاعر ہے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی شاعر ہے۔ اس میں پاک دلی اور معصومیت کے ساتھ انتہا درجے کی رندمشربی بھی پائی جاتی ہے۔ لیکن بے اعتدالی جو کہیں کہیں پائی جاتی ہے لطف سے خالی نہیں۔ اگرچہ بعض اوقات شہوانی خواہشیں اسے گمراہ کر دیتی ہیں۔ مگر اس کا کمال اس کا ساتھ دیتا ہے۔ اس کی شاعری شہوانی جذبات کو مشتعل کرنے والی نہیں ہے۔ اس کا بہترین کلام وہ ہے جس میں وہ اپنے دلیس کا راگ گاتا ہے۔ اور جس عنوان سے ان چیزوں پر نظمیں لکھتا ہے، چھوٹے بڑے بچے امیر غریب سب پڑھتے اور مزہ لیتے ہیں۔ اپنے وطن کی ہر چیز کی طرح اس کی طبیعت زرخیز اور مالا مال ہے۔ اس کی اکثر نظمیں بہت پرزور اور جاندار ہیں (مثلاً بنجارا۔ ریچھ کا بچہ۔ گلہری کا بچہ) جو مجاز سے حقیقت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ دراصل ہندوستانی معاشرے کی [illegible] پر تنقید ہے۔ اس نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جن میں ہندوستان کے تہواروں کا پرلطف سماں کھینچا ہے۔ اس نے ہندوستان کے موسموں کا حال جس لطف و خوبی سے لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کا عاشق ہے۔ اس کا یہ کمال کا لیا [illegible] سے کم نہیں۔ وہ اپنے اسلوب بیان میں بے بہا ہے۔ اس کا کلام عیب سے خالی نہیں۔ وہ لفظوں کے انتخاب میں لاابالی ہے اور اپنے بیان کی روانی میں کسی چیز کا [illegible] نہیں۔ اس کے کلام سے ظاہر ہے کہ وہ عوام کا شاعر ہے۔

ذوق (۱۲۰۴ھ م ۱۷۸۹ء تا ۱۲۷۱ھ م ۱۸۵۴ء) فارسی شعرا کے ایک طویل سلسلے کا مقلد ہے۔ اس کے قصیدے جو زیادہ تر اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہیں، اردو ادبیات میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ غزلوں کی حالت دوسری ہے۔ اس کی طبیعت غزل کے لئے مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ فن کے لحاظ سے اس کی غزلیں بے عیب ہیں مگر ان میں شعریت کم ہے۔ وہ محبت کی گرمی اور جوش سے خالی ہیں۔

مومن (۱۸۰۰ء تا ۱۸۵۲ء) ایک عاشق مزاج لذت کا دلدادہ حسن پرست شاعر تھا۔ اگرچہ اس نے قصیدے، مثنوی وغیرہ بھی [illegible] طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کا اصل رنگ غزل ہے۔ جس میں وہ عشقیہ معاملات اور واردات کو پیش کرکے پیچیدہ خیالات کو ادا کرتے ہیں۔ اس نے اکثر نازک پیرایہ اختیار کیا ہے لیکن اس کے کلام میں [illegible] اثر نہیں۔ اس کا عشق صادق نہیں۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر آخری مغل بادشاہ بہت پرگو شاعر تھے۔ ان کے چار ضخیم دیوان موجود ہیں۔ بہت سی اصناف سخن میں شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ [illegible] جو ان کے عہد کے ملک الشعراء تھے۔ ذوق کی وفات کے بعد اپنا کلام مرزا غالب کو دکھانے لگے۔ [illegible] نہیں اور بنے تنے قاعدے اور بعض زبان کا بہت شوق تھا۔ لیکن اکثر اشعار جن میں

[illegible]

[illegible]

غالب نے [illegible] فارسی [illegible] شروع کر دی [illegible] اس کا کمال [illegible] بظاہر ہوتا ہے [illegible] اس کا اثر اس کے کلام میں درد [illegible] پیدا ہو گیا ہے۔

غالب نے چند دنوں میں بہت رنگ تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے ہم عصروں نے اس کی قدر نہ کی۔ غالب کے کلام سے اردو کی جدید شاعری کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس میں جدت، تخیل کا زور اور ایسی بلند پروازی ہے جو اردو کے کسی شاعر میں نہیں پائی جاتی۔ غالب کی بدولت اردو شاعری میں فلسفہ کا ذوق پیدا ہوا جس سے وہ اب تک محروم تھی۔ فلسفے، تصوف اور سوز و گداز نے مل کر اس کے کلام میں ایک عجیب رنگ پیدا کر دیا ہے۔

غالب کا طرز مرصع اور دل نشین ہے۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ اکثر اوقات اس کا طرز ادا فارسی رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جدت پسندی کا [illegible] تھا کہ اس کے خیالات کی نزاکت اور جدت کسی آسان طرز میں ادا نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن جہاں کہیں اس نے صاف شعر کہے ہیں وہ انتہا درجے کے سہل ممتنع ہیں۔ غالب نے اردو شاعری میں ایک نئی روح پیدا کی، جس میں اب تک کی جدید شاعری کا ہیولا موجود تھا۔ وہ بہت قدردان، ظریف، خوش صحبت اور شاندار شخص تھا۔ دہلی میں ۱۸۶۹ء میں انتقال کیا۔

مرثیہ: بین کرنا اور آنسو بہانا دنیا کی شاعری کا ایک قدیم طرز ہے۔ لیکن مسلمانوں کی المیہ شاعری امام حسینؓ کی شہادت سے ہے۔ ایران میں بھی اس پر بہت سے مرثیے لکھے گئے۔ محتشم کاشی کی نظم بہت مشہور ہے۔ محتشم ایرانی تھا۔ اس کا نام [illegible] کا سلسلہ ہے۔ اسی کی تقلید ہندوستان میں [illegible] شاعروں نے کی۔ انیس (۱۸۰۲-۱۸۷۴ء) اور دبیر (۱۸۰۳-۱۸۷۵ء) محتشم کاشی سے سبقت لے گئے ہیں۔ لیکن ان [illegible] میں بھی [illegible] حسن بیان اور زبان اور مذہب کے جوش نے ان مرثیوں کی قدر و منزلت بہت بڑھا دی ہے اور اس کی وجہ سے اردو ادب میں مرثیہ کو ایک خاص مقام حاصل ہو گیا ہے۔

میر انیس کے کلام میں [illegible] بیان کئے گئے ہیں [illegible] ان کی تاریخی حیثیت [illegible]

[illegible]

شاعری کا دائرہ محدود [illegible] ہے اور رعایت لفظی، مناظرہ کی پامال تشبیہوں اور استعاروں پر ہے۔ اور ابتذال کی طرف مائل ہے۔
واجد علی شاہ کی مثنوی ... شاعرانہ صنعت سے کمال کا نمونہ ہے۔ لیکن رعایت لفظی کا خبط عجیب حد تک پہنچ گیا ہے۔ شوق کی مثنویاں لکھنؤ کی عیاشانہ سوسائٹی کا عکاس ہیں۔ جس کا اصل منبع واجد علی شاہ کا پھیلایا ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ان مثنویوں کی زبان کی صفائی، بے ساختگی اور محاورے اور بول چال کی خوبی قابل داد ہے۔ لیکن شاعر خوش فعلیوں پر جان دیتا ہے اور تلون کا شکار ہے۔

داغ اور امیر کے بعد میر تقی کی قدیم (کلاسی) کی بنیاد ڈھے گئی۔ دونوں کا کلام پستی کی طرف مائل ہے۔ یہاں مردہ روایت کے علمبردار ہیں جس کی ساری کوشش بے اثر چھوٹی چھوٹی خوش نمائیوں میں صرف ہوتی تھی۔ لیکن داغ زبان کا بہت بڑا استاد ہے۔ اس کی زبان کی سادگی، روانی اور بے ساختہ پن اور اس زبان میں اظہار خیال حیرت انگیز ہے۔ اس نے اردو کو روزمرہ اور محاورے اور شوخ اسلوب بیان سے مالا مال کر دیا ہے۔ یہ بات داغ پر ختم ہے۔ اس کا اثر اس کے ہم عصر شاعروں پر بھی ہوا۔

جب ادب ایک تسخر اور نقالی ہو گیا تو ملک کی داخلی زندگی پر مغرب کا اثر پڑنا شروع ہوا۔ یہ ہندوستانی طبائع کے لئے خیالات کی نئی دنیا تھی۔ پرانی روایات بدل گئیں۔ جدید سائنس کی بدولت باطنی خودی کی جگہ ظاہری فن نے لے لی۔ ذوق کے اصولوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ مسجع اور مقفیٰ زبان کی بجائے سادگی اور زنانہ پن کی بجائے مردانہ پن اور خود اعتمادی پیدا ہو گئی۔

اسی عہد کی ایک ممتاز ہستی محمد حسین آزاد (متوفی ۱۹۱۰ء) ہیں یہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مغرب کی ابلتی ہوئی شراب سے اپنا جام بھرا۔ وہ زبان کے محقق اور مسجع نثر کے استاد تھے۔ مگر وہ بڑے شاعر نہ تھے۔ وہ صرف مٹی کی مورتیں بنانا جانتے تھے ان کے ہم عصر حالی کی حالت بالکل دوسری تھی۔

خواجہ الطاف حسین حالی (۱۲۵۳ھ م ۱۸۳۷ء تا ۱۳۳۲ھ م ۱۹۱۴ء) پانی پت میں پیدا ہوئے۔ جہاں ہندوستان کی تین فیصلہ کن لڑائیاں ہوئیں اور سلطنتوں نے پلٹا کھایا۔ ان کا لڑکپن اور جوانی دلی میں بسر ہوئی۔ یہ مغلیہ سلطنت کے زوال کا زمانہ تھا۔ اس میں سیاسی اور معاشی تبدیلیوں کا ہونا ناگزیر تھا۔ مغلیہ سلطنت کے اقبال کا سورج انہوں نے اپنی آنکھوں سے ڈوبتا دیکھا تھا۔ ان تمام واقعات کا گہرا اثر ان کے قلب پر ہوا۔ ادبی فیض انہیں شیفتہ کی صحبت اور غالب کی شاگردی سے پہنچا۔

ان کی ابتدائی شاعری عام طرز کی تھی۔ لیکن جدید اثر نے ان کی شاعری کا رخ نیچرل ازم اور حقیقت نگاری کی طرف پھیر دیا۔ ان کی قومی اور اخلاقی شاعری علی گڑھ تحریک کا نتیجہ ہے۔ سر سید احمد خاں کی تحریک سے ملک میں ایک نئی تہذیب کا دور شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی حاضی زندگی میں ایک نئی روح پھونک دی۔ حالی نے ان جدید خیالات کا گیت گایا۔ اسلامی حکومتوں کے زوال نے ایک عجیب درد پیدا کر دیا تھا اس نے اس کھوئے ہوئے عظمت اور جلال کو دلی سوز و گداز اور درد سے بیان کیا ہے۔ اس نے اپنے مسدس (مد و جزر اسلام) میں تاریخ زمانہ گذشتہ ہی کو نظم نہیں کیا بلکہ ہندوستانی مسلمانوں کی قومی زندگی کا مرقع بھی حیرت انگیز صفائی سے پیش کیا ہے۔ اگرچہ اس کی شاعری کی بنیاد زوال یافتہ قوم کی گہری بے چارگی اور مایوسی پر ہے جسے پڑھ کر بے اختیار دل بھر آتا ہے۔ مگر وہ پھر بنانا اور تعمیر کرنا چاہتا ہے۔

حالی اگرچہ انگریزی زبان و ادب سے واقف نہ تھے۔ تاہم وہ ان چند لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے باوجود زبان نہ جاننے کے بھی انگریزی خیالات و ادب کی ایک گونہ ترجمانی کی ہے۔ انہوں نے ادب میں ایک نئی جان ڈال دی۔ شاعری حالی کے لئے صداقت کا جذبہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات صداقت کی خاطر فن کے حسن سے بھی دست بردار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی کا بڑا نقاد ہے۔ اس کی زبان پاک صاف اور پر اثر ہے اہل چال کے وہ ... [illegible] ... اس وقت تک معیاری رسائی نہیں ہوئی تھی اس نے اپنی نظموں میں بڑی خوبی سے استعمال کئے ہیں۔ اس نے اپنی قوم کی بے دیانتی ... بڑی دردمندی سے کی ہے۔ مناجات بیوہ اس ... [illegible]

کی نظم جو کہ سے پڑھ کر شدت سے دل بھی پگھل جاتا ہے۔ حبیب کی وداع اس کی ایک دوسری نظم ہے جس میں اپنے ملک کی خستہ حالت اور بے بسی کو موثر انداز سے بیان کیا۔ مرثیہ اردو میں شہدائے کربلا کے لئے خاص تھا حالی نے قوم کی بہتری پر گو دو ہستیوں کے ایسے مرثیے لکھے ہیں جن کی نظیر ہماری زبان میں اس سے پہلے نہ تھی۔ غالب کا مرثیہ اردو ادب میں شاہکار کا درجہ رکھتا ہے۔ حکیم محمود خاں کا مرثیہ گویا دل کا مرثیہ ہے۔

مغربی خیالات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو دیکھ کر جو قدیم روایات کو بہائے لئے جا رہا تھا۔ اکبر حسین (۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء) نے مشرقی تہذیب و روایات کی حمایت میں اپنی آواز بلند کی اور اپنی طنز و تضحیک کے نشتر یورپ اور اس کی فضولیات کے پرستاروں پر برسانے شروع کئے۔ اس نے علی گڑھ تحریک کو بھی نہیں بخشا۔ علی گڑھ اور سر سید احمد خاں تو گویا اس کے مزاح و طنز کے ہدف تھے۔ اس کو اندیشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یورپ کی مادیت کا سیلاب اسلام اور اسلامی ثقافت کو لے ڈوبے۔ ہر نیا خیال اور جدید تحریک کو وہ بدگمانی کی نظر سے دیکھتا اور اس کے ہاتھوں اس کی بری گت بنتی۔ خصوصاً ان تنگ نظر ہندوستانیوں سے اسے سخت نفرت تھی جو اندھا دھند اہل یورپ کی نقالی کرتے تھے۔ اگرچہ خود اس کی نظر بھی محدود تھی۔ نئے خیال سے بدکتا اور مذہب کے نام پر اس کا مضحکہ اڑاتا تھا۔ اس کا اسلوب بیان بہت ستھرا، پرلطف اور پرمزاح ہے اس کی طنز بڑی گہری اور کاری ہوتی ہے۔ اس وجہ سے وہ بہت مقبول ہوا لیکن یہ مقبولیت اب کم ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کا اس قسم کا کلام کا معتد بہ حصہ وقتی تھا اب اس کا زمانہ نکل گیا ہے۔ مگر اس میں شبہ نہیں کہ اس کے کلام کے بعض حصے اس زمانے کی نفسیاتی تنقید اور خوبی بیان کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

شاعری کے اس جدید دور میں تین شخصیتیں دوسروں سے الگ نہایت بلندی پر نظر آتی ہیں۔ غالب، حالی اور اقبال۔ ان تینوں کے کلام نے مردہ شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ غالب نے اگرچہ کوئی نئی راہ نہیں نکالی لیکن اس کی جدت فکر، بلندی، تخیل اور بیان کی شوخی نے پرانی شاعری میں نئی جان ڈال دی۔ اور باوجود زندہ دلی کے اس کے کلام میں یاسیت جھلکتی ہے۔ اس کے بعد ہی زمانہ بدلتا ہے اور اس کے ساتھ ہماری شاعری بھی بدل جاتی ہے۔ حالی نے آکر ہماری شاعری کا رخ یکسر بدل دیا۔

اقبال میں گو غالب جیسے تخیل کی بلند پروازی اور حالی کا سا سوز و گداز نہ ہو لیکن اس کے کلام میں جو ولولہ، جوش اور تخلیقی قوت ہے وہ کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ اگرچہ اس نے فرنگی تہذیب، جمہوریت، وطنیت اور مادیت کے بت بڑی بے دردی سے توڑے ہیں لیکن ہماری شاعری میں سب سے زیادہ مغربی خیالات سے تتبع اسی نے حاصل کیا ہے۔ وہ بہت بڑا مفکر اور عظیم المرتبت شاعر ہے۔ اس نے ان حکیمانہ افکار کو جو مغرب و مشرق کی حکمتوں کے گہرے مطالعہ، ذاتی غور و فکر اور زندگی کے تجربات سے حاصل کئے تھے، اپنے جذبات و وجدانیات میں ڈبو کر شعر کے قالب میں ایسے لطافت، پر جوش اور انقلاب انگیز پیرایہ سے ادا کئے ہیں کہ ان کے پڑھنے سے مردہ دلوں میں بھی زندگی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اس نے مسلمانوں کو جو تہذیب سے مرعوب اور بے ایمان، وطن سے مجبور، احساس کمتری میں مبتلا، مایوس و دل شکستہ تھے عزت نفس اور خودداری کا پیغام سنایا اور خودی کا جدید فلسفہ پیش کر کے ان کی ہمتوں میں بلندی اور عزائم میں استقلال پیدا کیا۔ ابتدا میں اس نے مقبول عام شاعری کے بعد وطنیت کے گیت گائے ہندوستان وطن کا ہر ذرہ دیوتا نظر آیا۔ اور نئے شوالے کی بنیاد استوار کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ملک کی اجتماعی زندگی اور بنیادی اصولوں پر بھی نظر ڈالی اور ہندو مسلمان کو بیداری کا پیغام دیا۔ آخر میں وہ وطنیت سے نکل کر تعمیر ملت کی طرف مائل ہو گئے اور بنی نوع انسان کو اپنا پیغام دیتے ہیں یعنی وہ قوموں کو روحانی رشتے میں منسلک کرنا چاہتے ہیں جو اسلام کے بنیادی اصولوں کی پیروی میں ہے۔ ان کے خیال میں اسی میں بنی نوع انسان کی مشکلات و مصائب کا حل اور ان کی نجات ہے۔

اقبال نے اپنے کلام سے اردو زبان کو اس قدر مالا مال کر دیا ہے کہ اس سے پہلے اسے نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اردو کی تنگ دامانی کی شکایت اس کے بعد باقی نہیں رہی۔ وہ بلاشبہ شاعر مشرق کے خطاب کا مستحق ہے۔

[illegible] شاعری [illegible] کی اصلاح [illegible]
کرنے لگے۔

غزل اپنی روایتی حسنِ بیان، سبک پن، رمزیت، اشاریت کی وجہ سے ہماری شاعری پر چھائی رہی۔ اس کا میدان حسن و عشق ہے۔ اگرچہ [illegible] ادھر بات بھی کہی جاتی ہے تو اسی کو اول چال اشاروں کنایوں میں کہنی پڑتی ہے۔ غزل کا قدیم اسلوب داغ پر ختم ہو جاتا ہے۔ حالی کی تنقید نے ایک طرف تو ابتذال و پستی سے بچایا اور دوسری طرف لفظی صنعت گری اور بے جان و بے لطف قافیہ بندی کی مشق سے نجات دلائی۔ حالی کے پیش نظر غزل کی اصلاح تھی۔ اس کے سب آثار چاہے اور محاسن و عیوب اس کی نظر میں تھے۔ اس کی اصلاح کی محرک وہ بد ذوقی تھی جس نے غزل کو لفظوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ اس میں خیال کی جدت تھی نہ تازگی۔ خیال پس پشت جا پڑا تھا۔ حالی کی تنقید نے غزل کو پستی اور لفظی شعبدہ بازی سے نکالا۔ مضامین کے لحاظ سے وسعت کا مشورہ دیا اور اس صنفِ سخن کو زندگی سے زیادہ قریب لانے کی طرف توجہ دلائی۔ صداقت اور خلوص لازم شرط تھی۔ حالی نے خود بھی اس پر عمل کر کے اچھی مثال پیش کی۔ اس کی غزلیں بھی حسن و عشق سے خالی نہیں۔ ان میں عشق کے نازک جذبات و احساسات اور انسان کی نفسی کیفیات کو بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ چونکہ اس کی شاعری کا مقصد قومی اصلاح تھا اس لئے یہ خیالات بھی اس کی غزل میں داخل ہو گئے ہیں۔ اس سے بعض وقت غزل کی وہ شان باقی نہیں رہتی جس سے غزل عبارت ہے۔ تاہم اس سے وسعت کا راستہ کھل گیا۔ بعد کے شعرا اس کی تنقید اور مثال سے کسی نہ کسی صورت سے ضرور متاثر ہوئے۔

غزل کی قدیم روایت اس وقت حسرت، اصغر اور فانی کے دم سے قائم تھی۔ حسرت کی شاعری خالص عشقیہ ہے جہاں تک غزل کا تعلق ہے وہ اپنے وقت کے مصحفی ہیں۔ حسرت کی شاعری خالص عشقیہ ہے وہ محبوب کے انداز بیان کرتے ہیں۔ حقیقت سے ہم کنار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے عشقیہ واردات کو سچے اور صاف طور سے بیان کیا ہے۔ یہ صوفیا کا عشق نہیں بلکہ عام انسانوں کا عشق ہے اس کی غزلوں میں کہیں کہیں سیاسی رنگ بھی آ گیا ہے مگر بے اثر ہے۔

غزل میں جدت کا رنگ بھرنے میں اصغر کا بھی حصہ ہے ان کا میلان اگرچہ صوفیانہ خیالات کی طرف ہے اور ان کی نظر [illegible] حیات پر جھکی ہے لیکن انسانی حسن کی کیفیات اور اثر کو بھی بڑی خوبی سے اور بعض اوقات اور انداز سے بیان کیا ہے۔ فانی زندگی سے بیزار نظر آتے ہیں ان کے کلام پر سراسر حزن و ملال اور یاسیت چھائی ہوتی ہے۔ مگر باوجود اس کے وہ حسن و عشق کے اسرار بیان کر جاتے ہیں جو غزل کے لوازم میں سے ہیں۔ اصغر اور فانی دونوں جذبات کی رو میں بہہ نہیں جاتے اور باوجود وفورِ جذبات کے ہوش و خرد کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ بخلاف ان کے جگر حسن و عشق کا شاعر اور ان کی نفسیات کا ماہر ہے۔ اس نے غزل میں بڑی رنگینی اور مستی پیدا کی ہے۔ اس وقت جب کہ نظم کے مقابلے میں غزل کا اقتدار گھٹتا نظر آ رہا ہے مگر جگر نے اس کی پشت پناہی کی اور اپنے عاشقانہ اور سرور افزا کلام سے تغزل کا رنگ جما دیا۔

لکھنؤ بھی جدید اثرات سے نہ بچا۔ وہاں کے شعرا کو اپنے پرانے غیر شاعرانہ طرز کو خیرباد کہنا پڑا۔ انہوں نے تصنع اور لفظی صناعی کو ترک کر کے سادگی اور حقیقت کو پیش نظر رکھا۔ چکبست کی غزلیں حسن و عشق سے خالی ہیں۔ وہ وطنیت اور ہوم رول کا راگ گاتے ہیں۔ ان کی نظر غزلوں میں بھی سماجی اور سیاسی مسائل کی طرف پڑتی ہے۔ لیکن انہوں نے آداب غزل کو ترک نہیں کیا۔ شعرائے لکھنؤ نے ناسخ کی تقلید چھوڑ کر غالب و میر کی پیروی کی طرف توجہ کی۔ صفی، عزیز، ثاقب، آرزو، اثر کا کلام اس کا شاہد ہے۔ خاص کر آرزو نے سادہ اردو کا اپنی "سریلی بانسری" میں ہندی کے سانچے میں خوب ڈھالا ہے اور ایک نئی فضا پیدا کر دی ہے۔ اثر کی غزل میں سادگی، صفائی، نفاست، اور رنگینی پائی جاتی ہے۔ جس سے ان کی غزلوں میں تازگی پیدا ہو گئی ہے۔ یگانہ میں عاشقانہ رنگ ذرا ابھرا ہے۔ اور وہ کسی کے سامنے جھکنا نہیں جانتا۔ اس کی خودداری اور بے باکی حد سے بڑھی ہوئی ہے۔ اس نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں کی طرح مسائل حیات پر بھی نظر ڈالی ہے وہ حسن و عشق کے معاملات کو بھی فلسفیانہ رنگ میں پیش کرتا ہے۔ یگانہ نے غزل میں جدت پیدا کی ہے۔

اقبال کے بعد جس شاعر نے ملک میں عام مقبولیت حاصل کی وہ جوش ہے۔ اگرچہ اس کے کلام میں وہ گہرائی نہیں جو اقبال کے کلام میں ہے پھر وہ حسن پرست ہے، شاعر شباب بھی ہے اور شاعر انقلاب بھی۔ اس کے یہاں رومان اور انقلاب باہم گھل مل گئے ہیں۔ وہ بہت پر جوش گو اور پر جوش فکر شاعر ہے۔ اس کے کلام میں شان و شکوہ اور دبدبہ ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بغیر جھجک کے آزادی کے ساتھ کہہ دیتا ہے۔ اسے اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ الفاظ اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ اس کے کلام میں دریا کی سی روانی ہے لیکن بعض وقت یہ روانی خوفناک طغیانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ خصوصاً جب مظلوموں اور مزدوروں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر سرمایہ داروں اور حکومتوں پر گرجتا ہے یا جب وہ فرنگی سیاست کی کامستبداد اور اپنی قومی معاشرے کی خرابیوں اور بدکاریوں کی قلعی کھولتا ہے۔ وہ اب غزل سے بیزار ہے۔ غزل میں اس کے خیالات کی گنجائش نہیں۔ حالی اور اقبال نے بھی غزلیں کہیں ہیں اور اپنے افکارات ہیں ادا کئے ہیں اور غزل کے لئے مسلسل غزلوں سے بھی کام لیا ہے۔ مگر غزل مربوط اور مسلسل خیالات کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ اسی وجہ سے حالی اور اقبال نے دوسری اصناف سخن یعنی مثنوی، قطعہ، ترکیب بند وغیرہ سے کام لیا ہے۔ جوش کو بھی یہی کرنا پڑا۔ اب وہ نظم کا شاعر ہے۔ اس کی بعض خاص نظمیں زندہ رہنے والی ہیں۔ اس کا میلان اشتراکیت کی طرف ہے مگر عمل کچھ اور کہتا ہے۔

سیماب بہت پر گو شاعر ہے۔ ہر صنف میں طبع آزمائی کی ہے۔ وہ فن کی طرف زیادہ مائل ہے۔ اس کے کلام میں ایسے جذبات و احساسات نہیں پائے جاتے جو دل پر اثر کریں۔ قریب قریب یہی کیفیت علی اختر کی ہے۔

خالص غزل گویوں کا زمانہ حسرت، اصغر، فانی اور جگر تک رہا۔ اس کے بعد نئے شاعروں کی آمد ہوئی جو نظمیں لکھتے ہیں۔ مگر غزل نے ساتھ نہ چھوڑا۔ بلکہ اس زمانے میں اسے اور فروغ ہوا اور مشاعروں نے اسے اور رونق بخشی۔ طرحی مشاعروں کی بجائے غیر طرحی مشاعرے ہونے لگے۔ مشاعرہ غزل ہی کی خاطر بنا تھا اور غزل ہی مشاعروں پر چھائی ہوئی تھی۔ اب غزل کے ساتھ نظمیں بھی پڑھی جانے لگیں۔ نئے شاعر نظموں کے ساتھ غزلیں بھی لکھتے ہیں۔ غزل کے دو مصرعوں سے ان کی سیری نہیں ہوتی۔ اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، ساغر نظامی، احسان دانش، روش صدیقی کا شمار انہیں شعرا میں ہے۔ انہوں نے مختلف قومی سماجی اور ملکی موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں۔ اختر شیرانی اپنے وقت میں رومانیت کا امام تھا۔ اس کی شاعری میں ترنم، نغمگی، شادابی اور شدید عاشقانہ جذبات پائے جاتے ہیں۔ سانیٹ کو اردو میں شیرانی نے رواج دیا۔

جدید ترین شاعر فیض۔ مجاز، جذبی۔ جاں نثار اختر، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی، مخدوم محی الدین ترقی پسند ہیں۔ ان کے ہاں رومان حقیقت یا رومان و سیاست باہم مل جاتے ہیں۔ ن۔م۔ راشد، میراجی اور اختر الایمان کے ہاں اشاریت اور ابہام پایا جاتا ہے۔ جنسی لذت کی طرف میلان بڑھا ہوا ہے جو بعض اوقات عریانی کی حدود میں جا پہنچا ہے۔

فراق کی غزل میں بھی نئے دور کا احساس موجود ہے اس نے بھی غزل میں وسعت پیدا کی ہے۔ وہ اس کے سماجی، سیاسی اور عمرانی تجربات ہیں جس سے اس کی غزل میں تنوع پیدا ہو گیا ہے۔ وہ حسن و عشق کی کیفیات کو حقیقی رنگ میں بیان کرتا ہے اور دیکھ کر ہی نہیں چھو کر بھی لذت حاصل کرتا چاہتا ہے۔ اس کے مزاج میں رومانیت ہے جس نے غزل میں خاص شان پیدا کر دی ہے۔ اس کی غزلوں میں فلسفیانہ رجحان بھی ہے مگر وہ اس دنیا اور مادی حیات سے آگے نہیں جاتا۔

کچھ شاعر اور بھی ہیں جن کا کلام منظر عام پر آیا ہے مثلاً قیوم نظر، یوسف ظفر، حفیظ ہوشیارپوری، مجروح، اختر ہوشیارپوری، عدم، سلام مچھلی شہری، ناصر کاظمی، فضلی، مسعود حسین خاں، ابن انشا وغیرہ نئے شاعروں میں دو چار کے سوا ابھی اوروں نے اپنا مقام حاصل نہیں کیا۔ کچھ ایسے ہیں جو تھک گئے ہیں اور ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی نئی بات نہیں رہی۔ کچھ ایسے ہیں جن کی شہرت فی الحال ان کی صرف دو چار غزلوں یا نظموں پر ہے، اور کچھ ایسے ہیں جنہوں نے ابھی ابھی اس کوچے میں قدم رکھا ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا کہ کون کس رتبے کا ہے۔

اس زمانے میں شعرا نے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ مثلاً نظم معریٰ اور آزاد نظم۔ راشد، میراجی اور ڈاکٹر خالد [illegible] نظمیں [illegible] کی

ہیں۔ اس سے قبل ہمارے شاعروں میں مولوی محمد اسمٰعیل، مولانا عبدالباقی، مولانا شرر، شفقت کیفی دہلوی نے بھی طبع آزمائی کی تھی لیکن یہ طرز تحریر ایسی ہے جس کے لئے بڑی قادر الکلامی اور ذوق سلیم کی ضرورت ہے تاکہ قافیہ اور ردیف سے جو ترنم اور کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو وہ اپنے اسلوب بیان کے حسن اور حلاوت کی صورت و ترتیب سے پیدا کر سکے۔ لیکن اس سے ہم بے اعتنائی نہیں کر سکتے۔ جب ہماری زبان میں ڈرامے، رزمیہ نظمیں یا اسی قسم کے موضوعات پر لکھنے کی نوبت آئے گی تو یہ طرز اختیار کرنا پڑے گا۔

ہمارے قدیم شعرا میں محبوب کا تصور خیالی تھا۔ نئے شاعروں میں یہ تصور زیادہ ترعملی اور مادی ہے۔ ہمارے نئے شاعروں اور ادیبوں میں بہت سے ایسے ہیں جن پر فرائڈ اور مارکس کے نظریوں کا اثر ہے۔ ایک کا تعلق نفسیات سے ہے اور دوسرے کا سیاسیات سے۔ ان نظریوں سے بلا شبہ ہمارے ادب کو فائدہ پہنچا ہے۔ نفسیات نے اندرونی کیفیات کے تجزیہ میں مدد دی۔ اور اشتراکیت نے فرد اور سوسائٹی کے امتیاز اور ان کے حقوق اور ذمہ داریوں کو سمجھایا۔ لیکن جن لوگوں نے ان نظریوں کو تنقیدی نظر سے نہیں پڑھا وہ غلط راستے پر جا پڑے۔ ایک تحت شعوری کے فلسفے میں گم ہو کر لذت پرستی کے عارضہ میں مبتلا ہو گیا۔ دوسرا بغیر یہ سمجھے کہ وہ کس ماحول اور کس سوسائٹی میں ہے بغاوت پر آمادہ ہو گیا۔

ہر زبان کے ادب میں اول قدم گیت نظم یا شعر کا ہے۔ نثر بہت بعد کی چیز ہے۔ اردو زبان کا آغاز بھی اسی نہج سے ہوا۔ نظم کی طرح نثر کی ابتدا بھی دکن سے ہوئی۔ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب "معراج العاشقین" سمجھی جاتی ہے۔ اس کی حقیقت میں گذشتہ اوراق میں لکھ چکا ہوں۔ اس سے قطع نظر کی جائے تو سب سے قدیم نثر ہمیں میراں جی شمس العشاق کی ملتی ہے۔ آپ کا مختصر رسالہ ہے جس کا نام "شرح مرغوب القلوب" ہے اس میں چھوٹے چھوٹے دس باب ہیں جن میں شریعت اور طریقت کی باتیں بیان کی ہیں۔ نمونہ اس نثر کا یہ ہے۔

"خدا کہیا تحقیق مال اور بیٹا بیٹی (اولاد) تمہارے دشمن ہیں۔ چھوڑ دو پشمنان کون ۔۔۔ اے کیا غفلت ہے۔ جو تجھے اندھلا (اندھا) کیا موت کی یاد ستی (سے) تجھے بسرا کرے"

دکنی نثر کی دوسری کتاب "شرح تمہید ہمدانی" یا "شرح تمہید" ہے۔ یہ "تمہیدات عین القضاۃ" کا ترجمہ ہے۔ مترجم شاہ میراں دشاہ میراں حسینی یا میراں جی خدانما، امین الدین اعلا کے مرید اور ساکن ملدہ حیدرآباد دکن ہیں۔ ان کا سن وفات ۱۰۷۴ھ ہے۔ کتاب کی زبان ٹھیٹ دکنی ہے لیکن صاف ہے مغلق نہیں۔ کتاب میں تصوف کے مسائل، مسائل شرعیہ، عقائد اور قرآن کی بعض آیات کے باطنی معانی بیان کئے ہیں۔ میرے کتب خانے میں اس کے تین نسخے ہیں۔ سب سے قدیم نسخے میں سن کتابت ۱۰۱۲ ہجری لکھا ہے۔ اس حساب سے یہ اردو دکنی کی بہت قدیم کتاب ہے۔

میراں جی شمس العشاق کے فرزند و خلیفہ برہان الدین جانم کا ایک رسالہ خاصا بڑا "حکمۃ الحقائق" دکنی اردو میں ہے۔ اس میں تصوف کے مسائل سوال وجواب کے انداز میں بیان کئے ہیں۔

مذکورہ بالا کتابیں اگرچہ اردو نثر کی قدیم ترین کتابیں ہیں اور تاریخی حیثیت رکھتی ہیں لیکن ادبی نظر سے ان کا درجہ کچھ زیادہ بلند نہیں۔ جو کتاب اس بلند مرتبے کا دعویٰ کر سکتی ہے وہ ملا وجہی کی کتاب "سب رس" ہے جو ۱۰۴۵ ہجری م ۱۶۳۵ء میں تصنیف ہوئی۔ اس میں حسن و عشق کی عالمگیر حقیقت کو مجاز کی صورت کے قصے کے پیرائے میں بیان کیا ہے۔ اور دونوں کو میدان کارزار میں لا کر ایک دوسرے کے مقابل صف آرا کر دیا ہے۔ پوری کتاب مقفیٰ عبارت میں ہے باوجود قافیے کی پابندی کے اسلوب بیان صاف، شگفتہ اور رواں ہے۔ زبان چونکہ پرانی ہے بعض الفاظ اور محاوروں کے سمجھنے میں الجھن ہوتی ہے لیکن اردو ادب میں یہ کتاب خاص اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ وجہی پہلا شخص ہے جس نے اپنی زبان کو "زبان ہندستان" لکھا ہے۔

شاہ امین الدین اعلا نے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے نثر میں بھی بعض رسالے لکھے ہیں۔ ان میں ایک "گفتار شاہ امین" ہے جس میں تصوف کے بعض مسائل اور بعض اصطلاحات کی تشریح کی ہے۔ دوسرا مختصر رسالہ "گنج مخفی" کا نام کا ہے اس میں شاہد و مشہود کی بحث ہے۔

اسی عہد کی ایک کتاب "شمائل الاتقیا" ہے جو ترجمہ ہے اسی نام کی ایک کتاب جس کے مصنف رکن عماد الدین دبیر معتوی مرید برہان الدین غریب

کا نام میزان الطب ہے۔ یہ ترجمہ انہوں نے ۱۱۰۰ھ میں شروع کیا اور کئی سال میں ختم ہوا۔ کتاب کا موضوع تصوف و طریقت کے مسائل ہیں۔ یہ ضخیم کتاب ہے۔ عبارت سادہ ہے۔ میرے نسخے میں سن کتابت ۱۱۰۵ھ ہے۔

میر حسن نے اپنے "تذکرۂ شعرائے اردو" میں لکھا ہے کہ "میر محمد حسین المتخلص بہ کلیم جہان محمد شاہی نے فصوص الحکم کا ترجمہ اردو میں کیا تھا اور ایک کتاب نظم و نثر میں بھی لکھی تھی جس کے دو ایک جملے بطور نمونہ تذکرے میں نقل کئے ہیں۔ یہ جملے بہت اچھی صاف اردو میں ہیں۔ تذکرہ ۱۱۸۸ اور ۱۱۹۲ھ کے درمیان میر حسن نے لکھا تھا۔ اس وقت کلیم کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ دو کتابیں اردو نثر کی پہلی کتابیں ہیں مگر نایاب ہیں۔ اب تک ان کا کہیں پتہ نہیں لگا۔

دوسری کتاب "نو طرز مرصع" ہے جس کے مصنف میر محمد حسین عطا خاں متخلص بہ تحسین ہیں۔ یہ بہت اچھے خوش نویس تھے اسی بنا پر ان کا خطاب "مرصع رقم" تھا۔ اس کتاب کی تکمیل مصنف نے وزیر الممالک نواب برہان الملک شجاع الدولہ (نواب اودھ) کے سایۂ عاطفت میں کی۔ اور ان کے حضور میں پیش کرنا چاہتا تھا کہ اتنے میں نواب صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ کتاب نواب آصف الدولہ کے نام سے معنون کی۔ نواب آصف الدولہ کی تخت نشینی ۱۱۸۹ھ م ۱۷۷۵ء میں ہوئی۔ یہ وہی قصہ ہے جسے میر امن نے باغ و بہار یا قصہ چہار درویش کے نام سے لکھا ہے۔ نو طرز مرصع کی عبارت رنگین اور تشبیہات و استعارات سے مملو ہے۔ تحسین نے اپنے بیان میں عام قصہ گویوں کا طرز اختیار کیا ہے۔ فارسی ترکیبوں اور الفاظ کی بھرمار ہے۔

شاہ رفیع الدین دہلوی (۱۱۶۳ تا ۱۲۳۳ھ م ۱۷۵۰ء تا ۱۸۱۸ء) اور ان کے بھائی شاہ عبد القادر (۱۱۶۷ھ م ۱۷۵۳ء تا ۱۲۴۳ھ م ۱۸۲۷ء) نے قرآن مجید کے ترجمے اردو میں کئے لیکن یہ ترجمے بالکل لفظی ہیں۔ عبارت کا تسلسل اردو بول چال کے مطابق نہیں۔ شاہ عبد القادر کو ترجمے میں ۱۸ سال لگے اور ۱۲۰۵ھ م ۱۷۹۰ء میں تکمیل کو پہنچا۔ اسی زمانہ میں حکیم شریف خاں دہلوی نے شاہ عالم بادشاہ کی فرمائش پر قرآن پاک کا ترجمہ کیا۔ اس کا قلمی نسخہ ان کے خاندان میں حکیم محمد احمد کے قبضے میں تھا۔ ترجمے کے آخر میں کاتب نے روز جمعہ ۹ ذیقعدہ لکھا ہے۔ حساب کرنے سے اس کا سن ۱۲۰۸ھ م ۱۷۹۳ء معلوم ہوتا ہے۔ حکیم صاحب کے ترجمے کی زبان زیادہ صاف ہے اور لفظی پابندی میں سختی نہیں برتی گئی۔ اگرچہ شاہ صاحب کے ترجمے کی سی ادبی خوبیاں کسی دوسرے ترجمے میں نہیں۔ حکیم شریف خاں کا انتقال ۱۸۰۱ء م ۱۲۱۶ھ میں ہوا۔

جدید اردو نثر کی بنیاد دراصل فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں پڑی۔ یہ کالج لارڈ ولزلی نے ۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء میں قائم کیا۔ اس کا مقصد ان انگریز افسروں کو تعلیم دینا تھا جو انگلستان سے ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ چونکہ آگے چل کر ان کا تقرر ذمہ دار عہدوں پر ہوتا تھا۔ اس لئے اس قسم کی تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا کہ وہ اصل ملک کی زبان اور اہل ملک کے خیالات اور رسم و رواج اور آئین و قوانین سے واقف ہو جائیں۔ اسی ضمن میں کالج نے ہندوستانی زبان یعنی اردو کی بڑی خدمت کی۔ اردو میں سادہ اور روزمرہ کی زبان لکھنے کا ڈھنگ ڈالا اور مقفیٰ اور مسجع عبارت ترک کر دی گئی۔ پچاس سے اوپر کتابیں تیار ہوئیں اور طبع کی گئیں۔ جن میں کچھ ترجمے تھے، کچھ تالیفات اور کچھ تصانیف جو قصص و حکایات، تاریخ و تذکرہ، لغات، صرف و نحو اور مذہب پر مشتمل تھے۔ کالج نے اردو زبان کے حق میں دو بڑے کام کئے۔ ایک تو روزمرہ کی زبان کو سلاست اور صفائی کے ساتھ لکھنا سکھایا۔ دوسری اس زمانے کے لحاظ سے لغت اور صرف و نحو پر جدید طرز کی کتابیں لکھنے کی کوشش کی۔ اس میں کالج کے ڈائرکٹر جان گلکرسٹ کا بڑا ہاتھ تھا۔ ایک اور اچھا کام کالج نے یہ کیا کہ نستعلیق ٹائپ کا مطبع قائم کیا اور کالج کی کتابیں اس میں چھپنے لگیں۔

کالج کی بعض کتابیں اب بھی پڑھنے کے قابل ہیں۔ خصوصاً میر امن کی باغ و بہار زبان کی فصاحت و سلاست اور بے تکلف طرز بیان کی وجہ سے اردو ادب میں ایک شاہکار ہے۔ میر امن کو زبان پر بڑی قدرت ہے اور ہر موقع پر اس کی مناسبت سے صحیح اور ٹھیٹ لفظ استعمال کرتا ہے اور ہر کیفیت اور واقعہ کا نقشہ اس خوبی سے کھینچتا ہے کہ اس کے کمال انشا پردازی کی داد دینی پڑتی ہے۔ میر امن کے علاوہ میر شیر علی افسوس بھی کالج میں ملازم تھے۔ ان کی کتاب آرائش محفل ... سے ماخوذ ہے بہت مشہور ہے اور گلستان کا ترجمہ باغ اردو کے نام سے کیا ... کہانی

لکھی جو کہ فارسی کے قدیم اخلاقی نامہ کا ترجمہ ہے۔ اسی طرح داستان بطرز قصہ حاتم طائی گل مغفرت وغیرہ کی کتابیں ہیں ترجمہ کیں [illegible] نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے قصے کو نثر میں بیان کیا ہے جس کا نام نثر بے نظیر ہے۔ مظہر علی خاں ولا نے ہندی سے بیتال پچیسی کا اردو ترجمہ کیا اور اتالیق ہندی وغیرہ کی کتابیں لکھیں۔ مرزا جان تپش کا بھی تعلق کالج سے رہا۔ ان کی کتاب شمس البیان فی اصطلاحات ہندوستان [illegible] طپش نے بہار دانش نام کا ایک منظوم عاشقانہ قصہ بھی لکھا ہے وہ صاحب دیوان ہیں۔ کاظم علی جوان نے شکنتلا ناٹک کا اور شیخ حفیظ الدین احمد نے خرد افروز کے نام سے عیار دانش کا ترجمہ کیا۔ ان کے علاوہ خلیل خاں اشک، نہال چند لاہوری، منشی بینی نرائن جہان اور کئی اشخاص کالج سے متعلق [illegible] گلکرسٹ نے لغت اور صرف و نحو پر کتابیں لکھیں۔

ایک اور ادارہ جس نے اردو زبان اور اس وقت کے نظام تعلیم میں انقلاب پیدا کیا وہ مرحوم دہلی کالج تھا اس کی تین بڑی خصوصیتیں تھیں ایک یہ کہ یہ پہلی درسگاہ تھی جہاں مشرق و مغرب کا سنگم ہوا۔ اور ایک ہی چھت کے نیچے مشرق و مغرب کے علم و ادب ساتھ ساتھ پڑھائے جاتے تھے اس ملاپ نے خیالات کے بدلنے، معلومات میں اضافہ کرنے اور ذوق کی اصلاح میں بڑا کام کیا۔ اس کالج سے ایسے روشن خیال اور بالغ نظر انسان اور مصنف نکلے جن کا احسان ہماری زبان اور سوسائٹی پر ہمیشہ رہے گا۔ دوسری خصوصیت اس کی یہ تھی کہ ذریعہ تعلیم اردو زبان تھا۔ تمام مغربی علوم اردو کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے۔ تیسری خصوصیت یہ تھی کہ اس سے متعلق ایک مجلس ترجمہ (ورنا کیولر ٹرانسلیشن سوسائٹی) تھی جو کالج کے طلباء کے لئے انگریزی سے اردو میں درسی کتابوں کے ترجمے یا تالیف کا کام انجام دیتی تھی۔ اس کی مطبوعات کی تعداد قریب ڈیڑھ سو کے ہے جو تاریخ، جغرافیہ، اصول قانون، ریاضیات، اور اس کی مختلف شاخوں، کیمیا، میکانیات، فلسفہ، طب، جراحی، نباتیات، عضویات، معاشیات، وغیرہ علوم و فنون پر مشتمل تھیں۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد اس کا شیرازہ نہ بکھر جاتا تو یہ کالج ہماری زبان و ادب کی عظیم الشان خدمت انجام دیتا۔

فورٹ ولیم کالج نے بلاشبہ سادہ اردو لکھنی سکھائی مگر اس کی تقریباً سب کتابیں قصص و حکایات کے ترجمے ہیں۔ دہلی کالج میں کالج کی جماعتوں کے درس کے لئے مختلف علوم و فنون کی کتابیں ترجمہ و تالیف کی گئیں جس کا مقصد طلبہ کو مغربی علوم سے روشناس کرنا تھا۔ پھر سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء) تھے جنہوں نے سنجیدہ اور علمی مضامین سادہ اور بے ساختہ زبان میں ادا کرنے کا ڈھنگ ڈالا۔ ان کی تحریروں میں سادگی کے ساتھ استدلال اور عقلیت کی پختگی ہے وہ ابہام سے بہت بچتے ہیں۔ اور بعض اوقات اپنے خیال کو دل نشیں کرانے کے لئے اس قدر سادگی اور وضاحت سے کام لیتے ہیں کہ عبارت بے مزہ ہو جاتی ہے لیکن ان کے کلام میں اثر ہے جو سادگی بیان، اور خلوص کا نتیجہ ہے۔

اگرچہ سر سید کا شمار ادیبوں میں نہیں لیکن ان کی تحریروں کا معتدبہ حصہ ایسا ہے جس میں خوش بیانی، مزاح اور ادبیت کا دل آویز رنگ پایا جاتا ہے۔ ان کے رسالہ "تہذیب الاخلاق" ______ ______________

نے اردو ادب میں انقلاب پیدا کر دیا۔ یہ انقلاب خیالات میں [illegible] طرز بیان میں تھا۔ یہ نثر نگاری [illegible] نثر نگاری سے بالکل [illegible] جو تصنع اور آرائش تھی، بقول سر سید کے "جہاں تک ہو سکا ... اردو عبارت پر توجہ کی ... کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا کرنے میں ہو۔ جو اپنے دل میں ہے وہی دوسروں کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"۔ یہ نثر نگاری کا [illegible] ہے۔

اس ذیل میں ہم مرزا غالب کے واقعات کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو زبان کی فصاحت اور سلاست، بے ساختگی، مزاح و ظرافت اور دلکش انداز کا بے مثال نمونہ ہیں۔ ان کی مقبولیت ہمارے ادب میں کبھی کم نہ ہوگی۔

وہ بزرگ جن کو جدید معنی نثر نگاری میں استادی کا مرتبہ حاصل ہے اور جن کی تصانیف ہمارے ادب میں کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں وہ یا تو وہ تھے جو سر سید احمد خاں سے کسی نہ کسی طرح وابستہ تھے یا وہ جن کی تعلیم قدیم دہلی کالج میں ہوئی تھی

مولوی محمد حسین آزاد دہلی کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ وہ زبان کے محقق اور سچے نثر کے استاد تھے اور باوجود اس کے کہ وہ بعض اوقات تکلف اور کہیں کہیں

[illegible] صاحب طرز ہیں کہ حسن کی [illegible] [illegible] منتخب [illegible] [illegible] ایسے پر معنی ، سبک اور لطیف الفاظ میں ادا کرتے ہیں کہ آنکھوں کے سامنے [illegible] ۔ [illegible] ان کی تصنیف آب حیات [illegible] باوجود [illegible] نقائص کے اردو میں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہے ۔ [illegible] خاص طور پر [illegible] ہے ۔ اس میں انہوں نے شعرا کی سیرت [illegible] کے حالات اس [illegible] ہیں کہ ان کی زندہ تصویریں آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں [illegible] تیز تخیل [illegible] اور قصص [illegible] ہیں ۔ وہ نقاد نہیں اگرچہ انہوں نے سب سے پہلے اس طرف توجہ کی ۔ وہ اس کے اہل نہ تھے ۔ ان کی تنقید [illegible] تذکرہ [illegible] بیان [illegible] کے عیب و محاسن اور مبہم الفاظ میں ایک قسم کی تعریف یا تنقیص ہوتی ہے ۔ ان کی رائیں ایک طرح کی رعایتیں ہیں [illegible] ہیں ۔ ان کی نثر بھی تنقید کے لئے موزوں نہیں ۔

حالی نے جس طرح اردو شاعری میں انقلاب پیدا کر کے صحیح رستے کی طرف رہنمائی کی اسی طرح اردو نثر میں بھی ان کا کام [illegible] ان سے پہلے نثر ہماری زبان [illegible] فارسی عربی میں ایک قسم کی نیم شاعری تھی ۔ یعنی رنگین مسجع یا مقفیٰ عبارت ، تشبیہوں ، استعاروں اور مبالغے سے لدی ، خیالی [illegible] اور لفظوں کی بھرمار ، ایک معنی کے لئے کئی کئی مترادف الفاظ ۔ [illegible] صحیح نثر کہنا چاہئے اس کی ابتدا اگرچہ سرسید سے ہوئی لیکن حالی نے اس کی بنیاد کو مضبوط [illegible] اور [illegible] ۔ حالی کی نثر [illegible] سادہ اور متین ہوتی ہے ۔ متین سے میری مراد ایسی نثر ہے جس میں جان اور قوت ہو ۔ حالی کے مزاج اور کلام میں اعتدال اور قدیم اساتذہ کا سا ضبط ہے ۔ وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے ، عقلیت اور استدلال کو پیش نظر رکھتے ہیں ۔ رنگین عبارت جو تشبیہ اور استعارہ سے معلوم ہوتی ہے ذہن کو اصل موضوع سے ہٹا کر لفظی صنائع اور آرائش کی طرف لے جاتی ہے اور اصل مضمون کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے ۔ ان کی نثر میں الفاظ اور خیالات ایسے یک جان ہو جاتے ہیں کہ اس سے معنی میں روشنی اور کلام میں قوت اور شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایک اور خصوصیت ان کی نثر کی [illegible] ہے [illegible] کلام میں ضعف پیدا ہوتا ہے ۔ وہ لفظ کے بہت بڑے نباض ہیں ۔ صحیح لفظ صحیح مقام پر جادو کا سا اثر رکھتا ہے ۔ حالی [illegible] کا کام لفظوں سے لیتے ہیں وہ [illegible] ایسا برمحل لفظ بٹھا دیتے ہیں کہ سارا خیال چمک اٹھتا ہے ۔

جدید سوانح نگاری کی بنیاد بھی حالی نے ڈالی ۔ اس میں پہلی کتاب جو ان کے قلم سے نکلی وہ "حیات سعدی" ہے ۔ سعدی کی حیات پر فارسی اردو میں کوئی [illegible] نہ تھا ۔ صرف شیخ کے کلام کے مطالعہ سے شہد کی مکھی کی طرح ذرہ ذرہ چن کر سعدی کی سیرت اور اخلاق اور حالات کو مرتب کیا ۔ کلام پر منصفانہ تبصرہ اور اس کے محاسن اور ادبی نکات کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے ۔

حالی کی "یادگار غالب" اردو کے عالی مرتبہ شاعر پر پہلی کتاب ہے ۔ اگرچہ اس کے بعد غالب پر کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن یادگار غالب کو پڑھ کر غالب کی عادات و اخلاق ، اس کی سیرت اور شخصیت کا جو نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے دوسری کتابیں اس سے قاصر ہیں ۔ یادگار غالب نے پہلی مرتبہ غالب کی قدر و منزلت اور عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی اور اس کی سیرت اور کلام کے مختلف پہلوؤں اور اس کے اشعار کی [illegible] اور باطنی خوبیوں اور نکات کو اس انداز سے بیان کیا کہ غالب کی شخصیت انسان اور شاعر کی حیثیت سے اس رتبہ کو پہونچ گئی ہے جس کا وہ مستحق ہے ۔ یادگار غالب نے غالب کو زندہ جاوید کر دیا ہے ۔

تیسری کتاب اس موضوع پر "حیات جاوید" ہے ، نثر میں حالی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے اس میں صرف سر سید احمد خاں کی سیرت اور ان کے حالات اور کارناموں ہی کا ذکر نہیں بلکہ ایک اعتبار سے مسلمانوں کی ایک صدی کے تمدن کی تاریخ ہے ۔ اس میں اس زمانہ کی معاشرت اور تعلیم ، مذہب ، سیاسیات [illegible] تحریکیں اور ان کے اثرات و نتائج ، سب ہی کچھ آگیا ہے ۔ یہ زمانہ بہت انقلاب انگیز تھا ۔ مسلمانوں کی حالت نہایت پست [illegible] تھی ۔ ان کی اصلاح کے لئے سرسید کی مساعی اور جدوجہد ، مخالفوں کی یورش ، حکومت کی بے التفاتی [illegible] [illegible] حالات کا لکھنا جو ہر طرف سے [illegible]

[illegible]

[illegible] مولوی نذیر احمد (۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء) [illegible] تعلیم پائی [illegible]

[illegible] یہ ناول مسلمانوں کی معاشرتی اور مذہبی اصلاح کے مقصد سے لکھے گئے ہیں۔ ان کا پہلا ناول مراۃ العروس [illegible] لڑکیوں کی تعلیم و تربیت ہے۔ اس میں [illegible] خاندان کی [illegible] ہے [illegible] کتاب [illegible] اصغری اور اکبری کے نام [illegible] ضرب المثل ہو گئے۔ ایک بڑی خوبی اس میں [illegible] عورتوں کی زبان اور ان کے خیالات کو جس خوبی سے ادا کیا ہے [illegible] ان کا دوسرا ناول [illegible] توبۃ النصوح [illegible] ایک خاندان کی [illegible] ہے۔ [illegible] ابن الوقت میں [illegible] مغربی تہذیب کی اندھا دھند تقلید کی خرابیاں دکھائی ہیں۔ ان ناولوں کا [illegible] کردار بہت مقبول ہیں۔ ان میں ایک عیب یہ ہے کہ قصے کے دوران میں بعض وقت طویل وعظ شروع کر دیتے ہیں [illegible] موقع کی [illegible] مناسبت سے [illegible] بعض اوقات [illegible] مسلمان شرفا کی خانگی زندگی کا نقشہ بہت خوبی سے کھینچا گیا ہے [illegible] مراۃ العروس میں اصغری اکبری اور توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کیرکٹر بہت پر لطف اور دلکش ہے [illegible] ان ناولوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو زندگی سے کس قدر دلچسپی تھی اور انہوں نے [illegible] کی نفسیات کو کس قدر گہری نظر سے دیکھا ہے [illegible] نقشہ کھینچا ہے۔

ان کا ایک بڑا کارنامہ قرآن مجید کا اردو ترجمہ ہے۔ قرآن پاک کا یہ پہلا ترجمہ ہے جس میں [illegible] کی کوشش کی گئی ہے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] شاعری [illegible]

[illegible] اس امر پر بحث کی [illegible] شاعری [illegible]
[illegible] کو قائم رکھا [illegible]

[illegible] انگریزی نہیں جانتے تھے۔ انگریزی ادب کے متعلق [illegible]
[illegible] عظیم الشان خدمت [illegible] انگریزی تعلیم یافتہ [illegible]

[illegible] انگریزی تعلیم یافتہ [illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible]

اسی [illegible] وہ تنقید میں صحیح اصول سے کام لیتے ہیں اور [illegible]

[illegible] ناول اور مختصر افسانے کا رواج بھی مغربی اثر کا نتیجہ ہے۔ [illegible]

کا ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دوسرے ناول نگار پنڈت رتن ناتھ سرشار [illegible]

[illegible] ان کا مشہور ناول "فسانۂ آزاد" ہے جو بہت ضخیم ہے۔ [illegible]

[illegible] اکثر واقعات غیر فطری اور مبالغہ آمیز ہیں۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ [illegible]

معاشرت کے بعض پہلوؤں پر ان کی نظر گہری ہے۔ خاص کر لکھنؤ کی سوسائٹی کی رگ رگ سے واقف ہیں۔ [illegible]

شادی بیاہ کے ہنگاموں، ناچ رنگ کے جلسوں، بازاروں کی چہل پہل، [illegible]

[illegible] بیگمات کی زبان پر بڑی قدرت ہے۔ اس ناول کا مشہور [illegible]

ہو گیا ہے۔ باوجود نقائص اور خامیوں کے یہ کتاب اردو ادب میں ایک مقام رکھتی ہے۔

[illegible] کے بعد عبدالحلیم شرر کا نمبر آتا ہے۔ [illegible]

ناول تاریخی ہیں۔ [illegible] تاریخ کے مطالعہ کا شوق [illegible]

[illegible] لیکن حقیقت نگاری [illegible]

[illegible]

ایک [illegible]

[illegible]

[illegible] ان کا نام [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہیں۔ مرزا احمد سعید کا "خواب ہستی" قابل ذکر ہے۔ مرزا صاحب، صاحب فکر ادیب ہیں۔ فنون لطیفہ کا ذوق رکھتے ہیں [illegible] ہے۔ لیکن ان کی تحریروں میں [illegible] ایک ہندو بیوہ کی [illegible] کے حالات کا صحیح نقشہ ہے۔

[illegible] مرزا محمد قابل ذکر ہیں [illegible] لکھنے والوں میں ایک [illegible] کا التزام [illegible] حقیقت نگاری سے کام لیا گیا ہے [illegible]

[illegible] افسانہ [illegible] پریم چند سے ہوئی [illegible] افسانہ [illegible] دیہاتی زندگی اور دیہاتیوں کے دکھ درد، ان کی دلچسپیوں اور مشکلات و مصائب کو بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں [illegible] سلطان حیدر جوش [illegible] پریم چند کی طرح [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

[illegible]

[illegible] عباس، [illegible] ممتاز مفتی، اختر انصاری، حیات اللہ انصاری، [illegible] زندگی کی مختلف [illegible]
کا اپنا موضوع بنایا اور ان کے بیان میں نفسیاتی جزئیات [illegible]۔ قرۃ العین حیدر، ممتاز شیریں، بلونت سنگھ، [illegible] نے بھی بعض افسانے
اچھے لکھے ہیں۔

اسی کے ساتھ مارکس اور فرائڈ کے نظریات نے بھی ہماری جدید شاعری اور تنقید کی طرح افسانے پر بھی اثر ڈالا اور [illegible] سے
زیادہ متاثر ہوا۔ اس سے [illegible] وسعت پیدا ہو گئی لیکن بعض افسانہ نگاروں نے حقیقت نگاری اور فن کے نام سے [illegible]
اور لوگوں کے جذبات اور عقیدت کو مجروح کرنے میں تامل نہیں کیا۔ بعض نے جنس کو اپنا موضوع بنایا ہے اور اس قدر غلو کیا ہے کہ [illegible]
نمایاں ہے۔ مثلاً عصمت اور منٹو بہت اچھے افسانہ نگار ہیں اور ان کے بعض افسانے درحقیقت اعلیٰ پایہ کے ہیں۔ لیکن چند ایسے بھی ان کے قلم سے نکلے
ہیں جن کو پڑھ کر گھن اور نفرت ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ گزشتہ پچیس تیس برس میں اردو افسانے نے قابل تعریف ترقی کی ہے اور اس کے بعض افسانے ایسے ہیں کہ ہم [illegible]
کے مشہور افسانوں کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ تقسیم کے بعد جو فسادات ہوئے ہیں اس پر بہت سے نئے افسانے [illegible] گئے ہیں ان کے
متعلق اس وقت کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔

ڈراما: [illegible] واجد علی شاہ کے عہد میں رقص و سرود کو خوب فروغ ہوا۔ اسی زمانہ میں ۱۸۵۲ء کے لگ بھگ سید آغا حسن امانت نے ایک
ناٹک اندر سبھا کے نام سے تصنیف کیا۔ اس میں اس نے ہندی دیومالا کو اسلامی روایات میں [illegible] پیدا کر دیا [illegible] اس کی
مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔

اسی دوران یعنی ۱۸۵۳ء میں [illegible] کے اور بمبئی میں اردو اسٹیج کا آغاز ہوا۔ [illegible] امانت کی اندر سبھا ہی سے ہوئی [illegible]
نے [illegible] فرحت افزا [illegible]
[illegible]
جہاں [illegible] اردو کا شوق پیدا ہو گیا۔

[illegible] یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک کی عام مقبول زبان اردو میں [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

[illegible] سمجھے جانے لگے۔ ان کمپنیوں [illegible]

[illegible]

[illegible] اس کے بعد [illegible] کمپنیوں کی [illegible] اسٹیج پر دکھائے۔

ان پارسی کمپنیوں کے کاروبار کے ختم ہونے پر بعض دوسرے اصحاب نے بھی تھیٹریکل کمپنیاں بنائیں۔ خاص کر بمبئی میں [illegible] تھیٹریکل کمپنی [illegible] ریاست رام پور کے نواب حامد علی خاں [illegible] رام پور کے سامنے تھیٹر کی عالی [illegible] کو اپنی کمپنی کے لئے جمع کیا۔ اس کمپنی کے ٹوٹنے پر اس کے عملے نے [illegible] تھیٹر [illegible]

[illegible] تک بیسیوں کمپنیاں بنیں اور ٹوٹیں اور کچھ دن اپنا اپنا تماشا دکھا کر رخصت ہو گئیں۔ [illegible] ان [illegible] لیکن اس ضمن میں اردو ڈرامہ اور اردو زبان کی خدمت بھی ان کمپنیوں نے کی۔ [illegible] بعد میں کچھ اصلاح ہوئی لیکن پھر بھی قدیم روایات کے پابند رہے۔ موضوع عشق و محبت ہوتا تھا [illegible] باتیں [illegible] ہوتی۔ بادشاہ بھی [illegible] فقیر بھی [illegible] غلام بھی [illegible] اشعار [illegible] متقی [illegible] احسن لکھنوی، بیتاب اور حشر نے کچھ اصلاح کی۔

[illegible] اسٹیج پر [illegible] کے قابل نہیں [illegible] کے قابل ہیں۔ ان لکھنے والوں میں مرزا [illegible] احمد علی شوق، [illegible] حکیم [illegible] شجاع، امتیاز علی تاج، ڈاکٹر عابد حسین، پروفیسر محمد مجیب، فضل الرحمٰن، عظیم بیگ چغتائی، [illegible] عبد الماجد [illegible] قابل ذکر ہیں۔ [illegible]

[illegible] اشاعت [illegible] اور اس [illegible]

[illegible] مغربی علوم [illegible]

[illegible]

[illegible] تاریخ [illegible] طبیعات وغیرہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

شائع کرکے اردو زبان کی تاریخ میں انقلاب پیدا کیا۔ [illegible]

ملک کی [illegible]

کی [illegible] حیدرآباد دکن [illegible]

ہم کبھی نہیں بھلا سکتے۔

تقسیم ملک کے بعد حال میں پاکستان میں چند ادارے ایسے قائم ہوئے ہیں جو علمی ادبی ثقافتی کام کر رہے ہیں۔

ادب ہو یا زندگی کا کوئی اور شعبہ اس میں ترقی پذیری کی قوت اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس میں تازگی جدت اور توانائی پائی جاتی ہے اور تازگی و جدت اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ ہمارے پیش نظر کوئی خاص مقصد ہو۔ جس کے حصول کے لئے ہم ہر قسم کی قربانی کے لئے آمادہ ہوں۔ جب کوئی خاص مقصد پیش نظر نہیں ہوتا، تو جدت، تازگی اور توانائی بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ اور زندگی کے کاموں میں یکسانی اور مساوات سی پیدا ہو جاتی ہے

ایک ہی لکیر کو پیٹتے پیٹتے انسان اکتا جاتا ہے اور اس بیزاری کے عذاب سے بچنے کے لئے نئی نئی اور طرح طرح کی تفریحات میں مبتلا ہو جاتا ہے اسی وقت آثار حیات گھٹنے لگتے ہیں، قویٰ میں اضمحلال پیدا ہونے لگتا ہے، دل میں امنگ نہیں رہتی۔ دل و دماغ کے ابھارنے کے لئے طرح طرح کے محرکات استعمال کئے جاتے ہیں لیکن وہ سب عارضی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ آخر اسی عالم نیم جانی میں اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ اصول، افراد، اقوام اور زندگی کے ہر شعبہ پر صادق آتا ہے۔

(رسالہ اردو خطبات ص ۲۴۳-۲۴۴)

مصنفین کی تخلیقی سرگرمیاں

میگھ ملہار

ممتاز شیریں کے طویل اور مختصر افسانوں کا دوسرا مجموعہ - پانچ روپے

لارک پبلشرز - بندر روڈ - کراچی

مقدمہ شعر و شاعری — ایک مطالعہ

حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کا تجزیہ از ممتاز حسین (زیر طبع)

مکتبہ اسلوب پوسٹ بکس [illegible] کراچی

حالی اور نیا تنقیدی شعور

اختر انصاری دہلوی   دو روپے

اردو اکیڈمی سندھ کراچی

روشن آرا

از بیگم ایل آر خان ایک معاشرتی اور اصلاحی ناول۔ قیمت ساڑھے چھ روپے

فیروز سنز اور دیگر مشہور کتب فروشوں سے دستیاب ہو سکتی ہے

آگ، خون اور پھول

ناول از بیگم ایل آر خان (زیر طبع)

ڈپل

از مسعود مفتی (مزاحیہ مضامین کا مجموعہ)

نیا ادارہ لاہور

منظر منظر

منظر [illegible] کا مجموعہ کلام (زیر طبع)

[illegible] اور ناول

[illegible]   مکتبہ اسلوب - پوسٹ بکس [illegible] کراچی

خبرنامہ

بابائے اردو کی پہلی برسی پورے احترام سے منائی گئی

بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی پہلی برسی پورے پاکستان میں عقیدت اور احترام کے جذبات سے منائی گئی۔ کراچی میں ۱۶ اگست کی صبح کو دفتر انجمن میں قرآن خوانی ہوئی جس میں تقریباً ۵ ہزار افراد نے حصہ لیا۔ چیف الیکشن کمشنر جناب اختر حسین جو انجمن ترقی اردو کے صدر بھی ہیں، انہوں نے مزار بابا پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ اس کے علاوہ متعدد داداروں کی طرف سے پھولوں کی چادریں چڑھائی گئیں۔ عورتوں کے لئے قرآن خوانی کا علیحدہ انتظام تھا۔ قرآن خوانی کے بعد انجمن ترقی اردو خواتین کے زیر اہتمام بابائے اردو کی یاد میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت کے فرائض بیگم محمد شریف نے انجام دیئے۔ اس جلسے میں صدر کے علاوہ بیگم سردی عرفان اللہ بیگم سیدہ عثمانی بیگم محسن الدین اور دیگر خواتین نے تقاریر کیں۔ اسی روز شام کو تھیاسوفیکل ہال میں نیشنل اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے زیر اہتمام جلسہ ہوا جس کی صدارت روزنامہ جنگ کراچی کے مدیر سید محمد تقی صاحب نے کی۔ اس جلسے میں ممتاز ادیبوں اور شاعروں نے بابائے اردو کی زندگی اور ان کے مشن پر روشنی ڈالی اور انہیں خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ سید محمد تقی پروفیسر ممتاز حسین، ایم ابراہیم جلیس، طفیل احمد جمالی، علی مختار رضوی، رئیس امروہوی اور دیگر اہل قلم حضرات نے تقاریر کیں۔ اس روز اردو کالج انجمن ترقی اردو خواتین اسکول بہادر یار جنگ ہائی اسکول اور دیگر تعلیمی ادارے جن میں ذریعہ تعلیم اردو ہے، بابائے اردو کی یاد میں بند رہے۔ اردو کے بہت سے اشاعتی اداروں میں بھی تعطیل رہی۔

دوسرے روز یعنی ۱۷ اگست کو نوعمر ادیبوں کی نمائندہ انجمن بزم امروز کے زیر اہتمام انجمن ترقی اردو اور پاکستان رائٹرز گلڈ کے تعاون سے ایک جلسہ عام اردو کالج میں منعقد ہوا۔ اس جلسے میں جس کی صدارت ریڈیو پاکستان کراچی کے ریجنل ڈائرکٹر حمید نسیم نے کی۔ سید محمد تقی، طفیل احمد جمالی، رفیق الدین احمد، رفیق خاور، عمر مہاجر، مصلح الدین سعدی، انجم اعظمی، ڈاکٹر مس شمیم ارشاد، اور عبدالرحمن چودھری کے علاوہ بزم کے کئی اور اراکین نے تقریریں کیں۔ اور متعدد شعرا نے جن میں مشتاق مبارک، جون ایلیا، آرزو اکبرآبادی، محشر بدایونی اور سحر انصاری وغیرہ شامل ہیں اپنی نظموں کے ذریعہ مولوی عبدالحق کو خراج عقیدت پیش کیا۔ جلسہ میں بزم امروز کی جانب سے ایک سوونیر بھی تقسیم کیا گیا جس میں بابائے اردو سے متعلق مضامین، قطعے، نظمیں اور پیغامات شامل تھے۔

مقررین نے بابائے اردو کی زندگی کے مختلف پہلوؤں خاص طور پر اردو اور پاکستان کے لئے ان کی جدوجہد پر روشنی ڈالی۔ کچھ مقررین نے طلبہ کو اس عظیم قومی و ثقافتی رہنما اور محسن کی یاد منانے پر مبارکباد دی۔ جب کہ بڑوں نے اسے سرے سے نظرانداز کردیا۔ انہوں نے ملک کے نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو بابائے اردو کے مشن کی تکمیل کے لئے وقف کردیں۔ اور ابھی سے پاکستان میں ایک اردو یونیورسٹی کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینا شروع کردیں۔

صدرِ جلسہ حمید نسیم نے ملک کی ترقی میں اردو زبان کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے بابائے اردو کو اردو کے لئے ان کی عظیم ادبی خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کیا۔ رفیق الدین نے غیر منقسم ہندوستان کے میدان سیاست میں مولوی عبدالحق کے کردار کا جائزہ لیتے ہوئے انکشاف کیا کہ قائداعظم نے مسلمانانِ ہند کی قیادت اس وقت قبول کی تھی جب انہیں یہ یقین دلا دیا گیا کہ گاندھی جی کی ریشہ دوانیوں کو مولوی عبدالحق نے پارہ پارہ کر دیا ہے۔ اور کانگریس کی اردو دشمنی کی تحریک کا کمر اس بڈھے کے ہاتھوں ٹوٹ چکی ہے۔

شاہد صدیقی کا انتقال

اردو کے مشہور شاعر شاہد صدیقی ۱۷ جولائی کو حیدرآباد دکن میں حرکت قلب بند ہوجانے سے انتقال فرما گئے۔ اس ناقابلِ تلافی نقصان پر ہند و پاکستان کے تمام ادبی حلقوں میں اظہارِ افسوس کیا گیا ہے۔ ۱۰ اگست کو کراچی میں بہادر یار جنگ اکیڈمی کے زیر اہتمام مولانا ماہر القادری کی صدارت میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا جس میں ابراہیم جلیس، نظر حیدرآبادی، خواجہ حمید الدین شاہد، مصلح الدین سعدی، تحسین سروری، اور دیگر شاعروں اور ادیبوں نے مرحوم شاعر کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کی طرف سے ۲۰ اگست کو "ایوان اردو" میں ریاستی وزیر آندھرا پردیش نواب میر احمد علی خاں کی صدارت میں ممتاز شاعر و صحافی حضرت شاہد صدیقی (صاحب چراغ منزل) کی اچانک وفات پر منعقدہ جلسۂ تعزیت میں عالم خوندمیری، وقار خلیل، ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ، پروفیسر سید محمد، مرزا شکور بیگ، اوج یعقوبی، بانو طاہرہ سعید، وحید مرزا، صلاح الدین نیرؔ، اور سعادت جہاں رضوی نے تقریروں اور نظموں کے ذریعہ بھرپور خراجِ عقیدت ادا کیا۔ ڈاکٹر زورؔ نے ایک تعزیتی بیان میں کہا ہے کہ "شاہد صدیقی حیدرآباد کے ان شاعروں میں تھے جو گذشتہ دو تین سو سال میں حیدرآباد آئے اور اسی کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور دکن کی علمی و ادبی زندگی میں مرحوم نے اپنی ذہانت و ظرافت سے خوشگوار اضافے بھی کئے۔ میکش ، فانی بدایونی، عظمت اللہ خاں اور فرحت اللہ بیگ کی طرح شاہد صدیقی کا بھی حیدرآباد دکن کی کلچرل زندگی میں ناقابلِ فراموش حصہ ہے۔"

قاضی نذرالاسلام کی ادبی خدمات کا صلہ

مرکزی حکومت نے پاکستان کے قومی شاعر قاضی نذرالاسلام کو ان کی عظیم ادبی خدمات اور آزادی کی جد و جہد کے صلہ میں ۱۹۵۸ء سے ڈھائی سو روپے ماہانہ کا تاحیات وظیفہ جاری کیا ہے۔ مرکزی حکومت کے ایک ترجمان نے اس سوال پر کہ حکومت نے قاضی نذرالاسلام کی امداد کے لئے کیا اقدام کیا ہے یہ انکشاف کیا۔ قاضی نذرالاسلام ایک عرصے سے بیمار ہیں اور کلکتہ میں زیرِ علاج ہیں۔ ترجمان نے بتایا کہ ۱۲ سال سے انہیں یہ وظیفہ باقاعدہ طور پر مل رہا ہے۔

"شاہ لطیف کا کلام ابدی زندگی کے لئے مشعلِ راہ ہے" ڈاکٹر قریشی کی تقریر

سندھ کے بزرگ اور مشہور شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ۲۱۰ ویں برسی کے موقع پر بھٹ شاہ میں بھٹ ثقافتی مرکز کمیٹی نے ایک پُر رونق تقریب منعقد کی۔ اس تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے تقریر کرتے ہوئے شاہ عبداللطیف بھٹائی کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور کہا کہ شاہ بھٹائی کے کلام اور فلسفے نے انہیں زندۂ جاوید بنا دیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ آج بھی ہمارے [illegible] ڈاکٹر قریشی نے مزید کہا کہ بھٹائی کا کلام نہ صرف یہ کہ ہمیں روحانی سکون پہنچاتا ہے بلکہ یہ ابدی زندگی کے لئے بھی مشعلِ راہ ہے۔ ڈاکٹر [illegible] کلام پیغام [illegible] محبت ہے جو صرف سندھ کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ سارے عالم کے لئے ہے۔

پندرہ ہزار افراد کی زبان کی لغت

ٹوکیو ۱۲ اگست۔ جاپان ایک ایسی زبان کی لغت شائع کر رہا ہے جو صرف پندرہ ہزار افراد بولتے ہیں۔ یہ زبان "آئنو" ہے جو شمالی جاپان کی آئنو نسل میں بولی جاتی ہے۔ یہ نسل بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ یہ ڈکشنری آنجہانی ڈاکٹر جماشیبو چیری نے لکھی ہے وہ اس نسل کے واحد فرد تھے جنہوں نے ڈاکٹریٹ کی۔ وہ ہوکیدو یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ انہوں نے اپنی نسل اور زبان کے بارے میں بہت قیمتی مواد چھوڑا ہے۔

حکومت سندھی ادبی بورڈ کو فراخدلی سے امداد دے گی

ایک سرکاری ہینڈ آؤٹ کے مطابق حکومت سندھی ادبی بورڈ اور سندھی ادب کی ترقی کے لئے کام کرنے والے اداروں کو فراخدلی سے امداد دے گی پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ سابق صوبہ سندھ میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنانے کا یہ مقصد نہیں کہ حکومت سندھی زبان کو ختم کرنا چاہتی ہے۔

پاکستان آرٹ کونسل کے نئے سیکریٹری جنرل

لاہور ۱۴ اگست۔ معلوم ہوا ہے کہ مسٹر ڈیڈلے سنجاری کو پاکستان آرٹ کونسل کا سیکریٹری جنرل مقرر کیا جائے گا۔ اس سلسلے میں ایک تجویز کونسل کی گورننگ باڈی کے زیر غور ہے کونسل کے جنرل سیکریٹری کا عہدہ مسٹر فیض احمد فیض کے استعفے کی وجہ سے خالی ہوا ہے اگرچہ گورننگ باڈی نے ان کا استعفیٰ ابھی تک منظور نہیں کیا ہے لیکن اس امر کا قوی امکان ہے کہ اسے منظور کر لیا جائے گا۔ مسٹر ڈیڈلے سنجاری ریڈیو پاکستان کے پہلے ڈائرکٹر جنرل تھے اور آج کل ریڈیو پاکستان کے تجارتی مشیر ہیں۔ مسٹر فیض ماسکو سے واپسی پر غالباً کراچی یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے کام شروع کر دیں گے۔

ساحرؔ لدھیانوی پردۂ فلم پر

مشہور شاعر ساحرؔ لدھیانوی کے گیتوں کو فلمی دنیا میں بے حد مقبولیت حاصل ہے۔ کسی فلم کے ساتھ ساحر لدھیانوی کا نام فلم کی کامیابی کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ ساحر کی ایک مشہور نظم "پرچھائیں" پر مبنی ایک رنگین فلم تیار کرنے کے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں ڈائرکٹر فلیشن چوپڑا بی آر فلز کے زیر اہتمام اس فلم کو تیار کریں گے۔ اور خود ساحر لدھیانوی فلم میں کام کریں گے۔

ڈراما گلڈ کراچی کا سالانہ جلسہ

۱۲ اگست ۱۹۵۹ء کو کیتھڈرل ہال کراچی میں "ڈراما گلڈ" کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں جناب ممتاز حسن نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقع پر گلڈ کی طرف سے خواجہ معین الدین کا ڈرامہ "تعلیم بالغان" پیش کیا گیا۔ صلاح الدین اسد صاحب نے حسب ذیل روداد پیش کی۔

"گزشتہ سال موسم بہار میں کچھ ہی دن تھے جب ڈرامے اور اسٹیج کی لگن دل میں لئے چند افراد نے "ڈراما گلڈ کراچی" کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی تھی۔ یہ لوگ اسٹیج کے لئے نئے نہیں تھے انہوں نے پاکستان بننے کے بعد ایسے حالات میں بھی جب کہ یاروں نے عشق بھی فراموش کر دیا تھا، اپنی زندہ دلی کو جوان رکھا اور اپنے ہم وطنوں کو مصیبت میں ہنسنے کا سلیقہ سکھاتے رہے۔ ملک میں آرٹ کونسل آف پاکستان کے قیام سے بہت پہلے اس گروپ نے اور دوسرے کچھ بہترین ڈرامے جیسے "زوال حیدرآباد" "نیا شاہ" "لال قلعے سے لالوکھیت" اور "مرزا غالب بندر روڈ پر" اسٹیج کئے اور ان میں [illegible] پاکستان میں اسٹیج کی روایت کا انہی لوگوں نے زندہ کیا اور متعدد بار اس کی ترقی اور [illegible]

مختصر یہ کہ ڈراما گلڈ نے اپنی تشکیل سے ان ہی صلاحیتوں کو اب یکجا کر لیا تھا اور آغاز کار کے لئے کسی موزوں کھیل کی تلاش تھی۔ گذشتہ ہدایتکاروں کی نگاہوں سے وہ خوبیاں اوجھل نہیں تھیں جو عموماً کسی ڈرامے کو صفحۂ قرطاس سے اسٹیج تک لانے میں ہوتی ہیں۔ ان ہی خوبیوں کے مدنظر ڈراما گلڈ نے اپنی اولین پیشکش کے لئے جناب خواجہ معین الدین کے مقبول ترین کھیل "لال قلعہ سے لالوکھیت" کا انتخاب کیا۔ اور تقریباً دو مہینے کی شبانہ روز محنت اور ریہرسل کے بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں تھیاسوفیکل ہال کے اسٹیج پر اسے پیش کیا۔ یہ کھیل تیرہ راتوں تک کھیلا گیا اور ایک اندازہ کے مطابق اسے پانچ ہزار آدمیوں نے دیکھا اور حوصلہ افزائی کی۔

اسی دوران میں میرپور خاص کی ایک مقامی انجمن کی خواہش پر گلڈ نے "لال قلعہ سے لالوکھیت" کے چار شو وہاں دینے منظور کئے۔ ان چار راتوں میں تقریباً آٹھ ہزار آدمیوں نے اسے دیکھا اور کھیل کے پروگرام میں توسیع کے لئے اصرار کیا جانے لگا۔ ہم بمشکل پانچواں شو وہاں دے سکے، کیونکہ بیشتر اداکاروں کو ان کے دفاتر سے مزید چھٹیاں نہیں مل سکتی تھیں۔ واپسی پر ہم نے اپنے آمد و خرچ کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے مالیاتی موقف میں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی۔

دسمبر ۱۹۵۳ء میں ارژنگ بزم ثقافت کی دعوت پر ہم حیدرآباد سندھ گئے۔ سٹی کالج کے میدان میں عارضی اسٹیج کھڑا کیا گیا۔ اینٹوں کے چبوترے پر اسٹیج کی چوکیاں جمائی گئی تھیں۔ میدان میں تقریباً ڈھائی تین ہزار نشستوں کا انتظام تھا۔ مسلسل تین راتوں تک "لال قلعہ سے لالوکھیت" کے شو ہال ہوتے رہے اور روزانہ تقریباً تین ہزار آدمیوں نے اسے دیکھا اور پسند کیا۔ ارژنگ بزم ثقافت کا شاید سب سے کامیاب پروگرام یہی تھا۔ ارژنگ کے صدر اور معتمد صاحبان کی شرافت اور خلوص نے ہمیں باندھ لیا ورنہ معاملات کا مالی پہلو وہاں بھی دردناک حد تک خراب رہا جس کی ابھی تک یکسوئی نہیں ہو سکی ہے۔

حیدرآباد سے واپسی کے بعد ہمیں یہ احساس ہوا کہ مکمل ڈرامے کے اسٹیج کرنے میں بے شمار اخراجات لاحق ہوتے ہیں اور طرح طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اسی لئے جب جیکب آباد سے ہمیں دعوت آئی تو ہم نے خواجہ معین صاحب کے ایک ایکٹ کے کھیل "تعلیم بالغان" کا انتخاب کیا جو آج رات بھی ہماری سالانہ تقریب کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے اس کی ریہرسل کراچی میں مکمل کر کے ہم جیکب آباد پہنچے۔ دسمبر کی سردیاں تھیں اور ہواؤں کے ہاتھوں میں ہتھیار تیز تھے اس کے باوجود کھیل کامیاب رہا اور ہزاروں افراد نے اسے دیکھا۔

فروری ۱۹۵۴ء میں یہی کھیل لے کر ہمارا ایک گروپ رحیم یار خاں گیا اور کامیاب لوٹ آیا۔

کراچی یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے موقع پر ہوٹل میٹروپول میں "تعلیم بالغان" کا ایک شو دیا گیا اور ملک کے نوجوان دانشور طبقے نے اسے پسند کیا۔

یہ ہمارے کمرشیل کاروبار تھے جن میں ہمیں خاطر خواہ نفع نہیں ہوا۔ مگر کسی خسارے کا منہ بھی ہم نے نہیں دیکھا۔

۳۰ اگست ۱۹۵۴ء سے کراچی کی نواحی بستی کورنگی میں "تعلیم بالغان" اور "مشاعرہ" دو کھیل تین راتوں تک پیش کئے گئے۔ کورنگی کے ہیلتھ سنٹر کے کمپاؤنڈ میں اسٹیج بنایا گیا تھا اور میدان میں نشستوں کا انتظام تھا۔ روزانہ ایک ہزار سے زیادہ آدمیوں نے اسے دیکھا۔ یہ سہ روزہ پروگرام آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی کے تعاون سے ترتیب دیا گیا اور مفت داخلے کی اجازت تھی۔ ایسے ہی تفریحی پروگراموں کی مدد سے عوام میں اسٹیج کی روایت کو مقبول بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ کراچی کی دوسری نواحی بستیوں، ڈرگ روڈ، لانڈھی وغیرہ میں بھی اس قسم کے تفریحی پروگراموں کا ایک خاکہ آرٹس کونسل کے تعاون کے ساتھ ڈراما گلڈ کے پیش نظر ہے۔

قومی خیر سگالی کے جذبے کے ساتھ ڈراما گلڈ نے مشرقی پاکستان کے سفر کا بھی ایک پروگرام مرتب کیا ہے۔ اس سفر میں ہم اپنا کھیل بطور [illegible] یہ ارادہ شاید آئندہ چند مہینوں میں پورا ہو جائے لیکن فی الحال ہماری سب سے [illegible]

پیداوار نیشنل پروڈکٹس کمیشن نے ہمیں انتخابات سے بے نیاز کر دیا ہے جس کے لئے ہم ان کے ممنون ہیں۔ مگر دوسرے کئی انتخابات کے لئے ہماری بے اختیارانی بدستور ہے اور جب تک اس کا احساس نہ ہو ہم کوئی اقدام نہیں کر سکتے۔

ڈراما گلڈ نے ابتدا ہی میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ وہ ڈرامے اور اسٹیج سے محبت کرنے والے ادیبوں اور فن کاروں کی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لانے میں اپنے محدود وسائل کے باوجود ممکنہ اعانت کرے گی۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء - ۱۹۶۲ء والے سال میں جتنے کھیل اور ثقافتی جلسے کراچی میں ہوئے، ان میں کسی نہ کسی اعتبار سے ڈراما گلڈ کی نمائندگی بھی شامل حال رہی۔ ایوان گارڈ سے لاہور آرٹ کونسل کا تھیٹر گروپ، امریکن یونیورسٹی کے طلبا کا کلچرل گروپ، پاک امریکن کلچرل ایسوسی ایشن، کمشنری انتخابات اور کئی ثقافتی اداروں کے لئے ڈراما گلڈ نے اسٹیج کے پردے اور دیگر ضروریات مفت فراہم کیں۔

ہم سب اس بات سے واقف ہیں کہ ہمارے ہاں ڈرامہ لکھنے والوں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن یہ ڈرامے زیادہ تر پڑھنے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اور اگر ان لکھنے والوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اسٹیج کے لئے بھی کچھ لکھیں تو وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ چپ ہو جاتے ہیں وہ ایسا کرنے میں حق بجانب بھی ہیں۔ فن یا کاروبار کی حیثیت سے اسٹیج ابھی ہمارے ملک میں سرمایہ کاروں کے نزدیک قابل اعتنا نہیں ہے اسی لئے ہمارے شہروں میں اسٹیج کی روایت بھی تقریباً معدوم ہے۔ اپنے تجربات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں میں ڈرامہ اور اسٹیج کا شوق موجود ہے وہ اچھے ڈرامے دیکھنا چاہتے ہیں لیکن سرمایہ کاروں کی عدم توجہ کے سبب نہ انہیں یہ تفریح میسر آتی ہے اور نہ لکھنے والوں کو اسٹیج کے لئے لکھنے میں کوئی جاذبیت محسوس ہوتی ہے

ادارۂ مصنفین

اہل اردو کو بنگالی پڑھانے کا انتظام

قومی اسمبلی کے اسپیکر جناب مولوی تمیز الدین صاحب نے تجویز رکھی تھی کہ مغربی پاکستان میں بنگالی اور مشرقی پاکستان میں اردو پڑھائی جائے۔ چنانچہ پاکستان رائٹرز گلڈ کے مغربی پاکستان کے حلقہ نے اس تجویز کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے اور لاہور میں بنگالی پڑھانے کے لئے ایک کلاس کھولنے کے انتظامات کئے جا رہے ہیں اس کلاس میں مصنفین کے علاوہ بنگلہ سیکھنے کے دیگر خواہش مند بھی استفادہ کر سکیں گے۔

ذیلی حلقہ کوہاٹ

پاکستان رائٹرز گلڈ شاخ کوہاٹ کے زیر اہتمام ایک علمی و ادبی اجلاس زیر صدارت جناب آذر سرحدی ۲۱ جولائی بوقت ۹ بجے شب بر مکان ابوالفضل غلام رسول صاحب منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں محمود شوکت، ایوب صابر، رضی الدین صدیقی، محمد بشیر بشیر، انجم بریلوی، پروفیسر سید دلی رضا احمد پراچہ، اللہ پراچہ، محمد شاہ حیران رامپوری، فیض القادری اور عزیز اختر وارثی نے حصہ لیا۔ اسی اجلاس میں طے پایا کہ آئندہ اجلاس اگست کے آخری ہفتہ میں سپراسی جگہ منعقد کیا جائے۔ اس اجلاس میں سیکریٹری کے اس اعلان کو جس کے ذریعہ گلڈ کوہاٹ کے زیر اہتمام ستمبر ۶۲ء میں ایک انٹر اسکولز مباحثہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے سراہا گیا اس مباحثہ میں گلڈ کوہاٹ کی طرف سے اول آنے والی ٹیم کو شیلڈ اور اول، دوئم اور سوئم آنے والے طلبا کو علی الترتیب انعامات بھی دیے جائیں گے۔

ذیلی حلقہ حیدرآباد

پاکستان رائٹرز گلڈ اردو سب ریجن کے زیر اہتمام گذشتہ دنوں سجاد حیدر یلدرم ڈائرکٹر ریڈیو پاکستان کی زیر صدارت اندس مسلم کالج میں تنقیدی

نشست منعقد ہوئی جہاں گرام کے مطابق قابل اجمیری نے فرزل اور عثمان عرفانی نے اپنا مقالہ [illegible] پیش کیا تقریب میں حمید علی شاعر، اختر انصاری اکبرآبادی، سید محمد نصیر، محمد احمد، رفیق ترمذی، حسن احمد سلیم، شہزاد احمد، رضوان صدیقی اور ظہور نظر نے شرکت کی۔ نشست کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ اردو سب ریجن حیدرآباد کے تحت بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق کی یاد میں ۲۴ اگست کو یادگار اجتماع کا اہتمام کیا جائے گا۔

ذیلی حلقہ سکھر

گلڈ کے سکھر سب ریجن اور مجلس ادب کے اشتراک عمل سے ۲۰، ۲۹ جولائی کو مشاعرے اور مجلس مذاکرہ کا انعقاد کیا گیا۔ یہ دونوں ادبی نشستیں بہاولپور اور ملتان کے اہل قلم جناب ظہور نظر، ریاض انور، عرش صدیقی اور ارشد ملتانی کے اعزاز میں ترتیب دی گئی تھیں۔ ۲۸ جولائی کو مجلس ادب کی جانب سے معزز مہمانوں کے اعزاز میں لنچ کا اہتمام کیا گیا اور شب کو گلڈ کے اراکین کی طرف سے کیف نشاط میں عشائیہ دیا گیا۔ عشائیہ کے بعد ڈسٹرکٹ کونسل ہال میں جناب شیخ ایاز کی زیر صدارت بزم مشاعرہ کا انعقاد ہوا۔ جناب حسن حمیدی نے مجلس ادب کے سیکریٹری کی حیثیت سے اور جناب آفاق صدیقی نے سب ریجن کے اعزازی سکریٹری کے طور پر مہمانوں کو حاضرین سے متعارف کیا۔ مشاعرے میں جن مقامی اور بیرونی شعراء نے حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ شیخ ایاز، ظہور نظر، عرش صدیقی، ریاض انور، ارشد ملتانی، اشتیاق اظہر، حسن حمیدی، آفاق صدیقی، عاشق کیرانوی، شوکت عابدی، مظہر جمیل، عمران صدیقی، رؤف خاں، شباب ملیح آبادی، ظہور صدیقی، صلاح الدین، شور صدیقی، مسلم شمیم، ماہر اور کلیم۔

۲۹ جولائی کی صبح کو جناب ایوب قریشی نے ناشتہ کی دعوت دی اور جناب ف۔ الف عثمانی نے معزز مہمانوں کو دوپہر کے کھانے پر مدعو کیا۔ شام کو ایس ایم ہائی اسکول میں جناب مظہر جمیل نے عصرانہ ترتیب دیا۔ عصرانہ کے بعد جناب ظہور نظر کی زیر صدارت "ادیب اور سماجی ذمہ داریاں" کے موضوع پر مجلس مذاکرہ کا آغاز ہوا۔ مذاکرے میں جناب ظہور نظر، ف۔ الف عثمانی، ریاض انور، ارشد ملتانی، عرش صدیقی، زبیر بن عمر، حسن حمیدی، آفاق صدیقی، مظہر جمیل اور شور صدیقی نے حصہ لیا۔

"بابائے اردو وادیٔ مہران میں"

گلڈ سکھر سب ریجن بابائے اردو کی پہلی برسی کے موقع پر ایک مخصوص ادبی اجتماع کا اہتمام کر رہا ہے۔ ساتھ ہی بابائے اردو کے غیر مطبوعہ خطبات، ادبی خطوط اور نادر تصاویر پر مشتمل ایک کتاب بھی شائع کی جا رہی ہے جس کی ترتیب کے فرائض آفاق صدیقی نے انجام دیئے ہیں۔ یہ کتاب جس کا نام "بابائے اردو وادیٔ مہران میں" ہے اس اجتماع کی پہلی نشست میں پیش کی جائے گی۔ سکھر سب ریجن کی دو اور کتابیں "ریگزار کے موتی" اور "Sukkur Past and Present" بھی اس موقع پر پیش کی جائیں گی۔

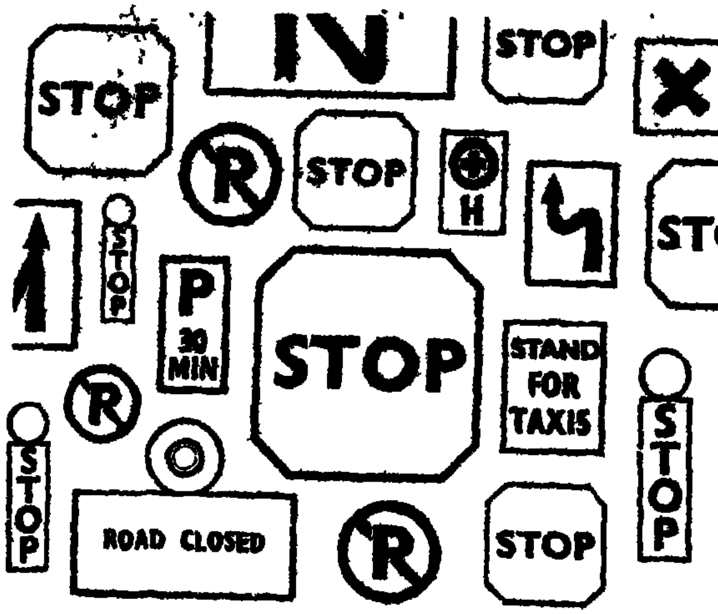
ایک ضروری اعلان

"ہم قلم" ادارہ مصنفین کے تمام اراکین کی خدمت میں باقاعدگی سے ارسال کیا جاتا ہے۔ اگر بعض اراکین کو یہ پرچہ نہیں ملتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے دفتر کے ریکارڈ میں ان کا پتہ درست نہیں۔ جن اراکین کو "ہم قلم" نہیں ملتا، وہ اپنے پتے سے ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ انہیں "ہم قلم" باقاعدگی سے ملتا رہے۔



بچے ہنستے کھیلتے
ہی
اچھے لگتے ہیں
گھر کی رونق اور مسرت بچوں کے دم سے ہی قائم
ہے۔ وہ ایک پل بھی نچلا نہیں بیٹھ سکتے، ان کا ننھا منھا
ذہن ہر لمحہ نئی نئی اور میٹھی میٹھی شرارتوں کی آماجگاہ بنا
رہتا ہے۔ اور اسطرح گھربار کا دل موہ لیتا ہے۔ جب
وہ خاموش اور پژمردہ ہوں تو اسکا مطلب یہ ہے کہ
وہ تندرست نہیں۔ دودھ اور اشیاء خوراک میں غذائیت کی
کمی سے ان کے نازک اور بڑھتے ہوئے قویٰ زیادہ حرکت کے
متحمل نہیں ہو سکتے۔ انکو نونہال بے بی ٹانک سے مضبوط بنایئے
نونہال
بے بی ٹانک
manhattan

"ٹھہریئے" کی تمام علامتیں آپ کتنے [illegible]؟



باہر سے آنے والے دوستوں کے ایک گروہ نے تو اس شہر میں کئی "ٹھہریئے" کی [illegible] علامتیں [illegible] آپ کو [illegible] کہ یہ کتنی [illegible]۔
[illegible] ہر علامت ایک خاص [illegible] رکھتی ہے [illegible] آپ [illegible] علامت [illegible] ذہن [illegible] اور [illegible] پر [illegible] مفہوم کے لحاظ سے [illegible]۔

تیزروی اور محتاط روی

ذرائع نقل و حرکت کے موجودہ دور میں "سلامت روی" کی اہمیت پر جتنا بھی زور دیا جائے کم ہے۔ چنانچہ برماشیل کی خدمات کا دائرہ محض تیل کی تقسیم کاری تک ہی محدود نہیں۔ اگر ایک طرف ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے برماشیل کے ڈپو سریع نقل و حرکت کیلئے [illegible] مصنوعات فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف [illegible] کی تنظیم کے ہوئے فلم، پوسٹر اور کتابچے [illegible] کی تلقین کرکے "تیز روی" اور "محتاط روی" کے [illegible] ایک خوشگوار اور ضروری توازن قائم کرتے ہیں۔



برماشیل
کا آپ کی زندگی سے گہرا تعلق ہے